نقوش
لاہور

جلد دوم

افسانہ نمبر

ادارۂ فروغِ اردو ○ لاہور

جلد دوم

نقوش

افسانہ نمبر

فہرست میں انگارے کے نمائندہ افسانوں کی نشاندہی کردی گئی ہے۔
مگر انھیں اپنے تُند و تیز مزاج کی وجہ سے خارج کرنا پڑا۔ لہٰذا
صفحہ ۴۶۴ کے بعد صفحہ ۸۷۴ کو مربوط ہی جانیں!

[ادارہ]

ترتیب

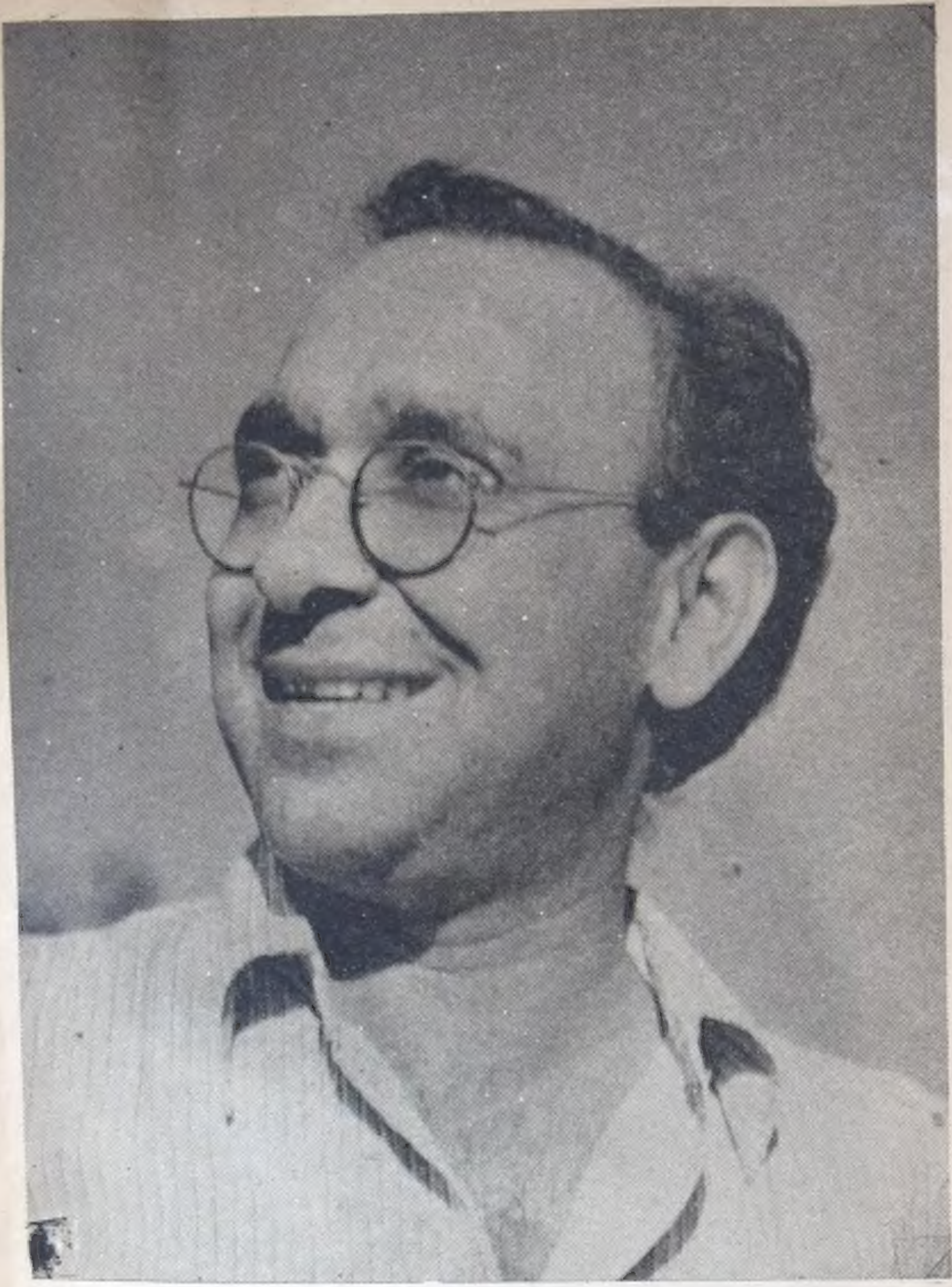
جلد دوم

تیسرا دور
(انگارے کے افسانے)

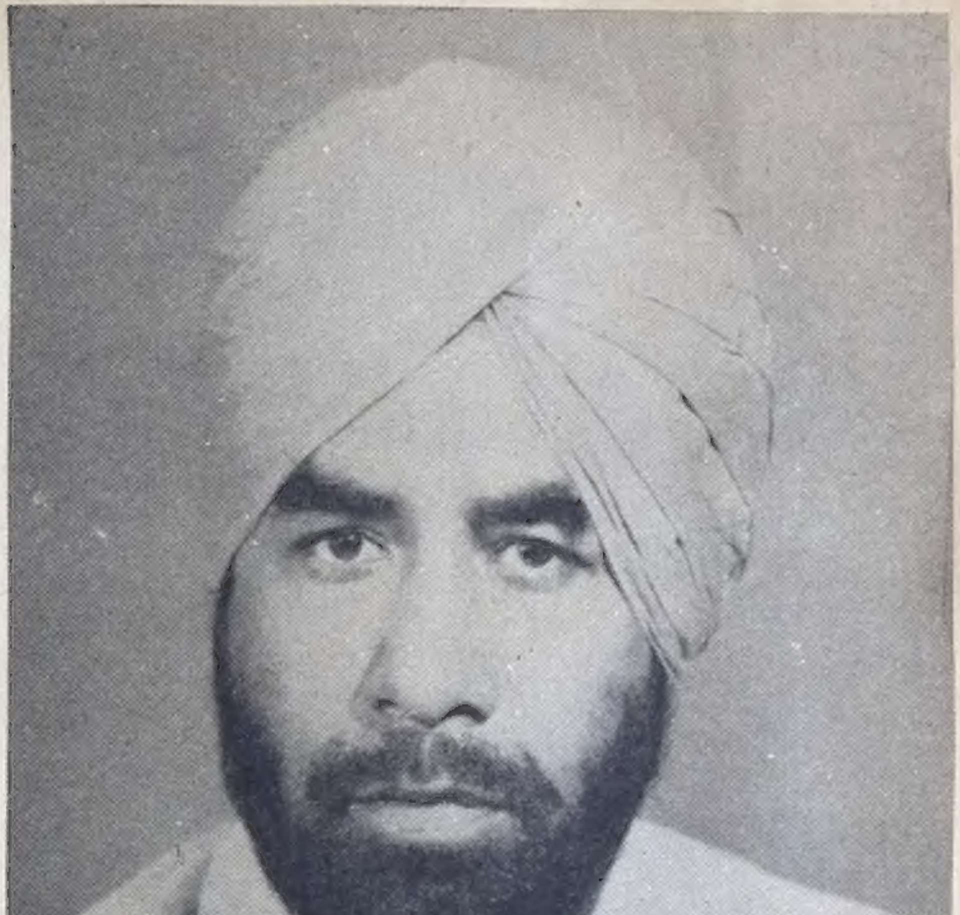
چوتھا دور

پانچواں دور

مقالات

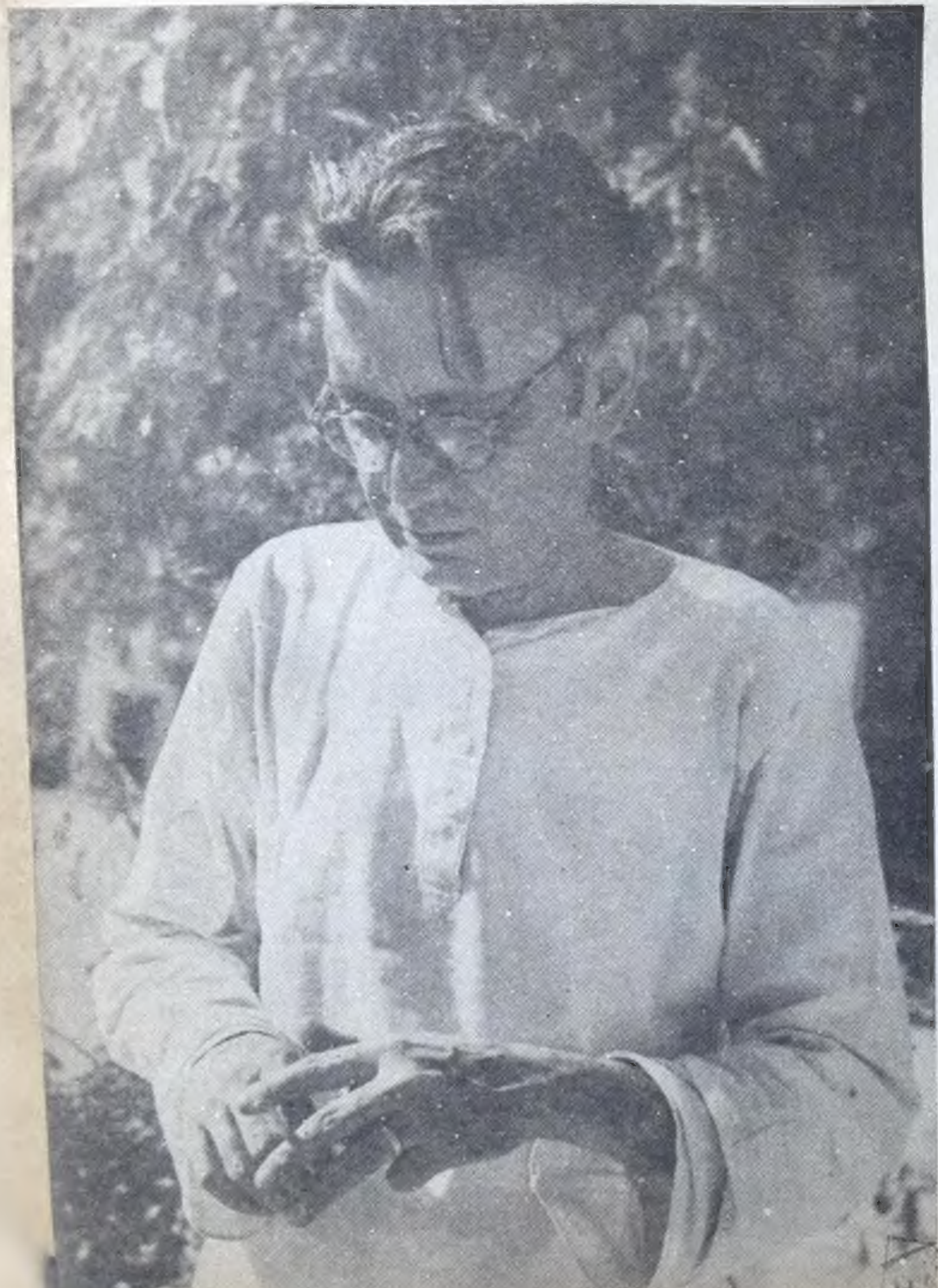


کرشن چندر



راجندر سنگھ بیدی

سعادت حسن منٹو



قرۃ العین





عصمت چغتائی



احمد ندیم قاسمی

غلام عباس





ممتاز مفتی

(۸)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

کرشن چندر

زندگی کے موڑ پر

مسافر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا فیتہ، نیبزن کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا نقرئی کنارہ۔ آنکھ کے نشے کی قمیص اور امرت منتھن کی شلوار، عجیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چھاتی پٹی کو ڈھانپنے کے کام آسکتے ہیں۔ لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہن لیں تو گول گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت، لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لئے تھے اور سوشیلا نے بلی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لئے تھے اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی اور سوچتی کہ جب سہری پور جائیں گے تو لیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا، ہاں، اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی، ارے یہ کیا ہے؟ دیکھ تو بہن یہ لاہور کا نیا فیشن ہے۔ کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے، ہاں کالج میں، اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی، خوب لطف آئے گا ان کی باتیں سن کر، اور لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئن کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے اس کا دل للچا رہا تھا، اب پرکاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی، اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے۔ لمبے لمبے سے، ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اس سے ذرا بڑا طلائی گنبد تھا کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید گوری گردن تک پہنچ جاتے تھے، یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مندر کے منڈر لٹکے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی تو اس کا ہنسنا، اور طلائی گنبدوں کا جھومنا، اور اس کے گالوں کا شہابی ہو جانا، یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں اور وہ سوچتی کیا سوشیلا اور اس کے ناخن، اونہہ! یہ اور بات تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی، بڑی بہن۔ لیکن جب پرکاش چند نے معصوم سے لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی تو لیلا نے جواب دیا "میں کیا کرتی

نا! میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں ہیں۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدّے سے ہیں، کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں؟"

اور سوشیلا نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے نہایت بھول پن سے کہا۔ "بھائی جان! آپ ہماری استانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں۔ بالکل سپید، بے داغ اچھے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں، اور بھاپا جی[1]! پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر؟"

پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے پرکاش چند، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے۔ پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دیئے۔ پرکاش وتی کے لئے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑھی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی۔ "دیکھنا جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو تو اسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دے دینا، اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولہا کو، اور —— بس کافی ہے۔"

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے تو پرکاش کی ماں نے کہا۔ "دیکھنا بیٹا، ڈولی کے وقت میرا خیال ہے کہ بس دولہا دلہن دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا، آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا تو پرکاش وتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیئے تھے، یہی ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا۔" اور کہا "بس کافی ہے، اچھا بیٹا جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

لیکن جب تانگہ بالکل ہی چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرا لیا اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے اور پھر انہیں تینوں کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہئے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہو گی اسی لئے کہتی ہوں، بیٹا یہ دوآبے کے لوگ بڑے تنگ مزاج ہوتے ہیں، ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اٹھا دی، اور سر اٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور ......"

پرکاش نے گھبرا کر کہا۔ "بہت اچھا ماں، بہت اچھا۔"

ریل جا چکی تھی اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا، دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچا دیا، بٹالہ پہنچ کر انہوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی اور آخر انہوں نے اسے رابرٹس پارک کے قریب پا لیا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پرکاش چند سولہ صدی خالص شہری تھا جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گزری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس کے نیچے تین بوسیدہ لاریاں، دائیں طرف رابرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ رابرٹس پارک کے درختوں پر پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اور آک پر اودے اودے پھول آئے ہوئے تھے۔ مٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بڑھا کسان نظر آ رہا تھا اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے آسمان کی طرف تک رہے ہیں کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ پرکاش نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔ "سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا —— "ہاں جناب، کیا کہا آپ نے؟"

---

[1] وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو "بھاپا جی" کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

"میں نے کہا سری پور ——"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا "ہاں جناب! یہیں سے۔" پھر فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا "تشریف رکھئے، ایک روپیہ کرایہ۔"

"کس وقت چلنا ہوگا؟"

"چار بجے، اب کیا وقت ہوگا جناب؟"

"اڑھائی!"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب۔ ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر ہیٹ اتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ سری پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کس کے ہاں؟"

"لالہ کھوری رام کے ہاں!"

"لالہ کھوری رام؟ وہ جن کا بڑی ڈھاب کے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ، وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے چین سے واپس آیا ہے، سنتا ہے وہاں روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آج کل ہونے والی ہے جو......"

"ہاں، ہاں، وہی!"

"میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے؟"

"نہیں۔"

"جی ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ کھوری رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، بڑے نیک آدمی ہیں۔ ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں، کیا بتاؤں جی، ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا کیسا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھا، پہلوان تھا جی پہلوان، ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو ہرا دیا۔ اللہ بخش بھی بڑا تگڑا پہلوان ہے مگر ہار گیا جی! کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا، ضلعداری کا امیدوار تھا، لیکن وہ ہنستے ہنستے ہوئے بیچارے کو کسی نے رات رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلعے میں بہت قتل ہوتے ہیں، قتل اور چالان، ابھی پچھلے مہینے میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں بابو جی، سڑکیں بالکل کچی ہیں، گاڑیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے، یہ لاری میں نے دو سال ہوئے نئی لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان، پہیے، بریکیں، مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بری حالت میں ہے —— او فضل، او فضل، ابے حرامی، اٹھ، دیکھتا کیا ہے، چل اسٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے سورج چھپا جاتا ہے۔ آج رات کو میری شاہ جی کے گھر دعوت ہے۔ سواری ملے نہ ملے دعوت پر تو پہنچنا ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لئے بوجھ سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پہ ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا۔

پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا: "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں، اور یہ بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بتانے میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ جاؤں، مجبوری ہے، اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"

لاری واقعی بھر چکی تھی۔ دوسرے درجے میں جو عورتوں کے لئے تھا، سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی، ان سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا:

"آؤ شاہ جی۔"

"کہاں بیٹھوں؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا "یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے۔" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سُرخ تھا اور چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند قطرے، دونوں ہاتھوں کی چھنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال، کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

"بھائی رجبے!" لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لے کر کہا "میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا، امید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی۔"

رجب علی نے پھر انجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سوشیلا اور لیلا بولیں "بھاپا جی!"

"کیوں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا "بی بی جی! ابھی لاری زور سے چلے گی تو خوب ہوا آئے گی۔"

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پر ڈالی اور ایک سوشیلا اور لیلا پر، پھر بولا "آپ لالہ خوشی رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش وتی کی شادی ہے نا؟"

"جی!" پرکاش بولا۔

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے، ایک بولا "میں نے موجو سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے۔"

دوسرا بولا "موجو خود کہاں کا شریف ٹھہرا؟"

تیسرا کہنے لگا "موجو پھر جاٹ بھائی ہے، لیکن وہ مہاجن ہے، کھتری بھی نہیں۔"

لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا "زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے، بھائی بھائی کا دشمن، اب تو بنج بیوپار کا زمانہ نہیں رہا، ابھی میں راستے میں سیٹھ رنگ مل کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو، سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو ادھار دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہو۔ اِدھر ادھار دیا اُدھر وصولی کے لئے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے۔"

رجب علی آہستہ سے بولا "کم بخت پسٹن کام نہیں کرتا۔"

دوسرے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو دیہاتنیں باتیں کر رہی تھیں "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ تیرہ سال کی عمر میں دوہاگ، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی بے چاری کے بھاگ۔ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دیئے تھے

لیکن کرموں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروّت نکلی . . . . . ."

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے ساتھ کی عورت تنگ آ کر بولی "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں؟"

"میں تو چھاتی دیتی ہوں مگر یہ پیتا ہی نہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔ اُو رر۔ آ۔ آ۔ آ۔ اُس۔ اں۔ اں۔ سو جا میرے لال سو جا۔ ہائے مر جاتو، جان کھائے جاتا ہے۔"

رجب علی گھسیٹا مل کی طرف مڑ کر بولا "پسٹن کام نہیں کرتا شاید۔" لیکن گھسیٹا مل پرکاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا "مالیہ پچاس فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے، چوکیدارہ بند ہو جائے تو سرکار کا کام کیسے چلے؟"

جاٹ بولا "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی۔"

"تم سکھا شاہی چاہتے ہو؟"

"نہیں جٹا شاہی۔" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سنا؟"

"اب بچن کا باپ ٹکراتے ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پُرلطف ہوتی ہے، سادہ اور معصوم، پرکاش نے سوچا کاش مجھے اردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے تو تکڑے سے اس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور لیلا نے پکارا "بھائی جان، پانی، دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا "آگے نہر آئے گی، اس کے قریب ہی ایک کنواں ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی؟"

گھسیٹا رام چونک پڑا "ہاں، جی، کی بیٹی، کیا کہتے ہو، اوہ رجب، میں سو گیا تھا؟"

"ہم کہاں آ پہنچے ہیں؟"

پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور لیلا کو دئے۔

رجب علی بولا "نہر کے قریب لالہ جی۔"

گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا "اوہ بہت پیاس لگی ہے، کنوئیں پر پانی پئیں گے۔"

رجب علی کہنے لگا "میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ نہر کے کنوئیں کا پانی بہت ہی میٹھا اور ٹھنڈا ہے۔"

پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، حدِ نظر تک خشک سے کھیت کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ، لاری آہستہ آہستہ نیم ریتلے میدان میں چل رہی تھی کچی سڑک پر گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا، دھوپ بے حد تیز تھی اور آگ کے شراروں کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، آک کے پھول دھوپ میں بالکل مصنوعی معلوم ہوتے تھے، پیپل کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں لیکن ان کا رکھوالا وہاں نہ تھا. . . . . .

یہ ایک گاؤں تھا، سڑک کے اس طرف دائیں ایک گندے جوہڑ کے قریب سے گزر رہی تھی، ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی، ایک عورت خاکی رنگ کی قمیص اور کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی، ایک لڑکی، سڈول اور سانولی باہوں والی نوجوان لڑکی، ڈنڈے سے چند بھینسے ہوئے

کپڑے کوٹ رہی تھی۔ سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا بڑ نظر آ رہا تھا جس پر ڈاک کے لئے سرخ ڈبہ لٹکا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا۔ اس پر چار سکھ جاٹ ایک بے میلی تاش سے کھیل رہے تھے۔ پھر وہی میدان تھا، وہی رتیلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا۔ زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض "زندگی" کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ، اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا۔ اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی، وہ اس کا ایک رخ دیکھ سکتا تھا۔ ایک جوان جاٹ عورت، گندمی سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخسار دن پر صف باندھ رکھی تھی۔

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہو گیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا "او تو——
تو——لی"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا۔ اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا اور گنگنایا "او تو——لو——لی——او"

جاٹ عورت بیدار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ جب ماں نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم متبسم لب پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے۔ اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی۔ ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ بولی "ہمیں سری پور جانا ہے۔"

رجب علی بولا "اماں، جگہ تو بالکل نہیں۔"

بوڑھی عورت بولی "بیٹا! میں سہارا لے کر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی، ہاں، اگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے۔" رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انہوں نے گانا شروع کر دیا۔

او بنتو——

بنتو دا سر بن ورگا
بنتو دا منہ چن ورگا
بنتو دا لک چیترا

او بنتو——

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی۔ بنتو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے، لیکن اس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل اس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی، جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا۔ بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دئیے اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پل پر سے گزر گئی۔ آگے جا کر ایک کنواں آیا۔ وہاں لاری ٹھہر گئی اور مسافر پانی پینے لگے۔ پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور شیلا اور رسیلا کو پانی پلانے لگا۔ جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے، دیہاتی عورتوں میں، لیکن بچہ بڑا شریر تھا۔ اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا اور پھر مجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جا کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی، اسے سامنے کے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اترتے ہی اس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پہ رکھ لیا اور بچے کو کمر کے خم میں، اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی، گویا کہہ رہی تھی مجھے اچھی طرح دیکھ لو، ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے، میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں، جہاں میرا خاوند اپنی منتو کا انتظار کر رہا ہے، میں کماد کی فصل کاٹوں گی، گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی، اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی کٹھیا لے کر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی، یہی وہ پگڈنڈی ہے جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ اپنے دل میں کہنے لگا "ٹھیک ہے منتو، اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں، یہ سماج کا قصور ہے اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں، بھائی، بہن، خاوند، بیوی، بھانجا، بھتیجی، ماموں، پھوپھی اور خالہ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی، اس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل ہی کہا خدا حافظ، خدا حافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں۔ لیکن اگر ہم انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا۔۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔۔ اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اڑتے جا رہے ہیں۔ نڈر، بے باک، خوش، نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے، ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑتے جا رہے تھے، سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا، ونگیروں پہ پیلے پیلے پھول کھلنے ہوئے تھے مغربی آسمان پہ شفق کی سرخی تھی اور سطح زمین پر ایک سنہری دھند، کیکر کی پتلی، گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک نذہن گھونسلا بن دیا تھا۔

منتو اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی، پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی "چ۔ چ۔ چوں چوں" پرکاش نے اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا دی اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رجب علی بولا، "یہ پسٹن کام نہیں کرتا۔"

محور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے، یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا لیکن اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ ریگ کی لہریں چھا گئیں پھر گیہوں کی رنگ کم ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں، وقت، مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتداد زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں اکثر دکانوں پر حقہ گڑگڑایا جا رہا تھا یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور ادھ موئے سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو رویہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر جہاں لاری کا اڈہ تھا، لالہ خوری رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا، یہ جھیل اس زمانے میں ایک اونچا بند تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا اس قصبہ میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگ کر

کوئی کام نہیں ۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے ۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح' یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے' چاہے چرخہ چلائے، بہر حال چرخہ تاش سے بہتر ہے ۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراستِ طبع کی داد دی ۔ چند ایک لوگوں نے اسے گھور کر دیکھا' سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں ۔ ان کے بھڑکیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذبِ نظر تھے کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے رہے ۔ ایک دکان پر ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اتار کر رکھ رہا تھا' وہ انہیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اتارنا بھول گیا' پھر اس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی' اسے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی اور اس کا چہرہ جیسے کسی الجھن سے فوراً صاف ہو گیا ۔ جب سوشیلا' لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گذرتے تو گاڑی بان بڑے مزے سے گنگنایا ۔

اک بنگلہ بنے نیارا ....

اور پھر بنولے کی بوریاں دکان پر پھینکنے لگا' سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہو گئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے ۔ اس بنگلے کی ہوس نے نہیں بزدل' غلام اور خوشامدی بنا دیا ہے ۔ ایک ہندوستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے ۔ بیوی' بچہ اور بنگلہ ۔ لالہ خوردی رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا ۔ پرکاش چند نے لالہ خوردی رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے ۔ لالہ خوردی رام کا لڑکا بیر بھاگتا اندر سے آیا اور پرکاش چند کے گلے سے لگ گیا ۔ وہ دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے ۔ بیر اب پہلے سے لمبا' مضبوط اور جوان ہو گیا تھا' چین کے دور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے ۔ اس کے لہجے میں خودداری تھی اور بلند حوصلگی اور خود اعتمادی' جب وہ سری پور سے گیا تھا تو بالکل ایک لڑکا سا تھا' چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا اور اب ...... اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصے تک لاہور کے کنویں کا مینڈک بنا رہا' ماحول کا اثر' تن آسانی یا ایک جبلی کمزوری' لالہ خوردی رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں' پھوپھیوں' بھانجیوں' بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا شمار نہ تھا' انہوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں سے سٹریم لائن STREAM LINE سینڈلوں سے لے کر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا ۔ بالاتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور کی میمیں ہیں ۔ سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ ناخنوں پر سرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا جس کی یاقوتی چمک کے آگے حنا کی رنگت ماند ہو گئی تھی ۔ ارے ...... بھی یہ کیا چیز ہے ؟ کہاں سے آتی ہے ؟ بتر' پتہ' پتہ' لکھ دو پتہ' لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا ۔ اس کے طلائی آویزوں کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی ۔ یہ چڑیلیں چیتا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں ۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے مردار بلیاں کہیں کی ۔ اگر مجھے پتہ ہوتا ...... آنگن میں چارپائی پر پرکاش اور بیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ بیر کی ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی اس نے ریشمیں اور پھولدار شلوار پہن رکھی تھی ۔ زعفرانی قمیص اور سر پر سنہری کنارے والا سرخ دوپٹہ تھا ۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں ۔ بیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش جی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا ۔ بیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی اور کسی کی بات بگڑنے نہ پائی ۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر خاندان کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لے کر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہو سکتا ہے وہاں منگل ہونے والے جنگل میں آگ بھی لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر ہوگی اور ایک باہر' اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات بھی یہی ہے کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی' لیکن بیر کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی' اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ ان کے گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا تو وہ خوش ہو کر اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی ۔ پرکاش نے بیر سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے اور بیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رک گیا' کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوار پتے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی' ان کی طرف

جھجکتے ہوئے قدموں سے بڑھی چلی آرہی تھی اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو بیر کے لب کانپنے لگے اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردوں میں چھپا لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا ہو اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دے کر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اوہ یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا "کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، رکے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آجاتے ہیں۔ شاید ابھی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں" دفتر کی بیزنے ابھی اس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا "یہ کون تھی؟"

بیر نے کہا "چین بہت اچھا ملک ہے۔"

پرکاش نے کہا "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی۔"

بیر نے کہا "چین کے لوگ افیم کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی ....."

پرکاش چارپائی سے اٹھ بیٹھا، کہنے لگا "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی۔ ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں کے داؤں ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا یہ شنگھائی نہیں۔ سری پور ہے چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں، ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سُن آؤں۔"

بیر نے کہا "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔"

پرکاش وتی دوسری منزل پر ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہو گی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا، اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا "سُنتی ہو بہن تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔"

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا "تو تو کہتی تھی کہ میں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا، میاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم ایکٹرس بننا چاہتی تھی، اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے جالندھر میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟"

پرکاش وتی نے رو کر کہا "اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں؟"

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اسے پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی، شاید بہنوں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ بُرا کہتے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت طرحدار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو، جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو، جو حسن کی قدر کر سکے، پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی

جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا ہو اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے۔ انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجہ اوّل نہیں لگایا تھا، نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں سکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ یوگ باشششٹ اور استتی باچن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارھویں تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہا ودیالہ میں داخل کرا دیا تھا لیکن شادی کے معاملہ میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر کے اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ امرت سر کے مشہور ساہوکار تھے اور تھوک ہلدی بیچتے تھے۔ ہلدی بیچ بیچ کر انہوں نے امرت سر میں لاکھوں کی جائداد بنالی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈھا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت ہنر شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں، بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن جات کرنے میں ہے، شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر پرکاش کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا "لاکھوں کی جائداد کی مالک بن رہی ہو اور اب یوں آنسو بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کہنے لگی: "مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ ہٹو۔"

پرکاش نے کہا "ہم نہیں ہٹیں گے، کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے ہلدی بیچنے والے کی ہونے والی بیوی! ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ جواب دو گی؟"

پرکاش وتی نے کہا "تم لاکھ بار پوچھو۔ ہم تب بھی نہیں بتائیں گے۔"

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا "دیکھو جب تک تم خود نہ اڑو، اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ یہ زمین تمہیں اڑنے نہ دے گی۔"

پرکاش وتی نے کہا "کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے!"

اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی تھی لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی، یا اپنے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن، اندھی سماج کے قفس میں پر پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے اور پرکاش وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گزر جاؤں۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے میری ہمت بندھ جائے گی۔

پرکاش نے کہا "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔" پھر ہنس کر کہنے لگا: "آخر ایک دکاندار کی بیوی ہو نا؟"

پرکاش وتی نے تیوریاں اوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا: "پرکاش جی کو سائیں جی کے پتا جی بلاتے ہیں۔"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کون ہیں؟"

پرکاش وتی بولی "یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے، پاگل ہے، اس کا باپ پٹواری ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کے پتا جی کہاں ہیں؟"

لڑکے نے کہا: "باہر بیٹھک میں بیر کے پاس بیٹھے ہیں۔"

پرکاش نے کہا: "اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو، کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمہاری۔"

پرکاش وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور بیر نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور بیر کا بچپن کا دوست، لالہ سیتا رام پٹواری، لمبا، دبلا، پتلا، ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے دو اداس سی آنکھیں، ایسی آنکھیں جو اکثر پٹواریوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو تیتن برجیندر، بیر کا بہنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا بوٹا سنگھ قصبے کے سیٹھ کا لڑکا، دھن سیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا اور رام لال، منگت رائے، پھیرو، رامو، ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی، جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں اُلجھی ہوئی، لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط، یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں میں بھگتا دیتے ہیں اور جب گھی میں کچوریاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر حقّے کی مدد کے، تلتے ہی رہتے ہیں اور جب کشاہیاں مانجنے پر آ جائیں تو بڑے بڑے جناوری جھیوروں کو مات کر دیتے ہیں۔ یہ آدمی غریب ہوتے ہیں لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں وہ چاچا، ماموں، تایا کے معزز القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ شادی کے رسم و رواج سے یہ لوگ بہت واقف ہوتے ہیں اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولہا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہئے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو ایک رم پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

برجیندر نے جس سے بیر کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا: "آپ بھا پاجی، لاہور میں کیا کام کرتے ہیں؟"

بھا پاجی؟ پرکاش نے سوچا۔ یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مصر ہیں اور ایک انہی پر ہی کیا موقوف ہے...... اور پھر پرکاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آ گئیں جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی کیفیت کا جس سے ادھیڑپن ٹپکتا تھا۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرلے خیالات کی یاد بہت تلخ تھی جس نے اسے قبل از وقت معمّر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے بکھیڑوں نے اس کی روح کو کچل دیا تھا اور اس کے ضمیر اور اس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی کشمکش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل جائے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفان ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک ٹھٹھری ہوئی لاش، اس لئے اب جب کوئی اسے بھا پاجی کہہ دیتا تو اسے چنداں حیرت نہ ہوتی اور وہ اپنے دل کی اُداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا جس نے ایک لمحے میں اسے بڑا بھائی کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا: "میں کوآپریٹو بنک میں کلرک ہوں۔"

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"پچھتر روپے!"

"پچھتر روپے؟" پٹواری نے کہا۔ "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب!"

"جی! آپ کی عنایت ہے۔"

بڈھا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنسنا بہت بُرا لگا لیکن اس ہنسنے میں کوئی بُرائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا جس میں پرکاش کی برقانی نگاہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بڈھا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا: "پٹواری جی! کوئی گیت سنائیے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں سے پوچھا: "کیا تمہیں گیت بھی یاد ہیں؟"

پٹواری نے بڈھا سنگھ سے کہا: "بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اُداس آنکھوں کی اداسی کو دیکھ کر کہا: "بیشک تمہیں گانا آتا ہے۔ تمہیں کئی گیت یاد ہوں گے، کئی گیت، جو تمہاری اُداسی نے خود بنائے، جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری رُوح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے، لیکن کیا ہوا تمہیں؟ یہ اُداسی تم نے کہاں سے پائی؟"

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سُن لی، کہنے لگا: "بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

چاچا پھیرو نے حقہ آگے کر کے کہا: "حقہ پیجئے لالہ جی۔ ذرا دیکھئے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا: "لالہ جی! سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔"

"عجیب؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا: "وہ تو پاگل ہے جی، کیا بتاؤں! اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اول جلول بکنے لگتا ہے، ہمارے ہاں مسلمان تو اسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر! اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان بھی جسے چٹکی اٹھا کر دے دیتا ہے ایشور کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"سچ؟"

چونی لال نے کہا: "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا۔ حکیم صاحب نے بہتیری کوشش کی، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا میں اسے بلا لایا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا: "بھائی اچھا ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی فکر نہیں — اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا۔"

"کمال ہے۔" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا: "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے۔ اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ جب ڈپٹی صاحب کا لڑکا قتل ہونے کو تھا اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔" پرکاش نے کہا۔

پٹواری بولا: "اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے، وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا۔ کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا۔ لیکن بھگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرا بھائی آئے گا۔ پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ اسے

بہرے کر نہ پھرنا اور نہ اسے کوٹھے پر لے جانا،' اس کی ماں نے ایسا ہی کیا۔"

رحمن سیاں نے بات پوری کرتے ہوئے کہا "ہاں' اسی دن وہ چھوٹے چھوٹے لڑکے کوٹھوں پر گر کر مر گئے۔"

جِراری نے کہا "اور وہ چھوٹا بچہ بیمار ہوا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کم بخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات' وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے' سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو رہا تھا اور سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

بزار وکیندا لاچا

مٹی نہ پھرول جوگیا

مٹی نہ ڈول جوگیا

تیرا لبھنا نئیں لال گواچا

مٹی نہ پھرول جوگیا

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا "لے گئے لے گئے میرے بھائی کو لے گئے۔" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ہائے میرا بچہ مُردہ اور بے جان پڑا ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں یم راج کے دوت اٹھا کر لے گئے تھے ...."

شام کے وقت بیر کا بہنوئی برجندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے کو گئے۔ ریتلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اُگے ہوئے تھے اور ان سے نیچے اتر کر کھیت تھے لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی' اس لئے بالکل روکھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اُگ رہے تھے اور کہیں کہیں کٹر دے کسیلے بیروں کی جھاڑیاں' مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلاتے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوا رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اٹھتا اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا۔ جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناک ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ پرکاش نے برجندر کی طرف دیکھا لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے باتیں کئے جاتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے کہنے لگا "بھائی صاحب آپ ذرا بیر کو سمجھائیں نا۔"

"کیوں' کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھدار ہے' کماؤ بھی ہے لیکن روپے کی قدر نہیں کرتا۔"

"وہ کس طرح' میرے خیال میں تو ......"

برجندر نے بات کاٹ کر کہا "آپ نہیں جانتے۔ اول تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ یہ بات اچھی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ پانسو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے۔ آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انہیں کا کہنا نہ مانے تو اس سے

بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا۔"

"بے شک، بے شک!" پرکاش نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجئے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے اور اس سال بیاہ بھی رچے لیکن اسے دیکھیے یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ بسا کھامل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے، گھر کے کام کاج سے واقف، سوشیل، سمجھدار، سینا پرونا جانتی ہے، خط پڑھ لیتی ہے، ماں باپ بھائی بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے۔ پرانا خاندان ہے۔ امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے لڑکی ٹھنگنی ہے سانولا رنگ ہے، آواز بھاری ہے اور اپنی طرف نگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مَس رکھتی ہو۔ سنیما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ اسے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو۔ گیارھویں پاس کر کے بھی کیا بنا۔ تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح جانے۔ اب ہم اسے کسی بے کار گریجویٹ کے پلّے باندھ دیتے تو بے چاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے، وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی لیکن اب ہیرو کو کون سمجھائے۔ ہم نے سوچا ہیرو آپ کا کہا مانتا ہے آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہ راست پہ لے آئیں تاکہ گھر برباد نہ ہو۔"

اور پرکاش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہو گی۔ کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے، اور پھر ہیرو تو منگھائی کے کابرے COBRET بھی دیکھ چکا ہے اور شاید اسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے لیکن برجندر نے کہا "نہیں۔ آپ ضرور کوشش کریں، میری خاطر سے۔" اور پرکاش نے کہا "اچھا میں آپ کی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔" برجندر نے کہا "جی نہیں، یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اگر چاہیں تو اسے سمجھا سکتے ہیں۔" بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجندر رواتن کرتے کرتے کبھی کبھی زور سے کھنکھار دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آ گئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے سہمے ہوئے سے تھے، عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں نا امیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا یہ میرا خیال ہی ہے، میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں، عام کسانوں کے، ان کے دلوں میں طمانیت ہے، صبر ہے، یقین ہے، شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے، روح کا پرتو ہے، شام کے سناٹے، پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اونچی اونچی آوازوں میں گالیاں دینے لگے۔ پرکاش اور برجندر اٹھ کر اس گروہ کے قریب جا پہنچے۔ برجندر نے پوچھا "کیوں جھگڑتے ہو بھئی؟ کیا بات ہے؟"

ایک ملاح نے کہا "شاہ جی! بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔ یہ دوسرے کنارے پر صبح سے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اتارتا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو۔ ہمیں بیاس پار کرا دو۔ ہم نے کہا اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمہیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آ کر یہ

کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس —— آپ خود گن لیجئے۔"

کسانوں نے کہا، "ہم غریب ہیں، ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں، ہم پر دیا کرو۔"

بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

ایک ملاح نے کہا، "اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ دیئے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا، "بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں، آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان! ہم نے ایسی بپتا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں —— ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟"

برجندر نے کہا، "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال نون سب کچھ دیں گے۔"

بوڑھا کسان بولا، "پرماتما تمہارا بھلا کرے۔"

ایک بوڑھی عورت بولی، "اری لاٹیا! جا سرکنڈے، گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری بنتو! لحاف اور چٹائیاں چھپرے سے اتار کر ادھر لے آ۔ ارے سادھو! اکم بخت کدھر بھاگ گیا تو....."

لاٹیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی.....

دریا سے واپس آ کر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا اور اب وہ ایک بڑی سی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا سا دیا۔ 'برات آئے گی' یہ بھی سب جانتے تھے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب یہ واہمہ دور ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا بھیرو جو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور سینتالیس برس گزر جانے پر بھی مجرد تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے تاکہ کل کے لئے بٹالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں۔ جگت رام نے اور برجندر کو برات گھر کی صفائی کروانے، برات گھر سجانے اور براتیوں کے لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ تیرا اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر ادھر گھومنے اور چیروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا، بیٹھک میں اب صرف پرکاش، چونی لال اور بڑنا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آ رہی تھیں یا باہر جا رہی تھیں۔ ریشمیں لباس، سرسراتی ہوئی قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ چنریاں جن پر منقش کے لہریئے تھے۔ پھر کبھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حسن، جس میں رعنائی اور برہمنی کی بجائے جوانی اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور بڑنا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ فیشن کے بادامی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مروارید کے سندر لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی جھینپنا

کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے بےاختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دونوں نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی جس نے بیر کر اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔ پرکاش نے پوچھا: "وہ کون ہے؟"

"وہ کون؟" چونی لال نے پوچھا۔

"وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور ....."

چونی لال نے کہا: "وہ! ..... وہ مس اوورسیئر ہے۔" اور یہ کہہ کر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اوورسیئر؟"

"ہاں، ہاں!" بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا: "اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیئر ہے نا۔"

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا: "میں نے سُنا ہے کہ اوورسیئر کی تبدیلی جالندھر ہو گئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے ......"

"سچ مچ؟"

"ہاں! مجھے آج ہی پتہ لگا ہے، ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سُن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گذر جائے گی۔"

"نہیں، نہیں ..... آہ بے چارہ!" اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا، یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بےتربیت ہیں، بالکل دیہاتی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔ آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا اور کم سن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر رکھی تھی ......

کتنے گیوں! پردیسیا رے!

ٹھک، ٹھک، ٹھک، ٹھک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس دیس کے گیت سُنے تھے۔ بلّوریں چشموں کے کنارے نیلی آنکھوں والی چیرا، ہنسوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنوں پر گیت، جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اُداسی میں گائے گئے، جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت ..... لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سُروں میں لرزنے لگتا، اور کبھی اس کی گویائی کی حِس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمے کے الجھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اُٹھتا۔ لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنا دیا تھا، جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور بڑا ہونے پر اسے بےقرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا رازدار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بےقرار تھا، یہ اچھا ہے۔ پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اُٹھ گئی، انسانیت بھی فنا ہو جائے گی......

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کر دیا تھا۔

او منہوں لکھنا!

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حساس اور درد مند دل چاہئے۔ جوانی کی بے قرار روح نسائیت اور شباب، اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی، جس کے سر پہ سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا، اور جس کی سبز قمیص پر نقرئی فیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

ٹک ٹک، ٹک ٹک، پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹک ٹک، ٹک ٹک، اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے ہیر اور بس اور بیٹر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ ہیر کا چہرہ سفید تھا اور بس اور بیٹر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ ہیر نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان! میں بھی اوپر آ رہا ہوں۔ ابھی.... دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولہا بھائی کی آمد کے قصے سنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرأت سے کام لے کر اسے اپنے نسوانی مزاح کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں ہیر آ گیا اور آ کر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا، اس کا چہرہ سپید اور سُتا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش اور پرکاش وتی دونوں جلد جلد ہیر کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ ہیر کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی: "ماتھا گرم ہے۔"

پرکاش نے پوچھا: "کیا بات ہے ہیر؟"

ہیر نے رکتے رکتے کہا: "اُف..... کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پرکاش نے کہا: "پانی، پانی۔"

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا: "پانی، پانی۔"

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا: "پانی، پانی۔"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی۔ ہیر کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ ہیر نے تھوڑا سا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے، کسی نے پاؤں، کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو، ہوا لگ جائے گی، کسی نے کہا کھڑکی کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ، چڑھ گیا۔ دوسری پھوپھی جان بولیں: "اے ہے، کہاں ہے ہیر کی ماں؟ ہیر کی ماں!"

ہیر کی ماں بولیں: "میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔"

ہیر کی ماں نیچے سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگ کر اس کے پیچھے دوڑیں "ارے..... ارے..... میں کہتی ہوں ہیر کی ماں، اس کے تو ہاتھ پاؤں [illegible] کاسنی پھل منگواؤ۔ تاکہ پیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔ اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔" ہیر نے لاکھ انکار کیا [illegible] دم گھٹا جا رہا تھا اور اب وہ بھی نہیں گھٹتا تھا۔ اب اسے آرام تھا، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور اسے آرام سے لیٹے رہنے

کر کہا۔ ناچار ہیرؔ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور و غل کرنے ہیرؔ کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کافی پھل کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جماعت میں جاگئی اور وہ اسے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً ہیرؔ نے آنکھیں کھول کر کہا:

"ہائے بھاپا جی!"

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا "چین کیسا ملک ہے؟"

ہیرؔ نے کہا "ہائے میں مر جاؤں گا اب کیا ہوگا ان کی تبدیلی ہوگئی ہے۔"

پرکاش چند نے کہا "سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کاربرے ہیں اور بنگلو چینی عورتیں . . . ."

ہیرؔ نے کہا "میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا "اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

ہیرؔ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "ہائے بھاپا جی۔ ہائے بھاپا جی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا . . . . ."

پرکاش نے کہا "مجھے سب پتہ ہے" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سرخ تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے ہیرؔ کی ماں سے کہہ کہہ کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوالی تھی تاکہ آرام سے سو سکے۔ ہیرؔ کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا تھا "بیٹا شادی نہیں دیکھو گے؟" اور پرکاش نے ہیرؔ کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال، دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آ گئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا "بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوالی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھئے۔"

پرکاش نے برا سا منہ بنا کر کہا "میں سونا چاہتا ہوں۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا "تو۔ سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی؟"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا "اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟ . . . . . ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نو وارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟ . . . . لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہئے۔ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دبلے پتلے لمبے قد کے آدمی،

وہ اس دن بیٹھک میں حقّہ پی رہے تھے، نیلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی، رخساروں پر پرچھائیاں۔"

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں اور تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بیچارے مجرّد تھے ابھی تک۔ عمر چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا تھا۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دمن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارک دے کر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے۔ اگرچہ مونچھیں بدستور رسیلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ادھر ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا "ہم دریا پر گئے تھے جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور و غل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لاڈیا، میری جوان اور سندر لاڈیا، پتہ چلا کہ بوڑھے کسان نے دو سو روپے کے عوض لاڈیا کو چاچا پھیرو کے حوالے کر دیا تھا۔ پیٹ بری بلا ہے اور اب وہ بے وقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے۔ گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے۔"

بوٹا سنگھ بولا: "چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔"

دمن سیال نے کہا: "دیکھئے بھائی صاحب! اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا پھیرو نے کہا ہے، اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ ہم نے کسی آدمی کو یہ بات بتا دی ہے تو پھر وہ عمر بھر ہم سے سیدھے منہ بات نہیں کریں گے، اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی لال نے کہا "آؤ بابا جی ذرا بارات گھر میں باراتیوں کے درشن کر لیں اور ان کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کر لیں۔ بیچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے ..... کہیں انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی۔"

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں، آج شادی کی رات تھی۔ ابھی ابھی ان لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور ہیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں، "سروارنا" کیا تھا اور چاندی کی چونیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں۔ دولہا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا، بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی، وہی تلخی، وہی سختی، اور سہرے کے زریں تار اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی، ہونٹ موٹے اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے وہ ادھر ادھر اس طرح گھما رہا تھا جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی چالاکی اور بنیا پن تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے رشتہ دار تھے جن کے چہرے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے، گانٹھیں چاہے کتنی ہی نکل جائیں...... "ملنی" کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے ملے تھے۔ چاندی کے گلاب دانوں میں

بنا ہوا معطر پانی ایک دوسرے پر چھڑکا گیا تھا۔ ہیجڑوں، بھانڈوں اور میراسیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گداگروں کے بے نفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کئے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹوں پر بیٹھ۔ گڑگڑا کر درکندی دریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لوٹا جا سکے۔ پیسوں کے نچھاور ہوتے ہی چھنے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ نفیری جس کی چھاتی سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا اور میراسی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی اور اب بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا...... کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی۔ وہ چپ چاپ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں لکڑی کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لگائے گئے تھے اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر آدم کے قصے اور گائتری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے اوپر چاندنی لگائی گئی تھی اور فرش پر لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش نے پرکاش وتی سے کہا: "آج تمہارا بیاہ ہے، دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آ جائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیوداسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچنا ہوگا۔ اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو۔ کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجے میں کہا: "نہیں۔ میں آج ذبح کی جاؤں گی...... خبر نہیں، پڑھا کر سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہو گی۔ لیکن میں سوچتی ہوں کیا مجھے اسی لئے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا.. میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں...... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا: "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی؟"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

پرکاش نے پرکاش وتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا: "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیو گی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے، اور ایک موٹر کار۔ یہ لکیر تمہاری شاعری کی تھی لیکن یہاں آ کر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہو گی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس برس سے صاف ظاہر ہے لیکن اس کے علاوہ وہ تمہیں ہر سال نئے بھدے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی اور......"

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا: "ہٹو بھی۔ ہر وقت بے ہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا: "معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خاموش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رتجگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جاتی تھیں اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے، نائنیں شربت پلاتی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے پاس قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر رتجگے کا نظارہ کر رہے تھے کئی لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی۔ کیونکہ جسم مر چکا تھا لیکن حرص تیز ہو گئی تھی اور حقہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ رہی تھی ——— شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا، اور اب سب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے، پرکاش نے سوچا کیسی بے انصافی ہے! ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دیئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے چہرے لے کر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا: "لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے؟" اور رتجگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت فحش، لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں باپ، بہنوں بھائیوں، بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ وہ کرو، یہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھی سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گذر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا:

ہائے برجندر دے تیری ماسی
اوہنوں لے گیا اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی
دھب، دھب، دھب، دھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ پلائی، تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے۔ اگر گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے۔ اور پرکاش نے سوچا

کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لے جائے اک سنیاسی آخر ایک سنیاسی کیوں؟ ایک سنار یا چمار کیوں نہیں؟ اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوتش سے ان کے مستقبل کو روشن اور دلکش بناتے ہیں، کایا کلپ کرتے ہیں، مکتی دلاتے ہیں اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں۔ اس لئے ماسی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر شریف اور چھپائے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا آج وہی گناہ اُبل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لَے میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سُن رہے تھے جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے جنس کی بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ بلبل کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑکیاں، باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی تھی۔ زندگی غیر محدود تھی، عشق تازہ اور شباب زندہ تھا لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے، آنکھیں موند لے، اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنا لے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے۔ اب گیت ہلکے ہو رہے تھے ...... دولہا جائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے ...... پرکاش وتی اور دولہا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے گھی کا مزا چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے ...... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا ...... پرکاش وتی اور دولہا خوشنما اور شباب بیدی کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ایک ...... دو ...... تین ...... چار ...... پانچ ...... چھ ...... سات ......

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آگئی تھی لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے اردگرد بہت سی عورتیں سوتی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مُرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے اردگرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سمٹے ہوئے لیٹے تھے۔ سوشیلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بیر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک پچرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہوا تھا۔ ماتھے پر سُرخ بندی۔ اسے اس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے۔ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو کلٹی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گزرا۔ اس کے چاروں طرف دہکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے، کسی کی چھاتیاں، کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے کناروں پر۔ کسی کی ٹانگیں سکڑی ہوئیں، کسی کی پھیلی ہوئیں، کسی کی سانس میں خراٹے تھے ...... کسی کی آنکھیں نیم وا ...... ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سنہری تار اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، کیلے کے پتے مُرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی۔ شعلوں نے قربانی لے

لی تھی اور اب خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازے کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرشِ زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حُسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے جھینگے ابھی تک بین بجائے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ گُٹرگوں گُٹرگوں رٹ رہا تھا۔ بیری کی جھاڑیوں پر گھاس کے ٹڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدورا کے مندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس میں ہزاروں ننھے ننھے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے۔ پھر دور کہیں اس نے رہٹ کے چلنے کی روں روں سنی اور پورب میں حدِ افق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا، اس کے پائجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیلا پرتو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آ جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے پر گذرنے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا، اس کے عنبر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزا چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی، لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر سے ٹلے اور گلہریوں کی دُمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپتے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے، دور ایک اونچی منڈیر پر ایک مور کھڑا تھا اور وہ اپنے دلکش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی!

اس رنگین، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں، اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید۔۔۔۔ مور کے چھتر پر مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی۔۔۔۔ آسمانی۔۔۔۔ دھانی، خوشیاں۔۔۔۔ غم۔۔۔۔ زندگیاں۔۔۔۔ پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائے گی، یہاں تک کہ انسانی زندگی، اس کی تہذیب، تمدن، اس کے عالی محل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغموم ہو جائے گی لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی۔۔۔۔ ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا، بیری کی پتیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح۔۔۔۔ یکایک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اُجالا ہی اُجالا ہو گیا۔ زمین کا رقص رک گیا۔۔۔ پپیہے کی پی پی بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رک گیا اور کہنے لگا۔ ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟۔۔۔۔ وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چمکاتی ہوئی آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہو گئی۔۔۔۔ ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر سستاتا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں۔ آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں اور ہرے بھرے طوطے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی ہے۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور اسے سنتا گیا۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ بے مطلب، بے معنی۔۔۔۔ منبع نامعلوم۔۔۔۔ منزل ناپید۔۔۔۔ اب وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔ روں۔۔۔۔

سعادت حسن منٹو

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبّرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں۔"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقّہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقّے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکّرانہ لہجے میں کہا ——

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے —— اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی "یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آ جائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"......... ..." یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں ...."

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی..... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے ـــــ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا ـــــ

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں، اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے ـــــ

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ـــــ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کرکے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا۔ چل ـــــ ذرا ہوا سے باتیں کرکے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی، اور مونچھوں کو

مُنہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "بہت تیری ایسی کی تیسی"۔

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی "...... غریبوں کی کُٹیا میں گھُسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا"۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ——— سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں"۔

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے...... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا"۔

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں، وہ انہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں، یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے، تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ———

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے، اس سے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور

یہ کہ وہ شریف آدمی اور ٹوڈی بچے میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا ——

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں، اگر ..... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں"

"وہ بے کار گریجوایٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہو گی"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو "نیا قانون ...!" اور وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں، اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی —— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی —— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ..... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا ———

"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چکنی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ———

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ——— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ——— جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں پرانے کرائے پر تانگہ نہ چلانے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلوم ہُوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک 'گورا' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا، ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا —

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس گورے کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے داہنے ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا، اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی، اُسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی۔"

"مگر یہ پانچ روپے ہیں۔" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا۔ "پانچ روپے۔ کیا تم ——؟"

"ہاں ہاں پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین دفعہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پستہ قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا ——

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں   پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— اب ہمارا راج ہے بچہ؟"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ——

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے ——— اب نیا قانون ہے میاں —— نیا قانون!"

اور بے چارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

رُوپ، شبو، کتھو اور منّا ——— ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیئے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے، گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل رسیا پیار سے چاندرانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد تھا، گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ——— پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے، وہ سی نہ سکتی تھی ——— منہ سلا بچہ پیدا ہو گا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ——— اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے، اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبہ سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہرپھول بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چوکا، برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ رسیا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیے، ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب، فراخ نتھنوں والی ہٹیلی رسیا اپنی بوسیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبرِ اعظم کی متوقع ہے۔ چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی ——— دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی، پھر جانوروں کے لیے بنولے، کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ حتیٰ کہ اس کے کولہے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر رسیا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا پہ

تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی ریتا اور کاشتھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک پرشکم کتیا کی طرح، ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جاتی لیٹی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے دوزخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ پٹیل کی بیٹی ہے، وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ پٹیل سارنگ ولوگرام کا ایک متمول ساہوکار تھا۔ دیانگ پرگرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کاشتھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ کاشتھوں کو تو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کاشتھ ہی کل وہو رگی کو بڑھانے والی ——— بہو، کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لئے اسے حمل کے شروع میں چاٹ اور راب بھل آزادانہ دئے جاتے تھے۔

"دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے۔" ہولی سوچتی تھی" اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں برے ہیں اور بڑے کاشتھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ .... رسیلا کی تو بات ہی دوسری ہے، شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا! ...... لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور تیا کی تو بات ہی علیحدہ ہے ——— شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی ......"

...... راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دئے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں ...... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سا راکشس، شیر پہ چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر لگتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ برتا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا ——— کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا برت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے تیا آئی اور آتے ہی بولی:

"بہو .... اناج رکھا ہے کیا؟"

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی: "ہاں ہاں ..... رکھا ہے ——— نہیں رکھا، یاد آیا! بھول گئی تھی تیا ....."

"تو بیٹھی کر کیا رہی ہے نواب جادی؟"

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی: "جی! مجھ سے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟"

تیا لاجواب ہو گئی۔ اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پرواہ تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی:

"تم نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ ——— رانڈ، جانتی بھی ہے آج گہن ہے جو بچہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بھیسوا اسے مانے چلے گی؟"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ یہ سب ہو جاتے، لیکن ماں کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میا اور بھی بھکتی جابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سرسوں کے تیل کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے جابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پُرسوز نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھیڑا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آواز دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا:

"میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کاہے کی تھی؟"

"جلدی کیسی؟"

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہی..... تم بھی تو کب ہو کہتا:"

ہولی سہم کر بولی "تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، بوس ناک سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی، رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔

اس وقت میا ماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی۔ بہت سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا۔ البتہ میا کی اس عادت سے جل بھن گئی ——— "رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی زیادہ، اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے....."

ہولی سوچتی تھی کل رسیلے نے مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دے دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے، کیوں گالیاں دیتا ہے، میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ دکھائی نہیں دیتا........ اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد......!

میا نے کچھ باجرہ، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا یہ میا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باسمتی چاول ہنڈیے میں چپٹ گئے تو بڑبڑاتی ہوئی بےصبر ہو گئی اور آپ اتنی گھبرا کر اپنے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی:

"لے، دھو ڈال"

اب ہولی نہیں جانتی بچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے، ہلے یا نہ ہلے، وہ کتیا ہے یا نایاب جادو۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زیر میں داخل ہونے والا ہی ہو گا۔ بچہ جھلسے ہوئے کپڑے کی طرح چُرمُر سا پیدا ہو گا اور اگر بعد ازاں بچے کا بُرا سا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟ .... لیکن قصور اور بے قصوری کی تو بات ہی علیحدہ ہے۔ کیونکہ یہ کوئی شخص کہنے کو تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے ——— سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آ گیا، جس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی، اور جلتی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر ماتا کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں ———

ماہندی[1] تو ادی مالوے   اینو رنگ گیو گجرات رے

ماہندی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اُلجھنے کو دنے والی الھڑ چھوکری تھی، ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ نہاب جادو تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں ——— وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

. . . . سارنگ ویوگرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تردیدی گھاٹ پر اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں۔ پھول، ناریل، بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے . . . . . . ایک سال بعد پھر لوگ دھکے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گنا جاتے ہیں، پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک و صاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے، ناقوس، سنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جھگھٹے کی صورت میں گاتے بجاتے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگوٹے جیسا کھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو دان دیتا ہے تا کہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے پکارتے ہیں چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے ——— چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرے میں آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے کالستے کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندر کی طرف اشنان کے لئے چلی۔

اب ریمی، رسیلا، جمالا کا شبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے، گجرے تھے اور آم کے پتے اور ہولی کے ہاتھ میں روورکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی تا کہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی ——— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے فاصلے پر ایک ٹوٹا پھوٹا تکڑا تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروبِ آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے خلاف ننھے ننھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک بجلی کی ٹمٹاتی ہوئی روشنی سیماب وار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی کی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رستے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیم لانچ کی آخری سیٹی تھی ——— پھر وہ سارنگ ویوگرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا

---

[1] ماہندی (حنا)؛ تو مالوہ ——— وسط ہند میں پیدا ہوئی۔ اس کی گجرات تک پہنچا ہوا ہے۔ گر یہاں سے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

کلس دکھائی دینے لگیں ...... اور پھر وہی اماں .... کنوارپن اور گر بانچ!

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آ چکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے ...... اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پُر اسرار، بعید الفہم طاقت ہے ـــــ اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا ـــــ دھوتی پیچھے کی طرف ڈھلک جاتی تھی ...... آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں ـــــ سارنگ دیوگرام کے سامنے ...... وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹنڈیل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں ...... پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا ـــــ مرغی ...... روپے ...... چابیاں میرے پاس ہیں ...... پانی زیادہ ہوگا ......

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا عین جبکہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیوگرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور رسیلے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سابرمتی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا اور کچھ دلیری سے بولی:

"کتھو رام!"

کتھو رام نے بھی میتل کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا ـــــ

کتھو رام بولا:

"ہولے!"

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "کتھو بھیا ...... مجھے سارنگ دیوگرام پہنچا دو ......"

کتھو رام قریب آیا اور ایک ٹنڈیل کو گھورتے ہوئے بولا:

"سارنگ دیو جاؤ گی ہولے؟" اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا: "تم لے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟"

ٹنڈیل جو سب سے قریب تھا بولا:

"بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

کتھو رام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ٹاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا:

"ہولے ...... کیا تم اساڑھ میں سے بھاگ آئی ہو؟"

"ہاں۔"

"یہ سرپھرا جادیوں کا کام ہے؟ ...... اور جو میں کانسٹبلوں کو خبر کر دوں تو؟"

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو نباب جادی تھی اور نہ سرپھرا جادی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کٹھورام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس نے سامنے لانچ کے رسے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ بٹ دیوگرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کٹھورام بولا "ڈرو نہیں ہولے ...... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹتے چلیں گے۔ لیکن گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔"

کٹھورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کٹھورام اور اس کی ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کٹھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا "یہ کون ہیں؟"

کٹھورام نے آہستہ سے جواب دیا "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کٹھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کٹھورام آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی ....

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا شگن کا فور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی بہتی گئی —— دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر کی طرف ...... جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی ..... پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ، بگٹٹ .... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی ...... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔ ...... دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے ...... چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اسارتھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں ——

دان کا وقت ہے ....

چھوڑ دو ...... چھوڑ دو ..... چھوڑ دو ......

ہر پھول بندر سے آواز آئی ——

پکڑ لو ...... پکڑ لو ...... پکڑ لو ......

....

چھوڑ دو ...... دان کا وقت ہے ...... پکڑ لو ...... چھوڑ دو!!

——

عصمت چغتائی

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں، جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منّی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دُبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملے میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھونٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی۔ جبھی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول

کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو! اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے چھپاچھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے، نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے، کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا ——
گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس شبنمی دوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلے کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی، پر بچوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا! لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہے لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقے کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم سے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر   ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں

بل بل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ٹھٹے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آکر انہیں سہارا دیتیں، پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ" اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اوپر سے چکنائی۔ بلغم نہ پیدا کر دے گی؟ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر؟"

اور سب ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی، کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آ سکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپئے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سوئیوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں!" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی، "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اوٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے، اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا، پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار، چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چیچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سویٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کسنے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے۔" بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔

"اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔" بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو۔ مگر ......" میں لاجواب ہو گئی اور پھر سکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار

مسکرا پڑیں، چپکے سے بولیں:

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجئے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خاصی آنکھیں ہیں۔

"جا کلموہی ماری، اری دیکھ تو سہی وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، لٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموشی سے کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہئے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

"بتائیے نا؟"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹہوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے، مزیدار ہی ہوں گے۔"

"اے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں، دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے:

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں، گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسائیں، میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی ٹھنسائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے

بہانے سے اور ساتھ ساتھ جگت بازی!! میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ نتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولہے کی اڑتی ہوئی راکھ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔

"اونہہ!" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں' پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں۔۔۔۔۔ اوہ نہیں۔۔۔۔۔ کھا نہیں لوں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں' پانی بھرتے ہیں' پیاز کاٹتے ہیں' بستر بچھاتے ہیں' جوتے صاف کرتے ہیں' یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو۔۔۔۔۔ مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ۔۔۔۔۔"

"اری چپ مردار!" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سویٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سویٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سویٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی! تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سویٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:

"کیا یہ سویٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے! مٹی کے تودے۔ یہ سویٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں' یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے

منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرا نہ دکھا سکیں گے' انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا' انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولھے کی آنچ سہتے ہیں، تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو، محنت نے ان میں زخم ڈال دئے ہیں' ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھوک اور کال کی باتیں، دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

”یہ سویٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟“

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پہ جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

”وہ بولے؟“ ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔“ میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

”کیوں؟“ وہ مسکرائیں۔

”مجھے اچھے نہیں لگتے ...... دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہوگئیں۔“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

”بڑے شریر ہیں۔“ انہوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

”بی آپا ..... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔“ میں نے سُلگ کر کہا۔ ”آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔“

”کیا ہوا؟“ بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔“

”راحت نے توڑ ڈالیں؟“ بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

”ہاں!“

”خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔“ پھر چمکار کر بولیں ”خیر تو بھی چوتھی میں بدلے لیجیو، وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

”اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔“

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیوں نے چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا

کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرا دو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بہن جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکا دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوار پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے، ورنہ ان کے گھر ہی سے پیام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تنور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تنور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں، دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے......

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے، بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا جا رہا ہے...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے...... حمیدہ کا گلا بھر آیا......

"جاؤ نا میری بہنو" بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ...... یہ ملیدہ" اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا...... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پھر پہاڑ کھسکا...... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا...... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلے

بہن بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سویٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں، انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں، کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا، بائیں ابرو پھڑک رہی تھی، گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا، اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر ..... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکا بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سہاجوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

———

احمد علی

ہماری گلی

(احمد علی کا ایک افسانہ "مہاولیں کی ایک رات" اس سے پہلے بھی پیش کیا گیا ہے لیکن وہ افسانہ ان کے فن کی نمائندگی نہیں کرتا۔ پہلے افسانے کی شمولیت سے محض ایک وقتی رجحان کی نشان دہی مقصود ہے۔

(مرتب)

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازے کے برابر صدیق بنئے کی اور اس کے برابر عزیز خراوی کی اور آس پاس کمہاروں کی دکانیں، عطار کی دکان، پان والے کی، اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی، بساطی کی، حلوائی کی دکان۔ ہمارے محلے میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی اور اس طرح کے لوگ راستہ بچانے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے۔ کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی سوٹ پہنے، انگریزی ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا، بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا ان کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا نکل جاتا۔ کبھی کبھی راہگیر عاجز آ کر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھتری اٹھاتا۔ وہ دور بھاگ کر لڑکے چلاتے "ٹو ہے ہے، ٹو ٹو ہے" پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لمڈو! کیا کرتے ہو۔ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟" اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا "ان کی ماؤں کو تو دیکھو! لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں گرد مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور وہ اپنی سفید تکونی داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا اڑاتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دورہ کرتا ہے۔ لڑکپن میں سبق نہ یاد کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اس نے دکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے شادی کر لی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ پینے آتا تو وہ اس کو آبخورے اور لٹیا میں خوب اچھالتا۔ یہاں تک کہ اس میں سے جھاگ نکلنے لگتا۔ پھر چمچے سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ بلنے

تک نہ پاتا تھا۔ اکثر اس کی بیوی دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی ——— اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں ادھر سے اُدھر تک پھیل چکا تھا، مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں سنگینیں تانے کھڑی تھیں۔ کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور ان میں سے بو اُٹھ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا جو ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا، جس نے صبح ہی کپڑے تیار کئے تھے، کڑھاؤ مانجھا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لئے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی وہ "ہائے میرے لال" کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے منہ سے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی:

"ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے، میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا تھا۔ صدیق بخش نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے ادھر سے گزرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا "بھائی بڑا افسوس ہوا اور حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا چلا چلایا لڑکا جاتا رہا۔" یہ کہہ کر وہ پھر گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اٹھنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اٹھا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پٹھے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہو گیا۔

"ہوا کیا۔ ترکِ موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ اکلوتا بیٹا تھا۔ ان دو دن کے چھوکروں اور کھدر پوشوں کا شکار ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور ناند کی طرح معلوم ہوتے تھے کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکایک اس کی نگاہ دال پر پڑی اور وہ بولا "میاں ماشاء اللہ کونسی دال دے رہے ہو۔ میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذرا پھرتی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بگڑے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی اور بین کر کر کے رو رہی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ یامین کی ماں کو جب اس حادثہ کی خبر ملی

تو وہ پرسے کے لئے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا اور وہ اس کے ننھے بچوں کو سلائی کر کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی...... آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے بسی تاریکی کی طرح سارے محلہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا، اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی بلیوں کے غرّانے اور کھڑبڑ کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی،

ع گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اُتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آ کر بیٹھتے اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا کر لیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے، ڈالیاں گر چکی تھیں اور اس کا تنا سیاہ اور بدہیئت، رات کی تاریکی میں اس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اس پر جانور منڈلاتے تھے نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اٹھتا تھا۔ لیکن شام کو فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس مرگھٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اس کے بال کاٹ دیئے تھے اور اس کا سر اس کے لمبے اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑے اس کو اتار لیتا یا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ اکثر مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گونگوں کی طرح گن گن کرتی۔ جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور "پگلی" کہہ کر پتھر پھینکتا اور منہ چڑاتا۔ عورت "ایں، ایں" کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا "ابے سسروں تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور ہو!"

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بدصورت ضرور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منتو جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا "کیوں، تیرے بچہ کب ہو گا؟"

اور پگلی ایک وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جوڑ لیتی اور بلبلاتے ہوئے کسی راہ گیر یا دوکاندار سے مخاطب ہو کر منہ کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی تھی، ایک بے کس و بے بس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچا لو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے......

ہندوستان میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مرجانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، کمانے لگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور مرجاتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی ہوا ان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے مندم جو کام کرنے اور مرنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لئے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے سٹے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے ——— اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی، وہ کتے تھے۔ بھیے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پٹھے کھجاتے رہتے۔ یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دُمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے وہیں پڑے رہتے اور قصائی کی دکان کے سامنے چھیچھڑوں پر جھپٹتے۔ لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھا لے جاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو، اپنی دُم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں لڑائی لڑ کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے۔

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی تھی۔ وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تازہ بھنے ہوئے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور جن میں بھوک اور غربت اور رنج اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی میلی ٹوپی کیسی رہتی تھی۔ گلے میں پھٹی ہوئی قمیص اور اس کی لنگی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑ رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں؛ اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانتدار آدمی تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا:

"ان سے کوئی کام شروع کر دو۔ اس لئے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خونچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلے والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلا لیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔

اسی دوران میں عبدالرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزارہا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ——— کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مرد غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہرِ خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہوتی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوکے کتے پڑے ہوئے روتے چلاتے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو مڑی ہوئی تھی اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی اور پھولی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لئے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی یہاں تک کہ دور دور آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازے کو کسی مہم سے لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا۔ اور اس کو اس بلوے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید بھگت چکا تھا۔ لیکن اس کے گاہک اب اس کی آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا۔ لیکن اب اس کی آواز میں پہلا سا کراراپن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی سے نکال نکال کر چنے تولتا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور اس کی چکٹی داڑھی پر منوں خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھینچر۔ لیکن اس کی آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلے میں بے بسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سنی اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منہ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ جب ہندوستان اپنی ہی بندشوں میں خود ہی جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سننے میں آتا تھا دور سے اس کی آواز آتی تھی ؂

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

لیکن محلے کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ چرس پیتا تھا۔۔۔۔۔۔

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کوابی اور مرزا کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کلو گذری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کے چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑپن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ منصف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی

بیوہ نے اس کو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ مر گئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گزر گئے تھے لیکن محلہ کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف گڑی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجھلا کر بولی:

"مرا مشٹنڈا کہیں کا۔ تجھ پر خدا کی سنوار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ ڈالتا ہے۔"

منو بولا:

"تیری جوانی پھر کس دن کام آئے گی؟"

"ہٹ دور ہو! موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔"

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"جھاڑو پیٹے! جوان مرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا چلاؤں گی کہ شہر بھر یاد کرے گا۔"

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لئے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

"کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟"

لیکن کلو بغیر پیچھے مڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہو گئی۔ عزیز خیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا شور سے اٹھ گیا۔ منو کو کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگا:

"ابے منو کیا بات ہے؟"

منو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو کر ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا:

"کچھ نہیں یار! کلو تھی۔"

"ابے کچھ سودا بھی پٹا؟"

"نہیں میاں جئے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی۔ لیکن سسری جائے گی کہاں؟"

اوپر بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرّانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلّا غرّاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن منو نے اپنی قمیص کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگرٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا:

"او میاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں بڑا بڑھیا سگرٹ پلاتا ہوں۔"

اور ایک سگرٹ نکال کر عزیز کو دیا۔

"ارے یار میں نے کہا اب کے کس کا مار لایا؟"

"میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا ہوتا۔"

"میاں ہوش کی لو، وہیں سے ڈرو! دوزخ میں جلوگے۔ توبہ کرو۔"

"جا یار یہ بھی کیا مُلاؤں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں۔ میں تو نکموں کو تاؤ دیتا ہوں اور ٹھیٹ پیٹتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگائی۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روگ پالا؟"

"بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آگے آجاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔"

"اچھا یار تُو تو اس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ میں اب چل دیا۔"

"ذری سُن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے۔ قسم کھا بتا دے گا؟"

"اچھا جا کیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتا دوں گا۔"

"یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟"

"بھئی اس کی نہیں بدی تھی۔"

"دیکھ قول دے چکا ہے۔"

"اچھا جا تو جیتا میں ہارا۔ جو سچ پوچھے تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔"

"جبھی تو میں اور بھی حیران ہو رہا ہوں۔"

"میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ منڈا مسکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری پھوپھی اس سے چلی گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میری شکایت کر دی اور بیتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا ہو تو پیشاب سے مونچھیں منڈوا دوں گا۔ ایک موقعہ پا کر میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اس کے اندر بڑی بڑھیا چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگرٹ کیس پسند آ گیا۔ میں ان سے مانگ تو نہ سکتا تھا لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑا لیا کروں اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہو گیا۔ یار سچ پوچھو تو یہ لوگ کبھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں۔"

"لیکن اگر کبھی پکڑے گئے تو؟"

"پھر تو نے وہی فضول کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہو گی۔" یہ کہہ وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپڑ مار کر روانہ ہو گیا......

ہمارے محلّہ کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سُرخ رہتی تھی۔ ان کا سر تاملا تھا لیکن پہلوؤں میں اور گُدّی پر ان کے پٹّے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ماتھے پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا جس کا رنگ ماکم کا سا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکارتے ہوئے گزرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پاجامہ اور گلے کا کرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سُرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کھرا پن اگرمی کے ساتھ ساتھ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور اس کی آواز بہت دور سے سُنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان جھلکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لئے بُلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار میں کمی ہوتی اور ان کے بل کھاتے ہوئے ایک سناٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھو جاتے تھے۔ لوگ نثار احمد کو حضرت بلال حبشی کہتے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بکھرے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے پڑ رہی تھی اور ان میں سے ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی۔ کیونکہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گرد و غبار اور دور ملوں کی چمنیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور و شغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آ رہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دل شکن مایوسی تھی اور وہ تکلیف وہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاص پہچان ہوتی ہے

جس میں غربت اور غلاظت، زندگی کی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ گرد و غبار سے میلے اور پھیکے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اڑتا ہوا گزرا اور ان کے میلے رنگوں میں غائب ہو گیا۔ دور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی ممٹیوں اور میناروں سے کبوتر اڑتے تھے یا منڈلا منڈلا کر ان پر بیٹھ جاتے تھے۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنما میلی کچیلی عمارتیں اور ان کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دور دور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا زندگی کی سرد مہری اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دو منزلہ مکان بن رہا تھا اور اس کی پاڑیں آسمان اور نگاہ کے درمیان سدِ راہ ہوتی تھیں۔ لیکن بانسوں اور بلیوں کے رنگ نگاہ کو تکلیف نہ پہنچاتے تھے، اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر ہلکے اور مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت نثار احمد کے کھنکارنے کی آواز آئی اور لہروں کی اٹھتی سنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کن لیکن تسکین بخش تھی کہ میری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور بڑائی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مزار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے، اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے۔ اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرے پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے مبہم خیالات کا شکار میں اذان کو سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آ گئی۔ "حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ" کی خوشی پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر "حی علی الفلاح، حی علی الفلاح" کی آواز سناٹا چھاتی ہوئی، دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی، بار بار لمبی تان کے دھیمے سُروں میں ہوتی اس آہستگی اور دل بستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز رک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے، ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک اور دنیا ہے جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان بپا کئے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہے وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اسی بات کی ترغیب دلاتی ہے، ہمارا ہر گیت یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بندھی ہیں، ہمارے گلوں میں طوق ہیں، ہماری زبانوں پر قفل ڈال دیے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں، ہمارا جسم سُن ہو چکا ہے، ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم کبھی زندہ بھی تھے یا یہ سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلارے، ہمیشہ سے اس کی لوریاں سے مخمور غفلت کی نیند سویا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا، ایک کبابی اور ایک دو آدمی اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا،

"میں تو یار ہر ایک چیز میں اسی کی شان دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لئے ٹُنیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آدمی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "پہلے دن میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے

ایک چھپکلی آ رہی تھی۔ وہیں جگہ ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ گاڑی بچے کے پاس آن کے رُک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھیں اب کیا کرتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھپکلی نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک قلانچ ماری اور بچے کو صاف لانگ گئی۔ مجھ کو تو اس جانور کی عقل میں اس کی شان نظر آ گئی۔"

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا، دوسرے میں آبخورہ تھا اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا:

"واہ واہ کیا اس کی شان ہے!"

مرزا نے لٹیا میں دودھ لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:

"ہاں میاں اس کی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ کو حکم ملا کہ محل بناؤ، تو بس صاحب انہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آناً فاناً میں بڑے بڑے فتر اور سلیں لا لا کے جمع کر دیں اور محنت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی پھرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل اتنا تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمانؑ روز اس جگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے۔ تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف اس کے اندر کی قلعیں اور فتر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمانؑ اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا۔ لیکن دیکھتے ہیں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آ چکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو اس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں اس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے مونٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن ان کو ذری بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی راکھ کی طرح جھڑ گئی اور ان کا خود کا دم نکل گیا۔ ادھر تو ان کا کام تمام ہوا، ادھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رُعاب شعاب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چمپت بنے۔ لیکن میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ اب ان قلعوں اور فتروں کو کون صاف کرے گا؟"

عزیز کے ہاتھ میں حقہ کی نَے اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لٹیا تھی اوپر تھا اور آبخورہ والا نیچے، اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی ان "قلعوں" اور "فتروں" کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

غلام عبّاس

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے، کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے:

”۔۔۔۔۔۔ اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

”۔۔۔۔۔۔ اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہ رو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سنان برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا۔۔۔۔۔؟“

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اُٹھے :

"صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر سستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے :

"صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا ہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں، ناک میں دم آ گیا ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے۔۔۔۔۔۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکینِ بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکنِ بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا :

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدرِ بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعثِ صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحبِ صدر بولے "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے، اور مفلس اور نادار طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی باتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصے تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقے میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے، یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہرِ خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے، مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا

کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سُنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گذاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگرٹ بیڑی چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنجسورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ کر آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیارن نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا، ادھر اُدھر گشت کرتا دکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں، اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کر، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سُن گُن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرد و پیش چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک چھوٹا سا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا ہے اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا، اور پانی بھر بھر کے مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے، وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو یہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے 'اللہ ہو' کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کرایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا، گاؤ تکیے لگا دیئے گئے۔ پاندان، پیک دان، پیچوان اور گلاب پاش رکھ دیئے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کی چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے تنومند سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹھکیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ،

فانوس، ظروفِ بلوریں، قدِ آدم آئینے، نوابی پلنگ، تصویریں، اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے دیواروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کہیں بسنے کے لائق ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، اسبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش، اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپ سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جابجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے، اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں ——— جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ڈالیوں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور انہیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگرٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیاسلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا کہیں کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانکتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکا کرتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک نائی بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے

آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رُخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی، اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور فرحت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کرتے، تیتروں سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک محو بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رُخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجے کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رُخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر ایک میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھلاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدور پیشہ لوگ

کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، خر مستیوں اور اوباشیوں سے نکالنا چاہتے تھے پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہے ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پر اسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیالدار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹر کی کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچہ میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے دل پسند دل بہار مالش کی صدا لگاتے، درد سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے، ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بینک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔ شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم سالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حُسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حُسن آباد" کے "حَسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اُجڑنے سے پہلے موسوم تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی!"

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے، مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقہ کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی......"

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

احمد ندیم قاسمی

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا۔" کسی نے کہہ دیا۔ "ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا۔" وہ سوچتی۔ "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پاکر رویا ہوگا اور پھر ــــ پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ــــ"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل اُدھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال جب وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آکر کہا تھا "میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا ــــ" اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے اُلجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا۔ "ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا ہے۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا۔ "ذرا ٹھہر پرمیشرے! کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ "اسے مارو نہیں، اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے ــ"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔ "بول۔ تمہیں کس نے پیدا کیا ـــ؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اب اس نے پرمیشر سنگھ کو یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے۔ مگر پھر ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا "پتہ نہیں!"

"تو اور سنو!" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا "اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے۔ مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے۔ اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا "یہ سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا "لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی اس لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر!" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے!" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو۔"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ "آہا!" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا "تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو؟ کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو وہ یونہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" ایک نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے یہ کہا کہ "ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لیے چلتا ہوں" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے

برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے "جانے کیا ہو گیا ہے اسے"۔ اس نے کہا تھا "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے تو بس تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں ہی ذرا غصے سے دیکھ لیتی۔ بپھر جاتا تھا، کہتا تھا بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری، ہمارے گھروندے میں سستانے بیٹھ گئی ہے، وقت آئے گا تو چلی جائے گی۔ —— اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشہ کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" —— بیوی اسے محض "اونہہ!" سے ٹال کر سو جاتی تھی۔ مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور جب ذرا سی پو پھٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے بھیڑ بکرے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی۔ اذان کا تصور تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دئیے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی۔

اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔ "ٹھیک ہے، سوئے نہیں تو اور کیا کرے۔ نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو!"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا۔ آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر کو تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کر کے کودتی ہوئی آئی اور بولی "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا "ڈرو نہیں بے وقوف اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے ——"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی "اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ آتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھی کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گی۔"

"پر ہے یہ کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا "واہگورو جی کا ہے، ہمارا اپنا ہے۔"

اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے لیے تو ایک تل تھا اور یہیں تھا ذرا بڑا تھا پر ہم سب یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں تو سب کے بھوروں کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں اور۔۔۔"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ ملبلا اٹھا۔ "ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ "اری یہ، یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جانے۔" بیوی کی آنکھوں میں، اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا جیسے کرتارا سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ ڈالنے گیا تھا سورما، اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار بیٹیاں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کچھ کاٹ کباڑ ہی بن جاتا۔ اور پھر۔۔۔ پگلے۔۔۔ تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا ہے؟ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ اور خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی "یہ کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے سمجھیں؟"

"نہیں" اب کے بیوی چیخ اٹھی۔ "میں نہیں سمجھی اور نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ ڈال دے وہاں سے۔ لے جا اسے۔ پھینک دے باہر۔"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ گرجا۔ "یہ تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی، چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گورو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کو ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا۔ "اختر کدھر گیا؟" وہ چیخ رہا تھا۔ "ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم ہی میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو۔ اختر! اختر!"

وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں لپکے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو۔ ارے وہ گیا کہاں۔ اختر! اے اختر!"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹے، سکھ تو ہوں۔" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

"نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"نہیں!"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

"کیسے نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔

"چلو!" وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے، پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ "نہیں پہنتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا۔"

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک گیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمہارے خدا کی قسم، میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا پھر تمہاری ماں پاکستان سے آکر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں سے اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا، کرتارا نام کا، تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ "روتے کیوں ہو پرمیشرے، کل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا، "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو۔ اور اگر ادھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا؟" پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ "یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے نسخے ہی سمجھا رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا اور بولا۔ "پرمیشر سنگھ!"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو!" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھوئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہوگا گرنتھی جی!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں یہ مسلمان رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہنا مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چپ آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چومتے۔ منہ تکتا۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں۔"

"واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی!" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا ——— "اچھا جی! اچھا!" اس نے کہا، اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لووں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ "ذرا ادھر آ امر کورے! یہ دیکھ، کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں!" امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتارا بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔ "میں اس کمشو سے نہیں بہلوں گی ماں۔ یہ بھائی ہوں، یہ مسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی کونے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں، ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی ماں کے لئے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا۔ "میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرمو۔ میرے کیس بڑھا دو، مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ "یہ سب ہو جائے گا بیٹے، سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہو گی۔ وہ بات کبھی نہیں ہو گی۔ وہ نہیں ہو گا مجھ سے اچھے! یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔"

اختر اپنی اماں کو اب بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے صرف ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہو۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا۔ مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بھر گیا اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار سے گلی میں پٹخ دیتا۔ "الو کی پٹھی!" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ "سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں، پر یہاں یہ سنڈی ہمارے ساتھ تھی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو!" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند تھی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ "پانی" اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔ "پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ ماروں گا۔" امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی: "مار تو سہی۔ تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں۔" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لئے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنائی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ "ہم تو اب اماں پاس جائیں گے۔ یہ امر کور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "میں کیوں پانی پلاؤں؟ کرتارا بھی تو اسی طرح پانی مانگ رہا ہو گا کسی سے کسی کو۔

اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر؟ ہاں!"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے۔"

"نہیں۔" اختر بڑے غصے میں بولا "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پرے مارا اور چلایا "ہم تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے، تم تو امر کور سؤر کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو مومنوں کے ہاتھ سے پئیں گے۔"

"یہ بھی تو تمہی سؤر کی بچی کا باپ ہے۔" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا "تمہیں اس سے کیا؟"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا، اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا "اری سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

بیوی نے پہلے تو پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا۔ پھر ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے ہلا کر آہستہ سے بولی "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امر کور چونک اٹھی۔

اور ماں نے سرگوشی کی "سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ثانئے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں!" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امر کور چیخی تھی۔" پرمیشر سنگھ نے کہا "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا۔" اختر بولا۔

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی: "میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں؟"

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں!" اختر بولا "اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو، نیند آ جائے گی۔ اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کے سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا "روز پڑھا کرو، اونچے اونچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کور پکاری "نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے؟" پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلتا رہے۔ کیا ہے؟" بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا "پگلیاں" وہ بولا "گدھیاں!"

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچھی نیند میں "پروس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور، اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں۔"

"کرتارا؟"

"نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر بولا "ہاں ہاں وہی کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔"

پرمیشر سنگھ وہیں لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا "کیوں بے کرتارو! تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے بکھرے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مسلا!" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا!" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے۔ مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا "شنو بیٹے۔ میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا" اختر نے معمّے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو پلکوں سے آنکھوں میں جمع ہوئے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے! آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ کہیں چھپ جاؤ۔ پھر جب وہ چلے جائیں گے نا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا "فوجیوں کی لاری آ گئی۔"—— وہ مینڈھ پر سے کودا اور گنّے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ "گیانے! او گیان سنگھا!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنّا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا "آؤ بھئی گنّا چوسیں۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنّا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔" اور تب پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی "جاؤں؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنّے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت ہی میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی...... گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیرِ لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس ممتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی، جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے چھینی گئی تھیں۔ "اور مذہب کا کیا ہے دوستو!" اس نے کہا تھا "دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے جدا کرتے ہو، ان کی آبرو پر ناچتے ہو۔ ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں۔ ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارکباد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے جو حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد نڈھال سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا "ہائے رے میں مرا، کانٹا اتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلاتا رہا اور پھر اس کی ماں ننگے سر دوڑی بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھایا

پھر پیچھے مڑ کر پکار کر شوخی سے مسکرائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا "منو! کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"واہ گرو" بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے۔"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا "آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آ کر وہ بولا "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا، تمہاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند جب ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔"

اب کے اختر بولا "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"

"ہاں!" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی "جاؤ گے اماں کے پاس؟"

"ہاں!" اختر بولا "پر تم تو جانے نہیں دیتے، تم بہت برے ہو۔ تم سکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا "نہیں بیٹے! آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اداس ہوں۔"

"میں بھی تو اداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لئے جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرمیشر ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرمیشر کو چٹھی لکھیں گے۔"

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا "گانا سنو گے؟"

"ہاں!"

"پہلے تم قرآن سناؤ۔"

"اچھا!" اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر پھونک دی اور بولا "لاؤ تمہارے سینے پر بھی پھونک دوں۔"

رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے رک کر اس کے سینے پر پھونک دی اور بولا:

"اب تم سناؤ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لئے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے

اور گنگناتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر ہن ورگا جے
بنتو دا منہ چن ورگا جے
بنتو دا لک چیتا جے
لوکو
بنتو دا لک چیترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا سے وقفے کے بعد بولا "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بھی تو بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا۔ "وہ کوئی سکھ ہے؟"

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گرو گوبند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا "ارے چاند تو سر پر آ گیا۔"

پرمیشر سنگھ نے رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا؟"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "جاؤ بیٹے تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ـــ"

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا "اذان کے وقت نہیں بولتے!"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پرمیشر سنگھ بولا۔

"شش!" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ بس تم ـــ"

"کیوں؟ کیوں نہیں جاؤ گے؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔" پرمیشر سنگھ نے اختر کو بہلا لیا۔ "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتار نہیں، اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمہیں کرتار اما م کا کوئی لڑکا ملے نا تو اسے ادھر بھیج دینا - اچھا؟"

"اچھا!"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا "جاؤ"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا "تم بھی آجاؤ نا۔"

"نہیں بھئی!" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا "تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا" بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور وہ قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

زم زم پو پھٹ کے واڑے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے "کون ہو تم؟"

"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا "میرا کنگھا لاؤ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھپ سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ "ہالٹ!" ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ....

......اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا۔ مگر خون اس کی پگڑی کی سیکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا "مجھے کیوں مارا تم نے؟ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اڑ رہے تھے۔

ممتاز مفتی

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے، مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ میں، آپا اور امی جان، کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا "امی جان! میں بھی بیاہ کروں گا۔"

"اوہ ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"اونہوں!" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں، دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں؟"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا۔" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولہے پر گڑ گئی، چولہے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی!" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا "اور چھاجو باجی ایسی!" اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں "تصدق، بدو سے پوچھ لو کہ آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں؟" بدو چلایا اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی "اونہہ!" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں "بچے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے۔" "وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں "میرے لال

نہیں معلوم نہیں، ان کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔" سجو نے بھولے پن سے پوچھا "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں؟" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی اور دیگچی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں سے اپلے صرف اپنچ کر نکالنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز سجو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی "آپا تم تو بس بیٹھی رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی!" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر سجو چیختا "آپا میرا دلیا۔" ادھر ابا گھورتے "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتیں "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے؟" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہلتی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے، جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجدہ باجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر چھم آواز میں کہے "ہیں جی! کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری لگتی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا، "ایک یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے "سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں؟"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

اماں تنک کر بولیں "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے "افوہ! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ جی! ابا کی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر دیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی جغادری نجومی ہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے، اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا ——— ہاں سد

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں پریشانی ہے   نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں لگاتے ہوئے سُن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی "بدو رو نا" اور پھر آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے، جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونو اکیلے ہوتے، پوچھتے "بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

"آپا؟" بدو لاپروائی سے دہراتا "بیٹھی ہے —— بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں نہیں۔ اچھا بدو، آج تمہیں، یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں۔"

اور جب بدو کا دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا تو وہ مدھم آواز میں کہتے "ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔"

بدو چیخ اٹھتا "کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے "ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے، دیکھا؟ جیسے ڈھول ہی کہتے ہیں ڈگمگ، ڈگمگ سمجھے؟" اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا، بالوں کی لٹ پھسل کر گالوں پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں، آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے بھائی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ٹن، ٹن، اڑا اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے، سمجھے؟"

بدو بولا "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ!" بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں!" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے "واہ! تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو!"

بدو نے کہا "ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیئے۔"

"تو وہ اپنے ابا کے لئے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں!"

"میں کون آپا سے؟" بدو چیخا۔

بھائی چلائے "او بدو۔ ڈھنڈورا۔ تو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرف ڈگڈگ ڈگڈگ۔" بدو پھر چلانے لگا "میں جانتا ہوں تم مجھے بجا رہے ہو نا؟" ـــــ "ہاں ہاں، اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔" بھائی صاحب کہہ رہے تھے "کشتیوں میں، اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے، آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان۔ تو آؤ ـــ ٹھہرو۔ جب میں تین کہوں" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا "ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آگئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو ہیمنا؟" ان کے منہ سے ہیمنا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے بس نور جہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں ـــ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے ہیمنا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجادے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی، جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجادے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا "سکول کا کام کر رہی ہوں۔"

پوچھنے لگے "تم نے کوئی برنرڈسا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا "نہیں!"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہوگی!" وہ انکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم آواز میں کہا "نہیں!" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی جان بولے "اوہ کیا بتاؤں ہیمنا کہ وہ کیا چیز ہے، نشہ ہے نشہ، خالص شہد، تم اسے ضرور پڑھو بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا "ضرور پڑھوں گی۔"

پھر پوچھنے لگے "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا "مجھے کیا معلوم آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی نکتہ چین۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں، اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم سم آپا۔ بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلّا اٹھے "آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ ہوں! سجادہ بیگم کو بڑی سستی ہو گئی ہے ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے۔ کہنے لگی "شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید یہ کیا غضب ہے خدایا۔

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔" یہ سنتے ہی اماں وہاں دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے ان کی عادت ہے "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال کرنا چاہیے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی، کہنے لگے "اوہ یہ بات ہے مجھے کیا پتہ۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں ـــــ" اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا اس سے ملنا تو کیا بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں۔ کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلۂ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ پر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں۔ ہارٹ بریک ہاؤس۔"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنی ہوتے؟" آپا پہلے تو ٹھٹک گئی، پھر سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے چڑ کر کہا۔

"اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔"

کہنے لگی "میں کیا جانوں؟"

میں نے اسے جلانے کو کہا "ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے؟" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یونہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر بولے "چھبیلی اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا "میں کیا جانوں؟ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔" ہنس کر کہنے لگے

"آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے "نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن ڈاکا ہو جائے" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے "دیکھو جیتی مجھے لڑنا ہے خداپ ندہے، میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے، ذرا نہ اکتائے" جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا" میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی، پھر کہنے لگے "وہ مجھے بے حد پسند ہے یہاں تو جیتی ہم فیرنی کھا کر اکتا گئے۔" میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہو گی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا، تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا "بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدو جاؤ ذرا بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے —"

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پر بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے، میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساجرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چلاتا "باجی" "اچھا جو باجی" چیختا پھرتا اور کہتا "ہم تو اچھا جو باجی سے بیاہ کریں گے"۔

باجی کہتی "شکل تو دیکھو اپنی، پہلے منہ دھو آؤ۔" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ خم نما ابرو ہیں پر چھتی ہے۔ بھئی بھائی جان کیوں نہیں؟"

باجی کے منہ سے "بھئی جان" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنس گیا ہو مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جان" کہہ کر اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جان" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جان" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جان" میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی "بھئی جان ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے "کیوں میاں بدو! کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی "آپ بات پوچھئے" بھائی جان کہتے "یہ اور تم؟" باجی تیوری چڑھا کر سوچ میں پڑ جاتی، چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی، ابھریں

مسکرا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی "اونہہ مجھ سے تو آپ ہٹ جائیں گے۔" بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "کل جو پٹخنی بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی "میں نے کہا چلو بھئی جاآن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔" اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو پھاجر باجی پھاجر باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی "یہ بھئی جاآن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا، ہے نا بھئی جاآن؟" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جاآن" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا "آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔"

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے، کس نے بنایا ہے؟" ساجو باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جاآن کے لئے۔" بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا "میں بتاؤں بھائی جان؟"——— آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں، جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا الگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی "چھوڑیئے چھوڑیئے" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی، کہنے لگی "آج ایک دھنسنا تا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے "وہ یہاں سے کب لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو۔" غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے تیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی "واہ آپ تو ہمیشہ ہیری سے چھیڑتے ہیں۔" بھائی جان معاً بول اٹھے "تو کیا ہوتا ہے"——— "چپ — خاموش" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک ترکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا "آپا! اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا "اماں کہاں ہے؟" اور وہ ماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا "آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔" بدو مچلنے لگا۔ آپا بولیں "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس" اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی

رہتے تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی رہتی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے "بدو، ساجرہ باجی سے بیاہ کرو گے؟"

"اونہہ!" بدو نے کہا "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا "ہم تو ساجرہ باجی سے بیاہ کریں گے"۔ اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہے؟" پھر چولہے میں جلے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "ایسی!" "اور ساجرہ باجی؟" میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا "ایسی!" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "ہاں یاد ہے!" بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولہے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا "اُف کتنی سردی ہے!" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان دبے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔"

خواجہ احمد عبّاس

زعفران کے پھُول

آؤ مسافر، یہاں اِاس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں۔ .... وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمہاری؟ .... پنکچر ہو گیا ہے؟ ...... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے .... اب میں کرس کی تو بات ہی ہے .... نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیئے۔ اور پھر پیسے کر کے روں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟ ... اکیلی جان ہوں اذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں، چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں، اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے، پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہیئے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن ... تم بھی کہتے ہوگے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا ہے ... ...

کیا کہا تم نے بیٹا؟ ... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے ... ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھُول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دُوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں ... ... اس کی وجہ کیا ہے؟ ... یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں ....

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟ ... ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گذرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا! پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی، یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیئے جائیں گے، اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پہ مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟ ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟ ... دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے ... ہے نا؟ ... پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟ ... یا ابھی تمہاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑبڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟

... ... خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو ... ...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پہ بہار آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلھن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے ... ...

تمہاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا ... ... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا، بے چارہ، کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا، اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے، جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔

"کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو"

تو جواب ملا

"ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو ....."

تو بٹیا تب پتہ چلا کہ وہ بے چارہ کتابوں میں یہ پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آگئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے، اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تینوں ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

... ... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ... ... بٹیا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں .....

ہاں تو زعفرانی ... ... کیا کہا ... ... زعفرانی کون؟ ... ... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی ... ... نہیں بتایا تھا؟ ... ... بھول گئی ہوں گی ... ... لو دیکھو لو یاد کا یہ حال ہے بٹیا ... ... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی، لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی۔ وہ لوگ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!! ... ... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں ... ... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں۔ مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی وبصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دبلی تھی۔ جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لٹک لچک کیسے بچے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ ویسے پھٹے ہٹے۔ اوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں، نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب، میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی۔ وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا۔ میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر ہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پہ تلا ہوا تھا ... ... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بٹیا ... ...

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا بھلا

ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون سا بر مل سکتا تھا؟ ... میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی ... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے۔ اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتیں پر آفتیں آنی شروع ہو گئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہو گئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہے گا؟

... سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آ رہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔ کبھی برف میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجہ پرجا کا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے ... کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا لونڈو چلاتا ہوا آیا۔

"ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں، شیر کشمیر!"

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آ دیں ... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو ——— کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہو گا، ہبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں ...

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر ... ارے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ——— ——— ایک اسکول ہے ——— اب تو بڑا کا ہو گیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی ——— ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور سامنے نہ شیر نہ چیتا، ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پہ کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ تو جی یہ تھا وہ شیر کشمیر ... میں نے کہا "لو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ جادو بیچنے والا ہو گا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا تار کر کے بھونپو والا باجا بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا، اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔ اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پہ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیئے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہیئے۔ لڑکوں، لڑکیوں کو پڑھانا چاہیئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بیٹھک کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوتے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں ... تم تو جانتے ہی ہو تالاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو، سارے پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا، یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام اور چین، صلح، شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پہ شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پہ تلا ہوا۔ میں کہتی ہوں ارے تمہارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انھیں راجوں

مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے رُوکھی سُوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں، تم میں کون سُرخاب کے پَر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تُلے ہوئے ہو ... ... پر میری کون سنتا ہے، بیٹا ... ... وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا ... ... تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟ ... ... وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں۔ ہاں۔ بیٹا۔ اس کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کیسے ہو گے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے بڈھے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے ... ... یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے۔ اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پہ تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کر چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سُن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے ... ...

... ... جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی بڑا غلام نبی کہنے لگا اب میں دُوسرے کی زمین پہ مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اُٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا۔ چھ مہینے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڑھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لئے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانسنا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اُٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسے گڑھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش آگئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے ... ... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا نورو بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نورو کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آکر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا نورو شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی میٹرک کو بھی نکما ہٹا وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا۔ نہ میں اُس کی ماں ... ...

... ... زعفرانی؟ تو اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں، زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں۔ اور یہاں اوّل تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سُنا سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پہ، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے، کبھی اُون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولہا جلتا۔ میں نے کہا۔ غفورا دس برس کا ہو گیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پہ لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے میں داخل کروا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دُکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی ... ... مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے

اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی ... ... پر بیٹا اس لونڈیا پہ تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ... ... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پہ بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے ... ... جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے بیٹا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں ... ... بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں عیب کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سینما، بائسکوپ، ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہو گئے ہیں ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ زار و قطار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو کچھ جواب نہیں دیا روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا، گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اسکا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی، بیٹا بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہ سنی ہو گی۔ کہنے لگی۔

”ماں! میرا بیاہ کر دو“۔ اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بہلاوے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول دل میں تھی — میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور رو رہی تھی۔ اور جب ذرا ہچکیاں رکتیں تو یہی کہتی۔

”ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں رل جائے گی ... ...“

... ... اب تم ہی بولو بیٹا، غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پہ لڑکی کا بیاہ رچائے ... ... پھر بھی میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے، تو یہ فکر تو دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل صورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ دُہنی ماتھے پہ پٹے کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

”غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمود“۔ یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گننے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا۔

”غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا۔ اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں“

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمود کے منہ پہ کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟“

محمود کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ٹھیر ٹھیر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

”ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اسے دق ہو گئی تھی“۔ اور بس چپ ہو گیا

... ... بیٹا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پہ کیا اثر ہوتا ہے ... ... ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون سے اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے ... ... اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے ... ...

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا، زعفرانی پہ بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر پڑا۔ چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی پڑ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پہ سوار رہتی کہ پڑھو، تختی لکھو۔ مدرسے کا کام کرو۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے۔ نہ جانے کیوں؟ ... ...

ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

"کب اور کیسے بیمار پڑا، علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟"

اور جب محمدو نے کہا۔

"ہاں بہت سوں کو"۔ تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا۔

"تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟ ... ... نہ جانے کیوں ... ..

... ... میرے کہنے سے محمدو ہمارے ہاں تین دن اور ٹھیرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا

"چھوڑ کر کیا کروں گا، ماں جی؟ اور کوئی کام آتا نہیں ہے۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے نہ ماں نہ باپ ... ..."

میں نے جلدی سے پوچھا

"اور بیوی؟"

اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کب کی مر گئی"

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں، پر میں نے کہا۔

"دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟"

اس کو تین دن میں میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پہ ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں۔

"مجھ سے کون بیاہ کرے ہے اماں جی؟"

... ... تو بیٹیا یوں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پایا۔

... ... کیا کہا؟ زعفرانی کی مرضی؟ بیٹیا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی جمعرات کو محمدو اسے بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش ہو گئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں.... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہو گئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹیا آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا ہو اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمدو آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر ویر سے ڈرے

میری بات۔ پر اب عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا شاید ہی کیوں نہ پہنوں۔ سو میں نے بھی سلوا لی ... ...

اتنا غصہ آیا ہے مجھے اس شیرِ کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا، شیرِ کشمیر پکڑے گئے۔ شیرِ کشمیر پکڑے گئے۔ مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا ... ... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا ... ... پر یہ ضرور سُنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمد وا اور اس کے ساتھی برات لائے ہوں مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لئے "شیرِ کشمیر زندہ باد" "ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے۔ اور ہمارا غفورا چھ اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا ... ... "ک ش م ی ر چھ و ڑ د و" ... ... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

... ... ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی، اور اس میں سے سپاہی کود کر، بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے، میں دیوار کی طرف دوڑی، جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہوا کھریا مٹی سے لکھ رہا تھا۔ غفورا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا ... ... میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اُس نے جان دے دی۔ اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی حرفوں کو دہراتے رہے۔ جنہیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ک ش م ی اور ابھی ر نہیں لکھ پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی۔ اور اس مہینے میں دُوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی ... ...

... ... اور اس کے بعد کیا ہوا، بیٹا، یہ مجھے ایسا یاد ہے، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دُوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اُٹھتا چلا جائے ... ...

... ... زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہرا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں ... ... آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سُلگ رہی تھی ... ... اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں۔ اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وُہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جا نکلا۔ یہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے۔ سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

... ... گھنی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف، زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں ... ...

... ... ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے۔ اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے۔ میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں، زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔ ... ... عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کی بجائے خون ... ... خون مٹی میں رل رہا تھا ... ...

اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اُس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"میرا بیاہ ہو گیا ماں"

... ... یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گلِ لالہ کی طرح سُرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

... ... سُنی بیٹا! تم نے میری کہانی؟ ... ... پر تم کہاں ہو! ... ... چلے گئے نا تم! ... ... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سُن پاؤ گے۔

... ... موٹریں تو اس سڑک پہ سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر ورساور کو بھیج دیئے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ "اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟" ... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں ... ... "

اختر حسین رائے پوری

مجھے جانے دو

"مجھے جانے دو" اس نے کہا۔ اور جب تک میں اسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھپک، اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گزرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پاتا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستین جمپر پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو پھسلانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے سرخی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر رواں چلا چلا کر کہہ رہا تھا — ہمیں لے لو — ایک روپیہ کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھونک دیتی تھیں۔ اور کوئی منچلی کسی بدنما مارواڑی کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھل کھلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبانِ حال سے کہتی تھی — ہمیں لے لو — ایک روپیہ کے بدلے۔

ٹرام پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ نہایت استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ بدبخت، نسوانیت کی کلنک، خدا غارت کرے، چند ٹکوں کے لئے، شراب کی بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں — اوہ، ہم! — پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنھوں نے انہیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی تھی۔ شام جب آرتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو گھی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے۔ اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لئے آتے وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بے باکی سے طوائفوں کو گھورنے لگتے جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا احساس مطلق نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اطمینان سے آرتی کا تماشا دیکھتی اور وقتاً فوقتاً کیرتن کے لئے پر پیروں سے ٹیک دینے لگتی۔ جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بے تال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پجاری کو پکار کر کہتی —— "ارے ذرا سی مُرکی تو بنانا"
اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی —— "اری اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر سے گزرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم جنسوں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی۔ اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی۔ خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آجاتیں۔ دور ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا حتیٰ کہ پیر شل ہو جاتے تھے۔ میں یونہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ بہتیرے شریف اس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوئے بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں بدمعاش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پنجے دبائے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے کیونکر ہم کلام ہونے کی جرأت کی تھی۔

اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سُلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولاپن تھا۔ گویا انسانی سماج کی تہ میں چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اس نے مرتے مرتے کہا تھا "میری پیپ تمہارے جسم کو سڑائے گی، میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا، میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔"

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک خلا جس میں کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔

شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے، وہاں سے ایک ادھا خرید لاؤ۔"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا بُرا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے۔ جیسے بھینس کے تھن سے دودھ چھلک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور کیڑے تیرتے ہوئے، اور متوالے مل کر گا رہے تھے۔

"اکیلا غیروں کا آآآآ..... ہا آآآ..... وہ سے نا آ......"

میں نے جلدی سے ایک ادھا خریدا، اور دونی کی چاٹ چٹپٹی مسالے دار۔

اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر

ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں دو تین ستارے چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا مدعا زبان سے نہیں بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے، اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے، جب عورت خود اس سے پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اتار لی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر باہر دیکھنے لگی۔ میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔

پھر وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل، غازہ اور لاکھے کو دھو ڈالوں تو کیا رہ جائے ——— دھندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے، میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہو گی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے؟!"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں؟ یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے مرد ——— سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ!

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس۔ تو تم آتے ہی اسے توڑ دیتے۔ یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو درندوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر آ جاتے ہیں۔ ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں۔ اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے پلوں میں دو چار ٹکلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھروالی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لئے روٹیاں اور سنگار کے لئے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اُجالے میں جب تم لوگ ادھر آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔ ان ٹکیتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں انہیں شہر سے نکال دینا چاہیئے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو۔ اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا منہ کالا کر کے اپنی حرام کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو۔ اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے"

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے در و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مر جاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑھ کے مولانا نورالاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں، اور تمہیں شرافت کی قسم کہ وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے

نکل کر کہنا۔ مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق نہ بسورئیے۔

اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے؟ تو کہنا میں آپ کی بیٹی کے جنازہ کا تماشا دیکھ کر آرہا ہوں وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے ایک مرد مومن نے کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپ کے ہم جنسوں نے تحفہ میں اسے گھناؤنی بیماریاں دیں۔ اور جب وہ مر گئی تو ایک حافظ نے اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی جب تم یہ کہہ چکو گے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے۔ لیکن اپنی نجابت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا۔"

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ "تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ——————— مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود ان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے ہم انہیں زنا بالجبر، اغوا اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! ——————— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا۔ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لئے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا؟"

اب ہوا چل رہی تھی۔ اور تاڑ کے پتے غم ناک آوازیں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹراموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ اِکّے دُکّے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی "میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے۔ اور اب بھی اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا۔ کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایۂ حیات اسے سونپ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لٹائے وہ پلیگ میں مر گیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبت کو، خالق کی مہر مل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا۔"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں۔ جس ماں کے آگے اس نے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو، اور جس عورت کے آگے اس کے محبوب کا جنازہ، اسے تسلی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو: "میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہے۔

الہ آباد . . . . میرے سوتیلے خالو کا مکان . . . . میری نامرضی کے خلاف عصمت دری . . . . . بدنامی کا ڈر . . . . کلکتہ . . . . یہ چکلہ گھر . .

زیر لب وہ ٹوٹے پھوٹے جملے دہراتی رہی، اور چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا، اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی "کیا تم جا رہے ہو؟" اس نے اداس

سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا تو جاؤ۔ خدا حافظ! اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا، اور یہ اس کے بچوں کو ورثہ میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکے داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔

مگر کبھی کبھی آ کر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ دیر نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں۔ ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لئے چلے جاؤ!"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر بھی گرفتارِ تقدیر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یونہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" اس نے کہا ——— اور وہ چلی گئی۔

ملک راج آنند

حجاموں کی یونین

جدید ہندوستان کی تعمیر میں ہمارے گاؤں کے چندو حجام کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ضرورت ہے کہ میں اُس کی تاریخی خدمات کی طرف توجہ دلاؤں، ورنہ ممکن ہے دنیا اُسے فراموش ہی کر دے۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ دنیا کو حق شناسی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ عجیب و غریب کارنامہ کچھ اس قسم کا ہے کہ شروع میں خود چندو بھی اُس کی پوری پوری اہمیت سے واقف نہ تھا۔ اس وقت وہ ہندوستان کے دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اہمیت کو بہت زیادہ نہیں خیال کرتا تھا۔ لیکن قدرتاً جو خود پسندی بڑے آدمیوں میں ہوتی ہے، وہ اُس میں بھی آگئی ہے۔ یہ خود پسندی اُسے بُری بھی لگتی تھی اور اسے زیب بھی دیتی تھی۔

میں چندو کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ یہ کرتا پھٹا ہوا بھی کچھ اس طرح سے تھا کہ بمشکل اس کا ننگا اور پھولا ہوا پیٹ ڈھکتا تھا۔ ہم اکٹھے گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ میں کھیلا کرتے تھے۔ کبھی سپاہی بنتے تھے، کبھی دوکاندار اور کبھی کلرک۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کھیل تھے۔ جو ہم نے اپنی تفریح کے لئے ایجاد کئے تھے۔ اس تفریح میں اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ ہماری مائیں کبھی کبھی آ کر دیکھ جاتی تھیں۔

چندو مجھ سے کوئی چھ ماہ بڑا ہوگا۔ ساری باتوں میں وہی پیش پیش رہتا تھا۔ میں بھی خوشی خوشی اُس کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ چونکہ اُسے بھڑ پکڑنے کا خاص ملکہ تھا۔ وہ بھڑ کی دم کو دبا کر بڑی ہوشیاری سے ڈنک نکال لیتا اور پھر اس کی ننھی ٹانگوں سے تاگا باندھ کر اڑاتا تھا۔ لیکن میں جب کبھی کوئیں کی منڈیر کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں پر سے بھڑ پکڑنے کی کوشش کرتا، تو مجھے ضرور سزا بھگتنا پڑتی۔ بھڑ اکثر میرے گالوں پہ کاٹ لیتی تھی۔

ہم کچھ بڑے ہو گئے تو پھر بھی ویسے ہی چندو مجھے دنیا بھر کی خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ اب تو وہ قسم قسم کے کنکوے بھی اڑا لیتا تھا ان کنکوؤں کا توازن کچھ اس ڈھب کا ہوتا تھا کہ انہیں قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

اسکول کے کام کاج میں وہ مجھ سے پیچھے تھا۔ وہ میری طرح سوال نہیں نکال سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ اس کے پتا نے اسے شروع ہی سے آبائی پیشہ سکھا دیا تھا۔ اور وہ لوگوں کی حجامت بنانے کے لئے اُس کو گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ اسکول کا کام کرنے کے لئے اس غریب کو وقت ہی کہاں ملتا تھا لیکن اُسے گیت بہت یاد رہتے۔ اس فن میں وہ مجھ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُسے نہ صرف یہ کہ کتاب کے سارے گیت ازبر یاد تھے۔ بلکہ وہ نثر کے صفحے اس شان سے زبانی سنا دیتا تھا کہ وہ سب گیت ہی معلوم ہوتے تھے۔

امتحان ہوا۔ چندو نے وظیفہ حاصل کیا۔ ماتا جی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی کہ اس کو تو اسکول سے کچھ نقد بھی ملے اور میں فیس پاس سے دے کر تعلیم حاصل کروں۔ اب وہ مجھے چندو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں چندو ایک حجام کا بیٹا ہے اور کمین ذات کا ہے۔ اور یہ کہتی تھیں کہ مجھے اپنی ذات اور مرتبے کو پہچاننا چاہئے۔ میں نے اپنے والدین سے اور کوئی باطنی اوصاف تو حاصل کئے ہوں گے۔ لیکن برتری کا کوئی احساس یقیناً وراثت میں نہیں پایا تھا۔ مجھے تو اس سُرخ نشان سے بھی نفرت آتی تھی۔ جو ماتا جی صبح کو میرے ماتھے پر لگایا کرتی تھیں۔ چست اچکن، سفید لٹھے کا پاجامہ، سنہری طلائی جوتا۔ ریشم کی پگڑی غرض کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہ بھاتی تھی۔ چندو جو کپڑے پہنتا تھا۔ کچھ عجیب سے ہوتے تھے۔ ان میں شکن بھی ہوتے تھے اور پیوند چکتے بھی رہتے تھے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے بھی حق ہونا چاہئے کہ چندو کی طرح کپڑے پہنوں ——— ایسے کپڑے جو وضع داری سے بے نیاز ہوں۔

چندو نکر پہنا کرتا تھا جو اُسے ایک پنشن یافتہ صوبیدار نے دی تھی۔ اُس کی قمیص کے اوپر ایک مخمل کی واسکٹ بھی ہوتی تھی۔ جو پیتل کے بٹنوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہ ایک گول بانات کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتا تھا۔ یہ ٹوپی کبھی ہمارے گاؤں کے وکیل لالہ حکم چند جی کے سر کی زینت ہوا کرتی تھی۔

چندو کے پتا پلیگ کی بیماری سے اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان کے بعد چندو بالکل آزاد ہو گیا۔ جو جی میں آتا تھا کرتا تھا۔ اس کی آزادی قابلِ رشک تھی۔ صبح ہی صبح وہ اونچی ذات کے شرفا کے گھروں میں جا کر ان کے سر اور خط بنایا کرتا تھا۔ پھر خود نہا دھو کر اپنے کپڑے پہن لیتا تھا اتنے میں لالہ حکم چند جی کی گاڑی تیار ہو جاتی تھی۔ اور وہ بھی وکیل صاحب کے ساتھ پائیدان پر بیٹھ کر شہر کو چل دیتا تھا۔ یہ شہر گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

چندو مجھ پر بڑی نوازش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ مجھے شہر جانے کے بہت کم موقعے ملتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ تین میل تک جوتیاں چٹخاتے خوفِ خدا دل میں لئے ہوئے جودھیالہ کے مڈل سکول میں پہنچ جاؤں اور کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ اُس نے پتا کی وفات کے فوراً بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور بے رحم اُستادوں کی زدوکوب سے بچ گیا تھا۔ وہ میرے لئے شہر سے رنگ بھرنے والا برش، سنہری روشنائی، سفید چاک، پنسل تراش، جس میں دو طرفہ والا پھل لگا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے اور بھی کئی تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ مجھے متمدن دنیا کے بازاروں کی مختلف النوع چیزوں کی تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ واپسی پر اُسے پھر وکیل صاحب کی گاڑی کے پائیدان پر آنا ہوتا تھا۔ اس لئے اُسے کچہری میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پر اکثر وہ صاحب لوگوں، وکیلوں، چپراسیوں اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور ان کی انگریزی وضع قطع کی پوشاک پر دل کھول کر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے دو ایک مرتبہ مجھ پر یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اپنے گھر کے مٹکے سے کچھ رقم اڑا لے۔ یہ مٹکا گویا ان کا دولت خانہ تھا۔ جہاں چندو کی ماں اُس کی پیشہ وارانہ چابکدستی سے حاصل کی ہوئی مزدوری کو جمع رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس رقم سے کلام خان کا ساز و سامان خریدے یہ کلام خان شہر کے دندان ساز تھے۔ چندو کہا کرتا تھا۔ یہ خانصاحب لوگوں کے منہ میں دانتوں کی قطاریں لگا کر اور مصنوعی آنکھیں جما کر معجزہ ہی تو کر دیتے ہیں۔ کلام خان کا حلیہ اُس نے اس طرح بیان کیا تھا۔ وہ ایک آدمی ہے۔ بالوں میں ایک طرف کو چیر لگاتا ہے۔ مادے سے سخت کی ہوئی قمیص پہنتا ہے۔ اس کے اوپر گلے میں ایک ہاتھی دانت کا کالر

ہوتا ہے اور اس میں ایک بو ٹائی لگی رہی ہوتی ہے۔ ایک سفید رنگ کا کوٹ ہوتا ہے۔ نیچے ایک پٹی دار پتلون اور سیاہ رنگ کا پمپ شو، اور یہ پوشاک جو وہ کام کرنے کے وقت پہنتا ہے۔ ربڑ کی بنی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ جادوگر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے چمڑے کے بیگ کو کھولتا ہے اور اپنے چمکدار لوہے کے اوزاروں کو بڑے طمطراق کے ساتھ باہر نکالتا ہے۔ پھر چندو نے اس مسئلے پر میری رائے دریافت کی کہ کیا وہ حجام جس کے پاس ڈاکٹری کی سند بھی موجود ہو۔ اگر غلام خاں کا سا لباس پہن لے تو زیادہ معزز نہیں بن جائے گا؟ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا۔ اگرچہ میں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن انسان کے جسم کے اوپر جو کیل، پھنسی، پھوڑے وغیرہ نکل آتے ہیں ان کا علاج تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں نے اپنے پتاجی سے سیکھا تھا۔ اور انھوں نے اپنے پتاجی سے یہ تعلیم لی تھی۔

میں نے اس کے اس منصوبے کی تائید کی۔ اور پرجوش انداز میں اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح ہمارے ہاں آیا۔ اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک ربڑ کا کوٹ زیب بدن تھا اگرچہ یہ کچھ بڑا تھا۔ لیکن تھا بڑے ٹھاٹھ والا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کا ایک پمپ شو تھا۔ اتنا چمکدار کہ اس میں مجھے اپنا چہرہ صاف صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے چکر پر نکلا تھا اور مجھے دکھلانے آیا تھا کہ وہ اپنے اس نئے ساز و سامان سے کتنا بارعب ہو گیا ہے۔

اسے دیکھتے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "عجیب! عجیب"!

وہ زمیندار کے گھر کی طرف جس کا خود وہ بہروپ بنایا کرتا تھا، تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ میں بھی اس کی داد دیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس وقت گلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ تنہا میں ہی اس کی شان و شوکت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے لباس میں ملبوس تھا۔ خود شناسی میں محو، گاؤں کی دیواروں کے اوپلوں سے اپنی پوشاک کو بچاتا ہوا۔ اور غلیظ پانی سے ہٹتا ہوا، جو گاؤں کی گلیوں میں اکثر بہتا رہتا ہے۔ چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی کہ ہم زمیندار کے گھر میں داخل ہوئے ہمیں دیوی ملا۔ یہ زمیندار کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور کہا چندو آیا! چندو آیا! بری مشن اسکول کے پادری صاحب کی طرح خوبصورت اور شاندار کپڑے پہنے ہوئے۔

موٹی توند والے زمیندار نیکی چند نے اپنا ہاتھ پوتر جنیو پر پھیرتے ہوئے کہا "رام! رام! یہ جنیو اس کے کان پر لٹک رہا تھا۔ چونکہ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا "سؤر کہیں کا! ہمارے گھر میں گئو ماتا کے چمڑے کا بیگ لئے اور کسی جانور کے، نہ جانے کس جانور کے گودے کا بنا ہوا کوٹ اور منحوس کالا انگریزی جوتا پہنے چلا آ رہا ہے۔ نکل! دور ہو! شیطان کے بچے۔ تم ہمارے دھرم کو بھرشٹ کرو گے۔ پتا نے آنکھیں بند کیں تو ایسا ہو گیا کہ دنیا میں کسی کا بھی ڈر نہیں"؟

چندو کہنے لگا "لیکن جاگیردار صاحب! میں نے تو ایک ڈاکٹر کا لباس پہنا ہوا ہے۔"

"سؤر کہیں کا! نکل یہاں سے! جا اور وہ کپڑے پہن جو ایک نیچ ذات حجام کو زیب دیں۔ اپنے ان نئے نرالے خیالات سے ہاتھ اٹھا ورنہ ڈنڈوں سے تمہاری تواضع کی جائے گی۔"

چندو نے عرض کی "لیکن لالہ نیکی چند جی......"

"چلے جاؤ! چلے جاؤ! نکمے کہیں کے قریب مت آنا ورنہ ہمیں گھر بھر کو گئو کے گوبر سے پوتر کرنا ہوگا۔"

چندو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہاں سے واپس ہو لیا۔ کچھ بدحواس بھی ہو رہا تھا۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس کی توہین ایک ایسے شخص کے سامنے ہو رہی تھی جو اسے ایک برگزیدہ ہستی خیال کرتا تھا۔ پھر وہ بڑھتا ہوا تھانو رام کی دوکان کی طرف چلا گیا۔ یہ صاحب گاؤں کے ساہوکار تھے اور گلی کے موڑ پر پنساری کی دوکان کرتے ہیں۔

زمیندار کا لڑکا دیوی اپنے پتا کے اس سخت سلوک کو برداشت نہ کر سکا۔ اور شور و شغب کرنے لگا۔ میں اس کو خاموش کرانے کے لئے ٹھہر گیا

اس کے بعد جب میں گلی کے سرے پہ آیا تو دیکھا کہ وہ ساہوکار صاحب چنے تولنے کے لئے ہاتھ میں ترازو لئے ہوئے کھڑے ہیں اور چندو غریب کو بے نقط سنا رہے ہیں "تم سور تمہیں، چاہئے تھا کہ پتا کے مرنے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے اور اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتے نہ یہ کہ کبھی بھانڈ مسخرے کی طرح رنگ برنگ کے سوانگ بھرتے پھرتے۔ ہسپتال کے لوگوں کے سے ناپاک کپڑے پہن کر پھر رہے ہو۔ جاؤ اپنے کپڑے پہن کر آؤ۔ ورنہ میں تم سے خط نہیں بنواؤں گا" ساہوکار صاحب جوش میں یہ لعن طعن کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے چوٹی کی مقدس گانٹھ پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے

چندو بہت دل برداشتہ ہو گیا۔ غصے میں آ کر میرے پاس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گویا کہ اس سارے افسوسناک حادثے کا میں ہی ذمہ دار تھا۔ مجھے بے حد تشویش تھی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ چندو مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اونچی ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا "پنڈت پرمانند جی کے پاس جاؤ اور کہو جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں غلیظ نہیں ہیں"

پرمانند جی کو زمیندار نے بلا بھیجا تھا کہ فوراً اس ناپاک مسئلے پر بات چیت کر لی جائے۔ میں نے یہی کہا تھا کہ پرمانند جی زمیندار کے گھر سے نکلتے ہی کہنے لگے "اچھا تو تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ اسکول کی تعلیم نے آج کل کے لڑکوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تم یہ لباس پہنو تو مناسب بھی ہے۔ چونکہ تم بڑے ودوان بننے والے ہو۔ لیکن اس نیچ ذات کے لڑکے کا اس لباس سے کیا واسطہ تھا۔ وہ ہماری ڈاڑھیوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ سروں کو چھوتا ہے اور ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتا ہے۔ پرماتما نے پہلے ہی سے اسے ناپاک بنایا ہے اب وہ اور زیادہ ناپاک کیوں بنتا ہے۔ تم اونچی ذات کے ہونہار ہو اور وہ نیچ ذات ملیچھ ہے"

چندو نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ غصے میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ایسے کہ اسے کوئی اشد ضروری کام آن پڑا ہو۔ میری ماتا مجھے کہہ رہی تھیں۔ "بیٹا! اب تمہارے اسکول جانے کا وقت ہے۔ کھانا کھا لو اور اسکول جاؤ۔ ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی" موقع تو مل ہی گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے اس حجام لڑکے سے میل ملاپ نہ رکھنے پر لیکچر پلانے لگیں۔

چندو کی شامتِ اعمال نے سارا دن مجھے بے چین رکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آیا تو اسے وہاں سے بلانا چاہا۔ اس کی ماں مشہور زبان دراز عورت تھی۔ چونکہ وہ اونچی ذات کی بہو بیٹیوں سے جا ملتی تھی اور بے تکلفی کے ساتھ کہ وہ شاید آپس میں بھی اس طرح سے نہ ملتی ہوں گی۔ اس سے اس کو کافی جرأت ہو گئی تھی۔ لیکن مجھ پر وہ ہمیشہ سے مہربان تھی۔ اب کچھ طنز آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کیوں نہ ہو پورے ساٹھ سال کی ذلت اور رسوائی کوئی برداشت کرے تو اس کے لب و لہجہ میں طنز آ ہی جاتی ہے۔ "ہاں تو تم آ گئے۔ تم یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لئے آئے ہو گے۔ اگر تمہاری ماں تمہیں یہاں دیکھ پائیں تو میری آنکھیں پھوڑ دیں کہ میری نگاہیں تمہارے خوبصورت چہرے پر کیوں پڑیں۔ تم ایسے ہی بھولے بھالے ہو جیسے کہ نظر آتے ہو۔ یا کہ تم بھی اپنے بھائی بندوں کی طرح چھپے منہ بگلے بھگت ہو"

میں نے اس سے دریافت کیا "اماں چندو کہاں ہے؟"

اب اس نے قدرے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ "بیٹے! میں نہیں جانتی ہوں کہ وہ کدھر کو نکل گیا ہے۔ شہر ہی کی طرف کہیں گیا ہو گا۔ کہتا تھا سڑک پر کچھ آدمیوں نے حجامت بنوائی تھی، اور ان سے کافی پیسے مل گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس خیال میں ہے۔ کچھ ہی ہو اسے اپنے پتا کے گاہکوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ابھی بچہ ہی ہے۔ اس کے دل میں عجیب و غریب خیال آتے ہیں۔ ان لوگوں کو چندو پر خفا نہیں ہونا چاہئے۔ بچہ ہی تو ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے آئے ہو۔ اچھا تو جب وہ آئے گا میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ کہیں سڑک ہی کی طرف گیا ہو گا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا اماں" اور گھر کو چلا آیا۔

اس دن شام کو چندو میرے یہاں آیا اور معمول کے مطابق سیٹی بجائی۔ سیٹی ہی ہمارا ایک اشارہ تھا۔ جسے کہ ہم شن سمجھ لیتے تھے اور بڑے بوڑھوں کی لعن طعن سے بچے رہتے تھے چونکہ انہیں ہمارا میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چندو نے دیکھتے ہی مجھ سے کہا۔ بازار کی طرف چلے آؤ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

میں اس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اس نے کہنا شروع کیا: "تمہیں خبر ہے آج صبح میں نے کچہری کے قریب لوگوں کے رموٹنڈ کر اور خط بنا کر ایک روپیہ کما لیا ہے۔ اگر مجھے پچھلے پہر جلدی ہی لالہ جی کی گدی پر واپس نہ آنا ہوتا تو میں اور بھی بہت کچھ کما لیتا۔ اب دیکھو تو میں ان رسم و رواج کے دیوانوں کو کس طرح سبق سکھاتا ہوں۔ میں ستیہ گرہ کرنے والا ہوں۔ میں اب ان کی خدمت گزاری کے لئے ان کے گھروں میں نہیں جاؤں گا۔ لالہ گم چند جی کے بیٹے سے جو کبھی کبھی جوئے کا داؤ بھی لگاتا ہے، جاپانی بائیسکل پانچ روپے کو خرید کر چلانا سیکھ لوں گا۔ اور اس پر سوار ہو کر شہر بھر کا چکر لگایا کروں گا۔ میں جب اپنی سفید پگڑی باندھ کر اور دوسرے کپڑے پہن کر بائیسکل پر سوار ہوں گا —— اور خاص طور سے جب کہ اس دو پہیہ گاڑی کے سامنے بیگ لٹکانے کی ایک کھونٹی بھی ہے —— تو کیوں دوست! بابو معلوم ہوں گا کہ نہیں؟"

مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ میں نے کہا "ہاں!" میرے جسم میں جذبات کی جھرجھری سی آ گئی۔ اس لئے نہیں کہ سائیکل سوار چندو کی عظمت و شوکت کو خیال میں لا رہا تھا، بلکہ اس لئے کہ اب میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے خیال تھا کہ اگر چندو نے بائیسکل خرید لیا تو مجھے بھی کبھی کبھار چڑھنے کے لئے دے دیا کرے گا۔ اور اگر یوں نہ ہوا تو سائیکل کی پچھلی کھونٹی پر یا اس کے ساتھ آگے بیٹھ کر شہر تو چلا ہی جایا کروں گا"۔

چندو نے بائیسکل کا معاملہ کچھ اس خوبی سے طے کیا کہ مجھے اس قسم کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ روپیہ پیسہ وہ بے دریغ خرچ کر دیا کرتا تھا لیکن اس معاملہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ واقعہ چندو کی تجارتی قابلیت کا اتنا بڑا مظہر ہے جس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے رازداری کے طریقے سے مجھ سے کہا "تم ذرا ایک روز اور انتظار کرو میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ تم اتنا ہنسو گے کہ کبھی عمر بھر میں اتنا نہیں ہنسے"۔

"مجھے ابھی بتا دو" میں نے بے صبری سے اسے کہا۔ اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے کارنمایاں کے جوہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس نے کہا "نہیں! ابھی انتظار کرو۔ میں درست تمہیں صرف اشارۃً ہی بتا سکتا ہوں —— یہ ایک راز ہے جو صرف ایک حجام ہی جان سکتا ہے۔ اب مجھے یہ مشین سیکھنے دو۔ تم اسے پکڑ لو۔ میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ خیال ہے کہ اسے چلا ہی لوں گا"۔

میں نے کہا "لیکن سائیکل سیکھنے کا تو یہ طریقہ نہیں۔ میرے چچا جی نے پچھلے پہیے کی کھونٹی سے چڑھنا سیکھا تھا اور بھائی نے پہلے کوشش کی تھی کہ پیڈل پر کھڑا ہو کر اپنے بوجھ کا توازن قائم رکھے"۔

"تمہارے چچا جی تو ایک بھاری ستون ہیں۔ اور تمہارا بھائی لمبی ٹانگوں والا کیکڑا ہے"۔

میں نے کہا "بہتر" اور اس کے سوار ہونے کے لئے بائیسکل تھام لیا۔ میری نگاہیں ابھی بائیسکل کی پالش کی چمک دمک کی داد دے رہی تھیں کہ ہینڈل میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندو سائیکل سمیت دھپ سے دوسری طرف جا گرا۔ ساہوکار کی دکان سے جہاں کئی کسان زمیندار کے ارد گرد اکٹھے ہوئے تھے، ایک ساتھ فضا میں قہقہے بلند ہوئے۔ ساہوکار نے بھی چیخ کر کہا۔ "کل یگ کے شیطان! خوب سزا پائی۔ بچھیرے کہیں کے ہڈی پسلی توڑ ڈالو ورنہ یوں تو تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے"۔

چندو کا سر ندامت سے جھک گیا اور لگا مجھے سخت سست کہنے۔ میرا تو خیال تھا کہ اسے یہ پریشانی میری وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے وہ مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیگا۔ لیکن اس نے صرف اسی قدر کہا "احمق! تم بڑے ہی نکمّے ہو"۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور کہا۔ "دیکھ لیں گے! دنیا کس پر ہنستی ہے۔ مجھ پر یا ان پر"۔

میں نے مستعدی سے کہا: "اب سے میں مضبوطی سے پکڑوں گا۔" پھر میں نے گرے ہوئے سائیکل کو اٹھا لیا۔

زمیندار نے کہا: "ہاں! توڑو بڈی پسلی۔ مٹور کہیں کے۔"

چندو نے مجھ سے کہا: "پرواہ نہ کرو۔ میں انہیں بتا دوں گا۔" میں نے پورے زور سے سائیکل کو پکڑ لیا۔ اور وہ ہمت کر کے گدی پر بیٹھ... اور مجھ سے کہا: "چھوڑ دو۔"

میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اس نے بائیں پاؤں کے زور سے پیڈل کو دبایا۔ پہیئے گھومے ہی تھے کہ چندو کا بوجھ ایک طرف کو جھکا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا پاؤں دوسرے پیڈل پر آ گیا۔ توازن کچھ قائم ہو گیا۔ لیکن جھکاؤ اب کچھ دائیں طرف کو تھا۔ چندو کچھ اس طرح سے لڑکھڑا... کہ خوف و ہراس سے دل کانپ اٹھا۔ لمحے بھر کے لئے وہ ایک طرف کو خطرناک طور سے لٹک بھی گیا۔ اس کا ہینڈل ... گیا۔ اور وہ لڑکھڑا... اس موقع پر ہنسی اور طنز کی ملی جلی ہوئی آوازیں دکان سے آتی ہوئی سنائی دیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ اب کے اپنے اناڑی پن کی وجہ سے ذلیل ... ہوا تو یہ شور و غل اسے لے ڈوبے گا۔ لیکن کچھ معجزہ ہی ہوا۔ چندو کے پاؤں ٹھیک ٹھیک پیڈلوں پر چلنے لگے۔ ہینڈل کو بھی اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور اس کو بھی کوئی جنبش نہ ہوئی اور آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرا گلا "شاباش شاباش" ... آواز سے پھٹا جاتا تھا۔

ایک میل تک وہ اسی طرح چلا گیا۔ اور واپسی پر بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

یہ چندو کا ایک نیا کمال تھا۔ اسے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ میں بھی اس کی خوشی میں شریک ہونے کا مشتاق تھا۔ لیکن میں دوسرے ... سے نہ مل سکا۔ کیونکہ مجھے سیدھے اسکول سے ہی اپنے چچا سے ملنے کے لئے دیر کے بعد جانا پڑا تھا۔

تیسرے دن وہ میرے ہاں آیا اور اس نے کہا: "کل جس مذاق کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ابھی ابھی تم پر ظاہر ہو جائے گا۔" میں ذرا ... پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس سے پوچھتا جاتا تھا: "بتاؤ وہ ہے کیا؟"

وہ خود گاؤں کے کمہار کے تنور میں چھپ گیا اور کہنے لگا: "دیکھو! ساہوکار کی دکان میں جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ اسے تم دیکھتے ہو؟ بیچ نو... کون ہے؟"

میں نے مختلف صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لمحے بھر کے لئے دماغ کو چکر سا آ گیا۔ میں نے کہا: "مجھے تو صرف کسان نظر آتے ہیں۔ زمیندار کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے کہا: "پھر دیکھو! تم تو احمق ہو۔ زمیندار وہیں ہے۔ وہ دیکھو لمبے لمبے چیتھڑوں والا۔ اس کے منہ پر سفید سفید جھاگ لگا ہوا ہے۔ جھاگ نہیں سفید بال ہیں جو حجامت نہ ہونے کی وجہ سے بڑھ آئے ہیں۔" زمیندار اپنی گھنی مونچھوں پر مہندی لگایا کرتا تھا۔ میں جوں جوں ... مونچھوں اور گردن کے سفید جھاڑی دار بالوں کو دیکھتا تھا۔ حیرانی سی ہوتی تھی۔ دفعتہً میرے منہ سے نکل گیا: "اہاہا! بیمار شیر کتنا زیادہ ... نظر آتا ہے۔"

چندو نے تنبیہ کے طور سے کہا: "چپ رہو۔ شور نہ کرو۔ ساہوکار کو تو دیکھو۔ کوڑھی نظر آتا ہے۔ اس کی مونچھیں دیکھو۔ تمباکو کے دھوئیں سے زرد ہو رہی ہیں۔ انہیں کبھی میں تراشا کرتا تھا۔ اب تم دکان کے پاس جاؤ۔ اور وہاں پہنچ کر کہو: اودبلاؤ، اودبلاؤ۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

میں آخر یہ چندو کا ایک پرجوش چیلا تھا۔ ذرا بھی تو دیر نہ کی۔ میں نے دکان کے پاس پہنچ کر اودبلاؤ! اودبلاؤ کہا۔ کسان جو زمیندار کے گرد کھڑے تھے۔ ان کے دل گدگدا رہے تھے۔ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن پاس ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔

ساہوکار نے چلا کر کہا۔ پکڑلو اس چھوٹے شیطان کو۔ یہ اُس حجام لڑکے چندو کا ساتھی ہے۔

لیکن میں اتنے میں برگد کے درخت پر چڑھ چکا تھا اور وہاں سے مندر کی دیوار پر کود گیا تھا۔ وہاں میں نے پجاری پر بھی فقرے کسے۔

اس حجام لڑکے کی ستیہ گرہ کی افواہ سارے گاؤں میں پھیل گئی اور گھر گھر بڑے بوڑھوں کی بڑھی ہوئی داڑھیوں کا مذاق اڑنے لگا۔ اونچی ذات کے لوگ یہاں تک، کہ خود ان بزرگوں کے گھر کے افراد بھی اس اجنبیت پر ہنس ہنس پڑتے تھے۔ اور ان کی شکل و صورت پر عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ جب تک داڑھی مونچھ کٹتی رہی زمیندار کی جوان بیوی خاموش رہی۔ لیکن اب تو اسے کراہت سی ہو گئی تھی۔ اس کراہت کے دور ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اب اُس نے کسی جوانمرد کے ساتھ ہم سفر ہونے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر وہ اپنے میاں سے بیس برس چھوٹی بھی تو تھی۔

چندو ان دنوں بدستور شہر جاتا رہا اور وہاں خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ان دنوں چندو کا کام کاج شہر میں خوب چلا اور اُس نے کافی رقم بچالی۔ اپنے لئے نئے کپڑے اور نئے اوزار بھی خرید لئے اور مجھے بھی کئی تحفے لا کر دئے۔

گاؤں والے یہ دھمکی دیتے تھے۔ کہ اُسے بد عنوانیوں کی وجہ سے جیل بھجوا دیں گے اُس کی ماں کو بھی حکم ملا تھا کہ وہ اُسے ٹھیک راستے پر چلائے ورنہ نقص امن کی پاداش میں اُسے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔

لیکن چندو کی ماں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ خوش حالی کا منہ دیکھا تھا۔ وہ ان کے متعلق جو کچھ خیال رکھتی تھی۔ صاف صاف اُن کے منہ پر کہہ دیا اور اتنا صاف کہ اُس سے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ یوں کام نہ چلے گا۔ ویرکا کے حجام کو بلا لو۔

چندو کو وہ عام طور سے حجامت کے دو پیسے دیا کرتے تھے۔ ویرکا کے حجام کو دو پیسے کے بجائے ایک آنہ پیش کرنا منظور کیا۔

چندو کے ذہن میں نئے نئے تصورات تھے۔ اتنے نئے کہ پہلے اُسے کبھی سجھائی نہ دیتے تھے۔ شہر کے حجام نرنجن داس کی دکان کو دیکھ کر اُسے بھی تجویز سوجھی کہ شروع بازار میں عین شاہراہ پر اپنے چچیرے بھائی ڈھونڈو اور حجاموں کو ساتھ ملا کر دکان کھول لے۔

اس کا چچیرا بھائی وہی ویرکے کا حجام تھا۔ اور یہ لوگ گاؤں کے ارد گرد کام کیا کرتے تھے۔ ان کے کام کاج کا دائرہ سات میل تک تھا۔ اُس نے اپنی تجویز اپنے چچیرے بھائی ڈھونڈو اور دوسرے حجاموں کو ذات برادری کا عام جلسہ کر کے بتائی دل اور دماغ کی خوبیوں کے ساتھ قدرت نے اُسے فصاحت کا مادہ بھی ودیعت کیا تھا۔ اس نے اپنی لسانی سے حاضرین کو یقین دلا دیا۔ کہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ یہ امیر و کبیر حجامت بنوانے کے لئے ہمارے ہاں خود چل کر آئیں۔ نہ یہ کہ ہم اپنا سازو سامان لئے لئے ان کے گھروں کا طواف کریں۔

"چندو برادرس ہیئر کٹنگ اینڈ شیونگ سیلون" نے حقیقت میں دنیا کے لئے ایک راستہ تیار کر دیا۔ اور آج تک ہمارے ملک کے مزدوروں کی کئی سرگرم انجمنیں اسی سیلون کا اتباع کرتی ہیں۔

رشید جہاں

نئی مصیبتیں

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچا زاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں۔

"شاید بارہ روپے پاؤنڈ تھا۔ کیوں نہ اماں جان؟" وہ ساس کے لئے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں،" صغرا کی جیٹھانی عطیہ بولیں "بچوں کے سب جمپر اونچے ہو گئے۔ اب مسز رابرٹ کو اون لا کر دیا ہے کہ ان کے سوئٹر بن دے۔ بڑی مشکل ہے۔"

"آپ کو کیا مشکل، بنے گی تو بیچاری نرس ——" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور موقع پر بغیر چوٹ کئے نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ وہ سال میں دو تین جمپر بنا کریں اور ادھیڑیں اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بنتی؟" بھابی عطیہ نے چیخ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے۔ اور بقول صغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی شائستہ لڑائی نہ ہو۔ اماں کو صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں۔ "سچ تو ہے اون بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی پیسے سے ایک پونڈ لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آتش دان کے سامنے اپنی سفید بلی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں۔ ادھر بلی اونگھ رہی تھی۔ ادھر چچی اماں۔ لیکن نہ معلوم کس طرح صغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے بولیں۔ "لاؤ گی کہاں سے؟ آج کل لڑائی کے زمانہ میں اون رکھی ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی۔"

"ابھی ابھی صبح ہی تو آپ دکان سے لے کر آئی ہیں۔ اور اب کیا دن بھر میں ساری دکانیں خالی ہو گئیں۔" چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ جانے دیتے تھے۔

رشید جہاں کا یہ سب سے پہلا افسانہ دلی کی سیر ایک رجحان کی ترجمانی کرتا ہے ان کا فن آپ کو اس افسانے میں ملے گا (مرتب)

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے کب کہا تھا کہ دکانیں خالی ہو گئیں؟"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ کوئی نیا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب بھی ساس کی فکر تھیں۔ اور اب تو اور بھی زیادہ۔ ان کے اوپر روپے کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ورکتا رہا تھا۔ اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ ان کو بالکل ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے!"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا! .... صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا......"

"اے ہے ابا جان رہنے بھی دیجئے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے"۔

چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لئے تیار ہونے چلے گئے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا۔ "خیر تم مت لینا۔ مجھ کو تو اون چاہئے .... میں ضرور خریدوں گا......"

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں ...." لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اون اب ناپید ہو گیا ہے"۔ چچی اماں نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا کہ سننے والے کو ترس آجائے۔ آج ہی صبح میں، بھابی عطیہ، اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپے سے زیادہ کا اون لے کر آئے تھے۔

"اون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اجڑ گئی ہے"۔ میری اماں نے بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان ٹھیک ہے اب جارجٹ کے دام ہی دیکھ لیجئے۔ پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپے گز بہت اچھی جارجٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپے گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں نے اتنے تھوڑے کپڑے مسوری میں بنائے اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں"۔

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ"!

"نوکروں کی وردیاں ہر سال سو سوا سو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھند اٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے۔ کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سن لیں"۔ چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"اے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عیب ہے کہ صفائی کے نام پہ ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں"۔ اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی بی آج کل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی ایسا تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں"۔ یہ چوٹ بچاری صغرا پر ساس نے کی...... بیچاری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں۔ ساٹھ برس کی عمر ہونے پر بھی بہت شوقین تھیں اور باوجود بے شمار ساڑھیاں ہونے کے صبح ہی دو نئی ساڑھیاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا میں نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساڑھیاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پہ غصہ آرہا تھا۔ کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں "کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشین کی قیمت تو ڈیوڑھے سے زیادہ ہو گئی۔ ۲۴ روپے میں وہ ساڑھی ملی۔ بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن سکتا ہے۔ اور دوسری تو خیر سودیشی سلک تھا۔ ۱۷ روپے میں سستی سی مل گئی۔ میں کہتی ہوں کہ آج کل تو وہ برا زمانہ آگیا ہے۔ کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا۔ بڑی مصیبت کے دن ہیں......

اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے......"

"آپ سچ کہتی ہیں اماں جان!" بھابی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لے کر دل دکھا دینے والی آواز میں کہا "یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے۔ کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام و چین اس کمبخت کی نذر ہو گیا ہے......!"

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا ٹھیک ہو......، پٹرول کے دام ہیں کہ بادا کے مول اور پھر بھی ناپید۔ وہ تو کہو کہ تمہارے بھائی جان کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی شکار کی موٹر پڑی تھی۔ اس چھکڑے کو پچاس روپے دے کر رجسٹر کروا لیا تو جا کر دو موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا۔ سچ سچ اس لڑائی میں تو پچھلی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے۔" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

"ہم نے تو اپنی موٹر بندی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سویرے سیر کرنے کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہوئی ہے ناس ہی ہو گئی۔" میری اماں نے صاد کی۔

"ہاں بہن تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پر پابندی سرکار نے کیوں لگا دی۔ اب دام دو روپئے چار آنہ گیلن تھے چلو تین روپے کر دیتی۔ لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے پاس دام ہوتے وہ خریدتا جس کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا" بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا۔ جیسے گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پر ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پر آفت آئی ہوئی ہے لو بھلا سیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی لے جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور انڈے؟" چچی اماں نے کہا "بارہ آنہ درجن تو ہو گئے۔ اور مرغی وہ بھی اب دو دو روپے تک ہو گئی۔ کوئی کھلائے تو کیا کھلائے۔ اور تو اور آج تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس (Prunes) کہیں ملتے ہی نہیں، بلا سے پچھلے مہینے بیس بیس روپیہ سات سیر کا ٹین مل تو گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں...... فروٹ سلیڈ بغیر پرونس کے بچے تو چکھتے بھی نہیں......!"

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے۔" عطیہ نے ساس کے ساتھ ہمدردی کی۔ "راشد تو برابر یہی کہتا آتا ہے کہ دادی ماں کا خانساماں ہی اچھے چیز اسٹیکس (Chees Stakes) بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں سے بھی اچھے......"

"ارے تو میں کیا کروں دولھن کہ کوکنگ چیز (COOKING CHEES) تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی بھی نہیں دیتا۔ [illegible] کی دکان پر گئی اور کہا کہ بھئی سونے کے مول ہی دے دو۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے لیکن وہ کہیں ہو تو دے!"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔

"ہائے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی۔" بھابی عطیہ نے شو شو کر کے ایک دم سے کہا۔

"ہاں سچ تو ہے۔ اس کم بخت واجد نے نہ تو لکڑی پوری ڈالی اور نہ ہیٹر اب تک لگایا۔ ارجمند ذرا اس گھنٹی کا بٹن دبانا...... چار چار تو نوکر ہیں اور پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کرو۔ بوا آج کل تو کوئلہ بھی دو آنے سے دو دو روپے ہو گیا۔ بجلی کی سستی رہتی ہے۔ سنے تو وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

پھر صغرا سے کہا "ذرا صغرا تم جا کر دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے تمہاری چھٹانک بھر [illegible] رہتی ہے......" صغرا [illegible] کو جھٹک کر جلدی سے اٹھیں اور "[illegible] تو ہی ہیں بھی" "بھابی ٹھیرو۔ میں بھی آتی ہوں" کہہ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"دیکھیو گرم کپڑے میں...... جانا۔ ٹھنڈ میں نہ جانا۔" ماں کی آواز میرے کان میں آتی رہی۔ میں اور بھابی برآمدے پر ہو کر باہر آ گئے۔ باہر ہوا اتنی تیز اور ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے آر پار ہو رہی ہے۔ بھابی نے باہر نکل کر واجد! واجد! کو کئی آوازیں دیں۔ اور کوئی جواب نہ پا کر

بچارا مردی کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہوگا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں۔ تھوڑی دور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا۔ اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ مالن مع اپنے تین چار بچوں کے بیٹھی تھی۔ دھوبن بھی مع اپنی فوج کے جمی ہوئی تھی۔ ماجد اور دوسرے خدمت گار بھی وہاں موجود تھے۔ مہتر بھی ایک کونہ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی "اے چھوٹی دولھن ذرا ادھر آنا"۔

چھوٹی دولھن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگیں۔ سب مرد نوکر کھڑے ہو گئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغرا نے پوچھا۔

"اے دولھن! یہ لڑائی کب تک چلے گی؟"

"بہت دن ...... کیوں؟"

"ہے رام! ...... سچی؟"

"ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی" صغرا نے لاپروائی سے کہا۔

"ہم لوگ کیسے جئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے"۔

"تین سیر کا تو گیہوں ہے" ایک مزدور نوکر نے اطلاع دی۔

"اے بٹیا سچ بتاؤ۔ یہ بپتا کب ختم ہوگی؟ ہمارا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا؟" مالن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے!"

"دولھن تم تو ہر بات میں مذاق کرتی ہو سچی بتاؤ اکھبار میں کیا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا۔

"ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو" سب نے امید بھری نظر میری طرف پھیری۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی۔

"دولھن! میر بوا کہت رہیں کہ نوکرن کی چھٹنی ہوگی؟ کا یہ ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم"۔

ماجد ہیٹر لگانے چلا گیا۔ میں اور بھابی وہیں الاؤ پہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے۔ راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑا نہیں پہنے تھی ——— بولیں "آدمی اگرچہ تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آجائے گی ....."

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے "اونہہ" پیٹ بھر دے کر بولی "یہ اس کو آپ نے خوب کہی"۔

بھابی ہنسیں "اور نہیں تو کیا۔ بھابی صفیہ کی جان چھوٹ گئی۔ یہ کم مصیبت ہے۔ تمہاری اماں کی ہوا خوری کم ہو گئی یہ کچھ کم مصیبت ہے۔ اور ہماری احساس سے چارہ گی کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں۔ بڑی کنگ مہنگی ہی جاتا ہے اور نہ پردیس ...... اور اگر ان پہ تمہیں نمونیہ ہو گیا؟"

محمد حسن عسکری

حرام جادی

دروازہ کی دھڑ دھڑ اور کواڑ کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنوئیں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں لیکن دوسرے لمحہ ہی نم اندھیرے کے ہلکے ہلکے اجالے میں ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈوروں کو دبا دبا کر ملانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر بھنبھنا رہے تھے۔ وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے —— اور پھر بھی وہ بھنبھنا رہے تھے۔

امید و بیم کی یہ کشمکش جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازہ کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں: "کھولو —— کھولو۔" یہ آوازیں تیلی، نوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کئے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا کھولو۔ کھولو کے وقفہ کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا..... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہوئے کہا "نصیبن دیکھو تو کون ہے؟"

یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی جب سے وہ اس قصبہ میں مڈوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا —— یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش یہی جھلاہٹ اور پسپائی —— سب اسی طرح، اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا اور پھر اس کا سارا دن نوزائیدوں کو احتجاجانہ چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں، کچھ دن آئے ہوؤں کی رفتار ترقی کے معائنہ میں اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گذرتا تھا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے —— ہر گھنٹہ ہر گھڑی اسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آ رہے تھے

جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر، ضبط تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکتے تھے اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے، ۵۶ سالہ بڈھے، الھڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور ایک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں اور پھر وہ بچارے کرتے بھی کیا۔ وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرضیکہ بچے چلے آ رہے تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، بے پنکھ مرغ کی طرح سرخ بچے اور کبھی کبھی گورے بچے، دبلے پتلے ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایلی نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی ——— اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آجاتی تھی ——— کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں۔ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک۔

اور اسے انہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرہ کو برستے ہوئے دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی، روڑوں کی سڑکوں، تنگ و تاریک، سیلی ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھنسے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا اور پھر نالیاں تو ٹھیک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوارن کے بہے بہتے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کئے رہتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سمیٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایلی کو ہلکے ہلکے فیروزی سینڈل کے بجائے اونچی ایڑی والا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک کے ابھرے ہوئے روڑے اکثر اس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستہ میں گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی اور یہاں کی گرمی! اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینہ میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں اور اس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی بھنتی سڑکوں پر سے گزرتی تو اسے دور آلھا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ اور درخت کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بدھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور پُر استہزا معلوم ہوتے اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا ہے جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کئے رکھتا ہے۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی ——— ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی ——— کچھ ہریالی اس کے سامنے تیرتی ...... اور وہ پھر اسی تپتی ہوئی ٹکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی سنبھلتی چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں: جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سنیما کے پردے کی طرح پوری طرح روشنی اور صفائی کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے گذرنے لگتیں اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر چاہتی ٹھہرا لیتی لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان ان مناظر کو یاد کرتی جن سے اسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا تو اس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی۔ گھر کی دیواریں مع رات کی تاریکیوں کے اس پر جھک پڑتیں۔ دل بھنچنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا اور اس کا سر گھمنی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اسی شہر کے اسپتال میں پہنچ گئی ہے، مگر ان در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ بیگانگی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضاء منجمد اور ناقابلِ حرکت ہو گئے ہیں اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دل پر مسلط۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی،

اور دراصل اس کے لئے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہئے تھا۔ ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا، مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی ملی ہوئی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گرد و غبار، شریر لڑکے موجود تھے اور وہ ان کے وجود سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ تو ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پروا اور مطمئن تنکے کے گدّوں پر جھولتی ہوئی ان اثرات سے کبھی دس بیس پندرہ برس نکل جایا کرتی تھی۔ اس کی دنیا تو ان عدالتوں سے دور ضلع کے صدر ہسپتال میں تھی۔ کھلی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ، اور وہاں کی ہوا کا لطف تو ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کی سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی سہیلی ڈینک کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لئے نکلتی تھی تو دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھڑپھڑانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ سی تیرتی اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پُرلطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے جھکڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گذرتے چلے جاتے تھے اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرہ میں دوپہر کی سختی اور اُداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پُروقار انداز سے ساڑھی کا پلّہ سنبھالے گذرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے "میم صاحب" کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے۔ سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے۔ بلکہ قصبہ کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ رعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس سفید، سرد، متین عمارت اور اس کے غیر مرئی مگر اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجاً حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح اس کی حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائنہ کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بُرے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے نرم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں مگر اسے دوبدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی اور صفائی اور سلیقہ کی تو ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے، چادروں اور دوسری جنسوں کے مٹکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کوٹلوں کا گٹھرا، سوت اور روئی کی گٹھڑیاں، سب الّم غلّم بھرے ہوتے تھے اور ایک انگیٹھی پر گُگُل چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرہ میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ـــــ اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں، اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا الٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کُتر تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پھسر، کھڑبڑ، کراہوں "یا اللہ، یا اللہ" اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے، اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پاکر چیخنا شروع کر دیتے تھے اور ان کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں "ارے چپ چپ...... دیکھ بھیا آیا ہے..... صبح کو دیکھیو..... ننھا سا بھیا" مگر صبح کو ننھا سا بھیا دیکھ سکنے کی امید انہیں اس وقت تک کوئی تسکین نہ دے سکتی اور ان کی روں روں دھاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو کر کمرہ کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں پر لیپ پڑے ہوئے تکیوں، پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں، اور مدتوں سے نہ دھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے جیسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی، اس کا جی الٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک گھنٹہ گذارنا گویا جہنم کے

عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبہ کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی "مڈوائف" کے، جو ان دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی" ہاتھوں میں دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں انہیں تو قصبہ کی پرانی دائی، درپھٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بہت کم ہو گیا تھا لیکن آخر ذمہ داری تو اس کی ہی تھی اور وہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر برائی بھلائی کے لئے جواب دہ تھی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر زچہ ناز لڑکیاں اتنا چیختی چلاتیں اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا یا پھر ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی الٹی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی رک رک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں اور ایملی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا ورنہ دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی۔ اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایملی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو ایملی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پینے کی عادت ڈال لی تھی لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ کئے بغیر ہی وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخے اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اسے ہر بار اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ان کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں ان کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے اور وہ اس کی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے: "کہو میم صاحب! لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے کالے بالوں کی قربت اسے ہراساں کر دیتی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرے سے آ ملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے ہٹ جاتی اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر بھنایا ہوا ہو، جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پرے کونے میں اچھال دیتی اور کپڑے اس طرح جھنجھلا جھنجھلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نصیبن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ الٹا سیدھا کھانا حلق سے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تکئے پر سر رکھتے ہی نیلا ریں، پیٹر، ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتے۔ بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ سر تکئے میں گھسا جاتا مگر تکیہ اسے اوپر اچھالتا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے۔ ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے۔ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی، مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی —— کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی سخت مونچھیں، یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی، مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا ایک پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا، اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا...... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیہ والی نالی بہنے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بیتابی سے

ہلتیں ...... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک رُلتی جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی، دوڑتی ...... سیاہ آسمان پر روشن اَن گنت تاروں کے گچھے کے گچھے جگنوں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور چُبھن بخارسے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں ...... سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلّط ہو جانا چاہتے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آپہنچا اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آدھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں، بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی .... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے .... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں، وہ اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی اور امیلی نیند میں بالکل بیہوش ہو جاتی مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں ——— وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی جھلاہٹ اور چپ ہائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے ہاں بلایا گیا تھا اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا "جلدی ——— بلایا ہے ——— جلدی ———" ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے جلدی ——— آخر وہ کیوں جلدی کرے ؟ کیا وہ ان کی نوکر ہے ؟ یا وہ اسے دولت بخش دیتے ہیں۔ ہونہہ ——— جلدی : وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مر جائیں گے ؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلا کر ؟ ——— کہتی ہیں پڑھیں "اسے کیا خاک آتا ہے ———" کیا خاک آتا ہے ——— کچھ نہیں آتا ——— اچھا پھر ؟ بیٹھیں اپنے گھر، کون ان کی خوشامد کرنے جاتا ہے ——— کچھ نہیں آتا ! جیسے جیسے آئے اس نے دیکھے ہیں ان لوگوں کے تو خواب و خیال میں بھی نہ گذرے ہوں گے ——— چمکدار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے ——— اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر، وہ نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں ——— کچھ نہیں آتا ——— ہونہہ !

امیلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلوا دے وہ جلدی نہیں آسکتی۔ وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں۔ ان کے کہنے سے اس کا بگڑتا کیا ہے اور آخر ذمہ داری تو خود اس کی ہی ہے۔ چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا، "کہہ دو کہ جلد میں آرہی ہوں" مطمئن ہو کر اس نے کروٹ لے لی۔ سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے، وہ ساکت ہو جائے مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آ کر لگتا تھا "جلدی ———" جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اسے جلدی جانا تھا ——— جلدی ...... اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی۔ جلدی جانا تھا ..... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کر سکتی تھی۔ کل رات ہی، سے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین ——— اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اٹھ جانا بہت مضر ہوگا، اور خصوصاً اس قصبہ جیسی آب و ہوا میں جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر چار مہینے میں اسے چار دن بخار آچکا تھا ——— اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی، ان لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے، اس کی ——— تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ سو جاتی مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آرہی تھی اور اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے ہاتھ آنکھوں پر کھسکا لیا اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ مگر ہر دفعہ "دودھ لو، دودھ" "اپلے او کنڈے" "اُٹھ ! ہٹ ! ابے پڑھنے نہیں چلنے کا ؟" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے

اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے۔ اب اس کے اعضاء اور بھی بوجھل اور ناقابلِ حرکت ہو گئے اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ——— "جلدی بلایا ہے" اس صبح کے چاندنے، اس قصبہ برداشت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں، "جلدی بلایا ہے" اس صبح کے چاندنے، اس قصبے سب سے چھپا لے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے ——— اپنے آپ سے غافل ہو جائے ——— اپنے کو کھو دے ..... اسے محسوس ہوا کہ دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں ..... سر کے درد کو گویا یکایک کسی نے پکڑ لیا ...... وہ آنکھیں بھی ذرا کچھ دور جھکیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا ...... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا۔ سکون تھا، خاموشی تھی اور مسرت، دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی ...... وہ بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے۔ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو ......

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاندنے میں چمک آ گئی تھی۔ نصیبن نے چولہے پر دیگچی رکھی۔ بکری والا محلہ سے جانے کے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں ...... دو بادامی سائے اترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں ——— گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں ...... سائے کچھ دور پر رک گئے، وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے ...... آنکھیں صبح بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے ...... وہ مدت کے آشنا بازو ...... مگر وہ یہاں کہاں!

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ڈیمین کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے پیچھے الٹے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ ڈوروں والی جلد جلد پھرتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو ...... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازو اسے بھینچتے تھے اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو جھنجھلا پڑتی تھی مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا ...... اور اس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور نم آلود لبہ سے ...... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی۔ مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا، "...... میری جان ...... ہا ہا ہا! ...... اے می لی ...... ڈی یر ...... پیاری پیاری ...... ہا ہا ہا ———" اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی، میری جان؟ ...... ہیں؟ ...... اس سینے پر تو سرخ کھلے گی! کہو کیسی رہی؟ ہا ہا ہا ہا! ———" اور وہ لمبے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اسے ایسے وقت اسپتال سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ڈیمین سو رہی ہیں اور وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا اور وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا مگر وہ یہاں کہاں! ——— اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ——— لیکن وہ یہاں ہوتا ——— وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن ——— کچھ دوسری شکلیں ابھریں ——— اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے ——— اس کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا اور اس نے اسے کیسی بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا "لے ...... اور لے گی ...... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ ......" اگر میم صاحب شور سن کر نہ آ جاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا ——— ایلی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی ——— ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا ——— کیسی خونی آنکھیں، اور آخر میں وہ شراب کتنی

چینے لگا تھا ——— مگر وہ ہوتا تو اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا ——— ماناکہ وہ روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر ٹہلتا رہتا تھا۔ لیکن ظاہر تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا ——— اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی اور اسے اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی ——— وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ——— لیکن وہ لمبے منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی، سوکھی جیسے لکڑی ہو ——— اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو، بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آگئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے ——— نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی اس میں جو وہ ایسا لٹو ہو گیا تھا ——— اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا ——— وہ اسے تھوڑے دن یونہی چلنے دیتی تو کیا تھا ——— مگر اس نے کیسی بے رحمی سے اسے مارا تھا ——— ہاں ——— ایک دفعہ مار ہی لیا تو کیا ہو گیا۔ وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا ——— اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی۔ بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اسے اکساتی رہی ——— یہ اچھی دوستی ہے ——— اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی، اور اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی اور جو ڈینا اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی ——— ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے۔ اب وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی، اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے ......

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی، اگر نصیبن اسے نہ پکارتی "اجی میم صاحب اٹھو، سورج نکل آیا"۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چاروں طرف دیکھا اب تو واقعی اسے چلنا چاہیے تھا مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیہ پر سر رگڑا۔

وہ منہ دھو کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی۔ نصیبن لکڑیوں کو چولھے میں ٹھیک کرتی ہوئی بولی: "وہ منڈیاین کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتی ...... اجی ہو ہی آؤ ان کی طرف میم صاحب کسی دن، بڑا یاد کر رہی تھیں!"

ہو ہی آئے ان کی طرف ——— کیا کرے وہ جا کر میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ لوٹے ٹاٹ کے ——— یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انہیں تو قصے سناتے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصے سنانے کو، اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں ...... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پر چڑھی جاتی ہیں ...... اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے ...... جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں ...... کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی ——— یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے ——— عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں ——— اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں اور اگر کہیں اس کی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ جاتی ہیں اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں جیسے اس کی نظر ان میں سے کچھ چرا لے گی یا اس کی نگاہ پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی ——— ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں ——— ؟ اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا ——— بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں ——— اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا، وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں، جیسے وہ نیا پکڑا ہوا عجیب و غریب جانور ہے ——— اور جب وہ ان سے بولتی ہے تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں ——— وحشی ہیں بالکل، جانور ...... بالکل ——— اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی وہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں، اور کوئی کیوں ان کے ہاں جا کر

بیچاری موں لے اور راں کے مرد کتنی شرم آتی ہے اسے ان حرکتوں سے۔ وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہٹتے ——— "ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ" اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے ——— جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں ——— تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں ——— اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بدتمیز ہیں ——— انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی۔ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے بیچارے، ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے، بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے ——— سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا۔ وہ خود، ڈینا، کٹی، میری، شیلا اور ماں مریم ——— مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں، چھتری ہاتھ میں لئے ہانپتی ہوئی اور ان میں تھا ہی کیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس ——— اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا سب چلتے تھے، آپس میں ہنستے، مذاق کرتے ——— اوہ، شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی، کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی ——— مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں ——— اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں ——— اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے، اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے؟ ——— جیسے جانور ——— نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو، بس آؤ اور پڑ رہو ——— لے دے کے رہ گئی منصبن، تو اسے اس کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا، اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی۔ اس کے یہاں برات بڑی دھوم دھام سے آئی ——— اسے کیا ان باتوں سے ہوا کرے، اس سے مطلب؟ ——— یا بہت ہوا تو اسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سنا سنا کر ——— ایک دفعہ اس نے سنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ——— بکتی ہے بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے۔ لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ ——— مگر نہیں، بیکار کا ڈر ہے ——— جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں ——— بھلا دنیا کا کام کیسے چلے ——— پاگل ہے بڑھیا، بہکا دیا ہے کسی نے اسے ——— مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار، نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں ——— اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ——— کتنے دن ہو گئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ——— بارہ سال، کتنا زمانہ گذر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ——— کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے ——— روز اسکول پہنچانے جاتے تھے ساتھ ——— کلاس میں اس کی سیٹ میز کے پاس تھی ——— اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بہت اچھے آدمی تھے ——— بچارے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے، مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ——— اور لڑکے تو نہ جانے اسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا، سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ——— ارے وہ موٹا کرم چند، بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اسے ——— اور ہاں وہ عظیم! بڑا بھولا تھا بچارا، سوکھا سا زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا ——— اور اس دن وہ دل میں کتنا ہنسی تھی۔ اس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدہ میں دوسری طرف وہ آ رہا تھا، جب وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا، اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اس نے بہت گڑگڑا کر کہا تھا۔ "کہئے گا نہیں"۔ وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ——— کتنا سیدھا تھا واقعی وہ ——— وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا ——— مگر ——— وہ زمانہ تو اب گیا ——— اب تو وہ یہاں دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں ——— کسی کا

خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روزانہ ڈاکیئے سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں مگر —— روز جواب وہی "نہیں" —— اور جو آیا بھی تو بس وہی ملیے بادامی لفافے —— آن ہز مجسٹیز سروس —— ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو اور وہ یوں کرو۔ کوئی اس کی ملنے والی بھی جو وہ یوں کرے —— خواہ مخواہ کی آفت —— اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟ —— اگر آنٹی ہی دلّی سے خط بھیج دیا کریں تو کیا ہے —— مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں —— ایک دفعہ جانا چاہیئے اسے دلّی —— اچھا شہر ہے —— کیا چوڑی سڑکیں ہیں —— اور سینما کس کثرت سے ہیں —— اور وہ —— وہ خیر ہے ہی —— مگر وہ ——

کائیں کائیں، کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے لیٹی تھی۔ اسے جلدی جانا تھا اور اس نے بیکار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اس نے چائے کیوں نہیں لاکر رکھی مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں اور واقعی، اس نے خیال کیا۔ اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہرحال اس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اس نے دوبارہ منہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کونسی ساڑھی پہنے —— سفید، سرخ کناروں والی۔ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ —— اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے اس کی بہار تو بس ایک دن ہے۔ اگلے دن کام کی نہیں رہتی —— نیلی ساڑھی نیچے سے جھانک رہی تھی —— اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ —— مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے —— وہ جدھر سے نکلتی ہے سب کے سب اسے گھورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت —— اور ان زمینداروں کو دیکھو، بڑے شریف بنتے ہیں؟ —— خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں —— اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں —— "کھو یار!" —— "ابے مجید ذرا لیجو!" —— کوئی کھانسنے لگتا ہے کیا وہ سمجھتی نہیں —— ذرا شہر میں کہہ کے دیکھنے ایسی باتیں —— وہ مزا چکھا دیں انہیں —— مگر یہاں وہ کیا کرے، مجبور ہو جاتی ہے —— ان کی ہی وجہ سے تو اس نے رنگدار ساڑھیاں چھوڑ دیں اور سفید پہننے لگی، مگر پھر بھی نہیں مانتے —— اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے —— تو پھر سفید ہی پہن لے —— مگر روز روز سفید اور کیا، وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اسے کھا تھوڑی لیں گے، بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اس کا؟ —— اب وہ پھر رنگدار ساڑھیاں پہنا کرے گی —— دیکھیں وہ اس کا کیا بناتے ہیں —— ہنسیں گے تو ضرور —— مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے —— آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی!

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی —— مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا اور کھال بھی کھردری ہو چلی تھی۔ جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کتنی چمک تھی —— رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا —— اس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں "یہ تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے" —— مگر اب ——

اس نے آئینہ رکھ دیا اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مردا پنے پیروں کو —— اس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سوکھے اور ہلکے رہ گئے ہیں، اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور پلپلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس نے

بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو اِدھر اُدھر اڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے تھے مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی اور اس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائیبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اس کے پاپا نے اسے دی تھی۔ مدتوں سے اس نے اسے کھولا تک نہ تھا اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اسے پھر پاپا کی یاد دلا دی اور وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ پہلے ہی صفحہ پر اس کا نام لکھا تھا۔ لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی کہ وہ اس وقت کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانہ میں اس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی مگر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا۔ اب اسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائیبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائیبل کے ورق الٹنے لگی ——— پیدائش ——— خروج ——— ورق تیزی سے الٹے جانے لگے ——— استثنا ——— روت ——— یرمیاہ ——— حبقوق ——— متی ——— لوقا ——— رسولوں کے اعمال ——— کہاں سے پڑھے ——— آدم ——— نوح ——— طوفان ——— ابراہیم ——— کشتی ——— صلیب ——— مسیح ——— یسوع آ جائے ——— گرجا کا گھنٹہ ——— سب مل کر گرجا جاتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے ———

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے اور اسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائیبل پڑھا کرے گی ورنہ کم سے کم اتوار کو ضرور ——— لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے ——— بہت ہی بری بات ہے ماما کبھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں ——— اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا، اور لگے بھی تو کیا ہے دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں مگر باوجود اس کے آنکھیں پھٹ پھٹانے سے پہلے تو اس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھس آئیں اور پھر پاپا اور ان کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ اور سب مل کر گرجا جایا کرتے تھے۔ ہنستے، مذاق کرتے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکے دیئے گویا ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے ——— آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا، اور خاموش۔ صرف کانوں اور سر میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور دعا کو دہراتی چلی گئی "اے میرے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین!"

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی اس نے پھر آئینہ میں جھانکا اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لئے دعا مانگے۔ لیکن کیا چیز؟ کوئی ا ——— اس کا تبادلہ شہر میں ہو جائے ——— مگر وہاں اسے پھر وہ تیمن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے ——— پھر اور کیا؟ ——— وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا ——— پھر آخر کیا؟ ———

اس نے بہت بازو ملے۔ مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اس لئے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی اور وہ سڑک کی نالی، ریت کنکروں سب سے بے پروا اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے اپنی رفتار میں کبھی کچھ سستی معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک

نہ نکلے تھے اس لئے اسے اپنی آنکھ ناک کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سایہ میں سے گزرتی تو اس کے پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک دکاندار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ کیا یہ اسے دیکھ رہا تھا؟ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اسے ویسے ہی ہو گئی تھی ——— وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی: "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی...... جیسے ان میں البسا ہوا ہے آج" ——— اس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے...... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے، اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی ——— آخر کہاں تک؟ ——— پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی ——— مگر ان آنکھوں نے جو اب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اسے رکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلّو اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی......

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب مرقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی، بولے:

"اخاہ میم صاحب! بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو!"

"جی...... ہاں...... وہ ذرا دیر ہو گئی" کہتی ہوئی وہ زنانہ کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازہ پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گزر رہی ہے، یہ کہتی ہوئی "جرا دیکھو تو...... ابھی تک نہ نکلی گھر سے حرام جادی!"

عزیز احمد

زرّیں تاج

جیپ بہرحال دغا دینے پہ تُلی ہوئی تھی۔ ہر دس دس گز پہ رُک رُک جاتی۔ بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا ارشد نے حسین چاندنی رات کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک، اس پر بکھری ہوئی چاندنی، کناروں پہ یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی۔ اور آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ کو اور جیپ کی اس مسلسل شرارت کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے ذرا بھی واسطہ تھا؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ڈرینیج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی۔ اور کنارے سے موٹر تو کیا آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا "سرکار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں" آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پہ ارشد کو ترس آرہا تھا اور غصہ بھی۔ دور پہ کوئی بیل گاڑی کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتی لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں۔ مذاق نہیں تھا۔ آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آؤٹ تھی۔ لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پہ جلا رکھا تھا۔ اور سوئی ہوئی زمین پہ انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے، چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے گھر گھراہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا ——— امجد بھائی نے آج دعوت کے لئے کیا اچھا دن چُنا تھا۔ . . . چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کپڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آ گیا تو . . . موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چھپ جانے کے لئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں، اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہُوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اب دور پہ . . . . . . چشم زدن میں، نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا، اور پھر سڑک کے بالکل

قریب تقریباً پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گذر گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ جسم نے تھرتھری سی لی۔ جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ ایک سرخ سا گولہ زمین پر پھٹا اور شعلہ بلند ہوا، سرخ شعلہ۔ "سرخ پیاز" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے کو شہر یا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت ممانعت تھی۔ اب ہوائی جہاز بہت دور جا چکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ الٹے پاؤں وہ جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر انجن کا رخ کیا۔ اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر ارشد کو تعجب ہوا۔

"میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔ چلے چلو۔"

"آپ جائیے سرکار۔ میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا بہت دور پر۔ اور اب بہت اوپر۔ نیلا ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا پھر غائب ہو گیا۔ وہ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گبرڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے گھسیڑ کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح امڈتے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا معشوقوں کی طرح، عجمی شاعروں کے معشوقوں کی طرح دل ربا اور خونریز معشوقوں کے رخ زیبا جیسا چاند، ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت، ان کی حنائی انگلیوں اور سرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ ——— اور اسے جنگ پھر یاد آ گئی اور وہ ہوائی جہاز جو ابھی ابھی گزرا تھا ——— دور پر ایک موٹر گذری۔ اس وقت، اور اس رات اس کے سوا کسی اور بیوقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موٹر گزری وہاں چوراہا ضرور ہو گا۔ چوراہا ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلیاں اور سرخ ہونٹوں کی طرح سرخ خونریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی، تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آ سکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز، خون کو منجمد کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد، ایک مسلسل کراہ۔ وہ جو نعرے لگاتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہو گا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ ڈھونڈے گا۔ ایک اور چوراہے پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز، بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی، ایک آدمی آر پار جانے والی سڑک سے تیزی سے سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پیشین گوئی کی "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا۔" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی۔ ——— سائیکل سوار فوجی لاری کو جل دے کر نکل گیا۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد۔ اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل دور۔ جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی شہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ——— حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی، سانپوں کی، اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے لپیٹے تھی۔

اور دفعتاً چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی، خواب کی طرح، عشقِ حقیقی کی طرح، ذرا ذرا سے سلگے ہوئے جنون یعنی جنونِ ذی فنون کی طرح۔ اور اسے سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے، جیسے وقت کی

فنا ہو گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں چل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے . . .

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گذرا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیب، شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں، فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ کہ اس زندگی اور اُس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اسی کی یاد، اسی کا سلسلہ ہے . . . .

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطب جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ والا "یہ تیسرا کون ہے" "یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے وجود سے عدم، عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی اور حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں جیسے۔

یہ قدموں کی چاپ، یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، پیدل، کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بچارا شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش! اور حسین اور یہ سڑک، یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے، یہ کالی کالی زلفیں . . . .

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی، وہ دوسرا ساتھی، چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر، اس کی ہم سفر . . . . . . اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زرّیں تاج ہوں"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا۔ ہوس آرائی کی تھی، تفریح کی تھی، کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا، کبھی عشق کا ہوس پر۔ اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے یہ دوئی فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے، اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں، کانٹوں کی جھاڑیاں، دیو ہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غالب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا اور پھر ہوس کے بعد تھکن اور پھر عذر واماندگی لے حسرتِ دل . . . . . اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا۔ جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زرّیں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں۔ اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کے جس نے باب کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف، اس اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے زرّیں تاج کو مخاطب کر کے کہا "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت ہوئی ہے۔ اگر کبھی حالی ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی دورانِ خضر میں، مرودِ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو عشق سے، ہوس سے، خواہش سے، اور ان سے جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لپٹی ہوئی حسین ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی شاعرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف . . . . صدیوں کے آر پار۔ اور پھر اس نے زرّیں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب اُلٹ دیا تھا، یوں اس کا لباس سیاہ تھا۔ ایرانی عورتوں کی طرح۔ ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بادفروش کے ساتھ کجاوے میں پہنا ہو گا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی، کافوری چمک تھی۔ ایک حسین آسیب، الفت کے پہرے کی چمک۔ جیسے ملکۂ زکا چین کی کھلی ہوئی لاش کی مارکو پولو کے نام یہ پیغام . . .

"یہ کہ دنیا کہ میں نے محبت کی اور مرگئی۔ اب میں محبت ہوں اور زندہ ہوں۔ اور چونکہ زندہ ہوں جھول گئی۔ اور چونکہ محبت ہوں سب کو معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلۂ خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے، جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا "تم ملکۂ کوکا چین ہو۔ تم زریں تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی "کوکا چین نہیں وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی۔ میں زریں تاج ہوں۔ میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے، اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ پہلے مجھے دیکھ کر عشق عشق کرتے ہیں۔ پھر محبت کرتے ہیں، جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قیمت لے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گذر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں، اپنی رقیب سمجھ کر۔ اور جب میں مر جاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا۔"

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی، چاندنی کانپ گئی، سب درختوں اور ان کے سایوں کو فالج مار گیا۔ دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر ایک نیلا ستارہ چمکا۔ پھرکتے جھینگے جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا۔ اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ زریں تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پل صراط پر چاندنی کے برزخ میں۔

دور پہ ہوائی جہاز نے پھر سرخ پیاز جھینکے، زمین سے ٹکرا کے مینر سرخ شعلے اٹھے۔ پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا۔

اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی، چاندنی سے زیادہ حسین، ایرانی شاعری کی دوشیزہ کی طرح جمیل، اس کے لب لعلین چاندنی رات میں چمک رہے تھے، سینکڑوں میل دور ٹینکوں سے سچ مچ کا خون بہہ رہا ہوگا، اور سچ مچ کے بے پناہ گزین غنڈوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور سچ مچ کی عورتیں اپنی عزت ——— زمانہ امن کا تصور ——— بچانے کے لئے کنوؤں اور باولیوں میں گر رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پل صراط کے اس پار تک، جس پر سے گذرتے ہوئے زریں تاج نے پوچھا "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرم راز کتے، سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے۔ اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زریں تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زریں تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا۔ "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں۔ اور وہ مسکرائی۔ چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زریں تاج کا، کالا طلسمی جوڑوں کا سا لباس چاندنی رات میں یکلخت چمکا۔ جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا ——— اور اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام سیرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں بنا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی نژاد تھی، عیسائی تھی، مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی، لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھو گئی کہ نہ مجھے اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانۂ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار عورتیں چھینیں، ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے ہزاروں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے، شکار کھیلنا آتا ہے، راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے میں مکالماتِ عشق میں ماہر ہوں، اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو، جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں، میرے حسن و جمال کی تعریف سنتا ہے مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ اور مجھے ڈھونڈنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ دل اپنے "جوہ نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں، اپنے تیرِ مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں جنہیں مہین بانو نے میری دلجوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر، خسرو کا چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے، میں مبہوت رہ جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں "شیریں! شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے، یہ طلسمات کا جنگل ہے" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی" اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار، نئے بسمل، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے، پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے اور سوفار، ابروؤں کی اور کمانیں۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تصویر بناتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ مجھے فارسی شاعری کی ایک روایت کو جنم دیا ہے۔

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہریار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے۔ جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ جُل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کے نکل پڑتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے چشمۂ آبِ حیواں، چشمۂ نرگس، چشمۂ آبِ حیات، چشمۂ تسلسلِ حیات۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اتر پڑتی ہوں۔ میں کپڑے اتارتی ہوں۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سانپوں کا زہر ہے، اور یہ زلف حبل المتین بھی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے ہونٹ عقیق و لعل، میرے دانت موتی، میرے شانے آئینے اور پھر نازپستان، میری کمر، ساقِ سیمیں میں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت، یہ کیا غضب ہے۔ کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پر آ نکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں، کوئی موسم نہیں، کوئی دیار نہیں، زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے، پھر میری جانسوز عریانی دیکھتا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔ میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے باد پا رہوار پہ سوار ہو کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں بلکہ اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے......

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اس کی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے۔ اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا کبھی فنا نہیں ہوا عشق ہے۔ اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا کبھی فنا نہیں ہو سکا عرفان ہے اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار ہی ظہور ہوتا ہے، آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیرویہ آتا ہے۔ اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مر چکی ہے۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں۔ خسرو پرویز دیارِ عشق کا شہریار ہے۔ میں دیارِ حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری، زر، زور کوئی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے۔ اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکۂ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بسا دی جاتی ہوں۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سراپا والی بات۔ اور بالآخر شکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ عجمی نسوانیت کی روح اس سے اب بھی دور ہوں۔ بہت دور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ، اور زاری اور زر اور زور کسی کی مجھ تک پہنچ نہیں۔ زاری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرۂ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ عجمیت کی روح کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ دربار کی لی ہوئی شاعری سے اور توقع ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے، میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے، دیارِ جمال میں۔ اس کی سپاہ، میرے دار السلطنت میرے قلعے کے اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے، منت و زاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجت کرتا ہے اور میں اس کی ہر حجت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جتاتا ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پہ ملامت کرتا ہے۔ میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں۔ اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے حواسِ خمسہ سے شخصیتوں کی بجلی سے۔ اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کرنے کے لئے اپنی وارداتِ دل باربد کی زبانی سنواتا ہے، میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں، جن میں اس کا امڈتا ہوا شکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک جوہر ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا پگھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا۔ میری جنس خرید لی، میرا حسن خرید لیا، میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے انتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، حالانکہ اس کی محبت، اس کا جسم، اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں۔ اور جس شخص

کے پاس یہ کہی گئی۔ اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا ——— اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجینیئر نہ کرنا ——— اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ وہ مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نقاشی کا فرہاد نہیں تھا وہ شیرویہ کی سند تھا۔ وہ مزدوری کا مظہر جمال تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے۔ اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا روؤ گے۔ جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے دلیروں کا خون بہایا تھا۔ بیٹھے آپ میں یہ جرأت نہ پا سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا شیرویہ سا مشیر ایک روباہ صفت ہوتی ہے۔ جس کا مشورہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جو گڑ سے مر سکتا ہے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے مدن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ لیا تھا۔ خسرو نے میری طرف سے وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے بے ستون کو کھود دیا تاکہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آ سکے تو میں اس کے حوالے کر دی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سینکڑوں عورتیں تھیں اور سینکڑوں عورتیں آ سکتی تھیں۔ اس قسم کے بیہودہ وعدے کو عار نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ وعدہ ناممکن بھی تو تھا۔

اور فرہاد وہ گرسنہ مزدور طرب "وہ رقیب" اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے رجھانے کے لئے میری دوشیزگی کے زمانے میں تیس ہزار ... پر پرویز کا نقش بنایا تھا۔ فرہاد ہر بار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی۔ جو وہ بار بار ان نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہار جاتا وہ پہلے اس مجسمے کے ٹکڑے کر دیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا۔ اور اس طرح پورا پہاڑ کٹ گیا۔

اور تب میرا شوہر بہت پریشان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا۔ شطرنج کے موجد کے نامی جانشین کو۔ اور روباہ نے پھر روباہی کی چال چلی میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی ——— اور اس کم بخت مزدور، کم ہمت مہندس نے اسی تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، جس سے اس نے میرے مجسمے تراشے تھے۔ بے ستون کو کھودا تھا۔ مجھے پا لیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا۔ میری روح سن کر پھڑک اٹھی۔ ... وہ مزدور اپنی بے بسی کی رسوم و قیود کا کس قدر پابند تھا۔ مرنے کے لئے اسے اسی تیشہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے بھی مر سکتا تھا یا بے موت کے اس طرح مر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزہ ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح ہلاہل کا جام تلچھٹ تک مزے لے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ روباہی کی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب ذرا یہ تو سوچو یہی شیریں جس کی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی، وہ اس نے مارا۔ کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت الٹ سکتا تھا مگر افسوس اس کا تیشہ درفش کاویانی نہ بن سکا۔

ملکہ کی دلدوز چیخ پھر ابھری۔ اور دیر تک گونج کے خاموش ہو گئی۔

اور پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام مہر النساء تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ریشہ ریشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ کے ساتھ ہندوستان آئی مغلوں کے دربار میں میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ افسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ جب میں باغ میں تھی شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھما کے کسی کام سے گیا ایک کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آ کے مجھ سے ناراض ہو کے پوچھا۔ کیسے اڑ گیا تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا "ایسے اڑ گیا!" کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھب گئی۔ اور وہ مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے انارکلی پر عاشق

ہو گیا تھا۔ اور اس سے پہلے۔۔۔۔۔۔

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری پرورش ابھی خوابیدہ تھی۔ شہنشاہ اکبر یہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انارکلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کرا دے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ ایسا شاذ ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی ذہین تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد جیسے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا گیا۔ اور اپنے شوہر کے آغوش میں میں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھا۔

وہ بہادر تھا، جری تھا، اس کے قویٰ مضبوط تھے، اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا، اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اور اپنا انتقام لیتے ہیں۔ اگرچہ میرے جری اور بہادر شوہر نے جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا۔ اس لئے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کرا دیا گیا۔ وہی فرہاد والی بات۔ وہ جو شیر افگن تھا۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا خود بازو روباہی کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں حرم میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی۔ جگہ شہنشاہ کو تو بچپن سے مہرالنساء کا دوسرے کبوتر کا اڑا دینا یاد تھا۔ اس لئے جوں جوں انکار بڑھتا گیا۔ میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوتِ ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے۔ اسی وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو اس برِ اعظم میں آجکل اغوا کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں۔ کچھ اسی طرح کی کمزوری مجھ پر بھی طاری ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا۔ اور میں کئی میں سے ایک۔ کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی۔ اور مجھے "نورمحل" کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ ایسی محلات کئی تھیں۔

محبت، یعنی اس قسم کی محبت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی، اب میرے دل میں مر چکی تھی۔ بالکل مٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک عجیب جذبہ محبت تھی۔ مقید طائر کی محبت صیاد کے ساتھ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ۔ اور اس جذبہ محبت میں میں نے گردو پیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرز تھما دیا گیا ہو اور جس نے ہزارہا شیر افگنوں اور ابوالفضلوں کے قتل کی تلافی مافات کے طور پر ایک طلائی زنجیر لٹکوانے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیر عدل کا خوش نما نام دیا تھا۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا حکم چلے۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ عرقِ گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کئے خوشبوؤں، پشوازوں، زیورات

ہیں نئی نئی بہاریں کھلیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔

اور عین اسی زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں۔ میں نے شہنشاہ سے کہا اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر تو انھیں قتل کر دے تو دنیا قیامت تک تجھ پر نفرین بھیجتی رہے گی۔ اور ان کو شہید تصور کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ، تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے!

لیکن ایک پیالہ کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خاں کو قتل کرا دیا تھا۔ اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں۔ اور جو سر خدا کے آگے جھکا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا۔ اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا۔

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کھلی ہوئی فضا میں آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور پہ پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے جو چنار جہاں پناہ نے نصب کئے تھے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے، لیکن بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پہ لوٹ رہا تھا۔ اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اور اس نابہنجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں شہ دیتا ہے۔ لیکن ادب سے شاہ شطرنج کو پیٹتا نہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی درویشی نے خوب رنگ لائی۔ میں نے بھی اس نابہنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا۔ مگر جہاں پناہ اس کے چنگل میں تھے، سارا ہندوستان انھیں بچانا چاہتا تھا اور نہیں بچا سکتا تھا۔ اور مہابت خاں اگرچہ صیاد تھا اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پر ہاتھ اٹھا سکے۔ میں اب وہ مہرالنسا نہیں تھی جس نے دو نوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چل کے بالآخر بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لئے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح ان کے دل پہ ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا۔ اور ہڈی پسلی چور چور ہو گئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انھوں نے شراب کا جام پھیر لیا مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا علالت کا جام تھا۔ مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا، شیر افگن کو شکار کرا دیا جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھنچوا دیں، جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا۔ اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقعہ سے اتنا متاثر تھا۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی، اس کے ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ مہرالنسا تو کبھی کی مر چکی تھی۔ اب نور جہاں بیوہ ہو کر جیتے جی مر گئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی، جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آ گیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زرّیں تاج خاموش ہو گئی۔

پھر زرّیں تاج نے کہا۔

میرا نام زرّیں تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہو گئی۔ اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، الٰہیات میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں مناظرہ کر سکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد بھائی ملا محمد سے کر دی گئی۔ عورتوں میں ابن علم سے عشق مشہور ہے، مجھے اپنے ابن علم سے ہمیشہ چڑ تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا۔ مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن مروڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سنے تو اسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور میں جواں سال تھی۔ لیکن میں اس کے جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بے دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوشِ بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھیر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتابِ بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی تپلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آ جاتے۔ انھوں نے باب سے میری شکایت لکھ کر بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنا لیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منوّر کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغِ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہو گئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں ہمیشہ کے لئے دل سے چاہتی وہ خسرو پرویز تھا۔ وہی فاتحانہ مالکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے میں اسے سونپ دی گئی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جیتا جاگتا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا۔ اور اس کی موجودگی سے اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انھوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے۔ میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے۔ اور اس لئے وہ خبیث و مردود ہو گیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں۔ مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے، انھیں رسول اللہ نے بلا طلاق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی روبرو اس کے جمال کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ میری روح اسے ڈھونڈتی تھی کہ اسے اپنا حال سنائے اور جب میری روح اس مردِ کامل کے لئے تڑپ رہی تھی۔ عقلِ نسوانی، مردانہ وجدان کی برق کی متلاشی تھی۔ میں نے اپنے

ذہن پر فکر و سخن کے دروازے کھلتے دیکھے۔ وہ مجھ سے دُور تھا اور میری روح اس کے لئے بے تاب تھی۔ وہ کہیں بھی مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اسے حالِ دلِ مشتاق۔

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تمہارے اقبال نے اس شعر کو پسند نہیں کیا۔ غالب کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا۔ لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق کا تھا معشوقِ حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لئے ہوئی تھی۔

دور دہانِ تنگِ تو، عارضِ عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لئے عجیب و غریب جذب و احساس کا زمانہ تھا۔ یہ عشق کا زمانہ تھا۔ نشاط و فنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں، کبھی مجھے بقائے دوام بخشتیں، کبھی لمحہ لمحہ نئی موت نئی لذتِ مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ یہی میرا تخلص تھا۔ اور میں نے آبشار گرتے دیکھے۔ الفاظ کے آبشار۔ اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متنبی کے ترنم کو قاآنی کے ترنم میں حل کر دیا۔ ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اُٹھے تھے۔ میں پہلی شاعرہ تھی جو ان ایک ہزار شاعروں سے الگ کھڑی تھی اور میری انگلیوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چہ شود کہ آتشِ حیرتے بزنی بہ قلۂ طورِ دل
فسککتہ و دککتہ متدککا متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا، ایک جہاں سوزِ عشق کی آگ تھی، سیال آگ جو اس آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی، جس کی تہہ میں نیستی کے نہنگ منہ پھاڑے ہوئے تیار تھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں۔ میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے خروش لاشنئی کی دعوت دی۔
اب آبشار کے گرجتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا۔ محمد علی باب۔ اس کے چہرے کا قدس، ظہورِ حق کی بشارت دیتا تھا۔ جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ رحمت اور ابتلا سے بچ گیا۔ لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا۔ قہار اور جبار۔ کامل مرد، مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا۔ قہار اور جبار ہی نہیں تھا۔ اس میں رحم و لطفِ شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کسے ار نہ کرد الستم نہ گرفت حبلِ ولایتم
کنمش بعید ز ساحتم و ہمش بہ قہر بدا و لا
منم آں ظہورِ حبیبی، منم آں سیفت بے منی
منم آں سفینۂ ایمنی و لقد ظہرت محملا
شہد لئے طلعتِ نار من بدبدیگرے دیار من
سر و جاں کنید نثارِ من کہ منم شہنشہِ کربلا

اور باشوکت، باعظمت، گرجدار آبشار تھا کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فرش تک۔ جلال سے جمال تک۔ اس کی ہمہ گیر ہستی

سے میرے حساس ذہن تک۔

طیر السمار شگفت، ورق البہا تصفصفت
دیک الیفیا و دقت متجلا متبسلا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر مُلّا محمد قزوینی خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریروں میں جوش اور سُکر کے عالم میں میں اکثر چہرے سے نقاب اُلٹ دیتی۔ اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوئے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنان مصر والی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی۔ عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی۔

بدر النسا کی مصیبت کے مصنف نے غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ برادُن سے صبحِ ازل نے محض میری مروّت میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ فرہاد کی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیق جمال کی پابندیاں، اور موضوعِ جمال کی پابندیاں۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ یا نئی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی۔ درقوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی۔ نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام ڈر ڈر کے لیتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کا فرباغی تھا۔ دونوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو قتل کی تھی۔ اور دونوں کا کام بادشاہوں پرویزوں، جہانگیروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا، میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنا دی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد مُلّا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تاکہ عورت کی صورت .... اور اس کے دماغ اچھی طرح پہچانے جاسکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آگئی۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتویٰ دے دیا کہ وہ میرے شوہر محمد اور اس کے باپ مُلّا تقی کو قتل کر دیں۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انھوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کے اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے میں نے چھپ چھپا کے خراسان کا رُخ کیا۔ جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بار فروشی ملا محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بار فروشی مرد کا ذہن اور جسم۔ اور تم نے بہت سے قصے تو سنے ہوں گے۔ کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی پر شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبز درختوں کے گہرے سائے میں زریں تاج قدم سے قدم ملائے ارشاد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی داستان سُناتی ہوئی نقاب اُلٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشاد نے اس سے پوچھا "تمہارے اور محمد علی بار فروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد علی باب کی روح کی شیدا رہیں۔"

وہ مسکرائی۔ چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرّے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں۔ اور کہنے لگی "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سُنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد

جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط۔ اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں۔ باب میرے لئے محض روح تھا۔ ملا محمد محض جسم محض ہوس۔ محمد علی بارفروشی ان دونوں کے درمیان تھا، ذی روح جسم، جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے، قرار دے لے۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو۔ جس سے مل کے میں اپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کر طہران آئی۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح، نورجہاں کی طرح۔ لوگوں نے مجھے اسیر زنداں کو طہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سن کے ناصرالدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے دو صدیاں کا دوسرا کبوتر بھی نورجہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نورجہاں تھی نورجہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بارفروشی مجھ سے چھن چکا تھا۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رقیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصرالدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ اپنی نورجہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لئے لکھا تھا، اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو و ملک و جاہ سکندری، من و رسم و راہ قلندری
اگر آں خوش است تو درخوری، وگریں بد است مرا سزا

اور ظاہر ہے کہ اس جرأت انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ ہزار گانت سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یا مجھے کنوئیں میں دھکیل دیا گیا اور کنوئیں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو خچر کی دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دارالقضا لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

پھر زور سے سائرن بجا۔ اور دفعتہً رک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چیری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دلدوز چیخ سنائی دی، اور سکرات کی طرح اکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ وہ ہوائی جہاز دکھیہ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور پر دو سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی۔ سڑک پر۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زرین تاج مسکرائی۔ چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا۔ اس لئے زندگی نہیں ہوتی۔ زرین تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی۔ اگرچہ وہ اس سے آگے نکل گئی تھی۔ اب اس جیپوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی۔ اب گویا ایک کاچستانی تمرالاپ رہی تھی۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ۔ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ وہ راہبر آچکا تھا۔

وہ ماضی کی طرف چلی گئی۔ چاندنی میں غائب ہو گئی۔ اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لئے مستقبل ابھی بہت بہت بہت دور تھا۔

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:
"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں سہیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا، کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے ——— وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے۔ جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ——— دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے، یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکیدار کی جھونپڑیا۔ جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرامزادے۔ ایک وہ سالا تھا بھوندو، اور وہ دوسرا تھا بھورا، اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ ملوں کے مزدور ——— بھائی ہیں بھائی ہیں۔ مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ ——— جب جیلر نے آ کر مجھے حکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس اکدم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر! کیا چیز ہے!

گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا، اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں، کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی، مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹولے آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر، اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ وہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور اونکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں، بچپیں برس کے بھاری بوجھ کے نیچے سے ایک دم پھڑپھڑا کر، تڑپ کر نکل آئیں، اور کسی دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بیرا، بھاتی، بلاقی، چتو، نیولا، سورج، بلی اور وہ کتنا سالا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون، ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا کا پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آناً فاناً میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی اکیلی منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت، وہ چڑیل چڑیل چلاّ کر بھاگے، پھر کیا تھا سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے.....

گھسیٹے یہ یاد کرکے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کرکے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتاوروں کے ہرے بھرے جھاڑ تھے، جن کے بیچ بیچ سے بڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوّوں کا شور، کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہوہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی چھوٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہل کو کندھے پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک اکیلا کھڑا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے

یادیں تمام ہوئے۔ وہ بلاارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا، یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی جنا ایسی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ منے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے شہر جاؤں گا، نوکری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرالال کی طرح اکدم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کر دوں گا۔ اس وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ کر گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی، گنگنائے گی، میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی —— بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو —— اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پہ آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر پہنچ کر ٹھٹکا جیسے کوئی بری بات اک دم یاد آگئی ہو۔ یہی جگہ تھی جہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے! گھسیٹے! —— کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دئے۔ ان کو اتارو، پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو توڑتے رہو، پھر جوتی لاکر پاؤں کے نیچے دھرو —— شبن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "پھر پھاڑ لایا؟ —— اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں۔ —— یہ کہاں سے کھونچا لگا لایا؟ —— کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔" ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں، گاؤں میں ادھر ادھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں گئے تھے دیکھ لیا۔ "تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا —— سونے کا بٹن" دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار چار پیسے پہ ملتا ہے۔ جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجیب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کے لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور سب ہا شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں —— ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے منہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آگئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینارے سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آگئی جو باجے گاجے سے، مشعلیں جلائے، ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے

آ اتری تھی۔

بنیا بھی آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پُتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرر گھرر چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھاگل نہ بولے" "دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ" اماں روٹی دے، اماں روٹی دے"۔ اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ، رو دھو کچھ کرو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی۔ جیا اور شبراتن! اُفوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی، اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی ہی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں ——— ادھر ابا کلھاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھنیں دھوئیں ——— واہ ری اماں! جہاں کسی کا جی خراب ہوا، اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ "ارے آ تیرا سر داب دوں" ——— "ادھر آ تجھ پر گجرا اتار دوں" ——— "چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا" ——— "دونوں وقت ملتے نہ چلا" ہر وقت ٹوٹکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ——— کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچھ پکے، گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے بھی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھڑبیریاں کنٹھے اور کیا کیا سب بہت شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق پر رکھ دی، میں ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا وہ لگے ڈکارنے "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولت سے بولیں "چوہا کھا گیا ہوگا" ——— "تو کھا گئی ہے تو۔ کیا چوہے بھی گڑ کھاتے ہیں؟" اماں نے کہا "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی ہی جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے مار مار کے "واہ کیا مزا ہے" جیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہوگا؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے۔ ستر اسی برس کون جیتا ہے؟ جیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہوگا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ اُفوہ کلو کے ناتیوں کی بھی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھی کی بڑی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بنیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بیتابی سے پوچھا ——— وہ جگہ تھی وہ ——— ہاں ——— وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اداس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر ٹکا تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوکھٹ کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدھام تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے بیڑھے سائے کیچوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ——— تم کو کیا کھلائیں گے؟

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے، پچیس برسوں کے پچھلے ارمانوں کے

خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا، وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے، اور بار بار بکریوں کے موت کی کمراہند اور منابداں کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد منڈیا رہی تھیں، ان باتوں کے گھونٹوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلا رو رہا تھا، رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"اندر چلی آؤ نا۔"

اس دھیکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا، پھر کہنے لگا:

"کون فقیرا؟"

"ہاں!"

فقیرا ذرا چڑ کر بولا:

"تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا:

"تم ہو کون؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں ——— کہہ تو دیا!"

"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا:

"میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں ——— تمہارے پاس!"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا:

"تو اندر آؤ۔"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلا وجہ ہرے بھرنے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھرانے کی روزی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھید والا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر اب چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: "بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھا گئے؟"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا ـــــ بھورا، جگیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا ٹھٹکا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو ـــــ گھسیٹے تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہے؟"

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے ـــــ اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اماں! ـــــ ہے کیا؟"

"ہاں!"

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:

"وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ، اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کونے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے پیچھے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بدگوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھ رہی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھینچی ہوئی اُلٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری محنت کشانہ زندگی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی جیسے گونگا کھانا مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باب .... باب ...... باب......

باب ...... باب...... باب......"

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی، جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بند رچیختے اور رات کو سیار روتے ہیں۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا:

"جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا:

"اماں!"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا: "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باس کی آواز نکل رہی تھی اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر اس پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جیسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے، اس نے کیسا کیسا اپاجی مارا اور ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی!

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار ابل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھالے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت، کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا:

"بھیا تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سبیتا کروں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولہا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولہے کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

"اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں۔ آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"

"وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں بکائیں نہیں۔ لگان اپنا تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کا۔ ہے میں پکڑا گیا؟"

"سونی سنگھ کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا: 'فقیرا مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن عیش، تو کر لیں گے ———' دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا ——— سنتے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

"جمیا حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے، کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:

"تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا 'جمانا' تھا ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب بچے پیٹ بھرے

ہیں پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری جب چولہا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا:

"کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں، ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا، چار سال رکشا چلائی، پھر خونچہ لگایا، ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو رونے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پہ رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا:

"بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا:

"تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔"

"ہاں، مگر نجانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے اور پھر باب، باب کہنے لگتی ہے۔"

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے منڈیروں پر بکری کا مسکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چلوسے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر لپیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے شوں شوں کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر، بکریوں کے موت کی کھرایند اور اپنی ماں کی باب، باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو برے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! اوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھیا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گزارنے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتیں بے شرم اور بے ڈھنگی۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلپے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ کانوں کے تختوں پر رات کاٹنا، وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سل اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لینا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چار، وہ دھیلے پان کا بیڑا! وہ پیسے کی ۲۵ بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی اور بھائیوں کی مار کھائی! کھانے پینے کو ترستے رہے، پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر بھاگے، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں، کہا چلو کلکتہ چلو، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا، کلکتہ کے پچیس برس! اُفوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو ضمانتی لاؤ۔ میں کسے لاتا؛ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے گھر اسی کے گھرانے رہتے تھے۔ ضمانتی لے آتے تھے۔ جھمن بولا دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن ضمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دیئے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے جب سیٹھ سے خوشامد کر کے کوئی ایک اچھی سی گاڑی دے دے تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑتے گزرے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا یہ لاؤ، وہ لاؤ، یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا جو کہتے "نہیں ہے صاحب"، نہیں ہے، ہجور"۔ وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا، نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پر جو کچھ بھی آیا حرامزادی بھنگوی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عزت رکھنے کی کیا پڑی تھی ...... لنگوٹی میں پھاگ ......

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑک کر بولا:

"پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گذارا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا "کیسی چوری؛ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ! روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں؟"

"گھر میں حصہ؛ بکریوں میں حصہ، تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا، پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا:

"کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؛ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے تگ و دو لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ لگا سکے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیرا نے طعن سے کہا:

"ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے کر جاتے ہی ہیں۔ تبھی جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

"اور تو نے کیا کر لیا ہے؟ چوٹٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؛ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا......"

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں اس نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تُو تُو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اٹھتا، روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب یہی ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں ہی دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بِتانا ہے۔ کاش! ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دوار پے بھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلّو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں میلے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک انگ چھپر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان چالیس کا سن ہونے کو آیا......

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آ جائے.....

ایک زبردست اُمنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا:

"بھیا فقیرا!"

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا:

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتے میں میں نے پچیس برس بتا دئیے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگاؤ، یہ کیا وہ کرو۔ سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟"

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے الجھی بات نہیں ہو۔ پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا:

"اگر کچھ ہو سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر تم تو ہم کہتے ہیں ..... وہ تو تم مانتے ہی نہیں۔ ——— اس میں تمہارا بھی بھلا ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان لے گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ بنیوں کو دیکھو، ان کے گھر دھن برس رہا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو کھڑے دونے جاتے ہیں کہ ہم پیچھے تمھارا ہی سر پھراؤ، ادھار دے دو، دو کنکریاں نمک دے دو، ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں۔ نہ جائیں تو کریں کیا؟"

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا۔ گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:

"اور تم کہتے ہو کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے اگر ہیں رہ ہی جائیں گے۔"

گھسیٹے نے اک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف تیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

"ہاں تمہارا سادی بیاہ کرنا ہے، روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری نہیں نہ سہی کسی اور میں سہی۔

ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا؟

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا مگر تب انہیں سن کر فقیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھی در پیڑھی چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے جب بھی مانجو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ ماما جوگیوں کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم تو ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوالاکھ کا رہے گا۔ ابھی ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھڑ لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دو روز چاٹ لو اور سوجھے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روز روز شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، اس جگنو کا یہ منتر سی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس جاگی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی، آج یہ بابا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے، ذرا یہ چکر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور بڑھ جائیں اور چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے۔ کیسا گدرایا گدرایا بدن ہے؟ جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دودھ دوہتے اوپلے وہ تھاپے، دہی وہ متھے، اکیلی جھوڑ، بانس اٹھا اٹھا کھیتوں میں ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضانی کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکہاری پیچھے سے آ گئی، اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۷)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنائی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی بابا، بابا، بابا کرنے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجیب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشہ کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں سے چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر سے باہر نکلے۔ پہر بارہ ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر

بے کسی سے میں ہی کہنے لگیں جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آ گئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا:

"کہاں چلے فقیرا!"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برما نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا:

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں"

"اماں کو لئے؟" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا:

"شاباش تم لوگوں کو ——— اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی۔ گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ باپ کہتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رت جگے سے اس وقت تک باپ باپ کہتے کہتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بری رہی، ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باپ باپ کر کے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دیا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، عقل چندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشتاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھئے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ سہم جاتا ہے، گھسیٹے فقیرا کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آ گئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی، منمنا کر ڈرونی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندھے چپڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے، پھیکے پسپے ہوا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن پر میل کی کھنگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، میلی، آخور، بلغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، زبان سے دے کر تھپک تھپک کر سلا دینے والی، ننا پاپن بے کسی!

——— اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ بیل کھیل ہو، چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو۔

مایا کے منڈ، کوہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ، تنہا راستہ ——— بھوئی آنکھ کا دیا۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:

"ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سُنا کر کہا:

"تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا:

"چپ رہو بد نصیبو نماز ہو رہی ہے!"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی ٹہوکا چٹا دیا۔ ٹہوکا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لٹکے ادھر سے گذر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہیے جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا! ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک لنگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ آوازیں لگانے لگا "جب دے گا اللہ ہی دے گا"۔ فقیرا بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور ٹہوکا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پنہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ فقیرے کا لگتا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے" اس صدا کو اس طرح دینے لگا جیسے کوئی والنٹیر "انقلاب زندہ باد" کہے کیونکہ دوسری اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ درد انگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔

اس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ بیٹھے یا ایک دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان ہو، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں، مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

(۵)

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آ گئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی کی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈالی، کم ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں نعمتیں بھری تھیں۔ بہت سی گھی کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر رنگا میل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مرلیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پورے دو روپے ملے تھے جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں تک چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا جو تھا اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مکھیوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ پاس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

”لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھاؤ۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔“

گھسیٹے نے کچھ ٹکڑیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی ——— گھسیٹے جھلا کر بولا:

”تم بھی کیا یاد کرو گی؟“

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی۔ مگر چبایا گیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور یہ پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل دیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جُٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور الٹے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے ڈھنگی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا اس کا شیرا ٹھوڑی یا چہرے سے بہتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیزی ہوتا گیا آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں لگنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی، چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر بنا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولہا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم سُرخ سُرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں ذکر میں ایک پھول کی تھالی بھی آ گئی ہے، ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے...... فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش ـــ

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپے! اور صرف ایک دن میں! پچاس روپے مہینہ! اوہ! اگر کہیں ہم کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تازی نان، بُھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں! وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گودیں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے، سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا تو سسرا اکڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا...... نہیں نہیں نہیں ہو سکتا۔ میں گھر نہ دوں گا، بکریاں دے دوں گا مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا۔ حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجوڑ کر جگایا اور کہا:

"فقیرا سنا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چکا جانا چاہیئے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہے گا کاہے کا حصہ بانٹ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اس کا۔"

فقیرا تلملا کر اٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابّا کا بنایا ہوا چھپّر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصّہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصّہ میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا:

"اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں ان کو اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھسٹے ہی گا؟ پندرہ برس میں پاتا رہا۔ گوُ مُوت صاف کرتا رہا تب اماں کی یاد نہ آئی، اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو ماں تیری ہے۔ ہٹ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری کہ تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصّہ میں ماں کی طرف لپکا جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا سے اونچا ہو گیا اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکّا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا، گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عو عو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے لپک کے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑسے کھڑے قد پیچھے گر پڑا اور بڑھیا چیختی قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے، گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلولوں کی طرح باہر نکل آئے، منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بر گئے۔ اب گھسیٹے کا غصّہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیجا کی طرح ہونق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصّے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پروا ہوتی ہے؟ مر گیا ——— مر گیا ——— ہاں ——— فقیرا ——— ناحق مرا ——— مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا بُرا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں میں بھی تو کچھ دن زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو ——— پیاری اماں ——— کلکتہ، وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ بکتیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے ——— لونڈے کے لونڈے ——— زرد زرد بیبیں۔

گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا ——— بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا، پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ دسینکڑوں میل سے کروڑوں درختوں کو تاراج کرتے، مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے، وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے، اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑالے جائیں گے گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آگیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا ——— امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھونڈے منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اوپندر ناتھ اشک

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا، اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

سردیوں کے مختصر سے دن کو گزرے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا سا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی سی بنیان، اس پر چھوٹا گرم انڈرویر، اس پر موٹے کھدر کی قمیص، اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ میں مست، دسمبر کی تیکھی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کالا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی! میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام کے ہی سہی۔" میں نے کہا، "لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟"

"میرے پاس کپڑا ہے بابوجی!"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی مٹی کے تیل کا گرم تیز بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا؟" وہ کہا کرتے ہیں۔ "اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے۔" اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں تیز ہوا کا جھونکا اندر

آتا ہے۔ میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اٹھ کر پھر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے۔ کچھ اس طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے گرد لپیٹ کر کام پر آ بیٹھا۔

بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برابر برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا اور "کیمپ نمبر کچن" سے گھر کو آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا بینگن کا پودا دوبار پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو دوبھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا سکڑا پکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا پڑی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی لیکن وہ بے حد ضعیف دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کمیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ، بانس کی سی ٹانگیں، سوکھا چہرہ اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ——— بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہاجنا بھی چھانٹنے پر بڑھتا ہے۔ دنیا میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں تو پھر انسان کو اس خدلسٹے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا۔ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اس کے پھل، پھول اور شاخیں ——— جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نت نئے ہرے بھرے زندگی سے بھرپور اچھلتے، کودتے، ناچتے گاتے پھول اور پتے نکلتے ہیں اور زندگی کی امر بیل بڑھتی ہوئی پھولتی پھلتی جھومتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں آپڑا ہے۔ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں؟ اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا "ارے بھئی تم ہو کون ———؟"

"میں جی! ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

بوڑھا کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں ——— بیاہنے کے قابل ——— اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آ گیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پر شاید ایک میلی پھٹی رلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے ——— قریب قریب گھل کر میں نے کہا "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔ برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو؟"

لیکن اس وقت سیمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے ماہی رام ——— وہ ٹھیکیدار کو پانی دا اس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی۔ اس کے نیچے کالا موٹا کمبل، گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا۔ ایک دن چھ مولیوں کے لئے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا اور اسے پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابوجی۔" ماہی رام نے کہا۔ "نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو دن دیکھتے ہو گئے ہیں ——— ایک رات گوبھی کے دس پھول غائب تھے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکے ہوئے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچن کو بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے اور پھر دو سو روپیہ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ سب بھی تو اسی میں سے پورا کرنا ہے اور پھر مزدوروں کی مزدوری....."

"لیکن ترکاری پر کون پالا کو ڈال جاتا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہاں تو کبھی چوری ہوتے سُنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی بھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔"

"نہیں بابو جی باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آ سکتا۔"

"لیکن اس دن مولیاں . . . . ."

"وہ اور بات تھی بابو جی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔ جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر کو کان ہو جائیں۔" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر سُلا دو۔"

"نہیں بابو جی سردی تو امیروں کو لگتی ہے' اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لئے یہاں سُلا دیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا ——— ان پرنگروں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بڈھا سو گیا ہے کوئی آیا کہ میں نے اسے دبوچا۔" اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے . . . . ."

"کافی ہیں بابو جی۔"

اور یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بڈھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن کام مجھ سے ہو نہ سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس ——— دھن' دولت' اولاد اور بے فکری کی وجہ سے اس کے گال اس پچاس برس کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سُرخ تھے ——— اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بڈھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں مزے سے گپیں ہانک رہا ہو گا' تاش اور شطرنج میں مشغول ہو گا۔

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا۔ اور کمرہ خوب گرم تھا ——— میں اٹھا۔ کچھ ضروری کاغذ اور قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل سویرے ذرا جلدی اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے میں تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں لیکن "نہیں نہیں بابو جی میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔" اس کا یہ جواب سُن کر قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر میں نے کمبل ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے ——— بے ربط ——— بے ترتیب۔ لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور پھر بند۔

سوتے سوتے کبھی ماہی رام' کبھی اس بوڑھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا۔ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں تک لے گیا ہے۔ سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت دردبھری نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ چور ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی گھٹا ہوا سر' وہی پھولے ہوئے گال اور چپٹی ناک۔

میری آنکھ لگ گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ بھاری ہے اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

میں نے سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پیا اور پھر لحاف کو اچھی طرح سے اوڑھ کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ شاں شاں ——— شاں شاں ——— اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے، پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں، کیاریوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ صرف اسی مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بڈھے کی سی ہو گئی۔ گھٹنوں کو پاؤں میں لے کر سینے سے لگائے وہ سکڑا سمٹا اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پہ لگتے ہیں اور وہ اس بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ کھڑی شور مچا رہی ہے "بڈھا مر گیا ——— بڈھا پھانسی لگا کر مر گیا۔"

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا، مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے..... کڑ کڑ..... کڑ کڑ......

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

جلدی سے گرم جرابیں پہن، سر پہ ٹوپی پہن اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدہ میں بڈھا مر گیا۔"

میں نے دیکھا۔ اسی میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارد گرد وہی میلا کچیلا لحاف لپیٹے بڈھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا......" میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سیکرٹری صاحب نے میری بات کو کاٹ دیا۔ "میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا۔" وہ بولے: "کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ٹھیکیدار کے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھا لینے کا انتظام کیا جائے۔

اس کے دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک رک کر میں نے ماہی رام سے کہا: "خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔"

میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا:

"بہت اچھا سرکار!"

دیوندر ستیارتھی

لال دھرتی

کوئی رنگ مظلوم نگاہوں کی طرح خاموش اور فریادی ہوتا ہے۔ کوئی رنگ خوبصورتی کی طرح کچھ کہتا ہوا اور داد طلب دکھائی دیتا ہے۔ کوئی رنگ مچلتا ہوا ہمیں کسی ضدی بچے کی یاد دلا جاتا ہے اور کسی کو دیکھ کر غنودگی سی چھا جاتی ہے .... لاری کے ڈرائیور نے دریا پار کرتے ہوئے کہا: "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں بابوجی!" میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سرخ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "آندھرا دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟"

آنکھیں موند کر میں نے اپنے دل میں جھانکا۔ وہاں سبز رنگ لہلہا رہا تھا۔ اپنے دماغ سے اس رنگ کا مطلب سمجھنے کی میں نے چنداں ضرورت نہ سمجھی اور آنکھیں کھول کر سرخ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے میں نے محسوس کیا کہ یہ رنگ بہت بلوان ہے اور میرا ہرا رنگ اس کے سامنے ٹک نہ سکے گا۔

ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس نے سرخ زمین کے بھید خود اس کی زبانی سن لئے ہیں اور اب اس کیلئے یہ مشکل ہو رہا ہے کہ انھیں چھپا کر رکھ سکے۔

لاری بھاگی جا رہی تھی۔ سرخ دھول اڑ اڑ کر ڈرائیور کے گالوں پر اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دھول وہاں بھی آ جمی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرے چہرے کی میلی تھوڑی زمین پر سرخ رنگ چڑھ گیا ہوگا اور بہت برا تو نہ لگتا ہوگا۔

"پہلے یہ سارا ضلع بہار اڑیسہ میں تھا، بابوجی!"

"اور اب؟"

"اب نقشہ بدل گیا ہے، بابوجی!"

"نقشہ بدل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جب سے اڑیسہ الگ صوبہ بن گیا ہے، اس ضلع کے تیلگو بولنے والے حصے آندھرا دیش کو مل گئے ہیں!"

"بہت خوب۔"

"لیکن ہم خوش ہیں، بابو جی! گورنمنٹ نے ابھی تک آندھرا دیش کو الگ صوبہ بنانا منظور نہیں کیا۔"

"مگر کانگریس تو کبھی کی یہ قرارداد پاس کر چکی ہے کہ زبان کی اہمیت کو قبول کیا جائے۔ ہر بڑی زبان کا اپنا صوبہ ہو تاکہ ہر زبان کے ادب کی پوری پوری پرورش کی جا سکے، ہر تمدن اپنے اپنے ماحول میں آزاد ہو کر نشو و نما پا سکے۔"

"جی ہاں۔ کانگریس نے یہی کہا ہے کہ آندھرا دیش کا الگ صوبہ بنا دیا جائے مگر گورنمنٹ نہیں مانتی۔"

"گورنمنٹ کیوں نہیں مانتی؟ مدراس میں تو اب کانگریس منسٹری قائم ہو چکی ہے اور اس کے پردھان شری راج گوپال آچاریہ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ وہ یہ کام ضرور کر سکتے ہیں۔"

"مگر اس کا حکم تو لندن سے آنا چاہیئے، بابو جی!"

"لندن سے؟"

"جی ہاں ...... اور اگر یہ حکم نہ آیا تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دیں گے اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔"

"لہو بہا دو گے اپنا؟ پہلے ہی یہ زمین کیا کم سرخ ہے؟"

ڈرائیور نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نیا رنگ جھانک رہا تھا۔ وہ نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ زمین سرخ تھی۔ کبھی گہرا بادامی رنگ زور پکڑ لیتا۔ پھر یہ سیندوری بن جاتا ...... سیندوری رنگ گلناری میں تبدیل ہو جاتا ......

سرخ رنگ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے لہو کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ کئی بڑے چھوٹے پلوں اور ننھی ننھی پلیوں کو پھاندتے ہوئے لاری وجے نگرم کے قریب جا پہنچی۔ مندروں کے بڑے بڑے کلس دکھائی دینے لگے۔ اس بھاگم دوڑی میں ہمیں وجے نگرم اپنی طرف بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا گویا ہماری لاری ساکن تھی۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی سڑک تربینی کی طرح تین طرف دوڑی جاتی تھی۔ دو سڑکوں کے سنگم پر بھیم راؤ کا مکان تھا۔ ڈرائیور انھیں پہچانتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے مجھے اتارتے ہوئے اس نے دوست نواز آنکھوں سے میری طرف دیکھا "آندھرا دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔ لاری آگے بڑھ گئی۔

میں نے آواز دی بھیم راؤ باہر نکلے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرے پر سیتلا مائی کا آٹو گراف نظر آ رہا تھا ـــــ چیچک کے بڑے بڑے داغ! توند کی طرف دھیان گیا تو میں بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکا۔ ہمارے اسکول میں ایسا ہیڈ ماسٹر کبھی رعب قائم نہ رکھ سکتا۔ تعارفی چٹھی کو پڑھتے ہی وہ مجھے اندر لے گئے۔ بولے "آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس غریب کے ہاں چلے آئے۔ اس چٹھی کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی۔"

"آندھرا دیش کی بہت تعریف سنی تھی" میں نے مسکرا کر کہا۔ "بہت دنوں سے ادھر آنا چاہتا تھا۔"

"آپ شوق سے رہیئے۔"

مجھے ایک الگ کمرہ مل گیا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ آندھرا دیش کی سرخ زمین میرے پیروں سے چھو رہی ہے۔ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کبھی کبھی میں قالین پر لیٹ جاتا اور دھیان سے اپنے دل کی دھڑکنیں سننے لگتا۔ اچھا شغل تھا۔ سرخ رنگ کیا کہہ رہا ہے؟ ـــ بار بار یہ سوال زبان تک آیا مگر ہونٹ بند رہے۔

بھیم راؤ کے مکان پر کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا ...... سبز اور سفید اور سرخ ...... اس ترنگے جھنڈے کا مفہوم میرے ذہن

میں اجاگر ہوا تھا۔ دل ہی دل میں بیچ بیچ میں یہ کہنے لگتا کہ اس جھنڈے کا سُرخ رنگ آندھرا دیش کی ترجمانی کر رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی مجھے ایک ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوتی۔ جہاں سفید رنگ ختم ہو کر سُرخ رنگ شروع ہوتا تھا۔ وہیں میری نگاہ جم جاتی اور اس نوجوان لاری ڈرائیور کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھتے "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں' بابو جی!"

میرے کمرے میں بڑا مختصر سا فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک ٹا مُلٹ میز پڑا ہوا تھا۔ دو کرسیاں، ایک تپائی اور ایک طرف ایک تخت جس پہ مجھے سونا ہوتا تھا، بستر پہ دن کے وقت کھادی کی دودھیا سفید چادر بچھا دی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس ٹائلٹ میز کا گول آئینہ وہاں نہ ہوتا تو وہ چند ہفتے اتنے دلچسپ نہ ہو جاتے۔ میرے جذبات کا رنگ پکی ہوئی اینٹوں کی طرح سُرخ ہو چلا تھا۔ یہ رنگ میرے چہرے پر بھی تھرک اُٹھتا۔ اس کے لئے میں آئینے کا ممنون ہوتا۔

میرے کمرے کی دائیں کھڑکی میدان کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سبز گھاس اُگتی ہوئی نظر آتی۔ پانی نہ ملنے پر یہ گھاس پیلی ہو سکتی تھی سُرخ نہیں۔

دن چڑھتا اور پتہ ہی نہ چلتا کہ کیسے بیت گیا۔ سب کچھ میرے لئے نیا تھا، ہر آنکھ میں کوئی نہ کوئی صدیوں کا جمع شدہ رنگ تھرک اٹھتا۔ اس سے پہلے کہیں ماضی اور حال کو یوں بغلگیر ہوتے نہ دیکھا تھا۔ رات ختم ہوتی تو صبح سورج کا تمتماتا ہوا تلک لگائے آحاضر ہوتا اسے دیکھ کر مجھے کرشنا وینی کی پیشانی کا "بوٹو" یاد آجاتا۔

پیچھے سے آ کر کرشنا وینی میری آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور چوں ہی پرے ہٹتی۔ میری آنکھیں اس کی پیشانی کی طرف لپکتیں کم کم کا سرخ، بوٹو، کینڈل کی بجائے پچاس کینڈل کا برقی قمقمہ بن کر اس کی پیشانی کو روشن کرتا دکھائی دیتا۔ کوشش کرنے پر بھی میں کبھی اسے ایسی حالت میں نہ دیکھ سکا۔ جبکہ غسل کے بعد یہ "بوٹو" دھل کر اُتر چکا ہو۔ پھر میں نے ہر کوشش چھوڑ دی۔ بس ٹھیک ہے یہ قمقمہ ہمیشہ روشن رہے، دن ہو چاہے رات ——— کم کم کا سُرخ بوٹو!

اُن پورنا اور کرشنا وینی دونوں بہنیں تھیں۔ وینی پورنا سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں گھر پہ پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن سنگیت کی ابتدائی منزلوں کو طے کر کے اس کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی۔ چھوٹی بہن صرف بہن کی ریاکو دیکھ چھیڑتی تھی۔ اس کا گانا سن لیتی تھی اور اگر اس نغمہ نے اس کی لطافت کا کوئی سویا ہوا رنگ جگا دیا تو اس نے تھوڑی بہت تک بندی کر لی۔ نہیں تو کس کی دیتا، کون ان پورنا، وہ اپنی کتابوں میں اُلجھی رہتی۔۔

بھیم راؤ اپنی بیٹیوں کی تعریف میرے سامنے بھی کئے بیٹھتے۔ دونوں کے سُرخ "بوٹو" میرے ذہن میں تیرنے لگتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرے مُنہ میں پان کی پیک اور بھی سُرخ ہو گئی ہے۔ میرے جذبات چھالیا کے ننھے باریک ریزے بن جاتے جو پان چباتے وقت پِس کے دانتوں کی دراڑوں میں سے گذر جاتے ہیں۔

"یہ تو اپنے آدمی ہیں، بیٹیو!" بھیم راؤ کہتے "ان سے خوب باتیں کرو، ان کی کہانیاں سنو۔ ولیس ولیس کا پانی پی رکھا ہے انھوں نے ——— ہاں ولیس ولیس کا،" اپنی یہ تعریف سن کر میرے ہر مسام کے کان لگ جاتے، ہونٹوں میں ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو جاتا، ذہن میں ایک گدگدی سی ہونے لگتی، یہ آندھرا دیش کی سُرخ زمین کا خلوص تھا، ایک ترقی پسند خلوص!

"یہ کرشنا وینی تو نری گلہری ہے، مسٹر راؤ" ایک دن میں نے دونوں بہنوں کی موجودگی میں کہا: "اور یہ اچھا ہی ہے"
"خوب! خوب! اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر، چلی تو بیٹھ ہی نہیں سکتی گلہری ہی تو ہے۔"
کرشنا وینی ہنسی نہیں۔ آخر اس میں گلہری کی کیا بات ہے؟ شاید ہمارے معزز مہمان کے دیش میں کنیائیں نہیں ہوتیں۔ وہ حیا سے سمٹی رہتی

ہوں گی۔ لیکن ولیس ولیس میں دھرتی دھرتی میں فرق ہوتا ہے نا۔

بھیم راؤ بولے "یہ آندھرا دیش ہے"۔

ان پورنا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اور یہاں کی کنیائیں آزاد نظمیں بن گئی ہیں ـــــــ"

کرشنا دیبی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ بولی "جی ہاں آزاد نظمیں"۔

اور میں نے محسوس کیا کہ کم از کم کرشنا دیبی ضرور ایک آزاد نظم ہے، نہ بحر کی پابند نہ قافیے کی پابند۔

ان پورنا نے اپنے بازو کرشنا دیبی کے بازوؤں پر ڈال دیئے اور بولی "دیبی! چلو آج دشیشری کے ہاں چلیں۔ کل تو آئی تھی ادھر آج اس نے شکل ہی نہیں دکھائی"۔

کرشنا دیبی نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت سر ہلا دیا۔ اور پنکھے کی ڈنڈی کو قالین پر پھیرتے ہوئے بولی "ان پورنا میں باہر نہیں جا سکتی"۔

"کیوں نہیں جا سکتی باہر؟" ان پورنا نے حیران ہو کر پوچھا۔

دیبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ان پورنا کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔ بولی "دی دی ـــــ" اور اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہہ گئی۔

ان پورنا اچھل پڑی۔ بولی۔

"سچ"

دیبی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ دیبی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کی طرف چل دی۔

ان پورنا نے تالی بجائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وہ بھی اپنی کھڑاؤں پر گھوم گئی اور سامنے رسوئی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جہاں اماں بیٹھی ہوئی زمین قند چھیل رہی تھی۔

ان پورنا نے کہا "اماں ـــــ"

اماں نے سر ہلا دیا۔ ان پورنا اس کے قریب پہنچ کر جھک گئی اور اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کے گالوں پر ایک مشتاق ہوئی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر ایک مسکراہٹ ناچتی ہوئی اس کے جھرّیوں سے بھرے چہرے پر چوگان کھیلنے لگی۔ اماں نے چاقو اور زمین قند کو ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

پشتو گارو دو پنڈت جی!

میرے لئے یہ سب ایک پہیلی بنا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیم راؤ اس سے کترا رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ریل گاڑی میں بیٹھا ہوں جو دندناتی ہوئی ایک سرنگ میں سے گزر رہی ہے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے۔ ... کوئی عورتوں کی بات ہو گی۔ یہ سوچتے ہی سرنگ ختم ہو گئی۔

کرشنا دیبی نے پہلے کبھی وہ سبز رنگ کی پانی گھگھری نہ پہنی تھی۔ گھگھری کا رنگ گہرا سبز تھا اور انگیا کا پھیکا سبز۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں بھی سبز رنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ یہ رنگ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سوال مجھے اس سے ضرور کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے لہو میں کسی نے سونا پگھلا کر ڈال دیا تھا؟ یہ سونا ہی تو تھا جو اس کے کانوں پر دمک رہا تھا۔ یہ سونا کیا کہہ رہا تھا؟ مانگ کہاں تھی۔ پوری پوری پگڈنڈی تھی۔ کیا مجال کوئی لٹ پھسل جائے کوئی بال سرک جائے۔ کنگھی چوٹی کا فن جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے کمال کو پہنچا ہے۔ ناک کی سیدھ رکھ کر سر کے بیچوں بیچ مانگ کاڑھنا ان پورنا کو میرے سے ناپسند تھا۔ لیکن کرشنا دیبی کی سیدھی مانگ ان پورنا کی ٹیڑھی مانگ سے کہیں سندر لگتی تھی۔ اس وقت دونوں بہنیں میرے قریب بیٹھی ہوتیں تو میں اپنا ووٹ چھوٹی بہن کے حق میں دیتا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد پورے گیارہ بجے اندر سے وینا کے سُر سُنائی دیئے صرف انّ پورنا ہی کی وینا تو یہ رنگ نہیں جما سکتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ محلے بھر کی وینا بجانے والی سہیلیاں سُر میں سُر ملا کر کوئی راگ سادھ رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا خوشی تھی ؟

بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جن کا ٹھٹھا اور ہنسی مذاق ہوا کو چیرے ڈالتا تھا آخر کس تقریب پہ بلائی گئی تھیں ؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ بائیں کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کر میں نے آنگن کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کرشنا دینی سامنے والے کمرے میں پیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہے اور آرتی اتاری جا رہی ہے۔ تھال میں کم کم نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی چوکھا دیا نہیں جلایا گیا تھا۔ کرشنا دینی نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ اتنی بھی کیا لاج تھی ؟ یہ کیا کوئی دیوی بننے کا اپائے تھا۔

کرشنا دینی کی ماں کو بدھائیاں مل رہی تھیں۔ انّ پورنا کی وینا سب سے زیادہ چہک رہی تھی۔ رنگا رنگ کی ساڑھیاں میرے ذہن میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ ابھی ایک بچی رونے لگی۔ اسے ایک کیلا مل گیا۔ ادھر ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے منہ میں گڑ اور تلوں کا لڈو ڈالنے لگی کہ ایک لڑکا جھپٹ کر اسے چھین لے گیا۔ کچھ پروا نہیں لڈوؤں کی کیا کمی ہے ؟ بھائی خوش رہے، جیتا رہے .... میری فطرت کے ایک پُر اسرار کونے میں کوئی تان سین جاگ اٹھا جیسے انّ پورنا نے اپنے گیت کی لہروں پہ اٹھا لیا۔ یہ کیسا گیت تھا ؟ شاید یہ دودھ اور شہد کا گیت تھا۔ دودھ دوہتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے کچھ ایسی ہی آواز انّ پورنا کی وینا پر پیدا ہوتی تھی۔

” اب تم گاؤ دشیشری ! “

” تم سے اچھا تو نہ گا سکوں گی۔ انّ پورنا ! اچھا بتاؤ کونسا گیت گاؤں ؟ “

” وہی جو تم نے اس روز گایا تھا۔ جب وینی کی طرح میں نے پیلی دھوتی پہنی تھی اور اسی طرح اسی آنگن میں ——— برکت والے آنگن میں، عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوئی تھیں ——— وہی شہد کی مکھیوں والا گیت۔ “

دشیشری نے گانا شروع کیا۔ آندھر دیش کی شہد کی مکھیاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ سوال میرے ذہن کی چار دیواری میں بند رہا۔ وینا کے سُر آگے بڑھتے گئے۔ یہ کوئی معمولی گیت نہ تھا۔ صدیوں کی نسوانیت کا جذبہ برتری تھا۔ ابھی تو دوپہر تھی۔ لیکن ہر عورت اور لڑکی کی پیشانی پر ایک ایک چاند نظر آ رہا تھا۔ کم کم کے سُرخ بوٹے !

کرشنا دینی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اب تک کبھی پتی پتہ کرنے نہ جھکی تھی۔ اس کے آویزے سانکل تھے۔ اس کے نگینے چپ تھے۔ لاج اور دوشیزگی پہلے کبھی یوں تمام بہنوں کے روپ میں نظر نہ آئی تھیں۔ مگر وہ کوئی کبوتری تو نہ تھی جسے پہلی بار انڈے سینے سے سابقہ پڑا ہو۔

ٹھٹھا اور ہنسی مذاق خاموشی میں بدلتے گئے۔ گیت بھی ختم ہو چکے تھے۔ وینا وؤں کے تار تھک گئے تھے۔ کرشنا دینی کی ماں اور بہن نے کم کم کی تھالیاں اٹھا کر ہر کسی کی پیشانی پر پھر سے نئے بوٹے لگا دیئے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ پہلے لگے ہوئے بوٹے ہی جلی کر دیئے گئے۔ ایسا دن تو بہت مبارک تھا۔ ہر کسی کو پان پیش کیا گیا۔ ناریل اور کیلے تقسیم کئے گئے اور یوں سب کو وداع کیا گیا۔ صدیوں سے یوں ہی ہوتا آیا تھا۔ کم کم کے سُرخ بوٹے ان گنت نسلوں سے قائم رہے تھے۔ ان کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے نہیں دیا جائے گا۔

دوسرے روز یہ محفل شام کے قریب جمی۔ پھر تیسرے روز بھی شام ہی کو۔ چوتھے دن شام کی بجائے صبح ہی کو یہ رونق شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں مجھے پتہ چل چکا تھا کہ کرشنا دینی۔ جسولا (حاملہ) ہو گئی ہے۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسی رسم میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

بھیم راؤ کی باتوں میں مزاح کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بولے :” جھوٹی شرم میں آندھر دیش کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو

حیرانی ہے یہ سُن کر کہ آپ کے ہاں ایسی کوئی رسم منائی نہیں جاتی۔"

"جی ہاں حیرانی تو ہونی ہی چاہیئے" میں نے بڑھاوا دیا۔

"کتنا فرق ہے دھرتی دھرتی کا۔"

"یہ تو ظاہر ہے۔"

"رجسولا ہونے پر گویا کنیا کو قدرت کا آشیرباد ملتا ہے۔"

"آپ کا مطمح نظر بالکل ٹھیک ہے مسٹر راؤ اور ایسے موقع پہ خوشی منانے سے ہرگز نہ چوکنا چاہیئے۔"

"ہمارے یہ گیت آپ کو کیسے لگتے ہیں۔"

"یہ سب گیت، اور ان کے یہ سُر آندھرا دیش کے ابدی بول معلوم ہوتے ہیں۔"

آندھرا دیش کے ابدی بول؟ ہماری یہ رسم بہت پرانی ہے۔"

"ضرور پرانی ہوگی۔"

پہلے روز جب کنیا کو اپنے رجسولا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح فوراً ماں تک یہ خبر پہنچا دیتی ہے۔ تین دن تک اسے ہلدی کے پانی میں رنگی ہوئی دھوتی پہن کر الگ کمرے میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ کوئی اسے چھوئے گا نہیں۔ اس کی آرتی بھی دور ہی سے اُتاری جاتی ہے۔

"آرتی میں ہمارے یہاں جلتا ہوا دیا، چومکھا دیا نہ بھی ہو تو پروا نہیں۔ ضروری سمجھا جاتا ہے مگر آپ کے ہاں ــــ"

فرق تو ہونا ہی۔ دھرتی دھرتی کا۔ ہمارے ہاں بس کم کم ہی سب سے ضروری مان لیا گیا ہے آرتی کے لئے۔"

"سُرخ کم کم؟"

"کم کم ہمیشہ سُرخ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر آنکھیں جھکا دیں۔ بھیم راؤ نے اپنی بات جاری رکھی۔ کھانے میں بھی رجسولا کو کافی پرہیز کرنا ہوتا ہے۔ سُرخ مرچ اور گرم مسالے اس کے لئے منع ہیں۔ میٹھے بتاشے اسے کھچڑی دودھ اور کچھ پھل مل جاتے ہیں۔ کھائے اور پورا آرام کرے۔ یہ ضروری ہے۔"

"تین دن کے بعد کیا ہوتا ہے؟" میں نے پھر بڑھاوا دیا۔

"کنیا اشنان کر کے پوتر ہو جایا کرتی ہے اس کی وہ پہلی دھوتی دھوبن کو بطور تحفے کے دے دی جاتی ہے۔ اب وہ ماتا پتا کی حیثیت کے مطابق نئے وستر پہن کر بیٹھتی ہے اور یہ چوتھی یعنی آخری آرتی اتارتے وقت اس کی پیشانی پہ بوٹو لگایا جاتا ہے۔"

"بوٹو کے لئے کم کم نہ ہو تو آندھرا دیش کا کام ہی نہ چل سکے، مسٹر راؤ!"

"کم کم؟ یہ تو ضروری ہے۔"

"بلکہ یہ کہیئے کہ آندھرا دیش اور کم کم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔"

"بس اب آپ نے ٹھیک سمجھی ہے بات۔"

"میرا رجحان شروع سے سبز رنگ کی طرف رہا ہے، مسٹر راؤ!"

"سبز رنگ کی طرف؟ لیکن سُرخ رنگ نرالی زبان میں بولتا ہے ...... کم کم کا پیغام آندھرا دیش صدیوں سے سنتا آیا ہے۔"

رنگوں کا مطالعہ میں نے بھی کر دیکھا ہے، مسٹر راؤ! سبز رنگ، اپنی جگہ ہے یہ شانتی کا رنگ ہے۔ ہر سبز چیز امن و سکون کا اشارہ کرتی

ہے۔ قدرت کو شاید یہی رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ جب تک دھرتی بنجر نہیں ہو جاتی۔ اس کی کوکھ سے اس رنگ کے کارنامے ہمیشہ ہمارا دھیان کھینچتے رہیں گے۔ کانگریس نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جھنڈے پر اس رنگ کو اس کی جگہ دینے کی بات فراموش نہ کی۔ سفید رنگ میرے خیال میں پوترتا (پاکیزگی) کا رنگ ہے۔ ہمارے جھنڈے پر بھی یہ رنگ بھی موجود ہے اور سرخ رنگ؟ میں سمجھتا ہوں یہ خون کا رنگ ہے۔ اچھے تندرست خون کا رنگ ـــــ تازہ مضبوط زندگی کا رنگ .... سبز، سفید، سرخ۔ خوب رنگ چنے ہیں کانگریس نے یہ جھنڈا بنانے کا کام آندھر دیش کے سپرد کیا جاتا تو سارے جھنڈے پر کم کم ہی کم کم پھیل جاتا۔"

"لیکن یاد رہے کہ سرخ رنگ کا مفہوم سمجھنے میں آندھر دیش نے خوب قدم بڑھایا ہے .... کانگریس کے بائیں ہاتھ نے ادھر جو زور پکڑا ہے، وہ بھی ظاہر ہے۔ پچھلے دنوں جب شری سبھاش چندر بوس کانگریس پردھان کے انتخاب میں دوبارہ کھڑے ہوئے تو آندھر دیش کے ووٹ بہت بھاری تعداد میں انھیں کو ملے تھے۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہونے والے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا آندھر دیش کے اپنے آدمی ہیں مگر آپ جانتے ہیں ان باتوں میں لحاظ داری تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ سوشلزم اور ہندوستان کی آزادی ہمارے دو بڑے آدرش ہیں اور آندھر دیش کو الگ صوبے کا وقار حاصل ہو جائے، اس کے لیے ہم اپنی جانیں لڑانے پر آمادہ ہیں۔"

"پنتلو گارو (پنڈت جی!) باہر سے کسی نے آواز دی۔

بھیم راؤ باہر چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کے غیر مرئی ہاتھ میری پیشانی پر کم کم کا بندو لگاتے ہیں۔ میں جھٹ وہاں سے ہٹ گیا اور کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بائیں کھڑکی کا پردہ ہولے ہولے ایک کونے سے سرکایا۔ سامنے بڑی خوشنما مجلس نظر آ رہی تھی۔ کرشنا دیوی نے ہلکی نیلی انگیا کے ساتھ گہری نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آویزوں کے نگینے زمردی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن کے نیچے کھچے سبز رنگ نے ان رنگینیوں میں پناہ پا لی ہے۔

انّ پورنا نے وینا پر ملہار کا راگ شروع کیا۔ اس کی انگلیاں بہت ہمک ہمک کر چل رہی تھیں مگر اس راگ سے بھی کرشنا دیوی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں۔ انّ پورنا آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور کرشنا دیوی دھرتی کی طرف آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ کس نے چھو دیا تھا اپنے غیر مرئی ہاتھ سے اس کنیا کو؟ .... ہر چنچلا تو یوں چھوئی موئی بن کر نہ رہ جاتی ہوگی .... ہلکی نیلی انگیا۔ گہری نیلی ساڑھی اور آویزوں کے زمردی نگینے: ...... باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آ رہا تھا۔

"بہت ہو چکی یہ لاج دیوی" انّ پورنا بولی "ایسی تو ہوئی تھی۔ جھولا تیری طرح۔ میں نے تو پہلے ہی دن کے بعد مسکرانا شروع کر دیا تھا، اور دائیں بائیں، سامنے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں تو کبھی نہیں ستاتی کسی کو۔"

کرشنا دیوی کے چہرے پر بھولے ہوئے وہی پرانی شوخی آ گئی۔ اماں نے آگے بڑھ کر کم کم اٹھایا اور اس کی بندی کو جلی کر دیا۔

کرشنا دیوی اب کوئی چھوئی موئی نہ تھی۔ ہر چہرے کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ کالی جھیلوں میں نہ جانے کتنی لہریں تھرک رہی تھیں...... کرشنا دیوی کے صندلی بازو جنھیں دیکھ کر تازہ تازہ رندے کیے جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اوپر اٹھے۔ اس نے سب کو نمسکار کیا۔

سب عورتیں اور لڑکیاں مسکرائیں۔ سب کے سرخ ہونٹ ذرا کم کم سے جڑ کر رہ گئے۔ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ کاجل کی لکیریں ہر آنکھ میں؟ ...... ہاں بیٹے ـــ سبز پان، جو اپنے سینوں میں سرخ رنگ چھپائے پڑے تھے وہ بٹے۔ ناریل بٹے۔ سب اٹھ کھڑی ہو گئیں ...... کیا رنگ برنگی تھیں یہ ساڑھیاں؟ کیا ہے کہ سرخ تھی یہ زمین؟ ـــــ اس کے خطے، اس کی قوسیں۔ ہونٹ، گال، آنکھیں، سینے؟ کون فنکار ان کی تخلیق کرتا تھا؟ کون تھا جو زمین کی ہر بیٹی کو ٹھیک وقت پر جھولا بنا دیتا تھا؟ ...... یہ تو بہت ضروری تھا۔ ان گنت صدیوں

سے اسبز، سفید اور سُرخ صدیوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔

سب عورتیں چلی گئیں۔ سب لڑکیاں بھی تتر بتر ہو کر اپنے اپنے گھر بھاگ گئیں اب صرف کرشنا دیبی اور اُن پورنا رہ گئیں، ماں رسوئی میں جا چکی تھی۔

" اچھا پورنا! ایک بات بتاؤ گی ؟"

" پوچھو پوچھو "

رجسولا ہو کر بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی۔ بھلا کیسے ؟

" کیسے ؟ یہی ہوتا آیا ہے بہن شروع دنیا سے۔ میں کون سی کمزور ہو گئی تھی ؟ بلکہ رنگ نکھر جاتا ہے، اس سے . . . . . . پھر . . . . ہر مہینے !

ہر مہینے ؟

" چُپ ویبی کوئی سن لے گا۔"

پھر دونوں بہنیں اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اپنے سُرخ قالین پہ لیٹ گیا۔ میری روح کی گہرائیوں سے ایک خیال اُٹھا اور باہر سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ٹکرا گیا۔

میرے ذہن میں کانگریس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سبز، سفید اور سُرخ ——— اس جھنڈے کی عمر بہت زیادہ تو نہ تھی۔ مگر یہ رنگ تو پرانے تھے۔ ہمالہ کے ہم عمر رنگ، گنگا، برہم پتر اور گوداوری کے ہم عمر رنگ! ہر گاہ ان رنگوں کا اپنا اپنا مفہوم ہے۔ مگر میں تو اس مفہوم پر سوچ رہا تھا جو خود ہندوستان نے ان رنگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا . . . . . . اور میری آنکھوں میں وہی لاری پھرنے لگی، جس پر سوار ہو کر میں نسیم راؤ کے مکان تک پہنچا تھا۔ دائیں بائیں آمنے سامنے۔ جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی۔ سُرخ زمین لیٹی ہوئی تھی۔ ایک رجسولا کنیا کی طرح وہ آرام کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے بہت قریب آتا دکھائی دیا جب اس کی کوکھ ہری ہو گی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا جو بہ آوازِ بلند پکار اُٹھے گا۔ بلون کی جے۔ اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اُگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے۔

اختر اورینوی

کلیاں اور کانٹے

وہ تعداد میں نو تھیں۔ گوری، سانولی، گندمی اور ناگوار، بعض ان میں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریوں میں ملبوس طلوع صبح کے تبسم کے ساتھ باکس اور ڈوڈونیا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح آٹھ ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھی۔ درجۂ اول کے کوارٹر، صحت گاہ کے عام وارڈوں سے قریباً تین فرلانگ پورب کی جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں، ہر پندرھویں روز۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے۔ دوم و سوم۔ درجۂ اول کے کوارٹر تو خاصے بنگلے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ اسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دو کوٹھریاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے ایک تیمارداروں کے لئے۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سا لانبا چوڑا کمرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے لعب ولہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو سل و دق کے جراثیم کے چند اور شکار آ جاتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ زندگی۔ موت اور زندگی، موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر، اسپتال اور قبرستان، ہر جگہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان، گوروں کا قبرستان، شہزادوں کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ہر شہر، ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحت گاہ، اسی کرہ پر قائم تھا اور اسی کے بنے ہوئے قانون کا پابند۔

ہم ان دنوں دس تھے۔ صحت گاہ کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ میں۔ یہاں سے نرس کوارٹر سامنے نظر آتا تھا۔ لوہے کے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی اقامت گاہ کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی مزدوروں کے ترسے ہوئے بچے پرستانی دوکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے کی ملاقاتیں اور پکنکوں میں ہم لوگوں کا ساتھ

رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف، ان کی برائیاں، ان کے ناز، ان کی سازشیں، ان کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تنگ کر بیٹھ حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گرسنہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے۔ انہیں مصالحہ دار چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد اس وارڈ میں ایک سال گذار چکے تھے اور چند ایسے بھی تھے، جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ امید و ناامیدی کے تین سال، ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو نو وارد رہتے، یہ ذرا سہمے سہمے، سنجیدہ، اُنمل، متردد، کمبے بس اور بلغمی سے نظر آتے تھے چند ہفتوں میں یہ جھجک عموماً دور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے بن جاتے تھے۔ لیکن ایک دو پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی اور گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہرکیف موت اور بیماری کے درمیان بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوشگوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے، ہنستے تھے، جملہ بازیاں ہوتی تھیں، قہقہے لگتے تھے، نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی، اصلی اور نقلی آہیں کھینچی جاتی تھیں، سرگوشیاں ہوتی تھیں اور رازداریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا، ایک مذہب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی، پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے کم از کم ایسا نظر آتا تھا۔

ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا بساتا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ، دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا۔ نیند اور گفتگو ممنوع، زندہ لاش کی طرح پڑے رہیے۔ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجئے اور کچھ مت سوچیئے۔ فکر و تردد ایسے مریض کے لئے مہلک ہے۔

"سوچا مت کیجئے۔ اچھے ہاں...... ں!"

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں۔ مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کا سوچ، موت کا سوچ، سل کا سوچ، دق کا سوچ، آرزوؤں کی لاش، ماضی کا ماتم، مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم، محسوس، ٹھوس، تپاں، متحرک، خود نگر، خوبصورت اور حقیقت کا اچانک سرد اور بے حس ہو جانا! احساس دادراک جھٹپٹانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا نامعلوم، تاریک، بے پایاں، لامکاں، بے زماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا، سوچنے والے دماغ، دھڑکتے ہوئے دل، تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ خیز ناقابل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ ہم "صحت گاہ" کی خاموشیوں میں پھسلتے ہوئے لمحات کو سرکتی، گھٹتی، ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قمیصوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی کو پکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کا ٹھیک پتہ چل جائے۔ ہم گاہ ٹماٹر کے دام اور پیٹی کوٹ کے حاشیے کو تخیل سے چھو کر درد زندگی کی اذیتوں سے پناہ لیتے تھے اور کبھی بے خواب راتوں کی نیند کا کاجل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح پژمردہ نڈھال ہونے لگتے تو ——

"اوہ ...... رے ...... رے! بڑے صاحب سے کہہ دوں گی، یہ تو سونے لگے ہیں!"

کی آواز سنائی دیتی اور گاہے گاہے گال یا پیشانی پر ایک آشناسی چپت۔ یہ نجات دہندہ آواز سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

"میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب، سوتا کون ہے؟" "آیئے آپ بھی سو جایئے؟" یہ جواب ملتا۔ پھر کوئی تسکین دہ ردِ عمل۔

وہ روز طلوعِ آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گھنگھرو بولنے لگتے تھے۔ ہم چونکنا ہو کر اس طرف دیکھتے۔ "صحت گاہ" کی ویرانیوں میں یہ روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید ساریاں سبز جھاڑیوں سے نکلتیں جیسے بیلے کے پھول کرنڈھی کے اخضریں پردے سے نکلتے ہیں۔ بگلوں کا پرا قریب تر ہوتا جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پھر بڑی چھوٹی اور دو لچیلی ہم لوگوں کے وارڈ میں آ گرتے۔ ہم دسوں مریض انہیں اپنے دامنِ نظر میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی ڈیوٹی درجۂ اوّل کے کوارٹرز سے اس وارڈ میں بدلتی تو عموماً وہی ہوتا کہ گویا سب جانے پر کردہ و ناکردہ غلطیوں پر ہم اُن کی سرزنش یوں کی جاتی:

"میں اے وارڈ میں بھی تھی کیسے اچھے مریض ہیں اے وارڈ کے اچھی اسی وارڈ کے مریض تو جان کھا جاتے ہیں"۔

"کیسے اچھے ہیں اے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں بے چارے اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کرواتے ہیں جیسے ہم ان کی لگائی ہوں......" اور کبھی زیادہ دلدوز:

"گھر میں کسنے ہوں یہ ٹھاٹھ ہوا شان دکھلانے آئے ہیں۔ اے وارڈ میں نواب صاحب اپنا منہ تک میلا نہیں کرتے تھے۔"

ہم دسوں مریض مختلف زاویوں سے درجۂ اوّل کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سُرخ اینٹیں طنز سے ہنستی ہنستی نظر آتیں۔ محترم نواب صاحب کی بوڑھی، ان کا جوان لڑکا، منصف صاحب دھن راج جی کے بھائی کی توند اور سُنہری چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ہسپتال کے صدر ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا چالاک دفتری کار نورِ نظر، بیمار و تیماردار، غرض درجۂ اوّل کی ساری مخلوق سل کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتی۔ جو ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دانی کے کاربالک ایسڈ میں فنا ہونے کے لیے۔

اس روز سینے کے گھاؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کوئی نرس ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کی بھڑاس اور چھپے ہوئے جنسی ارمان نکالتے تھے۔

ہمارے دلوں میں بھی چور تھا اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ عمر و مایوسی تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اُکساتی رہتی تھی اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لیے تیار رہتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے۔ ماضی کے نہاں خانے میں سینکڑوں مریض، بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گزرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گوندھے ہوئے ہمیں بھی پروتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا تنوع، ہمہ ہمی اور رونق تھی۔ اے وارڈ کے علاوہ اپر سی وارڈ اور لوئر سی وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی۔ یہ اپر اور لوئر محض زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے۔ دونوں سی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے لیکن ہمارے وارڈ کا سکہ ساری صحت گاہ میں مشہور تھا۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحدہ تھی۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے نازک سے لڑکے کا بڈ تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ یہ اس صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سل کے پنجوں سے چھینا تھا۔ اسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی۔ پھر بھی وہ وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ وہ نرسوں کا کھلونا تھا۔ ننھا گوپال "گوپال" پندرھویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا بہت ہی ہٹا کٹا تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ غریب ساڑھے تین سال

'صحت گاہ' میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے ہی چلا گیا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ اس کے بڈ پر ایک مارواڑی ہی آیا۔ یہ اتنا دبلا تھا کہ ہم لوگ اسے منگتی رام کا بھوت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو جاپان کے جنوں میں صرف ایک سیر ٹماٹر دن بھر میں کھا جایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مدراس کے سپچے تھے۔ شاید ان کی صورت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چونتھا خود میں تھا۔ 'صحت گاہ' میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرتیں نکالنے والا میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی حاذق کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویر بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا ہوتا ہے "اب کالا کوئی نہیں رہے گا"۔ نقی حسین تھا اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ، چونچال، بیباک اور ہنس مکھ۔ اس کی آمد سے 'نرسی وارڈ' کا پلہ گراں ہو گیا تھا۔ پہلے اپر سی وارڈ میں گھمسی نرسوں کا مرکز ثقل تھا۔ مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے 'نرسی' میں چلی آتی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے کھانے کی میز کے گرد بڑی دل نواز فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ چہل سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت بھاتے تھے۔ وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک واڑھی رکھتے اور نقلیں کرتے تھے، دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکا لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیئر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر عبیر کی سرخ بندی نرسوں کے لئے سرمایۂ تفریح تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بے وقوف بن کر اور جھینپ کر اپنا حق جما لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا مگر ایک کی فطرت میں ایمائی فن زیادہ تھا اور دوسرے میں واقعیت نمایاں۔

نقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصری جی تھے۔ گورا رنگ جس پر سرخی کی چھوٹ تھی۔ مصری جی بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر بالکل کنوارے تھے۔ اچھوت کنیا کی طرح۔ مجھے، نقی اور مصری جی کو ایک پھیپھڑے میں "لمبے پی" دی جاتی تھی۔ مصری جی کہنہ مریض تھے۔ "لمبے پی" کا کورس ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو "فرینک نرو" کی جراحت کے ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصری جی میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نویں صاحب ایک اڑتالیس سال کے بنگالی عیسائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھنٹوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے تختے کی طرح چت لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں، کسی قسم کے آثار حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ "زیر قدمت ہزار جان است"۔ اصولاً وہ اپنے سل زدہ پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیانِ حیات تھی۔ ہر وقت، ہر روز، ہر سال یونہی زندگی گذارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ 'صحت گاہ' میں انہیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوگی۔ موٹا گول مٹول سا، گردن ندارد۔ یہ لڑکا غلام ربانی بھی پیچھو بالو کا مرید تھا۔ کم سخن، کم آمیز مگر بسیار خوار و بسیار خواب۔ اسے ہم لوگ "مرغ" کہتے تھے اور پیچھو بابو کو "پطرس ولی"۔ "مرغ" وضو کے علاوہ غسل بھی "مناتا" تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "پطرس ولی" بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرین اور ایشری کی آواز سنتے ہی "مرغ" بھی ہنگ ویسے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جانِ میتا و ریم تھیں۔ ایشری بیس سال کی صندلی رنگ، دراز قد، چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چلتی تھی جیسے اسپِ تازی "قدم" چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق" قسم کا خم! ایشری ملنسار و دلنواز

اور مجسمہ سپردگی تھی ۔ وہ نسیمِ خوش خرام کی مثال آزاد و ہمہ گیر تھی ۔ ایشری کیتھرن کو کٹر بڑا کہتی تھی ۔ کیتھرن پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی ۔ سانولا رنگ ، جراحاتِ جفا پر نمک ریز اس کے پھیلے اور گداز کولھے ، اس کی گول کمر ، اس کی شاہی ہندی چال ، مست ہاتھی کی طرح ۔ وہ یوں افقِ نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے بھاری کولھوں کے محور پر بالائی جسم چلتے وقت جھوم سا جاتا تھا جیسے پھلدار شاخ موٹے تنے پر لچک سی جائے ۔ پھر اس کے کولھے پیش و پس ڈگمگا کے متانت سے آگے بڑھنے جاننے لگتے ۔ وہ داہنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کرکے ساری کے پلو میں تناؤ پیدا کرتی اور چھوڑ دیتی تھی ۔ آنچل کی پلٹن میں اس کے سینے ابھر آتے ہوتے اور پلو لہرانے لگتا تھا ۔ کیتھرن عموماً متین سی رہتی تھی ۔ مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحر کار بن جاتی تھی اور پھر سنجیدہ ۔ بجلی کا چنچل پن اور امنڈتے ہوئے کالے موج در موج بادل کی گمبھیرتا ۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں کرکے قاتل تر بناتی تھیں ۔ اس کی نظر میں بحر الکاہل کی گہرائی تھی ۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں ۔ ایک جوڑا تھا مارتھا اور فیبی ۔ مارتھا مردانہ وِلایتی چپٹی سی عورت تھی منہ سوڑ اور بے جھجک فیبی اس کے زیرِ حکومت تھی ۔ نرس کوارٹر کے ایک ہی کمرے میں دونوں رہتی تھیں ۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے ۔ "فیبی تو فلاں مریض سے گھل مل کر کیوں ملی ؟ فلاں نے تجھ سے چھیڑ چھاڑ کیوں کی ؟ " اس جوڑے کے نصف بہتر حصے پر ہر وقت پہرہ تھا ۔ مارتھا ہاں مصر جی سے خوش تھی ۔ شرمیلے ، اچھوت کنیا سے مصر جی ۔

ایک جوڑا تھا دو چچازاد بہنوں کا سلوکی اور ظفر رکس ۔ دونوں گوری گوری ، گدراز گداز ، مائل بہ فربہی عورتیں تھیں ۔ مگر لڑکیاں کہے جانے پر مُصر ۔ سلوکی اخلاقاً یا ضرورتاً لڑکی کہی اور سمجھی جا سکتی تھی لیکن ظفر رکس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی ۔

میگی اور دلاری کالی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں ۔ خوش اخلاق ، کرم فرما ، ہر دل عزیز ، ایثار پسند ۔ میگی ادھیڑ عمر کی تھی اور دلاری جوان ۔ اس کے "پھوٹے" ، گہرے ، سینوں کی سنگینی ، ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے محاذ سے نظریں پھسل کر صدری کی لٹھوں سہارے کے بل پر تھم جاتی تھیں ۔

نوبی تھی ڈورکی ۔ وہ سراپا ڈول تھی ۔ چھوٹا سا کھلونا ، شریر ۔ آنکھیں مٹکانے اور چہیں چہیں کرنے والی گڑیا ۔ گہرا سانولا رنگ ، ابلی سادہ پیاری آنکھیں ، گھنگھریالے بال ، لڑ پڑنے والی اور لڑ کر ہنس دینے والی ۔ یہ سب سے کم عمر تھی ۔ اٹھارہ انیس سال کی ہوگی ۔ کبھی تو یہ عورت دکھتی تھی اور کبھی گویا ابھی تک بچی ہی ۔

"صحت گاہ" ایک ویرانے میں تھی ۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا اور سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر ۔ "صحت گاہ" کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی ۔ الگ تھلگ دو ڈاکٹر ، ایک کمپاؤنڈر ، ایک ڈریسر ، ایک ایکس رے بابو ، دو کلرک ، نو نرسیں ، ایک میٹرن اور سسٹر ، آٹھ وارڈ بوائے ، چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سل و دق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمارداروں کے ، وارڈوں کے چاروں طرف باغ ، جنگل اور سرخ سرخ مورم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے ۔ کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پُرشور پہاڑی ندیاں تھیں ۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کی طرح خشک ہو جاتی تھیں ۔

ایک روز میں اور نقی ایکس رے کے نئے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے ۔ ڈولی صبح سے غمگین اور چڑچڑی تھی ۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا ۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا ۔ کہنے لگی :

"بڑا بنتا ہے ۔ ایکس رے کرنے کے بہانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرے اور دوسروں سے جلتا ہے ۔"

ڈولی نے ملنے کی بے خیالی میں یہ جملے ادا کئے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش۔ وہ کہہ چلی۔

"زمیں اگر ایسی ہو تیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔"

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبۂ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو "ڈے آف" ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین کی ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں۔ مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس کا بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کوارٹر میں دو دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں، ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں، طعنہ و طنز، چھیڑ چھاڑ اور کبھی جھوم کے گیت ؎

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیّاں
مروتا کاہے بھول آئے پیارے نندویا

اور غزلیں ؎

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیمانہ

سیّاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کئی کئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوتی جوانی، عورت، بیوی اور ماں ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے ناآسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی، اس منزل میں لا ڈالا تھا — لطافت مٹی نہ تھی، روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہو گی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لئے اپنے لب و رخسار ارزاں کر دئے اور یہ سلّی سل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل و دماغ میں ہضم کر جاتے تھے! "مثبت" مریض عموماً سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دلیریاں بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے' یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیات کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی۔ ٹی۔ بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی بے حقیقت ہو جاتی تھی۔ جیسے ملّا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے سپیڈیلم فلاسک میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مسخرے پن سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"بھائی تم بی۔ بی اور سفید بی (رقیبی) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو۔ میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا تھا "سیگی بھی تو ہم قافیہ ہے۔ اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے۔" بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انہیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آ گئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید اور ہولی سب تہوار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر لیا کرتے تھے۔ مجھے صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آ گیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور لتی بہت

قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں "سارس کا جوڑا" کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا معصوم سے مہ ترین گاہے گاہے وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لئے بلا لئے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اگروال نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلانا بھی چاہا مگر ہم لوگوں نے تاب مقابلہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے جنس لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقع پر ہم لوگوں نے ڈرامہ کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان بپا کرتا ہوا آیا۔

نقی لوٹسی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمۂ شیریں کی طرح تھیں جو صنف نازک کے تشنہ دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر ایلشری کی جرأتوں کے سامنے بقیہ سب عشقی بیبن کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی ہر درخت پر چڑھ کر کھیل کرنے والی۔ مگر چوری چوری پھل لے اور وہ بھاگ۔

ایلشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایلشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا اور دل دہی کے لئے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔ "مجھے کسی کا کڑھنا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو؟"

ایلشری نے میرے سامنے ایک بار جھگڑے کے عالم میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصّے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرین ایلشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی فتوحات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب و حجاب کا اتنا گوشہ وہ چپکیوں سے ارادتاً ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مائگی ارمان انگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرین نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور راہبانہ انداز کی فطرتاً تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک۔ ایلشری کی ذات میں اس کو وہ ٹائپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سینا ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر ہی میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ ایلشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی مگر کیتھرین نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا، "ڈارلنگ!" اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرین نے مجھ سے شکوے کئے "آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھائی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ ہے" کیتھرین نے اپنی سنجیدہ، شیریں، لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی خم ٹھونک کر اُبلنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نوخیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی پھرتی تھیں۔ اسی روز بڑے صاحب نے بھی رعایت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا نغمۂ شب گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لئے تیار رہیں۔ وہ سب کی سب وردی بدل کر نئے حسین اور زریں ساریوں میں لپٹی، جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقصِ مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایلشری طوفان و سیلاب تھی۔

کیتھرین نے اپنی فطرت کا نقاب اُلٹ دیا تھا۔ وہ بھی "کرسمس ایو" میں بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک مسرتوں نہ تھا۔ وارڈ میں وارڈ میں کہربائی لہر دوڑ گئی۔ معمر ڈیل صاحب آج ہیں ہم لوگ "پیر مغاں" کہتے تھے، سب سے بے کر غلام ربانی تک لوگ تلاطم محسوسات میں شرابور ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاتھ گستاخ نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اُف! اس وارڈ کے ممکنات، ورنہ اتنے کتنے محدود تھے ہمارے دل اپنی اپنی جیبیں اور اُسے وارڈ کی نرسیں انفرادی شان میں آسودہ کشاکش رہی تھیں۔

"نرسیں بڑے صاحب کے یہاں "کرسمس ٹری" ہلانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا ——— ہاں!" ایک لوچدار آواز فضا میں ہو کر دلوں میں اتر گئی۔

"او .... رے .... یے انہیں سو کیسے جائیں گے۔ ہو! تم بھی تو جان کے دشمن ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی یا نہیں! ذرا مسرتیں کر تو دیکھو ...."

ایک رہزن تمکین ہوش نے دھڑکتی ہوئی رگ چھو لی۔ پھر جلوۂ برق فنا قمر کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور ہنسی کی پھلجھڑی ہوائی سب میں یوں چھوٹ گئیں جیسے آتشبازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یاس یک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارہواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ بائیس کو وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم وسعتی کی ذات میں نماں بیڈ پر جا کر جا کر ہم آغوش ہوئیں، خاموش ماتم کی حالت میں۔ پر نیتی آپ بیتی ہی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب بد سلامتی نمازیں چپ چاپ سے رہے۔ ہم اس اندوہ و بلا سے پناہ چاہ رہے تھے اور اتفاقاً ہم سارے جہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ "پیر مغاں" مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر سب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دئیے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کمان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے بستر پھر سے ہلا کر ہم نے نورات فضا میں بکھیر دئیے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے بھی جاگ کر گزارے۔ گفتگو کی بے بسی کی جلتی بجھتی اور نرسوں کا استقبال اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ہم میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور سیٹیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین "مژدۂ شب" اچانک سحر پر لرزتی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز ہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے اُلجھے ہوئے بال درست کر لئے۔ نرسیں باریٹیم پر کرسمس کیرول گاتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ آنگنیں، چیت کی سسکتی ہوئی ہواؤں کی طرح، شباب کی شگفتگی کی مثال۔ کچھ دیر کے لئے نغمے رُک گئے اور خندۂ بیباک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے بھرپور ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ ہائے خاموشی کا ترنم، زندہ سکوت کی ابدیت سے آغوش رہ گئی۔ اکثر نظر اٹھی تھی پھر کے ڈھونڈ کر بڑھ کر کوئی بھی گلاب و بستہ بہشت کی حسرتیں پوری ہو گئیں، بہت سی آرزوئیں جوان ہوئیں، کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت نا کردہ گناہ حسرت کی داد لینے کے لئے دردناک مشکل کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود جرأت رندانہ پیتا ہوا تھا۔ باہر صبح کی نرم اور تیز ہوائیں سرد بوستہ خاموش، گہرے نیلے آسمان کے ملتے میں الھڑ دوشیزاؤں کی طرح برگزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں مائل، اختلاط ظلم رنگیں کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے بنک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ زولی اور نرقی سب کے دوریاں۔ ایک سپیدی میں خنوش سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی خواہش بنے اور بکھرے نغمے پھر بند ہو گئے۔ باریٹیم ایشرمی کھڑی تھی اور سالومی نے "فادر کرسمس" کا سوانگ بھرا تھا۔ سُرخ جامہ، سُرخ عبا، نیلی اونچی خرطومی ٹوپی اور سفید ڈاڑھی۔

ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ "پیر مغاں" نے بڑھ کر "نادر کرسمس" سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ مجموعی طور پر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا، موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ "پیر مغاں" نے ایشری کے گلے سے بندھا ہوا ہارمونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نفی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن پڑ جانے کی مضرت بھولی رہتی تھی۔ شمر وکیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائے اور رات کی پریاں مجسم غزل الغزلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلووں کے خیر مقدم میں عرضِ نغمہ اور گدازشِ رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے بعد روز بروز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں "وسعت گاہ" کی زمین سے زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوڑھے کرسمس نے سینا ٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر معجزانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں اسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے "پیر مغاں" کی شادی تقریباً "نادر کرسمس" سے کر دی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر "مدر کرسمس" بنی۔ "پیر مغاں" اسے میری "گھر میں" کے اصول سے میری "وارڈ میں" کہنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر میری "سالی" بن گئی اور کیتھرین نفی کی "بھابی" تھی۔ اسی طرح کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ سندباد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح "وسعت گاہ" کے صحرائی جزیرے میں بیٹھے، سنسار سے الگ تھلگ، انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لئے ہوئے بھی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لا انتہا حسرتِ تعمیر بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لئے "حسنہ آف" ہیں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی و دلآویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ چھوٹے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی شدت نے انہیں سرمدی رومانوں اور عطر و سینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے، جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رومان اور سینٹ تاریخ کے چکر میں پڑ کر بسکٹ روٹی اور پڈنگ بن گئے۔ استمرارِ حیات کے لئے روزمرہ کی واقعیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا "نفی بھائی! آج کل ذہن بہت ہلکا لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی...... تب بھائی! اور یہ جا کر بچے کا اسکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟" اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں چھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہہ چلتا، "مگر پڈنگ اور بسکٹ روٹی اور کٹولڑا کے گیت۔ طبیعت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے ہے نا؟ پھر ہم یہاں کے مریضوں سے کون گھل مل سکے گا؟ مسافر بیوی سے کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹولڑا کا پتہ کہاں ملے گا؟" نادان اور ناکارہ ارمان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لیزن وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ پکا تھا۔ پربھو بابو اپنی معمریت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے لڑکوں سے ہم سب لوگوں سے زیادہ رقابت کرتے تھے۔ وہ سل و دق کے ماحول میں نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر میت کو گوارا بنانے کے لئے بے چین تھے۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ لیکن صحبت کی محبت، برج اور کیرم کے کھیل یا نرسوں کا لوچ بھی زخم پر مرہم کا پھایا رکھ دیتے، جس سے بھی غم غلط ہو جاتے۔ ایک روز گوپال پربھو بابو سا ٹہل کر واپس آیا۔ اب اسے چند فرلانگ چلنے پھرنے

کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے امید تھی کہ رفتہ رفتہ اسے بھائی جاوِق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نقی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی۔ اس ٹک ٹک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں، گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لئے، مگر قہرِ مریض بر جانِ مریض۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب اُلجھن میں گذارا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور نقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اُٹھ بیٹھے "کٹوڑا آبزرویشن وارڈ میں ہے۔ ربابو سے ..... " گوپال رُک گیا۔ اس کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ "ربابو نے کٹوڑ کے گال میں ......" "ب کے اس نے بُرا نہیں کہا ......" "انور بھائی کیتھرین سے مت بولئے۔" گوپال بہت خفا تھا اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرین ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی، کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔ "انور بابو! مجھے تائی باندھنی نہیں آتی۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے۔ میں آپ سے ہی تو تائی کا ناٹ بندھواؤں گی" یہ کہہ کر وہ مسکرائی لچکی اور دزدیدہ نگاہوں سے، اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرین نے بھی کار خیر کرتے وقت غالباً گوپال کو دیکھتے دیکھ لیا تھا۔ یہ جملے آزمائشی تھے جن کے اندر احساسِ لغزش نے مشتبہ بیانی کو امید افزا بنانے کے لئے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا۔ کیتھرین چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر از کورہ شرمندۂ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایلشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی:

"کٹوڑا کا آج لاسٹ آن ہے۔ وہ شہر نہیں گئیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں۔"

ان دنوں ایلشری بھی اے وارڈ کے منصف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی۔ میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرین اور ایلشری ان دونوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اے بی وارڈ کو بھی مطلع کر دیا۔ پرمیہ بابو اور ہیرالال نے صاد کیا۔ طے یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرین سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف ایلشری سے۔ دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں ورنہ وہ ہمیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی۔

یہ چپ چاپ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے اسٹور روم سے نقی مجوب ہی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے علیحدہ لے جا کر کہنے لگا "سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے۔ مگر سیلاب کو سیلاب بھی کہیں روک پاتا ہے۔ چلو تشفی کی ہو چکی۔" ایلشری کی شخصیت کی طوفان وشی نقی کی شعلہ مزاجی کو پنکھا جھل گئی۔ میں نے اسے بہت بُرا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا "یہ منصف بھی کیا یاد کرے گا!"

میں نے جواب دیا ——— "مگر تم ایلشری کو اپنا تو نہ سکے۔"

"تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرین کو اپنا لیا؟" وہ تنک کر بولا اور پھر کامیاب ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے واقعیت کی ٹھوس پن اور جذبات پروری کی نامرادی کا زہر محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ کرسمس نے ہم لوگوں کی توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور توقعات کا قیام خلشِ نامرادی میں بس بھر دیتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ نقی حقیقت پسند تھا اور میں ڈرامائی بلندیوں پر اُڑ کر

غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی ہے۔

دو تین روز کے بعد میں اور نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیر جاتے تھے۔ بادِ شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین و آباد بستیوں میں لطف پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ معاملات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق ہمدردانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کیف بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔

اچانک خوشگوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

"پاگلوں کو دیکھو" کیتھرین کی لوچ دار آواز عین عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم ہو رہا ہے" یہ البشریٰ کی شوخ بولی اٹھلائی تھی۔

میں نے کہا "آؤ البشریٰ! ہم سے پریم کریں!"

"واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ...... ہے...... ے! دیکھو نا کیتھرین تمہیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرین میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں 'کولر کیلسیم' کا انجکشن دیا ہے۔ جبھی اکتنا پھول گیا ہے۔ بہت درد ہو رہا ہے انور بابو......"

اس نے متر تر نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا...... میں بیگانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی:

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لئے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہوا اور اپنے، ہمارا اپنا کون بیٹھا ہوا ہے۔ نقی تو یتیم ہے نا اور میں...... میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہم بھی چل بسے تو بی بی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرین کے لنگس بہت کمزور ہیں...... اسی لئے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھتے ہیں۔ چل نقی گوار ڈ ذرا سینک دے لیں......"

وہ البشریٰ سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ نقی نے بڑھ کر کیتھرین کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا:

"جیسی ڈالی پر بیٹھ کر گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آئی تھی وہ اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میرا پوچھ کرے؟"

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرسش نے سکوت کی مہر توڑ دی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک، بچی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میرے گویائی والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرین نے البشریٰ سے کہا:

"ننھی ہے نبھی؟ میں مہندر کے حق میں "منڈلس بیئیٹ" لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا! اور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر رہی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا تو سب جانیں۔"

البشریٰ نے ہنستے ہوئے کہا:

"اتنا جانتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ بادِ شمال ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک ان کی ہنسی کی دبی دبی مہک پہنچاتی رہی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز پیر نقاں، صحت گاہ سے چل دئے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انھیں پریکٹس کی اجازت بھی دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیر نقاں" بھی ہنستے ہوئے اپنی "وارڈ مین" سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کتنے درد آگیں

اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گذارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور ملنسار، ہفتوں وارڈ سونا سونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "پیر مغاں" منتخب کیا اور "صحت گاہ" اپنے زخم و مرہم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سینا ٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ ایسے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں! پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔ جانے پربھو وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائیبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سسٹر کی انہیں اجازت تو تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ "صحت گاہ" میں صرف ایک ہی رکشا تھا، وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پژمردگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جان مستقبل کا خوف بھی انہیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھا دیا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس ولاری رہ رہ کر روئے دیتی ہے۔ وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے سبھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سینا ٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچکدار حالت ہے کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے بسل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے تھے۔ محاذ کا رخ کب پلٹ جائے یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لئے تواتر کے ساتھ تمثیل و اداکاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرین اور ایلشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور ان دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرین سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ "انور بابو! تیرہ سال کے سن سے مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چمک دمک کی طرف رُخ کیا۔ بہت بُرا ہوا انور بابو!" کیتھرین نے ایک بار کہا۔

"آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟" میں بولا۔

"تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں۔ دوسروں کے لئے اچھی بنو، پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔" کیتھرین بیزاری سے کہہ اٹھی۔

"سب تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"کون؟ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے، وہ مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں، اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ شادی کر لوں گی کروں؟" کیتھرین ہنسنے لگی۔

"ضرور کر لیجئے!"

"کرا دو!"

اسے کرا دیجئے کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس کرا دو نا کی بے تکلفی میں پہلی بار تو

کیا ہوتا، کی حسرت پوشیدہ تھی۔ "ہم سِل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" میں نے برعکس سا جواب دیا۔

"تم نرسوں کو نہیں سمجھے انور بابو" اب کے بھی 'تم' تھا۔

کیتھرن بڑی عمیق نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پرپیچ و خاردار راستوں کی طرح سامنے آگئیں۔

کیتھرن اس نوع کی درد آشنا باتیں جیت کی پیاسی تھی۔ لیکن ایلشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایلشری اُکتا جاتی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی۔ حال اس کے لئے سب کچھ تھا۔ ہی شادکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نفی نے ایک بار ایلشری سے کہا:

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

ایلشری نے جواب دیا:

"کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو شکنجے میں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں؟"

نرس سلومی کو تجسّس اور ادھر کی بات اُدھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرن کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سُنائے اور حال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرن نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر، گھوش، وہ ہڈیوں کی ٹی بی والا ذی فراش مریض ہریش چندر سبھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک، کمپاؤنڈر، ایکس رے بابو یہ سبھی اس کے گھائل رہ چکے تھے۔ پر وہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحبِ ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرن نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دئے تھے اور کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایلشری کا تو یہ عالم تھا کہ نفی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر، چائے کا طشت، گرم پائتابے، عطر وغیرہ تحفے نفی کو دئے تھے۔ ایک بار وہ نفی کا سوٹ بنوانے پر مُصر تھی مگر نفی نے انکار کر دیا۔ ایلشری کئی دنوں تک روٹھی رہی۔ اس نے شکایتاً کہا، "آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے؟"

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اڑتیس سالہ میگی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے سیناٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا، اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایلشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرۂ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں روکا جیسے ماں بیمار بچے کو کھلانے سے روکتی ہے۔ مگر ایلشری اور میگی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایلشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ 'زندہ ساریاں' اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اُس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نفی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میگی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سیناٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اسکرین بھی کیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میگی اور نرس سرشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یہ نئی نرس سرشیلا سلومی کی جگہ پر بلائی گئی تھی۔ کیونکہ سلومی نوکری سے استعفا دے کر ایک ہوٹل ماسٹر سے شادی کرنے دلی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسرے ہسپتال میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی۔ لیکن مسلسل گھر پر اپنے گھٹنے لگ بھی رہ

سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ بڑے لوگ۔ غلغلت تو باٹھیل کی بد دعائی نسکار ہتی ہے "تیرے لئے اس زمین پہ لعنتیں ہیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم واندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا"

سلوتی چلی گئی۔ اب پھر وہ لڑکی ڈھتیں۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے ایسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے انداز مخصوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پٹا کرتے تھے، چپت کھاتے تھے۔ کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے ورنہ وہ شہید ناز ہو ہی چکے تھے۔ یہ حسن زنگار ترک ستمگر سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق ردِ بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سینا ٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر سی وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو سکوتے ہوئے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر جمی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انہیں لگاؤ تھا وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور منصر جی بھی۔ مگر منصر جی یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے نرسوں سے مل مل کر روئے بھی مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سینا ٹوریم کا ڈاکٹر نسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر سی وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ ذی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامن حیات ہے۔ ارادۂ زیست بقا کا سب سے زبردست ضامن ہے۔ بد دل اکتائے ہوئے متفکر مریض اپنی قبر خود کھودتے ہیں۔ اپر سی وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا مادۂ فنا متفکرمندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس تحسین کردہ کے نیرنگ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکساتے تھے اور نہ بدیوں کو۔ ان کے لئے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مر جائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک ہی شے ہو جاتا ہے۔ زندگی کا پرتو تک کہاں!

وارڈ میں جو نئے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ نقی میں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور مارواڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مار کھا سے لڑائی ہوئی، کل فلیپی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں۔ ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری "صحت گاہ" میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں ایلشری کو کسی سے رقابت نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی کرے۔ بس وہ تو کہتی "چپ کرو" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سینا ٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا ار بعہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئر سی وارڈ اول آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہئے۔ کبھی انسان غم منا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھیل جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد ہنسوڑ اور چونچال ہو گئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا۔

ہنستی ہنستی ہی وہ ان گنت باتوں کا تذکرہ کر ڈالتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی گرتی ہوئی کاٹیج کے قریب مویشیوں کا انتظام دیکھا تھا۔ وہ اس بات تک کا تذکرہ کرتی اور ہنسی پڑتی تھی۔

میں جوبلی کے روز دس بجے دن کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلو کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی، لانبے لانبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں، دو بیزار و باغی جذبات سے تلملایا ہوا چہرہ، لانبا قد، دوہرا بدن مگر بیماری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سامنے سینی ٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی، ریڈیو بجا، کھیل کود ہوا، نرسوں نے گلے گائے، غرض بڑی تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی اچانک علالت کے سبب ڈولی کی ان دنوں ڈیوٹی ہو گئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی بہلا کر جب واپس آئے تو پہلے ہی وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب افسردہ ہو گئے۔ مگر ڈولی اُدھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے ابھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی مسرتوں کی خریداری اور ویسے ہی ہم لوگ ان جانفشاں خوں فشانیوں کے عادی بھی ہو گئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کر کے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں کچی نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بیقرار سی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دیئے۔ میری نیند غائب ہو گئی۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یکایک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی ایک سیاہ آندھی تھی، روح تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بیڈ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انہوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کروٹیں لینی شروع کیں۔ لوہے کا اسپرنگ وارڈ ریڈ بلاک کے لئے طلسم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سینی ٹوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مجبور کوسے وارڈ کے چوبے جی نے ڈولی کا سارا زہر دور کر دیا۔ برہمن تھے نا۔ بس پی کر بھی آنند ہی رہے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دُم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کو ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف، اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سہما دیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی فیکٹری پر پردہ ڈالنے کے لئے چوبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں۔ اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے الجھنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انہیں انتقام کے لئے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈولی سے سخت لڑائی ہو گئی۔ اس نے ایک نئے مریض نواب صاحب سے کہ بس اتنا کہا تھا "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ میں حلق میں پینسلین لگانے کے لئے کب سے کھڑی ہوں۔" خان بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی۔ اور بڑھتی گئی تو اتنی کہ میں نے ڈولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ بیکار سلسلہ کلام قطعی بند۔ لیڈی ڈاکٹر اور کیتھرین نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سینی ٹوریم میں ہو گئے تھے اور فتی کو ایک سال سے کچھ زیادہ۔ ہم دونوں اکتا گئے تھے مگر گرمیاں دہلیز پر تھیں اور اس موسم میں سینی ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ ذرا گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملہ کا اعادہ کیا۔ کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوبلی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینی ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے ذوق و شوق سے رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت دی گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنستا تھا۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرستش روستانہ کے تحت آتیں۔ اس کا کوئی ماضی ایسے

برما سے اسے روپے بھیجتا تھا لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی یا نہیں یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا ——— "اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، جینے کی مصیبت، مرنے کا ڈر۔ سل کے مریض کا علاج! سینا ٹوریم سے جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! بہ نہہ! آرام یا استراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوادار مکان! اور کچھ نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری سے پہلے ہمارے پیٹ بھرے ہی تو رہتے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالو، سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کہ بیماروں کا علاج کرنا۔"

اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا۔ "جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا کیوں گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس، فورڈ کے پاس، برلا کے پاس، جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر فرد کو ہلاک کر دیا جائے۔"

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔اے تھا۔ وہ نہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈھتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا:

"اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔"

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس ولاری اور کیتھرن کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ ولاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے لٹا دے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی ابکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرن نے اسے آ کر اپنے خاص انداز سے کہا "کرن بابو!" تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرن کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، ادب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور نقی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جریان خون کے دورے کے وقت وہ باؤلا ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک مانتا یا کیتھرن کی مان لیتا۔ کیتھرن نے مجھ سے دوپہر کو آ کر کہا:

"انور بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ رسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجئے گا۔" مجھے اسی وقت کراہت بجلی کے کوندے کی طرح کی رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرن کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہر حال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرن نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرن کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرن کرن کے لئے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز سہ پہر کو بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اسے پی۔ ٹی۔ ہارمون سیرم، کیلشیم، ایٹرن، مورفیا اور کوگولین کے انجکشن دئے۔ مگر خون نہ رکتا تھا۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور نقی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بیک جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے یخ غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی رقت اور لجاجت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے یہ ناقص چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے

اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنی کو جاذب سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے فوراً چند پیسوں سے کرن کے لئے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائی وہ بے پایاں ممنونیت کی نظر سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گئی۔ "ذرا آنکھیں بند کر لیں۔ تم خدا سے بہت، بہت بہتر ہو۔"

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سب کو حیرت ہوئی اور کیتھرین کو حیرت کے ساتھ ناقابلِ بیان نوعیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرین پر فقرے کسنے لگا۔ "وہ تمہیں کیا لگتا ہے؟" اور وہ صرف اتنا کہتی "وہ تو پاگل ہے بیچارہ کرن"۔ اس بیچارہ سے مجھے چوٹ لگی مگر اس نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی نادان مگر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھٹک تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرین سے، مجھ سے اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا۔ پہیلی کو یاد کرکے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا "وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی، تمہاری خالص محبت تھی۔ حیوانی، بے عقل، آزاد، عجیب مگر پیاری اور مذہبی محبت، پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرین"۔ اس نفرت کے باوجود کیتھرین کرن کو چاہتی رہی، وہ اس کے لئے کڑھتی تھی۔ کہتی "ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوتے ہیں"

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرین کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی جانب اپنی بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچی تھی یا اس کی بے پناہ پُرشور ذہنی قوت کے سبب۔ وہ اب بھی میرے پاس آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کر پائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح تلملاتا رہا۔

گرمیوں میں ہسپتال کے مریضوں کی اور کثرت ہو گئی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں۔ لیکن کچھ تو ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی کشمکش و پیچ کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اسے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کسے ہٹایا جاتا۔ وہاں عاروں کی رگوں میں بھی تو خون تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر کرشنے پر بیش قیمت ہستیوں کو اسے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، نقی اور رجنیز وکیل صاحب کو یکسر قلم ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی، بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے مگر جون کے مہینے میں سینا ٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آگئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگے۔ وہ پہلے بہت خوش ہوا۔ پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ لوٹنے لگے۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ "انور بھائی اتنے بھی چلے۔ گھر چلیں ہم، انور بھائی؟ یہاں اسے اپنی کون رہنے گا؟ جاتے رہیں جلتے یہاں سے، ساڑھے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بیڈ پر ہو گئے" گوپال نے اپنے خالی بستر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں۔ "پھر ہم سب لوگ نقی بھائی، آپ، اپریشن، منشی جی، بھائی جانی، پربھو بابو، انور بھائی، ہم پانچوں آدمی چلیں شہر کے کنارے کرایہ کا مکان لے کر رہیں"۔ اس نے اس پروگرام کی دقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سینا ٹوریم میں مثالی کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کے فوری اور نوع اثرات کے تقدم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا بہ رہا ہو۔

نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ الیشری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوست روز جاتے رہتے ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ دکھ درد، امید و ناامیدی، خوشی اور مسرت، رفاقت اور غمگساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں

وعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لوری وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے۔ مگر اس ناقابلِ بیان مسرت کے ساتھ شکستِ رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینا ٹوریم کی رفاقت بھی میدانِ جنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا! کتنی ناامیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی! کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا! مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں، تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں، سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی۔ وقتی ہی سہی، فتح کے احساس سے پابندگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر دلوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکی میں پیس لیتا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی گئی جیسے نقی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہوں جسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لئے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو، وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

"اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی۔"

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور میں رہ گئے۔ نو مریض اور تھے۔ پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ بیزار، اکتایا ہوا اور کچھ خائف۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر۔ کیتھرن نے میری بڑی دلداری کی لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکہ و تنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ آنی جانی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک۔ ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھتے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گزر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے سراسر فریب۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرن نے دو دن کے لئے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ یہ ہے کوئی جنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ وصالِ داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریبِ احساس ہے۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرن کو صاف کہہ دیا "دھوکا دینے سے کیا فائدہ! آپ کس کو چاہتی ہیں چاہیئے۔"

وہ بگڑ گئی "میں چاہتی تو ہوں مگر .... اور آپ کتنے تنگ نظر، سنگدل، بدظن اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کس سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھ سے کہے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا۔ مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ سُن کر میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا۔ میں تلملا اٹھا۔ کیتھرن نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کچھی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انہیں کیتھرن کے ہاتھ میں تھما دینا چاہا، پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر بھنبھناتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے ٹیک دیں اور لوٹ آیا۔ کیتھرن بپھر گئی اور میں نے واپس ہوتے ہوئے یہ جملے سنے:

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ کس پر ناز کرتے ہیں۔ منہ و آری! میں کسی کی پیاسی نہیں ہوں۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے ......"

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی تسکین نہیں۔

کرتی کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صبح کو میرے منہ سے خون آ گیا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا، یہ کرہ سارے سامانِ حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح شش سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں "خلا" تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بنتا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانۂ حیات کو نوچ نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہار آنے کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پھر فریبِ تمنا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت! زندگی کی نیرنگی ناامیدیوں میں بھی امید کے بت تراش لیتی ہے۔ یہ کیفیت گذر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شاید کیفیتیں لوٹ واپس آ جائے شاید روایتی خون ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے۔ مجھے مسرت ہوئی۔ میں نے زہر سے امرت بنا لیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے۔ وہ ہر آن اپنے کو بچانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے، خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذتِ آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی ہار بستر کر دیا گیا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرتی کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے۔ ٹی بی کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوتے سوتے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پرانے زخم پر فائبروسس ہو چکی ہے۔ نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آ گیا ہے۔ یہ گذر جانے والا دورہ ہے۔ گھبراؤ مت! "نرسوں نے بھی عیادت کی، جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گذشتہ سال جب میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آ رہا تھا تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لئے روحانی، مابعد الطبعیاتی عالم کی طرف رخ کیا تھا۔ اب تک میرا دل بنجر تھا، بالکل بنجر۔ مگر بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے جاسی ششرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ، جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں چھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے۔ پائدار اشیاء تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، وزنی اور عظیم جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ عورت ہے۔ مادہ کا نقطۂ کمال، جسم کے حسنِ تعمیر کا عروج جمیل۔ اس لئے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا تو دل میں ایک ہوک اٹھتی تھی اور حیات کا ذرہ ذرہ جنسِ لطیف کو ڈھونڈتا تھا۔ مجھے اٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر جذبۂ دل ایسی حرکتوں پر اکساتا تھا جو سامانِ بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگی۔ میں سوچتا کہ زراگاؤدی ہوں۔ بدن کی رومانیت، جسم اور حقیقت پرستی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں کے جامے میں الجھے رہنا بے بسی، بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے فتح اور اس کی قوتِ اقدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی و کارناکردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا المناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا، سننا، دیکھنا، سونگھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔

عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بیک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا، میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ، اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں۔ میں نے اپنے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرین اس حال میں تو ضرور مجھ سے مل ہی جائے گی، ٹوٹ گئی۔ کیتھرین بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی، غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرین کتنی خود دار و خود بین تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈولی جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا۔ جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی، وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری علالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ میں چپ رہا۔ خفگی سے نہیں شرمندگی سے۔ اس وقت وہ چارٹ دیکھ کر چلی گئی۔ پھر وہ برابر آتی رہی۔ مجھے وارڈ کی بیگانگی سے وحشت ہوتی تھی لہٰذا مجھے معائنہ کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو ڈولی مزاج پرسی کے لئے آئی۔ میں انتہائی ندامت میں گڑ گیا اور ہیجانِ جذبات نے مجھے رو پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کر بہ رقت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اتنا کہا: "انور صاحب! آپ نہیں جانتے..."

میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کمیاب حسن کی چند نورانی کلیاں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ انوکھے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو ناپیدا کنار سمندر بنا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔

آخر کار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور سینا ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت اکتا بھی گیا تھا۔ ادھر کیتھرین نے مجھ سے روٹھ کر اپنی زندگی ہی بدل لی تھی۔ وہ سب سے تعلقات توڑ چکی تھی۔ اگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو اور لوگوں سے بھی گریزاں ہی رہتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کے تجربات تلخ و شیریں کے بعد شکستِ فریب کی تلخیاں برداشت کر رہی تھی۔ اب وہ صرف کھیلنا نہیں، زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

درخت کا اکھڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ ورنہ زندگی میں سے سب سے بڑا دکھ انتقال ہے۔ جڑیں اصل زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراہنے لگتی ہیں۔ میری حیات کا درخت بھی صحت گاہ میں ڈیڑھ سال تک نصب رہا تھا اور اب علیحدگی کے وقت اعصاب کے سوتے دردناک ہو رہے تھے۔

میں رخصت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی اقامت گاہ کو گیا۔ سب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سبھوں نے بڑے انس اور خلوص سے میری پذیرائی کی اور بعض نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر کیتھرین وہاں بھی خاموش رہی۔

رخصت کی صبح کو ایشری نے مجھ سے کہا: "کیتھرین رات بھر روتی رہی ہیں اور ڈولی بھی۔ آپ کو سبھی لوگ چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا: "جو میری خطرناک حالت میں بھی بیگانہ رہا ہو وہ بلاؤز کے پیرس بٹن ٹوٹ جانے پر تو رو سکتا ہے مگر میرے لئے اس کے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں ڈولی سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

ایشری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرین آئی اور اس نے ایشری کو ڈیوٹی روم میں بلا لیا۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور ہنس کر کہنے لگی:

"جائیے مل لیجئے! بلاتی ہیں۔"

نہ جانے کیوں میں ارادے کے خلاف اندر چلا گیا اور ایشری وارڈ میں مریضوں کا ٹمپریچر لینے چلی گئی۔

خود دار و خود بین کیتھرین کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جذباتی انداز میں پکڑ لیا اور اسی حال میں میز پر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے اپنے آنسو دکھلانے میں بھی عار تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا:

"انور بابو! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا۔ بس ایک گڑیا، ایک گڑیا، ایک گڑیا!"

بلونت سنگھ

جگّا

ماجھا کے علاقہ میں بھینی ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پُر رومان ہوتی کہ سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے ——— اور اب کے قرعہ گرنام کور کے نام پڑا تھا۔

گرنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس ٹھمک رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پُر شباب دوشیزہ کی پُر زور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پُرسکون سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اُٹھتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لئے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے ——— ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گذرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بُلا دیا۔[1] اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا "تو نے بکرا کیوں بُلایا ہے؟"

شنگارے نے تہمد کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جاتے مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ —— آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پُل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا تخنہ اُتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے

---

[1] کسی کی تضحیک کرنے کے لئے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا۔

شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی کرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اور ٹِنڈیوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت، جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا ٹھہر جاتے، جی چاہتا چل دیتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آ کر رُکا، اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلافِ معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرے کی رگیں اُبھری ہوئی، آنکھیں سُرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جُوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کلے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا، گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، اور اس کے سینے پر کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھَوی[1]۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے[2] کو پیچھے ہٹا پانی کی چھالی کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے سے لئے گھڑا اچھال[3] کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کولہے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دلنشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اُونٹ سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھَوی ہاتھ میں لئے ہوئے اوٹی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آ رہے ہوں ——— لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری لہجہ اور کرخت آواز میں پوچھا "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سُرخ سُرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں، مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

---

[1] کوڑے کا ڈھیر [1] ایک تیز دھار ہتھیار جو کہ لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے [2] آہنی کڑا جو کہ سکھ کلائی میں پہنے رہتے ہیں [3] جہاں پانی گرتا ہے۔

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ بولی "گرنام!"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے[1]، ویر[2]، چاچا، باپو[3] سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی دُلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اُجڈ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے بھر پور مٹکا زمین پر انڈیل دے، اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چڑیاں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[4] کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا "واہ گورو جی کا خالصہ، سری واہ گورو جی کی فتح!"

"واہ گورو جی کا خالصہ، سری واہ گورو جی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا "میں دور سے آرہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا "میں ہر طرح سے خدمت کے۔ . . ."

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے مُوت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھرلی[5] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھُس اور کھل کی سانی کی بُو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسّی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس[6]

---

[1] ماں [2] بھائی [3] باپ [4] دادا [5] نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ [6] ناند جس میں سانی کی جاتی ہے۔
[7] بیلوں کے ذریعے چلنے والی چکی۔

دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، یہ بڑے بڑے اُپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولہے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرے میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپ اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اُپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چارخانوں والا ایسا کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی ——— اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈبیوں کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اوپر تلے تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا۔ گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا "گرنام! بس جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شریہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لسنہ منڈیریوں پر نیزوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

البتہ سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

اُٹھ دن کیلا ای
ٹکی نے مل بالو!
ساڈا او بخیہ دو دیلا ای
ٹکی کے مل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے چپکے چپکے قدم اٹھاتی ہوئی آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ہی گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ

ملہ بیر کی مانند ایک پھل

نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخرکار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اُکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو —؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دبانے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہِ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی "تم کتنے اچھے ہو — یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا،

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں"

گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا "ہاں تم کالے ہو ذرا!"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی "میں ان کو اُپلوں میں چھپا دوں گی — کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا "گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اماں کھانس رہی ہے ـــــ اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھاچھ لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھری کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک[•] وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا، اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا، اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، دہن شعلہ ـــــ وہ قہر تھا۔

• گجرانوالہ کے جاٹوں کی ایک ذات

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا ؂

بکّے پل تے لڑائیاں ہوئیاں بکّے پل تے[1]
بکّے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کل ٹٹ گئے .... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا: ؂

جگّے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگّے ماریا
جگّے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے[2]

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا، اور وہ تارا تھی ——— گمنام!
گمنام بیچاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے، وہ ہنس دیتی، اس کے جذبۂ پندارِ حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ شکار کھیلے۔ بسملوں کا تڑپنا دیکھے، اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ روچھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں، اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیرِ غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگّا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گمنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے، اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہارِ محبت کرنے پر گمنام کیا رویہ اختیار کر لے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔
گمنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہارِ نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گمنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سر نگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ:
جگّے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے میں گذر گیا۔

جگّا صبح و شام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گوردواروں میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔
اس نے باپو کی منت کی کہ گمنام کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔ اور چونکہ اس نے لوٹا وہ سب جبری تو ندوالوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گمنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگّا ڈاکو تھا۔ اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے

---

[1] بکّے پل پر ایسی سخت لڑائی ہوئی کہ چھویوں کے کیل ہی ٹوٹ گئے۔ [2] جب جگّے نے لائل پور میں ڈاکہ ڈالا تو ہر طرف برقی تاروں کے ذریعہ سے اس بات کی خبر کر دی گئی۔

ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔
نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھٹکی سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اول تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے رات کی رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروبِ آفتاب وہ بھٹکی میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔

جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظر بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گردا گرد داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی مٹیالی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ "میری تو گردن ٹوٹ گئی!"

"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

"کپاس ——— اور ہوتا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آ رہی تھی اور رستہ میں اُپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کئے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ "گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الھڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں ——— میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سنا ڈالوں

لیکن ...... ج

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی" گمنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر لب کچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گمنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گمنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے"

گمنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے ......"

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "نہیں گمنام، نہیں جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا ...... ہاں تو ...... مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گمنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گمنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی ...... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔ "تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں میں سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام ......"

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دیپ ...... دلیپ سنگھ"

جگے کو سانپ سا سونگھ گیا۔

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ بجھا بجھا سا ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے" گمنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں ___

گمنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگتا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سُرخ ہو گئی، آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی ——— معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ———

"دلیپ سنگھ؟ ———"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پُل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پُل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پُل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے بیٹھا ہو، یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گذرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پُل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پُل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے اِدھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پُل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بے سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گذر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سُنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی ہی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع۔ مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں، گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں شرارت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ پیچھے کی جانب لٹکا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا خوب سجا ہوا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے، اس واقعہ کو وہ رت شاہ کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ ماتھور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پُل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو ڈراؤنا بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سائیں سائیں کر بہنے والے پانی کی آواز سُن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی ——— اس نے ذرا بلند آواز میں "سہتی"[1] گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سُن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پُل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پُل کے درمیان میں تھا۔ دل ہی دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کُرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو ——— اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پُل کی دیوار پر سے اُچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھُری پیچھے سے اس کی قمیص میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک

۱؎ پنجاب کا ایک مشہور گیت

یہ یقین۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"اِدھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا ——— یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا "مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا....... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے...... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے؟"

"بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا ——— اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں۔ اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں....... اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اکھڑ پن پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گوراں سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا ——— آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھری ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا "....... اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو گرو سے کرپا لگنے کے لئے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی۔ ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا..... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ——— مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا "اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن میں کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا اپنی اصلی جگہ پر آ گیا ——— دلیپ سنگھ کا تمام جوش کر کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھری پکڑ کر بولا،

"تیرے پاس چھری ہے؟"

"نہیں۔"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"صفا جنگ؟"

"نہیں!"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر برسی ہیں! ہنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"ہا!" اجنبی نے پکار کر کہا: "لاٹھی لے آ ——— میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھری اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہو ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نوعمر اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، بوڑھا جگا بھاری بھرکم قوی ہیکل، کہنہ مشق دلیر۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر کشتی پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چیخا: "یہ ایک!"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا: "دو!"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا: "تین!" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا: "اور سنبھل اب چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا...... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھری اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد۔

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پاکر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگّا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط قدموں میں چھوٹی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ٹاچی باہر کھڑی ہے اور اسے جلد ہی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا: "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ——— بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔

"...... اور وہ شخص یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا ——— اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہئے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگّے نے دلیپ کے کان میں کہا: "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے......"

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگّا بلند آواز میں بولا: "بابو! ماں! بے بے!!! میں ان کو شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔"

بابو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار جرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگّے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسرور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگّے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلی بار اس نے جگّے کے بلند سینہ اور اس کے غیر معمولی لمبے

ے ساتھنی

چہرے شناقوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم کتنے اچھے ہو...... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو" قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگیے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی ــــ

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گمنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور ردیہ ہیکر عورتیں، چمکتی ہوئی چھریاں ــــ عجب منظر پیش کرتی تھیں ــــ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر بڑا چکلا شخص تھا۔ گمنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ ــــ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے"

"نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینے سے لگا لیا ــــ اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خوابناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا "آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔"

ہاجرہ مسرور

بھالو

آج جمعرات تھی۔ ابھی چراغ بھی نہ جلے تھے ——— اللہ رکھی گلابی چھینٹ کا لہنگا اور مہین ململ کا کرتہ اور سر پر ہرا دوپٹہ جگنوؤں کی طرح لپیٹے آج بھی میلی پیر بیا گھسیٹتی درگاہ میں حاضری دینے نکلی لیکن ایسی بے تابی سے کہ انوری اس کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکی جھٹکی برابر پیٹ، اس پر دل کی ہاں کا سوٹ، شلوار پیٹ پر ٹکتی ہی نہ تھی، پیروں پر وہ سوجن کہ کبھی کبھار پاؤں میں پڑنے والی گرگابی سے پیر تو جیسے گوشت کا بڑا ہو کر ابلے پڑتے گھر سے دو قدم پر تو درگاہ تھی۔ مگر معلوم ہوتا کالے کوسوں کی بات ہے۔ مٹھی میں چراغی کے چار پیسے اور دوسری ہتھیلی پر ملیدے کی طشتری، یوں منوں کا بوجھ نہ معلوم ہوتی اگر اللہ رکھی کی چال پر ایسی منہ زور جوانی نہ آئی ہوتی۔

انوری نے ہانپتے ہوئے سوچا "سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتے۔ اب جیسے اماں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ میں بھی ساتھ ہوں۔" یہ سوچتے ہی اس کے رونگٹوں رونگٹوں سے کوئی شے کھول کھول کر سر تک آئی اور پھر ننھے ننھے قطروں کی صورت میں آنکھوں میں پھیل گئی۔

لیکن یہ قطرے اس وقت بھاپ بن کر اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ اللہ رکھی مزار شریف کے پائینتی کھڑی تڑپ کر میلی ہتھیلیاں پھیلا پھیلا کر روتے ہوئے کہہ رہی ہے ——— "میاں ——— اے میرے میاں ——— پکڑ یا حسن تو میری۔ ——— وہ حرامجادی پھر بھاگ گئی۔ میں تو تجھی سے لوں گی اس حرامی کو، میاں اے میاں۔" فرط احترام سے وہ چھانٹ چھانٹ کر کم سے کم "روزمرہ" میں اپنا دکھڑا میاں کے حضور کی درگاہ میں پیش کر رہی تھی۔

انوری کا دل بھی غنچہ سا کھا گیا۔ مگر کھل کر روتی کیسے۔ درگاہ تو درگاہ ہے، کئی لوگ ادھر ادھر کھڑے تھے۔ یہی لوگ بعد میں آکر چھیڑتے۔ نذریں پہنچ گئیں۔ ملیدے کی طشتری اور چراغی کے پیسے مزار کے مجاور احسان اللہ میاں کے حوالے کیے گئے جو انہوں نے پھرتی سے مزار کے طاق میں چڑھا دیے۔ چڑھاوے کے ساتھ ہی اللہ رکھی اور بھی بکھر گئی۔ ایسا بکھر کر روئی کہ انوری کے آنسو بھی بہہ نکلے، سویرے سے بھوکی بھی تو تھی۔ صبح ممہ قصائی کے بچے کچھے چھیچھڑے، اور ہڈیاں کاغذ میں لپیٹ لایا تھا جو پک کر بھی نظروں میں نہ سمائے۔ پھر پہلوان سے جو بچے وہ اللہ رکھی اور بچوں کے ٹینگ لگ گئے۔ بالشت بھر ادھ بچے شوربے میں ایک بڑی تیر رہی تھی۔ وہ بھی چچے ٹرنے کو جی نہ چاہا۔ ان دنوں گوشت تو ایسے یوں بھی اچھا نہ لگتا۔ سویرے سے کیسا کیسا جی ہو رہا تھا کہ ایک کھٹی نارنگی چوس لے مگر ان دنوں اس کی فرمائش آج کل پہ ہی ٹلتی رہتی۔ حد تو یہ ہے کہ صبح چولھے کی مٹی کھانے کو جی مچلا۔ ایک ذرا سی

کمر رہی تھی کہ اللہ رکھی ڈکاری "اری ناس پیٹی چولہا ٹھنڈا لیے لیتی ہے۔ تیرے یار آ کر چولہا بنائیں گے ؟"

انوری نے جلدی سے سسکتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور اللہ رکھی کی بانہہ پکڑ کر باہر لائی۔ میاں احسان اللہ ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر بولے "نہ رو بھئی۔ زمانہ ہی بُرا ہے۔ اولاد ماں سے سرتابی کر کے کبھی سُرخرو نہیں ہو سکتی۔ انوری اللہ رکھی کو سمجھاؤ نا! رپٹ لکھا دو تھانے میں، جہاں ہوگی پکڑی آئے گی سالی۔"

خوب تو گویا اللہ رکھی اب میاں احسان اللہ سے عقل سیکھے گی ــــ وہ تو اسی دن رپورٹ لکھا چکی تھی جس دن بھالو غائب ہوئی۔ داروغہ جی نے پہلے تو اللہ رکھی کو فراشی سُنائیں، مگر جب اللہ رکھی نے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اتار کر ان کے قدموں پر رکھے تو کہیں جب کر کچھ دھیمے پڑے۔

داروغہ جی کا غصہ کم ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی جو اللہ رکھی کے علاوہ اور بہنوں کو بھی معلوم تھی لیکن کس کے سر پر اتنے بال تھے جو یہ بات زور سے کہہ سکتا؟

اس وقت جبکہ وہ چھوٹے سے اُجڑے مارے قصبے کے واحد کھلے بندوں طوائف گھرانے کی طرف سے رپورٹ سُن رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے تو گھر سے ملازم جھوکرا نکلا اور کہا ـــ اندر بُلاتی ہیں۔

اندر پہنچے تو نازک بدن سنگارپٹار سے لدی ہوئی بیگم تھانے کی طرف کھلنے والے دروازے سے لگی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں، سرگیں آنکھوں میں آنسو، داروغہ جی کو دیکھتے ہی تڑپ کر بولیں "اللہ سے کچھ تو خوف کھاؤ۔ کیوں بے قصور نگوڑی بڑھیا کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ـــ یہ نہیں سمجھتے کہ اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والوں کا کیا دوش ــــ کئی دن سے قدیر میاں جو رات رات بھر غائب رہتے ہیں۔ ایسے ننھے بن گئے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" یہ کہتے کہتے آواز بھرا گئی، رکی رکی آواز میں کہا "بھئی واہ خوب خاندان کا نام روشن ہو رہا ہے۔ بڑے بھائی ہو کر اتنے بھی نہیں کر سکتے کہ... آج تک ہمارے گھرانے کے لڑکے رنڈیوں پنڈیوں کے پیچھے بھاگے ہیں بھلا؟"

اس پر داروغہ جی گھبرا گئے، ہکلا گئے، کانپتے ہوئے کہنے لگے؛

"ارے بھئی کیسے کہہ سکتی ہو کہ بھاگو کے معاملے میں قدیر میاں ــــ واہ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"اچھا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج ہی قدیر میاں کا پیچھا کر کے دیکھ لو، ارے میں تو قدیر میاں کی آنکھیں پہچان لیتی ہوں، ہاں نہیں تو۔" اتنا کہہ کر بیگم سہاگ جیسی سفید چاندنیوں سے ڈھکے ہوئے تختوں والے کمرے میں کھسک لیں اور گاؤ تکئے سے ٹیک کر بیٹھ رہیں۔ اس ادا سے داروغہ جی نے سمجھ لیا کہ بیگم اپنی بات سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہونے والی نہیں۔

اور وہ دل و جان سے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے تھانے میں پہنچ گئے۔

رپورٹ رجسٹر میں درج نہ ہوئی۔ اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ داروغہ جی نے چپ چپاتے بھاگو کو برآمد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن بے چاری اللہ رکھی کو اس کا کیا علم ہوتا۔ اس کے کلیجے میں تو آگ بھڑک رہی تھی، بچھڑی ہوئی سارس کی طرح ڈول رہی تھی، ہر طرف منہ اٹھا اٹھا کر پکار رہی تھی۔ "اری بھالو تجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ کیسے دکھوں سے پالا، خود اچھا نہ کھایا تجھے کھلایا، پال پال کر سانڈ کر دیا۔ ارے ان بالشت بالشت بھر کی چھپکلیوں کے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھا، آنے جانے والوں کی بغل سے اٹھا اٹھا کر دودھ چٹایا اور باتیں سُنیں، یہی تو زندگی کا آسرا تھیں اور اب جبکہ بڑھاپا آیا تو دنیا یوں اندھیر ہو گئی۔" انوری فرمانبردار سہی پر کتیا کا جنم لے کر آئی تھی۔ بچوں پر بچے لاکھ لاکھ علاج کر دو، پچاسوں روپے جنیا دائی کھا گئی مگر بات نہ بنی اور بچی بھالو، بھرے وقت میں ماں کا سہارا تھی اس کا یہ حال کہ آئے دن کم بخت ماری لونڈوں، لاریوں کی طرح گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رکھی کسی کے گھر برتن مانجھ کر پیٹ پالے؟ اپنا ہی پیٹ ہوتا تو خیر مگر یہاں تو کھانے والے کتنے تھے۔

اللہ رکھی، پہلوان، انوری کے تین لڑکے اور پھر انوری بھی تو ———— اب ایسے دنوں میں جبکہ لٹتے بیٹھتے میں بے چاری کی سانس پھولتی تو اسے کوئی کہاں دھکیل دیتا۔ پورے دنوں سے بیٹھی تھی۔ چہرہ ایک دم سفید کھریا مٹی، ہونٹ نیلے، آنکھیں مارے نقاہت کے خالی خالی، اس پر سے اس کا چھوٹا بچہ ابھی تک خالی چھاتی چچوڑنے سے باز نہ آتا تھا۔ ساری جان کھینچے لگتی۔ ابھی دو ایک مہینے پہلے تک وہ ہنس بول کر کسی نہ کسی سے اٹھتی جوانی تو جھٹک ہی لیتی۔ مگر اب تو اسے مارے بوجھ کے ہنسی تک نہ آتی تھی۔

اور آگے زمانے میں بھالو پھر چلتی بنی۔

"ہائے سچ مچ برا زمانہ لگا ہے۔ نفسی نفسی ہے یہ قرب قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بھالو حرامزادہ میری کمائی پر پل پل کر جوان ہوئی اور جب احسان چکانے کے لائق ہوئی تو حرافہ ہماری کٹی انگلی پر موتی بھی نہیں، نگوڑے نگوڑے یاروں کے پیچھے لگ گئی ہے۔ ارے کیا ہم کبھی اس کی عمر کے نہیں تھے؟ کبھی پیسے کے سوا کسی سے کوئی لالچ نہیں کی، اور ایک یہ بھالو ہے۔ ارے کیا یہ بھالو جانتی نہیں کہ انوری کسی کی کمائی کھانے والی نہیں۔ بس یہ مجبوری کے دن سدا تھوڑی رہیں گے۔ یہ وقت نکل جاتا تو اپنی جوانی کا صدقہ اسے سال بھر بٹھا کر روٹی کھلا دیتی۔ پر اسے میرا خیال کہاں؟" انوری درگاہ سے واپسی پر رینگ رینگ کر چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اجڑے قصبے کا اجڑا بازار اس وقت چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی میں چمک گیا تھا۔ کئی لوگوں نے انوری کو یوں چلتے دیکھ کر آوازے بھی کسے اور انوری شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے چپکے سے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اللہ رکھی سلیپر گھسیٹتی گلابی چھینٹ کا لہنگا گھماتی گھر کے دروازے میں غائب ہو گئی ———— اور انوری پھر کھول اٹھی "سچ ہے کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ اب اماں کو تو نہیں معلوم کہ میں بھی ساتھ ہوں اور یہ دل کی پیاس کی تشنگی بھی تو مصیبت ہے۔" انوری کا جی چاہا کہ بیچ بازار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس بات پر خوب روئے۔ پر وہ رو نہ سکی۔ بس جھکا کر ایک دوکان کے چبوترے سے لگ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ارے ہے انوری یہاں کیوں رک گئیں، گھر چلو۔" کسی نے دھیرے سے کہا۔ انوری نے پسینے میں ڈوبے ڈوبے ایک ذرا آنکھیں کھولیں یہ غالباً حفیظ تھا۔ نہیں یہ یقیناً حفیظ تھا۔ یہ نرمی حفیظ کے ہاتھ کے سوا کس کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے؟ اس نے کمر میں درد کی لہر محسوس کرتے ہوئے آنکھیں ٹھنڈی سی کھول کر سوچا اور پھر اپنا بازو حفیظ کے نرم ہاتھ میں پکڑائے اپنے گھر میں داخل ہوئی ———— اور انگنائی میں پڑی ہوئی کھاٹ پر دھم سے گر پڑی ——— گھر میں بھی ذرا دیر کو سکون نہ ملا۔

اللہ رکھی اور پہلوان گھر چلے اور بازاری سیاست پر زور شور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

"ارے خالہ ذرا انوری کو دیکھیو۔ اس کا جی بگڑ رہا ہے۔" حفیظ غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ کڑی آواز میں بولا۔

"اللہ خیر کریو، میاں بجر کا صدقہ۔" اللہ رکھی جھپٹ کر انوری کے قریب آئی اور جلنگی کی کھاٹ میں انوری کے ڈوبتے ہوئے جسم کو ٹٹولنے لگی "جیناوالی کو بلاؤں بٹیا؟"

"اونہوں، بس اب ٹھیک ہے جی۔" انوری نقاہت سے بولی اور اللہ رکھی لمحہ بھر رک کر پھر اپنے مورچے پر جا ڈٹی۔ چھپر تلے بنے ہوئے چولہے کے پاس لہنگا پھیلا کر بدستور بیٹھ گئی۔ چلم کو ہتھیلیوں میں ایک خاص انداز سے دبا کر ایک دو زور کے کش لئے۔

حفیظ بیڑی سلگاتا چلا "خالہ میں دوکان پر چلا، پھر آؤں گا۔"

اللہ رکھی نے جواباً ایک دو کش اور لئے۔

"اس بار لونڈیا آئی نہ کمائی پڑتی ہے۔ پورے دن بھر رہے ہیں۔" اللہ رکھی نے رو رو کے ہوئے پہلوان کو خوشخبری سنائی۔

"ہاں سالے بیٹھیگا۔ ہونی نہ ہو لونڈیا۔ دیکھ لیجو۔ چیاب سے مرکھ پڑو اور جو پھر لونڈا نہ جنے۔ چھاتی پر چڑھ کر کمائی کھائیں گے کتے کے بچے۔ تین کیا کم ہیں جو چوتھا بھی گھر دیکھ رہا ہے۔ پتر یا جات حرم نہیں آتی۔ شریف جادیوں کی طرح لونڈے جنتے۔" پہلوان اپنی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرتے

ہوئے ڈکارا۔

”چل رہنے دے نکھٹو۔ لونڈے ہوں یا لونڈیا۔ تیری کمائی تھوڑی کھائیں گے۔“ اللہ رکھی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا ”اسے ہاں کم بخت کی ناک بھوں ہر وقت چڑھی رہتی ہے جیسے سچ مچ کا خاوند ہو۔ کما کما کے ساری کمائی اجاڑ دی کم بخت نے۔ ہے دو کوڑی کا نہیں نخرے لاکھ روپے کے۔“

”ہوں! بڑی کمائی ہے تیرے گھر، خود تو دو کوڑی کی نہیں۔ ایک لونڈیا کتیا کی طرح سال پیچھے جننے بیٹھ جاتی ہے۔ دوسری مستانی ہاتھی ہو رہی ہے کمائی کے نام دھیلا نہیں، بھاگ بھاگ کر تبرک کی طرح بٹتی ہے۔ تو بھی جوانی میں ایسی ہی ہوگی۔ بیٹی ماں پر جاتی ہے۔“ پہلوان نے چیخ کر کہا۔

”تھوکے دیتی ہوں زبان روک لے۔ ارے بھلا میں کیوں ایسی ہوتی؟“ جہاں سنے کہا وہ کیا۔ مجال ہے جو کبھی کسی سے ماں کی مرضی کے بغیر ہاتھ بھی چھوایا ہو۔ اب تو زمانہ ہی برا ہے، اس میں کسی کا کیا دوس؟“

”دوس (دوش) کیوں نہیں؟ ارے تو نے کسی میرے جیسے کے پاس ایک بار رکھا ہوتا تو ساری منہ جوری (زوری) ——— اونٹ پہاڑ تلے آئے تو بلبلانا چھوڑ دے۔ میں نے کتنی بار کہا کر ———“ پہلوان کے منہ پر دل کی بات آ گئی۔

”بس بس سرم گھول کر پی گیا۔ لے بھلا کوئی دیکھو تو سہی، ہائے میری ماں!“ اللہ رکھی چلم چولھے میں اوندھا کر بے بسی سے رو پڑی۔

سچ مچ رونے کی تو بات تھی۔ جب لوگ سارے قاعدے قرینے پاؤں تلے روندنے کو تیار ہو جائیں تو پھر بے چاری اللہ رکھی اور کرے بھی کیا۔ دو دن سے پیسے کوڑی کی صورت نظر نہ آئی تھی۔ آج تو پنساری نے آٹا دال بھی اُدھار نہ دیا تھا۔ بھالو جو بھاگی ہوئی تھی۔ اب اس میں بے چارے پنساری کا بھی کیا قصور؟ جب گروی رکھنے کو چیز ہی نہ ہو تو پھر ادھار کوئی کس برتے پر دے؟ ادھر تو پیٹ کی ہائے دیا پڑی، اُدھر پہلوان پر پہلوانی سوار۔ اللہ رکھی چھپر تلے بیٹھی بڑے درد سے آنسو بہا رہی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ابھی تک گھر میں چراغ بھی نہ جلا تھا۔

پہلوان محاذ پر خاموشی دیکھ کر لال لنگوٹ پر تہبند باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔ آج یہاں روٹی کا آسرا نہ تھا پھر بیٹھ کر کیا کرے؟ اس بے رخی پر اللہ رکھی اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ایک زمانہ وہ تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے۔“ اللہ رکھی نے روتے ہوئے سوچا۔ اماں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ دانت ٹوٹ رہے تھے۔ پر خیر دکانی ٹھاٹھ تھا۔ اس کی بیاہتا کے گھر دو سال پہلے ہی بچہ ہوا تھا ——— مگر اللہ اللہ کیا وضعداری تھی۔ اس زمانے میں اللہ رکھی کی جوانی پکے پھوٹ کی طرح کھل رہی تھی۔ مگر مجال ہے جو خیرو قصائی نے کبھی اللہ رکھی کی طرف ایسی ویسی نظر ڈالی ہو۔ بیٹی کہہ کر پکارا اور بیٹی ہی سمجھا اور ایک یہ پہلوان ہے، کمانے جانے کو آنکھیں آ گئے۔ نام کرے اللہ رکھی سے یاری کا اور نظر رکھے اس کی بیٹی بھاوو پر ——— آگ لگے ایسے زمانے کو، نیتیں سلامت نہیں رہیں۔ جبھی تو ہر چیز برسنے کے بھاؤ ہو گئی۔ جوان جوان لڑکے قصبے سے بھاگ جاتے ہیں۔ کبھی برس مد برس میں فوجی سپاہی بن کر آتے ہیں۔ یا پھر کسی مل کے مزدور تو ناک بھوں چڑھاتے پھرتے ہیں۔ جو اس اجڑے دیار میں رہ گئے تو سمجھو دو بد اندیش ہیں۔ اللہ رکھی کے گھر قدم رکھتے ہیں تو پیسے پیسے پر تکرار کرتے ہیں۔ نہ کوئی انعام نہ کوئی تحفہ۔ قصبے بھر سچ پوچھو تو اب ایک اللہ رکھی کا گھر ہی مشکل کشائی اور حاجت روائی کا منبع نہ تھا۔ اب تو چوری چھپے ان کیٹوں کے گھر فیض جاری تھا۔ ہائے دوسروں کے ہنستے ہیں گھستے۔ دوسروں کے پیٹ پر لات مارتے شرم نہیں آتی لوگوں کو۔ ——— اماں نانی کے زمانے کا بنا ہوا مکان جگہ جگہ سے نمک لگ لگ کر گر رہا ہے۔ اتنا نہیں کہ دو نئی اینٹیں لگ جائیں ——— ارے جس کے دو بیٹیاں پہلے زمانے میں ہوتیں تو سمجھو کہیں کی مہارانی۔ اور اب دو بیٹیوں کے ہوتے بھکارن سے بدتر۔ آٹا روپے کا دو سیر نہیں جڑتا۔ اس پر ایک جنم جلی سہرے جلیوں والی شریف زادی کی طرح سال پیچھے بچہ جنتی ہے اور دوسری آگ لگی دوسروں کے پیچھے چھچھوندر کی طرح چھپاتی پھرتی ہے ——— اور یہ پہلوان بس کم بخت روٹیاں ٹھونسنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس سے کیا کوئی عیش اٹھائے؟“

اللہ رکھی اُمنڈ گھمنڈ کر آنسو برسانے لگی۔

"اری بھالو تو مرجائے۔ کسی کتے کتے کی آئی تجھے آجائے۔ تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑجائے۔ اری بھالو تیری چھاتی کھٹیا نکلے۔ اری تیا بیری! یہ اولاد تو میرے لئے سانپ بچھو ہوگئی ری بیا ———"

اور اسی لمحے تین عدد اولاد گھر کے اندھیرے میں چیں پیں کرتی گھسی۔ اللہ رکھی کا رونا پیٹنا سن کر ٹھٹکی۔ کسی نے کپڑے سے ٹپ ٹپ کرتے سے ناک پونچھی۔ کسی نے آنکھ اور کسی نے ناک، اور ماؤ بڑی آسانی سے سمجھ گئی کہ اس وقت کھانا ملنے کی امید نہیں۔

اور پھر سب نے اکٹھا رونا شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی پرانی اینٹوں کی گرتی ہوئی دیواریں ایک دم بھیانک سی لگنے لگیں۔ آسمان پر ایک تارہ چمک کر ٹوٹا۔ انوری ہول کر چیخی "اے بے اماں بچوں والے گھر میں شام کو نہ رو۔" اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر سب سے چھوٹے بچے کو گھسیٹ لیا جیسے وہ اسے کہیں بھاگنے سے روک رہی ہو۔

اللہ رکھی اس مداخلت بے جا پر سانپ کی طرح پھنپھنا کر اٹھی "کیا کہا تو نے؟ لو یہ اور آئی حرام جادی بچوں والی۔ اری یہ چونچلے تجھے نہیں سجتے۔ سرم ہوتی تو ڈوب مرتی کسی تلیا میں۔ ایک تو حرامی پلوں کی پوج کھڑی کر دی اس پر سے ——— مدد کے کر وال اس پچوڑی کو۔"

انوری غریب سدا کی نازک، کم سخن اور فرمانبردار، مگر اس وقت تو وہ بھی اکڑ کر بیٹھ گئی۔

"بس بس اماں کمبردار جو میرے بچوں کو کوسا، واہ جر اکیا ل نہیں، میرے بچے کسی کی روٹی نہیں توڑیں گے۔ اپنی جوانی کا صدقہ کہ تمہیں بہت کھلایا۔ اپنی جان کو جان نہیں سمجھا، بیماری رنگی میں بھی کمائی سے منہ نہیں موڑا اور تمہاری ہنڈی گرم کی۔ کر سنا ہے تو اس حرامپے کو کوسو۔ میرا نام بھی انوری ہے، تو میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں منہ کالا کر جاؤں گی۔ اللہ کی زمین بہت پڑی ہے۔ جہاں بیٹھوں گی روکھی سوکھی کھاؤں گی۔ پھر دیکھیں گے کہ تم بھالو کو کیسے بیری طرح دبا لو گی۔"

انوری کی اس خوفناک دھمکی کے بعد خدا جانے اللہ رکھی کیا طوفان اٹھاتی۔ مگر خیر ہوئی کہ اس وقت بازار کے بہت سے لوگ ایک لال پگڑی کے پیچھے پیچھے اندر گھس آئے! اور پھر کسی نے بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ یہ حفیظ تھا، وہی سفید شلوار اور سرمئی ریشمی قمیص اور وہی تیل میں چپڑے ہوئے پٹے، سرمے سے بھری آنکھیں اور پان سے سرخ ہونٹ، انوری کو بے تکا سا خیال بجلی کی طرح کوند کر آیا "ارے یہ تو موا حفیظ دوستی دوستی میں ہمارے گھر گھس کر ہمارے گاہک اپنے واسطے پھسلانے آگیا ہے ———" حفیظ کو انوری کے اس خیال کا پتہ لگتا تو اس کے خلوص کو کیسی ٹھیس لگتی ——— اسے یہی کرنا ہوتا تو کم بخت بنواڑی کی دوکان سے سر کیوں مارتا؟

"اے خالہ! بھالو آگئی۔ مبارک!" حفیظ خوشی سے چہک کر بولا۔

اور اسی وقت مجمع میں گپ شپ شروع ہو گئی۔ بھالو کو مجمع کے بیچ میں سے دھکیل کر تھانے کا سپاہی سامنے لایا۔

ہاتھ رسی سے کس کر بندھے ہوئے۔ ململ کی وہی نئی ساری جو بھاگنے کے دن پہنے ہوئے تھی۔ مٹی کرٹ کے بجائے سرخ رنگ کا جانگیہ اور وہی چھوٹی سی کرتی، مگر ہر چیز کیچڑ میں لت پت اور پھٹی ہوئی، جیتھڑوں جیسے سخت گھنگھریلے بال، جھریجھری کی کھوپڑی پر چپلتے ہوئے جیسے اس نے جنگل سے خوب ڈٹ کر ہاتھا پائی کی ہو۔ مگر اب ماں کے سامنے نظریں نیچی کئے کھڑی معصوم بنی تھی ——— مارے تندرستی کے جھومتے۔ بھنا اس کی عادت تھی جبھی تو سب اسے بھالو کہتے تھے۔

"آگئی ———" اللہ رکھی نے اپنے اور بھالو کے درمیان ایک ایسی خطرناک بٹری مٹری گالیوں کی کھڑکی کر دی ——— اور پھر ———

"چل اندر!" یہ کہہ کر اس نے بھالو کا ہاتھ پکڑا اور کوٹھڑی میں دھکیل کر کنڈی چڑھا دی۔ "چلو قصہ ختم! مجمع بڑا مایوس ہوا، ذرا بھی تو ہنگامہ گرمی نہ پیدا ہوئی۔"

لیکن اللہ رکھی کی تجربہ کار نگاہیں سمجھ گئی تھیں کہ اس وقت لوگ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں ہیں۔ ہاں بھئی کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے ———

چھانا پینے ذرا باہر بھلا۔ اللہ رکھی تیوری چڑھائے چولھے کے پاس گئی اور چلم بھرنے لگی۔

"جنگل میں مانک پور کی طرف بھاگی تھی۔ میں نے پکڑ لیا۔" سپاہی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

اللہ رکھی چلم بھرتی رہی۔

"اب باندھ کر رکھو مادر —— کہ اب کبھی چلیں ہیں کرے تو مجھے بتانا۔ ساری مستی مار مار کر نکال دوں گا۔"

پنساری ٹانگ کو کھجا کر بولا: "بھائی اللہ رکھی کم مارتی ہے؟ پچھلی دفعہ بھاگی تھی تو تین دن کھانا نہیں دیا۔ زنجیر میں باندھ کر رکھا، پہلوان نے جوتے مارے سو الگ —— بالکل سیدھی ہو گئی تھی مگر پھر تھوڑے دن میں بھاگ لی —— کیوں اللہ رکھی؟"

اللہ رکھی اطمینان سے چلم لے آئی اور پہلے سپاہی کو پکڑا دی اور خود انوری کے بچوں کو لے کر ٹوٹی ہوئی چھپر تلے بیٹھ کر چولھا سلگانے لگی۔

مطلب یہ کہ دربار برخاست، کھانے پکانے کا وقت ہے۔

لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ اپنا حرج کرتے، ایک ایک کرکے کھسک لئے۔ سپاہی نے بیٹھ کر تمباکو کے دو ایک کش لگائے۔ انوری تو اب تک مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھی تھی کہ سپاہی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر دوبارہ جھلنگا کھاٹ میں ڈوب گئی۔ اس کا چھوٹا بچہ دودھ چچوڑے جا رہا تھا۔

سپاہی نے اکتا کر گڑ جیسی بے مزہ تمباکو کے دو ایک کش اور لئے۔ قطعی گھریلو فضا تھی وہاں۔ وہ زیادہ دیر نہ ٹکا۔ چلتے چلتے سوچا۔ آہا بھانو ہے بڑی مزے دار۔ کل پرسوں اللہ رکھی سے بات کروں گا۔

سپاہی کے جانے کے بعد اللہ رکھی لنگا جھاڑ کر اٹھی اور باہر نکل گئی اور جب چند منٹ بعد واپس آئی تو دوپٹے کے پلو میں ارہر کی کھچڑی بندھی ہوئی تھی۔ چولھے کے پاس بیٹھے ہوئے بچوں کی آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک اٹھیں۔

انوری اور اللہ رکھی میں کوئی بات نہ ہوئی۔ انوری کو انگنائی میں ٹھنڈ لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی مگر وہ جاتے کہاں۔ چھپر تلے اللہ رکھی اور کوٹھڑی میں بھالو۔ اس وقت تو اسے سبھی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پڑی اونگھتی رہی —— رات کافی گزر چکی تھی۔

"او انوری اٹھ یہ کھا لے۔" اللہ رکھی تام چینی کی پلیٹ میں بڑے سلیقے سے کھچڑی لئے حاضر ہوئی۔

"نہیں کھانا انوری؟" انوری کی ناک میں گھی کی خوشبو آئی۔ اس نے جبر کرکے کروٹ بدل لی۔

"کھا لو انوری۔" حفیظ عطر میں مہکتا پٹی پر بیٹھ گیا۔ "اے ہے بے چاری خالہ نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ تم کھا لو تو ——"

مگر حفیظ کا صلح کا جھنڈا انوری نے پیروں تلے روند دیا۔

"نہیں مجھے دوسرے کی کمائی سور حرام ہے۔ اب تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" انوری نے زور سے کہا۔ پلیٹ میں کھچڑی پر رکھی ہوئی آم کے اچار کی پھانک بھی کتنی ظالم ہوتی ہے۔ انوری نے منہ کا پانی نگل کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

"ارے تو کہیں نہیں جائے گی۔ اب چھوڑ، تجھے کھانا ہے سو کہنے سے کھا لے۔"

حفیظ اسے اٹھانے لگا، اور اس وقت اسے حفیظ زہر لگا۔ آخر یہ کیوں ہمارے پھٹے میں پاؤں اڑاتا ہے، ہوا خواہی اپنی دکان سنبھالے جا کر۔ انوری نے بگڑ کر سوچا۔ وہ حفیظ کے اور اپنے گھر والوں کے گہرے ہمدردانہ تعلقات کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔

مگر حفیظ نے جو کہا وہ سچ ہی تھا۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا اور کھانا تو بہر حال کھانا ہی ہے انسان، پھر جبکہ آم کا اچار ہو۔ بالآخر وہ نیند کے جھونکوں میں پلیٹ صاف کر کے چھپر تلے بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ پہلوان چولھے کے پاس اکڑوں بیٹھا کھچڑی کے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ انوری کو دیکھ کر اس نے بھالو کی جنسیت کے بارے میں کچھ گفتگو چھیڑی مگر انوری تو سو بھی چکی تھی۔ پہلوان سچ کہتا تھا انوری تو مٹی ہی مرا کی مٹی، پتہ نہیں ایسی مٹی پر کون اپنے دام پھینک جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب جب آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور فضا ابھی شبنم سے بھیگ رہی تھی تو چپ چاپ حفیظ اللہ رمی کے شوربے کے مسالے کھچڑی کی پلیٹ اور چراغ لے کر بھالو کی کوٹھڑی میں پہنچا۔

بھالو زمین پر پڑی مزے سے سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اب تک رسّی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ململ کی ساری گھٹنوں سے اوپر تھی اور سرخ جانگیہ رانوں پر بالکل فٹ تھا۔

حفیظ کو ہنسی آ گئی۔ کیسی جنگلی ہے یہ بھی۔ رنڈی کو مردوں کی کیا کمی، پھر بھی مردوں کے پیچھے بھاگتی ہے، کہ کہتا ہے پہلوان، اس کے لئے تو سچ مچ بھالو ہی ہو۔ مگر بے چاری اس کی خاطر کتنی بدنام ہے۔ کتنے جوتے کھاتی ہے، کئی بار تھانے میں بھی پٹی، ہزار بار توبہ کی۔ مگر کیا پھر وہی۔ اللہ یہ کیسی آگ کی بنی ہوئی ہے!

حفیظ کے دل میں ہمدردی اور حیرانگی کی ایک ملی جلی سی لہر اٹھی اور اس نے چراغ طاق پر رکھ کر بھالو کو جگایا۔

بھالو نے لال لال آنکھیں کھول دیں۔

"بھالو یہ کھا لے، خالہ سے چرا کر لایا ہوں۔"

بھالو مٹی کیچڑ میں سنے ہوئے ہاتھوں سے کھچڑی کھانے لگی۔

حفیظ اپنی سفید شلوار سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بیڑی پینے لگا اور گفتگو شروع کرنے کے لئے کوئی عمدہ فقرہ تلاش کرنے لگا۔

"بھالو تو جانتی ہے میرا تجھ سے کوئی مطلب لالچ نہیں۔ نہ خالہ مجھے کچھ دیتی ہے نہ تو ——— پر کہوں گا سچی بات۔ بھلا بتا سہی اس طرح روز روز بھاگنے سے کیا فائدہ۔ دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اب تو پوری دیکھ لے یہ تو چھٹی دفعہ بھاگی ہے۔ اب کی کس کے پاس رہی تھی؟ لا مجھے دکھا اس نے تجھے کیا دیا؟"

بھالو نے ایک لمحے کو کھچڑی پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اپنی موٹی سیاہ روغن سے ڈھکی ہوئی پنڈلی کھجا کر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سچ بتا قدیر بابو کے پاس رہی تھی نا؟ تو ملا کچھ نہیں، ارے یہ بابو لوگ تو مفت کا مال چاہتے ہیں۔ ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

بھالو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کھچڑی کھاتی رہی۔

"اری سر تو ڈھائی سیر کا لیے پھرتی ہے، جیسے تجھے پہلے ہی سب پتہ تھا۔ پھر تو گئی کیوں تھی؟ بس سمجھ لے تھانے دار دشمن ہو گیا کہ تو اس کے بھائی کو پھنساتی ہے ——— اب یوں بھی اس نے تیرے منہ میں کون سا سونے کا نوالہ دیا؟"

"روٹی کا نوالہ بھی پیٹ بھر نہ دیا۔ بولا کے گھر کوٹھڑی میں بند کر کے دن بھر کو چلا جاتا تھا اور شام کو ایک دو روٹی لے کر آتا تھا۔ رات بھر سونے نہ دیتا تھا۔ جی بھی بھر گیا۔" بھالو روہانسی ہو کر آنکھیں ملنے لگی۔

"اری دیوانی اس طرح بھلا رنڈیاں دھندا کرتی ہیں۔ صبر کرنے سے تیری جوتی۔ اس سے پہلے تو جن کے ساتھ بھاگی تھی انہوں نے بھی دو چار دن کے بعد گھر سے نکال باہر کیا۔ اچھا قدیر بابو کے پاس سے تو خود بھاگی یا ———؟" حفیظ کریدتا ہی گیا۔

"انہوں نے کہا اب جاؤ بھالو۔ بھابی ناگن کی طرح پھنکار رہی ہے ——— میں وہاں سے چل پڑی۔"

"اچھا یہ تو بتا تو اس کے ساتھ گئی کس لئے تھی؟" حفیظ اسے دلائل پر لا کر چاروں شانے چت قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"قدیر بابو کہتے تھے بھابی کے نخرے نہیں اٹھتے، سوکھی چھوہارا تو ہے پر نخرے گاڑی بھر دکھاتی ہے۔"

"یہ بات تھی بابو صاحب کو اپنے گھر بلاتی۔ ذرا بابو صاحب کی گرہ سے کچھ نکلتا۔ ارے بابا دو پیسے کمانے سے کم میں نہیں ملتا ہے۔ مجھے تو تیری عقل پر غصہ آتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اگر خالہ سے تیرا دل خوش نہیں تو الگ ہو جا۔ مکان دلانے کا میرا ذمہ۔ بس خالہ کا روزینہ باندھ دینا اب بے چاری خالہ

کا بھی تیرے سوا کون بیٹھا ہے؟" حفیظا نے دلبہ بکھی کی پوری پوری وکالت کی ——— بھالو خاموشی سے کھاتی رہی۔

حفیظا کو اپنا جادو اثر کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ قصبے بھر میں اس کا کوئی سنجیدگی سے نوٹس تک نہ لیتا تھا۔ اس گھر میں اس کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ اس کو گھر بنانے کی کوشش کرتا۔

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی سونے یا ہیرے کا بنا تھوڑی ہوتا ہے۔" حفیظا نے ہزار باتوں کو ایک بات میں سمو دیا۔

بھالو نے کچھڑی سے ہاتھ اٹھا کر اثبات میں سر ہلایا۔ دیر تک دیر تک ہلاتی رہی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو گھورتی رہی ——— حفیظا کو بجھا بجھا کا ہوا راہ پر لگ گیا۔

"چل اٹھ بھالو! خالہ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ اور وعدہ کر پھر کبھی کسی مرد کے پیچھے نہیں بھاگے گی۔" حفیظا نے بھالو کا مرتا سا بازو پکڑ کر کھینچا۔

بھالو چپ رہی مگر وہ اٹھی بھی نہیں۔ بس چپ چاپ چراغ کو گھورتی رہی۔

"اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

بھالو پھر بھی چپ رہی۔ حفیظا تنگ آ کر اپنے پٹے کھجانے لگا۔ یہ بھالو بھی بس سالی ——— !

"حفیظے!" (حفیظا) بھالو نے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں بھالو!" حفیظا نے بھالو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

بھالو کی آنکھوں میں جانے کہاں سے ایک دم آنسو اُبل پڑے۔ زمانے میں ایک بار چھ دنوں سے بد تر مار پڑی۔ جب تو ایک آنسو نہ گرا اور آج پتہ نہیں کیسی چوٹ لگی۔ حفیظا بولا کر رہ گیا۔

"تو جس کے ساتھ بھاگی، اچھا کیا یا برا۔ اس بات کو جانے دے۔" بھالو نے جلدی جلدی آنسو خشک کئے۔

"پھر تو چاہتی کیا ہے؟" حفیظا کھسیا گیا۔

"میں تو سوچتی تھی میرے بچے ہوں، میں بھی ٹاٹ کے پردے والے گھر میں رہوں، جیسے تیری ماں رہتی ہے۔" بھالو دھیرے سے بولی۔

"اچھا!" حفیظا کو کچھ غصہ آیا اور پھر وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔ وہ بھالو کے منہ سے اپنی بیوہ دکھیاری ماں کا ذکر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"حفیظے!"

"ہاں!"

"تو سچ مچ مرد نہیں؟" بھالو نے بھولے پن سے منہ اٹھا کر پوچھا۔

حفیظا اس اچانک حملے سے چونک گیا۔ ایک لمحے کو اس نے سر اٹھایا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ مرد نہیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔ بقول اس کی ماں کے، "اللہ دینے والا ہے، جو چاہے دے دے۔"

"میں تیری دوکان کے لئے چھالیہ کترا کروں گی۔ تیری ماں کی خدمت کروں گی حفیظے، میں بہن بن کر رہوں گی حفیظے! حفیظے!!"

اسی رات بھالو پھر بھاگ گئی۔

دوسرے دن حفیظا اکڑ اکڑ کر چلتا جو دوکان پر آیا تو لوگ وہ سارے گھسے پٹے فقرے بھول گئے جنہیں سن سن کر حفیظے کے کان پک گئے تھے۔

انور

خون

راجا ایک اکیلے مسافر کی مخصوص خاموشی کے ساتھ جہاز سے اُتر کر جیٹی پر کھڑا ہو گیا۔ چودہ سال کے لمبے عرصے نے اُدھم گھاٹ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہوں گی۔ وہ ان تبدیلیوں پر غور کرنے کی بجائے اپنے لٹھے کی نئی شلوار پہ جہاز کے گندے ڈیک سے لگے ہوئے تیل کے دھبوں کو دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے احساس کی چادر پہ ملال کے بڑے بڑے دھبے آ گئے۔ آہنگی کی ہلکی ہلکی لہروں نے جہاز کی سیاہ کھردری دیواروں سے ہولے ہولے ٹکرا کر اس کی شلوار کے سیاہ دھبوں کو مٹا دیا۔ اُس نے بغل سے اپنی ململ کی، کلف سے اکڑی ہوئی، نئی پگڑی کو نکال کر دیکھا۔ اُس کا دماغ اُس کو یہ نہ بتا سکا کہ کلف نے اس کی پگڑی میں بھی بنگلہ کی نہریں پیدا کر دی ہیں، لیکن جب اُس نے اس پگڑی کو جھجکی انداز میں اپنے سر پر باندھ لیا تو اُس کے دل نے محسوس کیا کہ وہ بنگلہ کی نہروں میں تیر رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر اُس کی طبیعت میں دبی دبی مسرت کا خاموش جیسا ساکن جیسا طوفان برپا ہو گیا۔ وہ اُس نے لانچوں پر اِدھر اُدھر حرکت کرنے والی زرد اونچی کرینوں کی طرف دیکھنے کی بجائے پاس سے گزرنے والے تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک کالے مریاڑ، مریل مُردار بنگالی قلی کو کہا:

"جوان تم کو معلوم ہے، پنجاب کو گاڑی کتنے بجے جاتی ہے؟"

قلی نے بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر دھوئیں میں سے جواب دیا۔

"ہم کو نہیں مالوم۔"

صاحب نے قلی کو جانے سے روکنے کے لئے کندھے کے پاس سے اُس کی قمیص کا کپڑا پکڑ لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ سٹیشن کو جانے والی سڑک کونسی ہے؟"

بوسیدہ کپڑا اتنے سے معمولی جھٹکے سے سرے تک پھٹ گیا۔ قلی کے کالے منہ پر زرد آنکھوں میں سُرخ خون اُتر آیا۔

"تمہارے کو ایک دیکھے بولا ہم نہیں جانتا۔ پھر کاہے کو پکڑتا؟"

صاحب کو غصہ آ گیا۔ اُس نے ہوا میں ایک مُکا بلند کر کے پنجابی اردو میں کہا:

"سؤر — کا — پُتّر!"

قلّی جلتی ہوئی بیڑی ساجے کے مُنہ پر مار کر رفوچکر ہو گیا۔

اگر ساجے کے پاؤں کے پاس اُس کا کالا ٹرنک نہ پڑا ہوتا تو وہ اُس قلی کے پیچھے بھاگ کر اُس کو دریا میں دھکا دے دیتا، یا پھر کم از کم کسٹم والوں میں سے تو ضرور وہ کسی ایک کو پیٹ ڈالتا اگر وہ جلدی سے اس کا چھٹکارا نہ کر دیتے، اچھا ہوًا، سٹرینڈ روڈ کے سرے تک اُس کو غصہ چڑھا رہا ورنہ سٹیشن تک جانے کے لئے کسی رکشا والے کو آواز دے دیتا —————— اور خواہ مخواہ روپے بارہ آنے کا نقصان ہو جاتا، وہ اپنی بغل میں ٹرنک دبائے جا رہا تھا۔

سٹرینڈ روڈ پر پہنچ کر اُس کو ایک بنگالی بابو نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں سفید کھدر کی دھوتی کا ایک کنارہ، جسم چاولوں کی بادی سے پھولا ہوًا، کندھوں پر سر کی بجائے فٹ بال، ساجا اُس کے پاس چلا گیا۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے بابو جی!"

"آپ کو کدھر جانے کو مانگتا مسٹر؟"

"سٹیشن؟"

"یہ سڑک تمہارے کو ہاوڑہ برج لے جائیگا برج کا دوسرا سائڈ ہاوڑا اسٹیشن ملے گا۔"

ساجے نے سوچا کہ اگر وہ پانچ جماعتیں نہ پڑھا ہوتا تو اس بنگالی بابو کی طرح اُردو بولتا، اور نمبر ۸۴۹ کس طرح اردو کی چکنا پوٹا کرتا تھا۔ "ہم نے تمہارے کو بولیا ہمارے تاں بہتر کٹ کٹ کے ہتھاں میں چھالے پڑ گئے تے۔ اللہ نے تیرے کو جمعداری دی ہے۔ گرائیں ہو کے بھی آپ ہمارے لوگاں دا کھیال نہ رکھوں گا تاں — ۔"

نمبر ۸۴۹ بھی جہلم کے ضلع کا رہنے والا تھا۔ بے چارہ اُن پڑھ، ساجا بھی اگر اَن پڑھ ہوتا تو وہ قیدیوں کا جمعدار نہ بن سکتا۔ اور گرفتار ہونے پر اپنے آپ کو سراج الدین ولد معراج الدین نہ لکھواتا۔ بلکہ ساجا ولد ماجا لکھواتا وہ زہریلی ہنسی ہنسا، لا تھانیدار۔ ساجے کو کئی دفعہ خیال آیا کہ تھانیدار کا بھی خاتمہ کر ڈالے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ انگریزی سے ڈر کر پانچویں جماعت سے نہ بھاگ اُٹھتا۔ جس طرح وہ قلی اس کے مُکّے سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بھاگ گیا نہیں تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتا۔ اور پھر وہی پولس۔ پھر وہی چودہ سال یا شاید پھانسی لیکن پھانسی کیوں ہوتی اگر وہ پانچویں جماعت سے نہ بھاگا ہوتا۔ شاید وہ تھانیدار ہو جاتا۔ یا کم از کم سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے انگریزی کے ان اشتہاروں کو تو پڑھ سکتا۔ چودہ سال پہلے جب وہ قیدیوں کی بند لاری میں اس سڑک سے گذرا تھا تو اُسے یہ خیال نہ تھا کہ یہ سڑک اتنی لمبی اور وسیع ہو گی۔ اور ٹرام گھاٹ پر وہ جہازوں اور کرینوں کو دیکھ کر یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لئے اپنے عزیز وطن کو چھوڑ رہا ہے۔ جہاز، کرینیں، سمندر، اور انڈمان۔

چاند پال گھاٹ کے سامنے پہنچ کر اُس نے دم لینے کے لئے اپنے ٹرنک کو فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اپنی نئی سفید پگڑی سے اپنے مُنہ اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سامنے کی دوکان سے دو آنے کے چنے مول لئے۔ میونسپلٹی کے ایک نلکے پر پانی پینے کے لئے چلا گیا۔

جب وہ ہاتھ دھو کر پانی پینے کے لئے جھکا تو یکایک اُس کو کچھ فاصلے پر ایک رکشا جاتی دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رکشا والے کا پیچھے کی طرف سے تین چوتھائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ ساجا پانی کو بھول کر رکشا والے کو غور سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن رکشا بیڈن روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو کہا نہیں — نہیں۔

پانی پینے کے بعد اُس کو معلوم ہوًا کہ اسٹیشن ابھی دور ہے۔ اس کی دبی دبی مسرت پر بوجھ کا ایک ہلکا سا چھلکا آ گیا۔ اُس نے

محسوس کیا کہ اب وہ ٹرنک کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکے گا۔ اُس نے ایک رکشا والے کو بلایا۔ اپنا ٹرنک اُس میں رکھ دیا اور خود اُس میں بیٹھ کر بولا۔ "ہوڑا اسٹیشن۔"

تمام رستے اُس کو اپنے دل پر ایک غیر معلوم وزن کا احساس رہا۔

ہاوڑا برج پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ پنجاب میل روانہ ہو چکی ہے۔ ساجے نے ہگلی کی لہروں کی طرف دیکھا۔ ہگلی ساجے کی زندگی کے گھنے جنگل میں سے خاموشی کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔

اُس نے رکشا والے کو کہا۔ "مجھے یہیں اتار دے۔"

رکشا والے نے ٹرنک پل کے ایک کنارے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "رات کو کدھر سوئے گا، دادا؟" ساجے نے اُس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ رکشا والے نے رکشا کا کرایہ لیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پھر کہا "ہم بتائیں گا؟"

ساجے نے لنڈن میں کلکتے کے رکشا والوں کی بابت بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ حقارت سے رکشا والے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک پر جا کر بیٹھ گیا۔ رکشا والا چلا گیا۔

سامنے ہگلی پر نیا پل بن رہا تھا۔ کتنا مشکل کام ہے پل بنانا۔ خصوصاً جب دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو۔ اُس پانی میں ستونوں کی بنیادیں کھوکھلی کرتا رہے گا۔ پل پرانے ہو جایا کریں گے۔ اُن کی جگہ نئے پل بنا کریں گے۔ وہ سامنے ہگلی پر نیا پل بھی پرانا ہو جائیگا ۔۔۔ پھر اس کی جگہ ایک اور نیا پل بنانا پڑے گا۔ کیا اس نئے پل پر بھی ساجا بیٹھے گا؟ لیکن ساجا اپنے لئے خود ایک نیا پل کیوں نہیں بناتا۔ اُس کی زندگی کی بنجر زمین میں سے بھی تو ہگلی گذرتی ہے۔ اس ہگلی نے اس کی زندگی کی بنجر زمین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ان دور افتادہ حصّوں کو ملانے کے لئے ایک نئے پل کی ضرورت ہے اور ساجا ہگلی پر بننے والے نئے پل کی طرف دیکھتا رہا۔

آسمان پر شام کی شفق پھیل گئی۔ بادلوں کی سرخی نے ہگلی کے پانی پر سرخی چھڑک دی۔ ساجے نے دیکھا کہ ہگلی میں خون بہا جا رہا ہے خالص انسانی خون۔ وہی خون جس نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کے کنوئیں کی منڈیر کو رنگ دیا تھا۔ اور جس نے کنوئیں کی منڈیر سے بہہ کر کھیتوں کی طرف جانے والے پانی کو ہگلی کے پانی کی طرح سرخ کر دیا تھا۔ گودو کا خون اور گودو کے باپ کا خون۔ گودو جو کلکتہ سے کبھی کبھی گاؤں میں آ کر، سوٹ بوٹ پہن کر لوگوں کو کہا کرتا تھا کہ وہ اس کو گودو کی بجائے گوبند رام ورما کہا کریں۔ گودو جو گاؤں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو کلکتہ کے خواب دکھا کر ان کو اکثر اپنے ساتھ بنگالے جاتا تھا جو ساجے کے کنوئیں پر ہر روز اُس وقت نہانے کے لئے آیا کرتا تھا جب ساجے کی نوجوان خوبصورت بیوی، دارو ساجے کے لئے کھانا لے کر آتی تھی۔ ساجا اُس کی حرکت کو خوب سمجھتا تھا۔ لیکن گاؤں میں کوئی کسی کو اپنے کنوئیں پر نہانے سے منع نہیں کر سکتا۔ پھر جب ایک دن دارو کپاس کے کھیت کے پاس غصّے اور گھبراہٹ سے ہانپتی ہوئی دوڑی دوڑی آئی اور ساجے کو کہنے لگی۔ "گودو مجھے کہتا ہے میرے ساتھ کلکتہ چلو۔" تو ساجے کے آتش فشاں پہاڑ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ اس وقت ایک کلہاڑی سے اپنے کھیت کی باڑ کے چھدرے حصّوں میں کیکر کی جھنگیں لگا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کنوئیں کی طرف بھاگا۔ پہلا وار گودو کے سر کے پاس سے ہو کر اُس کے کندھے میں اتر گیا۔ دوسرے وار کے وقت گودو ڈر کر پیچھے کی طرف گر رہا تھا۔ اس لئے کلہاڑی اُس کے کولہے میں گڑ گئی۔ تیسرے وار کے وقت گودو کا باپ درمیان میں آ گیا۔ پہلی ہی ضرب اس پر اتنی کاری پڑی کہ اس کی گردن ایک طرف کو لٹک گئی اور وہ سیدھے گرتے ہوئے گودو پر اوندھا گر پڑا۔ اس کے بعد کی دو ضربیں بھی گودو کے بجائے گودو کے باپ پر ہی پڑیں۔ اس کے بعد گاؤں کے لوگ، وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار، مقدمہ ۔۔۔ پھر چودہ سال کی قید۔ کالے پانی کو جاتے وقت جب اس نے اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس نے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں کے آنسوؤں کا افسوس نہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ جس کو میں مارنا چاہتا تھا وہ بچ گیا اور جس کو میں مارنا نہیں چاہتا تھا، وہ مر گیا۔ گودو بچ گیا۔ گودو کا باپ مر گیا" جب اُس نے دادو کی سسکیاں سنیں تو اُس نے کہا:

"دادو! چودہ سال کوئی بڑی بات نہیں۔ میرا انتظار کرنا" اور پھر جب اپنی دو تین سال کی بہن نوری کی طرف دیکھا جو سب کو روتا دیکھ کر چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ میں بھی ساتھ جاؤں گی" تو اُس کے دل کے کسی کونے میں پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اُس نے غلطی کی ہے۔ اُس نے نوری کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا "نوری — نوری — نوری" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بجلی کی لہریں شاید اُن آنسوؤں کو نہ دیکھ سکی ہوں۔ کیونکہ شفق کی سُرخی سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گئی گودو اور گودو کے باپ کا خون بھی دیر تک کنوئیں کی منڈیر پر جمع رہنے کی وجہ سے شام کے وقت سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور جب اس نے شملے کے اُس حصہ کو دیکھا، جہاں اُس نے آنسو پونچھے تھے تو اس نے دیکھا کہ اُس کا دل سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا ہے اور یہ سیاہی شام کی سیاہی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں رات نہ آ جائے۔ اُس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سایوں کو اپنی پوری قوت سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور ایک دفعہ تو وہ ان بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکیوں کو چیر کر اپنے گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پر دادو کو اپنی چودہ سال کے انتظار سے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُس کو چومنے کے لئے بڑھا لیکن یک بیک پُل پر بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو گئی۔ اُس نے ایک ہارے ہوئے سپاہی کی دلدوز مایوسی کے ساتھ اوپر کو دیکھا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ رات آ گئی۔

رکشا والے نے اُسی رازدارانہ لہجے میں کہیں سے آ کر کہا "دادا!"

ساجا چونک گیا اور اس سے پہلے کہ اُس کا دماغ اُس کے معاملے میں دخل دے سکتا اُٹھ کے کھڑا ہو گیا "کہاں لے جاؤ گے؟"

"فسٹ کلاس پنجابن ہے — مِس نیلم — کیا پیارا نام ہے —"

کرائے کی کچھ باتیں ہوئیں اور رکشا چل پڑی۔

ہرسین روڈ

گرے سٹریٹ

سوناگچی

تھوڑی دیر کے بعد رکشا والے نے آ کر کہا "ہم تمہارے کو کیا بولینگے دادا، تم بڑا لکی ہے، وہ سالا سنیما جانے کو دیکھتا تھا۔ آؤ — آؤ —" اور ٹرنک اٹھا کر آگے آگے چل پڑا۔

چودہ سال کے بعد ساجا پہلی دفعہ ایک ایسی رات کے دروازے پہ آیا جس کے قفل کی چابیاں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ رات اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُس کے پیروں پر پڑی تھی۔ وہ اس کو ٹھکرا سکتا تھا۔ اچھال سکتا تھا۔ جھنجوڑ سکتا تھا۔ چاہتا تو قمقموں کی زرد روشنی میں رنگ دیتا۔ چاہتا تو اُس کو اندھیرے کے اتھاہ غار میں دھکیل دیتا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔

گندمی رنگ کی ایک پنجابی عورت جس کا سب سے بڑا حُسن اُس کی گدرائی ہوئی جوانی تھا۔ اپنے ہوش رُبا سینہ کے ساتھ، اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کے ساتھ گہرے سبز دوپٹے میں آسمانی رنگ کی ریشمی قمیص میں اور ساٹن کی سفید شلوار میں، اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اندر آ جاؤ — کیا سوچتے ہو؟ — اداس ہو؟" —

"نہیں تو!"

وہ اُس کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اُس کی پگڑی کے شملے سے کھیلنے لگی اور پھر ہنس کر اُس کی رانوں پر بیٹھ گئی۔ ساجے میں اختیار کا احساس جاگ اُٹھا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔ اور جذبات کی اس آگ نے اس کو بے اختیار کر دیا۔ اُس نے نیلم کو اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا اور اپنے ہونٹوں کے انگاروں کو اُس کے گالوں پر رکھ دیا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ۔ وہ گھبرا گئی۔ اُس نے ایک دو دفعہ سی سی کی اور پھر یکایک اُوئی اُوئی کر کے اُس کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ وہ اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔ ایک ہاتھ نیلم کی کمر میں چلا گیا، دوسرے ہاتھ نے بجلی کا قمقمہ بجھا دیا۔

کپڑوں کی سرسراہٹ — اور — اور —

پھر روشنی ہو گئی۔ ساجا اپنی گبرون کی قمیص کے بٹن لگا رہا تھا۔ نیلم آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور پریشان بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ دوبارہ میک اَپ کرتے ہوئے اُس نے کہا:

"سنو — ہم سینما جا رہے ہیں — سیکنڈ شو!"

"نہیں نیلم! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا!"

"میری سہیلی آیا ہی چاہتی ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے!"

وہ اُس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس کی بنگالی فیشن میں گُندھی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کچھ عرصے آئینے کے سامنے وہ اُس کے جسم کے مختلف حصّوں کو سہلاتا رہا۔ پھر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔ اور امریکہ کے ایک رسالہ میں سے ننگی تصویریں دیکھنے لگے۔ ساجے نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ اُس کا بازو ویسے خود ہی نیم عُریاں سینہ پر چلا گیا۔ رسالہ پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ بجلی کا قمقمہ بجھ گیا اور پھر —

ایک عرصہ تک پُر اسرار خاموشی کے بعد دونوں بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگے۔

"مجھے اپنا نام بتا دو!"

"نام پوچھ کر کیا لو گی کل شام کو جا رہا ہوں!"

"کلکتہ میں کیا کرتے ہو؟"

"یہاں تو میں آج ہی آیا ہوں!"

"کہاں سے؟"

"کالے پانی سے!"

"تم کالے پانی سے آئے ہو؟" —

"ہاں"

"پھر تو تم ساجے کو جانتے ہو گے!"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سوال ساجے کے دماغ پر پتھر کی طرح گرا، وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ارادے پر زور دے کر اپنی حیرت کو تجسّس میں تبدیل کر لیا اور کمرے کا بلب روشن کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں میں ساجے کو جانتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے!"

روشنی میں بھی وہ بالوں اور کپڑوں کی پریشان حالت میں اُسی طرح بے حجابانہ بستر پر لیٹی رہی۔ اُس نے اپنے جسم کے اُن حصّوں کو بھی جنہیں آدمیوں سے چھپایا جاتا ہے، چھپانے کی پروا نہیں کی اور کروٹ لے کر اپنی ہتھیلی میں اپنا سر رکھے ہوئے بے پروائی سے باتیں کرتی رہی۔

"پچھلے سال میں اپنے گاؤں میں گئی تھی۔ ساجے کی بہن نزدیک کے گاؤں سے میرے پاس آئی اور مجھے کہنے لگی۔ تم کلکتہ میں رہتی ہو۔ کلکتہ کالے پانی کے پاس ہے۔ کالے پانی میں میرا بھائی رہتا ہے۔ اُس نے پچھلے پانچ سال سے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر تم کو وہ کہیں ملے تو اُس کو میرا پیغام دے دینا۔

ساجا بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں، وہ بڑا لاپروا ہے۔ اُس نے ضرور ایسا کیا ہوگا اُس نے ضرور کوئی خط نہیں لکھا ہوگا۔"

"اُس نے مجھے کہا کہ اگر تم کو ساجا ملے تو اُس کو بتانا کہ ہمارے ماں باپ غم سے نڈھال ہو کر مر گئے ہیں۔ ہماری ساری زمین بک گئی ہے اُس کی بیوی دارو اُسی گودو کے ساتھ جس کو ساجے نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، بھاگ گئی ہے ـــ گودو کی بابت معلوم ہوا۔ کہ وہ کلکتہ میں کوئی اچھا کاروبار نہیں کرتا۔ وہ وہاں رکشا چلاتا ہے اور بازاری عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔ اُس نے دارو کو بھی بازار میں بٹھا دیا ہے ـــ"

ساجے پر غشی کی سی حالت طاری ہو گئی لیکن زہر کے ان گھونٹوں کو جو ساجے نے پیئے تھے اُس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہونا چاہئے اس بازاری عورت کے سامنے اس کو یہ راز فاش نہیں کر دینا چاہئے کہ وہ بدکار عورت اُسی کی بیوی ہے۔ وہ دیوار پر ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ لیکن اس کو اُس میں اصلی نقوش کی بجائے ریڈ روڈ کی طرف مُڑنے والی رکشا دکھائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے "ہاں۔ ہاں ـــ"

نیلم کی آواز مدھم ہو گئی۔ اُس کے الفاظ بھیگ گئے۔

"ـــ اُس نے کہا ساجے کو بتانا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ نمبردار کے بچے کھلاتی ہوں۔ گوبر کوڑا اٹھاتی ہوں۔ گالیاں سہتی ہوں مار کھاتی ہوں ـــ"

ساجا بڑبڑا اُٹھا۔

"نیلم میں جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"میں ابھی ساجے کو یہ سب باتیں بتا دوں گا۔ میں اُس کو مجبور کر دوں گا کہ وہ ابھی اپنے گاؤں کو چلا جائے۔ اُسے رات ہونے سے پہلے چلا جانا چاہئے تھا وہ مورکھ ہے۔ وہ نہیں جائے گا۔ وہ نہیں جائے گا۔"

نیلم حیران ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے کپڑے سنبھالتے ہوئے بولی:

"تو کیا ساجا کلکتہ میں ہے؟"

"ہاں۔"

"تو اُس کو فوراً جا کر کہہ دو کہ وہ اپنے گاؤں کو نہ جائے۔"

ساجے نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر اُسی تیقن کے انداز میں کہا۔

ساجا ضرور اپنے گاؤں کو جائے گا۔ کیا وہ اپنی بہن کی یہ حالت ـــ

"بلکہ اس کو اِن باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ بتانا اور اُس کو گاؤں تو ہرگز نہ جانے دینا۔"

"کیوں نہ جانے دوں آخر؟"

"اُس کا گاؤں کو جانا بے سُود ہو گا۔ اُس کی بہن اُس کو وہاں نہیں ملے گی!"

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"میں اس کی بہن ہوں۔"

ساجے کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اُس کا دماغ دُھواں بن کر کمرے میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ بجلی کی روشنی چھوٹے چھوٹے دھبّے بن کر اُڑنے لگی۔ اس رنگ برنگ دُھندلکے میں اس کو اپنے کالے ٹرنک کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کالے ٹرنک پر اپنے ہاتھوں میں اپنی کنپٹیاں لے کر بیٹھ گیا۔

نیلم پلنگ کے پاس کھڑی ساجے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سیڑھیوں میں سے پیروں کی آہٹ نے ساجے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جذبات کے غاروں میں سے نکلنے کی کوشش میں اُس کو کچھ راحت محسوس ہوئی۔

"نیلم ـــ جلدی ـــ جلدی ـــ نی ـــ لم"

اور دوسرے لمحے نیلم کی سہیلی دروازے پر آ گئی۔ ساجے کے زخمی دماغ نے ایک اور تازہ زخم کھایا۔ درد کے رُکے ہوئے سیلاب میں بھیگی ہوئی آواز پھڑپھڑائی۔

"دارو ـــ"

اور دارو نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر گرنے سے بچتے ہوئے حیرت آمیز مُردہ لہجے میں کہا۔

"ساجا!"

نیلم نوری بن کر تھرّا گئی۔ اُس کے رونگٹے اُس کے جسم پر دوڑنے لگے۔ اُس کے جسم سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گہرائیوں کی طرف بھاگنے لگے اور جب نوری کو یقین ہو گیا کہ وہ عنقریب کسی بھیانک چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جائے گی تو اس کے خشک گلے اور خشک ہونٹوں سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی۔ اور پلنگ کے بیک سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔

"بھیا ـــ بھیا ـــ یہ کیا ـــ میرے اللہ ـــ میرے اللہ"

ساجا کالے ٹرنک پر پتھر بن گیا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے انڈمان کے قیدی انسانی دماغوں کے پتھروں کو ہتھوڑوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ رنگ برنگے دُھندلکوں اور روشنی کے چھوٹے دھبوں کے درمیان ہگلی بہہ رہی تھی۔ ہگلی کی طوفانی لہروں پر ایک رکشا والا اپنی رکشا دوڑائے جا رہا تھا۔ نئے ہاوڑا برج کے پاس ایک سمندری جہاز اُس رکشا سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ خزاں دیدہ جنگل کے تمام پتّے جھڑ کر ہگلی میں بہہ گئے۔

قرۃ العین حیدر

جلاوطن

سُندر لالہ۔ بیجے دُلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔

ناچے سری ہری کیرتن میں۔

ناچے

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے گتو والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

"بندگی —— بندگی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راجی کھُسی ہو بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا —— مجھے کیا ہوا ہے جو دائمی خوشی نہ ہوگی۔ یہ سُوپ ہٹا بیچ میں سے" انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھیّن صاحب ناج پھٹک رہی تھی۔"

"تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہیئے۔ چل ہٹا سب چیز ——"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر پیر ٹکا کر انھوں نے اپنی بہن کو آواز دی —— بیبی —— جی ای ای —— جی ای ی ی —— (چھوٹا ہے اب تک مورا بھیّن —— بیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پڑی ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اُداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوا کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ اور ہر چیز پر غنودگی سی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے۔ "ٹھکرائن کی گیا" "بیبی صبح سے لے رات گئے تک روں

رُدن کرتا، ہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہیں بھیّن صاحب ——" ہیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلّے کے گودام میں سے باہر آکر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا [illegible]ی کے پلّو میں باندھ کر جس سے پشت پر جھنکتی ہوئی پہنچی ہیں آگئیں۔

"سب ہے رادھے جی کی بھیّن صاحب ——" رسوتی نے چوکے میں سے آواز لگائی —— "کٹھل کی ترکاری کیسی بھیّن صاحب ——؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور کیجیو بھابی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ پیتل میں رنگ برنگی مورتیاں الگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سپید ورسے لپی پُتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن نہیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے۔ ابھی سری رماکانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کیسا کھٹک سے تو ٹیوشن سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا، پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام کمی کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا۔ اور سکون۔

اب کسم نیچے کچے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اُس نے گدرے امرود اور کمرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکر دا دھی ناکت تا —— دھاکر دا —— ارے باپ رے۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر دمینتی سے کہا —— ماما آئے ہیں۔ بھاگ جا ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے —— دمینتی بھاگ گئی)

کسم چھت پر آئی لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے، خوب کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کسم دتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما —— ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں ——"

"چل چڑیل —— بہانے باز —— سبق سنا پہلے ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا ——" (انھوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)

"ارے باپ رے —— !!" کسم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں ری ——"

"ہی ہی ہی —— ماما ——" کسم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساری بھی تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی —— باؤلی سی ——" (انھوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے تو پر طاری کرنا چاہا)

جی ماما —— کسم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں، جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی پہنتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس ٹھیٹھ دقیانوسی سری واستو گھرانے کی بیٹیا —— پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے۔ اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چاء پانی پیتے تھے۔ اور گرو دھوا ہوئے: ان کو اب سات

برس ہوئے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پہ اُن کا رعب تھا۔ کیونکہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں —— دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے۔ اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلّا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے اُن کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ اُفوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی خصوصاً موندیرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کیم اور موندیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے —— "نل دمینتی" —— اور "شکنتلا" "ہریش چندر" اور "راج رانی میرا" —— اور اوپر سے ڈانس الگ —— گربا بھی ہو رہا ہے کہ آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نند لال —— اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی —— جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلیے پنگھٹ بھروا پانی —— اور ساتھ ساتھ موندیرا سین گپتا ہے کہ زنّاٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول —— وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کو بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سُری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخرِ انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا —— چلئے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی۔ "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی —— اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا:۔

ملتِ اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ ——

گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا —— بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ——۔ اسکول کو بند کرو ——۔۔

یہ سب قصے کیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔ صدرِ اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، امرتین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ امرتین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں ری —— ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لئے کیم دتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے۔ اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود دھیلا دوپایہ تھا۔ جہاں اُسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پردہ غالباً اسے بہرصورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں۔ اور راما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پر موجود تھے۔

یہ ماما اس کے بیچ تک پہنچے نہ پڑتے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کا مربہ تھے کیم کے ماما۔

رہے رماکانت اور بہرین۔ تو رماکانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جاکر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ بہرین اس کے برعکس بالکل انجینیر تھا اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینیرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یونہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گڑیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بے شمار رشتے کے بھائی تھے۔ اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا لادیں —— نوٹنکی کے دنوں میں رسوتیا تک لہک لہک کر گاتا —— اب ہی آئے ہیں تے بھائی —— لاؤں گا نوٹن کی رانی —— کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے چھپا چھپ ٹل اور دُہن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو میٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور ٹل اور دہ۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھتیجے صاحب جونپوری کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی یہ ضلع کے رؤسا اور مقامی عمائدین شہر میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں حکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ انٹلکچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کیم کے ماما نے اُسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا۔ اور ہر مسلمان کے اپنے وسیوں مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھئے تو کچھ بھی نہ تھے یا تو شاعری کرتے تھے۔ یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ایسے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ تریپورہ کانگریس کے موقع پر انھوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انھوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انھیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کراتے۔ جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار۔ میلے ٹھیلے۔ محرم بالے میاں کی برات۔ پھر اُس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیشکار سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اُداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں آؤٹ ڈور مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود دیکوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دوا دارو نیں گھنٹہ گھر کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال دفتری، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے

گوتن کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے ——— حکیم مارکہ دھاگہ خریدیے۔ پری برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو ——— چار جاکر ماں کو دو ——— آگیا۔ آگیا۔ آگیا ——— سالِ رواں کا سنسنی خیز فلم "لری راجہ" آگیا جس میں مس مادھوری کام کرتی ہے ———

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکامِ ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لاکر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اور سول لائنز کی اس دنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہوگئی ——— گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس میک کنزی دو۔ ڈبلیو پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو جن جتیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اوفیلیا میک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی۔ اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وہ مسز سکینہ اور وہ مسٹر فرحت علی۔ اور وہ مسٹر پانڈے۔ سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک رسیا نے بھائی لوگوں کو نگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقیماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جونپور ایسی ڈل جگہ پر مس میک کنزی کا دم ہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بیچاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جاکر ایک ڈپلومہ مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گلے سمجھئے گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی۔ کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو ان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی۔ اور تھر تھر کانپا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہوگی ———

آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتونِ محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے اکیٹوٹی ہوگئی۔

تو غرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا اور انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے

کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکمِ ضلع کے اعزاز میں کنور رنجن داس رئیسِ اعظم جونپور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرنگار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا۔ جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے۔ "اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اتروا لو" مہریوں سے کہا جاتا "ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دیتی آنا ری رام رکھی جھاڑو پیٹی")

بیگم کرنل ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی رنجن داس کی زبردستی پہ وہ بھی دعوت میں آگئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی سے ملنے کیلئے، علاوہ شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تو گئی چولہے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساری سی پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"ائے لو بٹیا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا!" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پہ انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"ائے ہاں سچ تو ہے۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار چڑیلیں بھتنیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے!" بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کیمی کی تو بہر حال آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے بالتے علیحدہ۔ کندن کا چمپاکلی اور بحرہ کشوری بھی پہن آئی تھی۔ لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیرِ اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کیمی دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہیں۔ کتنی سندر ہے۔ اور پھر ایم اے پاس۔ ایم اے پاس لڑکی کیمی اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری جین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضراتِ محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگو سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کیمی اور کشوری بیٹھی تھیں۔ اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور اوپر سے کنور رنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے مینیجر صاحب لالہ گنیش سہائے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے تھے —— "اجی پردہ کر لو کہار اندر آرہے ہیں" تو ان کے حلق میں ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما کمفو سے گھر آئے تو کیمی نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی کنول کماری ایسی۔ اور کنول کماری ویسی ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

(۳)

کیمی جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی۔ اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پہ آ کر کھڑے ہو گئے باغ سب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے

ٹھٹھرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سائے میں بھٹکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی۔ اور اداسی۔ اور نفرت تھی۔ اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کر یں گے۔ لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آکر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی لڑھکتی کر چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے او سری کے جھنڈے کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں بڑھ رہی تھی۔ بہت سے رنگ میں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک شب اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری ــــــ ؟ لاحول ولاقوۃ۔

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔"

"تم کہاں چلی جاؤ گی۔؟"

"توبہ ــــــ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ــــــ؟!"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کرو گی۔؟"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ اے عقلمند داس میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ــــــ" آفتاب رائے خوب ہنسے تھے ــــــ" میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند میں کیا شے ہے۔ تم جیسی ماڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے ــــــ"

"ہاں ــــــ بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر ــــــ" وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ نے پی سیلن روڈ پہ رہتی تھی۔ اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گلنے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے۔ اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھچھوڑ کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری جنگامی سے کہا آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی؛ تنا عرصہ ہو گیا تھا، منڈیر پہ کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا عزت نے عسکری سے کہا۔ اس دیہ ابا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالٰے ہی اس پر رحم کرے ــــــ

"بی اے کے بعد تم کیا کرو گی ــــــ؟" یک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ——" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل لئے۔ کیونکہ غالباً اُن کی زندگی ان کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر اُن کی آئیڈیالوجی تھی۔ "یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پھر ایک روز، لندن میں، جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انھیں چمپک نظر آیا جس نے دور سے آواز لگائی —— "جام پینے چلو تو ایک واقعۂ فاجعہ گوش گزار کر دوں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن پچیس کے بیچ کا ہے ——"

لڑکیوں کی عجب بیہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے "ان کو سمجھنا ہمارے تمھارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی اینگلو سیل کی ساس بنی پھرتی تھی۔ ہو گئی ہو گی۔ اب گلیڈ —— جگن ناتھ جین مائی فٹ —— کون تھا یہ اُلّو —— میں نے کبھی دیکھا ہے اسے۔؟" چمپک کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انھوں نے سوال کیا۔

چمپک رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوکنی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سامنے میں بکھر گیا تھا زندگی بڑی اداس ہے اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بیوقوف بھی ہے ——؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بیوقوف ہے —— چمپک رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"—— پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟" آفتاب رائے نے چمپک سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر ——" چمپک نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا —— "یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا —— جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمھاری ——؟"

"کیا بکواس ہے ——" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب چمپک رائے زادہ کو صحیح معنوں میں غصہ آ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا —— "تو میاں، تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جو اب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں —— ؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آ جاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مارتی وہ تم کو پھاڑ دیتی کہ —— کیا کرتی —— ؟ تم نے دیکھا کہ کم ہی نہیں دیکھا خیر چلو —— خیریت گذر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بیکار میں۔ کیونکہ میرا مقولہ ہے" اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا، کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں —— تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمھارے حق میں بالکل دافع بلیات ثابت ہوا ——"

"بیہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ——" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً لے پی سین روڈ پر سے گذرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔

جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا۔ کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندر اب لوں نہیں آئے ——— کیسی چوک مجھ سے آئی ——— پھر اد ھنا بیرجی آجاتی۔ وہ کوئل ایسی آواز میں گاتی ——— آمی پوہوڑی جھنوا ناگنگر بو جئے ——— بو جئے ہو ——— اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہر سے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین: بساررشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انھوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اندر جا رہی تھی اور سرخ ساری میں ملبوس تھی۔ اور لگتا اس کے پیروں میں تھا (آلی ری سایئں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ شرنگار ——— وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی۔ اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا)۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے نئے ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ اور صوفی ازم کی تاریخ پہ ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ——— او پرنس ایجنا ——— ڈارے جا ——— "عسکری ڈانٹ بتاتا" اگر تم اس جگہ بیٹھ ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمھارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے ———" مینپل اضافہ کرتا)

جونپور جا کر وہ کیمپ کر دیکھتے کہ تندی سے کچا لوکما رہی ہے۔ کھنک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی ری گوئیاں آں آں گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"اری او باؤلی ——— بتا تو کیا کرنے والی ہے ———" وہ سوال کرتے۔

"پتہ نہیں ماما ———" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

پتہ نہیں کی بچی ——— وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاندرات تھی۔ اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے نعروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آگیا ——— آفتاب رائے کو خیال آیا۔ شاید کبھی سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا۔ ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا۔ اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۴ فی صدی حصہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور، لکھنؤ، آگرہ، علیگڑھ، بریلی، مراد آباد، شاہجہان پور، وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے خطوں میں بھی

ن کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب اسے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی محلّے محلّے گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں۔ چپّے چپّے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔ لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پائجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولیس کا محکمہ اسّی فی صدی مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بیٹیا کا جہیز بنانا تھا۔ اور ہزاروں قصّے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلّاتے ـــ برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ـــ ہاتھی گھوڑا پالکی ـــ جے کنہیا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا۔ لہٰذا غیر شعوری طور پر ـــ IMAGERY بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ـــ بھری گگری موری ڈھرکائی شیام ـــ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں۔ جنہیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچے بسے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلّی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک پروگریسو ردِّ عمل ثابت ہو سکتا تھا۔ کس طرح انیسویں صدی کی وہابی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ بننے کے بجائے اس کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے ذہن میں آتیں۔ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا بیٹھے یہ کنٹرول کمری کود پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں۔ اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچرر شپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی، ہندو، ہندوستانی کے گن گائے جاتے اور مالویہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اتاری جاتی ـــ یہ میں تم سے کہتا ہوں ـــ کہ شدھ ہندی اور گئو رکشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انھوں نے ایک دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا ـــ بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے ـــ ان سے کہا گیا ـــ ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مریں گے۔ تمھاری طرح سے تھوڑا ہی ہیں۔ ڈھلمل یقین ـــ

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انھیں جونپور کا قاضی کہا کرتے تھے۔ یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ـــ "جونپور کا قاضی" ـــ

حرف "میں شہر کے اندیشے میں دبلا کیوں ہوا ——!"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پُر اسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈا نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے اس ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مُردے کے جنگل میں گیا بقال اور مسان چپکے چپکے رو رہے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنوز بخش حلوائی کے ہاں کی محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

"عاشور کی شب لیلیٰ ارے سرہانے شمع رکھ کر ——" بی مدّن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا ——

"—— اے تکتی رہیں چہرۂ علی اکبر کا ——" بگّن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں —— اے بیوی چاند رات کو نیں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں ——!" بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ۔ کمبخت ایسی سٹر ستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا —— اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا —— میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا —— اے بہن —— اے نیازی بیگم —— ذرا اپنی عینک تو دینا ——" بوا مدّن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کے دی جو بوا مدّن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بوا مدّن نجم الملت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں —— ؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھئے —— بڑی بھاوج —— نجم الملت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتی ہیں ——" بگّن نے جواب دیا۔

"ہاں بھیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں ——" بوا مدّن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بوا مدّن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظرِ استحسان نہ دیکھا تھا۔

کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوا مدّن کے اس طعنے کا انھوں نے ہرگز نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اتروا لو ——" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کر لو لوگو —— کہار اندر آتے ہیں ——"

فیرنی کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر ممولہ تیز آواز میں چلائی ——— "چھمّو بیگم آگئیں"۔

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں۔ اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو لانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے" انھوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں ممولہ نے یہ سن لیا "ہائے چھمّو بیگم ——— ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیا آوے شیطان کے کان بہرے ——— ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ سڑی گلی کی نیکے نوبت رائے کا تالاؤ بنا رکھا ہے۔ اتنا اتنا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں" اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

"اے بی ممولہ ——— ذری اپنے میں رہنا ——— میں خود سے نہیں آگئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ ——— مجلس پڑھ جاؤ ——— میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں۔ اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو" ——— "چھمّو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر نکلیں ——— "لے ہے ——— یہ کیا کوا تو چن مچی ہے ——— اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو ——— چل نکل ممولہ یہاں سے ——— ڈومنی ہے دیکھو تب ہی فضیحتا شروع کرتی ہے ——— آؤ چھمّو بیگم جم جم آؤ ———"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ "جی پیسے تو بھجوائیے بیگم صاحب ———"

"ارے ویا لیے ——— ساری دیہہ دکھن لاگت ہے ———" رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی۔ اور ریڑوے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ریڑوہ ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما کھٹولہ ہوتا تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا۔ اور چرخ چوں کرتا ریڑوہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی جو پہلے صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمّو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں۔ اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بُوا مدّن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں۔ انھوں نے کبھی چھمّو بیگم کی پروا نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے جھمکے لگاتی بُوا مدّن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا زرد پائجامہ اور طوطے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ ہاں یہ رام پور کی میراسن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمّو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ گن تلہا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بُوا مدّن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بُوا مدّن کو اگر یہ زعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی بھاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمّو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے پناہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمّو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کے دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمّو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر

کسی کسی جبیں پہ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ اور چھمو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمو بیگم کے وعظ بہت موثر ہوتے تھے۔ کیا جناب کبن صاحب بلکہ خود قبلہ جارچوی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات۔ انگریزی فلسفے کے واقعۂ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھمو بیگم پل کی پل دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

اے صاحبانِ مجلس ——— جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کئے ——— والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ——— جناب عباسؑ نے رو کر کہا بی بی سکینہ اٹھو ———" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاء اللہ سے چھمو بیگم نے سماں باندھ دیا۔ ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آگیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ سائنس کا موازنہ جرمن اور انگریزوں کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالتمآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں ——— بیبیو ——— میں کوئی مورخ کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفر نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اول پر اتر آئے تھے۔ اور نور کی جھاڑو سے رسالتمآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرمائیں ——— اے بیبیو ——— جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو۔ اور کان کھول کے سنو ——— کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔ جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنو بیبیو ——— کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال کہ قل ہو اللہ احد۔ اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد ——— یہ ون کیا ہے ——— ؟ ون، انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ——— مسئلۂ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادت علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھمو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھمو بیگم خاصی فراڈ ہیں۔ لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا جس میں شادی بیاہ، تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، گونڈے، جوگی رمپورے کی سالانہ زیارت، غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور حنائیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ و سسرال دونوں طرف سے ماشاء اللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ سو یہ دیورانی جٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہو گئی۔ سچ کہا ہے کہ بڑا کہ زر، زمین، زن، تین چیزیں گھر کا گھر دا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروا لیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا بھی منہ کس نے بند کیا ہے محلے میں اڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے غلے کی کوٹھڑی میں سونے کی مہریں دفن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی

وہیں۔ دوست کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ بوا مدن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھوٹو بیگم کا ہے۔ جو ادھر کی ادھر لگاتی تھی۔ اور پھر سال کے سال ممبر پہ دولہن بن کر چڑھ بیٹھتی ہے۔ چڑیل۔

رونا بہر حال فرض تھا۔ خواہ چھوٹو بیگم جیسی کٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہذا بوا مدن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ دنیا آئے تھے کیا کیا گل زہرا کو خدائی ———— زماؤں نے دیکھی در خیمہ سے لڑائی ———— ادے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا ———— اور جانے کون کون سے سائے جدید نوحے۔ جی ہاں ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کیمپ کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پہ سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم آفندی کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا سا توں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ تو یہ تو یہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔اے بھی کر لے لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں، کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل پکچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے فیشن کے نمونے اس کو آتے۔ جہاں پردہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پائے گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی سی ایس میں آ گئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔اے ایل۔ایل۔بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں فلم کی وزارت نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی وضع کی لیتے تھے۔ کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چائے پر گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا، کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈی باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال ہی کھلے ————

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک دھڑ ونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ جاتا ہے۔ اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ————

(۵)

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹننٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے کے موقع پر ضلع کے اردو اخبار والوں نے لکھا تھا ——— کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کر سبزی ترکاری، یہ بھی دیکھا، وہ بھی دیکھ ——— کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ در اصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پرانے مدرسۂ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا۔ "باعزت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں زنجیر گھونگٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا)

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علیگڑھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انھوں نے پورے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی بیشتر بیبیاں اسی ودیالے کی ودیارتی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جونپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کھیم کو اتروانے کے لئے آئے تھے۔ اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بچارے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

(۶)

• کھیم وتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد منبیت ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی ——— وہ چودھری سلطان کے لیکچر کے دوران

رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد یونین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ——— کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— اور پھر وہ خاموش ہو گئی ——— اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے ———

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے:" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ——— "کہ تم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے ہو، ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا۔ اور ایک قسم کا احساس برتری ——— چار سال جب اس وقت کیسم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ جہیل دیال کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کیسم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقا نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شنکر رام کا نظم ہو گئی۔ بڑا اچھے پڑوسی کر و بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمھاری۔ یہی ایک مثال میری اور کیسم کی دیکھ لو۔ جنم جنم سے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر ہندو کی دُکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطے دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ———" کشوری چپ ہو گئی۔

آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گذر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چاء پر گئی تھی:" ارملا نے کہا: "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے مجلس میلے کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری؟" ——— کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سکرٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروا لیں۔ پان وان وغیرہ بھی ہوں گے۔ بیچاری نے وعدہ کر لیا ———"

سویرا ست ہو گیا ——— سویرا ست ہو گیا ——— دوسرے کمرے میں میلے کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہربندرناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"——— میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں ——— اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ مستشرقوں کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انھوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ دارالعوام میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں ———" کشوری نے کہا۔

جارہ اور آگ لگی ——— دل میں بھوک پیاس جگی ——— پگ پگ ہم گاتے ——— ہم گاتے ہم گاتے ——— لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں" ——— اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا ——— تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر

اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے" روز ماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں، جونپور میں، میرے محلے میں، شاید تین چار بچے کچھے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے نہیں شاید محرم کا زمانہ گزر گیا ہوگا۔ پرانے کیلنڈر بیکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں —۔ کشوری نے دل میں کہا۔

"برفباری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں ——" روز ماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں —۔ کشوری نے کہا۔

پگ پگ ہم گنتے چلیں —۔ ڈکیون کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چار باغ اسٹیشن پر کھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول۔ پھر چاند باغ پھر کینگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات ہیں۔ ادھر ہندو سٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہاسبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی کبھی کھیم رانے زادہ دور سے نظر آجاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ ہوگی۔ نہیں ہوگی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شو ڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا: "آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنھوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ بھی تک جی نے کہا تھا جی ہاں۔

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی۔ کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ——" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا ——" کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے متعلق اظہارِ خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگئے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے اسٹرائیک ہم نے ——۔ آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے —— ارے تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا، ارے باؤلی ہی —— وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے "بات یہ ہے مس عباس ——" انھوں نے کہنا

شروع کیا۔ سیاست اور حصولِ تعلیم کے درمیان جو ——"

" اجی ڈاکٹر صاحب لیے لیں اب رہنے دیجئے ——" کسی نے آگے بڑھ کر کہا —— "ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگئے قبلہ —— "

" ڈاکٹر صاحب ہم نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے —— ؟" دوسری آواز آئی۔

" دیکھو میاں صاحبزادے ——" آفتاب رائے نے رسان سے کہا —— "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو —— ؟"

" ہم کچھ نہیں جانتے ——" انھوں نے شور مچایا —— "معافی مانگئے۔ ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

" ضرور مناؤ ——" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اکتا کر کہا۔

" اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

" ضرور کرو —— خدا مبارک کرے ——" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔

" کڑھا سجائی نکالا یہ بھی ——" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا، اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یونہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے مربی جانے کی سماتی کر استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب۔ لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کیمپ وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جونپور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علی کا ورد کیا کرتے۔ اور پولیس ہر ہفتے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ انت سمے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی۔ جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔ اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جونپور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی۔ اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم۔ اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی۔ اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھائیے۔ نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جئے۔ اخباروں میں مضمون لکھئے۔ ریڈیو پر بولئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑ چھو ہو —— لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آجاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ میں۔ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے

ڈی کا علاج کون بتائے گا۔ پُت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں، اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں ــــ دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایک ایک پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبا دھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا ــــ بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے جاتے مگر نہیں۔ اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ سارا جونپور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دوبارہ دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آ جاتا۔ بچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا۔ جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو لولا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھمو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کر دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد، ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا۔ یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں۔ اور ابھی ان کے بھلے دنوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی ترشی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ اچھے سیکنڈ ڈویژن والی اکنومکس کی ایم اے کو کہیں جونیئر لیکچرر شپ بھی نہ ملے گی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اور ویسے ایمان کی یہ بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفاداری کا کیا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائیے گا۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں۔

قدم قدم پر اس کو یہی سننے کو ملتا۔ اور وہ گھوم پھر کے جز بز لوٹ آتی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا ــــ وہ تمہاری گڑیا کلثوم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے با اثر آدمی ہیں۔ اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں گے۔ اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی۔ اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب والے ــــ اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اڑتی اڑتی سنی تھی۔ کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں

۔ن کو مرار جی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کو ری پبلک فلپی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال۔ ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "زیرِ زمین" تھے۔

بچارے آفتاب رائے

آج چاند رات تھی۔ محلّے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق، اور ربلے نگری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پہ اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔ اب وہ اتنے تاملے کہاں۔ ساری مہریاں ورکارنیں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس گمو ڈومنی ممولہ رہ گئی تھی۔ بس اس کی آواز کو بھی پالا مار گیا تھا لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ـــ آگئیں چھمّو بیگم ـــ آؤ جم جم آؤ ـــ

چھمّو بیگم چپ چاپ آن کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کٹہروں پہ انگلیاں چھوا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز جارجیٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ـــ "مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ اور اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی" ـــ اور یہ کہہ کر انھوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا امّن اپنی پرانی "دشمنائگی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ـــ "دلہا غم حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائے گا ـــ مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پکستان میں نہیں ہیں ـــ"

"ہاں ـــ ہاں ـــ" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ـــ "مولا کیا پاکستان میں نہیں ـــ تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔"

"دلہا ـــ ہم بھی چلدیے پاکستان ـــ" جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمّو بیگم چاند رات کا بین ختم کر چکیں تو بوا امّن نے یہ اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا امّن ـــ" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی۔ ہم بھی چلدیے ـــ" بوا امّن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ـــ؟" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ سب فضیحتوں سے الگ۔ سارے دلدر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر ـــ۔

"بس بڑی بھاوج لڑکا نہیں مانتا ـــ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آ جاؤ ـــ کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھولی ہے۔"

"اچھا ـــ؟ شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں ـــ" بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشور کی شب کی بپتا" ـــ بوا امّن نے جو حسبِ معمول عینک گھر بھول آئی تھیں دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اداسی

اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز لگائی —— چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈا پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

۸

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آ کر دریچوں کے پردے گرائے اور چائے کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ جا کر گریگری سیکھتی تھی۔ مسز لارنس اور لیڈی اولیویئر، اینتھنی ایسکویتھ، کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی سینے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئل ونٹلکچوئل نہیں ہوں۔ سیدھا سادھا آدمی ہوں اور جس ڈھرّے پر سن پینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے۔ انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی "ڈپلومیٹک وائف" تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یونہی جیسے ٹیں انٹلکچوئل بن گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

"سویرا ہو گیا —— سویرا ہو گیا ——" ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

"کنول دیدی —— جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میں آنا ہے ——"

"ہاں ہاں بھئی ——" کنول نے جواب دیا "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ ——"

"ارے ہائے ——" ارملا نے رک کر کہا "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے ——"

"ڈاکٹر —— آفتاب —— رائے ——" کنول نے دہرایا۔

"ہاں —— کنول دیدی ——" ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی "وہ تو دن بھر یونہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی ——"

"گڈ نائٹ ارملا ——"

"ارے ہاں" اُس نے جاتے جاتے رُک کر پھر کہا "کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جا رہی ہیں —— ؟ آپ کو تو سر رالف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا —— "

"ارے نہیں بھئی —— " کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا "یہ بھی اس کا ایک پوز ہے" ایک دل جلی مسز اجار یہ نے جو سکنڈ سکرٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ چڑیل کہیں کی" "نہیں بھئی آر ملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں —— "

"اچھا گڈ نائٹ —— "

"اچھی طرح سوؤ —— " کنول نے کہا۔ آر ملا ہربند رناتھ چٹو پادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے —— ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے —— ۔ ابھی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے —— کہنے لگے کل دیدی رگے —— وہ صوفے پر بیٹھ گئی —— دانشی —— اُس نے چلا کر آواز دی۔ کیا نا گرم پر لگا دو —— اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سمے لکھنؤ ریڈیو پر چنا بزگی گاتی ہو گی پوڑی چھوڑ رنا —— نکر نکر ہو جائے بر جو سے ہو —— اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں تنیٹرن سروس کے بعد نوٹتی ہوں گی ——

میں نے کیا کیا تھا —— ؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی —— سال گذرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ —— نردت نے انگلی اُٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا —— جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ ——

—— میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ —— ؟ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا بھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں ؟ کیا ملتا ہے۔ ؟

باہر اندھیرا تھا۔ اور سردی۔ اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی آفتاب بہادر —— اس نے غصے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا —— تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کونے میں آ کر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر —— ؟

پیچھے کیرل گانے والے ہنستے ہوئے کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر —— اب جو میں ہوں۔ اور جو تم ہو —— کیا یہی بہت ٹھیک ہے۔ ؟

بہت زمانہ ہُوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جنٹ آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی؟ ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بورسے آدمی کی تصویر سامنے لاکر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ ——— !! اور کمال یہ کہ جبین میں اسی طرح کا آدمی جیتن نکلا ———) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑیل۔ آخر یہ سب کرکری کھاتے ہیں ——— ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فرّاٹے بھرنے اور ہوا میں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی گدھا ہوگی بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں۔ اور مجھ میں کیا بُرائی تھی؟ اس نے طے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پہ یہ وحی اُترنی چاہیئے تھی کہ یہ مہاپرش، آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پہ منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اُس سے طبلہ اور بجے بجے دُنتی سُنے۔ پوریاں خوب کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ ——— ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چیلپی کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کی باقی افراد سے کہا: ——— بھئی نمبر ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر بھائی آفتاب چار پیتے پیتے رُک گئے۔ دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پروپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا جھیل کو فون کر دو۔ کہ آم خربوزہ تالائے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمیکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی ——— وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اُس نے دل ہی ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی۔ اور بیکراں تنہائی۔ اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔

آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلا وطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفورمنس ہیں اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال، اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اُترتا ہے۔ کیا اُلٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا۔ عجیب آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیل کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاویں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے ——— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹڑی چمک رہی تھی ——— جی ہاں۔

اری ثروت ——— کم بخت کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی تو ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے ربا ——— VICE VERSA)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے اُرملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کرے۔ ڈاکٹر ڈی پی مکرجی کی طرح مہا گرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید

نحیف کا احساس ہوا ـــ (وہ کون ہوگی ـــ کیسی ہوگی ـــ آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہوگی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہوگا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا ـــ کیا بات ہے صاحب ـــ ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ ـــ اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیٹھوون کے کنسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے۔ اور ٹینس کھیلا۔ ادھر اُدھر خواتین سے بھی مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا گویا ـــ بیچاریاں ـــ!! اور ایک بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا ـــ یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر ـــ تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر فرڈ پروگرام میں ریویو کردوں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ـــ زندگی تمام ہوئی ـــ زندگی تمام ہوئی ـــ نچلی منزل میں از ملاہر بنید رناتھ چٹوپادھیا کا وہ کمبخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کہرا اب کم ہوگیا تھا۔ اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سلٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے ـــ

صبح ہوئی، شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

(۹)

جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ لیکن انگریز پھر آڑے آیا۔ دو برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہوگئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے۔ اور ابھی میں راستے ہی میں تھی جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے ـــ "کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتشدان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہوگئی۔

آج مڈنائٹ ماس منانے جائیں گے۔ روزماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا۔ چلو ہم برومپٹن اوریٹری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پنہے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہنگرین پناہ گزیں لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھنٹوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کے "آزادی کا شکرانہ" کر دیا ـــ آج کی رات میں وہاں امید اور ناامیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنہیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا بھی نہیں جاسکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے ـــ

کشوری نے سوچا۔ یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور ہیں جلنے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو جنے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر بھی کر خوشی ہوتی ہے" اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ——— "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی ——— آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کلیم وتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی "ارے کلیم ——— کلیما" ——— میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہوگئی تھی۔ اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "پہچانا۔ تم ہم کا نا ہیں چنہیس" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی ——— ہلو کشوری ——— اس نے مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا۔ یہ میرے پتی ہیں۔ کلیم نے اس سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ نمستے بھائی صاحب ——— میں نے بیحد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے" کلیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بعث سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ——— "اچھا بہن جی ——— اس سے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آئیے۔ ہم یہیں ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں ——— "اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کلیم" ——— میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چل گئی۔ میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی۔ کہ رفیقو۔ انسان نے خودکشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔ اپنے پرائے ہوگئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تو لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتا رام کا فلم ہوگئی۔ میں نے اور کلیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا۔ اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو سمجھیں۔

"اس اندازے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن جلیہ روز ماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے" اس نے روزماری کو مخاطب کیا۔ "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی۔"

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دوران اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی" کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے مختصر تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ——— ؟ میرا گھر اب کہاں ہے ؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے ——— ؟؟"

وہ خاموش ہوگئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں سوائٹ کرسمس گائی جارہی تھی۔

۔ شاید میں نے تمہیں بتایا تھا ـــــــ ادر ملا نے نیچی آواز میں کہا تھا کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب راۓ مل گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ ری پبلک پلس ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سنا تھا ـــــــ! انھوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی۔ ـــــــ میں نے سوال کرنا چاہا ہاں ـــــ میں بھی ـــــ اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے۔ اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراؤنڈ نے اُن کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے ـــــــ بجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انھوں نے کیسے گذارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انھیں کب ملے گی ـــ کیا ہوگا ــــ؟

دور، گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پہ آگئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے۔ اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انھوں نے سوچا ــــ لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے۔ یہ جھیلیں۔ یہ باغات۔ ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الزبتھن وضع کے میز ہاؤس میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکرٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انھوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیمپوں کے نیچے۔ گھاس کے ان راستوں پہ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا سنسان سیڑھیوں پہ یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھٹکتے ـــــ؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا ـــــ آؤ ـــــ آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خدا کی آواز ہوں۔ اور تمہاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔ اور ہر موت کا محافظ ہوں۔ اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس سمے خداوند خدا کی تقدیس کرتے تھے۔ اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے بوڑھیاں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے۔ اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاستدان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیونکہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے ـــــ آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے پر واپس آ گئے۔

"کنولارانی" ـــــ کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آ جاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے، کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے" کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گی ——— ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے"

لیکن کنول کماری ——— تم اب بھی رو رہی ہو ——— ؟

خدیجہ مستور

مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے

پتلی سی نالی میں پانی کی دھار رینگ رہی تھی اور صابن کا پھولا پھولا جھاگ پانی پر غلاف کی طرح چڑھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اندھیرے غسل خانے سے نہا کر نکلا تھا اور تولیے سے بال خشک کرتا ہوا صحن میں پڑی ہوئی آرام کرسی کو دھوپ میں گھسیٹ کر سردی سے اکڑتے ہوئے جسم کو ذرا گرم کرنے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ تولیے سے بالوں کو رگڑتے ہوئے اس کی نظر نالی پر پڑ گئی۔ گندی کیچڑ بھری نالی میں پانی رک رک کر بہہ رہا تھا —— اسے اچانک وہ واقعہ یاد آ گیا جس نے اس کے بے حد حسّاس دل و دماغ پر بری طرح اثر کیا تھا۔ کئی دن تک اس کی یہ حالت رہی تھی۔ جیسے وہ اس ایک واقعے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھولتا گیا لیکن آج بہت دن بعد صابن کے جھاگ کے ساتھ بہتی ہوئی پانی کی دھار نے اس کے ذہن میں اس واقعے کی یاد پوری شدت سے اُبھار دی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں بے شمار آہیں گھٹنے لگیں۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ اس دن جیسی ہونے لگی جب وہ اس واقعے سے دوچار ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ایسے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے کہ پتھر بھی پگھل کر رہ جاتا۔ لیکن کبھی وہ اس حد تک متاثر نہ ہوا تھا۔

شہر کی گہما گہمی کو موت نے نگل لیا تھا۔ زندگی کونوں کھدروں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ ویرانی کہتی تھی کہ اب کبھی آباد نہ ہوں گے۔ موت کہتی تھی کہ ہمارے چنگل سے اب کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔ مگر امدادی کمیٹی کے درد مند دل کہتے تھے کہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ہم انہیں کیڑوں مکوڑوں کی طرح موت کے جال میں پھنس جانے دیں گے۔ وہ جہاں جہاں جا سکتے تھے، جہاں جہاں پہنچ سکتے تھے روتی سسکتی مایوس زندگیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر چن چن کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ اس روز بھی وہ سامان لاری پر ویران شہر کے گوشے گوشے کا چکر لگا کر پچاس فساد زدہ انسانوں کو کیمپ میں پہنچا کر محفوظ کر چکا تھا اور سارے دن کا تھکا ہارا پولیس چوکی پر لاری سے اتر کر گھر جانے کے لئے پیدل چل رہا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر آرام کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ ایک دم اس کے پاؤں رک گئے۔ سڑک کے کنارے بارہ تیرہ آدمی کھڑے جھک جھک کر نالی میں نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سب کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا —— بلڈنگ کے صدر دروازے پر بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا اور وہ سب اسے توڑنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

"ہم لوگوں نے آج تین دن ہوئے کہ اس گھر کے بچے بچے کو پار لگا دیا پر یہ جانے کیسے بچ رہا۔" سرخ آنکھوں اور بھیانک چہرے والا ادھر ادھر لہرانے لگا۔

"پھر توڑ دو نا تالا جی!" دوسرے نے زمین پر ٹیکتے ہوئے کمر بند سے اپنا اُلجھا ہوا پاؤں نکال کر کہا۔ "لیکن سوچو تو ——— تالا پڑا ہے بھلا گھر میں کون ہوگا؟" اس نے لوگوں کو سمجھانا چاہا۔ "کوئی نہیں ہوگا تو کیا یہ جادو کا کھیل ہو رہا ہے؟" تیسرا سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر نالی کی طرف اشارہ کرنے لگا ——— چوڑی اُتلی نالی میں بلڈنگ سے آتا ہوا صابن کا جھاگ ملا پانی کیچڑ میں رینگ رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ غسل فرمایا گیا ہے؟" چوتھا شخص اپنی قمیص سے چہرا صاف کرنے لگا۔ اور وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ اس وقت وہ سپاہیوں کو بہت دور پولیس چوکی پر چھوڑ کر آ رہا تھا اور پولیس کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔

"تالا توڑ دو جی!" کئی آوازیں ایک ساتھ بھنبھنائیں۔

"لیکن دیکھو نا، انسانیت کا تو یہ تقاضا ہے ———" وہ انتقام کے جوش سے کھولے ہوئے داغوں پر انسانیت کے تقاضوں کے چھینٹے دینا چاہتا تھا لیکن اس کی بات بیچ ہی سے جھپٹ لی گئی۔

"جب ہماری ماؤں، بہنوں اور ہمارے بھائیوں کو خون میں نہلایا جا رہا تھا جب انسانیت کہاں تھی اور جب آپ کہاں تھے؟" کئی آدمیوں نے ایک ساتھ سوال کر دیا۔

"اپنی انسانیت کے ساتھ سو رہے ہوں گے۔" بھیانک صورت اور سرخ آنکھوں والے نے شیطانی قہقہہ لگایا۔

"لیکن دیکھو نا ———" اس کے دونوں ہاتھ بلند ہو کر جھک گئے۔

"تالا توڑا جائے گا۔ آپ کیوں منع کر رہے ہیں؟" لوگ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ ان میں سے ایک نہیں۔

"میں منع نہیں کرتا تالا ضرور توڑ دو۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی بات کوئی بھی نہ سُنے گا اور اگر زیادہ مخالفت کی تو اسے بھی چیر پھاڑ کر پھینک دیں گے۔ تالے کو تھوڑی ہی دیر میں کنڈے سے جُدا کر دیا گیا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ وہ سب کے پیچھے تھا اور جیسے اس کی روح پھڑک پھڑک کر رو رہی تھی ——— وہ چھپے ہوئے انسان کی جان بچانے کے لئے تیزی سے سوچنے لگا اور اچانک اس کے ذہن نے جان بچانے کی ایک مُبہم سی ترکیب سوچ ہی لی۔

"دیکھو یوں اندھا دھند آگے مت بڑھو ممکن ہے کہ اس کے پاس بندوق ہو۔ میرے پاس رائفل ہے میں آگے چلتا ہوں تم سب دبے قدموں میرے پیچھے چلو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ سب اس کا کہا مان کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا ——— ایک دو تین۔ سیڑھیاں جیسے نہ ختم ہونے والی کڑی ہو گئی تھیں۔ وہ سارا دن کام کرنے کی وجہ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا جسم اور دل و دماغ سب ہی نڈھال ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ذرا بھی تھکان نہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا اور برابر سوچ رہا تھا کہ جب پہلے اس اونچی بلڈنگ میں قتل و خون کا بازار گرم کر لیا گیا تھا، ایک کو بھی تو اپنے حساب میں نہ چھوڑا تھا۔ پھر بھی وہ چھپ کر اپنی جان بچا گیا۔ اس وقت بھی وہ جیسے ہی اسے نظر آئے گا اسے چھپ جانے کا اشارہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ موت تم سے چند قدم کے فاصلے پر لپکی چلی آ رہی ہے۔ یقیناً اس گھر میں ایسی جگہ ضرور ہو گی جس میں وہ پہلے کی طرح چھپ سکتا ہے۔

پہلی منزل ——— دوسری ——— تیسری ——— ہر منزل کے ایک ایک کونے کو چھان مارا ہر کمرے میں سب سے پہلے وہ داخل ہوتا تھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الوؤں کا راج ہے۔ لیکن جب چوتھی منزل پر جانے کے لئے قدم اٹھ رہے تھے تو نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا دل پھڑک پھڑک کر دعائیں کر رہا تھا کہ وہاں بھی کوئی نہ ہو۔ کوئی نہیں۔ وہاں بھی الوؤں کا

روح ہو ——— وہ انسانی تراش خراش کے ایسے نمونے دیکھ چکا تھا کہ اب اپنے میں کوئی اور نمونہ دیکھنے کی سکت نہ پاتا تھا ——— اس کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ اس نے پیچھے دبے دبے قدموں آنے والوں کو کئی گز پیچھے چھوڑ دیا تھا اور جب سیڑھیاں ختم ہوتے ہی سب سے پہلے سامنے پڑنے والے کمرے میں وہ داخل ہوا تو جیسے دم بخود رہ گیا۔ نیلے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک بوٹے سے قد کی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی، ہونٹ سرخ اور پھیلے ہوئے، آنکھیں سنہری سنہری اور جسم نڈھال، اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ ہاتھ میں کنگھا تھامے سامنے رکھے ہوئے آئینے میں نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی زمین پر صابن دانی، تولیہ، کلپ اور بال پنیں پڑی ہوئی تھیں ——— اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی جیتا جاگتا انسان ہے، وہ کوئی خوبصورت روح ہے، وہ کوئی پری ہے۔ لیکن جب لڑکی نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کنگھا چھوٹ کر زمین پر گر گیا تو اس کے جیتے جاگتے وجود کا احساس ہوا، اور پھر اسے بچانے کے لئے اس کی روح روح پھڑکی۔ اس نے اسے چھپ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ آہستہ سے اسے بتایا کہ لوگ پیچھے آ رہے ہیں۔ مگر لڑکی جیسے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی اسے ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ لڑکی نے بس ایک بار اسے بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ سب لوگ کمرے میں گھس آئے۔ ان کے لہراتے ہوئے چھرے جھک گئے۔ وہ سب شیطانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"پہاڑ کھودا تھا تو چوہیا نکلی۔" سرخ آنکھوں والا لڑکی کی طرف بڑھا اور اسے محسوس ہوا کہ زور سے زلزلہ آ گیا ہے۔ لڑکی کا چہرہ ایک دم سفید ہو رہا تھا۔

"رحم کرو۔ اسے مت چھونا۔" وہ لڑکی اور سرخ آنکھوں والے کے درمیان آ کر پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"ارے تو کیا بدن میلا ہو جائے گا۔ محنت کریں بی فاختہ، کوے میوے کھائیں۔ ابھی اپنی راہ لگئے۔" ایک نے کہا اور سب پھر ہنسنے لگے۔

دو آدمیوں نے دھکے دے کر اسے لڑکی کے پاس سے ہٹا دیا۔

"میں ... نہیں ———" وہ پھر لڑکی کے سامنے آ جانا چاہتا تھا کہ سرخ آنکھوں والے نے اپنا چھرا اس کے سینے پر رکھ دیا ——— پھر ایک نے لڑکی کو اٹھا کر بھیڑ کی طرح کاندھے پر ڈال لیا۔ لڑکی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی، اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن جب وہ لڑکی کو لے کر چلنے لگے تو اس نے اپنی لٹکتی ہوئی باہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ اس کا جی چاہا کہ کاش اس وقت تو سچ مچ وہ چھرا اس کے سینے کے پار ہو جاتا۔ وہ بے چین ہو کر اس کی طرف بڑھا مگر اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا گیا اور سرخ آنکھوں والے نے آگے بڑھ کر لڑکی کی پھیلی ہوئی باہیں اپنے گلے میں ڈال لیں۔ لڑکی کی آنکھیں جیسے بے انتہا کرب سے بند ہو گئیں۔

پھر آن کی آن میں کمرہ خالی تھا۔ پہلے سے زیادہ ویران اور خاموش۔ وہ سب جا چکے تھے اور وہ اسی جگہ زمین پر بیٹھا تھا جہاں لڑکی ذرا دیر پہلے کنگھی کر رہی تھی۔ وہ پھیلی ہوئی باہوں کا سہارا نہ بن سکا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے سینے میں کوئی ضدی جذبہ مچل مچل کر اسے رلا رہا تھا۔ اس نے جانے کتنی جوان عورتوں کو اغوا ہوتے دیکھا۔ ان کی چیخیں، ان کی فریادیں سُنی تھیں۔ مگر اس طرح کوئی بھی تو اس کے دل پر اثر نہ کر سکا تھا۔ مگر یہ گم سم سی لڑکی صرف باہیں پھیلا کر اسے کس قدر متاثر کر گئی تھی۔ اس کے دل جیسے نازک گوشت میں بھرپور چٹکی لے گئی تھی۔

جب وہ جی بھر کر رو چکا تو اس نے قدموں سے روندی ہوئی بال پنوں اور کلپوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ انہیں دیکھتا رہا، انہیں چھوتا رہا۔ اور ہلکی سی نم تولیہ کو اٹھا کر سہلاتا رہا اور پھر اس بستر کو دیکھنے لگا جس پر اس قدر شکنیں پڑی ہوئی تھیں کہ جیسے اس پر مسلسل کئی دن تک کوئی کروٹیں بدلتا رہا ہو، پاؤں رگڑتا رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ اس خوبصورت اور عجیب لڑکی نے تین دن تین راتیں اس بستر پر تڑپ کر گذاری ہیں، اور پھر وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ بستر کی شکنیں درست کرنے لگا۔ تکیہ پر جگہ جگہ آنسوؤں کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تین دن مسلسل تین دن تک روتی رہی اور پھر اس نے

تھکن سے نڈھال ہو کر منہ دھویا تھا۔ تاکہ اس میں پھر رونے کی سکت پیدا ہو جائے ــــ اور پھر وہ اپنے بال سنوارنے بیٹھ گئی تھی۔ لیکن بال کیوں سنوار رہی تھی؟ اس نے صابن سے منہ کیوں دھویا ــــ اگر تھک گئی تھی تو منہ پر یوں ہی پانی کے چھینٹے بھی تو دے سکتی تھی۔ مگر اس نے تو باقاعدہ صابن سے منہ دھویا تھا اور انہماک سے سنگار کر رہی تھی ــــ شہر میں سناٹا تھا، اس کی بلڈنگ میں سناٹا تھا، مرت سب کو نگل گئی تھی۔ پوری بلڈنگ میں بھیانک ویرانی تھی۔ زندگی کا آس پاس کیا دور دور پتہ نہ تھا، اور وہ سنگار کر رہی تھی۔ اس تنہا خاموش کمرے میں مسلسل تین دن رو چکنے کے بعد سنگار کر رہی تھی۔ تھکن سے نڈھال اور چور، آخر وہ کس کے لیے سنگار کر رہی تھی۔ کیوں ــــ وہ کون سا جذبہ تھا۔ کتنی عجیب، کتنی حسین لڑکی ــــ وہ جب اسے اٹھا کر لے گئے تو وہ چپ چاپ چلی گئی ــــ اور پھر اس کے دل و دماغ کو دو پھیلی ہوئی باہوں نے جکڑ لیا۔ کاش وہ اس تھکی تھکی نڈھال لڑکی کا سر اپنے زانو پر رکھ سکتا، اس کے سُرخ پھٹے ہوئے ہونٹوں کو سہلا سکتا۔ وہ اس کے لئے وہ سب کچھ کر سکتا جو وہ چاہتی تھی اور پھر کچھ نہ کر سکنے کے جذبے نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ تکیے کے نیچے ایک کاغذ پڑا تھا۔ میلا، بوسیدہ۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ "میری جان!" ــــ وہ پورا خط جلدی جلدی پڑھ گیا۔ لیکن آخر میں جب وہ پڑھ رہا تھا کہ "میں تم سے جلد ہی آ کر ملنے والا ہوں میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے حد بے چین ہوں۔ اتنا بے چین کہ اگر میری راہ میں کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی حائل ہو جائے تو وہ مجھے تم تک پہنچنے سے نہ روک سکے گا۔ میں تمہارے پاس سیدھا تمہارے کمرے میں پہنچوں گا جہاں تم بنی سنوری بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہو گی اور" ــــ ہاتھ کانپے۔ خط چھوٹ کر زمین پر گر گیا ــــ

نیچے اچانک شور ہونے لگا۔ دھما دھم کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ شاید قریب کی کسی بلڈنگ کا سامان لوٹا جا رہا تھا۔ اس نے بال پنیں اور کلپ اٹھا کر جیب میں ڈال لئے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک بار پھر نالی کی طرف دیکھا۔ پانی بہہ چکا تھا اور صابن کا جھاگ بجھ کر ختم ہو چکا تھا۔

شفیق الرحمٰن

جلنی

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ نیلے لباس والی لڑکی سے پوچھا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین ہو گیا اور میں نے پائپ پیتے آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے۔ کالج میں ویسے اکٹھے رہے کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی۔ پھر ایک دوسرے کے لئے معدوم ہو گئے۔ اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گزاری جائے اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مٹاپے نے اس کے تیکھے خدوخال کو مبہم بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا وہ تجسس، نگاہوں کی وہ بے چینی، وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے۔ وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دوہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ شام کا وقت وہ کسی اور کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے۔ اس نے بھی معذرت چاہی کیوں کہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری کے گھر پہنچے اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبو کی لپٹیں سی آ رہی تھیں اور کبھی کبھار آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں۔ اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہوا تو اچھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آ کر اس نے ٹیلیفون پر کوشش کی۔ تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی لیکن شام کو اس کی آنٹی اسے کسی نوجوان کے ہاں لے جا رہی تھیں۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے۔ رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی۔ میرے لئے بھی انڈیلی اور اصرار کرنے لگا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے چھوا، کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا پھر ٹہلتا ٹہلتا دریچے تک گیا ایک بڑے سے گملے میں انڈیل کر واپس آ گیا۔

اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی مجھے بھی دی میں پھر اٹھا اور اپنا حصہ کھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ اپنی معمولانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت ملحوظ جسم تھیں۔ شراب کے متعلق جو دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے عاشقوں کے متعلق جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی لیکن وہ اس سے علیحدہ رہتا تھا جب کبھی بھولے سے گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ عاجز آجاتا اتنا نہیں سمجھتی کہ ایک ہوا باز کی زندگی کس قدر خطرناک زندگی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی اس نے خود منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا جسے اس وقت گرجے میں ہونا چاہئے تھا وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکی آگئی جس کی طبیعت ناساز تھی پھر معلوم ہوا کہ تیسری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے اپنی اسی یانکی جوان کے ساتھ نہیں، ایک دوسرے ہوا باز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ نہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکہ دیتی ہیں، ہمیشہ ٹرخا دیتی ہیں آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کئے جا رہا تھا میرے حصے کی ساری شراب گملوں اور پودوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کے دنوں میں باقاعدہ سگریٹ بھی نہ پیتا تھا اب ایسا شرابی ہو گیا کہ اتنی پی لینے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا تھا۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جینی تھی۔ جو رقص کا لباس پہنے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ ابھی ابھی آئی تھی ہم دونوں اٹھے، ہمیں دیکھ کر جینی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی تعارف ہوا ——— میرے خاوند سے ملئے ——— اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں ———

میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کے خاوند کو مبارکباد دی ——— اور کہا کہ وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا وہ چالیس سے اوپر کا ہوگا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ، دھندلی دھندلی آنکھیں، بے حد معمولی شکل پستہ قد۔ اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا تو شاید ہم اس کی طرف دوسری مرتبہ نہ دیکھتے۔ لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا اس نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ویسی ہی ہے اس کے ہونٹوں کی وہ دلآویز اور مخصوص مسکراہٹ جوں کی توں ہے۔ وہ مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی، جسے مونا لیزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی ——— نہایت پر اسرار اور نافہم مسکراہٹ۔ جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جو ہمیشہ راز رہی۔

اور یہی مسکراہٹ میں نے سالہا سال سے دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ سے میں تو ڈرتا رہا۔ جینی کے خاوند کے دوست آگئے اور مقامی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے جہاں بوتل اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیں لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ان تینوں لڑکیوں کے لئے اداس تھا جو اسے دھوکہ دے کر دوسروں کے ساتھ چلی آئیں۔ آج پہلی مرتبہ نہیں ہوا پہلے بھی ہو چکا تھا اور یہ لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں پرانی دوست تھیں اس کے ساتھ باہر جا چکی تھیں۔ اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں دراصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر طرف سے لگ رہی تھیں ریس، برج، شطرنج ہر جگہ وہ ہار رہا تھا۔ ایک ادنیٰ فلم کمپنی کی ایکسٹرا لڑکی جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ——— اور میں حسد بھری نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں جینی تھی وہ فرط مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا اس کی آنکھیں روشن تھیں ——— وہی آنکھیں جو کبھی غمگین اور پرنم رہا کرتی تھیں اب مسرور تھیں۔ رخسار جن پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی تھیں اب تاباں تھے۔ وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے جو جینی کی قسمت بن چکا تھا

اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زیادہ مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟ اور اس پراسرار مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی روح بہت دور تھی۔ وہاں تک میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ اذیت کی، کرب ناک شدید تلاطم۔ یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا؟ یا وہاں سب کچھ تخ ہو چکا تھا؟ برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا؟

اس کا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔

وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ کئی مرتبہ وہ بالکل قریب سے گزرے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ اس نے ماضی اور حال کی حدوں کو محیط کر لیا۔ وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے تاریک گوشوں میں مدفون تھیں۔

میں نے برسوں پہلے اُسے یونیورسٹی کے مباحثے میں دیکھا۔ میرے ساتھ میرا پرانا رفیق اور ہم جماعت جی بی تھا۔ یہ ان دنوں بہترین مقرر تھا سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج پر آئی گھنگھریالے بال جھکی ہوئی آنکھیں۔ لبوں پر عجیب مسکراہٹ۔ ملا جلا انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے ——

ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی نئی کہیں سے آئی ہے اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے لیلے کہتے ہیں۔ شاید اس کی ملیح رنگت اور گھنگھریالی پریشان زلفوں کی وجہ سے۔

کچھ دیر وہ شرماتی رہی۔ بول ہی نہ سکی۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جی بی کی تقریر کی مخالفت شروع کی۔ ایسے ایسے نکتے لائی کہ سب حیران رہ گئے۔ جی بی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی۔

جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جی بی اور اس لڑکی میں تقسیم کیا جائے گا لیکن جی بی نے ججوں سے درخواست کی کہ انعام کی وہی حقدار ہے اور اسی کو ملنا چاہئے جی بی کے رویے کو سراہا گیا ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی پہلا انعام جیت رہی تھی، وہ بھی ایسی لڑکی جو بالکل نووارد تھی۔

جب لیلے سٹیج پر چاندی کا بڑا سا وزنی کپ لینے آئی تو اس کی پریشان زلفیں اور پریشان ہو گئیں نگاہیں اور جھک گئیں جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا گیا، تو جی بی نے پلک کر کپ کا چوبی حصہ خود اٹھا لیا۔ لیلے نے جی بی کو جھکی ہوئی نگاہوں سے ایک مرتبہ دیکھا۔

اس بھولی بھالی الھڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جی بی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہر دلعزیز کالج میں سب سے ذہین، چست، ہنس مکھ اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کار پروفیسروں کی کاروں سے بھی بڑھیا تھی۔ جہاں کہیں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جی بی کو مدعو کیا جاتا۔ ہمارے کہنے پر لیلے کو بھی بلایا جاتا ——— لیلے کے خدوخال حسین نہیں تھے۔ اگر اسے نقادانہ طور سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہیں تھی ——————— لیکن اگر حسین خدوخال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہو سکتا ہے تو وہ لیلے تھی۔ اس کی بکھری ہوئی زلفیں جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ننھے ننھے ہونٹ ملیح چمپئی رنگت —— اور نہایت معصوم باتیں —— سب مل کر نرالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بے حد پیاری معلوم ہوتی ۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی، سب سے الگ تھلگ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں ان کے خاندان میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی ہندوستان کی تھی۔ اس لئے نہ ان کا کوئی خاص مذہب تھا نہ کوئی نسل۔ لیلے کا نام بھی عجیب سا تھا، اس کا لباس بھی ملا جلا ہوتا وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کرتی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار

سے وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں ایک دفعہ ان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے۔

پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ سیلے جی بی کی طرف دلچسپی رکھتی ہے، یہ افواہ بنی، پھر عام ہو گئی ہر جگہ اس نئے معاشقے پر تبصرے ہونے لگے۔ سب نے دیکھا کہ سیلی کے دل کا راز عیاں ہو چکا تھا وہ جی بی کو جب بھی بہت طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملتی۔ جانے پہچانے راستوں سے ایسے وقت گذرتی کہ جی بی نظر آ جاتا جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا بھر کی نعمتیں مل جاتیں یہ نوزائیدہ محبت، اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی۔ وہ مسرور رہنے لگی۔ ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی اس کا اجنبی لہجہ درست ہوتا گیا، اس کی گفتگو میں مٹھاس آگئی۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کتنی ہی مرتبہ اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی۔ وہ سیلے سے ملتا، اسے ملنے کے موقعے دیتا، خوب باتیں کرتا بڑی شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو، جس کا وہ عادی تھا۔

چاندنی رات میں دور ایک باغ میں تقریب ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ سیلی بھی آئی جی بی ہمارے ساتھ نہیں آیا، معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو سے کر آئے گا۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی۔ یہ اس کی نئی محبوبہ تھی۔

جی بی دیر میں آیا، کار سے وہ اکیلا اترا۔۔۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ مایوس اور کھویا کھویا سا تھا، اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا لیکن اسے اجازت نہ ملی، وہ تو ایسی محفلوں کی جان تھا۔ جب وہ اپنا سونیٹ سنا رہا تھا تو سیلے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے آئینے میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو۔ جی بی نے خلاف توقع غم آمیز اشعار سنائے جن میں شکوے تھے۔ التجا تھی اور وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی۔

سیلے نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا میں نے اسے ٹوکا ایک طرف سے جا کر ٹہلتا جی بیگ جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ سیلے آ گئی۔ جی بی کچھ دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا، وہ مبہوت سی چپ چاپ چلی گئی۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا پہلے بوسے پر وہ کانپ اٹھی۔ ان جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جی بی کے سینے سے سر لگا دیا وہ اسے بھیگے ہونٹوں سے چومتا رہا ایسے الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جو سیلے کے لئے نہیں کسی اور کے لئے تھے۔ اس کے بازوؤں میں سیلے نہیں تھی، کوئی اور بے وفا حسینہ تھی جس کے لئے وہ بے تاب تھا۔

سیلے شدت احساس سے آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی، وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی۔ وہ شعر و نغمے کی وادیوں میں جا پہنچی جہاں اس کے سہمے ہوئے خوابوں کی تعبیریں آباد تھیں جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں، جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے، جہاں صرف رعنائیاں تھیں اور محبت پاشیاں!

اس کے بعد سیلے کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر نیا نکھار آ گیا جو پہلے محض تخیل تھا وہ تخلیق ہو گیا۔ غنچے چٹکے، خوش الحان طیور چہچہانے لگے۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں۔ زمین سے آسمان تک قوس قزح کے رنگ پھیلنے لگے، ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا۔ اس کے بعد نہ دنیا رہی اور نہ زندگی محض خواب تخیل اور حقیقت کی سرحدوں پر چھا گیا۔

بہت دیر کے بعد سیلے اس خواب سے چونکی۔ دفعتاً اس پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی۔ جی بی کو اس سے محبت نہیں تھی وہ جی بی کے لئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ بغیر کسی صلے کے اسے چاہتی تھیں۔

جب بات بہت مشہور ہوئی تو جی بی کترانے لگا اس نے تقریبوں میں آنا بند کر دیا۔ سیلے کو دیکھ کر کار تیز کر دیتا اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر سیلے کو یقین نہ آیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اس صدمے کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا

یا لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی، تحائف بھیجتی۔

وہ دوسرے کالج میں تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو ہر روز دیکھ لیتی۔

ایک روز سب نے لیلےٰ کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے میں بھی گیا سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا دلچسپ فقرے نقل کئے، خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی بی کو برا بھلا کہا، اسے یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلےٰ نے اسے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے خفا ضرور رہا ہے لیکن کسے علم تھا کہ معمولی سا مذاق ایسی شکل اختیار کرے گا، اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔ محض لیلیٰ کی وجہ سے بقیہ لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا گہرا دوست تھا، ہم دونوں ہم عمر تھے، ہمارے خیالات یکساں تھے —— میں خاموش ہو گیا۔ دیر تک خطوط کا چرچا رہا، لیلےٰ کئی دن کالج نہیں آئی تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا —— جو کچھ اسے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلیٰ کی سہیلیوں کی منتیں کیں کہ اسے سمجھائیں کسی طرح اسے دور رکھیں اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا جہاں لیلےٰ کے نظر آنے کا احتمال ہوتا، اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں جن کی طرف لیلےٰ گزرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی۔

ایک دن مجھے ترس آ گیا میں جی بی سے خوب لڑا، جہاں تم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہو وہاں کبھی لیلےٰ سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ بولا —— تمہیں معصومیت اور سادگی پسند ہے مجھے نہیں۔ مجھے ناپختہ اور الھڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں، ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ خوش ہوئیں تو رونے لگیں، غمگین ہوئیں تو آنسو بہنے لگے۔ دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں، ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جی بی کے اس رویے کا اثر یہ ہوا کہ لیلےٰ اس سے ڈرنے لگی وہ اسے دور دور سے دیکھتی کہیں آمنا سامنا ہوتا تو راہ کترا جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی رہتی۔ کئی مرتبہ میں نے خود اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں اس کی تصویریں بھی دیں جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ اس کے کچھ رشتہ دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تجار تھے۔ اسی سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور ان کے لئے تعلیم اتنی اہم نہ تھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے کہ میں نے اسے لیلےٰ سے آخری مرتبہ ملنے کو کہا، اس نے انکار کر دیا جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دلایا۔ تو وہ راضی ہو گیا میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا اس نے آنسو خشک کئے بہترین لباس پہنا سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے، ان کے مشورے سے سنگار کیا اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لئے اپنے محبوب سے ملنے گئی اس رات جی بی پئے ہوئے تھا بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے محض میری وجہ سے پی تھی تاکہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں، اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا، جلد لوٹنے کے وعدے کئے لیلیٰ کو ایک بار پھر اس فردوس گمشدہ کی جھلک دکھائی جسے محبت کے پہلے بوسے نے تخلیق کیا تھا۔ لیلےٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی اور اس کا انتظار کرے گی اگر اس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ سزا کی طالب ہے اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے اگر وہ چاہے تو لیلےٰ مر جائے جدا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا۔ یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا کہنے لگا "شاید تمہارے پاس محفوظ رہے ورنہ میں تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا۔" رومال سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی ایک کونے میں سرخ دھاگے سے ننھا سا دل بنا ہوا تھا جسے لیلےٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلےٰ ذرا بھی غمگین نہ ہوئی، اس کے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔

پتے زرد ہو کر گر پڑے، پھول مرجھا گئے، ٹہنیاں ٹنڈ منڈ رہ گئیں، خزاں آگئی — وہ نہ آیا۔ جھکڑ چلے سوکھے پتے اڑنے لگے گرد و غبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی، تاروں کو بے نور کر دیا، وحشتیں پھیل گئیں —— وہ نہ آیا۔

کونپلیں پھوٹیں، ہریالی میں پیلی پیلی سرسوں پھولی، رنگین تتلیاں اڑنے لگیں، غنچے مسکرانے لگے، پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے، بہار آگئی — لیکن وہ نہ آیا۔

دن لمبے ہوتے گئے، لمبی لمبی جھڑیاں لگیں۔ سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل اٹھے اور برس کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے قوس قزح سے رنگین ہو گئے — لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک لیلیٰ کھوئی کھوئی سی رہی۔ بہت دیر کے بعد وہ سب کچھ سمجھ سکی۔ جب جی بی لوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔ جی بی اکیلا نہیں آیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ گوری چٹی فربہ عورت جو کسی لکھ پتی کی بیٹی تھی۔ جس کا گول مول چہرہ کسی قسم کے اظہار سے مبرا تھا جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی۔ جو اس ٹھوس اور مادی دنیا میں پیدا ہوئی اور اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی بی کو مبارکباد دی۔ اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں لیلیٰ کو بھی جانتا تھا اور جی بی کو بھی یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس وقت رقص گاہ میں تھے۔ جی بی میرا دوست تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا اور پی رہا تھا اور لیلیٰ وہ جینی تھی جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

لیلیٰ کو بدستور چھیڑا جاتا۔ طعنے دیئے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز ہم نے سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی باتیں بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد "لیلیٰ" کا ذکر ایک پرانی بات ہو گئی۔

ایک دن وہ کہیں سے آکر کالج میں داخل ہو گئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی لیلیٰ نہیں بلکہ شوخ و بے باک جینی تھی یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کئے نگاہیں اٹھائے سائیکل پر آتی تو لڑکے ٹھٹک کر رہ جاتے، ہر وقت اس کے لبوں پر نہایت بیباک مسکراہٹ ہوتی۔

یونین کا جلسہ ہے تو جینی تقریر کر رہی ہے۔ ڈرامہ ہے تو وہ ضرور حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو جینی اچھے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی سے لوگ ڈرتے تھے۔

جینی کی بے باکی کو سراہا جانے لگا۔ اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ڈے یونین کا صدر تھا، وہ دبلا پتلا سا بنگالی لڑکا تھا اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پڑوسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں اس کے انوکھے نظریئے، اس کا احساس پن وائلن پر غمناک نغمے — یہ سب مجھے اچھے معلوم ہوئے لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ویسے اس میں کوئی نمایاں عیب یا خامی نظر نہیں آتی شاید یہ اس کا اجڑا سا حلیہ، اس کی آنکھوں کی مجرمانہ بناوٹ، اس کے چہرے کا فاقہ زدہ انداز تھا جو مجھے ہمیشہ اس سے دور رکھتا۔

کبھی کبھی شام کو بھی اسے ہمراہ لے جاتا۔ اس طرح اس کی جینی سے ملاقات ہوئی۔

غالباً ڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کا انکسار تھا اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا بعض اوقات تو وہ اس قدر کسر نفسی سے کام لیتا کہ ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طالب ہے۔ شروع شروع میں شاید جینی کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔

وہ جینی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ پھر جیسے جینی بھی اس کی جانب ملتفت ہوتی گئی۔ جب وہ وائلن پہ درد بھرے نغمے سناتا تو اس کی نگاہیں

جینی کے چہرے پر جم جاتیں نغمے کی پرواز نہایت مختصر ہوتی، ڈے کی انگلیوں سے لے کر جینی کے دل تک ۔۔۔ !

جب وہ دونوں فلسفے کی کتابیں ہاتھ میں لئے بحث میں مصروف ہوتے تو اکثر بہک بہک جاتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی، اشاروں اور کتابوں کی حدود سے نکل کر کھلم کھلا ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ جینی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چلا تھا وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی کالج کی کئی لڑکیاں اسے دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دنوں ہم ڈراما کھیل رہے تھے، دوپہر سے ہی ریہرسل شروع ہو جاتی شام بھی اکٹھے گزرتی۔ اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا، اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی، کسی روز تو یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرا سبز وال پیپر ہے جس پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں، گلدانوں میں لمبی لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں، سبز قمقمے روشن ہیں، فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش و نگار، دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں سبزی مائل پردے، گملوں میں رکھے ہوئے پودے ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا جیسے درندوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پھر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا، دیواریں، پردے، غلاف، قالین، قمقموں کے شیشے۔ گلدانوں میں صحرائی پھول اور خشک ٹہنیاں ہوتیں انگیٹھی کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تصور میں لق و دق صحرا ابھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے حدی خوانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نظارے آنکھوں کے سامنے آ جاتے یہی آرائش کبھی طوفان زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی چنگھاڑتی لہریں، ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اور آندھیوں میں پتے کی طرح کانپتا ہوا سفینہ ۔۔۔ !

اس کے کمرے میں کبھی ایک جیسا گلدستہ میں نے دو مرتبہ نہیں دیکھا۔ گلدان میں رٹے بڑے پھول بھی ہیں۔ شوخ پھول بھی ہیں، لیکن صرف ننھی منھی کلیاں نمایاں ہیں، باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کبھی غنچے، کلیاں، پھول سب کہیں جا چھپے ہیں، صرف خوشنما وضع کے پتے سامنے آ گئے ہیں، اس کے ترتیب دیتے ہوئے گلدستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایسے حسین و جمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں جنہیں گلشن میں نگاہ پہچانتی تک نہیں ۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی طے ہوا کہ وہیں شام کو بارہ دری میں چھوٹا سا ڈراما بھی کھیلا جائے۔ جینی کی ٹریجڈی پارٹ تھا وہ دن اس نے اکیلے گزارا کسی سے بات نہیں کی دن بھر اداس رہی پھول کی روشنی میں ڈراما شروع ہوا جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا، لیمپ بجھ دیئے گئے۔ سب نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا تھا وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی، جس میں چودھویں کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سادا سا گیت اور وائلن کا تھرتھراتا ہوا نغمہ اس کی انگلیوں کی جنبش جسم کے رقص اور گھنگھرو کی تال پر چاند تارے ناچنے لگے پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں دیوداسیوں نے سنگار کئے کنول کے پھول تھامے آگئیں پجاریوں کے سر جھک گئے۔ فضاؤں میں تقدس برسنے لگا چراغوں سے دھواں اٹھا، دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صرف جینی رہ گئی اور اس کا محبوب ۔۔۔ پجاری اور دیوتا۔

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم نہیں ہوا، ساز او رنے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ڈے نے ان پیار بھرے جذبات کا اظہار کر دیا جنہیں وہ دیر سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا۔ یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت کے ساتھ محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق سہرا باندھے گا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہو گا۔ ان دونوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے ۔ آرٹ نے۔ وہ دونوں آرٹسٹ ہیں انسان فنا ہو جاتے ہیں آرٹ فنا نہیں ہوتا۔ آرٹ جاوداں ہے ۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے، معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی میں نے اسے جانے پہچانے نغمے

گنگناتے سناتا تھا۔ پیانو پر اس کی انگلیاں خوب چلتیں کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بجا رہا ہے اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں مختلف نغموں کا مرکب ہے۔ ایسے نغمے جو مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں رنج و مسرت، انبساط و حسرت، آشنائیاں، شک، وسوسے، امید و بیم، اعتراف غم۔ ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں، اسی طرح غم کی گھٹائیں بھی اکثر بہجت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور دیرپا نہیں ہوتا۔ یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں — سمفنی میں اسی لئے اتار چڑھاؤ آتے ہیں اور کئی کئی گتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیئے جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا اسے یہ نغمے نہایت دلکش معلوم ہوئے، اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے درباری کی تشریح کی کہ جیسے ایک بہت بڑا ہال ہے، سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ قندیلیں روشن ہیں، فانوس جگمگا رہے ہیں دو رویہ امراء اور وزراء بیٹھے ہیں پرہول خاموشی طاری ہے موسیقار کو بلایا جاتا ہے ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی میں شمار ہوگی غمگین موسیقی بھی موزوں نہیں بلکہ چھچھلی چیزوں سے بھی موسیقار گریز کرے گا۔ وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے — ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر وہ جو چیز چنے گا وہ درباری ہے۔

جینی سنتی رہی۔ پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں جو اس نے خود بنائی تھیں اسے مصوری کا شوق ضرور تھا لیکن یونہی معمولی سا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات برش کے ذریعے کاغذ پر منتقل کئے تھے وہ تاثرات جو مختلف راگنیاں سن کر اس نے محسوس کئے تھے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ جوگیا کی تصویر میں تاحد افق ننھے منھے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول جن میں کلیاں بھی شامل تھیں اور ادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔ پتیوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں، اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں — جن سے نورانی شعاعیں منعکس تھیں۔ پودوں کے رسائے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں — سب اس امر کے شاہد تھے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھند پھیل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی نوزائیدہ دھند جس نے فضا میں رنگ و بو کے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر مالکوس کی تھی، اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردوں سے کھیلتے ہوئے دکھایا تھا سفید اور سیاہ پردوں کی قطاریں لہروں پر تیر رہی تھیں کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی تو سامنے پردوں کو یک لخت بلند کر دیتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کے کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھایانٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے شوخ نغمے مرتعش تھے چنچل رقاصائیں گھنگھرو باندھے ناچ رہی تھیں ہر جنبش میں بلا کا لوچ تھا مخمور کر دینے والی مستی تھی۔

جینی انکار کرتی رہی لیکن میں نے ان تصویروں کو نمائش میں رکھوا دیا۔ ایک روز ہم نمائش میں تھے کسی نے یونہی جینی کا نام لے دیا۔ چند لمحوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا یہ سب جینی کے مداح تھے جو اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی بہت بھیڑ ہو رہی تھی ایک سکھ پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا کچھ ایسا ہی نام تھا لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آئے تھے اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں وہ اس قدر مشہور ہو رہا تھا وہاں اس کے حریف کو جو مقامی پہلوان تھا کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی، غل مچ گیا۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر دفعتاً مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے جو اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اس پر اشتہاروں اور کاغذوں کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تنہا چھوڑ دیا۔ سانگ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا جینی مسکراتی ہوئی گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا معطر رومال دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دلکش باتوں نے اسے موہ لیا، ان باتوں میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کو اپنی زبوں حالت کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکٹھے گزاری۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈٹے کے والدین آ گئے، وہ ہوسٹل سے چلا گیا۔ اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا۔ جینی کو ان کے گھر بلایا گیا لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز ڈٹے جینی سے ملا اور جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے آخیر تک ساری کہانی سنا دی سب کچھ بتا دیا۔ ڈٹے اس پر برس پڑا یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں۔ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہوں گے۔ اب اسے کیوں کر یقین آ سکتا ہے کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا، کھیل تھا، اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہیئے۔

میں نے سنا تو ڈٹے کو سمجھایا کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی ڈٹے بنگال سے آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈٹے پر اتنی دور کیوں کر عاشق ہو سکتی تھی اور وہ بھی بلا دیکھے بھالے۔ اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ کئی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے باز پرس نہ کی لیکن ڈٹے نہیں مانا اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چہلیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر صرف اسی کو چاہتی رہے گی اس کی منتظر رہے گی بچپن ہی سے اسے الہام ہو جائے گا کہ فلاں مرد آج سے اتنے سال بعد اسے چاہنے آئے گا، جو خود ہرجائی ہو گا اور چاہنے سے پہلے لڑکی کی گزشتہ زندگی کو اچھی طرح کرید کر اپنی تسلی کرے گا۔

جینی نے اسے سارے وعدے یاد دلائے جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کئے تھے وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ تو جیسے کسی بہانے کی تلاش میں تھا دیکھتے دیکھتے جینی میں بلے تمام نقص نکل آئے نہ اس کا کوئی خاندان تھا نہ مذہب۔ سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے والدین کے زیر سایہ ہوئی جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی جن میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غریب بھی تھے۔ اور پھر جینی کچھ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈٹے کو مل سکتی تھیں ایک حسین اور بہتر لڑکی تو ڈٹے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد راجے بہادر تھے لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائداد دے رہے تھے۔ انہوں نے ڈٹے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ میرے نام دعوتی رقعہ آیا۔ میں خاموش رہا جب جینی کے نام رقعہ بھیجا گیا تو مجھے بہت غصہ آیا طیش میں آکر میں نے کئی منصوبے باندھے۔ سب سے پہلا منصوبہ ڈٹے کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے جینی شادی کا تحفہ لے گئی اور سب کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈٹے کی بیوی کے لئے سنہرا ہار تھا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پڑا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈٹے کی بیوی سے ہوا، معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو آرٹ سے۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے زہر دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی جو اس قسم کی فضولیات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ بھلا ستار یا وائلن سیکھنے کی کیا ضرورت ہے جب صبح سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے کی کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اگر کسی نے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ شعر گھڑ لئے تو اس پہ اتنا بہکنے یا بے قابو ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا۔ مصروفیتوں نے آن دبوچا۔ ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ مدتوں تک میں نے جینی کے متعلق نہیں سنا۔

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جینی کا ذکر کیا تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ

محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک معاشقہ ختم ہوا ہے تو دوسرا عنقریب شروع ہو گا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی بالکل آزادانہ طور پر رہتی ہے ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ہر قسم کے لوگ آتے ہیں نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افواہیں اڑتی ہیں، لوگ پھبتیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا دیکھا، میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چپکا ہے وہ جینی کا ہے۔ یہ تصویر جینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جینی کے ہونٹوں کی ہے۔

پچھلے سال سیلاب آیا۔ لوگ بے گھر ہو گئے، قحط پڑا۔ جینی نے کچھ لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لیا گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی، امیروں سے فنڈ کے لیے چندہ اکٹھا کیا، اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا، رات دن محنت کی کئی مرتبہ بیمار ہوئی کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جینی کی وجہ سے محتاجوں کی امداد پہ تیار ہو گئے۔ اسے چھیڑا، تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے اسے شراب پلانی چاہی جینی نے گروہ کے سرغنے کے بال نوچ لئے اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دیا۔ وہ گھبرائے کہ اسی وقت جینی کو واپس چھوڑ گئے

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نکلوا دی۔ اس کی تعریف بھی شامل تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تبادلے نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے جاتا سچ مچ اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی پہلے سے کہیں زیادہ نازک اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پہ تازگی تھی نکھار تھا، ہونٹوں میں رسیلا پن اور رخساروں پر سرخی آ چکی تھی۔ اب وہ اک شعلہ فروزاں تھی۔ وہ طرح طرح سے بناؤ سنگار کرتی شوخ بھڑکیلے لباس پہنتی، چمک دمک کرتے ہوئے زیور، قسم قسم کی خوشبوئیں۔ وہ ہر موضوع پہ بلا دھڑک گفتگو کر سکتی تھی۔ کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ہفتے بھر کی شامیں پہلے ہی مختلف مصروفیتوں کے لئے وقف ہو جاتیں پرانی سیدھی سادی جینی کی جگہ اس شوخ و شنگ لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ جل سا گیا یہ جذبہ محض حسد و رشک کا جذبہ تھا شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ ہرا دے۔ تاش کھیلتے وقت مجھ بغلیں جھانکنے لگوں۔ رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے، اور اس کے لئے بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی ہے جن کا مجھے شوق تو ہے لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہے۔

شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رویا کرتے کہ کس طرح قدرت نے ان کو نہایت بدمذاق اور پھوہڑ طبیعت کی رفیقہ پلے باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن اس سیاہ خانے میں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے ——— وہ ہے جینی۔

پُر مغز اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پہ بحث کرتے۔ کارل مارکس فرائیڈ اور مولانا روم کے تذکرے چھیڑتے، سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے، مشاہیر پہ تنقیدیں کرتے، بے لوث اور سچی دوستی کا دم بھرتے لیکن موقعہ پا کر عشق بھی جتا دیتے۔

ایک طبقہ نفاست پسند اور نازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے رہتے، اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور کمتر سمجھتے۔ بار بار جینی سے پوچھتے ——— اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی، جگری اور روحانی صدمہ پہنچے گا ——— مگر ہر شام کو آ دھمکتے۔

کئی ایسے شرمیلے بھی تھے جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جینی پر نظمیں کہہ کر اسے بدنام کرتے، سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو اپنے آپ کو جینی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبودگی کے خواہاں رہتے

لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشا دیکھ کر غصہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے یہ سب کے سب تو اسے پسند آنے سے رہے، سارے ہجوم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے۔ میرا ارادہ بھی ہوا کہ اسے ٹوکوں پھر سوچا کہ بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں، دیکھا جائے تو میں خود اسی ہجوم میں سے ایک ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جا رہی ہے یہ شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کا دراصل کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت، نفرت، زندگی، موت، انسان، خدا — سب سے منکر تھا۔ بات بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب اس سے کتراتے تھے، اسے کامریڈ کے نام سے پکارا جاتا۔ محض جینی کی وجہ سے میں اس سے ملتا ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت شاید اس دن پیدا ہوئی، جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی کامریڈ عورتوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتا۔ نکتہ چینیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ان گنت مجبوریاں جتلائیں۔ لڑکی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے لڑکوں کے مقابلے میں اس کی پرورش میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ بھائی اسے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصہ چھین لیتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا بڑی ہونے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے دوپٹے کا ذرا سر سے اتر جانا خاندان کی ناک پر اثر انداز ہوتا ہے ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے مجرم بنا دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے مساوات اور آزادی کے سبق دیئے جاتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا۔ اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو چند خشک مزاج بزرگ چاہتے ہیں۔ لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں محبت کا واسطہ دلا کر سب کچھ منوا لیتے ہیں —— پھر چند خاندانی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار سکتے ہیں اور سلیٹ کی طرح بار بار سب کچھ دھل جاتا ہے۔ ان کا ماضی کوئی معنے ہی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے شادی نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش معاشی بے بسی، ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ شوہر سیدھا ہو بانسے پر اولاد بے مصرف سمجھتی ہے، مذاق اڑاتی ہے ——

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ ویسے عورت اور مرد برابر ہیں لیکن مرد کا رتبہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔ اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور وزن کا ذکر بھی کیا۔ مرد کے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا، وہ رہتا کہاں تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی کہاں اور کیسے گزری بس یہ مشہور تھا کہ وہ جینی کا دلدادہ ہے۔ جینی ان دنوں بڑی عجیب قسم کی کتابیں پڑھتی۔ مشکل مضامین کی بے حد خشک اور سنجیدہ کتابیں۔ جب وہ دونوں باتیں کرتے تو بہت کم لوگ سمجھ سکتے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا جینی کی باتیں اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں کہ وہ دماغی ارتقاء کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم ایک تاج پہنچ گئے، اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن جب جینی نے ایک خاص زاویے سے ہمیں دیکھنے کو کہا تو یوں معلوم ہوا جیسے اس تاج اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ کامریڈ اچھل پڑا بولا صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ اس زاویے کو ڈھونڈ سکتی تھی۔ جب قصے کہانیاں ہو رہی تھیں تو ایک لڑکا اپنا رومان سنانے لگا۔ اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی، اشارے ہوتے، پتھروں سے لپٹے ہوئے خطوط آتے، عہد و پیمان

ہوتے۔ لیکن وہ فاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔ نہ وہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔ تنگ آکر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا۔ کئی دنوں کے بعد گیا تو لڑکی نے بڑی منت سماجت کی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دو گی تو آئندہ کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ رضامند ہوگئی بار بار یہی کہتی ——— آپ وعدہ کیجئے کہ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تو مانی۔ وہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نقص تھا، وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے ہنستے لوگ دوہرے ہوگئے لیکن جینی خاموش رہی اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں دیر تک وہ چپ چاپ رہی مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ انگیز نہیں تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے سب نے کچھ مانگا جب جینی کی باری آئی تو اس نے کہا کہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی بس مجھے ایک زندگی ملی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ عش عش کر اٹھا۔ کہنے لگا جینی کا یہ نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کے لئے دعا مانگتے ہیں اس سے بہتر نظریہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں۔ ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے اپنے حالات سے مجبور ہے زندگی کے اٹل ارادے، شدید جذبے سب حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لئے ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اتفاق نے ہمیں ملا دیا۔ اسی طرح محض اتفاق سے ہم ان لوگوں کی رفاقت سے محروم ہیں جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے۔

پھر ایک روز وہی کامریڈ جو افلاطونی دوستی اور خلوص کے گن گایا کرتا تھا جینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی، پکچر دیکھی، چھوٹے موٹے تحفے خریدے جب ٹیکسی میں دونوں واپس آ رہے تھے تو اس نے جینی کو چومنے کی کوشش کی۔ جینی نے ٹیکسی ٹھہرالی جتنے روپے کامریڈ نے اس شام صرف کئے تھے اس کے منہ پر مارے اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا پھر معافی مانگنے آیا جینی نے کہا کہ مجھے طیش نہیں آیا مایوسی ہوئی ہے۔ میں تمہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی میرا خیال تھا کہ تم اس ہجوم میں سے نہیں ہو لیکن تم میں اور ایک عام انسان میں فرق نہیں۔

کامریڈ نادم تھا، بولا ”——— میرے نظریے خواہ کیسے ہوں میں انسان بھی ہوں۔ تم میں اتنی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا تمہاری بے چین روح کو دیکھا ہے اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔ اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے اور تم زیادہ خوبصورت ہوتیں تو تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔ اگر تم کسی بہتر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں تو تمہاری زندگی مقابلتاً آسان ہوتی۔ لیکن تم اتنی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوتیں تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی۔“

جینی عورت تھی، کامریڈ کے رنگین فقروں نے اسے موہ لیا اس کی آنکھیں جھک گئیں دل دھڑکنے لگا رخسار سرخ ہوگئے۔ جب کامریڈ نے بازو پھیلائے تو جینی نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا ”محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں بلکہ دونوں کے ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے محبت میں اگر رفاقت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے“ ——— اسی قسم کی باتیں بار بار دوہراتا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوتا اس کی چند چیزیں مجھے پسند تھیں اس کی صحرا نوردیاں بے چین طبیعت، سیلانی پن ——— لیکن اس کے شکست خوردہ نظریے، بلاوجہ کا حزن، تلخ خیالات برے معلوم ہوتے۔ وہ قنوطی تھا اور اذیت پسند اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا مصیبت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ راستہ کترا جاتا اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح سرگرداں رہے گا، اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔

میرا تبادلہ ہوا تو جینی مجھے چھوڑنے سٹیشن پر آئی۔ جدا ہوتے وقت میں نے رومال مانگا۔ پوچھنے لگی رومال سے کیا کرو گے؟" کہا رومال تمہاری شخصیت کی مسکراہٹ کی یاد دلاتا رہے گا۔" بولی "تم ہر مرتبہ رومال ہی کیوں مانگتے ہو؟" بتایا کہ اس کی خوشبو اور نمی سے سرخ دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جینی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا۔ جینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ چلتے وقت اس نے جینی سے کہا کہ بے سروسامانی اس کی تقدیر میں ہے۔ اس کی منزل مفقود ہے۔ وہ جینی سے محبت کرتا رہے گا۔ اس کی تصویر دل سے لگا کر رکھے گا، دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھ دیا کرے گا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا — اور بس!

جینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا۔ جو کچھ اس کے پاس تھا فروخت کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں۔ جب وہ واپس آئی تو طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جینی کے والد نے جو اب تنہا رہتا تھا اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن جینی وہ شہر چھوڑ کر کہیں نکل گئی۔

کیزی سے میں سمندر پار ملا۔ وہ ہندوستانی تھا۔ لوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اسے کریزی کہتے، اسی سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑوں میں ایک کیمپ میں ہوئی۔ ہم نے قصبے سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ خیمے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی وجہ ایک روسی لڑکی تھی۔ کیزی نے فوراً اسے ڈوئیل کی دعوت دی۔ اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں اور روسی سے کہا ہم اسے باری باری اپنے ذہن سے چھوا کر چلائیں گے۔ اس میں صرف دو گولیاں ہیں۔ جس کی قسمت میں گولی لکھی ہوگی اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پیچھے ہٹتے ہٹتے فوراً راضی ہو گیا۔ پہلا فائر کیزی نے اپنے آپ پر کیا، وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا، کچھ نہ ہوا۔ کیزی تیسرا فائر کرنے لگا تو ہم نے بڑی مشکل سے انہیں علیحدہ کیا۔ روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں۔ اس نے یونہی لبلبی دبا دی۔ دھماکا ہوا۔ گولی خیمے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہوا، وہ ہمارے کیمپ میں آ گیا۔ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی، ہم دونوں گئے۔ نہایت دلچسپ پروگرام تھا۔ آغا نے کیزی کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا۔ کیزی اس سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ محفل گرم ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک گھڑی دیکھ کر کیزی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دور کیمپ میں اس نے ایک لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردیوں کی اندھیری رات تھی۔ کیمپ وہاں سے سو میل کے لگ بھگ تھا۔ ہمیں سب نے منع کیا۔ کیزی کا وعدہ تھا۔ کیونکر پورا نہ ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی پیچیدہ و دشوار گزار سڑک برف سے سفید ہو چکی تھی۔ ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اڑ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دعوت ختم ہو چکی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ لڑکی منتظر تھی۔ کیزی نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا۔ مہینوں سے مجھے کسی دوست یا عزیز کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی۔ اسے یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں۔ ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ کیزی ایک دو بار ہمارے پاس آیا لیکن جلد اٹھ کر چلا گیا۔ جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا — "میں کیمپ میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا۔"

"اور یہ لڑکی" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ اب تمہاری ہے — میں یاروں کا یار ہوں۔ میں تمہارے چہروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں اس روشنی کی چمک بھی دیکھی ہے جو پہلی ملاقات پر پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں لیکن تم بھی میرے دوست ہو —"

اس کی شخصیت عجیب تھی۔ نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کسی مصیبت کا ڈر۔ وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد یہ سوچتا کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہئے

تھا۔ اس کے مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ گھبراتا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا۔ اسے سکون سے نفرت تھی اس سے لڑو اس سے جھگڑو مجاذ سے واپس آیا ہے تو ڈوئل لڑ رہا ہے جوئے میں آج ہزاروں جیتے تو کل سب ہار دیئے۔

سب اس کے کامیاب معاشقوں پر رشک کرتے، اس کامیابی کا راز پوچھتے وہ برملا کہتا یہ تو کچھ بھی نہیں، ہزاروں محبتیں ایسی بھی تھیں جو ادھوری رہ گئیں، جو کبھی نہ پنپ سکیں۔ جنہوں نے بار بار میرا دل توڑا۔

ہوارت قریب ایک چھوٹا سا خوش نما قصبہ تھا ــ گلشن ــ آس پاس کے باشندوں میں کیزی شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا موت کی سزا یقینی تھی، لیکن عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک نئی زندگی سمجھے گا جو اسے تحفتاً ملی ہے۔ اس زندگی کا گزشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں وہ ہمیشہ مسرور رہے گا، آزاد رہے گا۔ جو چیز ناپسند ہوگی اسے فنا کر دے گا، جو بھا گئی اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا

اس کا پیار آندھی کی طرح اٹھا، آناً فاناً میں چھا گیا اور طوفان کی طرح اتر گیا۔

وہ چھٹی پر ہندوستان آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام بنا، اسے ملنے گیا، وہ نہیں ملی مگر وہاں ایک اور لڑکی سے ملاقات ہو گئی ــ یہ لڑکی جینی تھی جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ کیزی نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا جتنے دن وہ وہاں رہا اسے نعم البدل سمجھتا رہا اس نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی اپنی دلچسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے جینی پر جادو کر دیا۔ پھر گیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیر نے گئے تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو قسمیں پلائیں عمر بھر یاد رکھنا اور وفادار رہنے کا حلف اٹھایا، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیمان کئے یہ سب کچھ اس قدر پرخلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی، جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دیتا جب دیر تک تنہا رہنا پڑتا، کوئی بری خبر سننے میں آتی، اداسیاں عود کر آتیں تو اسے جینی کی معصومیت، اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک خیمے میں بیٹھے رہتے باہر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں کو یاد کر کے شرمندہ ہوتا، اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا بار بار کہتا کہ جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی جو اس کی زندگی میں آئیں اگر اس کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ جینی سے ضرور شادی کرتا۔ وہ نہایت غیر معمولی لڑکی تھی، اسے کسی نے سمجھا نہیں ــ کسی کی نگاہیں اس کے خد و خال سے آگے نہیں پہنچیں، اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا۔ اس میں کسی معصوم کی روح تھی کسی عظیم شاعر اور بت تراش کی روح، اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ ان کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بلا کی معصومیت تھی اس میں سیتا کا تقدس تھا۔ مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ صرف ایک ایک مرد سے محبت کی ــ ایک مرد جسے اس نے کلبلاتے رینگتے ہجوم سے چنا اور دوسروں سے مختلف سمجھا، لیکن اس مرد نے اسے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ اس کی مسکراہٹ کیسی تھی ــ بالکل مونا لیزا کی مسکراہٹ، معصوم، اتھاہ اور پراسرار، اس کی مسکراہٹ کے سامنے کیزی جیسا انسان بھی کانپ اٹھا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتا اور اگلی صبح اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل کے فاصلے سے واپس ملک میں آیا

زہر دو بیچ دیا گیا اس عرصے میں کبھی کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا خیال آجاتا تو میں یہی سوچتا کہ غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے کٹھن لمحوں کے بعد مجھے مختصر سی چھٹی ملی، میں قریب کی پہاڑیوں پر چلا گیا وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا دور دور تک چائے کے باغات تھے اور مالدار سوداگروں کی آبادیاں۔ جہاں میں مقیم تھا وہاں خوب رونق تھی میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے چند ہی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ باوجود اتنی چہل پہل اور شور شغب کے وہ احساس تنہائی کم نہیں ہوا جو مجھے پیچھا کرا رہا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا کہ مجھے جینی مل گئی ایسے دور دراز خطے میں اسے پاکر مجھے از حد مسرت ہوئی اس مرتبہ تو وہ پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوتی اس کی باتوں میں حزن کی آمیزش تھی اس کے چہرے پر پژمردگی تھی، لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجیب جاذبیت تھی جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں دلفریب معلوم ہو رہی تھی، اس مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی جو چائے کے سوداگر تھے وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کلب، رقص، پارٹیاں، بے حد دعوتیں دینے والی تھیں، وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا، اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم جو تنہا رہتا جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں کام سے وقت کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ دونوں پڑھتے بحث کرتے، الجھتے، اب ہم تینوں ساتھی ہو گئے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا۔ واپس آکر میں نے تبادلہ کرا لیا اور جینی کے پاس چلا گیا ہم جنگلوں میں نکل جاتے، سیریں کرتے، کتابیں پڑھتے۔ بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے، میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا اتنی ہی نئی خوبیاں پاتا وہ بہترین رفیق تھی اکثر مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اسے پہلے کبھی نہیں ملا اس کی بے پناہ جاذبیت سے اکتاہٹ نہیں ہوا ہم رقص پر جاتے تو وہ سارا وقت مجھے رہتی، میری جانب متوجہ رہتی اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہتیں، مجھے اس پر فخر ہونے لگتا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی لیکن ہمارے خیالات ہم آہنگ ہو جاتے، دل میں طمانیت ہوتی، خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب رکھا غالباً دوستی کا جذبہ۔ یہ قرب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ذرا سی جدائی شاق گزرنے لگتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی، یہ نظمیں جینی نے لکھی تھیں، یہ نظمیں کس قدر حزنیہ تھیں کتنی کرب انگیز اور دردناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں یہ اس کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں معلوم ہوتیں جسے میں جانتا ہوں دلیر اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر کو ہم سیر سے واپس آرہے تھے ابارش شروع ہو گئی بچنے کو درختوں کے نیچے چھپتے رہے جب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تو بھاگ کر ایک شکستہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں نے اپنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پر بچھا دیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نظموں کی باتیں کرنے لگا یونہی تنگ کرنے کو کہا کہ پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پر نہ آتا تھا اب ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں کہیں اسے کوئی شاعر تو پسند نہیں آگیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے معافی مانگی شاید میں نے کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی تھی یا تلخ یادیں تازہ کرا دی تھیں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوبارہ معافی مانگی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ جب وہ میرے شانے سے سر لگائے بیٹھی تھی، تو ایسی ننھی منی بچی معلوم ہو رہی تھی جو راستہ بھول گئی ہو، بالکل بے یار و مددگار۔ جو سہارے کی طالب ہو۔ میں نے اس کے آنسو خشک کئے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اسے پیار کیا۔ ان کانپتے ہوئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی ان رخساروں پر وہی جلا تھی، یہ وہی سب کچھ تھا جسے میں نے پہلی بار جینی کے ساتھ مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ایسی بھی رہ گئی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی یہ کہانی اس نے خود سنائی۔ یہ ایک شاعر کے متعلق تھی، جو شرابی تھا، جواری تھا، مفلس تھا، بھوکا تھا، اپنی خودداری اور انفرادیت کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس کی بجائے غصہ آتا۔ جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی ——— ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی۔ سفارشیں کر کر کے اس کا کلام چھپوایا۔ ادھر ادھر متعارف کرایا۔ اس کی حوصلہ افزائی کی کہ شاید یہ اسی طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے اور وہ بیش بہا خزانہ جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا جینی غیر شعوری طور پر اس کے قریب ہوتی گئی۔ پھر اسی جذبے نے ایک اور شکل اختیار کی۔ جینی کو خود علم نہیں تھا کہ جسے وہ محض جذبۂ ترحم سمجھ رہی ہے ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ جینی نے ایک آوارہ و بے خانماں کو پناہ دی۔ اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو ہرگز اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ اسے جینی کی گزشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں اب تو اسے اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا۔ اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا نہیں اس سے پہلے وہ کیوں کر جیتا رہا لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا ——— تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں۔ محبت کا قلزم رواں ہے، تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر کائنات کا تسلسل قائم ہے، زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ جذبات جس دن فنا ہو گئے انسانیت فنا ہو جائے گی دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی یہاں کچھ بھی نہ رہے گا۔

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے۔ کبھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے کاش کہ وہ تندرست ہوتا تب کسی روز وہ دونوں شادی کر لیتے زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی۔ کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں۔ تب وہ سب اذیتیں بھول جاتیں جو دنیا کے جہنم میں اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ یونہی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے سینی ٹوریم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی، رات کو ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی وقت گزرتا گیا ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے ——— یہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ بعد میں ملا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی، یونہی کسی نے اڑا دی ہوگی، وہ وہاں رات دن ایسے ماحول میں رہ رہ کر تنگ آ گیا ہوگا اسے تفریح بھی تو چاہئے کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب وہ اس سے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی تحائف لے جاتی ان دونوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہیں کیا لیکن یہ افواہ محض افواہ نہیں رہی۔ شاعر سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر آیا تو اس نے شادی کر لی۔ نرس کے ساتھ۔ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی اسے روپے دیتی رہی۔ آخر نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسی لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے۔ شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا اپنے کارنامے سناتا جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے لے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے خلوص پر میرا ایمان ہے۔ میں انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں، شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں جن میں خلوص کارفرما ہو خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے ہمیشہ صادق رہتے ہیں۔ اس لئے وہ مدوجزر جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے تم سچی تھیں۔ تمہارے جذبات سچے تھے میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور رونا بند کر دیا وہ ہر وقت میری منتظر رہتی لیکن اب وہ مجبور نہیں تھی اب اسے ماضی یا

حال کا اتنا خیال نہیں رہا تھا جتنا مستقبل کا ۔ وہ تنہا اور اداس تھی ۔ کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے دیکھا ۔ ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا ۔ وہ عجیب باتیں کرنے لگی " کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اسی طرح سو جاؤں گی ۔ وہ خاموشی کتنی سہانی ہوگی ! موت کے بعد اگرچہ محض خلا ہوگا دن وہ نہ تاریکی ہوگی لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہیں ہوگی ۔ " پھر نظم کا ایک بند اس نے کئی بار دہرایا ۔ " میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں جنہیں ہر صبح نہایت قلیل روشنی ملتی ہے ۔ امید کی ننھی سی بجلی کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں ۔ جس روز یہ روشنی نہ ملی کسی ان ظلمتوں میں کھو جاؤں گا ۔ "

میں نے غمگین اور خوش نما چیزوں کی باتیں کر کے موضوع بدلنا چاہا لیکن وہ بولی ۔۔ " کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں کس قدر غمگین ہوں ، کس قدر دل شکستہ ہوں ، اگر اب مجھے سہارا نہ ملا تو میرے خواب خام ہو جائیں گے اصول ختم ہو جائیں گے میں گم ہو جاؤں گی ۔۔ "

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے بارہا اپنے متعلق سنی تھیں وہ کہنے لگی ۔ " تم مجھے جانتے ہو ، سمجھتے ہو ۔ میں بھی تمہاری بیتاب روح سے آشنا ہوں ۔ تمہارے ان گنت مشغلوں طرح طرح کے خوابوں کا مجھے احساس ہے ۔ میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں ، بالکل ذرا سا سہارا اپنی زندگی کا قلیل سا حصہ مجھے دے دو ، میں ہمیشہ قانع رہوں گی ، میں کبھی تم پر بار نہیں ہوں گی تم میرا ساتھ نہ دینا میں تمہارے ساتھ چلوں گی ۔ "

میں اس اشارے کو سمجھ گیا ، پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے ایسی باتیں کی تھیں ۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ عورت اور مرد کی دوستی نہایت محدود ہے اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عاید ہیں ۔ یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں آخر ایک مقام آتا ہے جہاں فیصلہ کرنا پڑتا ہے ۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا ۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو میں بزدل ثابت ہوا ۔ میں خاموش ہو گیا ۔ خاموش ہو کر میں اس گروہ میں شامل ہو گیا جو جینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا وہ گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا ۔ جینی سمجھ گئی ، پھر اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا اگرچہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا لیکن طے پایا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں پرانے دوستوں کی طرح رہیں ۔

میں نے تبادلے کے لئے کہا تو مجھے دوسری جگہ بھیج دیا گیا ۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے آئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے دیکھا ان آنسوؤں کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی ۔ میں نے رومال مانگا ، اس نے بالکل بچوں کی سی شوخی سے پوچھا کہ رومال لے کر کیا کرو گے ؟ میں نے کہا کہ اسے یادگار کے طور پر رکھوں گا ۔

" اور میرے آنسو کیوں کر خشک ہوں گے ۔۔ ؟ " اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے پوچھا ۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی ۔

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا تھا وہ نہیں ملا ۔ پھر یک لخت معلوم ہوا کہ موسیقی ختم ہو چکی تھی رقص ختم ہو چکا تھا لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے ۔ میں اور جی بی بھی چلے گئے ۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی ۔ اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا ۔

مجھے یونہی خیال سا آیا کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں ۔ میں اس سے دور دور رہا ۔ نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا اس سے رومال بھی تو نہیں مانگا ۔ نہ جانے کیوں ، میں اس گوشے میں چلا گیا جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے رہے تھے ۔ میں نے دیکھا کہ میز کے نیچے ایک مسلا ہوا رومال پڑا تھا جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آ چکا تھا ۔ میں نے اسے اٹھایا جیسے ڈرا ہوا تھا ، وہی جانی پہچانی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی ۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا ؟ جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی ، یا یونہی اتفاق سے رہ گیا ۔

دیر تک میں اس رومال کو لئے وہیں کھڑا رہا ۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے سرخ دل کو دیکھتا رہا جو اب تک خمار آگیں خوشبو میں بسا ہوا تھا ۔

جینی کا دل ۔۔ عورت کا دل ۔

سہیل عظیم آبادی

الاؤ

گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت۔ اُتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے اس کے بیچ میں کئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک کنواں اور اس کے بعد پھر کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر پر سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ ہر جا ہی پرجا ——— راجہ کو مرے، برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا، اس کا راج محل تو میدان ہے۔ یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ روکھ پیڑ نے کو کولھو بٹھاتے اور کولھوسار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کارتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کئی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ جگوا پورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی نیچے کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگوا نے ، تمی سیدھی کرنے کو لاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر پھر پیپل کی جھیڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کرتا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سُروں میں گُنگناتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہیئے۔ ٹھیک ویسی ہی، یا اس سے بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

بھگوا اپنے خیالوں میں گُم تھا کہ اکلو آ گیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناطے میں بھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا:

"بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گڑا سا لگے تب۔"

بھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور بولا:

"ہاں چچا! پر گڑ اسا اچھا سا مل جائے تب نا۔"

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا کر کے دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ سامو اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آ گئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا:

"ارے بھیّا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے؟"

اکلو بولا:

"بھگوا اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی۔"

باڑھو بولا:

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ سانول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سُن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا:

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھے بھی آگ تاپنے، واہ!"

باڑھو بولا:

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا۔"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا:

"اب یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے۔"

سانول نے کہا:

"کیا چچا! ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی۔"

باڑھو بولا:

"نہیں۔ تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے۔ کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھو ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھبی، اور چھیدو کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح

بھک بھک کھینچ کر دھواں اڑا رہے ہیں۔ ٹرانسٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائے گا۔"

اتنے میں چھپی آگیا اور بادھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی لیکن چھپی نے کہا:

"بھیا۔ اب او بھاناہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک دفعہ کا قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دکھا رتیا، گلو کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے جانے دو رتیا' تو رتیا کہتا ہے ایسے نہیں بھوجی۔ ویسے کہو۔ ع

موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر بھئی

یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی اچھال دوں گی تو راستے سے بھاگا۔"

"بچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ——— جانتے ہی ہو رتیا کیسا ہنسوڑ ہے۔"

لیکن چھپی نے بزرگانہ انداز میں کہا:

"ہش! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ ہو تو ہم نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

سانول چپ ہو گیا اور بادھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا لیکن سامیر نے بیچ ہی میں روک کر کہا:

"ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں۔ سنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی۔"

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کاٹھ کے الو ہیں۔ پھر بولا:

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔"

سانول بولا:

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔"

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی اس لئے بادھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا:

"بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا۔"

بھاگو بولا:

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! دھرمپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے۔"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آگئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کرگھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا لٹھ یا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چپ ہو گئے جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔

"ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی؟"

سانول نے جواب دیا:

"بچاگو دھر پور گیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی۔"

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ سب کا منتظر بے کار رہا۔ بچاگو نے پھر سے ساری بات دہرا دی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا:

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے۔"

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ جھگو تیلی نے کہا:

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا ———"

چھیٹر دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا:

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا؟ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کرے گا؟"

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا۔ سب کی باتیں سن کر اس کا خون کھول رہا تھا لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آکر اس کے ہونٹوں پر رک جاتی تھی لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا:

"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت۔ چین، جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا:

"ہم لوگوں کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا۔"

سانول نے کہا:

"ٹھیک کہتے ہو دلو ———"

طوفانی میاں نے زہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی چھیٹر اور جھگو اور ایک دو آدمی اٹھ کر چلے گئے اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پروا نہ ہوئی۔ بلکہ سانول نے کہا:

"ظلم پر ظلم ہے، پرسوں ہی کی بات ہے، میگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے میگھو کی عورت اگہران کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل میگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔"

دلو نے رائے پیش کی اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پروا ہو کر یہی فیصلہ کیا

کہ پٹواری جی کو رسید انہ نہ دیا جائے۔ وہ باڑ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں، وہ بھی بند اور بیگار بھی آخری طور پر ختم ——"

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔ ساؤل نے کہا:

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا:

"پکا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں پلٹتا۔"

پھاگو نے کہا —— "بالکل ٹھیک۔"

پھر سیتل بولا:

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کر دے گی۔"

سیتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی برائیاں وہ سن چکا تھا اس نے کہا:

"دلو بھائی —— کانگریس —— مولانا صاحب تو کہتے تھے ——"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا:

"دھت۔ یہ سب بکتے ہیں۔ گریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہو۔"

یہ کہتے ہوئے دلو اٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اٹھتے ہی سب کے سب اٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے "آج سبھا ہوگی۔" بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجہ پر غور کر رہے تھے کہ بھس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر جھتوں اور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے لگان باقی نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جاسکے گا —— اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے۔ مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے اور سب سے کہا یہ سب کا حشر طوطا رام اور اندر جھتوں کا ہوگا۔ تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔"

صبح اٹھ کر ساؤل منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آکر کہا:

"ساؤل بھائی! تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے۔"

ساؤل کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا، پھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ پھاگو نے ساؤل کو دیکھتے ہی کہا:

"بھیا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص

حکم لے کر آئے ہیں —— کیا رائے ہے ——؟"

سانول نے جواب دیا:

"چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک جھنڈو دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے سانول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا:

"اس سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھچڑ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی۔"

دلو نے کہا:

"غصہ کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا ——"

سانول نے کہا:

"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہیئے۔"

پھاگو نے پوچھا:

"تو اب کیا ہوگا؟"

سانول نے کہا:

"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

سانول چلا گیا۔ دلو اور پھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اس کو غصہ آجاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن پھاگو نے کہا:

"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو سانول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں۔"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا:

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔"

پھاگو بولا:

"پھر بھی ......"

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ سانول تیزی کے ساتھ سامنے سے آرہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ دلو آگیا اور آتے ہی بولا:

"پھاگو لاٹھی تو دے ——"

دلو اور پھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتنا جا رہا تھا —— اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے مگر وہ اس طرف کی دیوار کو جو نیچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جھنڈو اور جھبلی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا اس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ پھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی

خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ بھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا:

"اب کیا ہوگا دلو بھائی؟"

دلو بولا:

"دیکھا جائے گا۔"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آگئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ سانول چلا گیا لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا:

"بولو اب کیا ارادہ ہے؟ اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟"

ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر سانول کو پوچھنے آئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جھبی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جھبی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ جھبی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا:

"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی، ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہیے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے، کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے ——— اور ان کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا۔ ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کی سزا، سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہیے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرے اور بھکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ سانول، دلو اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۲۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور

نہ کچہری کی طرف ——— گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی۔ لیکن آگ جو سلگی تھی، وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔

ساتول صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جیسی آتا ہوا دکھائی پڑا

ساتول ٹھہر گیا۔ جیسی جیسے ہی پاس آیا۔ ساتول بولا:

"تم کو ہم سب سے بیر کا ہے کا جیسی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ تم بھی کسان ہو۔"

جیسی بولا:

"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو۔"

ساتول کو اس کا یہ کہنا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا:

"دیکھو جیسی بھائی، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے ——— اپنی بے عزتی بھی بھول گئے؟"

جیسی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا:

"بیکار باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

ساتول نے کہا:

"یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

لیکن ساتول اس بات کو بھول گیا تھا کہ پھاگو کا باپ گاؤں کا بڑا اہل تھا اور اسی زمانے میں بہت سا کھیت جیسی سے لے کر زمیندار نے پھاگو کے باپ کو دے دیا تھا۔ اس سے اُس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پرانی ہو چکی تھی۔ جیسی نے کہا:

"سنو ساتول! تم بیچ میں نہ پڑو۔ پھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر ......"

"یہ بات بڑی پرانی ہو چکی اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو پھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت دلوا دوں ——— لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے باپ پھاگو نے تو لیا نہیں۔ لیا تو تھا زمیندار ہی نے۔ قصور کس کا ہے؟"

مگر جیسی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اس نے کہا

"ساتول میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ———"

"سب ٹھیک۔ پر یہ تو بتاؤ اس دن تم پیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو کیوں بتایا تھا کہ ساتول پھاگو کے گھر پر ہے۔ میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا۔"

جیسی کھسیا گیا اور اس نے کہا:

"مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں۔"

وہ دو قدم آگے بڑھا لیکن ساتول نے اس کا راستہ روک لیا اور ذرا تیکھا ہو کر بولا:

"سنو جیسی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہوگا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں۔ یہ تمہارے حق میں بڑا بُرا ہوگا۔

جیسی جانتا تھا کہ ساتول غصیل آدمی ہے۔ اس لئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ پھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا۔ وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدے کے لئے

گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ سانول کو جواب دیئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا:

"سانول دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔"

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جیبی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے گھنے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی سانول نے راستہ نہ دیا تو جیبی نے چاہا۔ اس کو ہٹا کر چلا جائے ——— لیکن سانول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیبی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا:

"لڑنا چاہتے ہو کیا؟"

سانول بولا!

"ہم لڑنا نہیں چاہتے لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

جیبی کو غصہ آ چکا تھا اس نے کہا:

"کیا تو اس میں کسی کے باپ کا گیا ———

سانول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جیبی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس نے جیبی کے سر پر دے مارا۔ جیبی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولیس آئی اور سانول گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئیں؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر۔ اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

ایک طرف سانول کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف دلو اور پھاگو اور دوسروں کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آ گیا تو ان سب پر، جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ———

آخر اس طرح کب تک چلتا لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اس لئے چپ رہنا ہی بہتر لیکن چپ رہیں تو کب تک۔ دلو نے پھاگو کو ایک دن بلا کر کہا:

"اب کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔"

پھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اٹھے دوسرے گاؤں میں جلسے کئے جائیں اور اسی پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا، سر جوڑ کر بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ دھنی رام بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش سے کام کر رہا تھا جب سانول کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول پڑا اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آ گیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت،

ہر طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا۔ پھر ایک دو چار پانچ دس، ——— وہ ادھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولس آئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو، پھاگو، جمن، ہر کھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے ان پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے ——— وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ لیکن آئندہ کیا ہوگا، یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھرتا جا رہا تھا لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولس کے سپاہی نظر آتے تھے۔ انہیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پا چکے تھے مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے۔ وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کپڑوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا، ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا:

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا:

"سالے پٹواری کا کیچڑ۔ اوہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت۔"

اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا ———

ممتاز شیریں

آئینہ

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کئے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرے پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اور کیا کہئے بڑا ہی مزہ آرہا تھا ...... بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امی۔ کہیں گی "کچھ کام بھی کرو گی یا پڑی! تم ہو، آئینہ ہے اور بس۔ جب دیکھو آئینہ کے سامنے"..... نہیں آج امی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ ابھی ابھی آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کر دی۔ سیکنڈ ڈویژن! اور میرے گال تمتما رہے تھے..... ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اول آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز...... ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟ .... پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروا نہ تھی۔ بی۔ اے! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا...... گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ پردۂ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو۔ یا کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو کیا خوب کھینچا ہے ...... اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ خوب ستائیں گی "مٹھائی کھلاؤ۔ مٹھائی کھلاؤ" اور یہ کہتی پھرتی تھی نا کہ اس سال ہرگز کامیاب نہ ہوں گی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرا بھر بھی تیاری نہ کی تھی۔ اور وہ کہتی تھیں "آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے" اور مجھ سے شرطوں پہ شرطیں بدھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی بھی دینی پڑے۔ ہاں کیوں نہ آج ہی اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں۔ خوب لطف آئے گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اکتا گیا ہے .... اوہ! امی بھی ادھر آنکلیں "آج میں سہیلیوں کو چائے پر بلاؤں امی؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں بیٹی۔ شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے" آہا! آج امی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زکی کو ضرور بلاؤں گی۔ وہ تو پارٹی کی جان ہو گی پھر۔ اور صرف امی کو معلوم ہے نا کہ ..... اوں .... اں! بڑی شریر ہے وہ تو سب

سے کہہ دے گی ۔ پروین کو ڈبل کنگریجولیشن دو ۔ ایک تو اس کے گریجوٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی انگیجمنٹ (Engagement) پر ۔ اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی ۔ چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی ۔ اور میں بناوٹی غصہ سے یوں منہ بنا لوں گی ..... ارے تو غصہ بھی مجھے بھاتا ہے ۔ منہ پھلائے ہوئے میں بھی میں اچھی لگتی ہوں ۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا ۔

ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نہ ۔ ”غصہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو ۔“ لیکن میں نے آج تک توجہ سے نہ دیکھا تھا ۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے ۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں ، جس پہلو میں چاہو دیکھ لو جس طرح بھی چاہے دیکھ لو .... ہاں تو میں اپنے چہرے پر مصنوعی غصہ پیدا کر دوں گی ۔ گو جی تو یہی چاہتا ہو گا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں ۔ ہاں ، گھنٹوں یونہی چھیڑتی رہیں کیسا لطف آئے گا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں ۔ ایک خاص لذت .... چاء کے اختتام پر زرینہ مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں ؟ .... ہاں وہ فلمی گیت گاؤں گی ۔ وہ گیت ——

ساجنا جمنا پچھے کھیلوں ۔ کھیلوں اکیلی کیسے ؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زرینہ ایسی معنی خیز ۔ ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو گی ..... اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی ساتھ ہی گدگداتی ہوئی ”ایلی ، ایکلی ؟ ہم اتنی سکھیاں جو ہیں ۔ ہونہہ ! ہماری حقیقت ہی کیا ہے ۔ اسے تو اپنا ساجن چاہیئے ۔ اپنا —— نہ ہو تو “..... اُف —— میں —— کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں ۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ میں پھر دیکھا ۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی ۔ میں —— کے سامنے شرماتی ہوئی بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا ۔

”چھوٹی بی بی !“ ”کیا ہے خیرن بی ؟“ ”ایک خبر سنانے آئی تھی ۔“ ”خبر !“ میں نے مڑ کر پوچھا ” ہاں ہاں کہو نا کیا خبر “

” ارے آج تو تم بہت خوش نظر آ رہی ہو ۔ بی بی ! ہاں یاد آیا ۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں ۔ تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو ۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بری خبریں سنا کر رنجیدہ کروں بھی تو ۔ توبہ توبہ رہ جانے دو ۔“

” ارے ٹھہرو خیرن بی ! آخر کچھ معلوم بھی ہو ۔“

” کچھ نہیں بی بی ۔ وہ جو ہمارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا ۔ وہی جو بچپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں ..... ارے توبہ میرے منہ سے نکل ہی گیا نا بابا ۔ بھلی بھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں ۔“

” میری خوشی جائے بھاڑ میں ۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو ۔ اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی ۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے ۔“

” اوئی میرے اللہ میں نے کیا کیا ! بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں تو ؟ جس وقت تم چھوٹی تھیں ۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ نانی بی کا نام تمہارے سامنے نہ لیا کروں ۔“

” امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی ۔ اس کا ذمہ میں لیتی ہوں ۔“

” کل رات نانی بی جاتی رہیں ۔ بیٹی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں ۔“ خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ” مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا ۔“

گویا تصویروں کے سٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی —— اداسی کی جھلک —— اور میں بال گوندھتی ہوئی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی ۔

” نانی بی —— میری بوڑھی انّا وہی جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا ۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے ! کاش میں اپنی انّا کو مرنے

ست پہلے ایک بار دیکھ لیتی ہیں کیا کچھ نہ دے دوں گی۔ پھر اپنی انّا سے صرف ایک بار ملنے کے لئے! میری انّا کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یاد کو۔ ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑ سے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی۔ ایک مایوسی کے ساتھ اس دنیا سے چمٹی ہوئی تھیں۔ غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں! ...... اور تم تو، نانی بی! چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ نہ سکتی تھیں۔ ستائی ہوئی تصور کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذرا سی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں .... ہاں میری انّا تم مصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امّی۔ ابّا کو بھی نہیں۔ تم ان کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی مورت سی ..... اور میری غریب انّا! تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذرا سی بھی کشش رکھتی جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ، پچکے ہوئے گال، روکھے سفید بال، پوپلا منہ، سکڑے ہوئے ہونٹ، بے نور، اندر کو دھنسی ہوئی، چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں —— انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر! تمہاری یہ ہیئت اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔ گویا تم پرانے قصوں کی کوئی جادوگرنی ہو۔ اور امّی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی وہ تمہیں ڈانٹ بتاتیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مدعا طلب رحم ہوتا۔ مگر تمہاری پھیکی سی بے نور آنکھیں اس کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ اور امّی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں کے ذریعہ جادو اتار رہی ہو۔ ابّا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے .... وہی خوف ملی ہوئی نفرت کا جذبہ ...... گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر میری بوڑھی بے بس انّا، میں تمہیں چاہتی تھی، ننھے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی فلاسفر بنا دیا تھا۔ کیوں کہ میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابّا کا علم، ان کی عمر، امّی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ مگر میں گو ننھی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کیوں کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہمدردی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں، کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی۔ ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کر لیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امّی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں۔ طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں منگوا دیا کرتیں۔ مگر میں مچلنے لگتی۔

"اوں یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تو کھوپرے کی مٹھائی پسند ہے۔ نانی بی سے دیں گی۔" امّی بڑبڑانے لگتیں "یہ کمبخت بازار کی سستی مٹھائیاں دلا کر بچی کی صحت خراب کرتی ہے۔" میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو لڑکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگا دیتیں۔ مٹھائی ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ "میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی کھاؤں گی۔" امّی جھلا اٹھتیں۔ "اری پروین! کہاں بھاگ چلی۔ خدایا اس بوڑھی نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے۔" ہاں امّی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ محبت کا جادو، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ میری ننھی پروین، ارے کیا نام ہے تمہارا —— ہونہہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس جمانے میں۔ ہم پرانے جمانے کی بوڑھیاں کیسے بول سکیں۔ یہ جمانا ہی کیا میرا نام بھی بجرگوں نے کچھ ایسا ہی

رکھا ہے۔ جھاڑ را۔ جھرہ۔ مجھے ٹھیک بولنا نہیں آتا۔ میں تمہیں شہزادی پکارا کروں گی۔ چھوٹی شہزادی ہاں تم ایک شہزادی کی طرح خوبصورت ہو۔ ہوں۔ تو میری چھوٹی شہزادی کو کیا چاہیئے" "یہ مٹھائی تم اپنے ہاتھ سے کھلا دو نانی بی" میں اپنی مٹھی کھول کر ننھی سی ہتھیلی پسار دیتی۔ نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ کر مجھے کھلانے لگتیں۔ اور یہ معمولی مٹھائی اس سوکھے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں میں سجے ہوئے گلاب جامن برفی۔ لڈو پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امی سے نانی بی کا نام پوچھا: "نانی بی، اور کیا" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "نہیں امی کچھ ایسا نام ہمارا "زہرہ" اور مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام "زہرہ" ایسا پیارا نام ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے نام کا سا! اور امی مجھے پروین کہہ کر بلاتیں تو مجھے خاک اچھا نہ لگتا۔ اوں ——— امی مجھے شہزادی کہو۔ پروین نہیں" امی سر پیٹ لیتیں" "ارے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے اللہ اس بڑھی نے کچھ کھلا نہ دیا ہو" آخر امی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی اور سے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا برا معلوم ہوتا ہوگا۔ پھر جب نسیمہ اور نسرین پیدا ہوئے تو امی نے یوں انتقام لینا شروع کیا۔ کہ ساری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امی مجھے جھڑک دیتیں تو میرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی۔ "نانی بی میں تم۔۔ تمہاری بیٹی ہوں۔ امی کی نہیں" "روؤ نہیں میری بچی! میری شہزادی کو کس نے رلایا"۔ وہ اپنے لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کو بھر سامنے لا کر میری ٹھوڑی پکڑ کر رونے لگتیں "میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کو کیسے چاہتا ہوگا۔ وہ ان دو چھوٹے بچوں پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہزادی کے سے خوبصورت بھی تو نہیں"

آخر امی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں وہ صرف انتقام کے لئے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی کو ہمارے گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرنا چاہا مگر یہ خیال کر کے کہ مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا۔ اور نانی بی اس سلیقہ سے سب کام سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈر! امی چپ ہو رہتیں۔ مگر آخر یہ ہو کر ہی رہا۔ ایک دن نسرین نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔ اس پر میں نے اسے نوچا۔ وہ تھی ہی امی کی لاڈلی۔ منہ بسورتے ہوئے امی کے پاس دوڑی "ارے کیا ہوا میری بچی کو؟" ——— ہونہہ ان کی بچی کو بھڑ نے کاٹ کھایا تھا۔ امی کا یہ کہنا تھا کہ نسرین نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا "آپا پروین نے میرا منہ۔ نوچ لیا۔ خون نکل آیا ہے۔ اوں۔ اوں۔ اوں" "اُف ری مکار! گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس کیا تھا۔ امی نے مجھے گھسیٹ کر طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا "نہیں امی نسرین نے میری گڑیا توڑ دی ہے" میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امی کہیں سننے والی تھیں۔ میں نانی بی کی بیٹی جو ہوئی "اونہہ! گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا دیں گے۔ گویا تیری موئی گڑیا میری بچی سے زیادہ ہے دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی ہے" اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی مجھے امی سے چھین لینا چاہا "بیگم آخر کیوں لڑکی کو مارے دیتی ہو۔ کیا قصور کیا تھا اس نے اتنی سی جان، ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی" امی کی آنکھوں سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی۔ "دور ہو جاؤ" امی نے مجھے کھینچ کر نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا "تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر۔ میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں"

"نہیں بی بی۔ سوچو تو ننھی سی جان ہے۔۔۔۔ غصہ اترنے پر تمہیں خود رنج ہوگا"

"چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے" امی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشا تڑ تڑ مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں "چلے جاؤ، اس دیوانی کو

"ہٹو۔ جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ میری بچی نہیں۔" امّی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی مشکوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ "میرے اللہ! خدا جانے کیوں کچھ روز سے بیگم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے۔" نانی بی اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آکھڑی ہوئی اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ڈبہ۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ میں بھر لئے اور "نوکرانی کی بیٹی" کہہ کر قہقہہ لگاتی ہوئی زور سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا توڑے۔ میں خود ہی خوب پٹوں اور پھر نسرین میری ہنسی اڑائے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "نانی بی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہارا گھر کہاں ہے، نانی بی؟ میں امّی کے پاس جانے کے لئے کبھی ضد نہ کروں گی۔ تمہاری بیٹی بن کر رہوں گی۔"

"میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن کیوں پڑی رہتی؟" پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ مٹھائی لے آئیں، ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسو کو تھما نہ سکتی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانہ میں ہی نانی بی کے پہلو میں سو گئی۔ دوسری صبح امّی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امّی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روتی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امّی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں یکلخت منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امّی کو تک رہی تھی۔ امّی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگیں۔ "میری بچی مجھ سے ڈرتی ہے کیوں ڈرتی ہو ننھی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ زہرہ بی! (امّی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو! تم کون ہوتی ہو میری بچی کو مجھ سے چھیننے والی؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو۔ کہتی ہو میرا دل بچی سے پھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری طرف سے میں نے اپنی ننھی کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں بھن رہی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان؟"

"بی بی! میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے۔"

"بچی کا دل لگ گیا ہے! شرم نہیں آتی بوڑھے منہ سے جھوٹ بولتے۔ تمہیں اپنے سفید جونڈے کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے ورنہ وہ ایسی کریہہ صورت بڑھیا سے مانوس ہو جاتی! (میں دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی وہ غصہ میں کیسی کیسی باتیں بکے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دن تک یہ سہا ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ! برداشت میں ایک موئی نوکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں! ہونہہ! میں بھی کتنی دیوانی ہوں! ادنیٰ نوکرانی سے دبوں؟" امّی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں "سنتی ہو، کان کھول کر سن لو۔ تم اب ایک لمحہ بھی اب اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ چلی جاؤ اسی وقت۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اٹھو، بوریا بستر باندھو...... بیٹھی کیا تک رہی ہو۔ مجھے پھٹے پھٹے دیدوں سے؟ کیا مجھ پر بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے؟"

"بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آ کر دیکھنے کی اجاجت دو۔ اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلانے کا جریعہ (ذریعہ) ہے بی بی۔ اس کو بھی نہ چھینو۔ خدا واسطے اتنا جلم (ظلم) نہ کرو۔ اللہ میاں تمہیں برکت دے۔ میں نے بہت دنوں تمہارا نمک کھایا ہے۔"

"بچی کو دیکھنے، بچی کو دیکھتے۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دوں گی۔ اگر پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اپنی منحوس صورت

دکھائی! ...... میری بچی کو پھر مجھ سے چھیننے ..... میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں"۔ امی نے مجھے بھینچ لیا۔ اور رونے لگیں۔ اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی ادھر۔ ان دونوں عورتوں میں کتنا فرق تھا! ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت امی کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھول کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینہ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ غم اور حسن کا امتزاج۔

ادھر نانی بی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امی کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں سے۔ اگر ان پھیکی پھیکی بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں میں یاس اور رنج کی ایک دنیا ہوتی مگر بظاہر وہ جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔ گو میرا ننھا دل انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور امی کی طرفداری کرتا۔ آخر "غمگین حسن" اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا، نہ نانی بی کے پچکے ہوئے گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ ہاں مجھے امی پہ ترس آ رہا تھا، مگر اس دل کا کیا حال ہو گا جس سے ایک عزیز چیز چھین لی گئی ہو۔ امی کے پاس دولت تھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔ چاند سے بچے تھے۔ اس قسمت کی ستائی ہوئی بڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانا بھی تو نہیں۔ ہاں امی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی۔ اور اس سوکھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا۔ کتنی دبی ہوئی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔

نسیمہ کے رونے کی آواز آئی اور امی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔ امی کے جاتے ہی میں دوڑی ہوئی ان کی گود میں جا بیٹھی۔ "نانی بی! مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی نانی بی؟" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ نانی بی نے مجھے گلے لگا لیا۔ پھر کیا تھا جیسے بند ٹوٹ گیا ہو، رکا ہوا سیلاب امڈ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہا ہے۔ "میری بچی، میری ننھی شہزادی تمہیں چھوڑ کے کیسے جاؤں۔" "اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے دیکھنے کبھی کبھی آیا کرو گی نا؟" "نہیں بیٹی اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔" "کیوں نانی بی! مجھ سے روٹھ تو نہیں گئیں میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ تم جو کچھ کہو وہ سنوں گی۔ نہ روٹھو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے۔"

"اچھا تم جو کچھ کہوں وہ سنو گی؟" "ضرور۔" "مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا دے دو نا اچھی بیٹی۔" نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی اپنے چھوٹے سے ٹرنک میں سے ریشمی بٹوہ نکال لائی۔ اس بٹوے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین منکے موتی کانچ کے ٹکڑے۔ گڑیوں کے ننھے زیور، نئے ڈھالے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں "سادران" کہا کرتی تھی۔ سنہری چمکتی ہوئی چونیاں، دونیاں ...... اسی میں میں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چاندی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، عنابی، فیروزی، آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انہوں نے پیار سے چمکار کر کہا "میری اچھی بیٹی تمہیں مٹھائی لا دوں گی۔ یہ نہ لو" میں کوئی چیز مانگوں، اور نانی بی نہ دیں۔ وہ کبھی نہ نہ کر سکتی تھیں۔ ہو نہ ہو، یہ آئینہ کچھ ہو گا ہی اور میں آئینہ لینے پر مصر ہو گئی۔ "ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی"۔ بچپن کی ضد میں نے ہٹ کر کے، رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسوؤں کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے پاس رہا۔ کئی بار نانی بی نے نرم سی ہوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی۔ "ہوں! وہ غلیظ آئینہ کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے؟" نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں۔ مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں۔ مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں۔ وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بٹوہ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

"یہ سب کچھ لے لو نانی بی۔ مگر ضرور آتی رہنا۔ نہیں تو میں خوب روؤں گی۔" "اچھا بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی میں آ کر جاؤں

دل سے تمہاری خدمت کروں گی۔ مرتے دم تک وہیں پڑی رہوں گی۔ پھر مجھ پہ دو مٹھی خاک ڈال دینا بیٹی!" نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور اپنے میلے رومال میں لپیٹ کر کرتے میں چھپا لیا۔ پھر مجھے گود میں لے کر میری بلائیں لیں، گلے سے لگایا، پیار کیا۔ اور مجھے آہستہ سے اُتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی اور سر جھکائے خاموشی سے چلی گئیں۔ اب میں رو نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ "جب تم اپنا گھر بساؤ گی" کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی! میں اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹ کر بٹوے میں ڈالنے لگی۔ کیسی پیاری پیاری چیزیں تھیں۔ نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر اس گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں چن لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گزرنے تھے۔ اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپا ہوا تھا۔ اب کتنا صاف ہے! نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت، اس دن کی جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں وہ آخری سین جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں سے لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بارہا اُبھرتی ہیں۔ یہ یادیں بارہا میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں۔ بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے؟ اس بجھے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ اس سرد سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یاد چٹکیاں لے رہی تھی۔ یہ آئینہ انہیں راستے میں پڑا ہوا ملا تھا۔ جب ہم ہوا خوری کے لئے جایا کرتے تھے۔ ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لے جایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے دور ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خودرو گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی۔ اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی ننھی ننھی بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر آ بیٹھتیں۔ ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں نغموں سے معمور ہو جاتی۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوٹی سی دوکان ملتی تھی۔ جہاں صرف پان کی بکری ہوتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسہ کے پان اور سپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر بڑے انہماک سے پان کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بوڑھا دکاندار اندر جا کر "پان کوٹنی" لے آتا، اور نانی بی کے سامنے رکھ دیتا۔ دیتے ہی دو چار پوپلے منہ والی بوڑھیاں اور آ جاتیں۔ سب کی سب پان خرید کر "پان کوٹنی" کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں بھی چلم لئے آ بیٹھتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی محفل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور ان سب کی عجیب عجیب صورتوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بوڑھیاں نسیں نکالتی ہوئی، پان کوٹتی ہوئی، اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی، پوتے پوتوں کی، کبھی محلے والوں کی اور اکثر "ہمارے زمانے" اور "اب کے زمانے کی"۔ "اب کے چھوکرے بھی کوئی چھوکرے ہوئے! ہا! اب کی چھوکریوں کا دماغ تو آسمان پر چڑھ گیا ہے"۔ ایک بوڑھی منہ پر زور سے ہاتھ مار کر کہتی "اپنے زیوروں کے نام ہی سے کان پکڑتے ہیں۔ موئی ہاتھوں میں دو چوڑیاں اگلے ہیں باریک "سنگل" کانوں کی لو میں ایک باریک کرن پھول یا جھومر اور بس۔ بھلا یہ بھی کوئی زیور ہوئے۔ ہمارے زمانے میں جو پہنتی تھیں کان بھر کر سونے کی پتیاں۔ ہاہا نتھ اور پر جھومتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں۔"

"اور یہ بھی دیکھا، ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا۔ بُچی بُچی کیسی بُری لگتی ہے ناک"۔ ایک بڑھیا نتھنے چڑھا کر نفرت ظاہر کرتی۔

"نانا یہ زمانے کی چھوکریاں جی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ موئی موئی لٹیں نکلی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصا کوڑے کا ڈھیر بنا لیتی ہیں۔ حشر کے دن پُل صراط پر سے پھسل پھسل گر نہ پڑیں تو جب جانیں۔ کیا ہمارے بزرگوں نے جھوٹ کہا تھا؟ بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں سیدھے پُل صراط کر دی گی"۔ "اب تو اللہ ہی بچائے ان ٹیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھی مانگ نکالو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ ٹیڑھی مانگ تو کیسی اچھی صورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس بچی ہی کو دیکھو ہو بہو۔ کیسا پھول سا مکھڑا، چاند سی پیشانی، سیدھی

مانگ نکالتی تو چہرہ پہ کیسی رونق آ جاتی اب تو کرستان لگتی ہے کرستان۔" اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور میرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی: "اماں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے فیشن۔"

"وہ بوا، وہ فیشن کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا دیکھو تو پنڈلیاں ننگی بازو ننگے، لعنت بھیجو لعنت۔"

اور یہ رنگ تو دیکھو بوا، کیسا پھیکا پھیکا جیسی ہی کیا اب کے سب رنگ پھیکے۔ سچ پوچھو تو اجلے رنگ میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔"

"اونہہ اجلا رنگ! اب کی چھوکریاں اجلے کپڑے پہننے کو عار نہیں سمجھتیں ابھی سے بڑھیاں بنی پھرتی ہیں۔ بھلا ان بھی چھوکریوں کو کہیں اجلا رنگ سجتا ہے۔"

"ان بھی چھوکریاں کا۔ ارے بابا اب تو غضب ہو گیا غضب! سہاگنیں تک اجلے کپڑے بے دھڑک پہن لیتی ہیں، غضب ہو گیا غضب۔ توبہ توبہ کچھ سہاگ کا پاس بھی ہے انہیں؟"

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں ....

"ہمارے زمانے کی شادیاں، شادیاں تھیں، کئی ہفتے لگتے تھے، کیسی کیسی رسمیں اب دیکھو جھٹ منگنی پٹ بیاہ، اور بیاہ بھی کیسا بیاہ، ادھر نکاح پڑھا گیا، ادھر دلہن کی رخصتی ہو گئی۔ نہ کوئی رسم نہ ریت۔"

"اور اب کی دلہنیں تو خالہ! اباری چھوریاں، توبہ توبہ آنکھ کا پانی بہ گیا ہے کیسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔ اپنے خصم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ رو رو کر بے سدھ ہو جاتے تھے اللہ اللہ کیا زمانہ آیا۔"

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی۔ اماں! کا ہے کو بولوں اس دلہن کی بے شرمی" اور سب بڑھیاں ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگائے آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی سہیلیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے، توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ماں بچاری نے سر پیٹ لیا۔ کیا کرتی سمدھنوں کو منہ دکھانے سے رہی۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔ اوئی، میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس چھوکری کی آنکھوں میں؟ نانا بابا ہم سے تو رہا نہ گیا۔ آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سمدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے سے اتنے زور سے نوچا کہ اس کے چیخ نکل گئی۔ جب کہیں جا کر دو بوند پانی نکلا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پہ پلٹ نہ پڑی۔ ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔

"اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ اس بے شرم کے ساتھ ویسا ہی کرنا چاہئے تھا۔" سب یک زبان ہو کر کہتیں۔ اور بوڑھے میاں بھی بڑے زور سے سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔ یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے ہمہ تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔ جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کیسی پگڑی ایک بڑے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے تھے) اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجلانے لگتے۔ اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد ایک بات نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں مگر یہاں بھی نانی بی خاموشی سے سب کی باتیں سنتیں۔ یہ اب کے جانے پرانے اعتراضات سن کر بھی کوئی رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرے سے کوئی جذبہ کا اظہار ہوتا۔ شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا...... پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں لے جاتی۔

یہاں ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے سرخ پھولوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی اور نانی بی کی گود میں آ بیٹھتی۔

"ایک اچھی سی کہانی ہو نانی بی" "آج کون سی کہانی (کہانی)، بولو" اور ساتھ ہی اپنی نسوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں۔ پھر

ایک میلا سا رومال اپنی سوسی کے سُتھنے کے نیفے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہوئی کہانی شروع کرتیں۔ "اچھا سنو ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں" پھر ناس پر کھینچتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔ "اس نے سب شہزادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے۔ سب بولیں "آپ" مگر چھوٹی شہزادی بولی "اللہ" اور نانی بی اس جملے سے رومال پھر نیفے میں ٹھونس لیتیں۔ اس سے پونچھنے پر بھی کالی کالی دھول کی ایک تہ سی ان کے نتھنوں پر جمی رہتی۔ اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے منہ کے کناروں پر پان کی لال لال پیک بہ آتی۔ اور وہ ایک طرف منہ پھیر کر پیک کو تھوکتی ہوئی اپنی کہانی کو جاری رکھتیں "چھوٹی شہزادی بولی "ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں اور حضور آپ کو بھی" اس جواب کو سن کر بادشاہ.....

"کیسی چھوٹی شہزادی نانی بی؟ مجھ جیسی" میں بیچ ہی میں کہہ اٹھتی اور وہ لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیتیں "ہاں بیٹی تمہاری جیسی شہزادی ایسی ہی کھوبصورت شہزادی" میں خوشی سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی "بھئی کیسا پیارا مکھڑا ہے تمہارا۔ ہائے چاند کا ٹکڑا" نانی بی میری بلائیں لینے لگتیں۔ "تٹ تٹ تٹ" دیکھو تو سب انگلیاں ٹوٹیں۔ کتنا پیار ہے مجھے اپنی بچی سے" اور میں اپنی ننھی ننھی باہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نتھنوں پر جمی ہوئی دھول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔

پھر نانی بی اپنی ہتھیلی پر ذرا سا چونا پھیلا کر پھونک پھونک کر خشک کر لیتیں اور اس میں تھوڑی سی نسوار انڈیل کر ملنے لگتیں۔ ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ کہانی بڑھاتی جاتی تھیں۔ ناس ٹھس ٹھس کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بناتیں۔ اور ایک پیاری بڑی سفید ڈبیا میں۔ بالکل میرے کریم کی ننھی سی ڈبیا کی سی۔ انہیں ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ سب کرتی ہوئی وہ بڑی ہی دلچسپ کہانی سناتی تھیں۔ ایک ایک جملہ مزے لے لے کر۔ نانی بی کو کہانی سنانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا۔ بار بار کسی نہ کسی بہانہ سے ایسی جگہ ٹھہر جاتیں جہاں میرا اشتیاق بڑھا ہوتا۔ پان کی پیک تھوکنے کے بہانے یا گولیاں بنانے میں بہت ہی منہمک ہوتیں۔ میں بے تاب ہو جاتی۔

"اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہو نا"

"نا بیٹی جلدی کہوں تو کھاک مزا آئے گا؟" اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان کرنے میں کہانی کا دوگنا مزا آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے اتنی اچھی طرح بیان کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی "شہزادی" سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر "شہزادی" پر کوئی نہ کوئی مصیبت آ پڑتی۔ پھر کہیں سے ایک "شہزادہ" آ پہنچتا۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے۔ اور اس شہزادی کو مصیبت سے نجات دلا کر اپنے محل لے جاتا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ہی ختم ہوتی۔ یہ شہزادہ کتنا اچھا ہے۔ چھوٹی شہزادی کو بچانے والا۔ میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہزادی ہوں نانی بی! مجھے بھی ایک ایسا چھوٹا شہزادہ لے جائے گا" میں نہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی۔ اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک آ جاتی۔

"ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہو کر انگریزی پڑھو گی۔ خوب پڑھ کر بی۔ اے پاس ہو جاؤ گی تو...... اس پر تم ہو بھی کھوبصورت تمہیں ضرور ایک بڑا آدمی بیاہ لے جائے گا۔ کوئی بہت بڑا افسر"

"ہوں، ہوں، بڑا افسر نہیں چاہیے۔ چھوٹا شہزادہ" میں مچلنے لگتی

"ہاں ننھی، وہ شہزادہ ہی ہو گا۔ میری شہزادی وہ دن کب آئے گا۔ اللہ مجھے اس وقت تک جیتا رکھے۔ تمہیں دلہن بنا دیکھ لوں۔ تو چین سے مر سکوں گی......" آہ نانی بی، شہزادہ تمہاری ننھی کو لینے آ گیا ہے۔ مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی تمہاری آخری آرزو تھی۔ کہ دیکھ کر فرطِ خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ ان کے حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیں نہ لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں.......

دن تو یہ ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔ کچھ دور پر ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی تھی کہ اس تالاب تک ہو آئیں، مگر نانی بی کے کہانی بولتے ہی میں اندھیرا ہو جاتا، اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور مچاتے آ رہے تھے۔ تالاب کے پاس آ کر وہ بندر والا اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے تماشہ دکھانا شروع کیا۔ لڑکے اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند ایک مرد بھی جمع ہو گئے۔ "میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے پاس لے چلو" نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور لے جا کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ "یہاں نہیں اور بھی قریب لے چلو نانی بی"۔ "نا بیٹی، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ اتنے غیر مرد کھڑے ہیں اور میرے اللہ" اور نانی بی نے چادر کھینچ کر اپنے چہرہ کو اور زیادہ ڈھانپ لیا۔ "اچھا تم نہیں آؤ گی تو میں بھی یہیں رہوں گی"۔ میں نانی کی چادر تھامے تماشہ دیکھنے لگی۔

"اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو"۔ بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر حکم دیا۔

بندریا نے جلدی سے ایک چھڑی اٹھا لی اور اسے سر پہ رکھ کر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ گویا بہت کام کر رہی ہے۔ "اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کر دو بیٹا"۔ بندریا نے زور سے چھڑی زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

"بندریا نے چھڑی کیوں پھینک دی نانی بی"۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو دو ایک جھٹکے دے کر پھر وہی پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی بی ایک مٹی کے ڈھیر میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔

——— انہوں نے میری بات سنی تھی۔ کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک آئینہ کا ٹکڑا ——— "کیسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھاؤ نا"۔ نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے۔

"آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا"۔

"ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟" "وہی ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی"۔ "تمہارے گھر والے کون نانی بی"۔ "وہی بزرگوں نے جن کے ساتھ میرا بیاہ کیا تھا"۔ "تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ باجے بجے تھے، تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ نانی بی، آج کہانی کے لئے اصرار نہ کروں گی"۔

"میری بھولی بچی۔ ہاں میں نے اچھے اچھے زیور اور کپڑے پہنے تھے۔ مگر بیاہ کے معنی یہی نہیں۔ اچھا آج کانی (کہانی) نہ سنوں گی۔ مگر میری زندگی کہانی سے کیا کم ہے بیٹی۔ کیا بتاؤں کیسے دھوم دھام سے ہوا تھا میرا بیاہ۔ لکھتے ہیں پانچ ہزار کا خرچ ہوئے تھے پانچ ہزار! برابر ایک مہینہ لگا تھا، پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لدی گئی تھی گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑتی تھی۔ جھومر، مانگ میں موتی، پیشانی پر ٹیکہ جھومتا ہوا، ہاتھوں میں کنگن، پونچیاں، گوٹ اور گوکھروں کے بیچ میں ہاتھ بھر کر ہری ہری ریشم کی چوڑیاں، اتنی بڑی سی نتھ، پاؤں میں چار جوڑی جیہر، کان بھر کے سونے کی بالیاں۔ اور تجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے، ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ منہ پر چمکتا ہوا ابرک، چکیاں بھر بھر سیندور، کاجل مسی سے سولہ سنگار اور میں ایسی کا ہے کو تھی بیٹی ——— "نانی بی نے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "گول صورت، پھولے پھولے گال، کیسی دمکتی تھی چہرہ پر۔ اب کیا دیکھتی ہو بیٹی جھڑ جھڑا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس زمانے میں کیسی بھاری جوان تھی میں۔ ایک ایک پاجامہ جو مشاطہ لاتی میں نہ سماتی تھی"۔ ..... "اور کپڑوں کی چمک دمک کا کیا کہنا لال دامنی پہ بڑے بڑے طلائی بوٹوں والی"۔ نانی بی نے بوٹوں کی چوڑائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ "ہرا بنارسی لہنگا اور اطلس کا کرتہ کیسی بن سنور کر بیٹھی تھی میں"۔ میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور تصور میں نانی بی کو دلہن بنا دیکھ رہی تھی پچکے ہوئے نہیں، "پھولے پھولے گالوں

والی" نانی بی کو۔

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اور ہم تھے ہی کتنے، ایک بھائی، ایک بہن، بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ "ان" کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیز مانگے اور وہ نہ ملے بات ابھی جبان پر بھی نہیں آتی تھی وہ چیز میرے قدموں میں۔ کیا کہوں بیٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گزرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ کر لائی تھیں آکھر ایک ہی تو بیٹا تھا جگر کا ٹکڑا۔ ہم سبھوں پہ بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو ادھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے، مجھے گھر کی "راج دلاری" کہا کرتے تھے، مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز میرے لئے لے آتے، کیسے کیسے پیار کے ڈھنگ ہوتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن سہری پہ بیٹھی اپنے دامن میں گوٹ ٹانک رہی تھی پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔" پھر جلدی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی "بچی بھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ خیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔ ہاں آنکھیں بند کر دیں۔ اور کچھ میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹا لیا۔ دئی میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے آئینہ میرے چہرے کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھو کیسے بھلے لگتے ہیں جھومر تمہارے کانوں میں" میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھے تو بڑے برے لگتے تھے۔ اتنے لانبے لانبے لٹکتے ہوئے "نا بابا! مجھے تو کھائے اچھے نہیں لگتے۔" وہ ہنس کر بولے "تم تو پرانے ڈگر پر چلتی ہو۔ آکھر دن رات چار دیواری میں بند رہتی ہو نا۔ تم کیا جانو۔ جمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے بھئی یہ نیا فیشن ہے نیا فیشن، فیشن دلش کیا جانو۔ مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے" "خیر جانے دو۔ یہ آئینہ تو تمہیں پسند ہے۔ دیکھو لے کھو نہ دینا۔ بڑی دور سے منگوایا ہے۔ چھتر روپے لگے ہیں چھتر" ہائے آئینہ! آئینہ کیا کہوں۔ کیسا پیارا تھا۔ خیر یہ تو ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی کھوبصورتی کیا کھبر ہے۔ کناروں پہ کیسے کیسے رنگا رنگ پھول گویا ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ دل میں تو بہت کھوش تھی مگر دنیا کو دکھانے لگی "سارے بیٹے آدمی کاہے کو اتنا روپیہ کھرچ کرتے ہو مجھ پر۔ تمہیں تو پیسوں کی قدر ہی نہیں۔ کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری نجر میں۔ چھتر روپے بابا۔" اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے "جہرہ تمہیں یوں کھوش دیکھ کر قیمت ویمت سب کچھ بھول جاتا ہوں، تمہاری کھوشی پہ چھتر روپیہ تو کیا سب کچھ صدقے ہیں۔" آہ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں۔ ان باتوں کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" نانی بی نے آنسو پونچھے اور دبی آواز میں کہنے لگیں "آہ اس جمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے، چھتر روپیہ خرچ کیا اتنی دور سے، پرائے ملک سے میرے لئے آئینہ منگائے تھے۔ اللہ اللہ یہ آئینہ تو ان کی یادگار محبت ہے۔" اور انہوں نے اس آئینہ کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا" اور میں کیسے فخر سے وہ آئینہ اپنی سہیلیوں کو دکھاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں "اری جہرہ تو تو بڑے بھاگ والی ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے........

آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں، یہ آسمان کا چکر! یہ جانا کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتا بسا بسایا گھر اجڑ گیا۔ سہاگن بیٹھی۔ میرا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ میری قسمت ایسی پھوٹی ایسی پھوٹی خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے۔" نانی بی پھر رونے لگیں "میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" نانی بی نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا اتنی دھن دولت تھی، باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وکت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ وہ تاریخوں کے پل باندھتے اور یہ ٹھہرے سیدھے سادھے آدمی۔ پھیرے نہ سماتے اپنی تعریف سن کر سب کو سچے دوست جان کر کھوب کھاطر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے برے کی تمیج کرتے اور پھر کھدا نے انہیں ایسا نرم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے دروازے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانو بہت سے لچے لفنگے لنڈے بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ بری صوبت (صحبت) سے اللہ ہر ایک کو بچائے۔ جب پیگمبر کا بیٹا تک کھراب ہو گیا تھا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ تو ہر ایک کو کھراب کرتا

ہی ہے۔ پھر بھری جوانی۔ ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لئے ان کو شراب اور جوئے کا چسکا لگا دیا۔ خدا ان سب کو غارت کرے، میرے ہیرے ایسے آدمی کو خراب کیا۔ پھر کیا تھا بیٹی! باپ کی اتنی محنت سے کمائی ہوئی پونجی مہینوں میں اڑ گئی۔ پھر میرے جہیز کی چیزیں بھی ایک ایک کرکے بک گئیں۔ یہاں تک تو خیر تھی جب کچھ نہ رہا، تو کیا کہوں بیٹی!" نانی بی زور زور سے سسکیاں لینے لگیں...... "تو میرے گہنے مانگنے لگے۔ شراب کے نشہ میں چور آدھی آدھی رات کو آتے اور زیور رکھنے کے لئے تقاضا کرتے۔ کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس میری شامت ہی آجاتی۔ اتنا مارتے، اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے، لکڑی کہیں دکھائی دیتی تو اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوج جاتے اور ان پر نیلے نیلے نشان ابھر آتے۔ سارے زیور کپڑے برتن سب ٹھکانے لگ گئے یہاں تک کہ میرے بدن پر ایک دامنی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ چھالوں پہ پھاگے گمبار کے میرے دیدے اندر دھنس گئے۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رات انہوں نے خوب شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچے سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے وہیں پر بلا لیا گیا۔ تو کیا کہوں بیٹی انہیں برابر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی کھینچنے لگے، یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاقت لگائی بہت روئی بھی۔ مگر انہوں نے دامنی کھینچ ہی لی۔ وہ دامنی تھی ریشم کی۔ بول چار پیسوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی بدن پر ایک کپڑا نہیں جو کی۔ ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی، ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی قسمت پر روتی رہی۔ صبح رسوئی میں ادھر ادھر سے کچھ کوئلے جمع کرکے انہیں سلگا کر چولھے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں۔ میرا بھائی آکھڑا ہوا ہے، خدایا مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی میں آیا زمین پھٹ جاتی ایسی حالت میں مادر زاد ننگی، خدایا زمین شق ہو جاتی اور میں گڑ جاتی۔ آہ! ہم جیسی گنہگاروں کی دعا کہاں قبول ہوتی ہے۔ وہ تو اگلی نیک بی بیوں کا ہی حصہ تھا۔ ادھر دعا ہونٹ سے نکلی ادھر زمین شق ہو گئی۔ پھر کیا کرتی، ادھر ادھر دیکھا تو ہانڈیاں پکڑنے کا کالک سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی غنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی پھٹی پھٹی حیران نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جبان سے ایک لفظ نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ مجھ پر یہاں کیا گزر رہی ہے۔ ہاں ایک دو دفعہ میرا بھائی آیا تھا مگر میں ان کے خلاف کیسے جبان کھولتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ پچھلی دفعہ کہہ گیا تھا جہرہ کتنے دن ہو گئے تمہیں میکے آئے۔ بچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں نوکری کی خاطر پرائی بستی جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں گا تو اب کی دفعہ تمہیں جرور بلا کر جاؤں گا۔ اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایسی لاچار، ایسی بے بس اسے کتنا دکھ پہنچا ہوگا؟ آخر خون سے خون لگا تھا۔" اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور زیادہ لٹک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ننھا دل بھر آیا۔ گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی۔ پھر بھی نانی بی کو یوں روتی دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔ آنسو پونچھے۔ اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ "نہ ننھی، تم کاہے کو روتی ہو ننھی شہزادی۔ اللہ نہ رلائے میری بچی کو۔"

"اچھی نانی بی تمہیں کہانی سنانے سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں۔ ضد نہیں کرتی۔ چلو گھر چلیں۔"

"نہیں بیٹی، تمہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ اب تک میں کسی سے نہ بولی تھی۔ کس سے بولتی۔ اس کھود گرجی (خود غرضی) دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں، مگر تم بیٹی ننھی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی...... اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جندگی میں لگا ہی رہتا ہے۔ پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ پھر تو تمہیں باقی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں۔ کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔

"یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے جہرہ؟" میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی۔ خدا جانتا ہے۔ ان کے خلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھڑی پھینک کے وہ بولا "لو جہرہ یہ پہن لو" اور آپ دوسری طرف منہ پھیر کر تشت دان میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھڑی کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے، کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔

نجریں نیچی کئے بیٹھ رہا۔ کھانا کھانے کے بعد آہستہ سے دبی آواز میں بولا "چلو جہرہ گھر چلو اب مجھے، ان بدوں کے سب کرتوت معلوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی کسم میں تمہیں پھر اس نالائک کے گھر بھیجوں۔ اس جالم کو اپنے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کہا ہم رکھا تو محلہ بھر میں پھبتی (فضیحت) کراؤں گا۔" پھر وہ کچھ نہ بولا۔ کھاموشی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ ایسا ضرور کرے گا۔ آہ! میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے اُن سے پھر ملنے نہ دے گا۔" نانی بی بہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ "وہ گھسے میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گھسہ اتر ہی جاتا اور مجھے کچھ آس ہوتی۔ لیکن یہ کہتے وکت، اس وقت اس کے چہرے پر کیسا سکون تھا۔ گھسہ نام کو نہیں۔۔۔۔۔ میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے" نانی بی نے سرد آہ بھری۔ "میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آہ بیٹی! بیٹی" میں تعجب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ "آہ! کیا کہوں۔۔۔۔ بے۔۔۔۔ ٹی۔۔۔۔۔۔ ان کے چہرے پر پچھتاوا تھا۔ اداسی تھی۔ وہ جرور اپنے کئے پر رنجیدہ تھے اور بیٹی ان کے ہاتھ میں ایک نئی ساری بھی تھی۔ میں دروازہ کھولنے بھاگی۔ بہت جلدی کی۔ پھر بھی میرا بھائی آ ہی گیا۔۔۔۔۔۔۔ آ ہی گیا۔ مجھے جور سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں ایسی ایسی باتیں سنائیں انہیں شہدا، لفنگا، بدمعاش کہا۔ بے شرم کہا۔ بے گیرت کہا میرے اللہ! نہیں، نہیں نہیں، وہ بے گیرت نہیں تھے۔ ان میں سرحدوں کا خون تھا۔ میں بھائی کے پاؤں پڑ گئی۔ "اللہ واسطے ایسا نہ کہو بھائی۔" اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ اللہ یہ سن کر بھی وہ کھاموش کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے: "میں تمہارے گھر پڑے رہنے نہیں، جہرہ کو لینے آیا ہوں۔" اب اس کام سے کوئی تعلق نہیں۔ شرم نہیں آتی اسے اتنا ستا کر۔" میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا۔ "کیا میری بہن اتنی سستی ہے ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی کسم اگر میری بہن بھوکوں مرے۔ پر اسے، تم جیسے جالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ ماریں تو دیا اسے" میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساری کھینچ کر نالی میں پھینک دی۔

"مجھے جہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں جرور چلا جاؤں گا۔ اگر راجی ہے تو تمہارا کوئی حکم نہیں اس پر وہ میری بیوی ہے میں اسے جرور لے جاؤں گا۔" "ہونہہ! کیوں نہ کہے گی؟ پھر آ جائے گی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے" اور میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی "میں بھائی میں جاؤں گی بھائی مجھے جانے دو" اور بھائی نے مجھے آگ برساتی نظروں سے دیکھا۔ "چپ بے گیرت کہیں کی۔"

"نہیں میں جہرہ ہی سے پوچھوں گا۔" انہوں نے دہلیز پر کھدم رکھتے ہوئے کہا۔ کھریب تھا، میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے۔ "بے شرم اندر کھدم رکھتا ہے؟ ایسا بے شرم نہ ہوتا تو عورت جات کے گئے پیچھا۔ کیا پوچھتا ہے جہرہ سے۔ وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے میں اس جالم کے ساتھ نہ جاؤں گی۔" آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا۔۔۔ کیسا جھوٹ بولا۔ "اگر تجھ میں جرا بھی گیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا پھر کبھی ادھر نہ پھٹکنا۔" پھر میرے بھائی نے اتنے زور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جا کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور پر کھڑے تھے۔ آہ بیٹی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا۔۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے گیرت والے تھے۔ بیٹی۔ اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر پر آتے؟۔۔۔۔۔۔ آہ میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا ہوا۔ میں موکع پا کر وہاں سے چلی آئی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے جو نکلی، بیٹی، تو نوکری کے لئے دری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں کھدم نہ رکھا۔۔۔۔۔ میں ماں کے ہاں چین سے رہ سکتی تھی۔ مگر میری گیرت کیسے کبولتی کہ وہاں پڑی رہوں مجھے کسی کے گھر کی نوکری تو کیا کو لی، مجوری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا، بھیک مانگنا منجور تھا۔ مگر اس دروازے پر جانا منجور نہ تھا۔ جو ان پر بند ہوا تھا۔۔۔۔ اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو کبھی ویسا نہ کرتے۔ مجھے جرور بھیج دیتے۔ انہیں بیٹی کا لاکھ درد سہی۔ وہ میاں کا درجہ پہچانتے تھے۔ کہا کرتے۔ عورت کا مکام سوہر کا گھر ہی ہے بھائی نے جوش میں یہ نہ پہچانا۔ بابا ہوتے تو جرور بھیج دیتے۔۔۔۔ سبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے اور مجھے تو ایسا معلوم پڑا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی، بہت سنبھل گئے تھے پھر میری جندگی کیسے سکھ سے گجرتی! ایک دو

دن تکلیف سہہ لیتی۔ اور پھر وہ مارتے تھے تو کیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا تھا۔ صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو ان نیلے سوجے ہوئے حصوں پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ پھر ایک دو دفعہ تو انہوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی او خدا! لما ایا! ان کی ایسی ایک نظر ہی بس تھی...... ایک نظر ہی بس تھی۔" نانی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں تو ڈر رہی تھی۔ ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس کے اندر بھونچال آگیا ہو کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ آہستہ تھمنے لگیں۔

"اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ شراب جوئے کا کیا کہنا اگر یہ لت پشتوں کو بھی پڑے تو نہ چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری باتوں میں ان کی طرف انگلی اٹھائے۔ ایسے سچے وہ۔ غیر عورت کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گن ہو۔ یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی۔"

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہوئی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جا گھسی تھیں۔ صرف ایک بات مجھے اہم معلوم ہو رہی تھی۔ "نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا۔" اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی اپنی کہانی ختم کریں۔ تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لئے تو میں بڑی بری صورت بنائے بولی۔

"نانی بی! تم سچ مچ کتنا دکھ اٹھائی ہو۔ کیسا خراب تھا تمہارا آدمی۔ تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا۔ کیسا خراب آدمی۔ تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟"

"نفرت بیٹی؟ اس کی صورت سے نفرت" کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا سجیلا جوان!! گٹھا ہوا بدن، چوڑا سینہ۔ اور صورت کا تو کیا کہنا، چوڑی صورت، یہ اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹھی اس صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا۔ جب اجلے اجلے کپڑے پہنے لال کشمیری رومال کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھنے کو دو آنکھیں بس نہیں تھیں۔ میں جلدی جلدی لوٹا پانی لے آتی اور ڈیوڑھی کے باہر قدم رکھتے ہی اتار پھینکتی کہ کہیں چاند سے مکھڑے کو نظر نہ لگ جائے۔ اس کی صورت سے نفرت بیٹی! وہ تو اچھا بھلوں کا اچھا تھا۔ شہزادوں کا شہزادہ!"

"کیا کر رہی ہو پروین؟ اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوا دوں سب سامان آگیا ہے، تم آ کر ناہید بی کی کچھ مدد کر دو۔ بیچاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ دو ایک تم کر دو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوڑتا ہی نہیں۔"

"نہیں امی آج پارٹی نہیں دوں گی۔"

"کیوں بیٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ۔"

"اس دنیا میں تو صرف خوشی ہی نہیں ہے امی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے۔"

"ہونہہ" امی زور سے ہنس پڑیں۔ "ابھی سے قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی۔"

"امی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر وہی نانی بی! سچ مچ اس بڑھیا نے تم پر جادو کر دیا تھا۔"

امی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔

ابراہیم جلیس

زرد چہرے

آصف کی بہن جوان تھی اور پانچ سال سے اپنے دولہا کا انتظار کر رہی تھی۔ نہ جانے اس کا دولہا کون تھا۔ کیسا تھا۔ کہاں کا رہنے والا تھا اور کب آنے والا تھا ——— ؟ آصف کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جب تک اس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے پیلے پیلے پھول کھلے ہیں۔ اس کا دولہا کبھی نہ آئیگا۔ کیونکہ دولھے گیندے کے پھولوں کو مطلق پسند نہیں کرتے وہ تو گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں پہ جان دیتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں ہاجرہ پر وفا، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے گالوں میں کتنے بڑے بڑے سُرخ گلاب تھے۔ اور ان کے دولھے کتنی جلدی، کتنے اضطراب اور کتنی بے تابی سے آآ کر ان سُرخ سُرخ پھولوں کو توڑ توڑ کر لے گئے۔ اب سارے محلے میں صرف ایک ہی پھول رہ گیا تھا ——— گیندے کا پیلا پیلا پھول ——— اس کی بہن جو پورے پانچ سال سے خوابوں میں، تصور میں، خلاؤں میں اپنے دُولہا کو دیکھ رہی تھی۔ ممکن ہے خوابوں میں اس کا دُولہا دکھائی دیتا ہو۔ تصور میں چلا آتا ہو اور خلاؤں میں اس کی طرف بڑھتا ہو ——— لیکن وہ تو دھرتی پہ رہتی تھی۔ خوابوں، خلاؤں اور تصور میں آنے والے دُولھے دھرتی پہ کیسے اتر سکتے ہیں۔ وہ تو خوابوں کی نرم نرم سطح پر ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دھرتی تو ان کے لئے بڑی سخت کھردری اور پتھریلی ہوتی ہے۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ اس کی بہن کو دق ہو گئی ہے۔ لیکن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ دق وق کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک مرض ہے ——— طویل کنوارپن۔ جو بہت ممکن ہے۔ طویل ہوتے ہوتے دق کے گلے میں بھی بانہیں ڈال دے۔ جُوں جُوں اس کی بہن کا کنوارپن لمبا ہوتا جاتا تھا۔ وہ بھی اس کی فکر میں گھُل گھُل کر سوکھ سوکھ کر لمبا ہوتا جا رہا تھا ——— ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھانچہ۔

بہن کی مانگ میں افشاں چھڑکنے کے لئے اُس نے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ جب باپ بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گیا تو اس نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تیس روپیہ ماہوار کی کلرکی جیسی ادنے غلامی بھی چار و ناچار قبول کر لی۔ اگر اس کی بہن نہ ہوتی۔ یا جوان نہ ہوتی یا وہ مفلس نہ ہوتا تو اپنے مشہور قوم پرست باپ کی طرح وکالت یا کوئی دوسرا آزاد پیشہ اختیار کرتا۔ دفتری غلامی کبھی نہ کرتا۔ اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آزاد منش باپ کے لہو کی توہین نہ کرتا۔ اسکی طرح خود بھی حکومت سے ٹکریں لیتا رہتا۔ لیکن جس کا باپ مر گیا ہو۔ جس کی آمدنی تیس روپیہ ماہوار ہو۔ جس کی بہن کنواری ہو۔ اور جس کے بہن کے رخساروں پہ گیندے کے زرد زرد پھول کھلے ہوں وہ کیا حکومت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ وہ کیا دفتر سے جیت سکتا ہے۔

مگر اس کی بہن تو ابھی عورت بننے سے پہلے معمر بن گئی تھی۔ وہ بے چارا تو اس کے لئے صبح سے شام تک دفتر کی میز پر جھکا رہتا۔ صاحبوں کی پھٹکاریں سُنتا اور مہینے کے مہینے تیس روپے اپنی بہن کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اور اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تک نہ آتی۔ اُس کے پیلے پیلے گالوں میں ہلکی ایک مدھم سی دھار ——— ایک ہلکی سی شہابی رو تک نہ رینگتی۔ اسی بات پر وہ جھلا اٹھتا اور بات بے بات اسکو جھڑک دیتا۔ لیکن جب پیلے پیلے پھولوں پر شبنم کی بوندیں رینگنے لگتیں تو وہ ان بھیگے ہوئے پھولوں کو اپنے میلے دبیز کوٹ کے لمبے لمبے کالروں میں چھپا کر خود بھی رونے لگتا ——— کیونکہ شبنم کی بوندوں سے دُھل کر ان پھولوں کی زردی خطرناک حد تک نکھر جاتی۔

مگر وہ مایوس نہیں تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بہن کے دولہا کو خوابوں، تصورات اور خلاؤں سے گھسیٹ کر اسی دھرتی پر لے آئیگا ——— کیونکہ دولہے بڑے لالچی ہوتے ہیں پھول خواہ کتنا ہی معمولی اور پیلا کیوں نہ ہو۔ اگر اس کو سونے اور چاندی کے گلدان میں رکھ کر پیش کر دو تو دولہا آنکھ بند کر کے وہ گلدان لے لیتے ہیں .... اسی لئے وہ کلرکی کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے دفتروں میں بھی آدھی آدھی رات تک کام کرنے لگا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی۔ پچاس روپیہ۔ ساٹھ روپیہ۔ ستر روپیہ۔

صبح بالوں میں کنگھا کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا کہ آدھی آدھی رات تک کام کرنے سے اس کے اپنے گالوں کے سُرخ ڈورے مدھم پڑ رہے ہیں۔ لیکن اب اس کو ان سُرخ ڈوروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ یہی سُرخ ڈورے اس کی بہن کے رخساروں میں داخل ہو جائیں۔ اور بس ——— اور اگر یہ نہیں ہو سکا۔ تو وہ اپنی بہن کو سونے اور چاندی کے جگمگ جگمگ کرتے زیوروں سے ایسا سجائے گا کہ اجرہ، رمقا، زہرہ، شید اور سعیدہ کے دولہوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ اپنے بے مصرف فضول مسکرانے والے سُرخ گالوں سے متنفر ہو جائیں گے۔ اور جب شہر کی سڑکوں پر سے دولہا اس کی بہن کے گلے میں پڑے ہوئے جڑاؤ ہار کو پکڑے اسکو باجوں ڈھولوں اور تاشوں کے شور اور گیس لیمپوں کی سپید چمک دار روشنی میں فاتحانہ انداز میں کھینچے لئے جائے گا تو وہ ہاتھ مل مل کر اپنی جلد بازی، اپنی بیوقوفی اور اپنی حماقت پر پچھتاتے رہیں گے۔

جس مہینے اس کی آمدنی پچاسی روپے ہو گئی۔ اس کے گالوں کے شفق بالکل ہی ڈوب گئی۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی زرد رنگ کے شیشوں والی کھڑکی سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی میں کھڑا ہے۔ اس کے دوست احباب جب اس کے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے تو کڑوا کڑوا مذاق کرتے۔

"علاج کراؤ اپنا۔ کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا پسند نہ کرے گی۔"

"جوانی ساری عورت بغیر ہی گذر جائے گی۔"

وہ مسکرا دیتا۔ اب اُس کے ہونٹ بہت مسکرانے لگے تھے۔ بار بار مسکراتے تھے۔ ایک مہینے میں اس کو پچاسی روپے ملتے تھے اور وہ پچاسی دفعہ مسکراتا تھا۔

"ارے کوئی لڑکی شادی نہ کرے۔ اس کی بلا سے۔ جوانی صرف عورت کے آغوش میں گزار دینے کے لئے تو نہیں ہے۔ جوانی حجلۂ عروسی اور عورت کی خلوتوں میں بسر کرنے کے لئے تو عطا نہیں ہوئی۔ جوانی تو الف لیلیٰ کے سوداگروں کی طرح اتال پتال چھاننے کے لئے ہے۔"

اور پھر بقیہ جملے وہ اپنے دل ہی دل میں چپکے چپکے کہتا۔

"جوانی زندگی سے لڑنے کے لئے ہے۔ اپنی جوان بہنوں کی مانگ میں سہاگ کی افشاں بھرنے کے لئے ہے۔ ان کے شرمیلے، لالچی رنگ و بو پہ جان دینے والے دولہوں کو

آسمان سے دھرتی پر گھسیٹ لانے کے لئے ہے ——— میں جو اپنی بہن کا حجلۂ عروسی بناؤں گا۔ وہ تاج محل سے زیادہ شاندار ہو گا۔“

چند ہی مہینوں بعد وہ سو سوا سو سوا سو روپے ایک ایک مہینے میں کمانے لگا۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ جان عزیزہ رونے لگی تھی۔ لیکن وہ اندھا دھند دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں روپوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اپنی نیندیں، اپنے تصوّر کے جزیرے، اپنے سپنے اور اپنی جوانی ——— یعنی مہ جبیں جہاں کو بھی بھول گیا۔ اس کی مہ جبیں جہاں۔ جس سے اس کو ایک دبی دبی ڈھکی چھپی اور چور محبت تھی ——— جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیروں نے اس کے ننھے سے دل میں بیشمار آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بہت تھکا ہارا گھر لوٹا۔ اور چارپائی پر گر کر بُری طرح کھانسنے لگا۔ اس کی بہن نے اس کے جوتے کے تسمے کھولے اس کا میلا دبیز کوٹ اُتارا۔ اور اس کے سرہانے بیٹھ کر نیلگری کے تیل سے اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ اُس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بے زبان مجبور بہن کے پیلے پیلے، افسردگی سے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری اچھی گڑیا ——— باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو کیا ہوا؟ میں اب اپنے سائے میں تیرے ہاتھوں کو ایسی لال لال مہندی سے رنگ دوں گا۔ کہ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو جا اسی بات پر میرے لئے اچھی سی چائے بنا لا۔“

بہن ایک حزن بھری مسکراہٹ سے منہ چھپا کر چلی گئی۔ اپنے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگا دیکھنے سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

مسرت کے موقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے! وہ اپنے سائے کا اپنے باپ کے سائے سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ تو کھاتے پیتے پرانے ہندوستان کا ایک بھاری بھرکم انسان تھا۔ چھ فٹ لمبا تین فٹ چوڑا۔ اور اس کی آمدنی بیٹے کی آمدنی سے چھ گنی زیادہ تھی۔ اس کے سائے میں تو اٹھارہ انسانوں کا ایک خاندان پل رہا تھا۔ کئی غریب رشتہ دار عورتوں کے مانگوں میں سہاگ کی افشاں چنی گئی تھی ——— اب یہ ڈینگیں مارنے والا ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھچر۔ میلا دبیز کوٹ اتار دینے پر اس کا سایہ ٹیلیفون کے کھمبے کی طرح اتنا پتلا اور منحنی تھا۔ کہ ایک ہی دُبلی پتلی نرم و نازک بہن جوانی کی دھوپ اور حدت سے نہیں بچتی تھی۔ وہ تو اس دھوپ میں جیسے جل رہی تھی۔ ابل رہی تھی۔ بالکل اس دیگچی کی طرح جس میں پکتے ہوئے چائے کے پانی کو اُبال آ رہا ہو ——— ہاں تب وہ۔ برسوں سے پھٹی ہوئی جیبوں والا دبیز کوٹ پہن لیتی تو اس کے بڑے بڑے کالروں میں منہ چھپا کر جوانی، حدت، دھوپ سبھی کچھ بھول جاتی تھی۔

بھائی کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت اور سوکھتے ہوئے جسم کو دیکھ کر بہن نے آخر جی کڑا کر کے شرم کی کینچلی اتار کر پھینکتے ہوئے ایک دن کہہ دیا۔

”بھیا ——— آپ کی زندگی سے میری زندگی ہے۔ آپ پر سے میری جیسی ہزار بہنیں وار کر کے پھینکی جا سکتی ہیں۔ آپ میرے لئے کیوں اپنی زندگی اپنی جوانی اس طرح برباد کر رہے ہیں۔ مجھے آپ جیسے پیارے بھائی کے سائے میں بڑی آرام اور چین کی زندگی حاصل ہے۔ میں کہیں اور جانا نہیں چاہتی۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی ——— ہاں آپ شادی کر لیجئے۔ گلاب کے پھول جیسی بھابھی بیاہ لائیے۔ میں آپ دونوں کی خدمت میں ہنستے مسکراتے زندگی گزار دوں گی۔ جبھی آپ دونوں کے ہوتے مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے؟“

اس نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر محبت کی لطافت سے گدگدا دینے والا ایک نرم طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

”پگلی ——— میں جانتا ہوں کہ تو اتنی پیلی ہے۔ کہ تیرے جسم میں لہو کی بہت تھوڑی بوندیں ہیں۔ ان بوندوں میں کبھی تلاطم پیدا نہ ہو گا۔ تو چاہے یا نہ چاہے لیکن دنیا اور دنیا والوں کے لئے تیری شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر تو مصلے پر بیٹھ کر بھی قسم کھائے تو بھی کوئی تیری پاکدامنی کا یقین نہ کرے گا۔“

اُس نے بھی جی کڑا کر کے شرم کو بالائے طاق رکھ کے کہہ دیا۔ اس وقت اس کے جی میں آئی کہ یہ بھی کہہ دے "تو جھوٹی ہے۔ تجھے شادی کی ضرورت ہے میں خود ہر رات تیری چارپائی سے اٹھتی ہوئی دبی دبی مچلتی آہیں سنتا ہوں۔ بیشمار کروٹوں سے چرچراتی ہوئی چارپائی سے تیری پیاسی جوانی کی چیخیں سنتا ہوں۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر۔ تو نے صرف یہ گھر کی چار دیواری دیکھی۔ مگر میں نے تو بہت بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اٹھائیسویں برس میں سر میں سپید بال گردن میں جھکاؤ۔ اور آنکھوں میں یاسیت کا دھندلکا .... یہ کیا ہے؟ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تو تو صرف چوبیس برس کی ایک کنواری ہے۔"

پھر اس کی زندگی میں ایک بڑا ہی چمکیلا دن طلوع ہوا۔ اپنی بہن کو سر سے پاؤں تک سونے اور چاندی کے زیورات سے جگمگا دیا۔ اس کی مانگ کو کہکشاں سے زیادہ چمکیلا بنا کر سنوارا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایسی سرخ سرخ مہندی لگائی کہ شفق تک شرما کر پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی۔ سبز رنگ کی سلمی ستارہ ٹکی ہوئی بنارسی ساڑھی اور سونے کے پیلے پیلے چمکتے زیور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز رنگ کے گلدان پر پرانے ہندوستان کے کسی مشہور نقاش نے بڑے فنکارانہ انداز سے منبت کاری کی ہو۔ اور اس میں گیندے کا ایک پیلا پیلا پھول شرما رہا ہو .... اس پھول کی پتیاں شبنم کی لاتعداد بوندوں سے بھیگ رہی تھیں وہ خود بھی روتا ہوا مصنوعی خوشی سے مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دلاسا دے رہا تھا "ارے ———— دلہنیں روتی ہیں ———— کہیں روتی ہیں — ؟ ہونہہ"

اور شادیانوں، نفیریوں، ڈھولوں کا شور فضاؤں میں بلند ہو ہو کر اس پہ ٹھٹھے لگا رہا تھا۔ کہ دیکھو ———— یہ آنسو پونچھنے والا خود بھی تو آنسو بہا رہا ہے۔ ہا ہا ہا .... ڈھم ڈھم۔ پیں پیں۔ پیں پیں۔ ترررت۔ ترررر ...

بہن کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی اس کا گھر سبھی سنسان پڑ گیا تھا۔ اس کی بہن کی چارپائی اب چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی۔ وہ اب آہیں نہیں بھرتی تھی۔ اور نہ اس سے کسی پیاسی جوانی کی چرچراتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اب ہوٹلوں میں کھانا کھا رہا تھا۔ کسی چیز میں اُبال ہی نہ آتا تھا۔ مگر ہاں اس کی گردن اب پھر سے اونچی ہو گئی تھی۔ کتنے سال سے اس کی بہن کی وزنی جوانی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اب تو بوجھ اُتر گیا تھا۔ وہ فخر سے گردن اٹھا کر سڑکوں پہ چلتا تھا۔ بات بات پہ گردن پیچھے پھینک پھینک کر قہقہے لگاتا تھا۔ کتنے عرصے سے اس کے قہقہے اس کے حلق میں رُکے ہوئے تھے۔ محفوظ تھے۔ اب وہ شاذ و نادر ہی زمین کی طرف دیکھتا۔ اب اس کو زمین کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جتنا سونا چاندی اور روپیہ پیسہ اس کی بہن کی شادی کے لئے ضروری تھا اُس نے زمین کے حلق میں انگلی ڈال کر سب اگلوا لیا تھا۔

اب وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی بہن کو دیکھنے اس کی سسرال چلا جاتا۔ اور نہایت مسرور گھر لوٹتا۔ کہ بہن کے گالوں میں گلاب کی سرخ سرخ کلیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ آج کل یا پرسوں یہ کلیاں کھل کر بڑے بڑے لال لال پھول بن جائیں گی۔ اور اس کا دولہا ان پھولوں کے گرد مست، مخمور اور مسرور بھنورے کی طرح منڈلایا کرے گا۔ اس مزیدار خیال سے خوش ہو کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا جیسے وہ تنہا فاتح ہے۔ جسے نہ آسمان شکست دے سکا۔ اور نہ زندگی۔ البتہ اس کو ساری زندگی میں صرف ایک دُکھ تھا کہ وہ برجیس جہاں کو اپنا نہ بنا سکا۔ اگرچہ برجیس جہاں ابھی تک کنواری تھی۔ لیکن اس کا کنوارا پن ایک ٹرافی تھا جس کو جیتنے کے لئے چند خاص خاص شرائط مقرر تھے۔ آصف نے برجیس جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہلا بھیجا۔ کہ وہ برجیس سے محبت کرتا ہے۔ برجیس کے باپ نے جواب دیا کہ شادی کے لئے محبت اتنی اہم نہیں۔ بیوی کو اچھا مکان اچھی غذا اچھے کپڑے زیادہ ضروری ہیں ———— آصف کے رقیب، نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔

"میرے تین مکانات ہیں۔ وہ تینوں برجیس کے نام لکھ دوں گا۔"

"میری آمدنی چار سو روپیہ ماہانہ ہے۔"

"میری جواہرات کی دوکان ہے۔ یہ جبیں ساری عمر جگمگاتی رہے گی۔"

"میری دو موٹریں ہیں۔ یہ جبیں کو دنیا جہاں کی سیر کراؤں گا۔"

"میری پنشن پندرہ سو روپیہ ماہانہ ہے۔ میں یہ جبیں کو کشمیر کی جنت میں لے جاؤں گا۔"

آصف ہار گیا۔ اسی کے دفتر میں ہیڈ کلرک نے وہ گڑیا جیت لی۔ آصف کی جانِ تمنا جیت لی۔

محبوبہ کے چھن جانے کے بعد آصف کو کسی دوسری محبوبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اس کی جدائی کے خلاء میں اس کو اتنا سناٹا، سکوت اور ڈر محسوس ہوتا کہ اس کا جی چاہتا کہ اس مہیب سناٹے میں دفعتاً کانچ کی چوڑیاں بجنے لگیں۔ پازیب کی میٹھی میٹھی جھنکار پیدا ہو۔ دوپٹے سرسرانے لگیں۔ چھم چھم چھم ٹاپ چھم ——— محبوبہ نہیں سہی کوئی عورت ہی سہی جو اس کی زندگی میں مہمان کی طرح ہی کیوں نہ آئے۔

اور جلد ہی ایک عورت اُسے مل گئی۔ شہر میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے لئے ایک مشن آیا ہوا تھا۔ اس میں بہت سی لال پریاں تھیں۔ ان کے جسم جیسے سپید سپید شیشوں سے بنائے گئے تھے اور اندر گہرا سُرخ رنگ بھر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بھوکوں ننگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے اپنے ویران راستوں جیسے مذاہب کو چھوڑ کر اس شاہراہ پہ چلنے لگے۔ جہاں قدم قدم پہ ہوٹلیں اور سرائیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا ——— روپیہ پیسہ عورتیں۔ آصف کو ان نعمتوں میں صرف ایک ہی نعمت چاہئے تھی .... مس فاکس۔

واللہ کیا عورت تھی مس فاکس! پہلی بار آصف نے اس کو امپیریل پوسٹ آفس سے نکلتے دیکھا تھا۔ بھرا بھرا جسم۔ لمبا قد۔ اور اس کے مغرور نتھنے اس کو ننگے میں۔ جیسے سارا گلابی رنگ صرف کر دیا تھا۔ اس کے گالوں پہ میٹھے سیبوں کے بُجانے یا کسی شاعر کے کسیلے نارنج تھے۔ پوسٹ آفس سے نکل کر جب وہ اپنی سائیکل پہ چڑھ رہی تھی تو اس کی پنڈلیوں کی تھرکتی ہوئی لال لال مچھلیوں کو دیکھ کر اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ زندہ ہے۔ وہ مر گیا ہے وہ مر گیا ہے۔ وہ زندہ ہے ....

اُس نے قومی نسلی تعصب کو دل ہی دل میں دھتکار بتائی اور ایک صاف دل سے اعتراف کرنے لگا کہ واقعی دنیا کے دوسرے مُلکوں نے عورت کی اصلی قدر جانی پہچانی ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو عورت کی مٹی پلید ہو گئی۔ اس مٹی کو تو صرف گیندے زعفران بنفشے اور سورج مکھی کے پھول ہی اُگا سکتے ہیں۔

دُوسرے تیسرے ہی دن اُس نے مس فاکس سے راہ و رسم بڑھالی اور جوانی پھر لوٹ آئی۔ وہ اب اپنی بہن کو بہت کم یاد کرنے لگا۔ گلاب کا پھول سامنے ہو تو گیندا کہاں یاد آتا ہے؟

ایک دن مس فاکس آرکسٹرا پہ ایک المیہ فراقیہ گیت الاپ رہی تھی۔ اور آصف اس شاعر کو جس نے ایسا گیت لکھا۔ دل ہی دل میں کوستا ہُوا چپ چاپ سُن رہا تھا کہ اچانک اس کو گیندے کا پھول یاد آ گیا ——— کیونکہ دروازے سے اس کی بہن کا لالچی شوہر داخل ہوا۔ اور پھر آصف کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ رکا، جھجکا۔ لیکن جب مس فاکس مسکراتے ہوئے اس کو بُلانے لگی۔ تو آصف صوفہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا مس فاکس آصف کے بدلتے تیور دیکھ کر ہنس پڑی یعنی"............ وہ تو روز یہاں آتا ہے۔"

اسی شام وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اُس نے اس سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ سگریٹ پیتا رہا۔ اور اس کے بھینچے ہُوئے ہونٹ جو بار بار ہلکی سی کپکپاہٹ سے کھُل جاتے تھے۔ اس کی جھکی جھکی پلکیں اور پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں کانپتے ہوئے تارے دیکھے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہی گالوں پر اُس نے سُرخ سُرخ لکیروں کا ایک جال بنتے دیکھا تھا۔ آج وہ جال .... اُف خدا! عورت کا رنگ بھی کیسا تغیر پذیر، کیسا بے اعتبار، کیسا ناپائدار اور کیسا عارضی ہوتا ہے۔!

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا دماغ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ اس کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہنس رہا ہے تو کیوں ہنس رہا ہے۔ رو

رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ اب شاید اس احساس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی نے اس کے بڑیاں نکلے ہوئے سینے پر ایسا زبردست گھونسا لگایا تھا کہ وہ تین دن تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ کھانستا رہا۔ بال نوچ نوچ کر روتا رہا۔ کبھی ہنستا رہا۔ کبھی گاتا رہا۔ اور چوتھے دن جانے کیا اس کے جی میں سمائی اپنا پرانا رفیق وہی میلا دبیز کوٹ پہنے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ شعلے لپک رہے تھے جیسے کسی کو جھلس ہی دیں گے۔

چینی ریستوران کے چوراہے پر نکھری ہوئی شام اپنا سفید بھیگا ہوا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ بس اسٹاپ کے ستون سے کندھا ٹیکے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر توڑ رہا تھا۔ اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا ——— ایک بھاری بھرکم۔ پنجابی عورت کو اپنے دبلے پتلے منحنی پستہ قد شوہر کے ساتھ جھک جھک کر باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پنجابی عورت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کا خفتہ رنج کرنے لگی ——— "کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ہونہہ" وہ ان کے قریب جا کر کہنے لگا۔

"نہیں نہیں ——— میں پاگل نہیں ہوں پاگل تو گاندھی ہے۔ نہیں جناح پاگل ہے ——— نہیں نقیرا ہی پاگل ہے۔ وہ مزدوری کرتا ہے۔ ہو ہو ہو۔

پنجابی عورت پیر پٹختے ہوئے پولیس مین کو دیکھنے لگی اور اس اثنا میں سامنے سے مس فاکس سائیکل پر آتی دکھائی دی اور آصف "ڈارلنگ حسینہ۔ تیرا انتظار کب سے تھا۔ کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا وہ بھی اس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی سائیکل پر سے اتر پڑی۔ پھر جانے کیا ہوا... چینی ریستوران کا سارا چوراہا غضب ناک چیخوں سے گونج رہا تھا . . . . . مار ڈالا۔ ہاں مار ڈالا۔ خون۔ دوڑو پکڑو۔ پکڑو۔ مارو . . . . . .

جب چیخیں مدھم ہو کر بھنبھنانے لگیں تو آسمان کے پہلے ستارے نے دیکھا کہ مس فاکس خون میں لتھڑی سمنٹ روڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ اور خون کی دھاریں اس کی مرمریں لمبی پتلی دلآویز گردن سے نکل نکل کر بہہ رہی تھیں۔ آصف کو دو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ اپنا خونی چھرا فضا میں اٹھائے چیخ رہا تھا۔

"دیکھو یہ سارا چوسا ہوا خون بہہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رخساروں پر گیندے کے پھول کبھی نہ کھلیں گے . . . . . . اے اہلِ وطن۔ سارا چوسا ہوا خون . . . . میں نے مس فاکس کو مار ڈالا ہے اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ ہاں اہلِ وطن"

پولیس انسپکٹر آصف کو گردنیاں دے رہا تھا۔ اور لوگوں کی چہ میگوئیاں ——— چہ چہ باتیں چل رہی تھیں۔

"واہ . . . . . بڑا بہادر ہے . . . عورت کو مار ڈالا"

"پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی"

"ہائے رقابت ——— " شاید کوئی شاعر بولا۔

"ابی کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے" شاید کوئی کلرک بولا۔

"بدبخت۔ ان نمک حرام انقلابیوں کی وجہ سے ہی دیس کو آزادی نہیں ملتی" شاید کوئی بنیا بولا۔

پولیس انسپکٹر غصے کے مارے کانپتی ہوئی آواز میں اسے گردنیاں دیتے ہوئے بول رہا تھا "بدمعاش۔ ذلیل کمینہ . . . . "

آصف چیخ رہا تھا۔

"مار ڈالا ہے۔ اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ سارا چوسا ہوا خون . . . . مس فاکس کو مار ڈالا ہے"

سپاہی گردنیاں دے دے کر اس کو اکسفورڈ اسٹریٹ پر دھکیلتے لے جانے لگے۔

"اے اہلِ وطن . . . ."

قدرت اللہ شہاب

سردار جسونت سنگھ

راجہ بازار کے عقب میں گوردوارہ دمدمہ صاحب کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اندرونی دالان میں دسویں پادشاہ سری گورو گوبند سنگھ کلغی والے کا گُرپُرب منانے کے لئے دیوان لگا ہوا تھا، اور بیرونی صحن اور گوردوارہ کے آس پاس ساری کھلی جگہوں میں راولپنڈی اور راولپنڈی کے مضافات کی بیشتر خالصہ آبادی سنگھ سبھا منا رہی تھی۔ کہوٹہ، مری، گوجر خان، چکوال اور پنجاڑ تک سے لوگ جوق در جوق آئے ہوئے تھے اور صبح سے راولپنڈی کے کوچہ و بازار چوڑی چوڑی چھاتیوں والے کڑیل جوانوں اور رنگ برنگ دوپٹوں والی خوبصورت، صحت مند عورتوں کی ٹولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ہر گاؤں کی اپنی اپنی الگ ٹولی تھی اور برادری کا کوئی بڑا بوڑھا اس کی قیادت کر رہا تھا۔ اسی ایک ٹولی میں ماں باپ تھے، میاں بیوی تھے، بھائی بہن تھے، عاشق معشوق تھے —— اور پھر بچے تھے۔ خوبصورت، صحت مند، چاق و چوبند بچے جو راہ چلتے چلتے چوکڑیاں بھرتے تھے، قلابازیاں لگاتے تھے، بکرے بلاتے تھے، چھیڑ گاتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی لاٹھیاں ہوا میں اچھال کر "جو بولے سو نہال —— ست سری اکال" کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔

جوانوں نے سفید، نسواری اور نیلے لٹھے کے تہبند پہنے ہوئے تھے، گھٹنوں تک لمبی بوسکی کی دھاری دار قمیص۔ اس پر مخملی، ریشمی یا گبرون کی سُرخ واسکٹیں، سیپ کے بٹنوں کی قطاریں، جیبوں میں سے دو دو بالشت باہر لٹکتے ہوئے رومال، سر پر رنگ برنگے صافے، آنکھوں میں سُرمہ، ہاتھوں میں لمبی لمبی چمکتی ہوئی سمدار لاٹھیاں؛ کسی نے تہبند کی گانٹھ میں چھپائی ہوئی شراب کی بوتل یا ٹھرے کا ادھا۔ عورتوں نے اخروٹ کے چھلکے مل مل کر اپنے ہونٹ کبوتر کے خون کی طرح سُرخ کئے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی موٹی موٹی لکیریں اور دھوپ میں پا پیادہ چلنے کی وجہ سے گالوں میں تمتماتے ہوئے سُرخ سُرخ انگارے ان کے لباس کی زرق برق بھڑک کے ساتھ مل کر رنگ اور نور کی پھلجھڑیاں سی پیدا کر رہے تھے۔

گوردوارہ دمدمہ صاحب کے باہر سنگھ سبھا میں پہنچ کر گاؤں کی ٹولیوں کی دستہ بندی قائم نہیں رہتی تھی۔ جھولے، چنڈول، کشتی کے اکھاڑے،

دو پیسے میں بارہ من کی دھوبن دریشنے کا جادو دکھانے والے مداری، ایک آنے میں "جوان عاشق عرف بہرام" دکھانے والے تھیٹر، دو آنے میں تین تصویریں کھینچنے والے فوٹو گرافر، چار آنے میں بچھڑے ہوئے محبوب سے ملانے والے نجومی ———— کنگھیوں، آئینوں، رومالوں، حلوائیوں، دہی بڑوں اور چاٹ والوں کی دکانیں ———— یہ سب اپنی کشش سے گاؤں کی بندھی بندھائی ٹولیوں کو تتر بتر کر دیتے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے اس ہجوم میں سے پانی کی سی پریشان لہر اپنی سطح کو پاٹتی تھی ———— اور پھر رفتہ رفتہ یہ ساری بکھری ہوئی لڑیاں اپنے مرکز پر اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ ہر مرکز گوردوارہ دمدمہ صاحب کے اندرونی دالان میں تھا جہاں ایک زرکار شامیانہ کے نیچے گرنتھ صاحب مخملی غلافوں اور تکیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ گرنتھی الوپ سنگھ برابر کبھی دائیں کبھی بائیں ہاتھ سے سفید گھوڑے کی دم سے بنائی ہوئی چوری جھل رہا تھا اور سامنے ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں دیوان میں سنگت سجائے بیٹھی تھیں۔

عورتوں کی سنگت میں گاؤں کی بھری بھری، گدری گدری لڑکیاں بھی تھیں جن کے چہرے کچے ناریل کے گودے کی طرح نکھرے ہوئے تھے اور جن کے تن بدن سے سینٹ یا عطر کی جگہ صرف جوانی کی مہکار آتی تھی۔ کالجوں میں پڑھنے والی شہر کی چھوکریاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے رخساروں پر غازے اور پاؤڈر، سرخی اور سرمے کی نوکدار پنسلوں کی مدد سے عجیب و غریب سنگار کئے ہوئے تھے۔ ان کے اجسام سے جوانی خون کی جگہ مصنوعی عطریات اور سینٹوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں اور انہوں نے اپنی زلفوں کی سیاہ ناگنیں کڑا کر ان کی جگہ مشینوں کے کاڑھے ہوئے کنڈل بنائے ہوئے تھے، اسی شان میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور گھٹنوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد اس کی چاروں لڑکیاں تھیں انہوں نے الگ الگ رنگ کی بنارسی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کی انگوٹھیاں، کانوں کی بالیاں، کلائی گھڑیوں کی پٹیاں، سینڈل اور ہینڈ بیگ بھی ساڑھیوں کے ہم رنگ تھے۔ رات کے آٹھ بجے بھی انہوں نے آنکھوں پر تازہ فیشن کے سیاہ چشمے آویزاں کئے ہوئے تھے تاکہ کالے شیشوں کے مقابلے میں ان کے گورے رنگ اور بھی زیادہ نکھرے ہوئے نظر آئیں اور پنڈال میں جگمگاتی ہوئی بجلیوں کی روشنی ان کی نازک آنکھوں پر گراں نہ گزرے۔ جب یہ لڑکیاں لاہور میں ہوں تو انہیں بلا ناغہ گانے، ناچنے، بندوق کا نشانہ لگانے، تیرنے اور پڑھنے لکھنے کے سوا باقی تمام فنونِ لطیفہ کے مقابلوں میں اول انعام ملا کرتے تھے۔ جب وہ چھٹیاں گزارنے حسن ابدال آتیں تو راولپنڈی کوہ مری اور ایبٹ آباد سے سہیلیوں کو اکٹھا کر کے دیہات سدھار کے پروگرام بنتے تھے۔ کہیں نائٹ سکول کھل رہا ہے، کہیں بچوں کو نہلانے کا دن منایا جا رہا ہے، کہیں صفائی کا ہفتہ، کہیں پھولوں، پھلوں یا سبزیوں کی نمائش ہے، ان گوناگوں مشاغل سے تھک کر کبھی کبھی چاندنی راتوں میں مون لائٹ پک نک ہوتی تھی اور یہ نازک اندام خواتین سیاہ چشمے لگائے، ہلکی پھلکی خوبصورت چھتریاں تان کر اپنے جسم کو چاند کی کرنوں سے بچائے چہل قدمی کو نکلا کرتی تھیں ————

گوردوارہ دمدمہ صاحب کے دالان میں نہ تو لاہور کی رقص گاہوں کی نفاست تھی، اور نہ ہی چاندنی رات میں حسن ابدال کے مرغزاروں کی پاکیزہ لطافت، بلکہ یہاں تو ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے اجسام سے بہتے ہوئے پسینے کی بو چھائی ہوئی تھی اور اس فضا میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بڑی سردارنی اپنے سامنے رکھے ہوئے چاندی کے بکس میں سے کبھی الائچی، کبھی سپاری، کبھی پیپرمنٹ کی ٹکیاں اور کبھی روح کیوڑہ اور عرق گلاب میں بھگوئے ہوئے منقے نکال کر چاروں بیٹیوں میں تقسیم کرتی تھی۔ لیکن ان مفرح اشیاء سے کوئی چیز بھی ان کو تسکین پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بڑی سردارنی خود اپنے ہاتھ سے باری باری ان کے چہروں پر صندل کے بنے ہوئے ہلکے پھلکے پنکھے سے ہوا کرتی تھی۔ یہ پنکھا میسور سے اس نے خاص طور پر بنوایا تھا اور اس کی ہر جنبش کے ساتھ فضا میں صندل کی مشام نواز مہک پھیل جاتی تھی لیکن بڑی سردارنی کی نازک اندام بیٹیاں جس تکلیف میں مبتلا تھیں، اس میں صندل کی مسیحائی بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

عورتیں تو خیر نازک مزاجی کے اس مظاہرے پر ناک سکوں چڑھانے کے علاوہ اور کیا کرتیں لیکن مردوں کے دل اس تکلف کو دیکھ کر بہت بے چین تھے۔ گیانی ترلوچن سنگھ اور اس کے ساتھی بڑے سوز و گداز سے ایک المناک شبد الاپ رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ "اے گرو کے بیٹا! اپنے سارے دکھ مجھے دو اور میرے سارے سکھ تم لے لو۔ اگر تمہیں کانٹا چبھے تو میرے سینے میں تلوار مار دو۔ اگر تمہیں ٹھوکر لگے تو مجھے زندہ زمین میں گاڑ دو۔ اگر تمہیں ذرا سی آنچ آئے تو مجھے آگ میں پھینک کر جلا ڈالو۔ اے گرو کے صاحبزادو......"

عورتوں کی آنکھیں اس شبد کو گاتے گاتے نمناک تھیں۔ ان کے سینے میں عقیدت اور عبودیت اور قربانی کے جذبات بڑی شدت سے موجزن ہو رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے وہ آنچل سے آنسو پونچھتی جا رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے کا "تاطم" تھامے بڑی غمناک لے میں شبد کے بول گا رہی تھیں۔ مردوں پر بھی رقت طاری تھی کیونکہ ان سب سے اکثر گرو کے بیٹوں کی جگہ حسن ابدال کی بڑی سرکار کی صاحبزادیوں کے حضور میں اپنی قربانیوں کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔

گاؤں کے لمبے لمبے چوڑے چوڑے کڑیل جوان ان شبدوں کی لے میں اپنے دل پسند "ماہیا" کے دوہے گنگنا رہے تھے:

اے حسین دوشیزہ!
اگر اس چار دیواری میں تیرا دم گھٹتا ہے
تو آ میرے ساتھ بھاگ چل
میں تجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کے
بہت دور لے جاؤں گا
کھجوروں کے جھنڈ میں
چنے کے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے پاس......
اے نازک اندام دوشیزہ.......
اگر تیرے سینے کے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہیں
تو رات کے وقت چوری چوری میرے کنوئیں پر آ جا
وہاں بڑے خوبصورت جالی بچھائے ہوتے ہیں
جو جنگلی کبوتر ایک دفعہ زیر دام آیا
وہ پھر واپس نہیں گیا.........

....

شہر کے نوجوان بھی اپنے دل میں کچھ ایسے ہی ارادے رکھتے تھے لیکن کھجوروں کے جھنڈ اچنے کے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت اور رات کے وقت چوری چوری چلتے ہوئے رہٹ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے وہ بڑی سرکار کی چاروں بیٹیوں کو ڈلہوزی روڈ، لال کرتی یا راجہ بازار کے کسی ریسٹوران میں لے جانے کی آرزو پر ہی قناعت کرتے تھے جہاں بجلی کے پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر وہ بجلی کے پنکھوں کی ہوائیں، لیمونیڈ، آئس کریم، سوڈا، روز اور دمٹو کا آرڈر دیں اور برفائے ہوئے گلاسوں کا لمس ان خوبصورت ہونٹوں کو تازگی بخش دے، جو اس گرمی میں گلاب کی پتیوں کی طرح خشک ہو کر مرجھائے جا رہے تھے۔ ——— البتہ سردار جسونت سنگھ کو یہ تشویش تھی کہ اس کم بخت شہر راولپنڈی میں ایک بھی سلیقے کا ریسٹوران نہیں جس میں انسان لڑکیوں کو بلا جھجک لے جائے اور اگر اور نہیں تو کم از کم دو چار ڈانس ہی مار لے۔ ولایت سے آنے کے بعد وہ خالی شربت یا لیمونیڈ یا آئس کریم پر عشق جتانے

کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس معاملہ میں اب وہ ضرورت سے زیادہ ترقی پسند ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا کسی لڑکی سے سامنا ہوتا تو اس کے دل میں پہلی امنگ یہ اٹھتی کہ ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے کی بجائے وہ اس کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ملائے، سینما لے جا کر شانہ سے شانہ بھڑ کر بیٹھے اور پھر کسی ریستوران میں کھانا کھلائے، ڈانس کرے .... راولپنڈی میں سینما تو تھے لیکن شانوں کی کمی تھی اور ریستوران تو گویا نہ ہونے کے برابر تھے۔ ابھی چند برس کی بات ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہی ریستوران پیرس کی نقل کرتے تھے۔ شراب، ڈنر اور تمبولا کے کوپنوں کے ساتھ ڈانس کے پانٹر بھی مہیا ہوتے تھے اور ایک ایک کوپن کو حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں 'کیو' میں کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن اب چاروں طرف اُلّو بول رہا تھا۔ شراب کی جگہ "مری اسم مارکہ" لیمونیڈ اور جگا دھر سنگھ جگا دھر سنگھ کے کارخانے کی بنی ہوئی آئس کریم بک رہی تھی، آرکسٹرا کی جگہ فلمی گانوں کے گھسے ہوئے ریکارڈ بجتے تھے اور ناچ کا تو کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔

اس ذہنی اور اعصابی تشنگی کو بجھانے کی کوشش میں وہ کئی بار پٹتے پٹتے بچا تھا کیونکہ اس کے والد سردار گوردیال سنگھ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور کسی حالت میں بھی اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کا بیٹا پرائی لڑکیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے اور حیاداری سے آنکھیں جھکا لینے کی جگہ ہاتھ ملانے یا شانہ سے شانہ بھڑانے کی کوشش کرے اور ڈانس تو خیر بہت دور کی بات تھی۔

سردار جسونت سنگھ مل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ ہائے اب کے بھی بہار یونہی بیت جائے گی! حسن ابدال کی بڑی سرحاتی کی چاروں لڑکیاں کوئی ہیر و تو راولپنڈی آئی نہیں ہیں تو صد حیف کہ انہیں ایک ڈانس پر بھی نہ لے جا سکے۔ یہ احساس اس کے زخموں پر بڑی شدت سے نمک پاشی کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے راولپنڈی اور راولپنڈی کے بے کیف ریستورانوں کے مالکوں اور منیجروں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بڑی بڑی ثقیل گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ غصے سے بل کھا کھا کر وہ اندر ہی اندر گالیاں دیتا تھا اور دایاں ہاتھ زور زور سے اپنی ران پر مارتا جاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کے والد بزرگوار سردار گوردیال سنگھ قریب ہی بیٹھے شبد الاپ رہے تھے۔ بیٹے کی وارفتگی دیکھ کر ان کا جی باغ باغ ہو گیا اور دل ہی دل میں انہوں نے واہگورو جی مہاراج کو تعلیم دی کہ ولایت سے ہو آنے کے بعد بھی ان کا فرزند دلپذیر مذہب کے جذبات سے بدستور سرشار ہے اور گورو کے صاحبزادوں کی شہادت کے شبد پر بھری محفل میں بے اختیار گریہ وزاری کر رہا ہے......

شبد ختم ہوا تو عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے تصورات کی بھول بھلیوں سے نکل کر زور زور سے ناک صاف کئے اور بلند آواز سے "جو بولے سو نہال ——— ست سری اکال" کا نعرہ لگایا، شبد کے بعد گورو گرنتھ صاحب اور جپ جی کا پاٹھ ہوا۔ پھر ارداس ہوئی اور اس کے بعد لانگری سنتوکھ سنگھ دو نہنگ سیواداریوں کے ساتھ نمودار ہوا اور سنگت میں پرشاد تقسیم ہونے لگا۔

نہنگ سیواداریوں نے سوجی کے حلوے کی بڑی بڑی بالٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں، اور وہ خطِ مستقیم میں لانگری سنتوکھ سنگھ کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ لانگری سنتوکھ سنگھ نے آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں اور وہ غڑاپ سے کہنیوں تک بازو بالٹی میں ڈبو ڈبو کر مٹھی بھر تر بتر حلوہ برآمد کرتا تھا اور بڑی چابکدستی سے اسے ہوا میں اچھال کر گیند کی صورت بنا بنا کر تقسیم کرتا جاتا تھا۔ اس عمل میں اس کا بازو سر گڑ دھا کے گھی میں بری طرح لتھڑ جاتا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے بازو پر لگا ہوا گھی اکٹھا کر کے واپس بالٹی میں نچوڑتا جاتا تھا اور پھر وہ اپنی گھنی داڑھی کو انگوچھے کی طرح رگڑ کے اپنے بازو، ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کر لیتا تھا۔ سالہا سال سرگودھے کا خالص گھی پی پی کر لانگری سنتوکھ سنگھ کی داڑھی پچاس برس کے سن میں بھی کاجل کی طرح سیاہ، ابرک کی طرح چمکیلی اور پرانے بڑ کے تنے کی طرح گھنی اور پیچ دار تھی۔ داڑھی میں جا بجا بڑے بڑے پیچیدہ کنڈل تھے جیسے تالاب میں بانس گھما کر جھنور پیدا کئے گئے ہوں۔ پرشاد بانٹتے وقت لانگری سنتوکھ سنگھ کے ہاتھ اور پاؤں یکساں برق رفتاری سے چلتے تھے۔ ہاتھوں سے تو وہ حلوے کی گولیاں بنا بنا کر تقسیم کرتا تھا لیکن پاؤں کے انگوٹھے کی داب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جڑ کر بیٹھے ہوئے انسانوں کے ہجوم میں اپنا راستہ تلاش کرتا تھا۔ اس جستجو میں کبھی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کسی کی رانوں میں گدگدی کرتے تھے، کبھی ان کا تصادم پنڈلیوں

کے ساتھ بہتا تھا اور کبھی وہ راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے ایسی پگڈنڈیوں پر بھی جا بھٹکتے تھے جو شارع عام نہیں ہوتیں! خاص طور پر جب لانگری سنتوکھ سنگھ عورتوں کی سنگت میں پرشاد بانٹ رہا ہو تو بھولنے بھٹکنے کے یہ حادثات بڑی شدت سے رونما ہوا کرتے تھے۔

پرشاد ہو چکا تھا سب نے کھڑے ہو کر بڑے جوش و خروش سے "راج کرے گا خالصہ" کا ملی ترانہ گایا اور پھر "ست سری اکال" کے نعروں کے درمیان دیوان برخاست ہوا۔ اس موقع پہ ایک بار پھر بڑے زوروں کی ریل پیل ہوئی اور کچھ عرصہ کے لئے نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز—— گوردوارہ دو ماسٹر صاحب کے اندرونی صحن سے بیرونی صحن تک آتے آتے بہت سے یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا۔ لیکن سردار جسونت سنگھ کھڑے کا کھڑا ہی رہا۔ ولایت میں اس نے "لیڈیز فرسٹ" کے آداب بڑی محنت سے سیکھے تھے۔ اب وہ ریل پیل اور دھکم دھکا میں شامل ہو کے عورتوں کی ٹانگوں، چھاتیوں اور کولہوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کلچر کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سلیقے سے ایک طرف کھڑا رہا اور اس کے سامنے سے عورتوں اور مردوں کے ہجوم سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسروں سے ٹکراتے، ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے گزرتے رہے۔ جب بھیڑ چھٹ گئی تو سردار جسونت سنگھ گوردوارہ سے باہر آیا جہاں تین تانگے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک تانگے میں اس کا باپ، اس کی ماں اور حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور سوار تھیں۔ دوسرے تانگے میں سردارنی کی تین بیٹیاں بیٹھی تھیں۔ تیسرے تانگے میں بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی اور سردار جسونت سنگھ کی بہن کوشلیا تھیں۔ جسونت سنگھ کے پاس اپنا موٹر سائیکل تھا۔ اس نے سٹارٹر پہ زور سے پاؤں مار کر انجن چلایا۔ پہلے تانگے والے نے جو چکوال کا ہندو کھتری تھا "دیوی ہیرے والی تیری سدا ہی جے" کا نعرہ لگا کر گھوڑے کو چابک مارا، دوسرا تانگے والا کوہاٹ کا مسلمان سید تھا، جواب میں اس نے "پنج نعرے پنج تن کے ایک نعرہ حیدری—— یا علی" کی صدا لگائی۔ تیسرا تانگے والا نسبتاً جوان تھا اس لئے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ منہمک تھا۔ اپنی بغل والی خالی جگہ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ سا لوٹ گیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور کہا:

"ایک بی بی آگے آ جائے۔"

"کیوں جی! ہم ٹھیک ٹھاک بیٹھے ہیں یہاں۔" کوشلیا نے جواب دیا۔

"پیچھے بوجھ زیادہ ہے۔ تانگہ ہلکار ہو رہا ہے۔ اس لئے ایک بی بی آگے آ جائے۔"

کوشلیا بڑی جز بز ہوئی لیکن بڑی سردارنی کی چھوٹی لڑکی نے ایک ہاتھ سے کوشلیا اور دوسرے ہاتھ سے تانگے والے کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹھے بیٹھے چھلانگ لگائی اور اچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ "گوری گوری۔ او بانکی چھوری، کبھی میری گلی آیا کرو......." اب اس تانگے والے کے منہ سے بھی نغمے پھوٹنے لگے۔ اس کا چابک بار بار ہوا میں لہراتا تھا اور وہ حسن و جوانی کے قرب سے سرشار ہو کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا دوسرے تانگوں سے آگے نکل آیا۔ سڑک پر لوگ ادھر ادھر بھاگ کر اس کی زد سے بچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے کہ "پکڑنا، پکڑنا گھوڑا بے قابو ہو رہا ہے۔" لیکن رحمان تانگے والا اپنے گھوڑے سے واقف تھا۔ یہ اس کا گھوڑا نہیں بلکہ اس کا دل تھا جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ کوشلیا دونوں ہاتھوں سے چھت کو پکڑے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی ڈر کر تانگے والے کے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کی زلفیں تانگے والے کے شانے کے بالکل قریب لہرا رہی تھیں۔ اس کا نشیلا تنفس تانگے والے کے بائیں بازو پہ شعلے سے برسا رہا تھا۔ گھوڑے کی برق رفتاری میں ہر نئی سرعت کے ساتھ وہ سہم کر تانگے والے کے اور بھی قریب آ رہی تھی جو کئی فلمی دھنیں ختم کرنے کے بعد اب گا رہا تھا——

"ہاتھ سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آ جائے"

تھا خدا کر کے محلہ موہن پورہ آیا اور محلے کے سرے پہ سردار گوردیال سنگھ کی حویلی۔ سردار جسونت سنگھ باہر کھڑا تانگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سب پہنچ گئے تو سردار گوردیال سنگھ نے رحمان کو ڈانٹا "کیوں بے اناڑی گھوڑا نہیں سنبھال سکتے تو ماں کے پاس گھر بیٹھو، تانگہ کیوں ہانکتے ہو؟"

رحمان نے اپنی ترچھی ٹوپی کا زاویہ بدلا: "سردار جی یہ گھوڑا بجلی ہے بجلی، کبھی بے قابو نہیں ہوتا۔ جاؤ اپنے ہیرے گن لو موتیوں کی طرح سنبھال کر لایا ہوں ——— ہاں!"

"موتیوں کا بچہ!" سردار گوردیال زیرِ لب بڑبڑائے۔ وہ اس وقت خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ کھانا کھانے کے بعد حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی بیٹیوں کو لاہور کی ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی پکڑانی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چکوال کے ہندو کھتری تانگے والے کو دیا۔ "جاؤ تینوں برابر برابر بانٹ لینا۔"

رحمان نے چکوال کے ہندو کھتری اور کوہاٹ کے مسلمان پٹھان تانگے والوں کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ "جاؤ بیٹا دونوں بانٹ لو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا یاروں نے تو اپنی فیس وصول کر لی ہے ——— چل میرے شیر چھم چھم چھم" اس نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور چشم زدن میں یہ جا وہ جا۔

حویلی پہنچ کر گوردوارہ دمدمہ صاحب کے دیوان کی ریل پیل کی صدائے بازگشت یک بار پھر بلند ہوئی۔ حسن ابدال کی سردارنی کی بڑی لڑکی نے دیکھا کہ اس کے بائیں کان کی بالی غائب ہے اور ساتھ والے رخسار پر ایک کھردری سی انگلی کا نشان یوں نمودار ہے جیسے قندھاری انار کو تیز ناخن سے چھیل دیا گیا ہو۔ دوسری کی گردن پر چٹکیوں کے سرخ سرخ دھبے خون کی طرح جھلک رہے تھے، تیسری کے سینے کا ابھار عنقا تھا اور چوتھی کا بلاؤز تار تار ہو کر پس پردہ کے مرمریں اور مہتابی رموز کو افشا کر رہا تھا۔ برخوردار بڑی سردارنی پر بھی کرنٹ سی جلا کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ گیا تھا اور اب ان کی کمر میں بڑی شدت کا درد ہو رہا تھا۔ سردار جسونت سنگھ نے دیکھا کہ اس کی بہن کوشلیا کی انگوٹھی بھی موجود نہیں، جو اس نے لندن سے خاص طور پر اس کے لئے بیس پونڈ میں خریدی تھی۔ اگر اس انگوٹھی پر بھیڑ میں کوئی جیب کترا ہاتھ صاف کر گیا ہے تو بے شک بڑے قلق کی بات ہو گی لیکن اگر خود کوشلیا نے آج چوری چھپے اپنی انگوٹھی ترلوچن سنگھ کی نذر کر دی ہے تو کوئی بات نہیں، سردار جسونت سنگھ کو کوشلیا اور ترلوچن سنگھ کے عشق کا حال معلوم تھا۔

وہ دونوں گورڈن کالج راولپنڈی میں تھرڈ ایئر میں پڑھتے تھے اور آپس میں شدت سے محبت کرتے تھے۔ اگر دو تین برس پہلے سردار جسونت سنگھ پر یہ راز افشا ہوتا تو وہ گنڈاسا اٹھا کر کوشلیا اور ترلوچن سنگھ دونوں کے سر قلم کر دیتا۔ لیکن ولایت سے آ کر وہ کوشلیا کو بہن کے علاوہ ایک ہمدرد اور رفیق کی حیثیت سے بھی چاہنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے ہمراز بن گئے تھے اور جب کبھی سردار جسونت سنگھ کے اعصاب پر راولپنڈی کے بے کیف ریسٹورانوں اور ویران ہوٹلوں کا احساس بری طرح حملہ آور ہوتا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے مغربی موسیقی کے ریکارڈ لگا کر کوشلیا کو رمبا، والٹز اور فاکس ٹروٹ کے ڈانس سکھاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کا اصرار تھا کہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی چاروں بیٹیوں کے کھانے کا انتظام میز، کرسی، کانٹے اور چھری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ کوشلیا نے بھی حسبِ توفیق اس کی تائید کی لیکن دستور کے مطابق سردار گوردیال سنگھ کی رائے کا پلہ بھاری رہا، دالان میں دری بچھا کر اس پر مرزا پور کے دو قالین لگائے گئے تھے۔ مہمانوں میں محلہ مرین پورہ کے بہت سے سردار اور سردارنیاں شامل تھیں۔ ناگری سنتوکھ سنگھ بھی موجود تھا ——— گوردوارہ میں پرشاد بانٹ کر اس نے دن بھر کی تکان دور کرنے کے لئے بھنگ کے تین چار گلاس چڑھا لئے تھے اور اب وہ نشے کی ترنگ میں بڑی سردارنی کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا لگائے بیٹھا کلغی والے دسویں بادشاہ کے شجاعانہ کارناموں پر گورمکھی کے پر اثر اشلوک سنا رہا تھا ——— اس کے دو ننگ سیوا کاری یہاں بھی بڑے بڑے مورچھل پنکھے اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے اور حتی الوسع کوشش کرتے تھے کہ پنکھے کی ہر جنبش کے ساتھ بڑی سردارنی کی بیٹیوں کے بالوں اور کپڑوں کی ساری مہک ان کے پاس کھنچ کر آ جائے۔

کھانے کے بعد بڑی سردارنی کی بیٹیوں نے یکے بعد دیگرے سردار جسونت سنگھ کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر تیسری بار اپنے چہروں کو

آراستہ کیا۔ جسونت سنگھ اور کوشلیا دونوں انہیں رات کے ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی پر سوار کرانے پر مامور ہوئے۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد سردار جسونت سنگھ نے کوشلیا کو اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھا لیا اور پوچھا:

"کوشلیا! تم نے آج اپنی انگوٹھی نہیں پہنی کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں بھراتا جی! پہنی تو تھی شاید کہیں بھیڑ بھاڑ میں گر گئی ہو۔" کوشلیا نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"گرتی کیسے؟ تمہاری انگلی پر تو وہ بہت پھنس کے آتی تھی نا؟"

سردار جسونت سنگھ کا منہ سامنے کی طرف تھا اس لئے وہ قرمزی رنگ کے اس غبار کو نہ دیکھ سکا جو شفقِ شام کی طرح کوشلیا کی آنکھوں، ہونٹوں اور رخساروں پر چھایا جا رہا تھا۔

"بھراتا جی!" کوشلیا کی آواز کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا جیسے تیر نکل جانے کے بعد کمان اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔

"چلو اس کی طرف چلیں میری بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"بھراتا جی؟" کوشلیا حیرت اور احسان کے جذبوں میں گڈمڈ ہو گئی۔

"ذرا میں بھی دیکھوں کہ وہ جانور ہے کس ڈھب کا۔ ولایت میں لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کی بڑے فخر سے نمائش کیا کرتی ہیں۔ میں تمہیں مارگریٹ براؤنی کا قصہ سناتا ہوں جو میرے ساتھ ہندوستان آنے پر جان دے رہی تھی۔" سردار جسونت سنگھ یہ کہانی سنانے میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ کئی جگہ راہگیروں، چھکڑوں، بیلوں، کتوں اور بجلی کے کھمبوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ "بھلا سوچو تو کوشلیا اگر میں اسے لے آتا تو بھائیا جی جوتے مار مار کر ہوش ٹھکانے لگا دیتے دونوں کے۔ معلوم نہیں بیچاری کس حال میں ہوگی۔ کل یاد دلانا میں اسے ضرور خط لکھوں گا۔"

کوشلیا نے نہ تو مارگریٹ براؤنی کے حالِ زار پر کوئی خاص توجہ دی، نہ ہی سردار جسونت سنگھ کے خط لکھنے کی یاد دہانی کرائی۔ کیونکہ اس کے دماغ میں اول تو ترلوچن سنگھ ہی ترلوچن سنگھ بسا ہوا تھا اور اب اس کے علاوہ بھائیا جی کے جوتوں کا خیال بھی دوش بدوش اُبھر آیا تھا۔ یوں سردار گوردیال سنگھ بڑے شفیق اور ہنس مکھ باپ تھے لیکن جہاں بچوں کی تعلیم یا تربیت یا چلن میں کسی قسم کا رخنہ نظر آئے وہاں ان کا ہاتھ بے اختیار جوتوں کی طرف لپکتا تھا۔ تنبیہہ و سرزنش کا یہ فن انہوں نے اپنے ایامِ تحصیلداری میں حاصل کیا تھا اور ان کے تجربہ کے مطابق یہ طریق کار بہت مؤثر تھا۔

گورڈن کالج کے ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر کوشلیا موٹر سائیکل سے اتری اور ایک بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر، اس نے ایک پتھر سے کئی بار اپنے مخصوص انداز میں ٹن ٹن کی، جیسے تار گھر کا بابو گر گر گٹ گٹ کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا بھر میں نشر کیا کرتا ہے، ٹن ٹن کی آواز سن کر اوپر والے ایک کمرے میں روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ترلوچن سنگھ کھڑکی میں نمودار ہوا اور قریب لگے ہوئے پانی کے پائپ کو پکڑ کر اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ اس عمل میں اس کے دونوں ہاتھ اور گھٹنے زنگ آلودہ نل سے رگڑ کھا کر بُری طرح شل ہو گئے تھے۔ نیچے پہنچ کر وہ لپکا کہ اپنی زخمی ہتھیلیوں کو کوشلیا کی خنک اور شام نواز زلفوں میں چھپا لے لیکن یکایک اس کی نظر سردار جسونت سنگھ پر پڑی جو اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

ترلوچن سنگھ کے قدم من من جیسے بھاری ہو گئے۔ جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اچانک اسے منجمد کر دیا ہو۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور کرتے کے نیچے لگی ہوئی کرپان پر جا کے رُک گیا۔

"ترلوچن آجاؤ" کوشلیا نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ "یہ میرے بھراتا جی ہیں۔"

ترلوچن سنگھ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار جسونت سنگھ کوشلیا کے برادرِ بزرگوار ہیں لیکن جو چیز اس کے دل میں بُری طرح کھٹک رہی تھی

وہ اس وقت ان کی یہاں موجودگی تھی۔ کیونکہ ترلوچن سنگھ کے وہم وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی بھائی رات کے ایک بجے اپنی بہن کو اس کے عاشق سے ملاتا پھرے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے، اس نے سوچا۔ چنانچہ کرپان پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی گئی۔

"گھبراؤ مت۔" اب سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کو مخاطب کیا۔ "اگر تمہارے اس چھ انچ کی کرپان ہے تو میرے پاس ۳۲ بور کا جرمن ریوالور ہے۔ لیکن میں تمہاری طرح بزدل یا گنوار نہیں ہوں۔ تم بے خوف وخطر یہاں آجاؤ۔"

ترلوچن سنگھ آگے بڑھنے لگا لیکن کرپان پر اپنی گرفت نہ چھوڑی۔

سردار جسونت سنگھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ "میرا نام جسونت سنگھ ہے، ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر۔"

ترلوچن سنگھ حیرانی، پریشانی اور تذبذب کے جال میں ایسا گرفتار تھا کہ اس وقت اسے ان رسمی تکلفات کا ہوش نہ تھا۔

سردار جسونت سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں کوشلیا کا بھائی ہوں۔ مجھے دیکھ کر شاید تمہیں پہلے یہ خیال آیا ہو کہ میں تمہارا سر قلم کرنے آیا ہوں۔ اب ہمارے جانے کے بعد شاید تم سوچو گے کہ میں آدھی رات میں بہن کی دلالی کرتا پھر رہا ہوں۔ دونوں خیال اس ملک میں بڑی آسانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی کے بھی ذہنی تانے بانے کو بدل کر رکھ دوں۔ ہاں اگر تم ایک شریف آدمی کی طرح واقعی میری بہن سے محبت کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم یہاں چاندنی میں جی کھول کر باتیں کر سکتے ہو۔ میں گیٹ کے باہر انتظار کروں گا۔" سردار جسونت سنگھ موٹر سائیکل کو گھسیٹتا گھسیٹتا باہر لے گیا۔

"ترلوچی!" کوشلیا نے کہا۔

"کوشل!" ترلوچن نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

چاندنی بھی چھائی ہوئی تھی اور قریب ہی پیپل کا وہ دانائے راز درخت بھی تھا جس کی کہنہ سال آنکھ نے سال بہ سال نئی کوشلیاؤں اور نت نئے ترلوچنوں کے رومان پروان چڑھتے دیکھے تھے۔ اسی درخت کے سائے میں پیمان بندھتے اور ٹوٹتے رہتے۔ یہیں حسن ومحبت کی طلسماتی روحیں اپنا سحر پھیلاتی تھیں۔ اسی کی چھاؤں میں شاعری جنم لیتی تھی۔ افسانوں کے جال بُنے جاتے تھے۔ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں کو حیات جاودانی نصیب ہوتی تھی —— لیکن اس وقت کوشلیا اور ترلوچن کوئی اور بات نہ کر سکے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سکول کے دو روٹھے ہوئے بچوں کو کمرے میں بند کر دیا گیا ہو کہ گھنٹی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آپس میں صلح کر لو —— اور دروازے پر ماسٹر صاحب چھڑی لئے منتظر بیٹھے ہوں!

تسنیم سلیم چھتاری

ٹوٹ گیا اِک تارا

سائنس کا گھنٹہ تھا اور اسٹرانومی پڑھائی جا رہی تھی۔ ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا، "تارے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟" پروفیسر صاحب اس وقت لیکچر میں گم تھے۔ انہوں نے اس سوال پر دھیان نہیں دیا۔

اسی لڑکے نے پھر یہی سوال کیا اور پروفیسر صاحب نے دوبارہ بھی نہیں سُنا تو میرے قریب سے ایک دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا:

"مجھ سے پوچھو ...... جب کسی کی موت آتی ہے تو تارا ٹوٹتا ہے۔"

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔" اس فقرے سے سب کے کان آشنا تھے۔ یہ بات لاکھ مرتبہ چمکتے تارے کی طرح دل کے آسمان پر طلوع ہوئی تھی اور تکلیف کی اندھیری گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔ مجھے اس جواب نے وہ ساری کہانی یاد دلا دی جس میں ایک تارہ نکلا، چمکا اور پھر اپنے پیچھے یاد کی گہری لکیر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

پانچ برس پہلے کی بات! مگر کیا پچاس برس کے بعد بھی میں انجم کو بھول سکوں گا؟ نہیں! مگر کاش! ان دنوں میں، کوٹھیں کلاس میں تھا۔ شور و شغب کا عادی اور شرارت پسند! دنیا بھر کے کھیلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور صبح سے شام تک نت نئی حرکتیں کیا کرتا ...... روز کپڑے پھٹتے، گھٹنے اور کہنیاں لہولہان رہتیں، اماں ابا کی ڈانٹ بھی پڑتی اور چوٹوں کی تکلیف بھی ہوتی، پر اس دکھ میں کیسا خوشی کا پہلو تھا، پھٹے ہوئے کپڑے اور مجروح جسم لے کر انجم کے پاس پہنچا۔

"انجم خدا کے لئے ...... دیکھئے آج اماں سے ضرور پٹ جاؤں گا۔"

"کیا ہو گیا؟" وہ پوچھتیں۔

"دیکھئے کیسی خراش لگی ہے ...... اور یہ قمیص کی آستین مونڈھے پر سے الگ ...... اور کرتے کا بٹن ندارد ...... اُف۔

کتنا خون نکلا ہے ؟"

"شریر!" ایک ہلکا سا تھپڑ میرے بے ترتیب بالوں پر پڑتا۔ "چلو اب غارہ کرو دکھا کر لاؤں . . . . لاڈلے کے ڈھنگ ۔"

"ارے ارے . . . . . . کیا جوتیاں کھلوایئے گا . . . . . . قسم آپ کی چھپ کر آیا ہوں، اب یہاں منہ ہاتھ دھو کر جاؤں گا . . . . . . اگر انہوں نے دیکھ لیا اس شان میں تو آپ سمجھ لیجئے کیا ہوگا ؟"

"اچھا ہے مجھے تو خوشی ہوگی تم مہینے میں چار چھ جوڑے تو چیتھڑے کر لیتے ہو! اور یہ جو روزمرہ چوٹیں لگتی ہیں . . . . . . مجھے تو ڈر ہے کسی دن ہاتھ پیر ہڈی نہ پہنچ جائے . . . . . ."

"پھر آپ بُرے گا . . . . . آپ ہی تیمارداری کیجئے گا ۔"

"ہاں جیسے تمہاری نوکر ہوں نا!"

پھر سچ مچ وہ نوکروں کی طرح سے ہاتھ منہ دھلاتیں، کپڑے سیتیں، زخموں پر ان کے پرانے دوپٹوں کی پٹیاں باندھتیں۔ جب میں درست ہو کر چلنے لگتا تو وہ ہنس کر کہتیں: "پرویز میں کہے دیتی ہوں اگر اب تم نے . . . . . ." میں ہنستا ہوا بھاگ آتا اور دوسرے دن پھر اسی حالت میں پہنچتا۔

انجم مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ پھر کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں . . . . . . میں اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود ان سے کچھ اس طرح کھل گیا تھا جیسے چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے کا فرق ہی باقی نہ رہا ہو۔ اپنی دلچسپی کی ساری باتیں ان کو سناتا اور ان کی ساری باتیں بڑے شوق سے سنتا . . . . . . اور کبھی سوچنے لگتا کہ مجھے کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبوں سے کیا تعلق! —— انجم کو ہاکی اور فٹ بال سے کیا واسطہ! مگر یہ نہیں کہ ہم باتیں کرتے اکتاتے ہوں . . . . . ایک کہہ رہا ہے دوسرا محویت سے سن رہا ہے کچھ ایسی باتیں کہ تیسرا آ بیٹھے تو حشر تک نہ سمجھے کہ آخر گفتگو کا موضوع کیا ہے۔

ایک سال میں کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی جب شروع میں ہم ان کے یہاں کرایہ دار ہو کر آئے تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ یہ ایک عدد لمبی تڑنگی لڑکی یہاں موجود ہے۔ ان دنوں میں لڑکیوں سے بے حد گھبراتا تھا۔ آج بھی اسی قدر! مگر انجم کو شاید اشرف المخلوقات سے بھی کچھ بڑھ کر پایا اور وہ بہت جلد میرے خیالات اور احساسات کی شریک بن گئیں۔

دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں مجھ میں لاکھوں باتیں نئی پیدا ہوئیں اور پرانی علیحدہ ہو گئیں۔ نئے کھیل سیکھے، نئے دوست بنائے، نئی باتیں سوچیں اور نئی باتیں سنیں . . . . . . آنکھوں میں بھی شاید نئے نئے رنگ تیرتے تھے۔ جب ہی تو جدھر نگاہ اٹھتی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی مگر انجم! کیا اس ایک سال نے رتی بھر فرق بھی پیدا کیا تھا ان میں وہی لبوں کی خفیف سی لرزش پر وہی مسکراہٹ کا رقص! وہی ہلکے سے تھرتھراتی ہوئی پلکوں کے درمیان سے دو تاروں کی شعاعیں وہی سیاہ بالوں میں ڈوبتی ابھرتی لہریں . . . . . . وہی ہاتھوں کی نرمی اور وہی آواز کا رس! وہ کہیں سے ذرہ برابر نہیں بدلیں اور میں اس یک رنگی سے کتنا مانوس ہو گیا تھا . . . . . . کبھی کبھی سوچتا کہ اگر انجم اپنے مخصوص انداز کے بجائے ذرا اکڑ کر چلنا شروع کر دیں خوابیدہ سی آنکھوں کے بجائے اور لڑکیوں کی طرح دیدے پھاڑ کر باتیں کرنے لگیں تو کیسی عجیب لگیں گی! اچھی یا بری! . . . یا مجھے خیال آتا وہ ہلکے ہلکے رنگوں کے بجائے گہرے رنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیں یا شلوار قمیص کے بجائے ساڑھی باندھنے لگیں تو کیا میں انہیں بیک نظر پہچان لوں گا! اور کیا تب بھی ان کے چہرے پر یہی بشاشت ہوگی . . . . . شاید نہیں۔

ان کی باتیں کیسی اچھی اور کتنی مخصوص تھیں!

میں سونے کے معاملے میں بہت ماہر تھا مگر جب سے انہوں نے بتایا کہ وہ روز صبح کو باغ میں پھول چننے جاتی ہیں اور دیر تک وہاں ٹہلتی ہیں، تو آپ سے آپ میری آنکھ صبح سویرے کھل جاتی اور میں سلیپر گھسیٹتا ہوا باغ میں پہنچتا۔ وہ حوض کے کنارے کرسی پر بیٹھی میری منتظر ہوتیں . . . . . . سفید شلوار کے شبنم سے بھیگے ہوئے پائنچے . . . . کسی ہلکے رنگ کے باریک سے دوپٹے میں شگفتہ چہرہ جیسے اوس میں بھیگا ہوا گلاب! اور ایک

مخصوص فقرہ!

"کہو...... کیا حال چال ہے؟"

"رات بھر گھٹنے میں درد رہا...... جانے آپ نے کیا منحوس دوا لگائی تھی؟"

"لو اب مجھے الزام دیتے ہو...... شریر...... اچھا اب میں پھول جمع کرتی ہوں...... شرط یہ ہے کہ تم کسی پھول کو ہاتھ نہ لگانا۔"

"واہ یہ کیا پابندی ہے؟" میں جل جاتا۔

"بھائی پرویز تم مرد ہو...... سنا ہے کہ مردوں کے ہاتھ بہت سخت ہوتے ہیں...... پھول مرجھا جاتا ہے۔"

میں اس دلیل کو روز مان لیتا اور چپ چاپ بیٹھا انہیں تکتا رہتا۔ وہ پھول توڑ کر واپس جانے لگتیں تو میں ان سے ایک پھول مانگ لیتا۔

"میرا حصہ لائیے!"

وہ کوئی اچھا سا پھول لے کر میرے نائٹ ڈریس کے کوٹ میں اٹکا دیتیں۔ میں واپس آ کر کپڑے بدلتا اور ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا......

دن بھر دماغ میں میٹھی میٹھی سوچ کی بارش ہوتی رہتی اور جب شام کو کھیل سے واپسی پر سیدھا ان کے یہاں پہنچتا تو وہ پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بنائے اور مختلف اقسام کے مرہم لئے میری راہ تک رہی ہوتیں۔

زندگی کا یہ دور بھی کتنا مطمئن اور پُرسکون تھا مجھے ہر صبح شام کا انتظار رہتا کہ اپنا زخم خوردہ جسم ان کی تیمارداری کے سپرد کر دوں اور شام گزرنے پر صبح کا رستہ تکتا کہ ان سے باغ میں جا کر ملوں؛ اسی چکر میں دن بھاگتے چلے گئے۔

رفتہ رفتہ میری یہ کیفیت ہو گئی کہ نہ کسی دوست سے دوستی اور نہ کسی کھیل سے دلچسپی! ہر دم یہی خواہش کہ بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہوں خود بخود یہی خیال آتا کہ وہ مجھ سے گھبرا نہ جائیں یہ نہ پوچھیں کہ بلا ضرورت کیوں آئے ہو...... میں وہاں جانے کے لئے کھوں بہانے ڈھونڈتا ایسا بھی ہوا کہ دانستہ ٹھوکر کھائی اور چوٹ مار لی، جان بوجھ کر کپڑے پھاڑے اور پہنچ گیا۔ یہ بھی نہیں تو جا کر منہ بسورنے لگا۔

"خیر تو ہے کیا ہوا؟"

"بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔"

"کیوں دوپہر کو کھانا نہیں ملا تھا؟"

"وہ سب ہضم ہو گیا۔"

"تو پھر؟" گہری مسکراہٹ سے آنکھوں کی لو بھڑک اٹھتی۔

"کچھ کھلائیے جلدی......"

"ایک شرط پر!"

"کہئے!"

"مجھے بازار سے اس رنگ کا اُون لا دو گے؟" وہ نمونہ دکھلاتیں۔

"ایک شرط پر!" مجھے بھی شرارت سوجھتی۔

"وہ کیا؟"

"اگر آپ اُون کے پیسے دیں۔"

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہتے۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاتیں اور میں بازار سے اُون لے آتا۔

پھر ایک عجیب سا احساس جو میرے لئے عجیب بھی تھا اور پریشان کن بھی! میں نے محسوس کیا کہ جب وہ میرے علاوہ کسی اور سے باتیں کرتی ہیں تو مجھے ناگوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہیں تو میرا جی اُلجھتا ہے، ان سے کوئی ملنے آتا ہے تو مجھے بُرا لگتا ہے۔۔ ۔۔ خدا جانے کیوں! کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں ان کے یہاں پہنچا تو اور دو چار لڑکیوں کو بیٹھے پایا۔ میں لوٹنے لگتا تو انجم مجھے روک لیتیں۔

"ارے بھئی پرویز کہاں بھاگ رہے ہو؟"

میں ٹھہر جاتا تو ۔۔۔۔ "یہ تمہارے لیے منگوائے ہیں! کھاؤ نا، کیا تک رہے ہو۔۔۔۔ ارے بھئی ایسی بھی کیا شرم!"

ایسے میں ان کی میٹھی میٹھی باتیں بھی کڑوی لگتیں ۔۔۔۔۔۔ سب تو خوش ہیں اور میں تماشہ بنا بیٹھا سوچ رہا ہوں یہ کیا زبردستی ہے۔۔۔۔۔۔ اٹھنے لگوں گا تو روکا جاؤں گا اور رُک جاؤں گا تو مجھ سے بے فکر ہو کر اِدھر اُدھر باتوں میں لگ جائیں گی! مجھے بھی اتنا غصہ آتا کہ بیان سے باہر۔۔۔ مگر ان سے احتراز ناممکن تھا۔۔۔۔ ایک نامعلوم سی کشش!

اور ہاں مجھے ایک دُکھ بھی تھا۔ میں انہیں اپنا ساتھی اپنا دوست، اپنا رفیق اپنا ہم راز سب کچھ سمجھتا۔۔۔ اور وہ مجھے ایک کمسن اور نادان بچہ! وہ مجھ سے عمر میں یقیناً بہت بڑی تھیں پانچ یا چھ سال، مگر میں ناسمجھ اور نادان بچہ نہیں ہوں محبت اور نفرت کو سمجھتا ہوں مجھے آنسو اور ہنسی کی حقیقت معلوم ہے۔۔۔ بے تکلفی اور محبت کے علاوہ مجھے ان کے سلوک میں ایک طرح کا بزرگانہ اور ناصحانہ انداز دکھائی دیتا اور میں جھنجھلا سا جاتا۔۔۔ یا تو وہ مجھے اپنے برابر کا سمجھیں۔ میری نگاہوں میں کچھ دیکھیں میری باتوں میں کچھ پائیں۔۔۔۔۔۔ اور میری کمسنی کا ان کو اسی قدر احساس ہے تو مجھے صحیح معنوں میں بچہ سمجھ لیں۔۔۔۔۔۔ مجھے دیکھ کر لیٹے سے بیٹھ جاتی ہیں، ڈھلکا ہوا دوپٹہ گلے میں آ لپٹتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بات پر کہہ اٹھتی ہیں "تم نہیں سمجھتے پرویز تم ابھی بچے ہو۔۔۔۔۔۔ "وہ بچپن سے عقل لگنے کا شوق!"

میں چِڑ سا جاتا۔۔۔۔۔ مگر خاموش!

پھر ایک دن۔۔۔۔۔۔

"انجم! انجم! کہاں ہیں آپ؟"

"یہ رہی!" وہ ہمیشہ کی طرح ایک آدھ بنے سوئٹر سے الجھ رہی تھیں۔

"آج تو ایسی بھوک لگی ہے کہ زندگی میں نہ لگی ہوگی۔"

"اسے تب تو کسی ثقیل غذا کی ضرورت ہے۔"

"ہاں بس جلدی کیجئے۔"

"بلا معاوضہ کے نہیں!"

"کیا چاہیے؟" میں نے شان کے ساتھ کہا۔

"دیکھو پرویز! یہ میں اپنی ایک سہیلی کا سوئٹر بُن رہی ہوں اور بدقسمتی سے اس میں ایک لچھی اُون کم پڑے گا۔"

"میں تو نہیں لا دوں گا۔" سہیلی کے ذکر سے میں بگڑ گیا۔

"کیوں بھئی یہ خفگی کیسی؟"

"جب دیکھو آپ سہیلیوں کے سوئٹر بُنتی ہیں۔۔۔ کبھی ہم کو بھی کچھ بُن کر دیا۔۔۔ میں تو اب ہرگز ہی اُون لا کر نہ دوں گا۔"

"اچھا یہ بات ہے۔۔۔۔۔ ایمان سے کہنا کبھی تم نے فرمائش بھی کی؟"

"میں کیوں فرمائش کرتا جب آپ کو خود ہی خیال نہ آیا؟"

"میں چاہتی تھی کہ تم اپنے منہ سے کہو۔"

"میرا دل تھا کہ آپ کو اپنی طرف سے رحم آجائے۔"

وہ ہنسنے لگیں اور پھر بولیں: "مجھے یہ بات تسلیم ہے مگر دیکھو پرویز اگر تم نے اس کا شکوہ کیا تو یہ ہم دونوں کے لئے خوشی کی بات نہیں ہے؟"

ان کا یہ سوال! کہنے کا انداز!! اور اپنی مسرت کی انتہا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک ہفتہ بعد جو گیا تو انہوں نے سفید رنگ کا بے حد خوبصورت اور نرم سوئیٹر مجھے پہنا دیا۔

"بولو پسند ہے؟"

"سوئیٹر تو پسند ہے مگر آپ کا یہ سوال کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"آپ کا خیال تھا کہ میں اسے ناپسند بھی کر سکتا ہوں؟"

جب اپنی طرف لوٹا تو زمین پر قدم نہیں پڑتے تھے اور آپ سے آپ ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔

اماں نے دیکھ کر کہا: "ارے یہ نیا سوئیٹر!"

میں نے کہا: "جی ہاں انجم نے بُن کر دیا ہے۔"

وہ کہنے لگیں: "انجم بہت محبت کرتی ہے تجھ سے...... اگر تیری عمر کی ہوتی تو ہم شادی کر دیتے۔"

اماں نے یہ فقرہ یونہی سرسری طور پر ازراہِ مذاق کہا تھا۔ مگر میں اس حد تک حواس باختہ ہوا کہ دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

"انجم کی شادی اور میرے ساتھ...... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر نہیں! میں ایسا خواب بھی دیکھوں تو پھر آنکھ کھل لینے کی نوبت نہ آئے!

میں انجم سے محبت کرتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں! وہ کہیں تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں مگر شادی! ان کی تو محض پرستش کی جا سکتی ہے۔ ...... اگر کہیں یہ ممکنات سے ہوتا تو بھی میں اس کے لئے تیار نہ ہوتا...... میری نگاہ میں تو یہ ان کی توہین ہے...... اگر وہ سنیں تو شاید پھر مجھ سے بات بھی نہ کریں...... مجھے تو وہ بچہ سمجھتی ہیں...... چھوٹا سا بچہ جو چوٹ کھا کر بسورتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے...... جو بھوک کی حالت میں ان کے پاس جاتا ہے اور کچھ کھا کر مطمئن ہو جاتا ہے...... کمسن بچہ جسے ابھی سگرٹ نہیں پینا چاہئے عطر نہیں لگانا چاہئے...... اور شاید وہ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس دودھ پیتے بچے کو ان سے محبت کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہے......

اسی لئے انہوں نے میری حالت کو قابلِ غور نہیں سمجھا اور مجھے ان سے ان لاکھ باتوں میں سے ایک بھی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی جو میں دن رات سوچا کرتا تھا...... میں انہیں ہر دم دیکھنا، بات کرنا، پاس بیٹھنا ضرور چاہتا ہوں مگر شادی! اگر اس کی کوئی صورت ہوتی تو کیا میں اسے برداشت کر لیتا...... میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں تاحیات ان کو باغ کے پھول چنتا ہوا دیکھتا رہوں ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں! وہ سر جھکائے میرے ہاتھ پیروں کی چوٹوں کا معالجہ کرتی رہیں اور میں چٹکی باندھے ان کے بالوں میں گھونگر کی لہریں تکتا رہوں۔ وہ بڑے انہماک سے میرے لئے تکمے ٹانکتی رہیں اور میں پاس بیٹھا ان کے رخساروں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی پلکوں کا سایہ لرزتا ہوا دیکھتا رہوں...... ایسی ہی ایک مرہم سی لرزش جیسے ان کے سامنے پہنچ کر میرے پیر ڈگمگا جاتے ہیں۔

میں جاؤں تو وہ مسکرا کر پوچھیں: "ہاں تو کیا حال چال ہے؟" میں واپس آنے لگوں تو ہنس کر کہیں: "پرویز میں کہے دیتی ہوں......؟ شادی تو ان کی جلد ہی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ جو ان سے عمر میں دو چار سال بڑا ہوگا کہیں نوکر ہوگا...... اور پھر جسے وہ پسند کریں گی۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر ان کی شادی ہو گئی تو وہ یہاں سے چلی جائیں گی اور میری زندگی کا سہانا خواب بکھر کے رہ جائے گا۔ دل کو زبردست دھکا لگا ...... کیا اب میں ان سے جُدا رہ کر بھی خوش رہ سکتا ہوں ...... وہ میری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہیں۔ ان کی مسکراہٹ، ان کی باتیں، ان کی گہری گہری آنکھیں ...... اور میں گہری گھاٹیوں میں ڈوب گیا ......

اماں نے کہا: "کل بھائی جان آ رہے ہیں۔"

میری محویت کا سلسلہ ٹوٹ گیا ...... چلو اچھا ہے بھائی جان آ رہے ہیں ڈیڑھ سال بعد ان سے ملاقات ہوگی۔ دیکھیں اب بھی پہلے کی طرح شعر و افسانہ پسند کرتے ہیں یا نوکری نے کچھ تبدیل کر دیا۔

اُدھر بھائی جان بی۔اے کر کے نوکر ہوئے اُدھر ابّا جان کا تبادلہ ہوا اور ہم یہاں آ گئے۔ اماں بیچ میں ایک مہینہ کے لئے ان کے پاس ہو آئی تھیں اور ابّا جان بھی اکثر دورے کے سلسلے میں ان سے مل لیتے بس میں نے ہی ڈیڑھ سال سے نہ دیکھا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ابّا جان کو بھائی جان نے لکھا بھی تھا کہ پرویز کو یہاں بھیج دیجئے۔ میں بھی راضی ہو چلا تھا مگر انجم نے کہا کہ "تم ناحق جا رہے ہو گرل کر جاؤ۔" میں نے جھٹ سے اگرماں جانے سے انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ اب بھائی جان کو ایک مہینہ کی چھٹی ملی تو وہ یہاں خود ہی آ رہے تھے!

میں بھائی جان کو لینے اسٹیشن گیا وہ حسبِ توقع خوب صاحب بہادر بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: "کیسی جگہ ہے؟ ایک مہینہ خوب شاندار گزرے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا: "اب جیسی بھی جگہ ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔"

"کیوں نہیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ سوسائٹی کیسی ہے؟ ...... سینما ہاؤس کیسے ہیں، کلب کتنے ہیں اور ہوٹل کہاں کہاں ہیں؟ ...... تفریح کا کیا پروگرام رہتا ہے؟"

میں نے کہا: "مجھے ہوٹل اور کلب کی تو خود خبر نہیں! سوسائٹی اچھی خاصی ہے، دو چار سینما ہاؤس بھی ہیں۔"

"انگلش فلم چلتی ہیں؟"

"کبھی کبھی ......"

"لاحول ولا قوۃ۔"

"کیوں؟"

"وقت ضائع ہوگا یہاں اور کیا ...... آخر تم چھٹیوں میں میرے پاس کیوں نہ آ گئے ...... کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟ اسکول اور گھر؟ بس؟"

"ہاں بس اور کیا۔"

"دل نہیں گھبراتا؟ صحت ٹھیک ہے!"

"کمال کرتے ہیں آپ بھائی جان ......"

"بھئی کم از کم میں تو اس طرح نہیں رہ سکتا ...... سوچتا ہوں کہ مہینہ بھر کے بجائے دس پندرہ دن میں بھاگ جاؤں ...... تم بھی میرے ساتھ چلنا: سمجھے؟ وہیں اسکول میں داخل ہو جانا ...... انسان بن جاؤ گے، سمجھے؟"

اسٹیشن سے گھر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔

اماں سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کئے!

"یہ کس کا بنگلہ ہے؟ وہ کس کی کوٹھی ہے؟ اُدھر کون رہتا ہے؟"

میں سب بتاتا رہا۔

"اور یہ برابر کا گھر......؟"

"انجم!"

"کون انجم؟ یہ کون صاحب ہیں؟"

اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انتہائی مہمل قسم کا جواب دیا تھا۔

"ایک وکیل صاحب ہیں وہ مع فیملی رہتے ہیں۔"

"وکیل صاحب کا نام زوردار ہے! انجم!" بھائی جان نے زیرِ لب کہا۔

میں گھبرا گیا۔ "وکیل صاحب کا نہیں انجم تو ان کی لڑکی کا نام ہے۔"

"اوہ!" بھائی جان نے مجھے سرتاپا گھورا۔ "تو کیا بہت دوستی ہے تم سے؟"

"دوستی کیا...... بس۔" میں سٹپٹا گیا۔

"خوب! گویا کہ آپ بھی؟" انہوں نے معنی خیز طریقے پر ہنسنا شروع کیا۔

"تو پھر تفصیل بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟"

"اچھی خاصی ہیں...... آپ کی برابر ہوں گی۔" میں نے ان کا شبہ مٹانا چاہا۔

"میری برابر؟ اوہ! یوں کہو! میں تو سمجھا تھا کہ آپ!........"

میں سوچنے لگا کہ جو بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں اسے بھائی جان یوں لمحوں میں کیسے سمجھے لے رہے تھے!

بھائی جان کرسی پر لیٹ کر کوئی انگریزی کا ناول پڑھنے لگے اور میں نے سوچا کہ دیر تو ہو گئی ہے مگر لاؤ انجم کے یہاں ہو آؤں...... ان کو بتاؤں گا کہ ہمارے بھائی جان آئے ہیں۔ .... دفعتہً مجھے دروازے پر ان کی آواز سنائی دی: "پرویز!"

میں نے چونک کر کہا "جی!"

"کیا ہوا آج تم......." وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئیں۔ بھائی جان بھی سر اٹھا کر گھورنے لگے۔

"یہ میرے بھائی جان ہیں۔" میں نے تعارف کی رسم ضروری سمجھی۔ "اور بھائی جان یہ انجم ہیں... میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

بھائی جان نے مسکرا کر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

انہوں نے عمداً بھائی جان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کر دیا اور کھڑکی سے باہر نگاہ جما کر بولیں: "معاف کیجئے مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"اوہ!" بھائی جان نے سنبھل کر کہا: "کوئی حرج نہیں مجھے تو اردو آتی ہے۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگیں۔

"انجم ذرا تو بیٹھئے نا۔" میں نے سوچا کہ اب بھائی جان ان کو بداخلاق اور پتہ نہیں کیا کیا کہیں گے اور میرا جی جلے گا۔

"جی ہاں آپ تشریف لائی ہیں تو بیٹھئے نا۔" بھائی جان نے بھی کہا۔

"بہت کام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج پروین نہیں آئے تو میں سمجھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا آداب عرض!" اور وہ چلی گئیں۔

میں نے سہمی سہمی نظروں سے بھائی جان کی طرف دیکھا کہ کیا کہتے ہیں مگر وہ کسی سوچ میں گم تھے۔

دوسرے دن اسکول کی واپسی پر میں نے سوچا کہ اب ان کے یہاں چلنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اٹھا ہی تھا جو بھائی جان نے کہا۔

"کہاں چلے؟"

"کہیں نہیں۔"

"انجم کے یہاں نہیں جاؤ گے؟"

"سوچ رہا ہوں۔"

"چلو ہم بھی چلتے ہیں۔" وہ اللہ کریں میرے ساتھ چل دیئے۔ میرا دل چاہا کہ کاش وہ میرے ساتھ نہ جاتے میں انجم سے اچھی طرح بات بھی نہ کر سکوں گا اور گل کی سی وحشت پھیلے گی۔

وہاں پہنچے تو انجم کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بھائی جان کو بہت پیار کیا، دعائیں دیں۔ وکیل صاحب آ گئے چائے کا دور چلتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا انجم کو دیکھتا رہا جو آج بالکل چہرہ بے تاب تھیں تھوڑی دیر بعد ہم لوٹ آئے! بھائی جان دیر تک اماں سے وکیل صاحب کی تعریف کرتے رہے۔

تیسرے روز میں اسکول کی واپسی پر اپنے معمول کے مطابق سیدھا انجم کے یہاں پہنچا۔ اول گھر جانے میں خطرہ تھا کہ پھر بھائی جان ساتھ چلیں گے اور انجم سے بات چیت نہ ہو سکے گی! میں انہیں یہ بتانے کے لئے مضطرب تھا کہ اس دفعہ مجھے کرکٹ میں کپ ملنے کی امید ہے پہنچا تو دیکھا کہ صوفے پر لیٹی ہوئی آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہیں۔ میں چپ چاپ جا کر پیچھے کھڑا ہو گیا اور بصد مشکل یہ شعر سمجھ سکا ؎

نہ جانے آج کیوں دھڑکن مرے دل کی نہیں رکتی
یہ آہٹ آپ کی تھی آپ گزرے تھے ابھی دل سے

کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر شرارت سوجھی اور پانی کا گلاس میز پر سے اٹھا کر ان کے منہ پر چھینٹا دیا۔

تڑپ کر انہوں نے گردن موڑی اور مجھے دیکھ کر ہنس دیں: "اچھا ٹھہر جاؤ بدلہ نہ لیا ہو تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔"

"آہا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ!"

"واقعی؟"

"ہاں میں ڈر رہا تھا کہ کہیں دھوبی گدھے کی تلاش میں ادھر نہ آ نکلے۔"

"تو ہماری آواز گدھے جیسی ہے؟" انہوں نے میرے منہ پر کشن دے مارا۔

"نہیں توبہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاف کیجئے منہ سے سچی بات نکل گئی۔"

"ٹھہر جاؤ بدتمیز تمہارے لئے کھانے کی چیزیں رکھی تھیں اب ہرگز نہ دوں گی۔"

"کھل گئی قسمت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ بھی کتنی اچھی ہیں۔"

"جی ہاں تب ہی تو یہ قدر ہوتی ہے۔"

"کہہ تو رہا ہوں بھول کر منہ سے نکل گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کھلایئے نا کیا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے آپ کبھی ایسی عمدہ نہ تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیسے

میرا خیال آیا؟"

"جاوید صاحب کے لئے بنائے تھے..... چونکہ تمہاری پسند کے تھے اس لئے رکھ لئے۔"

"تو کیا بھائی جان یہاں آئے تھے؟"

"ہاں ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے۔"

"آپ سے باتیں ہوئیں؟"

"ظاہر ہے ابا جان بھی یہاں موجود نہ تھے اور اماں کو تم جانتے ہو کہ وہ کتنی کم گو ہیں...... بیچارے جاوید صاحب چپکے ہی بیٹھے رہتے۔"

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟" میں یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔

"وہ اپنے دورانِ تعلیم کی کچھ دلچسپ باتیں سناتے رہے۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہو گیا...... شاید میں یہ چاہتا تھا کہ انجم کو سوائے میرے اور کسی کی باتیں دلچسپ نہ لگیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روز جب میں اسکول کی واپسی پر ان کے پاس جاتا تو وہ مجھے بتاتیں کہ ابھی جاوید صاحب یہاں سے گئے ہیں.... اور یہ بھی کہ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں.... انجم کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا اسی طرح باتیں، چوٹوں کا معالجہ، کپڑوں کی درستی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ مجھ سے دور ہٹتی جا رہی ہیں....... کوئی ہمارے درمیان حائل ہو گیا ہے! کون؟ بھائی جان! مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے رقیب تو نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ باتیں اب سوچتا ہوں اس وقت تو ایک ہی خیال تھا کہ وہ مجھ سے نہ چھن جائیں...... اور بس!

اتوار کی صبح بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ ان کے یہاں پہنچے باتوں باتوں میں گانے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے کہا "بھائی جان بہت اچھا گاتے ہیں۔" یہ بات سچ بھی تھی! انجم نے کہا کہ جاوید صاحب کو گانا سنانا پڑے گا۔ بھائی جان نے اوّل دو چار دفعہ معذرت کی، پھر تیار ہو گئے!

گانا شروع کیا "کون سا گیت سنو گی انجم؟"

انجم نے کہا "جو آپ سنائیں گے۔"

"کون سا گیت سنو گی انجم؟"

"کوئی سا بھی! گائیے تو آخر!"

"گا تو رہا ہوں" بھائی جان نے جواب دیا۔

"واہ یہ کوئی گانا ہے؟"

"ارے اور کیا.... یہ تو جان نثار اختر کی نظم ہے۔"

"ہم نہیں سنتے...... کوئی ڈھنگ کی چیز سنائیے۔"

بھائی جان نے ایک غزل گائی جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے۔

شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

انجم ساکت بیٹھی سنتی رہیں۔ بعد میں تعریف کچھ اس طرح سے کی کہ بھائی جان کو بہت سی چیزیں گانی پڑیں۔
انجم کو بھائی جان کی آواز اتنی پسند آئی کہ اب وہ ہر ملاقات میں گانے کی فرمائش کرتیں۔ ان بہت سی ملاقاتوں میں سے جن میں شریک ہونے کا مجھے بہت کم موقعہ ملتا تھا۔

بھائی جان ہمیشہ اسی سے شروع کرتے:

"کون سا گیت سنو گی انجم؟
گنگناتا سا فسانہ کوئی
یا محبت کا ترانہ کوئی
کیسے جلتا ہے نشانہ کوئی
کون سا گیت سنو گی انجم؟"

اور آخر کار سب ہی طرح کے گیت سنا ڈالتے...... میں کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا...... بھائی جان کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا...... پہلے تو ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ دن بھی نہ رہ سکیں گے۔ اور اب انہوں نے بیماری کے نام سے ایک مہینے کی چھٹی بڑھوا لی۔ حالانکہ یہ بہت چھوٹا شہر تھا جس میں نہ اچھے ہوٹل اور نہ عمدہ کلب! مگر بھائی جان خوش تھے اور انجم بھی...... اگر میں رنجیدہ تھا تو اس کی وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر اس کا تذکرہ کس سے کرتا........ ہاں مگر دل پر ہر لمحہ ایک بوجھ سا رہتا اور روح جیسے تھک کر آنکھیں بند کرنا چاہتی ہو۔

وقت کی رفتار کو میں نہ روکنا چاہتا تھا اور پھر مشیت کو ان کھیلوں سے کیا ایسے نامکمل افسانوں کے خاکے بہت سے بکھرے پڑے رہتے ہیں...... اگر آنسو کسی لمحہ بھی نہ رکیں تو ان کا دل سے احترام ہی جاتا رہتا ہے۔

یونہی چپ چاپ وہ دوسرا مہینہ بھی بیت گیا۔

ابا جان نے کہا: "جاوید تم نوکری پر کب جا رہے ہو؟"

"سمجھ میں نہیں آتا ابا جان۔"

"کیوں؟ چھٹی کون سی تاریخ سے ختم ہوتی ہے؟"

"مجھے آج وہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔"

"تو پھر تم کیوں نہیں گئے؟"

"سوچتا ہوں کہ اب خود جاؤں یا استعفا بھیج دوں۔"

"استعفا!" ابا جان نے چونک کر پوچھا۔ "اب نوکری کا ارادہ نہیں ہے؟"

"یہ نوکری کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا جان..... پھر ہمارا افسر بڑا سخت ہے۔ بس ذرا ذرا سی بات پر..... اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ وہاں مجھے اچھا کھانا نہیں ملتا....... آپ نے محسوس کیا کہ یہاں آ کر میری صحت کتنی سنبھل گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کچھ دن یہاں رہ کر بے فکری کروں۔"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں سے جاکر بھائی جان مجھے آدمی بنانا چاہتے تھے وہ جگہ ان کی نظر میں اب کس قدر بے رنگ و بے بو ہو گئی ہے۔ جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہیں وہاں کھانا برا کیسے ملتا ہے۔ جہاں اچھی انگلش فلمیں چلتی ہیں وہاں کیوں دل نہیں لگتا اور جس افسر کی وہ ہمیشہ تعریف

لکھا کرتے تھے وہ اب بڑا کیوں ہوگیا ہے ...... میں یہ سب جانتا تھا اور مجھے بھائی جان سے ہمدردی بھی تھی...... وہ میرے رقیب تو نہیں۔ انہوں نے انجم کو میری طرف سے توڑ نہیں ڈالا..... اور پھر وہ کیا جانیں کہ میں اداس رہتا ہوں!

میرے دل میں شدید یہ آرزو پیدا ہوتی کہ کاش انجم کی بھائی جان کے ساتھ شادی ہو جاتی! میں انہیں خود کوئی گیت نہ سنا سکا مگر زندگی بھر گیت سنتے تو دیکھتا رہوں گا...... اور کیا یہ میرے لئے بہت نہیں!

بھائی جان نے نوکری چھوڑ دی...... انجم سنتی رہتیں میں دیکھتا رہتا اور وہ گاتے رہتے۔

کوئی فطرت کا بہاریں نغمہ؟ چاندتاروں کا خماریں نغمہ؟
یا شگوفوں کا نگاریں نغمہ؟ کون سا گیت سنو گی انجم؟

نغموں کا ایک تانا بانا سا بن کر ہمارے چاروں طرف پھیل گیا۔ ایک طرف بھائی جان گاتے تھے...... دوسری طرف میں تنہا مجبور! بیچ میں انجم! ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی! ایک کے حال سے غافل اور دوسرے کی باتوں سے باخبر! میں دن رات اس الجھن میں اپنے لئے سکون کی تلاش کرتا رہتا...... مگر میں چاہتا کیا تھا یہ مجھے آج بھی معلوم نہیں ہے۔

ایک صبح جب ابا جان کسی ضروری کام سے ہفتہ بھر کے لئے باہر جا رہے تھے تو چچا جان کی علالت کا تار موصول ہوا...... ابا جان کو انتہائی ضروری کام تھا۔ انہوں نے بھائی جان سے کہا کہ تم آج ہی شام کو اپنے چچا کے پاس لکھنؤ چلے جاؤ اور ہفتہ بھر بعد جب میں وہاں پہنچوں تو تم واپس چلے آنا۔ بھائی جان اس خبر سے مضطرب ہو گئے مگر لاچار تھے۔ اسی شام کو جانا پڑا۔ انجم سے ملنے گئے تو میں عمداً گھر پر رہ گیا۔ میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ جاؤں! واپس لوٹے تو کتنے افسردہ تھے۔ مجھے رحم آنے لگا...... بھائی جان کو اسٹیشن پہنچا کر میں نے سوچا کہ انجم کے پاس چلتا ہوں، ان سے کہوں گا کہ بھائی جان ایک ہفتہ بعد ضرور آ جائیں گے۔

ان کے یہاں پہنچا وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھیں۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ ان کو آواز دوں! چپ چاپ لوٹ آیا۔

پھر دوسرے دن صبح کو باغ میں گیا۔ نومبر کی شروع تاریخیں تھیں اور صبح کے وقت خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی مگر میں صبح کو باغ میں ضرور جاتا تھا اور وہ مجھے وہاں ضرور ملتی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ آج خدا جانے وہ موجود ہوں گی یا نہیں مگر پہلی نظر میں ان کو حوض کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھ لیا! حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"جاوید، ایک ہفتہ بعد ضرور واپس آ جائیں گے؟"

"ہاں ضرور!"

"اچھا...... پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا! سمجھے؟"

"سمجھ گیا"

انہوں نے پھول توڑے اور جب ایک گلاب کا پھول میرے کوٹ میں لگا کر واپس چلی گئیں تو میں نے سنگ مرمر کے چبوترہ پر بیٹھ کر محسوس کیا آج بہت دن بعد میری بے چین روح کو کسی نے لوریاں دے کر آرام کی نیند سلا دیا ہے...... اور میں بہت خوش ہوں!

ایک ہفتہ گذر گیا۔

"آج تمہارے بھائی جان کے آنے کا دن ہے؟"

"جی ہاں آج آ جائیں گے!"

"تم اسٹیشن جاؤ گے؟"

"ضرور جاؤں گا۔"

"پھر ان کے ساتھ یہاں آؤ گے؟"

"ضرور آؤں گا۔"

میں شام کو گیا ضرور مگر بھائی جان کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا! انجم کو یہ بتانے کہ چچا کی طبیعت بدستور خراب ہے بھائی جان ایک ہفتہ بعد آئیں گے

—— اور ایک ہفتہ!

یہ دوسرا ہفتہ ان کے چہرہ پر اُداسی کا رنگ مل مل کر گزر گیا مگر بھائی جان پھر بھی نہیں آئے۔۔ ۔ چچا کی طبیعت ابھی تک خراب تھی۔

آخرکار ابا جان اماں کو لے کر وہاں چلے گئے اور میں یہاں تنہا رہ گیا۔ زیادہ وقت اسکول کے علاوہ انجم کے پاس گزارتا وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ۔۔۔۔۔۔ میرا دل ڈوب جاتا ۔۔۔۔۔۔ میں اس کوشش بدامان جنت سے بھی باز آیا۔۔۔۔۔۔ بھائی جان لوٹ آئیں تو پھر بلا سے انجم کی یہ اداسی ساری کی ساری زندگی کے لئے مجھ پر مسلط ہو جائے مگر ان کے آنسو! جیسے یہ میرا گناہ ہو——

دو ڈھائی مہینے ایسے عجیب گزرے ۔۔۔۔۔ رُکے رُکے اور پھیکے پھیکے ۔۔۔۔۔۔ ابا جان لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چچا جان اچھی طرح سے ہیں اور اب میں جاؤں گا تو تمہاری ماں کو لے آؤں گا جاوید بھی تب ہی آئیں گے۔

میں نے انجم کو جا کر بتایا۔

"آجائیں تب کی بات ہے۔" انجم نے کہا۔

اور میں نے سوچا کہ آخر کیوں نہیں آئیں گے ۔۔۔۔۔ ضرور آئیں گے۔

ابا جان دوبارہ گئے۔ واپسی کا جو دن بتلا گئے تھے اس کا میں نے لمحہ لمحہ گن کر انتظار کیا۔ "آج بھائی جان ضرور آجائیں گے۔"

"دیکھو!"

"مذاق نہیں ڈٹ کر ناشتہ کھلانا پڑے گا آپ کو۔"

"اچھا!"

اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی لیٹ تھی اور مجھے جھنجھل آ رہی تھی خدا خدا کر کے ریل آئی تو ابا جان تنہا اُترے۔ میں گھٹ کر رہ گیا۔

"بھائی جان اور اماں کہاں ہیں؟"

"وہیں ہیں!" ابا جان نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں آئے؟"

"بس ہفتہ بھر بعد آنے والے ہیں ۔۔۔۔۔۔ جاوید تو انگلینڈ جا رہا ہے۔"

"ایں!" مجھے ابا جان کی بات کا اعتبار نہ آیا۔

"مذاق نہیں ۔۔۔ سارا انتظام ہو چکا ہفتہ بھر بعد تو یہاں آئے گا اور دو دن ٹھہر کر اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔"

"یہ کیا سوجھا؟"

"اس کو تو ایسی ہی نئی نئی سوجھتی ہے پہلے کہا نوکری کروں گا میں نے کہا تمہاری مرضی پھر استعفیٰ دے دیا۔ میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اب بیٹھے بٹھائے تعلیم کا شوق ہوا تو ولایت چل دیئے! مجھ کو تو اب خبر ہوئی جب ان کا پاسپورٹ تک بن چکا ہے۔"

"آپ نے روکا نہیں؟" میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"میں کیا روک سکتا وہ اس قدر خود مختار ہیں، ان کو چاہیئے تھا کہ اوّل مجھ سے اجازت لیتے۔ ماں رو رو کر جان کا خون کر رہی تھی مگر صاحب زادے نے قسم کھائی ہے کہ ولایت جا کر پڑھوں گا۔"

میں سکتے کے عالم میں گھر لوٹ آیا۔ انجم کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ ولایت کا قصہ اگر وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی اُف توبہ!

میں نے کوشش بھی کی تو وہاں نہ جا سکا۔ . . صبح کو باغ میں گیا۔

"جاوید نہ آئے تو آپ بھی چھپ گئے؟"

"ابا جان نے کچھ کام بتا دیا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان تو خیر اب کیا آئیں گے مگر خالہ جان کیوں نہیں آئیں؟"

"جناب شرط ہے اگر اگلے ہفتے سب نہ آ جائیں۔"

"بس جاؤ بھی۔" انجم نے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتے ہوئے بھیگی بھیگی پلکیں میری طرف اٹھائیں۔ . . میں سر سے پیر تک لرز گیا۔

اور لاکھ کوشش کی مگر بھائی جان کے ولایت جانے کی بات نہ سنا سکا۔ جس دن پھر ان کے آنے کی خبر تھی اس دن مجھ کو علم تھا کہ وہ ضرور آ جائیں گے۔ مگر اس یقین میں کتنا دکھ اور غم تھا یہ میں جانتا ہوں۔ وہ آئیں گے اور تیسرے دن چلے جائیں گے۔ . . . . . ایسی جگہ جہاں سے واپسی کے لئے ہفتے نہیں گنے جاتے بلکہ برسوں کا شمار ہوتا ہے۔

بھائی جان ریل سے اترے۔

"آپ ولایت جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیوں؟"

"پڑھنے!"

"کیا پڑھنے؟"

"بس کچھ . . . . . محض ایک ولایتی ڈگری چاہیئے!" اور وہ ہنسنے لگے۔ گھر آ کر انہوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ مجھ سے انجم کے متعلق ایک بھی سوال نہ کیا اور نہ وہاں گئے۔ میں بھی دم بخود بیٹھا رہا۔

اماں بہت دن کے بعد آئی تھیں اس لئے انجم کی والدہ ان سے ملنے کو آئیں۔ اماں نے انہیں بتا دیا کہ جاوید پرسوں ولایت جا رہا ہے۔ میں لرز گیا کہ اب یہ انجم سے جا کر کہہ دیں گی اور پھر نہ جانے کیا ہوگا! مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غصہ آ رہا تھا۔ اس طرح بنتے تھے کہ جیسے ان کو انجم سے بہت محبت ہے اور اب بلا وجہ ولایت جا رہے ہیں تو ان سے ملے تک نہیں . . . ان کی زندگی برباد کرنے کے یہ ذمہ دار ہیں۔ ان کا کیا بگڑا؟ انجم بجھ کر رہ جائے گی اور میری زندگی پھیکی اور بے رس! کیا مجھے انجم سے محبت نہیں؟ اور میں ان کا دکھ خوشی سے برداشت کر سکوں گا؟ اس گہرے سوچ نے دوسرے دن شام تک میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں ڈر کے مارے انجم کے پاس بھی تو نہ جا سکا۔ نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔ بھائی جان کے سامان کی مکمل فہرست بنا کر میں کمرے میں گیا جہاں وہ ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی چیزیں اٹیچی بیگ میں بند کر رہے تھے! ——— دروازے پر پہنچا تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ الجھے ہوئے سے الفاظ! انجم وہاں موجود تھیں! میرے قدم رک گئے ——— کچھ دیر بعد بھائی جان کی آواز آئی۔

"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم"

بھائی جان کو اب بھی جاں نثار اختر کی کوئی نظم یاد آ گئی تھی۔ مگر انجم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔

"تو پھر زندگی کیا ہے؟"

میں بھائی جان کا جواب سننے سے پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ انجم کے آنسو بھی آگ کی طرح میری رگوں میں گھل کر مجھے جھلسے دے رہے تھے۔

دوسرے دن صبح کو بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ اسٹیشن جا کر گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر آؤ۔ میں نے بمبئی جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا جو رات کو ساڑھے دس بجے یہاں سے جاتی تھی اور پھر گھر کی طرف لوٹا تو انجم مجھے اپنے باغ کے پھاٹک پر مل گئیں۔

"پرویز میرا ایک کام کرو گے؟"

"کہیے" میں نے ان کی متورم آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے بسی کے ساتھ کہا۔

"جاوید آج جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کتنے بجے؟"

"رات کو ساڑھے دس بجے!"

"اچھا...... تو ان سے کہنا کہ جانے سے پہلے میں ان سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا"

"اور دیکھو کہنا کہ سات بجے شام کے بعد سے میں ان کا یہاں باغ میں انتظار کروں گی وہ مجھ سے گھر سے کھڑے کھڑے مل لیں۔"

"مگر انجم یہاں باغ میں تو رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔"

"کوئی حرج نہیں میں ان کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔"

"لیکن آپ خود؟"

"میری پروا نہ کرو...... تو پرویز تم ان سے کہہ دو گے نا؟"

"ہاں ہاں ضرور!"

میں دیر تک کھڑا ہوا ان کو ڈگمگاتے قدموں سے واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گھر آ کر بھائی جان کو ان کا پیغام سنا دیا۔ وہ سن کر چپ ہو گئے اور پھر سے مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ ابا جان کے دوست اور اماں کی سہیلیاں سب جمع ہونے لگیں۔ کوئی امام ضامن لے کر آیا تھا اور کوئی صدقہ اتارتا تھا۔

شام گزر رہی اور رات ہو گئی: "بھائی جان آپ انجم سے مل لیجیے۔"

"وہ خود یہاں کیوں نہیں آتیں؟"

"باغ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں نا!"

"میں کس طرح جاؤں یہاں اتنے لوگ جمع ہیں؟"

"دس پندرہ منٹ کو ہو آتے اب آٹھ بج گئے اور وہ سات بجے سے وہاں آپ کی منتظر ہوں گی۔"

"اچھا دیکھو موقع نکالتا ہوں۔"

نو بج گئے۔

"بھائی جان اب دس بج چکے ...... آپ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں چلے جائیں گے۔

"ہاں!"

"انجم سے مل لیجئے نا"

"دیکھو اماں کس قدر رو رہی ہیں۔ یہاں سے اٹھ کر گیا تو وہ کیا سوچیں گی؟"

"بس پانچ منٹ کے لئے"

"کوشش کرتا ہوں"

"بھائی جان دس بج گئے"

"کیا کروں پرویز سمجھ میں نہیں آتا"

"ایک لمحے کو ہو آیئے"

"کوئی اٹھنے دے تبھی نا"

سوا دس بجے تو ابا جان نے کہا "بیٹا جاؤ اب تمہاری روانگی کا وقت ہو گیا"

"چلتا ہوں ابا جان!"

میں نے مضطرب ہو کر بھائی جان سے کہا "بھائی جان انجم!"

"مجبور ہوں پرویز"

اور جب موٹروں میں بیٹھ کر سب سٹیشن چلنے لگے تو میرے کانوں میں آپ سے آپ انجم کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کاش بھائی جان ان سے لمحہ بھر کو ہی جا کر مل لیتے وہ اس شدت کی سردی میں ٹھٹھرتے ان سے منتظر ہوں گی۔ اسٹیشن پہنچے تو اماں کی روتے روتے بری حالت ہو رہی تھی بھائی جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے "خط لکھتے رہنا پرویز"

جب ریل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آنسو پونچھ کر اماں سے کہا "اب واپس چلئے" ابا جان تو بھائی جان کو چھوڑنے لمبیٹی گئے ہیں۔ ہم اماں لوٹ کر آئے اماں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے ورنہ میں اسی وقت جا کر انجم سے ملتا۔ میرے سینے میں آنسوؤں کا طوفان اُبل رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ سارے آنسو میں انہی کے سامنے جا کر بہاؤں ...... ممکن ہے کہ ہم دونوں کو تسکین ہو جائے۔ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سینے میں نامعلوم چبھن ہوتی رہی۔

صبح کو چھ بجے کے قریب میں بستر سے اٹھ کر برآمدے میں نکل آیا۔ فروری کا شروع تھا اور گذشتہ رات غیر معمولی سردی رہ چکی تھی۔ کہرے کے اثر سے آس پاس کچھ نظر نہ آتا تھا۔ خلا میں نظر جمائے خاموش کھڑا رہا۔ جب سے سردیوں شدت کی ہوئیں تو انجم نے صبح سویرے کے بجائے دن چڑھے باغ میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اس لئے میں بھی دیر سے جایا کرتا تھا۔ آج ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کہرے اور ٹھنڈ میں نکل جاؤں اور باغ کا چکر کاٹوں اور کوٹ پہن کر میں باغ میں چلا گیا جہاں اوس سے ہر چیز تر تھی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی چکر لگا کر سنگ مرمر کے چبوترے تک پہنچا اور دفعتہً ٹھٹھک کر رہ گیا ... کوئی لیٹا ہوا تھا! شاید انجم!

میں دوڑ کر قریب گیا ..... وہی تو تھیں!

"انجم ... انجم!" وہ شاید سو رہی تھیں ...... وہ اتنے سویرے بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں آ گئی ہیں اور اس برف جیسے سنگ مرمر پر لیٹی ہیں .... میں نے حیران ہو کر ان کا ہاتھ کھینچا "انجم!"

مگر وہ بے حس و حرکت تھیں۔ کپڑے اوس کے اثر سے بالکل بھیگے ہوئے تھے ہاتھ برف سے زیادہ ٹھنڈے اور چہرہ سنگِ مرمر سے زیادہ سفید گیا! انہوں نے ساری رات یہاں گزاری ہے! اور یہ حالت!

بجلی کی طرح ایک وحشت ناک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور میں نے ان کو پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ دیا: "انجم! انجم!"

انہوں نے آنکھیں کھول دیں چونک کر نہیں بلکہ سہم کر!

"پرویز!"

"یہ آپ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں" انہوں نے گردوپیش پر اپنی ویران نگاہیں دوڑا کر کہا۔

"کب سے یہاں لیٹی ہیں؟"

"کب سے؟ بس مجھے تک تو مجھے یاد ہے کہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔"

"تو آپ رات بھر یہاں رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"اس شدید ٹھنڈ میں؟"

"نہیں زیادہ ٹھنڈ تو نہ تھی۔"

"واہ رات کو قیامت کی سردی تھی جب ہم اسٹیشن سے لوٹ رہے تھے تو ڈھائی سے زائد بج رہا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان گئے؟"

میں اس کا جواب نہ دے سکا۔

"تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

میں اب بھی خاموش رہا۔

"اچھا یہ تو بتا دو انہوں نے میرے لئے کوئی بات بھی نہیں کہلائی؟"

میں نے بیتاب ہو کر ان سے کہا: "انجم میں آپ سے یہاں بات نہ کروں گا۔ خدا کے لئے اندر چلئے آپ کو احساس نہیں آپ کا کیا حال ہے؟"

"چلو!" وہ چلنے لگیں مگر لڑکھڑا گئیں۔

"ٹھہریئے" میں نے ان کے بازو کو سہارا دیا ان کے چہرے پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کپڑے تو اس قدر تر تھے کہ نچوڑے جا سکتے تھے۔

میں نے ان کو پکڑ کر ان کے کمرے تک پہنچا دیا اور واپس آتے ہوئے کہا کہ "میں اسکول سے واپسی پر آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ جا کر آگ کے پاس بیٹھئے۔ خدا نہ کرے اگر سردی لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔"

اسکول گیا مگر مطلق کام نہ ہو سکا۔ ایسا اضمحلال تھا کہ جس کو بیان ہی نہیں کر سکتا...... واپس لوٹا تو سیدھا ان کے یہاں گیا اور برآمدے میں ہی حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا وکیل صاحب بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں ساتھ تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا۔

"انجم کی طبیعت خراب ہے!"

میں سمجھ گیا کہ یہ رات کی سردی کا نتیجہ ہے کمرے میں جا کر دیکھا تو بخار کی تیزی سے بیہوش تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں! مجھ سے

ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گھر آکر اماں کو بتایا اور بستر پر گر پڑا۔

"خدایا اب کیا ہو گا؟"

پھر تھوڑی دیر بعد گیا وہی کیفیت تھی، دیکھتا رہا اور پھر لوٹ آیا۔ صبح کو اسکول سے پہلے گیا پتہ چلا رات پھر طبیعت سخت خراب رہی ہے اور اب بھی بیہوش ہیں۔۔۔۔

اسکول جانے کی ہمت نہ تھی مگر کہیں سکون بھی نہ ملتا تھا لاچار چلا گیا اور پورے وقت کلاس میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شام کو دھڑکتے دل سے جاکر دیکھا۔۔۔۔۔ سارے گھر میں مُردنی چھا رہی تھی۔ برآمدے میں ڈاکٹر اور وکیل صاحب باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا، "نمونیہ ہو گیا ہے دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے۔۔۔۔۔ پوری احتیاط کیجئے آگے خدا مالک ہے۔"

میں وہیں سے بھاگ آیا اور باغ میں ایک تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور دل کو کوئی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔

"اللہ کرے انجم اچھی ہو جائیں اور ان کے بدلے مجھے موت آجائے۔"

رات کو گیا دیر تک پلنگ کے پاس کھڑا رہا۔ ان کی طبیعت بدستور خراب تھی اور بیہوش تھیں۔۔۔۔۔۔ میں نے واپس آکر ساری رات کرسی پر بیٹھے گذار دی۔۔۔۔۔۔ اور تڑپ تڑپ کر دوا اور دن!

ڈاکٹروں نے انجکشن دے دے کر ان کے دونوں بازو چھلنی کر دئے تھے مگر ان کو احساس نہ تھا۔

بیماری کے چار جان لیوا دن گذرنے کے بعد پانچویں دن صبح کو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت بہتر ہے اور ہوش میں ہیں! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا! اماں اکثر وہیں رہتی تھیں۔ اس وقت بھی موجود تھیں میں نے کمرے میں جاکر دیکھا تو انجم آنکھیں کھولے ہوئے بیٹھی تھیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

وکیل صاحب کی بیوی بھی مطمئن تھیں انہوں نے اماں سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"جاوید میاں کب لوٹیں گے؟"

اماں نے کہا، "دو سال کی کہہ گیا ہے۔"

"بہن تم نے ناحق جانے دیا ماشاءاللہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تو ہیں۔"

"آج کل کے زمانہ میں اماں باوا کی کون سنتا ہے جو جی میں آئے کرتے ہیں۔ میں نے تو بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ آیا۔"

"پھر بھی آخر گئے کیوں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بہن آج کل کی لڑکیوں میں شرم کا تو نام نہیں۔ دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے۔۔۔۔ جاوید چچا کی بیماری میں گئے تھے ان کی لڑکی بست فیشن ایبل ہے۔ بی۔ اے پاس ہے؛ وہ کہنے لگی کہ میں تو اس سے شادی کروں گی جس کے پاس ولایت کی ڈگری ہو گی؛ بس جاوید کو چڑ ہو گئی کہ ولایت جاؤں گا۔۔۔۔۔ پھر کس کے کہنے سے رکتا؟"

"تو چچا کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"اوہ کیا یہی تو بات ہے۔"

وکیل صاحب کی بیوی اور اماں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور میرا دم رکا جا رہا تھا۔ مجھے خود بھی علم نہ تھا کہ بھائی جان کس وجہ سے دفعتہً ولایت جانے کو تیار ہو گئے ہیں! اب پتہ چلا کہ چچا کی لڑکی نے یہ فرمائش کی تھی! کاش اماں نے یہ سب انجم کے سامنے نہ کہا ہوتا

میں نے انجم کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

وکیل صاحب نے آ کر کہا کہ ڈاکٹر نے مریض کے کمرے میں زیادہ بیٹھنے کو منع کر دیا ہے۔ ہم واپس آ گئے۔

ماں کی گفتگو نے مجھے عجیب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج ان کی طبیعت سنبھلی تو یہ خبر سنی۔ اب اللہ جانے اس کا کیا اثر لیں گی۔

شام کو گھر سے نکل ہی رہا تھا جو ان کا نوکر بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ کو جلدی بھیجئے۔ انجم بی بی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔"

میں ان کی بات ختم ہونے سے پہلے بھاگا اور سیدھا ان کے کمرے میں گیا ۔ ۔ ۔ ۔ یا اللہ کیا عجیب عالم تھا۔ تین چار ڈاکٹر پلنگ کے پاس جمع تھے اور بار بار انجکشن دیے رہے تھے۔ انجم بالکل غافل تھیں۔ ور زور زور سے سانس آ رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ باہر برآمدے میں بھی اس کی آواز صاف سنائی دے۔

وکیل صاحب نے روتے ہوئے کہا "اب کیا ہو گا؟"

ڈاکٹر نے مایوس لہجے میں جواب دیا "خدا بہتر جانتا ہے دعا کیجئے۔"

میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا۔ ور بے خبری میں بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ کر اسی سنگ مرمر کے چبوترہ پر گر پڑا جس پر انجم نے ایک رات گزاری تھی۔ دماغ میں کوئی خیال نہ تھا۔ دل کو صدمے کا احساس! میں پھوٹ پھوٹ کر رونا گیا۔ یہاں تک کہ سر چکرانے لگا۔ ہاتھ پیر ڈھیلے ہوتے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں بیہوش ہو گیا۔

پھر ہوش آیا۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرا جس پر ہلکی چاندنی کا بس نہ چل رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں اب کچھ باقی بچ رہ گیا یا سب کچھ ختم ہو چکا۔ میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے جہاں گہری خاموشی طاری تھی ۔ ۔ یا اللہ اب کیا سنوں گا! میں نے ستون کا سہارا لیتے ہوئے سوچا ۔ ۔ ۔ ۔ برابر سے ایک نوکر گزرا۔ میں نے بمشکل کہا۔ "انجم!"

اس نے کہا "اچھی ہیں!"

"اچھی ہیں!" میں پھر بھاگا اور کمرے کے پاس جا کر رک گیا۔ انجم کی والدہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

"انجم کیسی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"میں جا کر دیکھ لوں؟"

"ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ بات چیت نہ کریں۔"

"میں بات نہ کروں گا۔"

"اچھا تو جا کر دیکھ لو۔"

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے ہوئے دروازے کی طرف رخ کئے لیٹی تھیں۔ مجھے دیکھ لیا۔

"کیا حال چال ہے؟" بے حد نحیف آواز آئی۔

میں بے قرار ہو کر پلنگ کے پاس دوزانو ہو گیا۔

"آپ اچھی ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔"

"آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ کیا روتے رہے تھے؟"

میں نے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور کوشش کے باوجود آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلک رہے تھے۔

مسرت کے احساس نے مجھے بیخود کر دیا اور اپنے حواس سنبھالنے کو میں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تکنے لگا جہاں آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمکتا ہوا بڑا سا تارا ٹوٹا اور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے مڑ کر انجم کی طرف دیکھا تو وہ بھی آسمان کو تک رہی تھیں۔

"یہ تارے کیوں ٹوٹا کرتے ہیں؟" میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔"

"میں نے کہا، واہ یہ آپ نے نرالی منطق نکالی۔"

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا خیر ہوگا۔" میں نے چاہا کہ کسی طرح بات کو ٹال دوں۔

"پرویز تم کو میرا نام تو معلوم ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔" میں اس سوال پر حیران ہو گیا۔

"جانتے ہو انجم کسے کہتے ہیں؟"

میں بات کا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تارے کو کہتے ہیں۔"

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں ان کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"پرویز تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کرو گے۔"

"معاف کیجیے...... چلتا ہوں۔" میں انجم کو خدا حافظ کہہ کر اطمینان اور خوشی کے سانس لیتے ہوئے گھر لوٹا۔ اب ان کی طبیعت بہتر ہے۔ خدا نے چاہا تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

کئی دن کے بعد رات کو نیند آئی اور میں بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی۔ کمرے سے باہر نکلا تو اماں موجود نہ تھیں۔ میں نے نوکر سے پوچھا۔

"اماں کہاں ہیں؟"

"وکیل صاحب کے یہاں!"

میرا جی دھک سے ہو گیا..... پھر سے طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ ننگے پاؤں نکل کر دوڑا۔

بہت لوگ جمع تھے۔ میں دیوانوں کی طرح سب کے بیچ میں سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رونے کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں..... اور جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو میری نگاہیں انجم کے پلنگ سے ٹکرائیں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ نہ ہنستے ہوئے لب..... صرف ایک سفید چادر..... جس نے ان کا آخری پیغام مجھ تک پہنچا دیا..... "تارہ ٹوٹ چکا تھا!"

مدھوسودن

سمندر اور تین کمرے

اپنے قریب اس کی موجودگی کے ایک شدید احساس کو لئے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھی رہی۔ یہاں سے اٹھنا بے تکا معلوم ہوتا تھا۔ اور یہاں بیٹھے رہنا بھی بے ہنگم سا معلوم ہو رہا تھا۔ بینچ پر اس اجنبی نوجوان کے پاس بیٹھے ہوئے اس کے اعصاب میں ایک عجیب سی حرکت پھیل گئی تھی۔ جسے نیم اختیاری طور پر روکنے کی کوشش میں وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اپنی یہ سنجیدگی اسے پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سمندر کے کنارے پڑے ہوئے ان بنچوں پر دور دور تک لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن خود کو اس نوجوان کے ساتھ تنہا سا محسوس کر رہی تھی جو اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ اس کے بھاری ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک پریشان تفکر کے سے انداز میں انگلیوں سے اپنے گھٹنوں پر تھپکیاں دینے لگتا تھا اور اس کی طرف سے بظاہر بالکل لاپروا سا تھا، جیسے اسے سیما جیسی مغرور لڑکی کی موجودگی کا احساس نہیں ہے۔ سیما کو محسوس ہوا تھا کہ اس کا یہ انداز استغنا مصنوعی ہے اور اس سے اُسے ایک غیر شعوری تحقیر کا سا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ بے توجہی سے سمندر کے افق کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں فاصلے پر خشکی کا ایک مختصر سا ٹکڑا سمندر میں گھستا چلا گیا تھا اور اس پر استادہ بلند واٹر ریزروائر کے عقب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ غروب آفتاب کی سرخی کا سایہ سمندر اور آسمان کے سنگم پر ساکن ہو گیا تھا۔ سمندر کی سطح کو چھوتا ہوا یہ سایہ سرمئی ہوتا گیا تھا اور تاریکی کا منبع سمندر کا نیلا پانی معلوم ہوتا تھا۔

سیما کی توجہ لہروں کی طرف منعطف ہو گئی تھی اور لہروں کے شور سے جو اس کے شعور سے فیڈ ہو گیا تھا وہ پھر سُن رہی تھی۔ سمندر آج ساکن نہ تھا، ہوا تیز تھی۔ لہریں گرج کا شور کرتی ہوئی کنارے کی طرف بھاگی آتی تھیں اور کنارے سے ٹکرا کر پھیل جاتی تھیں۔ اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں لہروں کو دیکھتے ہوئے سیما ایک لمحے کے لئے اس کی موجودگی سے غافل ہو گئی، وہ یہ چاہتی بھی تھی اور وہ توجہ سے دیکھنے لگی کہ یہ لہریں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن اسے معلوم نہ ہو سکا، سمندر کی حرکت تھوڑے سے فاصلے پر آ کر لہریں بن جاتی تھی۔ اور وہ لہر اپنے آگے ایک اندھیرا سا سایہ لئے کنارے کی طرف دوڑی آتی تھی اور اس کے پیچھے دوسری لہر اور اس سے پہلے کہ پہلی لہر کنارے سے ٹکرا کر واپس جائے دوسری لہر اس سے آ کر ٹکرا جاتی تھی۔ لہریں لاتعداد تھیں ہر ایک سے ایک شور ہوتا تھا جو بیک وقت پھیلا ہوا بھی ہوتا اور منتشر بھی، اور مجموعی شور میں مل جاتا تھا جو ایک مسلسل صوتی حرکت معلوم ہوتا تھا۔

وہ اس میں منہمک ہو گئی تھی کہ اچانک بینچ پر نوجوان نے حرکت کی۔ وہ اپنی صورتِ نشست بدلنے کے لیے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ رہا تھا۔ پھر ایک خفیف سی بے چینی سے اس نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور پاؤں پھیلا کر بینچ کے سہارے پیچھے کو جھک گیا۔ سیما کے دل میں اُسے دیکھنے کا ایک مختصر سا تجسس پیدا ہوا اور اُس نے دیکھ لیا۔ اس کی پیشانی پر بے چینی کی مختصر شکنیں تھیں اور ـــ اچانک اس نے چہرے کی ایک خفیف سی جنبش سے سیما کو دیکھا اور سیما کی نگاہیں اس کے وجود سے پرے پھسل گئیں۔ لیکن یہ خیال رہ گیا کہ نوجوان نے دیکھتا ہوا دیکھ لیا ہے اور اس خیال سے اُسے اپنے احساس میں ایک عدم آسانی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے جسم میں کچھ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں اور یہ لہریں اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھیں، اُسے چھوڑ رہی تھیں۔

"میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا ہوں" اس نے اچانک کہا۔

"نہیں" سیما نے بغیر سوچے ہوئے جواب دیا۔ اور یکایک اُس کے جسم میں حرکت کرتی ہوئی لہریں رک گئیں اور اس نے ایک آسانی سی محسوس کی جیسے سیما کی اور اس کی شخصیت کے درمیان سے ایک اسرار سا تفریق ہو گیا ہو۔

"تعجب ہے" اس نے نیم طنزیہ سے لہجے میں کہا "لیکن آپ کو اگر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ ہو تو میں یہ بینچ چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں آپ بیٹھے رہیں" سیما نے پھر ایک عدم آسانی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا اس سمندر کے کنارے ایسی کوئی عورت نہ ہو گی جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند کرے"

سیما نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ بات اُسے پسند نہ آئی لیکن اسے ایک مخصوص سے تعجب نے مس کیا۔

دہلی میں میرا خیال تھا کہ صرف وہیں کے لوگوں میں ملنساری کی اتنی کمی ہے اور شاید بمبئی میں ایسا نہیں ہو گا، لیکن یہاں ہر شخص کی اپنی الگ زندگی ہے اور وہ اس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا"

"آپ دہلی سے آئے ہیں؟" سیما نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پوچھا، اور اُسے اپنا یہ استفسار عجیب معلوم ہوا۔

"ہاں" اُس نے جواب دیا "اور یہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دور دراز جزیرہ ہے، جہاں ساتھ دینے کو کوئی نہیں اور انسان بازاروں میں بیوقوفوں کی طرح چلتا ہے اور دکانیں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور سڑکیں پرائی، اور وہ زبان سنائی نہیں دیتی اپنی جسے سننے کی عادت ہے"

وہ خاموش ہو گیا اور سیما کو تعجب ہوا کہ یہ شخص کچھ زیادہ بے تکلفی سے بات کر رہا ہے۔ یہ بے تکلفی اس نے اپنے لئے محسوس نہ کی اس کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا تھا گویا وہ سیما سے زیادہ خود کو مخاطب کر رہا ہو، یا کسی کو بھی نہیں، یا سب کو، بغیر اس بات کی پروا کئے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ وہ سفید قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر کے ہلکے بال ماتھے پر سے پیچھے چلے گئے تھے، ماتھے پر خفیف سی شکنیں تھیں، اور ان سے سیما کو ایک پُر اسرار سی دلچسپی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی گفتگو میں ایک صداقت سی ہے اور وہ اس کے جذبات کے متعلق متجسس ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا، اور پھر اچانک اس نے کہا۔ میرا خیال ہے آپ بمبئی کی رہنے والی نہیں؟"

"نہیں" سیما نے جواب دیا "لیکن مجھے بمبئی میں تین سال ہو گئے ہیں"

"اوہ، تین سال تو بہت ہوتے ہیں" وہ رک گیا، پھر بولا ـــ "یہاں میرا اُن لوگوں سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے جو بمبئی کے نہیں ہیں، یا جو مجھے بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔ آپ کو میری گفتگو ناگوار تو نہیں؟"

سیما شاید کہنے لگی تھی۔ کہ نہیں، لیکن اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا

"بمبئی میں آکر میں نے صرف تین آدمیوں سے بات کی ہے اور ان لوگوں سے اُکتا گیا ہوں انہیں چھوڑ نہیں سکتا اور ان سے نفرت کرنے

لگتا ہوں۔"

"آپ، یہاں اکیلے ہیں؟"

ہاں —" اور پھر ایک مسکراہٹ میں جو مسکراہٹ سے زیادہ کچھ اور تھی، وہ کہنے لگا — تین مہینے کی تنہائی کے بعد اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ پاس سے گزرتے ہوئے یا قریب بیٹھے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کروں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا .... یہ بات کہ انسان تنہائی سے اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ راہ چلتے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنا چاہے، شاید آپ اسے صحیح نہ سمجھتی ہوں، لیکن یہ صحیح ہے۔ اور کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے اور غصہ آتا ہے کہ میں اتنے آدمیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔"

سیما سمجھ نہ سکی کہ کیا جواب دے اور وہ خاموش رہی۔ اس شخص کی گفتگو اس پر ایک مثبت اثر کر رہی تھی، لیکن اسے اپنی زبان کے آگے ایک رکاوٹ سی محسوس ہوتی تھی، درمیان میں ایک جھجک سی حائل تھی، دل کے اندر اسے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ کہے لیکن جو کچھ کہنا تھا وہ باہر نہ آتا تھا۔ اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ سمندری افق پر سرخی غائب ہو چکی تھی اور سرخی کے سائے پر ایک بڑا سا ستارہ چمک رہا تھا اور روشنی کی ایک طویل لکیر سمندر کی سطح پر پڑ رہی تھی جو سرمئی ہو گئی تھی۔ پانی کی نیلاہٹ میں اندھیرا گھل گیا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی سمندری بو پھیل گئی تھی۔ اور وہ یہ جان نہ سکی کہ یہ بو سمندر کی سیپیوں کی ہے یا ریت کی، یا پانی کی یہ بو عجیب تھی، اس میں سمندر کی دلکشی اور ایک شامی برگشتگی دونوں پائی جاتی تھیں، وہ اس کے متعلق ایک مخصوص احساس کی عادی تھی۔ ہوا ہلکی پڑ گئی تھی اور اس کے سر پر ناریل کے درختوں کا جوش سرد ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ساحل پر ٹہلتے ہوئے لوگ واپس جا رہے تھے، واپس چلے گئے تھے۔ قریب کے بنچ خالی پڑے تھے۔ سیما نے پھر خود کو نوجوان کے ساتھ اکیلا محسوس کیا اور عادتی طور پر اسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہئے۔ وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ نوجوان اپنی انگلیوں کو ایک موہوم سی بے چینی میں مسل رہا تھا اور سیما نے اٹھنے میں ایک تردد سا محسوس کیا۔ وہ ایک کشمکش میں پڑ گئی کہ اٹھنے سے پہلے اس سے کچھ کہے یا نہیں۔ کہے تو کیا کہے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا اور پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ اندرونی طور پر وہ کچھ کہنے کے لئے محسوس کر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے اور سیما انتظار کرتی رہی کہ وہ خود ہی کچھ کہے۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھیں سمندر کی سطح پر روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھیں۔ سمندر کا کنارا سنسان ہو گیا تھا۔ سیما اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا جیسے اسے برا لگا ہو کہ وہ جا رہی ہے وہ چلی گئی۔ اس کی نگاہ میں تعجب اور ناگواری کے اس جذبے سے سیما کو محسوس ہوا کہ اس نے اس کی توہین کی ہے اور آگے جا کر جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکبارگی ہی دونوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ ساحل پر خالی بنچوں کو دیکھنے لگا اور وہ آگے چلی گئی۔

ماہم سے دادر جاتی ہوئی بس میں بیٹھی ہوئی وہ سوچتی رہی۔ سیما کو معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے اجنبی کی ہتک کی ہے، نہایت عجیب ڈھنگ سے وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی .... یاد کر رہی تھی کہ جب پیچھے مڑ کر اس نے دیکھا تھا تو جیسے اس نے برا مان کر منہ پھیر لیا تھا، برا مان کر، اور حقیقت میں وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ سیما کے دل کی عورت اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی تھی اور وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ اس تاثر کا وہ خود سے اعتراف کرنا نہ چاہتی تھی۔ اور اس نے اس احساس قصور کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ کتنی عجیب تھی اس کی یہ بات کہ یوں خواہ مخواہ اس سے باتیں کرنے لگا، اس نے سوچا، اسے یہ امید ہی کیوں تھی کہ وہ اسے اس طرح جواب دے گی لیکن — سیما کے دل میں کوئی چیز اس کی حمایت کر رہی تھی، وہ اس ضد سے رہائی چاہتی تھی لیکن نوجوان کی ساری شخصیت ایک غیر معمولی تاثر کی شکل میں اس کے ذہن میں مجتمع ہو گئی تھی، یہ شخص — اچانک بے ربط طور پر اسے اپنے شوہر کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا وہ اس وقت گھر پر نہ ہوں گے۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ ایک غیر خوشگوار حالت میں رہ رہی تھی۔ وہ دن میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور ———

بس رک گئی تھی۔ سیما کے ساتھ والی عورت اتر گئی اور وہ کھڑکی کے قریب سرک گئی۔ بس اب دادر میں داخل ہو رہی تھی۔ مکانوں کے اندرونی حصوں

میں دھیمی روشنیاں تھیں اور بس اندھیرے میں سے گزر رہی تھی۔ بلیک آؤٹ میں دور دور کھمبوں سے لٹکتی ہوئی ڈھکی ہوئی روشنیوں کے دھبے تھے اور اُن کے چاروں طرف اندھیرا۔ یہ اندھیرا اب اُس کے لئے اجنبی نہ رہا تھا۔ یہ بلیک آؤٹ اس سے بھی پہلے شروع ہوا تھا جب اُس نے ٹیوٹوریل سکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اور وہ —' اسے پھر اپنے شوہر کا خیال آگیا اور پھر اس اجنبی کا۔

اب شوہر کے ساتھ وہ خوش نہ تھی، اس شخص کی قربت وہ اب بھی بڑی بیگانگت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ کیوں — اور اُس نے اُس کے خیال سے دُور ہٹنے کی کوشش کی۔ بس اب دادر کے پل سے گزر رہی تھی۔ پانچ منٹ میں وہ گھر پہنچ جائے گی۔ وہ گھر پہنچ گئے ہوں گے' اپنے شوہر کا وہ اس وقت گھر پر موجود ہونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن جب وہ گھر پہنچی تو ورمن موجود تھا۔

"سیر کر آئیں"۔ اس کے لہجے میں ایک طنز تھا۔

"ہاں" سیما نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اس نے طنز کو محسوس کیا تھا لیکن اس کی پروا کرنا نہ چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں سے وہ خود کو اپنے شوہر کے مقابلے میں مساوی سمجھنے لگی تھی' اور اس طنز کو ایک طنز کی طرح محسوس کر کے اس کی مخالفت کرنا ذلیل سا معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے تمہارا یہ چوبیس گھنٹے گھومتے رہنا پسند نہیں"۔

مجھے معلوم ہے تمہیں پسند نہیں ہوگا۔" سیما نے جواب دیا "تم چاہتے ہو میں دن بھر ان تین کمروں میں قید رہوں"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس طرح سڑکوں کی خاک نہ چھانو"۔

"کون چھانتا ہے سڑکوں کی خاک۔ جب تم رات کو دس دس بجے گھر آتے ہو تو میں شام کو سیر بھی نہیں کر سکتی"۔

ورمن چپ ہو گیا اور وہ کپڑے اتارنے کے لئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ سیما جانتی تھی کہ ورمن اس کے ملازمت کرنے سے بھی برگشتہ ہے۔ اب وہ اسے اپنے شوہر کی خود غرضی پر محمول کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خود کو بڑا آزاد محسوس کرنے لگی تھی۔ اور خود کو اپنے شوہر کا دست نگر نہ سمجھتی تھی، اور اس احساس سے اس کی اپنی مرضی کو تقویت مل گئی تھی، وہ اب وہی کرنا چاہتی تھی جسے خود ٹھیک سمجھتی ہو۔

کپڑے بدل کر جب وہ باہر آئی تو ورمن کھڑکی میں کھڑا ہوا باہر دیکھ رہا تھا۔

"سیما" اُس نے مڑ کر کہا "میرا خیال ہے تمہارا یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے"۔

"کیوں؟" سیما نے استفسار کیا۔

"کیونکہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا"۔

"کیوں برداشت نہیں کر سکتے، یوں کہو کہ تم سے میری ذرا سی آزادی دیکھی نہیں جاتی"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عورتوں کی طرح رہو"۔ ورمن نے بگڑ کر کہا۔

"میں بالکل عورتوں کی طرح رہتی ہوں۔ لیکن تم چاہتے ہو کہ مجھے اپنے رعب میں رکھو"۔ سیما نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارا یہ سکول جانا بھی پسند نہیں۔ یہ میری توہین ہے"۔

"میں تو اُسے توہین نہیں سمجھتی"۔ اُس نے ورمن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں' اور میں اُٹھا سکتی ہوں"۔

ورمن نے غصے میں اس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ جھگڑے عموماً اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ سیما کہہ چکی تھی کہ تمہیں مجھ پر رعب جمانے کا کوئی حق نہیں ہے' اور ورمن نے اس پر رعب جمانا چھوڑ دیا تھا، اور بات سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

رات بستر پر وہ دیر تک جاگتی رہی کمرے میں وہ اکیلی نہ تھی، درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ تھا اور پھر ورمن کا بستر۔ لیٹے ہوئے۔ سیما کو

کہ وہ جاگ رہے ہیں، یعنی ورمن جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ سو رہی تھی، ورمن کے سامنے وہ جاگنا نہ چاہتی تھی، آنکھیں بند کئے وہ لیٹی رہی۔

تین سال پہلے سیما کی شادی ورمن سے ہوئی تھی، جیسے شادیاں ہوتی ہیں۔ آگ کے گرد گھوم کر، منتر پڑھ کر، شہنائیوں کی آوازوں کے درمیان، اور جب شادی ہو گئی تھی تو سیما نے اس کا بُرا نہ مانا تھا؛ ورمن ایم۔ اے تھا اور اسسٹنٹ پوسٹ آفیسر اور وہ اندرپرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ تھی۔ جہاں ان لڑکیوں میں جنسی معاملات پر باتیں کر کر کے اس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی کو کھو دیا تھا۔ کتنی حسرت تھی اُسے ——— !

ورمن نے یہ حسرت پوری کر دی تھی   وہ یہ چاہتی تھی۔ اُن دنوں کئی کئی نصف گھنٹوں تک وہ لیٹے ہوئے ورمن کے پاس بیٹھی رہتی، اس کا بازو ورمن کے اوپر سے ہوتا ہوا فرش کا سہارا لئے رہتا۔ اس کا سینہ ورمن کے سینے سے چھوتا رہتا، اور وہ ورمن کے سینے پر اپنی انگلیوں سے بے معنی لکیریں کھینچتی رہتی اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ یا وہ ورمن کے بازوؤں میں، اس کے گھٹنوں پر بیٹھی رہتی اور اس کی قمیص کے بٹنوں کو کھولتی رہتی، بند کرتی رہتی۔ اور ورمن کے بازو اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے رہتے۔ کتنی لذت تھی ایک مرد کے بازوؤں کو اس طرح اپنی کمر کے گرد محسوس کرنے میں، کتنی راحت تھی، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور بوسے اور ——— اور، کتنی کیفیت تھا اس میں پہلے جاڑوں کی طویل راتوں میں وہ بستر پر اس کے جسم کی گرمی کو محسوس کرتی کتنی جنسی ہوتی تھی یہ گرمی اور کتنی راحت بخش اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور ——— جسمانی ملاپ جن کے متعلق لیشا کپور اور دویا دتی اور شمع اور شبنم اتنے ہیجانی انداز میں باتیں کیا کرتی تھیں، اور جن کے متعلق سوچ سوچ کر اُس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ بے شک وہ اتنے لذیذ نہ تھے جتنا اس نے تصور کیا تھا۔ لیکن اُس نے خود کو ان بوسوں اور بازوؤں اور حرارت اور ان سب چیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ جذبات کی شدت میں ان دونوں نے ایک دوسرے کی تقصیروں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک سال گزر گیا اور محبت کی باتیں گویا ختم ہو گئیں، باتیں ہی تو تھیں اور سیما کا انہیں بار بار دہرانے کو جی نہ چاہتا تھا، جی ہی تو تھا!

لیکن وہ جسمانی لمس وہ بوسے، وہ جسمانی ملاپ ———

اور دن گزرتے گئے اور وہ ان کی عادی ہوتی گئی اور اور یہ دیکھنے لگی کہ ورمن میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اُسے پسند نہیں، اس میں خود بھی ایسی باتیں تھیں جو ورمن کو پسند نہ تھیں اور سیما کو یہ سخت ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ ورمن انہیں دیکھنے لگا ہے لیکن ورمن انہیں دیکھنے لگا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ سیما کو اُن کا احساس کرا دیتا تھا۔ سیما کو یہ بات پسند نہ آئی، پھر وہ اسے بُری لگنے لگی۔ لیکن ورمن باز نہ آیا اور وہ بھی باز نہ آئی اور اُسے ورمن کے نقص اجاگر معلوم ہونے لگے۔ پھر اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اور ورمن کے خیالات نہیں ملتے، اور کہ ورمن کے ذہن میں ایم۔ اے کرنے کے باوجود بھی وہی پرانی تنگ نظری ہے۔

"——— لیکن تم اتنی اتنی دیر اس سے باتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

"وہ کیوں اتنی اتنی دیر یہاں بیٹھا رہتا ہے مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔"

"تمہیں تو کوئی چیز پسند نہیں۔ اوّل تو باتیں کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسرے وہ بالکل بچّہ ہے، تمہیں تو ہر ایک کے متعلق بُری بُری باتیں سوچنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

"عادت نہیں۔ میں ان سب بچوں کو جانتا ہوں، یہ چودہ برس کے ہوتے سے پہلے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"وہ نہیں ہے۔"

"ہو یا نہ ہو" ورمن نے درشتی سے کہا "لیکن میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اپنے گھر تم ایسا کر سکتی تھیں؟"

"اپنے گھر میں آزاد نہ تھی!"

"آزاد تم اب بھی نہیں ہو" ورمن نے گرتی سی آواز میں کہا۔

"کیا ——؟"

"میں کہتا ہوں تم نے یہ قمیص بٹن کیوں نہیں ٹانکے۔ اگر تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس شادی کا مطلب ہی کیا ہے؟"

"تم نے مجھ سے بٹن ٹکوانے کے لئے شادی کی ہے" سیما خفگی سے بولی اس نے سن لیا تھا کہ وہ آزاد نہیں ہے، سندر بپسنتھ گرلز کالج کی گریجویٹ آزاد نہیں ہے یعنی وہ کبھی آزاد نہیں رہے گی، اپنی شادی کے بعد بھی نہیں، تو پھر اس شادی کا مطلب ہی کیا ہے۔ اسے ورمن کی اس بات سے کتنی نفرت تھی، ورمن کی اس بات میں کتنی تنگ نظری تھی۔ اس کے خیالات نے ورمن سے ملنا چھوڑ دیا، اور دن گزرتے گئے۔ اور اپنے خیالات اس کے ساتھ روز بروز متضاد ہوتے گئے۔ اس کے اور ورمن کے درمیان خیالات کا اختلاف آگیا حقیقت میں وہ اپنے اور ورمن کے درمیان اب کچھ چاہتی تھی، اور اس نے آسانی سے خیالات کے اختلاف کا سہارا لے لیا۔ اور اپنے خیالات اسے زیادہ عزیز ہو گئے اور پھر —— یعنی اگر خیالات میں اختلاف ہو تو جنسی ملاپ وہ لذت نہیں بخش سکتے۔ وہ اب پہلی نہ ہو کر میاں بیوی رہ گئے تھے، اور میاں بیوی کی طرح رہتے تھے اور اب سیما کو محسوس ہوتا تھا کہ اس نے آرزو کو کھو دیا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، آرزو موجود تھی۔ لیکن وہ اسی شدت سے پوری نہیں ہوتی تھی، اور وہ اس کے ردعمل کو محسوس کرتی تھی اور اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اسے کھو دیا ہے۔ ان تعلقات میں اب وہ دلکشی نہ رہی تھی وہ اب ان کی کچھ ایسی خواہش مند نہ تھی اور کبھی کبھی اسے یہ بالکل پیشہ ورانہ سے معلوم ہوتے، اور ورمن اس سے ملنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کتنی ذلیل بات تھی یہ کتنی ناپسند تھی اُسے۔

سیما نے دراصل محبت ورمن سے کبھی نہیں کی تھی، یہ اس کی جنسیت تھی جس نے ورمن کے مرد سے محبت کی تھی۔ اپنے جذبے کی شدت میں اس نے خود کو ورمن میں اس شے کے سپرد کر دیا تھا۔ جو اسے تسکین دیتی تھی۔ اس وقت وہ ایسی تسکین چاہتی تھی جو اپنا کیرا اور دیا دیتی۔ جسے پانیں کر کے حاصل نہ ہوتی تھی۔ وہ سچائی نہ چاہتی تھی اور سچائی مل گئی تھی اور اس نے اس سچائی سے محبت کی تھی، جس سے سب عورتیں کرتی ہیں۔

سیما کو اپنے احساسات پر اعتبار نہ تھا، اپنے ادراک سے پیچھے وہ ان سے ڈرتی تھی اور اسے اب بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ورمن سے محبت کرتی ہے، جیسا سب عورتوں کو معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ محبت نہ تھی، اگر محبت کچھ اور ہوتی ہے، یہ صرف ایک احساس ملکیت تھا، ورمن اس کا شوہر تھا، اور ورمن کے علاوہ اس کا اور کچھ نہ تھا، اس کے لئے صرف وہ سب کچھ تھا اور سیما اس سے ایک شوہر کے روپ میں محبت کرتی تھی اور رازدارانہ طور پر اپنی روح کے نہاں خانے میں ایک مرد کی حیثیت سے اب اس سے خوش نہ ہوتی تھی۔ یہ جنسی تعلقات ان کے درمیان ایسے ہو گئے تھے جیسے رات کے کھانے کے بعد کبھی تاش کھیلنے کو جی چاہتا ہو یا جیسے انسان کبھی اپنے اوپر سے کچھ اتار پھینکنا چاہتا ہے یہ تجربے ہمیشہ اسے ایک ناگوار سی حالت میں چھوڑ جاتے تھے اور وہ محسوس کرنا چاہتی تھی اور محسوس کرنے کو کچھ نہ تھا، اور ورمن اپنا بوجھ اتارنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کبھی خواہش ہوتی بھی تھی تو یہ صرف اپنی آرزو ہوتی تھی، دوسرے کی ضرورت نہیں، صرف اپنی خواہش کی تسکین کی آرزو، لیکن وہ پھر بھی خود کو ورمن کے لئے رزرو سمجھتی تھی، جس کے ساتھ اس نے آگ کے گرد پھیرے لئے تھے۔ اس ریزرویشن سے وہ اپنی روح میں برگشتہ تھی لیکن اپنی ماتحتی کا ایک احساس جس سے وہ تقریباً ناواقف تھی۔ درمیان میں حائل تھا اور اس نے کبھی یہ سوچنے کی جسارت نہ کی تھی۔ خواہش اس کے اندر مردہ ہو گئی تھی۔ اور اکثر ان میں جھگڑے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی تنقیدوں کو برداشت کرنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ ایک ٹیوٹوریل اسکول میں پڑھانے لگی۔ سندر بپسنتھ کالج کی گریجویٹ ورمن نے اس کی مخالفت کی تھی۔ لیکن وہ مانی نہ تھی اور

اُس نے ملازمت کر لی تھی۔ اپنی بچّی کو کبھی اس نے ادراکی طور پر محسوس نہیں کیا تھا، لیکن اس آزادی کو اس نے پورے طور سے پہچان لیا۔ وہ آزاد تھی اور ایک داخلی رہائی سی محسوس کرتی تھی۔ خود بخود ان دونوں کے درمیان اب جھگڑے کم ہو گئے تھے اور دوری بڑھ گئی تھی۔

"سیما ——" بستر پر لیٹے ہوئے اُس نے ورمن کی آواز سنی، لیکن وہ بولی نہیں، وہ جاگ نہیں رہی تھی، وہ سو بھی نہیں رہی تھی، وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ورمن کیا کہے گا، وہی جو وہ شام کو کہہ چکا ہے، اور اس سے پہلے کئی بار، مجھے تمہارا یہ رویہ پسند نہیں۔ آخر وہ ایسا کیا کرتی ہے، کیا پسند نہیں ہے انہیں، پسند، ناپسند، ان دونوں کی پسند جدا ہے، اُن کے خیالات نہیں ملتے —— وہ سوچتی رہی۔ ورمن نے کروٹ بدل لی اور اُس نے ایک آسانی سی محسوس کی۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی تھی، سوتے میں کیا آدمی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا اور اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ مرد چاہتے ہیں کہ ان کی غرض پوری ہوتی رہے، عورتوں کا کوئی خیال نہیں، کیوں، خود غرض مرد، اچانک اُسے سمندر کے کنارے اس اجنبی کا خیال آگیا اور اس نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے برخاست کر دیا، دیر تک وہ لیٹی رہی اور اُس کے اوپر ایک ویرانی کا احساس ابھرنے لگا جس میں چڑچڑے پن کا بڑا جزو شامل تھا۔ اُسے زندگی کی بے رنگی پر ہمیشہ غصہ آتا تھا۔ لیکن اس ویرانی کے بارے میں اُس نے سوچا کبھی نہ تھا۔

بہت دیر تک وہ جاگتی رہی، بہت دیر بعد وہ سو گئی۔

دوسرے دن۔

دیر تک وہ سمندر کے کنارے گھومتی رہی۔ ساحل پر آج بھیڑ زیادہ تھی۔ لیکن وہ ایک تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔ کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ کیا ہے۔ سمندر کے کنارے بکھری ہوئی اس بھیڑ سے اُسے ایک علیحدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس خلا کا نہ تھا بلکہ جیسے وہ ایک وسیع مجمع میں اکیلی ہے اور مجمع کا دائرہ اس کے گرد تنگ ہے۔ سمندر کی وسعت بھی تنگ معلوم ہوتی تھی۔ جیسے بالکل ہی بسیط سمندر کو آسمان نے روک لیا ہو۔ آج مغربی افق پر شفق نہیں پھیلی تھی، دن ڈوب گیا تھا لیکن آسمان ویران تھا اور اس نے سمندر کو روک رکھا تھا۔ کسی چیز کی کمی تھی، یہ بھیڑ اور یہ تنہائی لیکن وہ بھیڑ سے الگ رہنا چاہتی تھی، اکیلی رہنا چاہتی تھی، سمندر کے کنارے اکیلی آئی تھی، اور پھر یہ تنہائی، اسے کسی ضرورت کا نیم شعوری احساس تھا، کوئی چیز محسوس نہ تھی۔

کنارے پر کھڑی ہوئی وہ لہروں کو ساحل کی گیلی ریت پر پھیلتے ہوئے دیکھتی رہی، لوٹتی ہوئی لہر سے ٹکرا کر پانی کنارے پر پھیل جاتا تھا اور ساحل کی ریت اس کے جھاگوں سے چمک اٹھتی تھی اور پھر پانی واپس لوٹ جاتا اور ریت میں جذب ہو جاتا اور ریت کی چمک معدوم ہو جاتی۔ دیر تک وہ تماشا دیکھتی رہی پھر وہ چند قدم آگے بڑھ آئی تھی، اور وہ دیکھتی رہی سمندر کی سطح سے اُبھر کر پانی کا ایک ڈھیر بڑھا آتا تھا، جیسے ایک وسیع چادر آپ سطح پر پھیلتی آ رہی ہو، سمندر کی سطح پر اس سے اونچی ایک اور سطح بہتی جا رہی تھی اور قریب آ رہی تھی، اور —— اور اچانک وہ ٹکرا گئی اور ایک شور میں بکھر گئی، اور پانی سیما کے قدموں میں پھیل گیا۔ سیما نے منہ سے تعجب کی ایک چھوٹی سی آواز نکالی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پانی غیر متوقع طور پر اس کے قدموں میں آ گیا تھا اس کا شعور اس کے لئے تیار نہ تھا، وہ لہر سے چھو جانا چاہتی تھی لیکن ——

واپس جاتا ہوا پانی اب کنارے میں جذب ہو رہا تھا وہ مڑی اور خشک ریت پر پاؤں رکھتی ہوئی اوپر بنچوں کی طرف چل گئی، اوپر بنچوں کی طرف۔ ریت اس کی گیلی سینڈلوں اور پاؤں میں چمٹ گئی تھی۔ اور اپنے تصور میں اُسے اس کے کرکرے پن کا احساس ہوتا رہا۔

بنچ کوئی خالی نہ تھا وہ ان کے آگے سے گزرتی گئی، عورتیں اور مرد، اور صرف عورتیں اور صرف مرد۔ بنچوں پر بیٹھے تھے، اور وہ خالی جگہ کی تلاش میں آگے گزرتی گئی، ایک پارسی اپنی بوڑھی عورت کے ساتھ کسی نوجوان کی طرح بیٹھا تھا، یہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ان کے جوڑوں میں چنبیلی کے پھول تھے۔ یہ —— اوہ، اس بنچ پر وہی کل والا نوجوان بیٹھا تھا اور اس کے برابر کی دو سیٹیں خالی پڑی تھیں

لیکن وہ گزر گئی، قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے سیما کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے کہتا ہو کیا تم وہی نہیں ہو جو کل گھنٹہ بھر تک میرے قریب بیٹھی رہی تھیں! اب سیما اسے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اس کے قریب بیٹھے، ایک جھجک سی محسوس ہوئی تھی، شعور و وہم میں اسے اس بات کا احساس یا شاید ڈر تھا کہ اس کے پاس بیٹھنا غیر اہم نہ ہوگا۔ وہ اس اہمیت سے خوف زدہ تھی۔

آخر تک کوئی بینچ خالی نہ تھا اور اب وہ واپس آ رہی تھی کہ آخر ایک خالی سیٹ پر بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے اور اُسے کوئی حرج نظر نہ آ رہا تھا، لیکن جب وہ اس کے قریب آئی تو وہاں رکتے ہی اُسے پھر ایک جھجک محسوس ہوئی، یہ نوجوان اس کی رُوح میں ایک اہمیت رکھتا تھا۔ اور اس کی نگاہ خالی سیٹوں میں اٹکتی ہوئی آگے بڑھ گئی، وہ پھر آگے جا رہی تھی، نوجوان بینچ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

آپ بیٹھئے۔" اس نے کہا۔ "میں تو بہت دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔" اور غالباً وہ سیٹ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بغیر ارادہ کئے ہوئے سیما نے کہا۔

"آپ میری وجہ سے نہ جائیں۔ میں کوئی اور سیٹ تلاش کر لوں گی۔"

"خالی بینچ شاید آپ کو نہ ملے۔"

"لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی کو اٹھا دوں۔"

"اور نہ یہ برداشت کر سکتی ہیں کہ کسی کے قریب بیٹھیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی نامعلوم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بالکل سنجیدہ تھیں۔

"دیکھئے۔" اس نے کہا، اور پھر ———

"شکریہ"

سیما سیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی، وہ بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموش رہی۔ ایک منٹ دو منٹ —— یہ خاموشی سیما کو بے ہنگم سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اس سے بات کرے، لیکن یہ خاموشی —— اور چند لمحوں تک خاموشی رہی، اور سیما کی توجہ ان حالات پر جمی رہی جن میں وہ خود کو محسوس کر رہی تھی، یکایک اُس نے کہا —— "میں در اصل بڑا ڈھیٹ آدمی ہوں کہ یہاں سے ہٹا نہیں۔ آپ کو شاید امید تو ہوگی کہ میں سیٹ خالی کر دوں گا۔" اس کے ہونٹوں پر سے ایک نامعلوم سی مسکراہٹ گزر گئی۔

"نہیں تو" سیما نے کہا۔

وہ —— اپنے خشک بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا وہ مسکرایا —— "میرا خیال ہے عورتوں کو اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہم ان کے لئے جگہ خالی کر دیں۔"

"شاید ——" سیما نے مختصر طور سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہوتی ہے" اُس نے "ہے" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کچھ سراہنے کے قابل بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب تک عورتوں کو یہ اُمید رہے گی وہ آزاد نہیں ہو سکتیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، ظاہر تھا کہ وہ گفتگو کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"کسی دوسرے آدمی سے کچھ امید کرنا ہمیشہ خود کو بالواسطہ اس کا ماتحت بنا دیتا ہے، اور عورتیں ہمیشہ امید کرتی رہتی ہیں اور خود کوشش نہیں کرتیں۔ ان کے ساتھ صدیوں سے خود کو PASSIVE سمجھنے کی ایک عادت بن گئی ہے۔ اور یہ عادت ان کی فطرت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے نیچر نے عورتوں کو Parasite بنایا ہے۔" سیما نے کہا۔

"اوہ نہیں ۔۔۔" اس نے نہیں کو طویل دیتے ہوئے کہا۔ "قدرت اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی ہے بے شک صحیح ہے کہ بعض حالتوں میں عورتوں کا عملی پارٹ بعد میں شروع ہوتا ہے، لیکن قدرت نے عورتوں کو Parasite بنایا ہے یہ غلط ہے۔ عورتوں کی اس حالت کی وجہ صرف یہ ہے ۔ کہ بنیادی خواہشات میں سماج نے ایسا لازمی دجو حقیقت میں غیر ضروری ہے تعلق پیدا کر دیا ہے کہ اس کی تسکین کا انحصار دوسرے پر ہے ۔ اور یہ دوسری چیزیں عورتوں کو کرنے نہیں دی جاتیں اور ایک عورت اس وقت تک کسی آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اس کی بیوی نہ ہو۔"

سیما سمندر کی طرف دیکھنے لگی، لیکن اس کی توجہ کا مرکز گفتگو تھی، بلکہ گفتگو سے بھی زیادہ اپنی توجہ کا مرکز وہ خود تھی، اس کی بے تکلفی سے وہ ایک مخصوص قسم کا نسوانی حجاب محسوس کرنے لگی، لیکن یہ اُسے ناپسند نہ تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

"بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ اکونومک مسئلہ لگا رہا ہے، اور عورتیں اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اقتصادی طور پر کسی دوسرے کی دست نگر رہیں گی۔" اور پھر یکایک رک کر وہ بولا ۔۔۔ "آپ کو شاید عورتوں کی آزادی سے دلچسپی نہیں؟"

"جی!"

"میں پوچھ رہا تھا کیا آپ عورتوں کی آزادی میں دلچسپی نہیں لیتیں، دراصل آپ کو یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہو گی۔ کہ میں چند منٹ کی ملاقات کے بعد آپ سے عورتوں کی آزادی کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں حقیقت یہ ہے اور جس کا میں اقبال کرنا چاہتا ہوں کہ دراصل میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی میں پچھلے تین مہینے سے میں نے کسی عورت سے بات نہیں کی اور اب میں اس سے اکتا سا گیا ہوں۔"

وہ ہنسا، لیکن اس کا قہقہہ مسکراہٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

"آپ کو میری بے تکلفی پر تعجب ہوا ہو گا، کم از کم ہونا چاہئے تھا" وہ بولا۔ "لیکن میں نے کہا نا کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں اور عورتوں کی آزادی کے سوا اور بات ہی کیا کی جا سکتی ہے۔"

"آپ عورتوں کی آزادی کے بارے میں بڑے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں، کیونکہ عورتیں اپنی آزادی کے بارے میں پریشان نہیں ہیں۔"

سیما مسکرائی، وہ اب اس کی گفتگو میں براہِ راست دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے کہا: "لیکن عورتیں کسی کا سہارا چاہتی ہیں۔"

"واقعی؟" اس نے ایک ہلکے سے طنز سے کہا، پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "لیکن سوال چاہنے کا آ جاتا ہے۔ چاہنا ایک دوسری بات ہے خواہش ایک مقدس چیز ہے۔ میرا خیال ہے انسان اپنی روح سے جو چاہتا ہے وہ پورا ہونا چاہئے اگر کوئی شخص خود کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد کرنا چاہتا ہے تو اس میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے Submission اس آدمی کو خوشی، مسرت اور راحت بخشتی ہے جو خود کو Submit کرتا ہے اور اس آدمی کو آرام اور سکھ پہنچاتی ہے جسے Submit کیا جاتا ہے، یہ مرت submission ہے جس پر ایک حسین زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور اس کے لئے روح کی آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے پاس روحیں نہیں ہیں، ہماری روحوں کے دروازوں پر صدیوں کی تہذیب کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔"

اس کی گفتگو سیما کو متاثر کر رہی تھی، وہ اس سے متاثر ہوئی تھی جیسے اس کے الفاظ سیما کے اپنے ان سوچے خیالات کی گونج ہیں۔ اپنے ہی خیالات کے اظہار کی دلکشی نے اُسے رجھایا تھا، اور اُس نے نوجوان کے لئے دل میں ایک خصوص سا محسوس کیا، اور ایک کشش بھی جو واضح نہ تھی، جو یا اس کے خیالات کی طرف تھی یا اس کی شخصیت کی، یا اس کی آواز کی۔ یہ کشش بالکل عجیب تھی اور اس نے خود کو اس کے تاثر میں محسوس کیا۔

"لیکن موجودہ حالات میں عورتیں سہارا نہیں چاہتیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "سہارا چاہنا پڑتا ہے، ہر عورت خود کو Parasite کرنے

پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک غرض ہوتی ہے مجبوری جس کی وجہ سے انہیں ایک سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں سچائی نہیں اور اپنی تہ میں یہ چاہت بڑا کمینہ پن لئے ہوتی ہے۔"

سیما اس بات سے متفق نہ تھی لیکن وہ اس کی مخالفت نہ کر سکی اور بالکل ایک ہپناٹک اثر میں سنتی رہی۔

"اور اس کے لئے عورتیں ذمہ دار نہیں ہیں، مرد بھی نہیں۔ یا شاید اس کے لئے دونوں ہی ذمہ دار ہیں؟"

"یا کوئی بھی نہیں" سیما نے کہا۔

"نہیں میرا خیال ہے عورتیں اس کے لئے اتنی ہی مجرم ہیں جتنے مرد، یا شاید مرد زیادہ ہیں، کیونکہ ان کے ہاتھ میں طاقت ہے، لیکن انہوں نے طاقت کو ذلیل کر دیا ہے۔ اور اس کی تقدیس کو کھو دیا ہے۔ عورتیں فطرتاً مرد کی حفاظت میں رہنا چاہتی ہیں، لیکن مرد انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے ذلیل اور کمینے اور غیر فطری ہتھیار استعمال کرتا ہے، اُسے ہر طرح اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے، اپنی جائداد بنا کر، اور اس نے عورت کی روح کو کھو دیا ہے اور اس کے جسم سے مطمئن ہے۔"

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا، اور سیما کو محسوس ہوا کہ وہ ورمن سے کس قدر مختلف ہے! صرف ایک بار اُسے اس فرق کا ایک بہت مختصر سا احساس ہوا، وہ سنتی رہی۔ وہ زیادہ تر خود ہی بولتا رہا تھا، سیما کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ آتا تھا۔ وہ کچھ کہنا بھی نہ چاہتی تھی۔ سننا چاہتی تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک مخصوص دلکشی تھی، اور اُسے سنتے ہوئے سیما کو ایک مخصوص سی ملائمت کا احساس ہو رہا تھا، یہ ملائمت اس کی گفتگو سے سیما کے احساس میں پھیل رہی تھی اور احساس سے نیچے اتر رہی تھی۔ ملائمت کا یہ تاثر ایک ہپناٹک سحر کے مانند تھا اور اس کے شعور پر قابو پا رہا تھا، وہ خود اپنے اوپر اس سحر کا اثر چاہ رہی تھی، یہ اتنا خوبصورت، اتنا ملائم اور پھر اتنا غالب تھا۔

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا۔ اور اس سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی سیما نے اپنے اوپر اس سحر کی ملائمت کو محسوس کیا۔

اور اس کی گفتگو کی دلکشی نے سیما کو مغلوب کر لیا۔ ہر شام وہ سیما کو یہاں مل جاتا تھا اور باتوں کے دوران میں سیما پر ایک ہپناٹک اثر رہتا۔ یہ اثر اس کی آواز میں قدرتی تھا اور سیما کے تصور نے اُسے پُر مبالغہ بنا لیا تھا۔ وہ خود کچھ کہے جاتا تھا اور سیما کے بولنے کا انتظار نہ کرتا تھا، اور وہ ایک نیم مسمریزی حالت میں سنتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ خود کو اس سحر کے تاثر کے سپرد کر دیتی تھی، اور اس کے سامنے اپنی طاقت کو کھو دیتی۔ اُس کی موجودگی اور خصوصاً اس کی گفتگو سے سیما کو اپنے اندر ہپناٹک لہروں کا ایک تسلسل سا محسوس ہوتا تھا، جو کچھ کہتا تھا اس پر وہ یقین نہ بھی کرتی ہو لیکن پھر بھی وہ خود کو اس کی آواز کے سامنے کمزور محسوس کرتی اور اس کی بات کاٹنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے سامنے سیما کو اپنے وجود کا احساس کم رہتا تھا۔ اور اس کا زیادہ۔ اس کی توجہ نہایت عجیب ڈھنگ سے اس کی گفتگو میں مدغم رہتی، بلکہ اس کی گفتگو سے بھی زیادہ کسی اور شے میں، وہ بخوبی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتی تھی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کسی دوسری شے کے قابو میں اس کا ذہن صرف اس بات پر منعطف رہتا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے، یہ اس کی آواز تھی یا اس کے کہنے کا ڈھنگ، یا کچھ اور تھا جو اُس نے کبھی نہیں پہچانا۔ اس سحر نے اس کے تحت الشعور پر تسلط کر لیا تھا، اس سے دور ہونے پر بھی وہ اُس کے اثر میں آنا چاہتی تھی۔ کبھی اس چاہت کی شکل خواہش کی ہوتی تھی، کبھی محض ایک کشش کی۔ تمام دن وہ شام کا انتظار کرتی اور اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ انتظار کر رہی ہے، صرف ایک بے چینی، ایک بے کلی سی محسوس ہوتی تھی۔ ورمن کی بیوی اس انتظار کو اپنی دانست کے دائرے میں داخل کرنا نہ چاہتی تھی۔

"اب یہ ہر وقت غائب رہنا کیا اختیار کیا ہے تم نے،" ورمن نے ایک دن سوال کیا۔

"غائب رہنا؟"

"اور کیا، صبح ہوتی ہے سکول چل دیتی ہو، شام کو تمہاری سیر ختم نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔"

"میرے باہر جانے سے تمہارا کونسا کام حرج ہوتا ہے؟"

"کام — ورمن نے چڑ کر کہا۔ "کام تو بہت کرتی ہو تم!"

"تو میں صرف کام کرنے کے لئے ہوں؟" سیما نے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم صرف سیر کرنے کے لئے ہو۔"

"تمہیں میرے ذرا سی دیر شام کو باہر جانے سے کیوں جلن ہوتی ہے؟"

"میں پوچھتا ہوں تم یہ جاتی کہاں ہو؟" ورمن گستاخی سے بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟" سیما نے کہا۔

"مجھے کیا پتہ کہاں ماری پھرتی ہو، کیا جانے کہاں جاتی ہو؟"

"تمہیں مجھ پر کیا شبہ ہے؟" سیما نے جیسے چوٹ کھا کر پوچھا۔

"بحث مت کرو۔" ورمن نے کہا۔ "مجھے نہ تم پر شبہ ہے نہ تم پر اعتبار!"

"کیا؟ —" سیما نے روتی آواز میں کہا، لیکن ورمن کمرے کے باہر چلا گیا تھا۔

ایک لمحے تک سیما ایک عجیب سی ذہنی حالت میں کھڑی رہی۔ اپنے دل کی تہ میں اُسے خود اپنے اوپر اعتبار نہ تھا۔ لیکن وہ اسے جاننا نہ چاہتی تھی اور اس وقت ورمن نے اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور کتنے تحقیر آمیز انداز میں۔ لیکن ان الفاظ کو سیما نے سچا نہیں سمجھا، ورمن کے یہ لفظ اسے ذلیل معلوم ہوئے، ذلیل اور کمینے، اور ایک انتقامی سے جذبے میں اس نے سوچا کہ وہ گھر سے باہر نہیں جائے گی، نہیں جائے گی۔

لیکن اس نے سکول جانا نہ چھوڑا، شام کو سیر کرنے جانا چھوڑ دیا، اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے نہ وہ ورمن سے بولی، نہ ورمن اس سے بولا، وہ سوچتی رہی۔

اس نو متعارف نوجوان کے متعلق بظاہر اس کے ذہن میں یہ رشتہ بالکل افلاطونی قسم کا تھا اس نے کبھی اس کے لئے شعوری طور پر جنسی کشش محسوس نہ کی تھی جو کشش بھی وہ اُسے جنسی نہ سمجھتی تھی، سیما نے کبھی اس نوجوان کو اس قسم کی مخصوص اہمیت نہ دی تھی لیکن حقیقت میں اب یہ نوجوان اس کے تمام احساسات کا ذمہ دار تھا اور سیما کی روح اس مناسبت کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ وہ اسے ناحق سمجھتی تھی، جیسے ورمن کو اس طرح منع کرنے کا ادھیکار نہیں ہے۔ لیکن ورمن کا ادھیکار تھا اور وہ اس امر سے واقف تھی، از رُوئے نفسی طور پر پہلے بھی تھی اور اب اس ادھیکار کے خلاف باغی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ حق کیوں ہے، وہ سوچتی تھی، کیا عورتوں کا جنم گھر کی دیواروں میں پیدا ہو کر وہیں مر جانے کے لئے ہوتا ہے، کیا انہیں دنیا میں کچھ دیکھنے کا حق نہیں؟ انہیں کیوں زندگی سے محروم رکھا جاتا ہے، کیوں — اس مخالفت کے بارے میں وہ ایک عمومی ڈھنگ سے سوچتی تھی لیکن حقیقت میں مرکز وہ خود تھی، اُسے ورمن کی شخصیت سے ایک رقابت سی ہو گئی، ورمن اور وہ — وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ خود کو اکتساب لذت کی محض ایک مشین تصور کرنے لگی، جو ورمن کو لذت بخشتی تھی، یعنی اس کا مطلب یہ ہے، وہ سوچتی تھی، کہ مرد تو ہر قسم کی آزادی کا لطف لیتے ہوئے اپنا دل خوش کرتا ہے اور عورت، عورت؟

اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے، چوتھے دن۔

رات کو ورمن نے اُسے منانا چاہا تھا، ایک جسمانی اتصال سے وہ سیما کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا تھا؟ —— لیکن سیما نے کہہ دیا، ان کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے! کیا؟ ورمن کو یقین نہیں آیا، پھر ورمن کو یقین آ گیا۔ اور وہ جیسے ایک غصے اور توہین کو ضبط کرتے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ ان کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے، یعنی، یعنی، تو پھر اس شادی کا مطلب ہی کیا ہے؟ لیکن سیما نے

ایک رہائی سی محسوس کی، جیسے اُس نے ورمن سے کوئی چیز لے لی ہے، یا ورمن کو کسی چیز سے محروم کر دیا ہے! اُس نے سوچا کہ جب انھیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو علم ہوگا کہ ـــ

خود اس کے لئے میاں بیوی کے اس تعلق میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اور نہ وہ یہ نہ کر سکتی، لیکن اب کیوں وہ اُن کی خوشی کا آلہ بنے جب وہ اس کی خوشی کی پروا نہیں کرتے، وہ سوچتی تھی، مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کی خوشی کا خیال رکھے۔ وہ خوشی چاہتی تھی اور خوشی ملتی نہ تھی اور وہ ان حالات کو چھوڑ نہ سکتی اور انہیں میں وہ ان سے ایک نسوانی انتقام لے رہی تھی، اور اپنی اقتصادی آزادی کا جذبہ غیر شعوری طور پر اسے سہارا دے رہا تھا۔

اور دن گزرتے گئے، اس نے ورمن کے بستر میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ گھر میں indifferent آواز میں گفتگو کرتے، گفتگو جو لازمی ہوتی تھی، وہ اس سے بچنا بھی نہ چاہتی تھی، بلکہ چاہتی تھی کہ ان حالات میں اور جھگڑا نہ بڑھے۔ اور یہ گفتگو بالکل کاروباری قسم کی ہوتی تھی۔

اس نے سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنی حقیقی خواہشات کو دبایا تھا۔ ورمن نے اس دن وہ الفاظ کہہ کر اُس کے زیر نفسی احساسات پر جنہیں وہ جاننا نہ چاہتی تھی ایک ناگوار روشنی ڈالی دی تھی اور اس نے انہیں sublimate کیا تھا اور سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن اب اسے ایک ویرانی سی محسوس ہوتی تھی، ویرانی، ویرانی، ویرانی، وہ اسکول جاتی، لڑکیوں کو پڑھاتی اور ایک اکتاہٹ سی اُس پر اُمڈی چلی آتی۔ اس کے گرد ہر شے بے خبر ہو گئی تھی، ہر شے نے اپنی دلکشی کھو دی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے لئے ایک ناگوار شفقت کر رہی ہے۔ وہ گھر میں رہتی اور یہ تین کمرے اُسے بالکل تنہا معلوم ہوتے، یہ تین کمرے، ان کے مجموعی وجود میں سے کوئی چیز زائل ہو گئی تھی، وہ چیز جو انہیں زندہ رکھتی تھی، وہ چیز جو ان کے اور سیما کے درمیان رشتہ تھی۔ اس کی دلچسپی ان میں سے تفریق ہو گئی تھی۔ ورمن گھر میں ہوتا تو وہ اس سے الگ الگ رہتی، ورمن کا باہر جانا بھی اُسے پسند نہ آتا، ورمن سے رقابت بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کا اپنا وجود خود اُس میں اکتاہٹ پیدا کر رہا تھا۔

پچھلے دنوں وہ بے چینی اور بے کلی جو وہ محسوس کیا کرتی تھی، دب گئی تھی، اب وہ پھر اُبھرنے لگی۔ اُسے پھر وہی انتظار کا سا اضطراب ہوتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ دن طویل ہو گئے تھے اور دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ پھر اپنے تصور میں خود کو اس سحر کے زیر اثر محسوس کرنے لگی تھی، نیچے اس کی روح کی تہہ میں خود کو اس سحر کے سپرد کر دینے کی آرزو تھی، وہ اس ویرانی سے اس سحر کے دُھند میں پناہ چاہتی تھی ملائم، ڈھکتے ہوئے، غالب دھند میں۔

اپنے ادراک میں وہ خود اپنے خیالات سے جھگڑنے لگی۔ وہ کیوں ان تین کمروں میں محبوس ہے، تمام دنیا اور زندگی سے منقطع ہو کر ان تین کمروں میں۔ اور اب اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے گھر میں رہنے کا نتیجہ کچھ نہیں۔ اس کے باہر نہ جانے سے ورمن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جیسے اس کی ورمن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اس کی برداشت کا کوئی خیال نہیں، کیوں ـــ، وہ اسی کے لئے بنائی گئی ہے وہ عورت ہے۔ مگر عورت اس کے لئے کیوں بنائی گئی ہے: یہ مردوں کی خود غرضی ہے، یہ مردوں کی دنیا ہے، وہ گھر سے باہر جانا بند کر دیتی ہے لیکن "ان" پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے ورمن سے جنسی علیحدگی اختیار کر کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُسے اس بات کا تاسف نہ تھا۔ لیکن ـــ کتنی عجز اہم ہے وہ، وہ کیا کر سکتی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتی، وہ صرف ایک عورت ہے۔

لیکن اس میں جو عورت تھی وہ ان حالات کے برخلاف ہو گئی۔ وہ کس بات میں اس سے کمتر ہے، اگر ہے بھی تو ورمن کو اسے زندگی سے علیحدہ

رکھنے کا کیا حق ہے، حق! وہ حق پر مصر تھی، ایک عورت کے حق پر، ایک انسان کے حق پر۔

اور اب یہ ویرانی، یہ کسی چیز کی آرزو جو نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ہر ایک چیز کی دلکشی مردہ پڑ چکی ہے، ہر شے ایک [illegible] میں پڑی ہے، ہر ایک شے پر سے خزاں گزر گئی ہے، اُسے اپنے اندر خزاں کا ایک مادی احساس ہوتا تھا، وہ اسے اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، خزاں۔

اور اپنے گرد خزاں کے اس دائرے سے باہر آنا چاہتی تھی۔ وہ باہر آ گئی۔

سمندر آج ساحل سے پیچھے گیا ہوا تھا، دھند ہلکا ہو چلا تھا، وہ دیر سے آئی تھی۔ سمندر کا شور فاصلے پر سنائی دیتا تھا اور زیادہ صاف اور زیادہ سنسان تھا۔ فضا میں سے دن کی روشنی غائب ہو چلی تھی۔ اور چاندنی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ سیما بنچوں کے سہارے چلتی رہی، سمندر دور چلا گیا تھا، اور کنارے پر ٹھلنا بیکار تھا! اور وہ بینچوں کے قریب ٹہلتی رہی، اس کونے سے اُدھر تک اِدھر سے اس کونے تک۔ اکثر بینچ خالی پڑے تھے۔ ایک سناٹا سا تھا، جسے اس نے ایک مبالغہ آمیز حد تک گہرا محسوس کیا۔ یونہی اسے معمولی سا خیال آیا کہ شاید وہ یہاں پھر مل جاتے۔ اپنے دل میں وہ اس سے ملنا چاہتی تھی، اپنی روح میں اُسے ڈھونڈھ رہی تھی۔ لیکن اکثر بینچ خالی پڑے تھے۔ سناٹا گہرا ہو رہا تھا، سما بند تھی اور سمندر دور چلا گیا تھا۔ ہر شے خود کو اس سے چھپاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گھر سے باہر بھی ہر شے خالی تھی، اس نے گرد و پیش سے علیحدہ ہونا چاہا۔ اور وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ دن کی روشنی چاندنی میں جذب ہو گئی تھی۔ اس کے قریب چاندنی روشن تھی لیکن اس سے دُور جاتی ہوئی مدھم ہوتی گئی تھی، ایک سفید سی دھند چھائی ہوئی تھی، سمندر پر، سب جگہ، اندھیرا تھا، نہ روشنی تھی۔ چاند جیسے ایک مردہ دنیا پر چمک رہا تھا۔ لیکن اس نے چاند کو نہیں دیکھا، اس کی روح پر ایک بار سا تھا، وہ نیچے جا رہی تھی۔ نیچے وہ ایک عجیب سی یاس سے ہم آغوش تھی اور ہر شے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

دیر تک وہ بینچ پر بیٹھی رہی، ایک خیالی دیوانے پن کی سی حالت میں اور غیر متوجہ شور میں سمندر کا شور سنتی رہی۔ اب فاصلے پر سمندر کی سمت ایک روشنی چمک رہی تھی، سمندر کی موہوم سطح سے ادھر ایک آدمی کا سلہوٹ اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے ادھر آ رہا تھا۔ اس نے سلہوٹ کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا۔ اور لالٹین قریب آتی گئی۔ بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھسی آ رہی تھی، بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھسی آتی اور وہ ہوشیار سی ہوتی گئی۔ آنے والا سلہوٹ اُدھر خشکی پر آ گیا تھا، اس کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی لالٹین ہل رہی تھی روشنی کا سایہ کنارے کی ریت پر حرکت کر رہا تھا۔ اور وہ روشنی کا وجود ریت پر گزرتا ہوا سڑک پر چلا گیا اور سیما نے جانا کہ وہ یہاں ہے، دھند لکے میں اور اُسے جانا ہے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اُسے جانا ہے، وہ جانے لگی۔

سمندر سے بازار جاتی ہوئی سنسان سڑک پر برقی قمقموں کی قطار چلی گئی تھی۔ شب بیداروں میں روشنیاں منجمد ہو گئی تھیں۔ ساکت، غیر متحرک۔ جامد روشنیاں، سڑک پر لائٹ کے دھبے تھے! اور اُن کے گرد تاریکی، اندھیرا روشنی سے زیادہ تھا، روشنی اندھیرے سے کم تھی۔ وہ جا رہی تھی۔ وہ آ رہا تھا۔ اور روشنی کے دو دھبوں کے درمیان اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرنے۔

"سیما دیوی"

سیما کے سینے میں دل رک گیا، وہ کھڑی تھی۔

اب وہ قریب آ گیا تھا، اس نے پوچھا: "آپ واپس جا رہی ہیں!"

سیما کہہ نہ سکی کہ وہ جا رہی ہے، صرف کہہ نہ سکی۔

"جاتے جاتے مجھے شبہ ہوا تھا کہ یہ آپ ہیں۔ آپ تھوڑی دیر ٹھہریں گی نہیں؟"

"چلیے" سیما نے کہا، ایک تیسری طاقت کے زیرِ اثر جو نہ اس کی اپنی تھی نہ اس نوجوان کی، اور وہ واپس ساحل پہ گئے۔

سمندر کتنی دور سے آگے گیا ہوا ہے" اس نے کہا "میرا خیال ہے۔ ہم اس خشکی پر سے گذر کر کنارے پر چلے چلیں" اور اس نے سیما کے جواب کا انتظار نہ کیا جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ انکار نہیں کر سکتی اور سیما اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ یا اس کی اپنی طاقت کا فقدان تھا یا اس نوجوان کا اثر یا دونوں ہی تھے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔

"جیسے چاند بڑا ہونا شروع ہوا ہے میں اب رات کو آتا ہوں" وہ کہہ رہا تھا "آپ نے تو اب آنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک ہفتے تک مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں روز آپ کا انتظار کرتا ہوں، اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوتا تھا کہ میں یہ انتظار کیوں کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ بمبئی میں نہیں ہیں، لیکن پھر بھی مجھے امید تھی کہ آپ یہیں ہیں اور مجھے پھر ملیں گی۔"

مبہوت سی سیما اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ وہ کیا کہے، اس کے اندر کہنے کو کچھ نہیں تھا، وہ خالی تھی، لیکن وہ کچھ کہنا رہا۔ اس کی متکلم موجودگی کا احساس سیما کو پھر سے متاثر کرتا جا رہا تھا، وہ پھر اپنی طاقت کو کھو کر کمزور ہو رہی تھی، وہی ایک نرمی کا تاثر اس کے ہوشیار شعور کو ڈھک رہا تھا۔

"آج کل میں رات کو دیر تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں، گھر میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں، لیکن یہاں اس سناٹے میں مجھے تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ پھیلی ہوئی سی جگہ میں اکیلا ہونے پر بھی وحشت نہیں ہوتی لیکن گھر میں ہمیشہ ایک جلاوطنی سی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عورتیں کس طرح ساری عمر گھروں میں رہ کر گزار دیتی ہیں"

"انہیں گھروں میں رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے" سیما نے آہستہ سے کہا۔

وہ رک گیا اور سیما جیسے خاموشی میں گرنے لگی، پھر وہ بولا "اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ شاید اس وقت زندگی کی شکل ہی بدل جاتی، یا یوں کہئے کہ زندگی کی کوئی شکل ہی نہ ہوتی یا اتنی شکلیں ہوتیں اور وہ اتنی جلدی جلدی بدلتی رہتیں۔ عادت نے زندگی کو بالکل ساکت کر دیا ہے، ورنہ زندگی اتنی اکتا دینے والی نہ ہوتی، نہ اتنی یکساں۔ خیال کرو کہ اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو زندگی کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی"

وہ ہنس پڑا لیکن بہت آہستہ سے، جیسے یا تو وہ خود اپنی آواز کے سحر میں ہو، یا اس سحر سے واقف ہو اور اس کے دائرے سے باہر نہ جانا چاہتا ہو، جیسے اسے ایک ڈر ہو کہ ایک اونچا قہقہہ سحر کے دائرے کی قوس کو توڑ دے گا۔ اس کے ہنسنے نے سیما کو متحرک سا کر دیا، جیسے پانی کی سطح پر چند بوندیں پڑ جائیں، لیکن پانی کی سطح پھر ساکن ہو گئی تھی اور وہ چلتی رہی وہ کنارے پر آ گئے تھے۔ یہاں زمین زیادہ نمدار تھی اور نرم زمین پہ پاؤں رکھتے ہوئے اسے وہی ایک گداز سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا ادراک پگھل رہا تھا اور گرد و پیش کا احساس ایک ملائمت کی سی کیفیت لے کر اس میں سمایا جا رہا تھا۔ سمندر کا شور گداز اور شفقت آمیز تھا، جیسے اس کا ذہن بہت ملائم ربڑ کا بنا ہوا ہو اور سمندر ربڑ کے ساحل سے ٹکرا رہا ہو۔

وہ کنارے پہ پہنچ گئی۔

یہاں تک آتے آتے وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کی خاموشی عجیب تھی کسی دوسری شے سے حاملہ تھی۔ چپ ہو کر وہ کنارے پہ سمندر کے جھاگوں کو پھیلتے ہوئے دیکھتا رہا، جن کی سفیدی چاند کی روشنی میں بکھر جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں آگے آگے، ساحل کے کنارے کنارے ان جھاگوں کو دیکھتی رہیں۔ لہر لہر سے ٹکراتی تھی اور کنارے پر جھاگ بکھیر جاتی تھی۔ صرف ان سمندری جھاگوں کو چاندنی نے سفید کر دیا تھا اور باقی ہر شے دھندلی تھی، وہ ان جھاگوں سے الگ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اور سیما اپنی حالت سے ناواقف اس کے قریب کھڑی رہی۔ اس کے پاس تھی اور ہر شے ساکن ہو گئی تھی۔ لیکن اس سکون سے پیچھے یا اس سکون کے پار ایک دوسرا متحرک احساس تھا۔ اور اس احساس نے سیما کو ڈھک لیا تھا۔ وہ اس

احساس کے تحت میں کھڑی رہی، جیسے عمیق، عمیق، روح کی عمیق گہرائی میں وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو، وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی تھی۔

"آپ بیٹھیں گی؟" اس نے پوچھا اور کنارے سے ہٹ کر گیلی ریت پر اپنا کوٹ بچھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا، اس کی آواز میں دور دراز تحکم کی ایک طاقت تھی۔ اور سیما بیٹھ گئی اور وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ سیما اپنی آواز سے محروم تھی، وہ کچھ چاہ رہی تھی اور اپنی روح میں اس سے ڈر بھی رہی تھی اور بولنے کی طاقت سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ عجیب ڈھنگ سے خاموش تھا، اس کی عالمہ خاموشی، خاموشی، کائنات میں جو صوتی حرکت تھی وہ سیما کی توجہ کے دائرے سے باہر ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ سے اس نے سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور سیما نے ایسا ہونے دیا وہ جیسے پیار سے سیما کی ہتھیلی پر اپنی انگلی سے لکیریں سی بنا رہا تھا صلیب کے سے نشان وہ کچھ کہہ رہا تھا، سیما سن رہی تھی، لیکن وہ سن نہیں رہی تھی، اسے معلوم نہ تھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ سیما کو صرف اس کی آواز کا احساس تھا بلکہ اس سے بھی آگے صرف اس آواز کے تاثر کا، اور اس میں الفاظ نہیں تھے، الفاظ سے جدا وہ صرف اس سحر کے زیر اثر تھی اور ہاتھ کا یہ لمس ایک منزل تھی؛ یہ جیسے اس سحر کی ایک مادی صورت تھی جس کے سپرد وہ خود کو کر دینا چاہتی تھی، یہ لمس اس سحر اور سیما کے درمیان میں ایک رشتہ تھا۔ پھر اس کا بازو سیما کی کمر کے گرد آ گیا اور سیما نے روکا نہیں، وہ اپنی عملی طاقت سے مستعفی ہو گئی اور اس کے بازو کا دباؤ سیما کو قریب لاتا گیا، وہ سحر اسے چھوڑ رہا تھا، سحر اسے اپنے آغوش میں لے رہا تھا، وہ آغوش میں آ گئی اس کے جسم کا ہر عضو ڈھیلا ہوتا گیا۔ اس کے تمام وجود نے خود کو چھوڑ دیا اور سیما اس کے آغوش میں پڑی رہی۔ وہ اگر اسے چھوڑ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ لیکن وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لئے رہا اور خاموشی کے لمحے ان لمحاتِ سرور میں جذب ہوتے گئے۔ اور سیما نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ سے ایک بلی کی ملائم سمور کو برش کر رہا ہو۔ اور اس کے ہاتھ کے نیچے سیما نے خود کو ایک بلی کے مانند محسوس کیا، ایک مسحور بلی کی مانند اس کی تمام توجہ اپنے سینے پر سمٹ آئی۔ وہ اپنے آپ سے غافل تھی، اس سے بھی غافل تھی، اسے اپنے سینے کا احساس تھا، صرف اس لمس کا جو اس کے سینے اور اس سحر کے درمیان تھا، وہ آہستہ آہستہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کی چھاتی کو اپنی انگلیوں کے نرم دباؤ سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ غافل تھی اور اس کے لب سیما کے لبوں پر رکھے تھے اور وہ غافل تھی، اور ——

جب وہ گھر پہنچی تو اب تک اس سحر کے اثر میں مبتلا تھی۔ اس کی روح کو چھید کر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اور اس نے اسے لاعمل اور (دست بستہ) کر دیا تھا۔ اس نے اپنے شعور کو اور اپنے عمل کو دوسرے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ ان ہاتھوں کی طاقت، ان میں بہت بہت بہت زیادہ کچھ تھا جس کے خلاف وہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ اور اس نے خود کو تفویض کر دیا تھا۔ اور ابھی تک اس سحر کے غالب اثر میں مبتلا تھی۔

لیکن اب مکان کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ دیر ہو گئی ہے، دیر ہو گئی تھی، اور دیر کا احساس اسے پورے شعور کی ذلیل حالت میں لاتا گیا —— گرر، گرر، وہ گھنٹی بجا رہی تھی اور گھنٹی کی آواز اس کی روح کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ ایک تقصیر کا سا احساس لیے ہوئے، خوف زدہ سی۔

گرر گرر، گرر گرر، گرر گرر ——

کوئی آ رہا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔ ورمن اندر کھڑا تھا۔ وہ ورمن کا سامنا نہ کر سکی، بالکل وہ ایک قصوروار کی طرح اندر آ گئی ورمن مڑ گیا تھا اور اندر آ کر سیما نے دروازہ بند کر لیا، بالکل آہستہ سے کہ شور نہ ہو، وہ آواز سے خوف زدہ تھی، اور اچانک کلاک نے گھنٹہ بجایا اور وہ چونک پڑی۔ اور ایک، دو، تین...... کلاک گیارہ کے گھنٹے بجاتا رہا اور وہ گھنٹوں کی آواز پہ قدم رکھتی ہوئی اندر چلی گئی، گیارہ بج گئے تھے۔

"کہاں تھیں؟" ورمن نے سنجیدہ درشتی سے پوچھا۔

"سمندر کے کنارے" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"وہاں نہیں تھیں تم، میں خود تمہیں وہاں دیکھ آیا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تھیں"

"وہیں تھی"۔ اس کی آواز قصوروار تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے تم پر بالکل یقین نہیں، تمہارے منہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ـــ کہاں تھیں تم؟ تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری۔ یہ رات کے گیارہ بجے تم سمندر کے کنارے تھیں۔ شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ کل سے تم نہ سمندر کے کنارے جا سکتی ہو نہ کہیں اور تمہیں جہاں جانا ہے میرے ساتھ جاؤ۔"

"کیوں؟" سیما نے حفاظت نفس کے سے جذبے سے کہا۔

"کیوں کہ میں جانتا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو اور میں تمہیں اپنے چہرے پر سیاہی نہیں پوتنے دوں گا۔ کل سے تمہارا اسکول جانا بھی بند ہے۔ تم کہیں اکیلی نہیں جا سکتیں"۔

"لیکن میں خود اپنے آپ کو سپورٹ کرنا چاہتی ہوں، میں تم سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں چاہتی!"

"تم میری بیوی ہو" ورمن نے زور سے کہا۔

اور الفاظ براہِ راست سیما کے لاشعور سے آئے ـــ

"لیکن میں اس سے محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں" ـــ

"سیما!"

اور اُس نے اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔

سیّد رفیق حسین

کلوا

منہ پر پسینہ، گالوں پہ سُرخی، کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے۔ قمیص کے دامن اور ہاتھ پر روشنائی کے دھبے، ازاربند پیروں تک لٹکا ہوا، ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتے کا پلا۔ منّن گھر میں داخل ہوا۔ اماں نے چیخ ماری۔ "ہائے ہے میں مرگئی"۔ سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہنڈل پہ تھا دوسرا ماتھے پہ۔ وہ ساکت بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ لڑکے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا، اور بھاری آواز بنا کر بولا "اماں ہم اسے پالیں گے"۔

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پلّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے خدا کے لئے گود سے تو پھینک"۔ کچھ خفگی کی آواز میں: "سارے کپڑے نجس کر دئے پھینک اسے۔ تمہارے ابا آتے ہوں گے"۔

لڑکے نے جلدی سے پلّے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلّا تین انچ کی دُم ہلا ہلا کر منّن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانہ سے گردن باہر نکال کر ناک پہ انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے کہا "بیوی دیکھئے تو موا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے"! دو برس کی لڑکی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلّائی "لو یہ بھی چلیں، اب گھر بھر گندا ہوگا۔ منّن تم یہ کیا مصیبت لے آئے!"

منّن نے کہا "ہم تو کاٹ کھائے گا ادھر نہ آنا"۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد منّن منہ دھوئے، صاف کپڑے پہنے، اُجلے بنے، چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ صرف سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پہ ہلکے نیلے روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے مرادآبادی تھالی میں دو بسکٹ تین جلیبیاں اور ایک پیالی دودھ تھا۔ جس پہ تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود کتے کی طرف مشغول تھے۔ کتے کا پلا صحن کے دروازے کے سامنے کھٹولے کے پائے میں رسّی سے بندھا ہوا ایک ہڈی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے تو پائی چھیلتے ہوئے کہا "اب ناشتہ کر لو۔ یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکا رہے ہو۔ دیکھو دودھ میں مکھی گر جائے گی"۔

"اماں اس سے ہڈی چھنتی تو ہے نہیں۔ بسکٹ دیدوں"۔ یہ کہا اور اٹھا کا بسکٹ لیکر اُٹھنے لگا۔

ماں نے کہا "چلے پھر چھوٹے کر۔ ارے تم کھا تو لو، میں اور ......"

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی، سیاہ فریم کی عینک۔ سیاہ تکونی داڑھی۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ چھتری ہاتھ میں اور سیاہ جوتا پیر میں۔ کھونٹے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ بیوی بچی ہوئی چائے کی ٹرے میں سے چائے دان لیکر باورچی خانہ کی طرف چلیں۔ پلّہ بیٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر دودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا "یہ کیا ہے جی؟ کون لایا اسے؟"

بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے باورچی خانے کے سامنے رک گئیں۔ مسکرا کر بولیں "ارے تمہاری ڈیوڑھی میں آگیا تھا۔ کوں کوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آگیا۔ کیسا پیارا ہے۔ میں نے باندھ لیا"

میاں نے لاحول کو قرأت سے ادا کر کے کہا "بھگے گا تو؟"

"بھنگن اٹھائے گی"

"موتے گا جو؟"

"تو لوٹے سے دھو دیا جائیگا۔ آؤ چائے پی لو"

"بچے جو چھوئیں گے؟"

بیوی اب باورچی خانہ میں تھیں اس لئے کوئی جواب نہ ملا۔ مگر البتہ پیالے کی طرف اور جھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جا کر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکا دیں۔ دوسرا قمیص اور پاجامہ پہن کر منہ دھویا۔ تولیہ سے رگڑ رگڑ کر داڑھی کو پونچھا۔ اور چائے پینے کو بیٹھ گئے۔ بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں اب پھر میاں بولے "کیا نجاست پھیلائی ہے پھکوا دو باہر!"

بیوی نے بگڑ کر کہا "بس تم کو تو ایک بات کی دھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔ پڑا ہے بچے کھیلیں گے!"

"ہاں یہ انہی حضرت کا شوق ہو گا؟"

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دودھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گھس چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پلّا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دو دن صحن میں جہاں دو دفعہ میاں نے گدو والی لڑکی کو اُسے چھوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں، جہاں ایک دفعہ اس کی رسّی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود اُن کے پیروں میں آگیا۔ آخری یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اُسکو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں بیوی کو بھنبوڑتے رہے۔ اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پلّا صدائے احتجاج بلند کرتا زمین پر اڑا ہوا کے پیچھے گھسٹتا ہوا نکس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ اور سڑک کے سپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک ... نے غیں غیں کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اُسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا پکی نالی میں جا گرا۔ موٹر ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا۔ لیکن کالا پلّا عرصے تک ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا رہا۔

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے پنجے ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن نالی اُس کے واسطے کافی گہری تھی۔ جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کے سڑاپوں سے کچھ پانی پیا۔ اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چل دیا۔ آٹھ قدم چل کر پھر اُس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسّی پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور سینٹھے کا قلم۔ سرف پیر آزاد تھے۔ چنانچہ اس نے ننگا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پلّا کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اتنے ہی قصائیوں کے دو لڑکے اور آگئے۔ کچھ دیر وہ اُسکا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جھک کر اس کی رسّی کا سرا پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسّی کو نالی سے باہر نکال دیا۔ رسّی پر

پٹی ہوئی کیچڑ کے چھینٹے اڑے۔ ایک کی آنکھ میں اور دوسرے کے کھلے ہوئے ہنستے منہ میں کیچڑ نے اپنا مزہ چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں ماں بہنوں کے متعلق شستہ گفتگو شروع ہو گئی۔ کالے پلّے نے محبت بھری نگاہوں سے اس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ سڑک پہ پھینک رہا تھا اور اپنے ساتھی کی گالی کے جواب میں گالی برابر لوٹا رہا تھا۔ پلّا دُم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پلّے کو غور سے دیکھ کر کہا "شیرا! ہے شیرا!" پلّا اس نے رسّی کے سرے کو پیر سے زمین پہ رگڑا اور اٹھا لیا۔ "آ، شیرا آ، آ!" کر کے رسّی تانی۔ شیرا نے تین چار پھدکیاں اس کی طرف بھریں۔ اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چھلنے لگے تو بیٹھ کے چت ہو کر ہی گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ گلی کے نکڑ پر مونڈھا بچھائے پہلوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے لونڈوں کو ڈانٹ بتائی "ابے تمہارا ایسا ویسا لونڈو کیا کرتے ہو۔ چھوڑو بچّے کو" لونڈے پلّے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلّا پنچھ کی دُم ٹانگوں میں دبائے سر زمین سے لگائے پہلوان کی طرف بڑھا۔ پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لڑھکا کے گلی کے اندر کر دیا۔ اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پر جا بیٹھے۔ وہیں پر چار دو کانوں میں کمہار رہتے تھے۔ ایک کمہاری بیٹی توے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلّا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے لگا، دُم پیروں کے اندر کوں کوں کرتا گیا۔ کمہاری نے کہا "دھو، دھو!"

ایک تیرہ برس کی دبلی سی کمہار کی لونڈیا نے بڑا بھاگ کر دوکان سے چھلانگ ماری اور پلّے کو اٹھا لیا۔ لیکن فوراً ہی رام رام کہہ کر زمین پہ رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پہ رگڑ کر دوکان میں گئی۔ ایک لٹیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلّے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند آیا۔ ہر طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا۔ بُری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھے میں بھگو کر بجرے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس کا نام کلوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں بھوریا نامی قصائی کے لڑکے نے پہلے تو چندو سے عشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بُری طرح جھڑک دیا تو پھر اس نے بَیر بڑھایا۔ اور اب بھی جب بس نہ چلا تو ایک رات جب یہ لوگ گلی میں سو رہے تھے تو کلوا کو کھٹیا کے پاس سے اٹھا بھاگ گیا۔ پہلے کلوا نے کوں کوں کی پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بیچارے کی تھوتھنی پکڑ لی گئی۔ بھوریا نے اسے بہت دُور علی پور کے ایک پرانے قبرستان میں لے جا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا نوحہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا زمین سے صرف چار پانچ انچ اونچا کرتا پہنے قبروں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا آیا۔ کلوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلّایا "بابا رے یہ دھولا" بابا، قبرستان کے تکیہ دار فقیر، مہندی کی کپّی ہاتھ میں لیے آ گئے اور کلو کی بہن کو یاد کر کے بولے۔ "رات بھر چلّایا کیا۔" اور مہندی کی کپّی سے کلوا کو ٹھونکنا شروع کر دیا۔ لمبے کرتے والا لڑکا کلوا کی واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جاتا۔ یہاں کلوا کی یہ حالت کہ جب پیٹھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا۔ اور پیروں پہ کپّیاں کو روکنے لگا۔ خدا خدا کر کے کپّی ٹوٹی تو اس کی جان بچی۔

کلوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دُور کچھ عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آیا کیں۔ لیکن اس طرف ایک قبر کے لمبے چوڑے تکیے نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف سے کلوا کی تیز ناک نے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ مگر بیچارہ مجبور تھا۔ ایک مہین اور لمبی چیخ نکل گئی جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑ لی۔ زبان گو پیاس سے لٹکی پڑ رہی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوں کوں کرنے لگا۔ عورت نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ قبرستان کے دوسرے سرے پہ دو مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھا اور ایک مقبرہ۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چار کھٹیاں ایک لائن میں پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرہ کے چبوترے پر گردن بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ہانپتی ہوئی زبان اندر کر کے گانجے کی خوشبو پر غور کیا۔ غالباً بُری معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دے کر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بھی اسی کھونٹی سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اس نے جاتے ہی بکری کے کونڈے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک عزت پر غصہ آگیا۔ اس نے تین چار دفعہ کھریں جوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے غالباً اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر اس چٹائی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب اس چٹائی پر کھانا ہونے لگا تو اس کی ہم کھونٹا بکری نے بھی جگالی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آکر گری تو اس نے اپنی دُم کو شکریہ کے واسطے دو دو دفعہ زمین پر مارا۔ تہذیب سے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر بڑھا کر بوٹی کو اٹھا لیا۔ چونکہ مزے دار تھی دو ہی دانت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا۔ اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اڑی۔ اس کے پھیلے ہوئے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آکر رک گئی۔ دُم کو تین جھٹکے شکریہ کے دیکر اٹھ کھڑا ہوگیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اُچھلی تو بکری کے پاس گری، یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ جو بن نگل کر جگالی کے نئے لقمہ کے گردن میں سے چل کر منہ میں آنے کے انتظار میں تھی، کوئی بھلا جانور ایسے موقعے پر دخل اندازی پسند نہیں کر سکتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر، کھریں جوڑ حملہ آور ہوئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے بھی جواب دیا "ہڈی" اور پھر "ہم ہم" کر کے دو جھوٹے حملے کئے۔ بکری صاحبہ ڈٹ گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسی کو بھی بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسی تنی۔ جھٹکا کھایا۔ دھم سے زمین پر دراز ہوگئیں۔ کھانا کیا ہونے لگا۔ ہڈی اٹھا دوسری طرف چل دئے۔ جب رسی تن گئی بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز صاحب نے اٹھ کر ایک رسی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر مار اور آدھے پیٹ کھانے پر گذر کرنی پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو رسی پر ورزش دی جائے تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ کلوا آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر کا ٹکڑا گلے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلوا کو مطلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہوگیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش، ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچی قبریں، دو پکی قبریں۔ ایک بہت اونچی پکی قبر، وہی پت جھڑی بیری، دو دھنسی قبریں، ایک چھوٹی قبر۔ اس کے برابر ایک بڑی قبر۔ ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصہ۔ سب کو دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کئے ہوئے پار کیا۔ دوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اُسے دیکھا اور بھاگا۔ چار چھلانگوں میں یہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولا پلٹ پڑا۔ دُم پھول کر جھاڑو ہوگئی۔ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلہ کو تیار ہوگیا۔ کلوا بھی اگلے دونوں پیر جوڑ کر بدن کو پیچھے تان کر رک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک نے دوسرے سے معافی مانگی۔ وہ اُدھر چل دیا اور یہ اِدھر روانہ ہوگئے۔ پھر وہی دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چندو یا غذا دونوں میں سے ایک جس کی بو مل جائے۔

جاتے جاتے پکی سڑک پر ہو لیا۔ عیش باغ کے سامنے پولیس کی چوکی پر پہنچا۔ ایک موٹے کتے نے لیٹے لیٹے غرا کر کہا "ہوں" کلوا نے دُم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سُوں سُوں کر کے فوراً ڈھونڈ لی۔ دیکھا تو کچھ حصہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آر۔ کے۔ ریلوے کی چوکی آگئی۔ ایک بوچے کتے نے لپک کر ان کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دکھا، شد بادی سے کھینچ کر کہا "کھیسیں" کلوا نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا "کھیسیں" بوچے نے اور گہری آواز گلے سے نکال کر کہا "دیکھیں" کلوا نے دانت نکال کر تین دفعہ جھٹکوں سے منہ بند کر کے کہا "ہیں۔ ہیں۔ ہیں" ایک کتیا اور آگئی۔ اس نے کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا، اور پھر بے پرواہی سے لیٹیں

چھوڑ کر چل دی۔ جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے "جانے بھی دو لونڈا ہے۔" مگر بوڑھے دل بوچے کو کب گوارا تھا؛ ہم ہم کر کے اوپر چڑھ بیٹھا ناچار کلوا نے اطاعت مندوں کی، چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کلوا نے بوچا کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک آر۔کے آر لائن کے اوپر چکر لگائے۔ یہی بوچا کے دانتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائداد تھی۔ کلوا نے بار بار چندو کی یاد میں اس جائداد کو چھوڑ کر دور کے سفر کے قصد کئے۔ لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمین کا چپہ چپہ کتوں کی جائدادوں میں تقسیم ہوا پڑا تھا۔ جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتوں کے قانون میں سخت جرم ہے۔ اگر کبھی بڑی جائداد کے تنہا خونخوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پر وہاں کے حاکم اور ایک، دو یا تین جتنے بھی شاگرد ہوتے اُن سے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا۔ اور آداب جنگ کی تمام باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز کلوا تنہا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریلوے کراسنگ سے کچھ دور بوچا اُستاد کی لاش لائن پر کٹی پڑی ہے۔ اُستانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر اُستانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے۔ اس کا انتظام ہاتھ میں لیا۔ متعینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور چیلوں کے پنجے سے ٹپکتی تھی۔ اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی تنہا رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں اُستانی پھیل گئیں۔ اور ان کے بھی ہاتھ پیروں پر رونق آ گئی۔ لیکن اب استانی کو اُن کا تعشق لونڈھیایا معلوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن کلوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلے جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ ہوا ہوگا اب کلوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمکدار مخملی کوٹ، لہراتی ہوئی لمبی دُم، گٹھا ہوا بھاری تن و توش، ہاتھ اور پیروں پر اُبھرے ہوئے پٹھے۔ بل کھاتے ہوئے۔ قد میں بڑے سے بڑا کتا ان کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چور اور آوارہ گرد کتوں کا ان کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ بڑھا لیا تھا۔ ایک دن اس پلیٹ فارم پر ایک جگہ ایک بو تھی............ کلوا کا محبت کا بھوکا دل تڑپ گیا۔ یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کلوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر، یہ روانہ ہو گیا۔ سیکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بُو اس کے واسطے الگ تھی۔ بُو لیتا بُو ہی بُو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان آنے تک اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہوگا جتنی مصیبتوں اور دقتوں کو اس نے بلوچپورے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسیوں کتوں کو زخمی کر کے خود زخموں سے چور جس وقت وہاں پہنچا رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی، مکان وہی تھا، دوکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سونگھے۔ چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بُو بہت خفیف تھی۔ کتے آتے اس پر بھونکتے اور چھپ جاتے۔ مگر یہ دم میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چندو کی بو سونگھتا، (جو بار بار زائل ہوتی چلی جاتی تھی)۔ یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بُو گم ہو گئی۔ اس نے دکان کے سامنے منہ اُٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان اس کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دولھا کے ساتھ دولھن بن کر بانس بریلی گئی۔ مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں لٹھیا لئے یہ کہتا ہوا نکلا "رو رہے جات دے کوکر۔"

قصائیوں کے کتے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قد آور۔ لیکن کچے گوشت کے کھانے والے بے انتہا خونخوار۔ کلوا کے بھی دانت کھٹے ہو گئے۔ جب کہیں جا کر ان کو گلی اور گلی کے نیچے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن رات کا زیادہ تر حصہ چندو کی دکان کے آگے ہی گذرتا۔ جہاں اب اس کا چاہنے والا کوئی نہ تھا۔ کلوا چندو کے باپ احسان دونوں کی مار بار بار کھاتا۔ (لیکن اس نے دکان کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں کھانے کو کافی اور عمدہ چیزیں مل جایا کرتی تھیں لیکن افسوس دل کی آگ

محبت کے چھینٹوں کی طالب ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کئے اور محبت کے لین دین کا خواستگار ہوا۔ مگر دل کا سودا کہیں نہ پٹا۔ ایک برس اسی طرح گذر گیا۔ مگر آخر چندو آ ہی گئی۔

بالکل وہی چندو۔ کچھ دُبلی اور ہو گئی تھی۔ بچہ گود میں تھا۔ لیکن کالو کو بھول چکی تھی۔ وہ کالو سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ لیکن کالو کتا تھا۔ زمین پر بچھ گیا۔ پیٹ کے بل دُم ہلائی۔ پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر پُشت تو نہیں چاٹی۔ کہاری کی جوتیاں جب پڑیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کہار نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ سمٹ کر پلایا۔ لیکن سب لاحاصل۔ اس بڑی بی کے دونوں پاٹوں میں پھر کہ پستے ہیں۔ اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندو پھر سسرال چلی گئی۔

کُوکو لاکتا غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد ہے۔ کتے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ مُنہ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پر بال کھڑے ہیں اور دُم بالکل سیدھی پھیلی ہوئی ہے۔

اور آج بھی وہی پیارا پیٹ منی، باپ کی بے جا سختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اُٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اُس نے شوقی عیدگاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے۔ منی عیدگاہ کی چار فٹ اُونچی دیوار پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ دن گزر گیا اب کیا کرے۔ گھر جائے یا نہ جائے۔ وہاں خبر ضرور ہو گئی ہو گی۔ ننھے سے دل میں وحشت کے پنکھے چل رہے تھے۔ دفعتہً دل صحرا نورد کلوا گذر ادھر سے ہوا۔ اس کی نگاہ منی پر پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے راتیں تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان میں سُہانی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں، آنکھ، ناک، کان اور منہ کا مجموعہ ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان پر خوشی کی چمک، غم کی سیاہی اور محبت کی نورانی شعاعیں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ کلوا نے دیکھا بچہ اداس بیٹھا ہے۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے نیچے جہاں وہ دوڑ رہا تھا بچے کی بُو۔ وہاں دوڑ رہی تھی۔ اس نے اس بُو میں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اس کو قدرت نے عطا ہی نہ کی۔ نہ رہا گیا، گھوم کر بچے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا ایک سمندر موجزن تھا۔ جس میں سے لپلپاتے شعلے تا بہ فلک اُٹھ رہے تھے۔ نوکری بھر کے ایک بچے کو اس میں پھینکا گیا۔ تو کیا ہوا؟ پلک جھپکی بھی نہ تھی۔ اور وہاں سبزے میں پھولوں کا ایک تختہ تھا، جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچہ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اب جن دماغوں میں عقل کی زیادتی ہو گئی ہے اور اس قصے کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں، آئیں ادھر آئیں، میں اُن کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جفا کاری ہیں جیسا کتے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اشتعال میں پتھر کی سل کتے کے آگے گھس جائے گی۔ خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چنگاری میں کتا پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اور اس وقت وہ حلم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

منی اور کلوا میں ایک دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روٹی تکیا اور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کلوا کو پیش کی گئی۔ انتہا تھا نہ انتہے کی بو اس پر بھی تکیہ کلوا کو بڑی میٹھی معلوم ہوئی۔ منی نے ڈرتے ڈرتے کلوا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کلوا نے منہ کھول کر محبت کے نشے میں دُم ہلائی، کہہ کر انگڑائی لی۔ منی کھیلتا کھیلتا کتے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا، قدم قدم گھر کی طرف آ گیا۔ یہ بھی نوامید تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہنچی ہو۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں گھسا۔ کلوا باہر ہی رہ گیا۔

محبّت کی دیوانی ماں نے مُنہ دُھلایا، ناشتہ کھلایا، اکنی کلکیا کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصے اور منی کے بیچ میں سدِ سکندری بن کے حائل ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اور منی سو گیا۔ افسوس ارے جاہل ماں تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج، ننھی ننھی خوشیاں، معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں۔ اور بیوقوف مائیں اس دنیا کو کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں۔

چھ دن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے۔ ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہو گیا۔ سیاہ پینتیس سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے تصادم ہوا۔ ماسٹر زمین پر گر پڑا ——— کلوا اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ روتے ہوئے منن نے جلدی جلدی کتابیں اور بستہ سمیٹا اور سیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جا کر "او" "او" کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا کلوا بھی منن سے آن ملا۔ سر اٹھا کر منن کا منہ چاٹنا چاہا۔ تو اس نے سر پر سلیٹ ماری کلوا خوش ہو گئے۔ اچھل کے آگے آگے ہو لئے۔

دوسرے دن بستہ بغل میں لیکر منن نے پھر عیدگاہ کا رخ کیا۔ کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہو لیا۔ واٹر ورکس کی دیوار کے نیچے پہنچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سایہ میں دونوں بیٹھے۔ منن نے کوٹ کی جیبوں میں سے چرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے، ہڈیاں اور بوٹیاں کلوا کو کھلائیں۔ اس کے بعد املی پر الجھی ہوئی پتنگ پر اینٹ کے ڈھیلے کا لنگر اچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اچھال پر اچھلتے تھے۔ لیکن فٹ سوا فٹ ان کی حد تھی۔ اس کے بعد عیدگاہ میں لمبی ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اٹھا کر تال کٹورے کا رخ کیا۔ راستہ میں منن نے کیتھے کے وہ چٹخارے لئے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی۔ لیکن جب حصہ ملا تو سونگھ کر ہی چھوڑ دیا ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند.....

جانوروں کو انسٹنکٹ (instinct) کا مادہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں۔ اور ہم کو عقل! جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے منن گھر واپس ہوا تو اس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں۔ باپ دروازے پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اور فوراً واپس لوٹ پڑا۔ پھر عیدگاہ پہنچا۔ وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی طرف خود بخود اٹھنے لگے۔ واٹر ورکس کے پاس آ کر پھر دل پر ڈنکے چلنے لگے۔ عقل نے قدم روک دیئے۔ واٹر ورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سنسان تھا۔ تھوڑی دور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کود ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پکی دیوار تھی۔ جس سے ڈیڑھ فٹ نیچے شفاف پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ منن اپنی فکریں بھول گئے۔ کنارے اکڑوں بیٹھ کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی جڑ تک آ گئی۔ منن نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا۔ پوری جان سے اندر لڑھک گیا۔ کلوا کچھ دور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اس نے پانی میں جست ماری۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہنچے بچہ پانی کی تہ کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اچھالا کھایا۔ کلوا کے دھوکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتا دیا کہ بچہ کس جگہ ابھرے گا۔ وہیں پر موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا۔ لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ کتے کی گردن میں اور دوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

افق کی سرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر جھانک جھانک کر تارے نکل آئے۔ ایک چمگادڑ نے پانی کی سطح پر تڑاتا مارا۔ دو بوند پانی منہ میں۔ تھتھاتا ہوا نکلا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ایک نیولے نے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور سمٹ کر رہتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ ماہ و مریم سے ایک تارہ ٹوٹا اور راہِ عدم میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا۔ جسم میں طاقت نہ تھی۔ ہاں اپنی ناک سے پانی باہر رکھ سکتا تھا بانچنے کی۔ دل میں طاقت وہی باقی تھی۔ مالک کی ناک اوپر رہتی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے۔ سسکتے ہوئے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑ دی۔ جس کو تھوڑی دیر بعد بھنگیوں نے نکال کر احاطہ سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنسناتے اترے۔ چونٹ کے پچھلے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے۔

ابوالفضل صدیقی

بازگشت

تمام علاقہ میں سناٹا تھا ـــــ عورتیں خائف خائف نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ایک آدھ سرگوشی کرکے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتیں، پھر بھی بچے سب کچھ سمجھ کر سہم کر رہ جاتے، مرد الاؤ کے گرد چلموں کے دھوئیں میں چپکے چپکے افواہوں پر تبصرہ کرتے، اور ڈر کے مارے گھٹ گھٹ کر خاموش ہو جاتے اور منٹ دو منٹ کی خاموشی کے بعد جب سکوت ٹوٹتا تو باوجود کوشش کے بھی وہ کوئی اور موضوعِ گفتگو تلاش نہ کر پاتے، اور پھر یہی سلسلہ جاری ہو جاتا۔ جدید سے جدید تر افواہیں حرکت میں تھیں اور ادھر ادھر سے ہر آنے والا آدمی افواہوں کی زنجیر میں ایک نئی کڑی کا اضافہ کرتا اور افواہوں کی زنجیر کا سلسلہ تمام ضلع کے اندر ملا ہوا تھا اور آٹھ دن یہ زنجیر مضبوط تر ہوتی جاتی اور ہراس در ہراس میں یہ مخصوص علاقہ لپٹا تھا اور کولو آکھارہ کے علاقہ کی جانب جانا تو در کنار نظر اٹھانے کی بھی کسی بڑے دیر بہادر کی ہمت نہ پڑتی۔ دیہاتی ذہنیتیں یوں بھی بھوت پریت قسم کے خوفوں کو بڑی جلد قبول کرتی ہیں اور پھر یہ کولو آکھارہ والا بھوت کوئی سنی سنائی چیز تو تھا نہیں، کتنی ہی مرتبہ کا آنکھوں دیکھا ـــــ پھر کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، علاقہ بھر میں بھیڑیوں ہی کا ہراس کیا کم تھا۔ اس کے ساتھ بھوت کے خوف نے اچھے اچھوں کے پتے پانی کر دیے۔

کولو آکھارہ کا خشک غیر کاشتہ اونچا نیچا، سخت کنکریلی مٹی کا رقبہ میلوں کے گرد میں پھیلا ہوا تھا۔ پچھلی صدی کے وسط تک یہ ہرا بھرا زرخیز میدان تھا۔ رفتہ رفتہ برسات کے پانی کا رخ شدت کے ساتھ ادھر کو ہوا، اور یہ زرخیز میدان پانی کے بہاؤ نے کاٹ کر پھینک دیا اور پندرہ بیس میل لمبا اور دس پندرہ میل چوڑا رقبہ اونچی نیچی اور گہری اوتھلی نالیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ نشیب بڑھتا گیا۔ دور دراز کا برسات کا پانی ادھر کو رجوع ہوتا گیا اور کولو آکھارہ رفتہ رفتہ پھیلتا گیا۔ ہر سال نئی اراضیات نئے نئے گاؤں کے رقبے برسات کے پانی کے کٹاؤ کی تباہ کاری میں پلٹتے گئے۔ برسات میں پانی کا تند بہاؤ کھیتیاں برباد کرتا گیا اور کنکریلے مٹی کے ٹیلوں اور گہری اوتھلی نالیوں کی تشکیل کرتا رہا۔ گاؤں ویران ہوتے رہے اور اس مخصوص علاقے کے سکان کھیتی کرنا بھولتے گئے اور پانی نہ معلوم زمین کی کتنی تہیں اڑاتا رہا اور بھانت بھانت کی مٹیاں ادھر سے ادھر کرتا رہا۔ ہر برسات کے اندر دو بارشوں کے درمیان چند روز دھوپ پڑتے ہی یکدم خشک ہو کر یہ علاقہ سنگلاخ کنکریلی شکل اختیار کر لیتا اور برسات ختم ہونے پر تو یہ اونچے نیچے پیلی مٹی کے ٹیلے اور نالیاں ایسی خشک ہو جاتیں کہ کہیں پر گھاس بھی نظر نہ آتی۔ جگہ جگہ پانی کی

دھار سے بچے ہوئے ٹیلوں میں گز گز ڈیڑھ ڈیڑھ گز اونچی جنگلی جھاڑیاں جن کے تخم پانی کبھی کبھی چھوڑ جاتا یا کہیں سرکنڈے کے جھنڈ اُگ آتے جن کی عمر بالعموم اگلی برسات تک ہوتی اور یہ منہ آنے والی برسات کے پانی کی بے تکی رو میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی۔

اور یہ لق و دق، اونچی نیچی خشک وادی بھیڑیوں، خرگوشوں، لومڑیوں کا مسکن تھی اور بھاگے ہوئے ہرنوں کی پناہ گاہ۔ جن کے زردی مائل خاکی رنگ بین اس کی مٹی کے مطابق تھے۔ اس علاقے کے تمام گاؤں تقریباً ویران تھے مگر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی عارضی چھپروں کی جھونپڑیاں نظر آتیں۔ البتہ اس کے ملحقہ گاؤں معمولی گاؤں سے ذرا بڑے تھے۔ ان میں اس ویران علاقے کے کسان جا بسے تھے۔ کولوآ کھار کا علاقہ یوں تو سب ہی جانوروں کا مسکن تھا۔ مگر خاص جولانگاہ بھیڑیوں کی تھی۔ اس علاقے اور اس کے ملحقہ دیہات کا مخصوص پیشہ بھیڑ بکریاں پالنا تھا۔ اور بھیڑیئے دن دہاڑے چرتے ہوئے گلوں پر آ پڑتے اور بھیڑ بکریوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ اچھلتے، کودتے ہرنوں پر داؤں کر کے دار کرتے اور خرگوشوں لومڑیوں کو لقمہ بناتے اور رات کو کولوآ کھار کے اندر کی جھونپڑیوں اور گونٹھوں پر اور ملحقہ علاقے کے گاؤں پر چھاپے مارتے باڑھوں میں سے بھیڑ بکریاں لے کر ایک جست میں نو فٹ اونچی دیواریں پھاند کر مع بکری کے باہر آ پڑتے۔ سوتی ہوئی ماؤں کی بھری گودوں پر دندانِ آز تیز کرتے۔ بھیڑیا، چیتا، آدم خور، بز خور، آہو خور، غرض کہ جو کچھ بھی اس کے منہ میں پڑ جائے وہ سب کچھ خور واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ہم جنس بھیڑیئے پر بھی بند نہیں ہوتا اور ذرا سی کمزوری پر بھیڑیا بھیڑیئے کو چٹ کر جاتا ہے اور آدم خوری کے معاملہ میں آدم خور شیر سے زیادہ بے پناہ اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی آدم خوری بچوں تک محدود ہوتی ہے۔ اور طریقہ چور جیسا ہے۔ یوں تو آدم خور درندہ بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ مگر بھیڑیا سب سے زیادہ خطرناک یوں ہے کہ یہ رات کے شروع حصے میں پہلی نیند کے وقت سوتے ہوئے دیہاتیوں کے گھروں کی نیچی نیچی دیواریں پھاند کر یا دروازوں کی ٹٹیوں میں سے کھسک کر چور کی طرح گھر میں گھستا ہے اور ٹوہ لے کر سیدھا خورد سال یا شیر خوار بچوں کی ماؤں کے بستر پر پہنچتا ہے۔ تمام دن کی کام کی تھکی ہاری، سوتی عورتوں کے پہلو سے چمٹے ہوئے بچوں کو لے بھاگتا ہے۔ نیند میں غلطاں ماحول کے اندر بھیڑیئے کا یہ حملہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ بچے کی چیخ پر بالعموم بدنصیب سوتی ہوئی ماں لوری دیتی ہے۔ اور اگر خطرے کا احساس ہو گیا تو شور مچاتی رہ جاتی ہے۔ بھیڑیا بچہ منہ میں دبا کر ایک جست میں باہر دکھائی دیتا ہے اور ماں پیچھے پکارا ہوتی رہتی ہے۔ سال میں دو چار حادثے ایسے ہولناک بھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں کہ بچے کی چیخ پر ماں ہوشیار ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی بچے کی ٹانگیں ماں کے ہاتھ میں رہ جاتی ہیں اور سر اور گردن تو جبلت کے مطابق بھیڑیئے کے جبڑوں میں ہوتی ہی ہے۔ اس رسہ کشی میں سو فیصدی ماں کی جیت ہوتی ہے اور بھیڑیا چبائی ہوئی کھوپڑی اور گردن کا بچہ ماں کے ہاتھ میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ بھیڑیا ہمارے علاقے میں برسات بھر پریشان اور بے گھر سا رہتا ہے۔ برسات شروع ہونے سے پیشتر نئے بچے جوان ہو کر ماں باپ کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ برسات میں منتشر ہو جاتے ہیں اور برسات ختم ہوتے ہی موقع موقع سے اپنے نئے بھٹ تیار کر لیتے ہیں جو ان کی جاڑے گرمی کی پناہ گاہ اور بچے دینے کی جگہ کا کام مئی جون تک دیتے رہتے ہیں۔ ان بھٹوں میں آرامگاہ، مردانہ مکان وغیرہ تقسیم ہوتی ہے۔ اور بچہ دینے کے وقت بھٹ کو گہرا کر کے مادہ علیحدہ جگہ بنا لیتی ہے۔ یہ بھٹ بالعموم ایسی جگہ واقع ہوتے ہیں جہاں برسات کے سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔ ۲۴ء کی برسات ختم ہوتے ہی یکدم کولوآ کھار کے علاقہ میں بھیڑیوں کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ یو پی گورنمنٹ کی جانب سے بھیڑیا مارنے پر ہمیشہ سے دس روپیہ انعام ملتا آ رہا تھا۔ ۲۴ء اور ۲۵ء میں حکام ضلع کو ان کے استیصال کے لئے ہتھیار تقسیم کرنا پڑے اور بیسیوں غریب شکاریوں نے اسے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس کے باوجود وارداتیں بڑھتی گئیں اور ۲۶ء کے ستمبر میں یکدم تمام علاقے میں یہ خبر بڑے زور سے پھیل گئی کہ کولوآ کھار پر بھوتوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

بھیڑیئے کا شکار یوں بھی تیسرے درجے کا اسپورٹ خیال کیا جاتا ہے۔ جس کو تقسیم انعام اور پیشہ ور شکاریوں کے لالچ کے سبب مخصوص طور پر ہمارے علاقے میں اچھے شکاری ذرا حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ نے انعام دگنا کر دیا اور مزید ہتھیار تقسیم کئے

مگر جب ان بھیڑیا مار شکاریوں نے بھوت اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تو وہ بھی دست کش سے ہوگئے۔ دلیر شبان زادوں نے اپنے ریوڑ کولوآ کھار کے علاقے میں لے جانا بند کر دیئے۔ یہاں آبادی تو یوں بھی عارضی تھی، البتہ اس لق و دق اونچے نیچے بیابان سے کئی کچے دیہاتی راستے گزرتے تھے۔ اب یہ بھی بند ہو گئے۔ اور چھوٹی چھوٹی گونٹیاں اجڑ کر ملحقہ بڑے گاؤں میں جا بسیں اور دیکھتے دیکھتے یہ تمام علاقہ غیر آباد ہو کر بھیڑیوں کی خود مختار ریاست بن گیا۔ بھیڑیئے ملحقہ گاؤں سے بھی آگے بڑھ بڑھ کر چھاپے مارنے لگے اور ضلع کے تین چار تھانے ان سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اب کوڑھ میں کھاج یہ ہوئی کہ یکدم بھوت والی افواہ تیز تر ہو گئی۔ چاروں طرف پانچ پانچ دس دس میل تک دیہات میں شدید ہراس پھیل گیا۔ مدتوں سے بھیڑیوں کے مارے تمام تمام رات جاگتے گزرتی تھی۔ بھیڑیئے گھر گھر، باڑے باڑے پھاندتے، کتے بھونکتے رہ جاتے۔ مائیں مضبوطی کے ساتھ اپنے ننھے ننھے بچوں کو چمٹا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دیتیں۔ پھر بھی چیرہ دستی سے جس کا بچہ منہ میں پڑتا چھین کر چمپت ہو جاتے اور کولوآ کھار کی گھاٹی میں گھس پڑتے اور ان حدود میں کسی کو جانے کی ہمت نہ پڑتی اور بدنصیب ماں باپ رات کے چھینے ہوئے بچوں کی ہڈیوں اور کپڑے کے چیتھڑوں کا سراغ لگانے نہ پہنچ سکتے کیونکہ اب وہاں بھوتوں کا قبضہ تھا۔

یہ اندھیر دیکھ کر حاکم ضلع نے انعام کی رقم پچیس روپیہ کر دی۔ جن شکاریوں کو بھیڑیئے مارنے کے لئے بندوقیں دی تھیں ان کو تنبیہ کرنی شروع کی مگر پیشہ ور شکاری ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان میں سے اکثر اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھ چکے تھے۔ حاکم ضلع نے اب مضافاتِ دیہات اور شہر کے مشہور شکاری جمع کئے اور اس انتظام میں مدد طلب کی۔

ہماری مخصوص چھ آدمیوں کی پارٹی اپنی نوعیت اور طرزِ شکار کے اعتبار سے ایک خاص انفرادیت کی حامل تھی۔ شہر کے شکاری ہمارے ساتھ نہ لگ سکتے تھے۔ سرکاری حکام اور شوقین شکاریوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ہمارا ساتھ دے سکیں جب مجسٹریٹ ضلع نے ہم کو بلوا کر یا استدعا کی تو ہماری توجہ ادھر ہوئی ورنہ ہم لوگ اس کو پیسہ پیدا کرنے والے شکاریوں، خانہ بدوش کنجروں اور پاسیوں کا کام سمجھ کر اب تک ذلیل سمجھے ہوئے تھے۔ میں تو خیر شہر کے قریب ترین مضافاتی مقام کا رہنے والا ہوں۔ بقیہ اور سب ساتھی دیہات کے رہنے والے تھے اور تین دن کے اندر میری دعوت پر استاد رضا خاں، سنگھ بابو، عابر خاں اور انوار خاں بھی جمع ہو گئے اور بڑے شوق کے ساتھ اسکیم بن گئی۔ استاد رضا خاں کی رائے ہوئی کہ شکار شروع کرنے اور کولوآ کھار کے علاقے میں داخل ہونے سے پیشتر ان پیشہ ور شکاریوں سے بات چیت کی جائے جو اس علاقے میں بھیڑیئے مارنے کا کام برسوں سے کر رہے ہیں۔ اور پھر کولوآ کھار کے چاروں طرف لگے ہوئے دیہات کا دورہ کر کے معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد اچھی طرح تمام وادی کو پرتالا جائے اور بھیڑیوں کی جولانگاہیں، بھٹ اور ان کے راستے اور نقل و حرکت کا دن میں کھوج لگایا جائے۔ اور پھر بھیڑیئے کے مخصوص طریقۂ شکار کے مطابق راتوں میں شکار شروع کیا جائے۔ ویسے یہ علاقہ تھوڑا بہت ہمارا گھوما ہوا تھا۔ کبھی کبھی زخمی ہرن میدان سے چوٹ کھا کر اس میں پناہ لیتے تھے اور ہم تعاقب کرتے اس میں جا پہنچتے تھے۔ دو چار مرتبہ اس کے بعض ایسے حصوں میں جہاں جھاڑیاں اور جھنڈ تھے تیتروں کا شکار کیا تھا۔ دو ایک مرتبہ خرگوش مارے تھے۔ اور کبھی کبھی اس کے اندر سے جاتے ہوئے راستوں سے گزرے تھے۔

سب سے پہلے ہم نے بھیڑیئے مار شکاریوں سے رجوع کیا جو آج کل حکام ضلع کے معتوبوں میں تھے۔ غریب رونے سے لگے اور روزگار ہاتھ سے نکل جانے پر پریشانی کا اظہار کیا، ورنہ دو آنے کے کارتوس میں دس روپے ہاتھ آجایا کرتے تھے اور تین بھیڑیوں میں لبنہ بھر سارے گھر کا پیٹ پلتا تھا۔ ان کی تقریر سن کر ہمیں بھیڑیئے کے شکار سے گھن سی آنے لگی، اور پھر ان میں سے بعض نے اپنے چشم دید بھوت کے واقعات بیان کئے۔ باتیں دونوں اچھے شکاریوں کے شایانِ شان نہ تھیں۔ شکار کے حادثے میں روپیہ پیسہ لینے کا تذکرہ اور پھر بھوت کا حوالہ۔ مشہور بات ہے جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلا کرتا۔ مگر پہلی چیز ہم میں رجعت پیدا کرتی تھی۔

تو دوسری دعوت دیتی تھی کہ یہ شکار جس میں بھوت کا واسطہ لگا ہے اور جس کے ڈر سے ہر آدمی میدان چھوڑ گیا ہے ضرور کیا جائے۔ ہم چار روز تمام دیہات میں طوفانی دورہ کرتے پھرے اور ہر جگہ بھوت والی روایت نہایت شدت کے ساتھ ذہنوں میں راسخ پائی۔ "بھوت پریت کے لئے دیہاتی ذہنیتوں کی مٹی یوں بھی بہت زرخیز ہوا کرتی ہے۔" ہم نے آپس میں کہا، آدم خور بھیڑیوں اور بھوتوں کے عمل میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہوتی ہے اور ہم شوق سے شکار کے لئے تیار ہو گئے۔ بھیڑئیے کے شکار کا مخصوص اور نہایت آسان طریقہ ہے۔ بھیڑیا رات میں شکار کرتا ہے اور علی الصبح بھٹ میں واپس آجاتا ہے۔ بالعموم رات کے نو دس بجے بھٹ سے برآمد ہوتا ہے اور رات کے شروع حصے ہی میں شکار کر لیتا ہے، ورنہ تمام رات ڈاؤ گھات کرتا پھرتا ہے اور صبح کاذب کے وقت ہاتھ مارتا ہے۔ یہ وقت بالعموم گاؤں کے اندر بکریوں کے باڑوں اور آدمی کے بچوں پر چھاپہ مارنے کا ہوتا ہے اور تمام دن بھٹ میں آرام کرتا ہے۔ سیدھے سادے اندھے دھندے شکاری رات کو بھیڑئیے کے نکلنے سے پیشتر بھٹ کے دروازے کے قریب چھپ کر جا بیٹھتے ہیں اور نکلتے ہی ٹھائیں سے مار دیتے ہیں۔ بالعموم بیس پچیس گز کے فاصلے سے فیر ہوتا ہے۔ خالی جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ چوٹ اتنی کاری پڑتی ہے کہ سانس بھی نہیں لیتا اور جہاں کا تہاں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ہر شکاری سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے شکار میں اسپورٹ کی کتنی روح ہو سکتی ہے۔ اور کیا لطف آسکتا ہے۔

سب معلومات حاصل کر کے ایک دن دوپہر سے شام تک ہماری چھ آدمیوں کی مختصر سی پارٹی وادی کے اس مخصوص حصے میں گھومتی رہی جس میں بھیڑیوں کی کثرت کے ساتھ بھوتوں کی کارفرمائی بیان کی جاتی تھی۔ تمام گزرگاہیں اور مواقع دیکھ کر ہم اپنی جائے قیام پہ واپس آگئے جو کولو آکھار کے عین وسط میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی۔ تھوڑا سا کھانا کھا کر اور چائے پی کر دس بجے کے قریب ہم اپنی جائے قیام سے نکلے اور اپنی اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ رات تو چاندنی تھی مگر آسمان پر ہلکی ابر کی چادر پھیلی ہوئی تھی جس نے جنگل کے سناٹے کو زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ ایسے ہی بھیانک سناٹوں میں شکاری کی فطرت جلا پاتی ہے اور لطف دوچند ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنی نشستوں کے لئے تین بھٹ منتخب کئے تھے۔ ایسے بھٹ اور بھی تھے مگر ہم چھ کی مختصر پارٹی اس سے زیادہ گھیر نہ سکتی تھی۔ ایک بھٹ استاد رضا خاں اور میں نے پسند کیا تھا، اس سے پورب کی جانب تین سو گز کے فاصلے پر ٹیلوں کی آڑ میں ایک بھٹ پر انوار خاں اور صابر خاں تھے اور اوپر ایک ٹیلے کے اس پار تقریباً ایک فرلانگ کی مسافت پر سنگھ بابا اور حسلم براجمان تھے۔ سنگھ بابو شام ہی کے وقت سے کچھ سست سے ہو گئے تھے اور چپ چپ سے تھے۔ دراصل انہیں دیہات کی افواہوں نے قدرے متاثر کر دیا تھا، اور شاید وہ بھوت کے وجود پر پہلے سے بھی کچھ یقین رکھتے ہوں۔ دبی زبان سے ایک آدھ مرتبہ انہوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی کھانا کھانے میں ادا کئے تھے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ پروگرام انہیں زیادہ پسند نہیں ہے —— تمام علاقہ دم بخود تھا کہ چند پٹھان اور ٹھاکر بچے، سرپھرے شکاری آج بھوتوں سے لڑنے کولو آکھار میں گھس پڑے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہو۔ کہیں کہیں لوگ ڈر رہے تھے کہ مبادا کوئی مصیبت ارد گرد کے گاؤں والوں پر آجائے اور کوئی پرانا تجربہ کار بوڑھا یقین کئے ہوئے تھا کہ ان کا بچ کر آنا مشکل ہے۔ غرض تمام علاقے میں ہمارے اس اقدام کی شہرت تھی اور آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

ہر بھٹ کے تین تین دروازے تھے۔ ہم نے اپنی نشستوں کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ دو شکاریوں میں سے ایک ایک کی کمان میں ایک ایک دروازہ تھا اور تیسرا دونوں کی کمان میں مشترک تھا۔ ہم قریب گیارہ بجے کے اپنی اپنی جگہ پہنچے اور چھپ کر بیٹھ گئے اور بھٹوں کے دروازوں پر ٹکٹکی باندھے انتظار کرنے لگے۔ نومبر کے شروع ہفتے کی خنکی اونچے نیچے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کے اندر نرم نرم ہوا کے سنکنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی اور جگہ جگہ جھینگر نغمہ ریزی سی کر رہے تھے۔ کسی کسی وقت کہیں دور کے گاؤں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز

آتی اور پھر ہلکی ہلکی سائیں سائیں اور جھینگروں کی آوازیں جلترنگ سا بجانے لگتیں۔ ہم چھ کے سوا وادی کے طول و عرض میں کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ آسمان سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور کل وادی میں صبح کاذب والی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

پہنچنے کے گھنٹہ بھر کے اندر ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم بھٹ کے قریب آ گئے ہیں اور بھیڑیئے اس قدر نڈر ہو گئے ہیں کہ اپنی جبلّت کے خلاف وقت بے وقت بھٹ میں سے نکل پڑتے ہیں۔ سرِ شام کی وارداتوں کی افواہیں ہم لوگ تمام علاقے میں سن کر آ رہے تھے۔ مگر تمام دیہات میں تو افواہیں ہی افواہیں تھیں اور پھر بھیڑیئے کے حادثے کی ہر حکایت کے ساتھ بھوت کا کردار کسی نہ کسی پہلو سے لگا ہوتا اور ہمارے لئے کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا مشکل تھا مگر اب یقین ہو گیا کہ بھیڑیئے بجائے پہر بھر رات گئے نکلنے کے سرِ شام ہی نکل پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے والا بھٹ بھی خالی تھا اور بقیہ دو بھٹوں سے بھی کوئی آواز دھماکے کی سنائی نہ دی۔ استاد رضا محمد خاں مجھ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر داہنی جانب ایک چھوٹے سے مٹی کے ٹیلے کی آڑ میں اپنی نشست لئے ہوئے تھے۔ اور میں ڈھلان سے اترتی ہوئی ایک نالی میں دبکا ہوا تھا۔ استاد رضا محمد خاں نے اشارے ہی اشارے میں مجھ سے کہہ دیا کہ بھٹ خالی ہے اور اب ساری رات بیٹھنا پڑے گا۔ کہیں صبح ہوتے امید ہو سکتی ہے جب بھیڑیئے شکار کر کے پلٹنے لگیں —— ان کا شکار بہت مشکل سے کامیاب رہتا ہے۔ بھیڑیا کھلے میدان میں ہوتا ہے۔ تمام رات شکار کرتے رہنے کے سبب وہ غیر معمولی ذکی الحس ہوتا ہے اور بہت دیکھ بھال، جانچ پڑتال کر کے بھٹ کے قریب آتا ہے۔ بھٹ سے نکلتے وقت خواہ کتنا ہی چوکنا ہو کر نکلے پھر بھی تمام دن کا سکون پائے ہوئے ہوتا ہے۔ بہر صورت بھٹ میں سے یکدم باہر کھلے میدان میں آن پڑتا ہے اور دروازے کے ارد گرد چھپے ہوئے آدمی کا باہر نکل کر ہی اندازہ کر سکتا ہے۔ پہلی جھلک پر شکاری یکدم ایک دو تین کر دیتا ہے۔ باہر سے اندر جاتے وقت پہلے تو تمام رات کا لتاڑا یوں بھی قدم قدم پھونک پھونک کر دھرتا ہے اور پھر کھلے میدان میں اچھی طرح ناک، کان اور آنکھ سے کام لے کر قریب آتا ہے۔ سب سے بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ شکاری کو معلوم نہیں ہوتا کہ بھیڑیا اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے کس سمت سے آئے گا۔

خیر ہم نے تھوڑی دیر اطمینان کے ساتھ نشستوں پر پہلو بدلے۔ شروع میں کچھ دیر ڈھیلے ڈھیلے بیٹھے رہے اور سمجھ گئے کہ شکار کا جو نقشہ بنا کر چلے تھے وہ بگڑ گیا۔ نصف شب گزرنے پر آگے پیچھے دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف گہری توجہ شروع کی اور اس حد تک دبک کر بیٹھ گئے کہ مٹی کا تودہ معلوم ہونے لگے۔ اگرچہ اس شکار میں اس سے زیادہ لطف آ رہا تھا جو بھٹ سے نکلتے ہی کتے کی موت مارے کے طریقے میں آتا۔ کم سے کم کچھ کشمکش و پیچ، کچھ غیر یقینی صورت تو تھی۔ ورنہ وہ بھی کیا شکار کہ ایک سوراخ پر نگاہ جمی ہوئی ہے اور سر نکالتے ہی ٹھائیں سے شکار ختم۔

چاند کی حرکت کے ساتھ بادل کی سفید چادروں سے چھن چھن کر گرتی ہوئی چاندنی کی کیفیات بدلتی رہیں۔ خنکی اور نمی بڑھتے بڑھتے کل معمورات کی سیمیں ردا تر ہو کر ٹپکنے سی لگی۔ تمام رات انتظار کے شکار اس سے پہلے بھی بہت کئے تھے مگر بھیڑیئے کے لئے آج پہلی مرتبہ بیٹھے تھے۔ آدھی رات گزرنے پر میں نے غور کیا کہ آغازِ شب سے ہی آج کچھ شکار کا جوش اور جذبہ شعور پہ اچھی طرح طاری نہ ہوا تھا اور اس وقت کچھ طبیعت کند بھی ہو گئی اور ایک مبہم سا اچاٹ پن جو ٹوٹنے پر ایک نامعلوم خوف کی حد تک پہنچتا محسوس ہوتا تھا میرے دماغ پر آہستہ آہستہ مسلط ہوتا جا رہا تھا جیسے انتظار بار سا معلوم ہو رہا تھا۔ اگرچہ ہر قسم کے انتظاروں میں شکار کا انتظار خوشگوار ہوتا ہے اور شکار کا سارا لطف مشکل اور جدوجہد کی سختی میں مضمر ہے۔

دیکھتے دیکھتے جیسے کل فضائے بسیط انگڑائی سی لے اٹھی اور ابر آلود چاندنی کے ساتھ صبح کاذب کا اجالا مل کر عجیب رومانوی قسم کے انتظار سے ماحول کو درخشاں تر کرنے لگا۔ موتیا رنگ کی آبدار بھیگی ہوئی خاموش رات، پرسکوت اونچا نیچا ماحول اور ہمارے جسم اور ہمارے حسیات

سب نیند میں غلطاں ہو گئے۔ میں نے بندوق کی نال پر ہاتھ پھیرا۔ سردی میں یخ اور اوس میں بھیگا ہوا فولاد۔ پھر اپنے تر ہاتھ کپڑوں پر پھیر کر منہ پر پھیرے اور نشست پر پہلو بدل کر ایک گہری جماہی لی۔ پھر ایک لمبی انگڑائی کے ذریعے جیسے تمام رات کا کسل دور کرنے کی کوشش کی اور خیال کیا کہ ساری رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ بدن کو پوری طرح چرا کر نالی میں چمٹ سا گیا اور میرے دائیں ہاتھ کی جانب سے آہستہ آہستہ چٹ چٹ کی آواز کان میں پڑی۔ اس وقت شکاری کے حواس خمسہ بھی بھیڑیے سے کم تیز نہیں ہوتے۔ یہ چٹ چٹ بھیڑیے کے چلنے کی مخصوص آواز تھی جس کو دیہاتی کہا کرتے ہیں کہ چلتے وقت بھیڑیے کے پاؤں کی تلیاں چٹختی ہیں۔ میں نے نہایت فن کارانہ انداز میں بندوق سنبھالی اور اپنی کمان والے دروازے پر پوری توجہ کے ساتھ ٹکٹکی باندھی۔ مگر تمام رات کے مجرم اور مفرور بھیڑیے کی شامہ، سامعہ اور باصرہ پوری قوت کے ساتھ بروئے کار تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں نے مٹی کے تودے کی طرح بے حس و حرکت پڑے انتظار کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پلٹ گیا یا اوگر دکسی جھاڑی یا نالی میں دبک کر میرے ہٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا بھٹ کی جانب نہ آنا اس امر کی قوی دلیل تھی کہ اس نے مجھ کو بھانپ لیا ہے۔ میں نے بہت ہی آہستہ سے گردن پھیر کر استاد رضا خاں کی جانب دیکھا جو اپنی نشست پر مجھے نظر آ رہے تھے اور دونوں بالکل ہی پیلی مٹی کا تودہ معلوم ہو رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ استاد کے ہاتھ پر بھی چاپ سنائی پڑی ہے۔ ہمیں مردہ سا پڑے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا ایک آدھ مرتبہ تھوڑی چاپ اور سنائی دی اور پھر سناٹا۔

نومبر کے شروع کی خوشگوار خنکی تدرے تیز سردی میں تبدیل ہو گئی۔ پچھم سے چلتی ہوئی سبک رفتار ٹھنڈی ہوائیں دھار جیسی کاٹ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام رات کے اوس میں نم کپڑے گیلے گیلے سے معلوم ہونے لگے۔ میری ناک اور کان برف سے ہو گئے۔ سرِ شام کا اُبھرا چاند بادلوں کی سپیں دوا کے اندر ہی اندر ضو فشانیاں کرتا افق کی پستیوں میں جا لٹکا اور ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آسمان پر ایک خطِ نور بڑھتا چلا گیا۔ اور صبح کاذب کے سفیدے کے ساتھ مکر چاندنی کا نور مل کر تمام فضا کو پگھلی ہوئی چاندی کے آبشاروں میں تبدیل کرنے لگا۔ جگہ جگہ آسمان پر سپیدۂ صبح کی جھلک دکھائی دینے لگی اور نیچے جیسے ساری دنیا سچ مچ کچی چاندی میں تبدیل ہونے لگی۔ میں نے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے آسمان پر نظر کی۔ بادلوں کی کھڑکیوں سے پھیکی پھیکی چاندنی اور درخشاں سپیدۂ صبح جگہ جگہ افشاں کی پھواریں سی چھوڑ رہا تھا۔ میں ایک لمبی سانس لے کر استاد رضا خاں سے کچھ اشاروں میں بات کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ استاد میری جانب گھور کر دیکھ رہے تھے اور مائل بہ تکلم سے تھے۔

استاد نے اشارہ سے کہا کہ آج کا شکار بگڑ گیا۔ میں نے ہفتہ بھر کی محنت یوں رائیگاں جانے پر افسوس کیا۔ کیونکہ ہم لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ آنے والی شب میں شکار پر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ آج تمام دن آرام کیا جائے، پھر ساری رات آرام کیا جائے اور پرسوں کے تمام دن۔ تو کہیں جا کر پرسوں شب میں شکار کے قابل ہو سکیں گے۔ دیکھتے دیکھتے موتی جیسی آبدار رات کے ڈانڈے درخشاں صبح سے آملے۔ مغرب سے روشنی کا ایک سیلاب پھوٹ پڑا اور مشرقی افق قرمزی درخشانیوں سے چمکنا شروع ہوا۔ جھاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدکیں۔ مٹی میں سے جگہ جگہ ٹڈے اچھلے ایک ٹٹیری بار بار ہمارے سروں پر منڈلاتی ادھر سے ادھر اڑنے لگی۔ صبح صادق کے آثار زمین سے آسمان تک نمودار ہو گئے اور ایک مخصوص شور جیسے سناٹے کی آواز سے سارا ماحول سنسنانے لگا۔ اس مخصوص صبح والے سناٹے میں کسی کسی وقت دور سے آتی ہوئی کوؤں کی آوازیں کان میں آئیں۔

ہماری، سنگھ بابو اور مسلہ کی نشستوں کے درمیان ایک اونچا خشک کنکریلی پیلی مٹی کا ٹیلا اور ادھر ادھر گہری گہری کٹی ہوئی نالیوں کا ایک جال تھا۔ دوسرا ٹیلا اس سے قدرے نیچا اور اس ٹیلے کے ڈھلان پر وہ بھٹ واقع تھا جس پر یہ لوگ داؤں کئے بیٹھے تھے یعنی ہمارے اور ان کے درمیان دو چوڑی نالیاں اور ایک اونچا ٹیلا حائل تھا۔ دوسرے برابر والے ٹیلے کا چند گز ڈھلان چڑھ کر یہ بھٹ آتا تھا۔ ناامیدی بڑھتی جا رہی تھی اور میرا جاٹ پن اکتاہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ یکدم سنگھ بابو کی نشست کی جانب سے ایک بھیانک آواز سنائی دی "گھیے۔ گھے

گھگھے گھے! بھو، بھو! بھوا وت!" اور باوجودیکہ حلق اور زبان کے بجائے یہ پیٹ سے بلند ہوئی تھی مگر میں نے پہچان لی کہ سنگھ بابو کی آواز ہے۔ اور پھر ہم نے دو منٹ دھماکے کا انتظار کیا مگر بجائے دھماکے کے بت بتاہٹ سنائی دی۔ ہم لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ نہ سکتے تھے کیونکہ یہ قاعدہ کے خلاف تھا۔ چند منٹ اور انتظار کیا۔ اتنے میں سیٹی کی آواز سنائی دی اور پھر صاف صاف بلانے کی سیٹی ان کی جانب سے بھی۔ جس کا جواب صابر اور انوار کی نشست کی جانب سے آیا تو استاد رضا خاں نے بھی جوابی سیٹی بجائی۔ اور سیٹی کی مخصوص آوازوں کے تبادلے میں طے ہو گیا کہ سنگھ بابو کی جانب چلنا چاہئے۔ ہم نے بندوقیں نیچی کئے تیز تیز نالے کے نشیب و فراز طے کئے اور ٹیلے کے ادھر والے ڈھلان پہ چڑھ کر چوٹی پر سے کچھ دیکھنے کی کوشش کی، اور پھر سنگھ بابو کی جانب سے پیہم بلانے کی سیٹیوں پر بڑھے۔ دوسرے ڈھلان کی جانب اترے اور پھر تیز تیز ادھر والے نالے کی چھوٹی بڑی اونچی نیچی سطح پر جستیں سی لگاتے اس ٹیلے کی جانب بڑھنے لگے۔ ادھر والا ڈھلان ہم نے تیز تیز چڑھنا شروع کیا، اور جب ہم اس کی چوٹی پہ پہنچے تو ہمیں اپنی داہنی جانب سے صابر خاں اور انوار خاں چڑھتے دکھائی دئے اور نیچے ادھر والے ڈھلان کی جانب سے اپنی نشست چھوڑ کر سنگھ بابو آگے آگے اور مسلم پیچھے پیچھے لپکتے دکھائی دیئے۔ چونکہ سب لوگ اتفاق سے براہ راست ہماری جانب بڑھ رہے تھے لہذا ہم وہیں چوٹی کی نوک پر ٹھٹک کر انتظار کرنے لگے۔ اب ہم چاروں ٹیلے کی نوک پہ جمع تھے جس کے ڈھلان پہ ادھر والے نالے سے ذرا اوپر ڈھلان پہ وہ بھٹ تھا جس پر سنگھ بابو اور مسلم داؤں کئے بیٹھے تھے۔ سنگھ بابو دوڑنے اور چلنے کی درمیانی چال چلتے ہمارے قریب آئے۔ مسلم پیچھے پیچھے لپک رہے تھے۔ میں "کیا ہے بھائی؟" سوال کرنے ہی والا تھا کہ استاد رضا خاں بول پڑے —

"کیوں جی، کیا غدر تھا بھائی؟" مگر کنور جی تو بہت بدحواس ہو رہے تھے۔ "وہ۔ وال۔ بھوت۔ استاد بھو بھوت!" اور میں نے غور کیا کہ سنگھ بابو کی زبان لکنت کر رہی ہے اور جسم پسینہ پسینہ تھا۔ جب میں نے قریب جا کر ان کے چہرے پر غور کیا تو آنکھوں میں بلا کی وحشت اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں نے اور قریب جا کر ہمدردی کے ساتھ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اندازہ کیا کہ ان کے نہ صرف ہاتھ میں بلکہ تمام جسم پہ رعشہ سا ہے۔ جیسے ان کی رگ رگ بکھری جا رہی ہے۔ سنگھ بابو جیسے پختہ کار۔ ور بہادر راجپوت شکاری کو اس درجہ خائف دیکھ کر میرے شعور میں بھی یک گونہ خوف کا احساس بیدار ہوا۔ اتنے میں صابر خاں اور انوار خاں بھی لپک کر آ گئے۔ اور دونوں نے بے ساختہ ایک منہ ہو کر کہا کہ "کیا ہے بھائی خیر تو ہے؟"

استاد رضا خاں تمسخرانہ سنجیدگی سے بولے "میاں ہوتا کیا وہی بھوت تھا۔ ہمارے کنور جی کو دبوچ ہی لیا تھا۔ بے چارے بڑی مشکل سے جان بچا کر بندوق لٹکائے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ خیر گزری"

سنگھ بابو ہماری صحبت کا رکن تھا۔ اور ہماری پارٹی کا سب سے زیادہ چلتا پرزہ! میری طرح وہ بھی استاد رضا خاں کا دوست قسم کا شاگرد تھا۔ استاد کے انداز پہ ذرا سنبھل اور نہایت سنجیدگی سے کہا —

"میاں ہم اپنی آنکھ سے دیکھ کر آ رہے ہیں۔ وہ وہاں ٹیلے کی آڑ میں سے یک دم پہلے دو ٹانگوں پہ کھڑے ہو کر مڑکایا، پھر ایک مرتبہ دبکا، پھر اچکا اور پھر لنگور کی سی جست لگا کر یک دم غیب سے بھٹ میں گھس گیا" یہ کہتے ہوئے مسلم سے اپنے بیان کی تصدیق چاہی۔

مسلم بھی خائف سے تھے مگر چہرہ سے سنجیدگی ظاہر ہو رہی تھی اور خوف کے آثار محض آنکھوں میں تھوڑے بہت نمایاں تھے۔ انہوں نے بیچ کر حلق صاف کیا اور پست آواز میں بولے "بھئی وہ ان کے ہاتھ پہ آیا تھا، جو کچھ بھی تھا۔ اور مجھ سے وہ جگہ بالکل آڑ میں تھی۔ جہاں سے سنگھ بابو اس کا چھکنا اور پھر بھٹ کے اندر کو جست کرنا بیان کرتے ہیں۔ البتہ پھیکی چاندنی میں میں نے ٹیلے کی آڑ سے لمبا سا سایہ اپنی بائیں جانب متحرک ہونے کا احساس کیا۔ تیزی کے ساتھ قدرتی طور پہ ادھر کو میری نظر مڑی تو ہر چیز غائب تھی۔ سایہ میں نے یقین کے ساتھ دیکھا بھی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کنکھیوں سے کسی سایہ جیسی حرکت کا مبہم سا احساس کیا اور جہاں تک خیال ہے ایک نامانوس سی سرسراہٹ بھی کان میں گئی —

اور میں بھی ہیں من سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی چیز نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی چیز تھی ضرور، یہ کیا تھی؟ یہ یہ جانیں اور پھر یک دم گھگھیا پڑے "بھوت، بھوت"!

سب نے یک قہقہہ لگایا مگر سنگھ بابو نے زیادہ درست ہو کر کہا "دیکھو بھیا مسلم! وہ جو کچھ بھی تھا مگر بھیڑیا نہیں تھا کیونکہ تمہارے کان میں سرسراہٹ کی آواز گئی چٹ چٹ نہیں گئی نا۔"

"ہاں صاحب چٹ چٹ نہیں گئی۔"

"اور بھیڑیئے کی چاپ میں چٹ چٹ بجتی ہے۔" سنگھ بابو نے سنبھل کر کہا!

"ہوں" مسلم نے کہا اور استاد رضا خاں بولے "تو بس بھوت تھا۔ اور تم بال بال بچے۔ میاں کنور جی کوئی بھیڑیا ویڑیا ہو گا۔ اور تم پر سر شام ہی سے بھوت کا خوف طاری تھا آج۔ ہم نے اندازہ کر لیا تھا کل ہی سے۔"

استاد کے جملہ پر سنگھ بابو کچھ تلخ سے ہو گئے اور بولے "استاد! بھوت، اور بھوت کے سوا کوئی اور چیز ہو تو۔ اور استاد ہم نے کبھی کسی زمانہ میں تھوڑا بہت بھیڑیئے کے شکار کا شوق کیا ہے اور آپ کی عنایت سے ہر رنگ میں بھیڑیا جنگل کے اندر دیکھا مارا ہے۔ بھٹ کے اندر گھستے بھی دیکھا ہے اور اندر سے نکلتے بھی۔"

"اچھا، تم نے پہلے بھی کبھی بھوت دیکھا ہے؟" استاد نے کہا

"جی مگر آج ضرور بھوت ہی دیکھا، اور گاؤں والے سچے ہیں۔ ضرور اس جنگل میں بھوت رہتے ہیں۔"

"خیر جانے دیجئے، بھیڑیا ممکن ہے۔ بھیڑیا نہ ہو، اور کوئی اور چیز ہو، آخر اسے ہم بھوت ہی کیوں کہیں۔"

"تو کسی اور چیز کا نام آپ مجھے بتا دیجئے کہ کیا ہو سکتی ہے؟ آخر ساری عمر آپ کی بھی شکاریں کٹی ہے اور میں نے بھی آپ جیسے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ آپ اس جنگل کے لحاظ سے کسی ایسی چیز کا تعین کیجئے جو اس حلیہ کی ہو۔ جناب اس کے سر پر بالوں کا گچھا ہے، بلکہ مجھ کو تو جسم پر بھی بال معلوم ہوئے۔ اور جب اس نے مڑ کر جست کی تو مجھے اس کے پاؤں بھی ایسے معلوم ہوئے کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں۔"

صابر خاں نے دخل در معقولات کیا "معلوم ہوتا ہے صبح کی نیند میں آنکھ جھپک گئی۔ کئی دن سے گاؤں والوں میں بھوت کی روایت سنتے ہوئے تھے۔ کچھ خواب یا نظر بندی کا قصہ ہے بھیا، ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔"

سنگھ بابو چڑ سے گئے اور بولے "جی مجھے ہذیان ہو گیا تھا، میں پاگل ہوں۔ جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں، اور بڑبڑاتا ہوں۔ شکار آپ ہی نے کھیلا ہے، اور میں نے تو تیس برس بھاڑ جھونکا ہے۔ گویا آپ کے نزدیک میں ایسا گھامڑ ہوں کہ داؤں پر سو گیا تھا! اور آپ جاگ رہے تھے۔"

صابر غریب قائل سا ہو گیا اور میں نے نیم سنجیدگی کے ساتھ ایک ایک لفظ چن چن کر کہا "جناب! ہم بھوت ووت نہیں جانتے، ہم تو صرف بندوق جانتے ہیں۔"

"خیر آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو پھر بھوت کے سوا اور کچھ نہ کہتے۔"

"جی خیر، مگر شاید ہم کتے پیچھے، پہلے دونوں نالیں دے بجاتے، پھر دیکھتے کہ سالا کیسے بچ کر نکل جاتا ہے سامنے سے۔" صابر نے کہا "چھیچھڑے اڑ جاتے۔"

"جی آپ تو بڑے تیس مار خاں ہیں!" سنگھ بابو نے خشمگیں انداز میں کہا "کل سے بندوق ہاتھ میں لی ہے، دس پانچ ہرن کبوتر مار کر شکاری بن گئے۔ یہاں ہم نے جتنے کارتوس پھونک دیئے اتنے چھرے بھی ابھی بندوق کی نال سے نہ نکال پائے ہوں گے، خاں صاحب بہادر!"

"خیر تیس مار خاں نہ سہی مگر کنور جی آپ کی طرح گھگھیا بھی نہ پڑتا۔" صابر خاں نے کچھ دریدہ دہنی سے کہا

"اجی صاحب زادہ صاحب امیں خیر گھگھیا تو پڑا، آپ کے حلق سے تو آواز بھی نہ نکلتی۔ دیکھتے ہی وہیں پر غش آجاتا" سنگھ بابو نے کہا سنگھ بابو نجیب الطرفین جوان راجپوت تھا وہ اپنے وقت کا بڑا بہادر سپاہی قسم کا جوانمرد شکاری، جو جنگل سور سے ایک برچھا لے کر جا بھڑتا تھا، اور دو تین شیر اور گلدار زمین پر کھڑے ہو کر رائفل سے شکار کر چکا تھا۔ بلا کا مضبوط، ورجفا کش، پرانا تجربہ کار چابک دست وقادر انداز، اور صابر خاں نوجوان خام کار شکاری تھا۔ مجھے اور استاد رضا خاں کو سنگھ بابو کی آزردگی کا خیال ہوا اور میں نے کہا "بیٹا صابر! گھگھیاہٹ سے یاد رکھتے اور تم کہتے ہو کہ بندوق چلاتے۔ یہ سب وقت پر اوسان بندھنے والی بات ہے ورنہ سنگھ بابو ہماری پارٹی کا سردار ہے اور ضلع کیا دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتا"۔

استاد سنگھ بابو کا انداز دیکھ کر بولے "ارے مردے آدمیوں اس میں بحث کیا ہے، اور بھئی تم بھی اُلجھتے ہو یار سنگھ بابو کل کے لونڈے سے۔ مٹی تو بولی ہوگی ہی۔ وہاں پر بھٹ کے اندر کی نکالی ہوئی، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ چلو جس دروازہ سے تم نے گھستے دیکھا وہاں پر کھوج (نشانات قدم) دیکھ لیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ سب روشن ہو جائے گا"۔

ہماری مختصر سی پارٹی ایک اونچے ٹیلے کی نوک پر بیٹھی ہوئی تھی، اور بحث استاد رضا خاں کے اخیر جملہ میں ختم ہو گئی تھی۔ مشرق سے سورج کی دہکتی ہوئی پیشانی چمکی اور بے آب وگیاہ خشک کنکریلی زرد مٹی کی اونچی نیچی وادی سنہری خیرگیوں سے منور ہو گئی۔ یوں تو ناکامی، تکان اور جاگنے کا کسل رگ رگ پر سوار تھا۔ مگر بھوت کے کھوج دیکھنے کا اشتیاق ہم سب پر سوار تھا۔ ہم بھٹ پر پہنچے، پہلے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اندر کی نکلی ہوئی نرم مٹی پر سنگھ بابو نے بھوت کے قدموں کے نشان دکھائے۔ یہ مٹی ڈھلوان کی صورت پنجوں سے کھود کر گھر بنانے والے جانوروں کے بھٹوں میں اندر جاتے ہوئے نرم راستہ کی طرح جمع رہتی ہے اور بھیڑئیے کے بھٹوں پر پنجوں کے پھینکنے سے پچاس پچاس گز تک لمبی پتلی سڑک سی بن جاتی ہے جو بھٹ کے اندر کو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے چوہوں کے بلوں پر جمع رہتی ہے۔

دور سے نرم پیلی گہرائی کی نکلی ہوئی مٹی کے اوپر بھوت کے پنجوں کے نہایت واضح نشانات بنے ہوئے اندر کو چلے آرہے تھے جتنا چوڑا پنجہ اتنی ہی چوڑی ایڑی۔ رُخ الٹا پھرا ہوا۔ اور سنگھ بابو بولے "یہ دیکھئے یہ الٹا پنجہ، آپ ہی بتائیے کس کا ہو سکتا ہے؟"

"مگر یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ باہر کو نکلنے کے نشانات نہیں ہیں، اور یہ پنجہ پیچھے کو پھرا ہوا ہے" استاد رضا خاں نے سوچ میں پڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ یوں کہ میں سچ بول رہا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" سنگھ بابو نے کہا۔

"مگر آپ ان نشانات کے بارے میں کیا کہیں گے" استاد نے چند اور نشانات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا جو ان نشانات سے بالکل خلاف رخ میں لگے ہوئے تھے "اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ٹیلے کی آڑ سے اسے اچکتے ہوئے دیکھا اور اس ٹیلے سے براہ راست آتے ہوئے اس بل کے اندر کو بھی نشانات معلوم ہوتے ہیں"۔

"ہوں۔ خیر یہ کہا ضرور جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ میرے پوائنٹ آؤٹ کے نشانات کو بھٹ کے اندر سے نکلنے کے گردانتے ہیں تو آپ سب تجربہ کار لوگ ہیں یہ اندازہ لگائیے کہ ان میں سے تازہ کون سے ہیں۔ یعنی شروع رات کے کون سے اور اخیر کے کون سے؟"

میں نے کہا کہ "اوس تو اب سب پر یکساں ہے اور چند گھنٹہ کے اس بل کے نشانات پر کوئی قطعی محاکمہ کرنا مشکل ہے"۔

"تو آپ یقین کیجئے کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ انہیں پنجوں اندر گیا ہے"۔

ہم تین میں بات ہو رہی تھی، صابر خاں قائل تھے اور مسلم اور انوار خاں متحیّر۔ مسلم نے ہماری گفتگو کے درمیان نہایت سنجیدگی کے ساتھ دخل دیا اور کہا "دیکھئے بات بزرگوں اور استادوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ لیکن آپ حضرات کی اس فنکارانہ بحث کی علتِ غائی میری

سمجھ میں نہیں آتی کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں یا آگے کو سیدھے ہیں۔ گستاخی معاف قبلہ! میں آپ حضرات سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ پنجے بھیڑیے کے ہیں؟

"نہیں" استاد رضا خاں اور میرے منہ سے یک دم نکلا۔

"پھر کسی اور ایسے جانور کے ہیں جس کا اس جنگل میں پایا جانا قرینِ قیاس ہو؟"

"نہیں ہمارے پندار میں یہ کھوج کسی جانور کی جانب منسوب ہی نہیں کئے جا سکتے۔ یہ تو عجیب ہی سے ہیں، اور سنگھ بابو کے قول کے مطابق بھوت کے ہی کہنا پڑیں گے۔"

"تو پھر قبلہ معاف کیجئے یہ بے کار بحث کیوں! اگر آپ بھوت کے وجود میں یقین نہیں رکھتے تو میرے اس سوال کا جواب دے دیجئے کہ ان کھوجوں پہ کیا چیز اندر گئی ہے اور کیا چیز نکلی تھی۔ اب بحث اس پر نہ کیجئے کہ یہ ہے کیا بلا، بلکہ آپ کو کرنا کیا ہے۔ اس پر سر جوڑ کر غور کیجئے یا پھر چپکے سے اپنے اپنے گھروں کو سرک جائیے اور پھر عمر بھر جنگل میں منہ نہ دکھائیے۔ ایک شکل تو یہ ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ کم از کم اس معمہ کو اس حد تک حل کیجئے کہ یہ کس مخلوق کے نشاناتِ قدم ہیں۔"

"غرض کسی نتیجہ پر پہنچنا تو ضروری ہے ہی، اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر؟ اب میدان چھوڑ کر بھاگیں گے تو نہیں، بھوت نہ سہی بھوت کے ابا سہی۔"

سنگھ بابو نے پھر تفصیل کے ساتھ بھوت کے آنے، اچھلنے، جست کرنے اور اندر گھسنے کی تمام روئداد جگہ اور موقع کا حوالہ دے دے کر بیان کرنی شروع کر دی اور مسلم نے آہستہ سے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا "میرے اللہ! ٹھاکر جی وہ تو سب سنی، مگر میری غرض یہ ہے کہ اب کرنا کیا چاہئے؟ اس کی بات کیجئے، وہ تو آپ کے قول کی تصدیق میں یہ نشان موجود ہیں۔"

اور یہ سوال بے جواب تھا، ہر شخص گومگو میں تھا، لیکن جائے استاد خالی است! بوڑھے استاد رضا خاں بول پڑے "اماں کرنا کیا، بھوت سالے کے بھی دو ہاتھ پاؤں ہیں۔" اور پھر تمام بھٹ کے منہ کا اوپر سے اندازہ لگایا، اور آہستہ سے شمار کر کے بولے "بہت بڑا لمبا چوڑا ہے بنا رینگے، دو تین گھنٹہ بیڑی چلنے تو دو، پانی ذرا نیچے ہے، چار پانچ مٹکے اور ٹھونکیاں لگیں گی۔" پھر نکلی ہوئی مٹی پر نظر کی اور بولے "بھٹ ذرا گہرا ہے اور جس پر ہم بیٹھے تھے اس سے ذرا لمبا چوڑا بھی۔ خیر بہر حال کچھ نہ کچھ تو ہمیں کرنا ہی ہے۔"

"کیا مطلب استاد؟ آپ اس بھٹ میں پانی بھر کر بھوت کو نکالیں گے؟ کیا بھوت کو پکڑنے کا ارادہ ہے؟" سنگھ بابو نے حیرت سے کہا "اب وہ جو کچھ بھی ہو۔ جب بھوت سالا مٹی پر نشاناتِ قدم چھوڑ سکتا ہے تو ہماری بندوق کی گولی بھی اس کے جسم میں گھس سکتی ہے اور اس کے جسم کو ہم پکڑ بھی سکتے ہیں۔"

"تو کیا یعنی۔ اوں۔ آں، گویا آپ بھوت کو بندوق سے ماریں گے؟"

"اجی ٹھاکر جی آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟" استاد رضا خاں نے کہا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ پچیس تیس آدمی ایسے فراہم کیجئے جو بیڑی سے نیچے گڈھے میں سے پانی اٹھا کر اس بھٹ میں بھر دیں۔"

یہ زیر زمیں رہنے والے جانوروں کے شکار کا بڑا موٹا اور پرانا طریقہ ہے، بھٹ میں پانی بھر دیا جاتا ہے، اور جب اندر سے پوری کھنڈل بھر جاتی ہے تو مجبور ہو کر جانور نکل بھاگتے ہیں۔ اور باہر بندوقوں، کتوں، برچھیوں اور کبھی کبھی جالوں سے شکار کرتے ہیں۔

گراتی بلندی تک پانی اٹھانا بڑا طول امل تھا حساب لگایا تو بیک وقت پچیس آدمی درکار تھے، مگر ابھی سویرا تھا اور تمام دن پڑا ہوا تھا۔ استاد رضا خاں کا خیال تھا کہ دوپہر تک بھٹ بہ آسانی لبریز ہو سکتا ہے۔ اور مزدوروں کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے اور سنگھ بابو کو جانا پڑا کیونکہ

اس جنگل کے کنارے ہماری زمینداری کے چند گاؤں لگے ہوئے تھے۔ ہم پہلے اس گوٹھ میں پہنچے جس میں ہم خیال نے موشے تھے۔ گذریوں اور مراثوں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ مگر ہماری کوشش کے باوجود خوف کے مارے ایک متنفس بھی ہمارے کام میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں سے اپنا بیل تانگا جتوا کر دوسرے گاؤں میں پہنچے مگر یہاں بھی ہر ایک نے بھوت کے خوف سے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے انکار کیا تو سنگھ بابو نے کہا چلو پس گنوے چلیں، یہ پاسیوں کا گاؤں تھا اور میری اور سنگھ بابو کی مشترکہ زمینداری تھی۔ راستہ میں سنگھ بابو بار بار اپنی نبض پر ہاتھ لے جاتے اور دو ایک مرتبہ دوران سر کی شکایت کی۔ پس گنوے پہنچتے پہنچتے انہیں خوب اچھی طرح بخار چڑھ آیا تھا۔ اور میں نے کہا۔ وقت کی بات ہے۔ کتنے کتنے جاڑے پالے میں ہم شکار کو گئے۔ ٹھنڈے پانی اور دلدل میں سارا سارا دن اور پوری پوری راتیں گزاریں مگر یہ رات کی سردی تمہیں نقصان کر گئی۔ اور کاتک کی سردی چپکے سے آدبوچتی ہے"

"ہاں، سر میں بڑا درد ہے"

اور جب میں نے غور کیا تو بری طرح جل رہے تھے۔ جتنی دیر میں پچیس تیس پاسیوں کے نوجوان پٹھے فراہم کئے اتنی دیر میں سنگھ بابو ڈیرہ میں پڑی ہوئی چارپائی پر بے ہوش ہو گئے۔ میں نے وہاں دو تین معتبر آدمی ان کی خدمت اور تیمارداری کے لئے مامور کئے، دو بیل تانگے میں جوڑ، چار بیڑیاں اور پیچھے پیچھے پچیس تیس آدمی ساتھ لے کر چل پڑا۔ تمام راستہ ان آدمیوں کے دل سے بھوت کا خوف اتارتا گیا اور جو انعام ہمیں گورنمنٹ سے بھیڑیا مارنے پر ملے گا اس کو جوں کا توں ان کے اندر تقسیم کر دینے کا لالچ دیتا گیا۔ اس کے علاوہ آج کے دن کی مزدوری کا بھی وعدہ کیا۔

پھر تیلے پاسیوں نے کام پر جت کر ذرا دیر میں نیچے سے اوپر تک نالیاں اور رندھے تیار کر لئے، پانی گڈھے سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی تک اٹھانا تھا۔ جتنی دیر میں میں نے مزدور فراہم کئے اتنی دیر میں استاد رضا خاں اور بقیہ تین ساتھیوں نے بھٹ کے تمام مواقع بغور دیکھ لئے تھے اور جب مجھ کو تنہا واپس آتے دیکھا تو سنگھ بابو کے متعلق سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ غریب رات سردی کھا گئے۔ پس گنوے کے ڈیرہ میں تیز بخار میں پھنسا بیہوش چھوڑ آیا ہوں۔ اس پر استاد رضا خاں نے افسوس سا کیا مگر صابر اور مسلم یک زبان ہو کر بولے" وہ ہم جانتے تھے اسی وقت جس وقت وہ گئے تھے کہ اب یہ گئے کام سے"

"نہیں جی کیا بکتے ہو، بڑا تیز بخار چڑھا ہے"

"اجی بخار نہیں ان پر بھوت چڑھا ہے" صابر نے کہا۔ مگر اس پر کوئی ہنسا نہیں، جیسے بھوت کے خوف سے ہر ایک متاثر تھا۔

اس بھٹ کے تین دروازے یا سوراخ یا مخل تھے۔ ایک ڈھال کے اوپری حصہ میں اور دوسرا نیچے پیچھے پورے ٹیلے کو اندر ہی اندر کاٹتا ٹیلے کی اس ڈھال پر نکلا تھا جو دوسری سائڈ پر تھا، اور ایک اس ڈھال پر۔ بیڑیوں سے پاسیوں نے پانی چڑھایا اور اوپر والے دروازے سے پانی بڑے زور سے سوراخ کے اندر کو پرنالے کی طرح چلنے لگا۔ سنگھ بابو تو بے چارے بیمار ہی ہو گئے تھے، اب ہم پانچ تھے۔ نیچے کے دونوں سوراخوں پر استاد رضا خاں اور مسلم، انوار اور صابر جوڑی جوڑی بنا کر اپنی اپنی سائڈ لئے تعینات تھے۔ اور میں سب سے اوپر ٹیلے کی نوک پر کھڑا تینوں سوراخوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایک جانب سے پانی داخل ہو رہا تھا اور دو سوراخوں پر چار بندوقیں پہرہ دے رہی تھیں۔ پانی بڑے تسلسل اور تیز رفتاری کے ساتھ اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو اوپر کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ پانی اندر گھستے ہی پہلے اندر سے ہلکی ہلکی گرد سوراخوں میں سے نکلی پھر کچھ کیڑے، مکوڑے بھدکے۔ ہم لوگ مطمئن اور جیسے اس معمہ کے حل ہو جانے کے شوق میں سرشار سے تھے۔ بھوت کا خوف تو دلوں سے بالکل ہی نکل گیا۔ شکار سے زیادہ اس تحقیق کا جذبہ کارفرما تھا کہ اس کے اندر کیا چیز ہے۔ ہم لوگ تھوڑی بہت بات چیت بھی کر لیتے، اور میں تینوں سوراخوں پر یکساں نظر ڈال لیتا، ورنہ جس سوراخ سے پانی داخل ہو رہا تھا اس سے ایک سوراخ تو نظر آسکتا تھا اور تیسرا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں ہونے کے سبب ان دونوں سوراخوں سے چھپا ہوا تھا۔

ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے، چار گھنٹے پانی بھٹ کے اندر جاتے ہو گئے۔ مجھے اشارہ کر کے صابر خاں نے بلایا اور سگریٹ دکھائی۔ سگریٹ دیکھ کر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ سوراخ جس میں سے پانی داخل ہو رہا تھا نظر آتا تھا۔ مگر ادھر والا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں تھا۔ میں نے اس سوراخ پر غور کیا تو تھوڑی دور اندر تک پانی اٹا اوپر کو بڑھ آیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کہا: بس اب بھر ہی چکا ہے بھٹ! اور اپنی بندوق کا سیفٹ چڑھایا۔ استاد رضا خاں نے جو دیکھا کہ میں ٹیلے کی چوٹی خالی چھوڑ کر چلا گیا ہوں تو اپنے والے بھٹ پر صرف مسلم کو چھوڑ کر وہاں آ بیٹھے۔ اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے وہیں رہنے کو کہا۔

پانی اور بھرا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اوپر بخوبی نظر آنے لگا۔ متحرک پانی کی سطح پر میں نے چند بلبلے دیکھے۔ اور پھر ایک بھیڑیے کی ناک پانی سے اوپر دو انچ کے قریب باہر سانس لیتی نظر آئی جو بظاہر ایسی معلوم ہوتی تھی کہ ٹکڑا پانی پر تیر رہا ہے۔ میں نے صابر کو اشارے سے دکھانا چاہا مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اول تو ساؤنڈ ہی خالی تھی، پھر میں بلندی پر تھا اور بہت ہی قریب۔ بڑے اطمینان کے ساتھ بھرپور شست لے کر گراپ کا فیر مارا۔ پانی اور کیچڑ اچھل کر باہر آیا، اور جب اک ذرا دھواں ہٹا تو پانی سرخ ہو رہا تھا۔ ایک آواز پانی کے بلبلوں کے ساتھ بھیڑیے کی جانکنی جیسی آئی۔ کھوپڑی پاش پاش ہو گئی، وہ اندر ہی اندر بھیڑیا ختم ہو گیا۔ اتنے میں اس سوراخ کی جانب سے جو ہم سے آڑ میں تھا یک دم دو دھماکے سنائی پڑے اور اوپر سے استاد رضا خاں للکارے "بہت اچھے، بہت اچھے، واہ!" دوسرا بھیڑیا ادھر والے سوراخ سے نکل کر بھاگا اور مسلم نے نکلتے ہی مار دیا۔ ابھی ہم اچھی طرح شکاری حادثہ کی رنگینی کا بھی اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ یک دم اوپر والے دروازے سے جس میں سے لگاتار چار گھنٹہ سے پانی داخل ہو رہا تھا ایک عجیب النوع مخلوق برآمد ہوئی جسے دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ سے نکلا "بھوت بھوت! بھوت!!" اور وہ بھی کلام موضوع کی آواز میں زبان سے نہیں بلکہ سچ مچ سینہ اور پیٹ کی گہرائیوں سے پھاڑتی چیرتی سی چیخ میں!——

——یک دم بھوت نیم ایستادہ ہو کر اپنے سامنے والے پاسی سے دست و گریباں نظر آیا، جو بھٹ کے سامنے پانی کا راستہ اپنے پاؤں سے درست کر رہا تھا۔ پاسی اور بھوت میں بمشکل دو چار ہاتھ کا تبادلہ سا ہوا ہو گا کہ وہ دونوں گتھ گئے اور کیچڑ میں لت پت بھوت نے پاسی کو اور پاسی نے بھوت کو دبوچ لیا۔ بھیڑیے سے ملتی جلتی دو چار غراہٹیں سنائی دیں۔ الوارہ دبک گیا، صابر بے ہوش سا ہو کر ایک نشیب میں ہو گیا۔ میں نے بھی جھاڑی کی آڑ پکڑی۔ بھوت اور پاسی میں ایک پکڑ بھی اچھی طرح نہ ہونے پائی تھی کہ کیچڑ میں چکنا بھوت گرفت سے پھسل کر بھاگا۔ سامنے دوسرا پاسی بیلچہ لئے کھڑا تھا۔ بھوت کو بڑھتے دیکھ کر اور کوئی راہ فرار نہ پا کر مرتا کیا نہ کرتا، بیلچہ لے کر جھپٹا۔ بھوت پلٹ پڑا۔ اتنی دیر میں بوڑھے استاد رضا خاں اوپر سے شیر کی سی دو تین جستیں لگا کر نیچے آ گرے تھے۔ میرے سامنے تھوڑا سا موقع تھا اور میں نے بھوت پر بندوق سیدھی کی مگر استاد نے بڑے ذہانت کر مجھ کو فیر کرنے سے روکا، ایک جست اور لگائی۔ ادھر بھوت جیسے کچھ راہِ فرار کا اندازہ کرنے کے لئے چند سیکنڈ ٹھٹکا سا۔ اتنے میں استاد نے اسے جا لیا۔ بڑی پھرتی سے بنوٹ باز استاد نے اس کے سامنے اپنی پگڑی سر سے اتار کر پھینکی۔ وہ کچھ پگڑی میں الجھا، کچھ لڑنے کا موڈ بنایا۔ اب کی جست میں استاد اس کے پیچھے جا پہنچے اور بڑی دلیری کے ساتھ بندوق پھینک کر اس کے سر پر ہاتھ ڈال دیا اور پیچھے سے بالوں کا گچھا پکڑ لیا۔ بھوت پھر دو پاؤں پر نیم ایستادہ ہو گیا۔ استاد نے اس کا سیدھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا، اور پھر دوسرا ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر گدی چڑھائی اور جکڑ لیا۔ اور بھوت کو بے بس کر کے قابو میں کر لیا ہمارے دل دہل اٹھے۔ بوڑھا پچاس سالہ تجربہ کار شکاری آج اپنے صید افگنی کے فن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ قادر انداز شکاری بندوق پھینک کر کلائیوں کے بل پر بھوت کو پکڑے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ بھوت بری طرح خرا رہا تھا۔

اس سنسنی خیز حادثہ میں بھٹ سے نکلنے سے استاد کے گدی چڑھانے تک بمشکل ڈیڑھ دو منٹ لگے ہوں گے، اور ابھی تک ہم حادثہ کی رنگینی اور حیرت آفرینی کا بھی بھرپور اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ استاد نے اپنی مضبوط کلائیوں سے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو پھیرتے ہوئے مسکرا کر

بھرائی آواز میں کہا "دیکھو تو یہ کیا ہے؟" اب حرکتوں کا کہربائی تسلسل جو انتہا شدید تھا کہ آنکھ کی شعاعیں بھی تعاقب سے عاجز سی تھیں۔ استاد رضا خاں کے مضبوط ہاتھوں میں بل سے کھا رہا تھا۔ اور یہ ہولناک مخلوق ان کے ہاتھوں میں اچھلنے کودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب پر ہیبت کم اور تحیر زیادہ طاری تھا۔ جس وقت گدّی چڑھائے ہی چڑھائے غرّاتے ہوئے کیچڑ میں لتھڑے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو ہوا تو اس بھیانک چہرہ اور اس پر بالوں کا گچھا دیکھ کر حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے ہمارے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ بھوت غصہ میں غرّا رہا تھا۔ بل کھا کھا کر ڈراؤنے دانت نکال رہا تھا۔ الامان و الحفیظ! کیسا سنسنی خیز منظر تھا۔ شدت خوف سے ہماری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ دونوں پاسی فرار ہو گئے تھے اور ہم سب جہاں کے تہاں مفلوج سے تھے۔ استاد رضا خاں بھوت کو شکنجے میں کسے مسکرا رہے تھے۔ اور بولے "ارے بزدلو! تم نے تو عورتوں کو مات کر دیا۔ دیکھو تو، ادھر چلو! یہ کیا بلا ہے؟" اور بھوت نے پھر بل کھا کر دانت چمکائے۔ بری طرح غرّایا اور نکلنے کی کوشش کی مگر استاد نے اس کو اس بری طرح جکڑا تھا کہ قسم کی طرح گاڑ سا دیا تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کر رہے تھے کہ جب وہ کمر جھکاتا تھا تو استاد گھٹنا مار کر کم بخت کو سیدھا کھڑا کر دیتے تھے۔ جب اس طرح بھوت کی نمائش کرتے ہوئے تقریباً دو تین منٹ ہو گئے اور ہماری رگ رگ پر حیرت نے قبضہ کر لیا تو ہم نے معاملہ پر غور کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ سمجھے۔ البتہ ان دو تین منٹ کے اندر ہم نے عقل کو حیرت و خوف کے جذبات سے چھڑایا اور میرا دماغ ادھر لگا کہ آخر بھوت پکڑنے کے بعد استاد رضا خاں اس قدر مطمئن کیسے ہیں۔ یا اللہ! یہ کیا طلسم ہے میں نے ایک قدم ادھر بڑھایا اور شاید بقیہ اور ساتھیوں کے شعور بھی حادثہ کے عجوبہ پن سے گلو خلاصی کر کے معاملہ کی اصلیت معلوم کرنے کی جانب رجوع ہوئے۔ انھوں نے بھی بندوقیں سیدھی کر کے ایک ایک قدم بڑھایا۔ اتنے میں استاد نے بھوت کو اور بھی زیادہ بے قابو کر کے اس کو اپنی گرفت میں کس لیا۔ میرا دو نگاڑہ ڈگمگا۔ اس ہیبت ناک شکل اور بھیانک سراپا دیکھ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میں ٹھٹک گیا اور استاد مسکرا کر بولے "ارے لڑکو! بھوت نہیں یہ آدمی کا بچہ ہے!" مگر اس پر آدمی کے بچہ ہونے کا کسی پہلو سے اطلاق نہ ہوتا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے سبب اس کی ہیئت بھوت کے اس حلیہ سے بھی زیادہ بھیانک تھی جو ہر ایک کے دماغ میں خیالی قسم کی شکل کھبوت کی ہوا کرتی ہے۔ یا جو مخصوص صورت بھوت کی بیان کی جایا کرتی ہے۔

ہم تینوں استاد کے پاس دوڑ کر پہنچے، ادھر سے شور سن کر مسلم بھی بھاگتا ہوا آیا۔ بھوت کھڑا غرّا رہا تھا۔ بل کھا رہا تھا۔ استاد اپنی قوی کلائیوں میں اسے سختی کے ساتھ جکڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بولے "آپ دیکھتے کیا ہو، کم بخت نے میرے کس بل توڑ لئے، زور کراتے کرا۔ پگڑی اٹھا کر کس لو۔ سالے کے پنجے بڑے تیز ہیں، اس پاسی کو تو لہولہان کر دیا۔"

صابر خاں نے پگڑی اٹھا کر بڑھائی۔ استاد نے کہا پہلے اس میں سے ایک پٹی پھاڑ کر ذرا اس کے منہ پر کس پیچھے کو گرہ تو لگا دو۔ اس کے دانت اور کچلیاں بڑی غضب کی ہیں، اگر کوئی پڑ گیا تو پارچے اڑا دے گا۔ پٹی پھاڑ کر اس کے ہونٹوں پر باندھی اور پیچھے لا کر گرہ لگا دی۔ بقیہ پگڑی سے پہلے گدّی چڑھے ہاتھ جوں کے توں گدّی چڑھے چڑھائے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیئے، اور احتیاطاً دونوں پنڈلیاں بھی کس لیں اور گٹھڑی سی بنا کر پا بدست دگرے دست بدست دگرے لٹکا کر وہاں تک لائے جہاں ہمارا بیل تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ پاسی کے بھاگتے ہی مزدور دن میں بھاگڑ پڑ گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا گاڑیبان بھی تانگہ اور بیل چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ استاد نے بیل جوڑے اور بھوت کی گٹھڑی بنا کر تانگے میں ڈال لی۔ ہم چاروں پیدل ساتھ ہو گئے۔ استاد نے گاڑی بانی کے فرائض انجام دئے اور ہم اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے۔

جیوں ہی ہم بھیڑیا انسان لے کر گاؤں میں پہنچے بھاگڑ سی پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے گاؤں کے سمجھدار آدمیوں کو اس بھوت کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ پھر بھی افواہیں بہت رائج ہو چکی تھیں۔ استاد نے بہشتی کو بلوایا اور دو تین مشک پانی کی دھار سے اس کا غسل کرایا۔ غصہ بھی ٹھنڈا ہوا، اور بھیڑیے انسان کی اصلی شکل بھی مٹی دُھل کر نمودار ہوئی۔ حجام بلوا کر اور دو تین آدمی اس کے ساتھ لگا کر اس کے بال کٹوائے۔ سبزہ آغاز سولہ سترہ سال کی عمر کا نوجوان برآمد ہوا جس کے جسم کی تمام کھال گوہ کے چمڑے کی طرح کھردری اور سیاہی مائل مٹیالی تھی۔ ہاتھ، پاؤں، پیٹ آدمی کے بجائے ریچھ یا بندر سے مشابہ تھے۔ کچلیاں معمولی آدمی کی کچلیوں سے زیادہ بڑھی ہوئی، رنگ دار منہ سے کف جاری اور آنکھوں میں بلا کی وحشت۔ ناخن آگے کو بڑھ کر

اور نوک دار ہو کر مڑ گئے تھے۔ وہ اچھے خاصے درندے کے پنجوں کی شکل بن گئے تھے جنہیں حجام بڑی مشکل سے تراش پایا۔ استاد نے عقیقہ کرا کر اللہ دیا نام رکھا۔ بھیڑیے سے ملتی جلتی غول نکالتا تھا۔ جس پر کسی کسی وقت مہیم آواز نکالنے پر کلام کا دھوکا ہو جاتا تھا۔ اور گاؤں والے سمجھتے تھے آدمی کی بولی بول رہا ہے۔ شروع میں دو تین روز تو بڑے ہی غیظ میں رہا اور اگر اچھی طرح کس کر نہ بندھا ہوتا تو کود پھاند کر ہاتھ پاؤں توڑ لیتا یا پنج پنج کر سر پھوڑ لیتا۔ تیسرے روز جب چوپال کے نیچے سے بکریوں کا ریوڑ گزرا تو چھپک سا گیا، وہ اچھل کر حملہ کرنا چاہا۔

اب ہم کو بھیڑیوں کے شکار میں مزہ آنے لگا تھا۔ ایک ایک آدمی رات کو ایک ایک گاؤں والے نوجوان کو ساتھ لے کر بھٹ پر جا بیٹھتا اور بالعموم شروع شب میں ہی ایک ایک دو دو بھیڑیے مار کر آدھی رات تک پلٹ آتا، اور ہم چھ آدمیوں کی پارٹی آٹھ دس بھیڑیے مار کر ہر شب پلٹتی۔ تمام دن اللہ دیا سے کھیل کرتے۔ ہفتہ بھر کے اندر اللہ دیا اس حد تک مانوس ہو پایا کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں میں زنجیر ڈال دی گئی اور زنجیر کے اس گول کڑے پر کپڑا لپیٹ دیا گیا جو ہاتھوں اور پاؤں میں رہتا ہے۔ کودنا، اچھلنا، سر پٹخنا بالکل چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ہر وقت نگرانی کرنی پڑتی تھی اور تمام جسم جکڑ کر رکھنا پڑتا تھا۔ پہلے روز کچھ پوریاں اور ترکاری سامنے رکھی گر اس سے مکدر ہو کر منہ پھیر لیا اور تین چار دن تک کوئی چیز حتیٰ کہ گوشت بھی نہ کھایا۔ پھر ہم نے ہرن اور خرگوش کا گوشت دیا تو تھوڑا سا کھانا شروع کیا۔

دیہات سے دور دراز کے لوگ تماشہ دیکھنے آتے رہے۔ تین روز گزر گئے مگر ابھی عورتوں کی آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی حتیٰ کہ اس گاؤں کی بھی عورتیں نہ آتی تھیں۔ ہم نے دو روز آرام کیا۔ اس دوران میں بھیڑیوں کے شکار کی نئی مہم کی اسکیم بنائی۔ کچھ پیشہ ور شکاری بھی دیکھنے آئے، اور ہماری سکیم میں شریک ہو گئے۔

تیسرے روز گاؤں کی لڑکیاں جمع ہو گئیں اور چند قدم کے فاصلہ پر کھڑی ہو گئیں۔ چند منٹ کے بعد حسین چنچل، شوخ و شنگ چمپا جو گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی سمجھی جاتی تھی غول سے نکل کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اللہ دیا نے اوپر نگاہ اٹھائی اور ذرا سمٹ کر پاؤں پر پاؤں رکھا اور ستر پوشی کی، اور منہ پر بار بار ہاتھ پھیرا جیسے اپنا آپا سنبھالا۔ پھر چمپا کی جانب سلونے سلونے تیوروں سے دیکھا۔ بھیڑیے انسان کی وحشی آنکھوں میں رس آگیا اور محبت کے مرغولے ناچنے لگے۔ بڑی میٹھی نظروں سے چمپا کو بار بار سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ چمپا کھلکھلا کر ہنستی رہی اور لڑکیاں پیچھے سے مذاق کرتی رہیں۔ جب لڑکیاں چلنے لگیں تو جاتے وقت دور تک پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

دوسرے روز پھر لڑکیاں جمع ہو گئیں، اور پھر بھیڑیے انسان پر رومانی کیفیات طاری ہو گئیں۔ چمپا پھر آگے بڑھی اور دوپٹہ کی آڑ سے دودھ کی بالٹی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ بالٹی کی جانب اللہ دیا کھسکا۔ چمپا نے جھک کر بالٹی اور بڑھائی۔ ادھر سے اللہ دیا نے بالٹی کا کنڈا پکڑا اور چمپا کے نرم و نازک گداز ہاتھ سے اس کی کھردری موٹی انگلیاں چھو گئیں، اور جیسے اس کے تمام جسم میں بجلی کی رو دوڑ گئی۔ آنکھوں میں نشہ سا آگیا۔ اور چمپا پھر کھلکھلا کر ہنسی تو مریخی اللہ دیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، اور دودھ کی بالٹی اپنے ہاتھ سے سرکا کر غٹا غٹ پی گیا، اور پی کر بڑے محبت بھرے تیوروں سے چمپا کی جانب دیکھا۔

اس کی داخلی کیفیات کا اندازہ کر کے چمپا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اللہ دیا کے تمام وجود کی درشتی اور وحشت ایک عجیب نرمی اور رومانٹک انداز میں بدل گئی۔ پھر بڑے اہتمام کے ساتھ ستر پوشی کے لئے پاؤں پر پاؤں رکھا اور جیسے اپنے ارد گرد دیکھا گویا ستر پوشی کے لئے کپڑا تلاش کر رہا ہے۔

ہم کو بھیڑیوں کے استیصال کی مہم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تقریباً چھ ہفتے ہو چکے تھے۔ پیشہ ور شکاری بھی ہمارے ساتھ پوری طرح اشتراکِ عمل کر رہے تھے، اور مہم پوری تیزی سے جاری تھی۔ قریب دس بارہ بھیڑیے روزانہ شکار کی اوسط تھی، اور اب تو ہمارا بھی جی لگ گیا تھا۔ تمام دن عورتیں، مرد بچے اللہ دیا سے کھیلتے۔ اور چمپا سے تو اللہ دیا اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اس کی موجودگی میں زنجیریں کھول دی جاتیں مگر ہم کو قاعدہ کے مطابق بھیڑیا انسان کو گورنمنٹ کے حوالے کرنا تھا، چنانچہ ایک روز یہی کرنا پڑا۔

جسم پر اچھی طرح کڑوا تیل مل کر اور اپنے ہاتھوں سے چمپا نے بالوں میں کنگھی کر کے بیل تانگے پر سوار کر کے مجسٹریٹ ضلع کے پاس

بھیج دیا۔ اور مجسٹریٹ ضلع نے اس کو پاگل خانے بھیج دیا۔ اللہ دیا ہفتہ بھر پاگل خانے رہا، اور وہاں ماہرین نے اس کی جبلّت پر غور کرنے کے بعد یہ تجویز کیا کہ اس کی بہترین تربیت چمپا جیسی نشبان زادی ہی کر سکتی ہے۔ اور پھر گاؤں واپس بھیج دیا۔

کچھ مہینے بعد جب ہمارا گزر پیش گوٹے میں ہوا تو اللہ دیا کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ اللہ دیا اس قدر شائستہ ہو گئے تھے کہ بکریوں کے ریوڑ کو دیکھ کر زقندیں نہ لگاتے تھے۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے زنجیر سے آزاد کر دئے جاتے تھے۔ چمپا کا حکم تو اس شان سے مانتے تھے کہ کوئی سرکس کا گھوڑا اپنے رنگ ماسٹر کا حکم بھی اس سے زیادہ قاعدہ کے ساتھ نہ مانتا ہوگا۔ اور اب چمپا نے اللہ دیا کو تھوڑے بہت گھر کے اندر کے کام پر لگا دیا تھا۔ بھینسوں کا تھان صاف کرتے، گوبر تھاپتے، کبھی کبھی چکی پیستے اور جب چمپا قہقہہ لگاتی تو ہنسنے کی کوشش کرتے، وہ چمپا کی جانب دیکھ کر نشہ میں سرشار ہو جاتے، اور کچھ مبہم سے الفاظ بھی نکالنے کی کوشش کرتے۔ ایک روز جب چمپا نے ایک لنگوٹی لگائی تو چند منٹ تڑپتے رہے، مگر جب چمپا سامنے سے ہٹ گئی تو پھاڑ کر پھینک دی، اور جب وہ پھر آگئی تو چیتھڑے پیٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

سال ختم ہوتے ہوتے چمپا نے اسے خوب اچھی طرح سدھا لیا، اور اپنے رومانٹک احساس سے زیادہ کام پر لگا لیا۔ اس طرح چمپا کے گھر والوں کو ایک بے تنخواہ کا ملازم یا بن داموں کا غلام مل گیا جو اپنی اجرت اس کی صورت دیکھ کر پوری کر لیا کرتا۔ چمپا اسے ایک فرمانبردار ٹٹو ایک وفادار کتے کی طرح چاہتی تھی۔ اس کے جذبات سے بھرپور فائدہ حاصل کرتی۔ اور اس کو زیادہ سے زیادہ کام پر لگاتی چلی جاتی۔

دیکھتے دیکھتے چمپا نے اللہ دیا کو بولی دی۔ اور پھر وہ زبان کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ایک سیدھے سادے انسان کی طرح کام پر لگایا، لباس کا شعور دیا۔ دو ٹانگوں پر چلنا سکھایا، یہاں تک کہ گنڈاسا لے کر چارہ کاٹنا۔ بیلوں، بھینسوں، گایوں کی خدمت کرنا سکھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ بھیڑیا انسان بڑی تیزی سے ارتقا کے منازل طے کر کے چمپا کے دوش بدوش پہنچ جائے گا۔ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک وقت آئے گا جب چمپا اس کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہو گی اور شاید اس وحشی انسان کے رومان کا جواب دینے پر بھی!

مہندر ناتھ

جہاں میں رہتا ہوں

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں؟ وہ کون سا مضمون ہے جس پر مصنّفوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ میں عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتا؟ یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا ہے اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی خود ان باتوں سے اُکتا گیا ہے لیکن خدا کے لئے مجھے اس طرف نہ دھکیلو۔ مجھے اپنے متعلق لکھنے دو ——— مجھے اپنی اُداسی، اپنے غم، اپنے دُکھ کے متعلق لکھنے دو۔ شاید تم اس اُداسی، اس غم، اس یاسیت میں ہندوستان کی اُداس روح کی جھلک دیکھ سکو۔

تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میں کتنی دُور سے چل کر آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکّر کاٹ کر، پنجاب کے حُسن سے مرعوب ہو کر، دہلی اور لکھنؤ کا چکّر لگا کر اور پونا کے ملیریے سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں، آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں، لیکن پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا! راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی ———!

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ لوگوں نے سڑکوں، بسوں اور ریلوں کی تعریف کی ہے، مگر میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ ہاں! جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر اور دور ——— بہت دور ——— ایک کشتی لہروں پہ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رُخ کئے ہوئے چلی جاتی ہے اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈ کے جھنڈ ——— ناریل کے درخت کافی لمبے ہوتے ہیں شاید سرو اور یوکلپٹس کے بھی درختوں سے لمبے اور اونچے ——— یہ درخت ہر وقت ہوا میں جھومتے ہیں۔ آپس میں ایک عجیب انداز سے گویا کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے ہو کر گزرتی ہے تو ایک عجیب سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتے جھومتے ہیں کسی جوان لڑکی کے پریشان بالوں کی طرح ——— چاند شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان درختوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ لیکن چاند کی سیمیں کرنیں سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں، لہروں کو چومتی ہیں، کھیلتی ہیں، لہریں بڑھتی ہیں، کھیلتی ہیں، ریت کے ذرے بکھرتے ہیں، چمکتے ہیں اور سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا

ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اُداس نغمہ پیا کرتی ہے ......

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں۔ سمندر، ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرس ——— اصل میں ان تین چیزوں سے بمبئی زندہ ہے۔ اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی ——— بمبئی نہ رہے۔ شاید دہلی بن جائے یا لاہور یا ایک ایسا ہی معمولی سا شہر۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کی وجہ تم جانتے ہو، وہی روزگار کی تلاش، پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا مسئلہ ہے مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا اور جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے گا، یہ جنگ رہے گی، یہ کشمکش رہے گی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں لیکن مجھے روٹی کی اتنی فکر نہیں۔ آخر کھانے کو تو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے، کہیں نہ کہیں تمہارے جیسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے اُدھار لیتا ہوں۔ لیکن یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہو وہ یہ کمینگی ہے، ہوگی۔ بھوک ہی کمینگی سکھاتی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالیشان محل تیار کرتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ جابر کمزور کو مار کر سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، کیا یہ کمینگی نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر حکومت کرتا ہے کیا یہ کمینگی نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لیتا ہوں اور پھر واپس نہیں کرتا تو میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں اور میں ہر گام، ہر قدم، ہر منٹ، ہر سیکنڈ ان قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں اور ان قدروں کا مضحکہ اُڑانا چاہتا ہوں، چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار۔

پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی محبوب ترین جگہ ہے۔ شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کے ہر نکڑ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دکان پر یا ایرانی کی دکان پر تم ایکٹروں کو دیکھو گے۔ یہ لوگ اتنے عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جتنا تم یا میں۔ یہاں آ کر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہر روز تم انہیں دیکھ سکتے ہو اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یوں پرونما گیتا کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی چھوڑو ان ایکٹرسوں کو۔ کیوں دردِ سر مول لیتے ہو، بچاری اب بہت موٹی ہو گئی ہے، کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو ——— شاید مہتاب تمہیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں وہی عورت ہے جسے ہیروئن کہا جا سکتا ہے باقی تو پھول کر کُپا ہو گئی ہیں۔ دراصل ہندوستان میں ایکٹرسیں اپنے جسموں کا خیال نہیں رکھتیں۔ ایک بار ایکٹرس بن گئیں اور ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں موٹا ہونے۔ نہ کمر میں لچک، نہ آنکھوں میں شوخی، چہرے پر گوشت چڑھنے لگا، کولھے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں غائب، اور آخر پھیلتے پھیلتے مجسم کُپا بن گئیں۔ اور اب بتاؤ۔ کیا کرو گے تم ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے 'METRO' کے سامنے ایک اشتہار دیکھا جس میں مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ اُف! کیا ٹانگیں تھیں۔ کتنی سڈول، جیسے سانچے میں ڈھلی ہوئی ——— کتنی خوبصورت ——— کتنی پُر فریب جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ سارا ہندوستان چھان ڈالو، ایسی خوبصورت ٹانگیں نہ ملیں گی۔ یہاں ان لوگوں سے رہنا سہنا سیکھو۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورتی کس چیز کا نام ہے؟ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورت ٹانگیں کیسے بنا کرتی ہیں؟ سڈول بازو کہاں سے ملتے ہیں؟ یہ کروڑوں CUTE، یہ حسین، جوان، خوبصورت WARM جو عورت کی خوبصورتی کی روح ہوتی ہے، کہاں سے آتی ہے؟ کس طرح بنتی ہے؟ ان میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کہو گے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے، ان لوگوں میں اتنی توفیق کہاں جو وہ اپنے جسموں کا خیال رکھیں؟ لیکن ان ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ تو غریب نہیں یہ تو ہزاروں روپے کماتی ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ انہیں بھی خوبصورتی کا احساس نہیں، ہماری عورتیں تو پھول کر کُپا ہونا جانتی ہیں اور جب پھول کر کُپا ہو گئیں تو سمجھو "نروان" حاصل کر لیا۔

اور جہاں کہیں خوبصورت عورت نظر آتی ہے، وہ اپنے آپ کو، اپنی ٹانگوں کو اتنا چھپا کر رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی نظریں اُدھر نہ جا سکیں۔ ہمیں تو زندہ رہنے کی بھی تمیز نہیں۔ جمالیات کا پاس نہیں۔ ہمیں ان لوگوں سے کچھ سیکھنا چاہئے۔

ارے بھائی! پروتیا کا ذکر کرنے میں ادھر اُدھر بھٹک گیا اور ہالی وڈ کی خوبصورت ٹانگوں کا ذکر کرنے لگا۔ اگر تم واقعی ان خوبصورت ایکٹرسوں سے ملنے کے لئے اتنے بیتاب ہو رہے ہو تو سیدھے بمبئی چلے آؤ۔ میں بمبئی کی مشہور ایکٹرسوں سے تمہارا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ بھی شہرت کے اتنے بھوکے ہیں جتنے ہم یا تم۔ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ میں یوں ہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پھنس گیا۔ کہہ رہا تھا کہ اپنا پتہ۔ بیچ میں بیچاری ایکٹرس آ گئی۔ تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں رہتا ہوں؟ میں پہلے شیواجی پارک میں رہتا تھا، وہاں سے کیوں چلا آیا؟ اس کی وجہ تمہیں بتاتا ہوں۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ دشمن —— میرا دوست جس کا نام تم "R" رکھ لو، ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے۔ جسم دیکھو تو جی پھڑک اٹھے۔ ورزش کا بہت شوقین —— اکثر وہ دن رات ورزش کرتا ہے۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ دراصل اس کا خواب حقیقت بن چکا ہے۔ بیچارے میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ عورت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف دیکھتا ہوں تو اکثر وہ اس فعل کو بُرا بتاتا ہے کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نظریہ درست ہے۔ آخر یوں ہی اپنے دل و دماغ کو خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنڑ پیلے جائیں۔ من یا وزنی پتھر ہر روز اٹھایا جائے اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی لہروں کو تکتا رہے، جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی! یا لہریں ہی لہریں — دور —— نظروں سے دور —— سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور آخر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی، آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل، اور ٹھنڈی، تازہ، زندہ ہوا اٹھلاتی بھرتی ہوئی، اور ناریل کے درخت اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو —— ان کو چھوڑ کر عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے، سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھو تو یہی کہو گے کہ کتنا اچھا حسین تراشا ہوا بُت ہے۔ بالکل یونانی مجسمے کی طرح حسین اور خوبصورت۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ ہے اور اس کے رخساروں کی رنگت سیبوں کی طرح سُرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو تو اس کے جسم سے ایک ہلکی ہلکی صحت مندانہ خوشبو نکلتی ہے جو مکھن، ٹماٹر، دودھ دہی کھانے سے پیدا ہوتی ہے —— عورتیں میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں، ان کی نگاہوں میں تعریف ہوتی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ یہ بازو اتنے سڈول کیوں ہیں؟ اس کی آنکھوں میں اتنی چمک کیوں ہے؟ اس کا جسم اتنا متناسب کیوں ہے؟ لیکن میرا دوست عورت کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ نہ جانے اسے عورت سے کیوں چڑ ہے؟ اور جب عورت ایک حقیقت ہے تو حقیقت سے منہ موڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ صرف ورزش کرنا اور گھی کھانا اور ایک خوبصورت جسم بنانا ہی زندگی نہیں ہو سکتا۔

میری طرف دیکھو، میں ورزش بھی کرتا ہوں اور صحت مند بھی رہنا چاہتا ہوں، لیکن میں صرف BOXER بننا نہیں چاہتا۔ زندگی میں کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس بالکونی میں کھڑی رہتی ہے، کیا تم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا؟ دیکھا ہوگا ضرور دیکھا ہوگا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم اپنے باغ میں چلے جاتے ہو اور ریشمی شبنمی گھاس پر، ایک سفید چادر بچھا دیتے ہو اور اس چادر پر لیٹ جاتے ہو۔ چاند آکاش پر مسکراتا ہے اور اس کی روپہلی کرنوں میں تم نہاتے ہو، ٹھنڈی اور براق کرنیں۔ گھنٹوں تک تم ان کرنوں میں نہلاتے رہتے ہو۔ پھولوں کی خوشبو سے اپنے جسم کو گدگداتے ہو اور بڑی بڑی گھاس کو چُنتے رہتے ہو۔ یہ تم کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا؟ وہ بھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی خوشبو نکلتی ہے۔ بہت ہی پیاری اور بھینی بھینی۔ بالکل اس چاند کی طرح خوبصورت اور حسین —— کیا تمہارے دل میں چاند کو چھونے کی خواہش پیدا ہوئی ہوگی۔ چاند تو خوشی اور مسرت کا منبع اعظم ہے۔ میں بھی اپنے چاند کو چھونا چاہتا ہوں۔ اسی خوشی میں نہانا چاہتا ہوں۔ اس مسرت کو اپنانا چاہتا ہوں، اسی لڑکی کے قریب سے گزرنا چاہتا ہوں تاکہ اسے میرے وجود کا علم

ہو جائے، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ جو شخص ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گذرتا ہے اسے پسند کرتا ہے۔ اس عمل میں بُرائی کی بات کون سی ہے
یہ تو بالکل ایک فطری خواہش ہے۔

اور پھر میرے دوست کو ایک لمبے بالوں والی لڑکی سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اور اگر وہ ایک دن تمہیں دیکھنے کے لئے تمہارے کمرے میں چلی آئی تو اس میں خفا ہونے کی کونسی بات تھی؟ اسے گھر سے نکالنے میں کون سی دانشمندی تھی؟ کیا اس حرکت کی لوگ تعریف کریں گے؟ کیا یہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہے؟ تم نے اس قسم کی حرکتیں کر کے اس کی خواہشوں کو کچل ڈالا، خوشی کے سرچشمے کو خشک کر دیا۔ وہ آج کل اداس اور غمگین کیوں نظر آتی ہے؟ اس کے رخسار آج کل کیوں زرد ہیں؟ وہ کیوں کھوئی کھوئی اور مغموم سی رہتی ہے؟ تم نے ورزش کی اور تھکن کم کی تاکہ آرام کی نیند سو سکو لیکن اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور بیچاری سوکھ سوکھ کر کانٹا ہوتی گئی۔ میں اس قسم کی اخلاقی قدروں کو پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں جب تمہیں عورت کی ضرورت پڑتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟ تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو اور ٹھنڈے پانی کے ٹب میں نہاتے ہو۔ یہ کب تک کرتے رہو گے؟ اور اگر دنیا کے سب لوگ اسی فارمولے پر عمل کرنے لگیں تو زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو کر رہ جائے۔

تو ہاں! میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ ایک دن ایک لڑکی میرے دوست کے کمرے میں آئی۔ میں بھی وہیں موجود تھا، لڑکی کو دیکھ کر میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ اس نے لڑکی کو گالی دی، بُرا بھلا کہا ——— کہ وہ طوائف ہے، وہ ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بیچاری ہکی بکی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور وہ ہم لوگوں سے دوستی کرنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم لوگوں کو وہ جچنے لگے اور پسند آ جائے۔ اس سے پہلے وہ ایک لونڈے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف جھک گئی تھی مگر میرے دوست نے لڑکی کی بے عزتی کی اور گھر سے نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں پیشہ کراتی ہے، وہ کیوں اپنے جسم کو بیچتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص زندگی کے بنیادی مسائل کو نہیں سمجھتا، اور اگر سمجھتا ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر، ایک ایسی عورت پر وار کرتا ہے جو نہتی ہے، جو اکیلی ہے، جس کا وارث کوئی نہیں، جس کی بے عزتی کی ذمہ دار سماج ہے، گورنمنٹ ہے، موجودہ سامراج ہے۔

طوائف کا مسئلہ ——— طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہوگا، بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں کو نوکری دینے سے، عورتوں کے لئے کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے اور عورت کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے ہوگا۔ جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں رہیں گی۔ اور آج بھی وہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی بلکہ میری بھی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی ایک دن اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا، اس سے صاف عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ لگا کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہے جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہگیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے۔ کیا اس کے سینے کے ایک گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا خاوند ملے جو خوبصورت ہو، جو نیک ہو، جو کماتا ہو اور جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اور اگر زندگی میں یہ چیزیں میسر نہ ہو سکیں اور بھوک اور فاقوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو بیچنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور! وہ اداس شام مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آجکل ماہم میں رہتا ہوں، سمرسٹ کا ماہیم نہیں، منٹو کا ماہیم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں۔ یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں، ہوا ناریل کے

بیزں سے کھیلتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ادھر اُدھر دیکھتا رہتا ہوں۔ اکثر لوگ میری طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ لڑکا یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے؟ کیا اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟ اور میں ان کی طرف اس طرح دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان کے دل کی ویرانی، ان کی بے بسی، ان کی لاچاری کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن میں نے انہیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے۔ میں اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو کمرے میں ادھر اُدھر پھرتے دیکھتا ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ پہلے یہ لڑکی ایکسٹرا EXTRA وغیرہ کا کام کرتی تھی پھر اس ایکٹر کو پسند آ گئی اور اب اس نے اسے گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کرتے ہیں اور پھر اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ اکثر ان لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہے۔ ایک انتہا سے گذر کر دوسری انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہاں وہ بے پردہ کھلم کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتیں۔ نتیجہ بے بسی، ایک یاسیت، ایک ڈر جو ہمیشہ ان کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مبادا ان کا مرد انہیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے نہ دیکھ لے، اور ان کا پھر وہی حشر نہ ہو جائے جس سے اکتا کر انہوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کے چند سال بعد انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی اداسی ہے جتنی کہ ان کی زندگی میں پہلے تھی۔ کبھی کبھی سامنے والے ایکٹر کی بیوی میری طرف جھانک کر دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی ہے، چہرے پر موت کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا زور زور سے چلتی ہے، کھڑکی کے پردے ہلتے ہیں، آنکھیں جھکتی ہیں لمحہ بھر کے لئے، اور پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہنے کو بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ماہم لاہور کی طرح گندا سڑا علاقہ ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ننھا فراک دیکھو کسی جوان لڑکی کا ہو گا۔ وہ سفید فراک دیکھو، یہ کتنا لمبا فراک ہے کسی بڑھیا کا ہو گا۔ رنگ برنگ کی ساڑھیاں، پاجامے، قمیصیں، دھوتیاں، ٹائیاں، انڈرویئر، چادریں جابجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ناریل کا درخت گرا ہوا ہے۔ چند دن ہوئے ہوا بہت زور سے چلی تھی جس کی وجہ سے ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی کے سامنے ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دیتا ہے، درحاصل یہ مندر نہیں ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں۔ یہاں گوردوارے اور مسجدیں کم دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں! شاید یہاں کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی تو انہوں نے ایک گڑھا کھود کر اس میں ایک پتھر رکھ دیا ہے اور ارد گرد ٹین کی چادریں لگا دی ہیں۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گر پڑا تھا میرا مطلب ہے اس خدا پر۔ لیکن درخت بھاری تھا، خدا کچھ نہ کر سکا، بیچارا درخت کے بوجھ تلے دب گیا۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کافی مل جاتا ہے۔ نہیں تو اس بات پر ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت کو گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی ہو۔ لیکن آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے —— جب پیٹ بھرا ہو تو خدا بھی یاد نہیں آتا۔ مذہب بیچارا ——!

فلیٹ سیکنڈ فلور پر ہے اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارد گرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ مکان کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بیچارا بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے، اگر خوبصورت ہوتی تو میں ضرور اس سے عشق کرتا۔ بیچاری نہایت ہی بدصورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آ جاتی، اکثر وہ پھولوں کا گچھا اپنے جوڑے کے ارد گرد باندھتی ہے۔ یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے بہت رغبت ہے۔ معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے اتنی ہی اسے پھولوں سے محبت ہوتی ہے۔ یہاں تم ہر لڑکی کو، ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے۔ عورت بیاہی ہوئی ہو یا کنواری لیکن پھول ان کی جان ہے۔ بغیر پھولوں کے

تمہیں یہاں کوئی عورت دکھائی نہ دے گی لیکن یہاں کے لوگ بدصورت ہیں' عورتیں اس سے بھی زیادہ بدصورت ہیں۔ صحت اچھی ہے لیکن چہرے کے خطوط، ان کی چال ڈھال' ان کا رہنا سہنا بالکل عجیب ہے۔ کم از کم مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ کاش بمبئی کی عورتیں پھولوں سے محبت کرتیں تو شاید ان کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ جب ایک خوبصورت پھول کو دیکھنے کے بعد ایک بدنما چہرے پر نظر پڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ دونوں کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ بہر حال اس گجراتی عورت کو پھولوں سے محبت ہے۔ بڈھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے اور شام ہونے کے بعد گھر آتا ہے۔ عورت دن بھر چارپائی پر پڑی رہتی ہے' بالکل اوندھی' اور سرہانے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے اور آجکل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ گجراتی خود تو باہر رہتا ہے اور نوکر دن بھر گھر میں رہتا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتن کو چومتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گجراتن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر پر لٹا لیا اور پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ شام کے وقت گجراتن بہت خوش تھی۔ آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' اس کے صحن میں ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن یہ خوشی جلد ہی ختم ہو گئی۔ بڈھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہو گیا اور اس نے نوکر کو گھر سے نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی یاسیت ابھر آئی ہے' اس کی ہنسی میں اداسی ہے' اس کی باتوں میں غم کی جھلک ہے۔ وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اس کی ٹانگیں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہتے ہوگے کہ میں پھر محبت کا قصہ لے بیٹھا۔ سچ کہوں تو برا تو نہ مناؤ گے ——— میں ہر طریقے سے یہ کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں' عورت کے متعلق کچھ نہ لکھوں لیکن ہر بار جب لکھنے بیٹھتا ہوں عورت سامنے آجاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بغیر افسانہ پھیکا رہے گا۔

لیکن آؤ۔ عورت کی دنیا سے تمہیں دور لے چلتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں' یعنی جس فلیٹ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک انسان کے رہنے کے لئے ہے لیکن آج کل اس فلیٹ میں پانچ انسان رہتے ہیں۔

میرے ساتھ ایک بنگالی نوجوان رہتا ہے۔ اس کا نام چٹرجی ہے' یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آیا ہے تاکہ روزگار مل سکے اور وہ اپنی اور بہن کی زندگی بسر کر سکے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے۔ وہ نہایت ہی دبلا اور پتلا ہے۔ اس کی ماں تپ دق سے مر گئی تھی۔ شاید اس کے بھی پورے جسم میں تپ دق کے جراثیم موجود ہیں۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں' اس کی آنکھوں میں پریشانی کی جھلک رہتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ لیکن چٹرجی نہایت چالاک آدمی ہے' ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی کام نہیں ملا۔ وہ بمبئی میں اس لئے آیا تھا کہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے۔ اس کا بھائی فوٹوگرافر ہے اور اس نے فوٹو کھینچنے کا کام بھائی کی دکان پر سیکھا تھا۔ اس کے بعد بمبئی کی طرف رخ کیا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی ہو کر اردو بول لیتا ہے لیکن وہ ہندی بھی جانتا ہے' ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول سکتا ہے۔ ایک بار اسے فلم میں جگہ ملی' لیکن کام اچھا نہ کرنے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ اب وہ ڈائرکٹر بننا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھلائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اکثر وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بار اسے زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار بھی۔ آگے ہی کیا توانا تھا کہ زکام اور بخار نے اسے اور لاغر کر دیا۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا اس کی آنکھیں دھنس چکی ہیں۔ چہرہ زرد ہو چکا ہے اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن اس نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری۔ وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ضرور ڈائرکٹ کرے گا۔ کیا ہوا کہ اس کے پاس

پیسہ نہیں۔ کیا ہوا وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھا سکتا ہے۔ وہ فاقے کرے گا، وہ زندگی سے لڑے گا، وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ کسی حسین خاتون کو پھانس لے، یا کوئی حسین خاتون اسے پھانس لے۔ بس چند دنوں کے اندر وہ شخص پروڈیوسر بن جائے گا۔ لیکن چٹرجی خوبصورت نہ ہونے کے باوجود بھی پروڈیوسر بننا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی سمجھدار عورت اس پر عاشق نہیں ہو سکتی۔ اس سے عشق نہیں کر سکتی لیکن وہ اپنی دھن کا پکا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ اکثر وہ بمبئی کے اسٹوڈیو کا چکر لگا کر تھک جاتا ہے اور پھر تھک کر کہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے اکتا گیا ہے، وہ کب تک! ہاتھ پاؤں مارتا رہے، وہ کب تک جدوجہد کرے، وہ کب تک لوگوں کی گھڑکیاں سنے۔ اسے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے، اسے زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ خودکشی کرے گا۔ جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی ہوتی ہے، وہ ہنسی میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ اس ہنسی میں کتنی شکستیں پنہاں ہوتی ہیں جو زندہ ہو کر اس کے لبوں پر ناچتی ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے، بمبئی کے ہر ہوٹل میں روشنی کے قمقمے روشن ہیں۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں لوگ شراب پیتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں، ہزاروں لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی رہتی ہے۔ ٹراموں، بسوں اور موٹروں کی آوازیں مدھم نہیں پڑتیں۔ لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اداس دکھائی دیتا ہے، اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے۔ آخر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد ——— ؟ آج کل وہ کبھی کبھی کھاتا ہے، کیا اس کو تپ دق ہو گئی ہے؟ کیا وہ زندگی بھر کبھی ڈائریکٹر بن سکے گا؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی؟

میرے ساتھی اکثر چٹرجی کو چھیڑتے ہیں، اس سے مذاق کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کب ڈائریکٹر بنو گے؟ کب پروڈیوسر ہو گے؟ یہ وہی اس کے ساتھی ہیں جو خود بھی بھوکے مرتے ہیں، لیکن چٹرجی پر فقرے کسنے سے باز نہیں آتے اور جب زچ ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے تو سب مل کر چٹرجی کو گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں۔ محض اس لئے کہ اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے کہ وہ فلیٹ کے کرایے میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ وہ اکثر دوسروں کا دست نگر رہتا ہے اور چٹرجی ان سب کی گالیاں خاموشی سے سنتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے نکال دیا جائے تو وہ کہاں رات بسر کرے گا؟ اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہو سکتا۔ وہ غصے میں اکثر خط لکھنے لگتا ہے۔ کس کو؟ شاید اپنے باپ کو جس نے اسے پیدا کیا۔ شاید اپنی ماں کو جو کب کی مر چکی تھی، یا اپنے بھائی کو جو ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ خط لکھو، لکھتے جاؤ۔ دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چرچل کو خط لکھو، ٹرومین کو خط لکھو کہ وہ تمہیں روپے بھیجے، دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلا دے۔ تم دنیا کے ہر بڑے انسان سے پوچھو کہ تم کیوں فاقے کرتے ہو؟ تم کیوں بھوکے مرتے ہو؟ تمہیں کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ دوستوں کی گالیاں نہ سنو، تم اس ذلت کو برداشت نہ کرو۔ یہ ذلت میرے دل میں آگ لگا دیتی ہے۔ یہ سب کچھ میں برداشت نہیں کر سکتا اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بالکنی سے نیچے پھینک دوں۔ دنیا میں ہر شخص متعصب ہے، ذلیل ہے، کمینہ ہے، رذیل ہے . . .

دنیا میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے ——— ٹھہرو! میں کمیونزم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں کہانی لکھنا نہیں جانتا۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے نہ ماحول۔ میں کردار نگاری کے معجزے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں رنگین عبارت نہیں لکھ سکتا، میں اردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ میری تشبیہیں نئی نہیں ہوتیں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، میرا ہر ... میں خوبصورت اسٹائل کا مالک نہیں ہوں۔ میں موپساں اور زولا بننا نہیں چاہتا۔ میں شہرت کا قائل نہیں ہوں ——— میرے پاس اس وقت صرف بارہ آنے ہیں۔ صرف چار آنے۔ لیکن میں جو کچھ بھی کہوں گا صاف صاف کہوں گا۔ میں وہ زبان لکھنا چاہتا ہوں جو ہر شخص کی سمجھ میں آ سکے۔

میں وہ نظام چاہتا ہوں جس میں ہر شخص کو روٹی ملے۔ کپڑا ملے، پیٹ بھر کے۔ میں انسانیت کا قائل ہوں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنی کمینگی کس لئے ہے۔ اتنی بے کاری کیوں ہے؟ اتنی بھوک کیوں ہے؟ اس کا جواب تم کیا دو گے، انسانی خداؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

خیر ——— ان سے ملو۔ ان کا نام ہری چند ہے۔ یوپی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہری چند اپنے والد اور چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی اس کا چچا سب کچھ سٹے میں ہار گیا اور بچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ سرکاری ڈپو میں کام کرتا رہا۔ لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی۔ نوکری چھوڑ دی، کسی نے کہا کہ تم ایکٹر بن سکتے ہو۔ بس پھر کیا تھا ایکٹر بننے کا جنون سر پہ سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے۔ کاش اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ وہ اصلیت کا کبھی سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ آجکل دن بھر میں بیس بار کنگھی کرتا ہے۔ آئینہ ہر وقت اس کے سامنے رہتا ہے۔ غسل خانے میں وہ دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا دھو کر نکلتا ہے تو کریم پوڈر کی آفت آتی ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ میں AFGHAN SNOW کی ایک شیشی ختم ہو جاتی ہے، وہ ہر روز دوگنی قیمت پر کپڑے دھلواتا ہے۔ آج کل وہ روپے گھر سے منگوا کر گذارہ کرتا ہے۔ لیکن کب تک ———؟ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے، وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے ——— بتاؤ ان سب باتوں میں کون سی بری بات ہے؟ ہر عقلمند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے کیونکہ آج کل ایک ایکٹر ہزاروں روپے کماتا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے کیونکہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر ہو جائے گا یا محض بھکاری۔ ہری چند زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ جن حالات، جس ماحول میں رہتا ہے اس میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی دن بدن اس کا وزن کم ہو رہا ہے، سر کے بال جھڑ رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا معلوم پڑتا ہے۔ آج وہ طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے۔ وہ دوائی کا استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دوائیوں کے استعمال سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر کب تک؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں نہایت ہی خراب خوراک ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو میں نوکر ہو جائے مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے اور شیشے کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے! اور بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور زور زور سے چہرے پر کریم ملتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور ہلکی ہلکی کھانسی ہو جاتی ہے لیکن میں ڈپو میں نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ بامشقت قید ہے۔ میں اس قید کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو! اس ٹرنک میں بی۔ اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا تو ——— وہ پھر ہنستا ہے ایک کھسیانی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں ہنسا ہوگا، یہ ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصہ اپنے پاس نہ رکھنا ——— ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے اور باقی ——— ہے بھی کیا ———

میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی کوئی نوکری کر لو لیکن وہ بالکل نہیں سنتا، اس دورِ ابتلا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قسمت ہے، وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت، عزت اور دبدبے کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں پرانے راستوں پر گامزن ہیں جن پر کئی صدیوں سے ان کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کراتا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر دن بھر باہر رہتا ہے اور رات کے تقریباً بارہ بجے گھر واپس آتا ہے۔ نمبر ۲ چوگے

کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے، دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے، ہاں اوتار سنگھ کو چھوڑ کر۔ اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو میں نے نہیں دیکھا۔ نہایت ہی چھوٹے قد کا انسان ہے، دور سے دیکھو تو ایک کھلونے کی طرح دکھائی دے گا اور جب نزدیک سے دیکھو گے تو شاید تمہیں خوبصورت دکھائی نہ دے۔ اس کے بال بھورے ہیں۔ اس کا رنگ گورا ہے، اسے سفید کپڑے پہننے کا شوق ہے اور عورتیں اسے کھلونا سمجھ کر پیار کرتی ہیں۔ رگھبیر جب کبھی گھر آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر وہ شعر لکھتا رہتا ہے پہلے وہ کچھ گنگناتا ہے، پھر شعر لکھتا ہے۔ دراصل وہ شاعر نہیں ہے۔ وہ ایک فلمی شاعر ہے۔ شاعر اور فلمی شاعر میں جتنا فرق ہوتا ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ رگھبیر ایک دلچسپ عاشق ہے، وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے بلکہ وہ ہر عورت سے عشق کرتا ہے۔ اگر وہ کسی عورت کی طرف دیکھ لے اور اسے پسند آ جائے تو سمجھ لو رگھبیر کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا۔ سڑک پر چلتے پھرتے، ٹرام یا بس میں چڑھتے اترتے، گلی کے ریستوران ہوٹل، سینما، گارڈن ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے، وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور گنگناتا ہے "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" آہ بھرتا ہے۔ اپنی محبت کے قصے دوستوں کو سناتا ہے۔ من گھڑت فسانے سنانے میں وہ نہایت کامیاب انسان ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے شادی کا وعدہ ضرور کرتا ہے۔ چند دنوں بعد عشق کا ابال سرد پڑ جاتا ہے لیکن رگھبیر کی نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے، یہ سن کر ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ہم سب اس کی محبت کی گہرائی کو جانتے ہیں۔ آج کل وہ ہر روز اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ یاسیت سی آ گئی ہے۔ کیا واقعی رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ بنگالن جس کا نام گیتا ہے شروع میں اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ گیتا ایک رنگی ہے۔ وہ ایک مشہور فلم استاد کے گروپ میں کام کرتی ہے اور بیچارہ رگھبیر اس بار اس گروپ میں شامل ہو گیا اور بنگالن کے پیچھے ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب یہ گروپ کلکتہ پہنچا تو اس بنگالن نے صاف جواب دے دیا۔ اس کے چاہنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو، ان کاروں اور چمکتی ہوئی ہیرے کی مالاؤں کو دیکھو، وہ شاعر تمہیں کیا دے گا؟ فقط چند شعر اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مر جاؤ گی، وہ کماتا ہی کیا ہے، وہ خود بھوکا ہے تمہیں کیا کھلائے گا؟ اور وہ پھر بنگالی نہیں ہے، وہ پنجاب کی ایک نام نہاد ریاست کا باشندہ ہے۔ اپنے گھر رہو، اس کلکتہ میں رہو، یہاں ناچ گاؤ، لوگوں کو الّو بناؤ اور زندگی کے دن اس ہنسی خوشی میں بسر کرتی جاؤ۔ اور بیچارہ رگھبیر! جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے، عورت کی بے وفائی نے اسے بری طرح اداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے، وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر امید تھا لیکن آج کل اس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہر کی لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ شملہ کی خوبصورت وادی میں اپنا مسکن بنائے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان، الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا۔ تیل اور نمک کی دکان کھولے گا۔ اسے شعر و دنیا سے نفرت ہو گئی ہے، اسے شاعری سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندۂ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کے پہاڑوں کو بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کو فراموش نہیں کر سکتا اور اس کے ذہن میں اس الھڑ لڑکی کے نقوش ابھر آتے ہیں جس نے اسے شہر جانے سے ایک بار روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دھند چاروں طرف سے ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ لڑکی کافی عرصہ تک رگھبیر کی طرف دیکھتی رہی اور رگھبیر اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید! کون کہہ سکتا ہے۔ کیا اس کی شادی

نہ ہوئی ہوگی کسی زمیندار کے ساتھ، کسی نمبردار کے ساتھ۔ ایسی حسین لڑکی کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہری اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں دونوں میں جبر ہے، ہر جگہ ظلم ہے، ہر جگہ محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ آج کل رگھبیر روتا ہے، شراب پیتا ہے اور شعر لکھتا ہے ——— بیچارہ رگھبیر ———!

اوتار سنگھ بڑی عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ یہ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے۔ صبح ۶ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے ۸ بجے گھر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے ڈپو میں نوکر ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور اس لئے اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے، وہ نہایت اچھا سوٹ پہنتا ہے، اور ہمیشہ ٹائی لگا کر دفتر جاتا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ اسے آج کل ترقی ملنے والی ہے اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اس کے صاف اور ستھرے کپڑے ہیں خاص کر اس کی نیلی ٹائی جو وہ چار روز سے پہنتا ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ اس سے بہت خوش ہے! اور ہمیشہ باقی کلرکوں کو لعنت ملامت کرتا ہے کہ تم بھی اس سردار کی طرح کپڑے پہن کر آنا چاہئے۔ اوتار سنگھ کو سکھ ازم پر یقین نہیں ہے، وہ گوردوارے نہیں جاتا اور اکثر قینچی سے داڑھی بھی صاف کرتا ہے لیکن اگر سکھوں کے متعلق کوئی مذاق کیا جائے تو وہ اسے بہت برا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ ترقی خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آگیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے ڈپو کی زندگی پسند نہیں، آخر کب تک آدمی دن رات کام کرے۔ ڈپو کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے اور نوکری کتنی ذلیل ہے۔ پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لئے identification card چاہئے۔ کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے، حاضری لگانی پڑتی ہے اور اگر کلرک کو ——— اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دولت کی غلامی ہے، موت ہے اور پھر ان لمحوں میں کبھی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے کبھی کسی عورت کی طرف مسکرا کر دیکھ لے یا عورت ہماری طرف ہنس کر دیکھ لے۔ میں کہتا ہوں کہ اس فلیٹ کے رہنے والوں میں اتنی جنسی بھوک ہے کہ تم ان کی باتیں سن کر گھبرا جاؤ اور سوچتے رہو کہ یہ لوگ کس ملک کے باشندے ہیں؟ یہ انسان نہیں بھوت ہیں۔

تم نے بمبئی آنے کے لئے کہا ہے۔ آؤ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو۔ اگر برا نہ مانو تو میں تمہیں اپنے گھر کا نقشہ کھینچ دوں تاکہ تمہیں میرے پاس پہنچنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور تم یونہی ادھر ادھر نہ بھٹکتے پھرو۔ اسٹیشن سے اترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ لو، اور پھر ہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے سیدھے اس گلی کی طرف مارچ کرو۔ جو دوسرا مکان ہے اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔ آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا، اور جونہی تم داخل ہوگے تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ انسان اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے۔ لوگ اسے پاگل کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی اسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اکثر یہ آوارہ پھرتا رہتا ہے ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنتا ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان میں مٹی کی تہہ جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان کافی دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اکثر یہ چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب لیٹے لیٹے تنگ آجاتا ہے تو سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہو۔ اس پاگل کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے۔ کتا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا۔ اس کتے سے گھبرانا نہیں۔ یہ کتا ہر نووارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ اس کی سرخ آنکھوں میں تم یاسیت کی جھلک پاؤ گے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر آشیانہ بلڈنگ کے رہنے والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہو وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔ یہ کتا ایک دو بار دیکھ کر تم سے گھل مل جائے گا اور پھر تمہیں دیکھ کر کبھی نہیں غرائے گا۔ نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں، انھوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے۔ میں نے اس رنڈیا کو اکثر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر ادھر ادھر جانے والے لوگوں کو پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے

مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر اس لونڈیا کو کہاں سے لے آیا! میوزک ماسٹر کی شکل کسی بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس نے شہر کے باہر ایک موٹر کھڑی رکھی ہے۔ یہ موٹر اکثر بلکہ ہر روز خراب ہو جاتی ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ موٹر اچھی طرح صاف نہیں کی جاتی، پٹرول کی کمی کی وجہ سے انجن خراب ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود شام کے بعد میوزک ماسٹر اپنی خوبصورت بیوی کو کار میں بٹھا کر باہر لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجنے کے بعد دونوں واپس آتے ہیں۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا، وہ مسرت جو ازدواجی زندگی میں ہونا چاہیے، کبھی ان کے چہروں سے نمایاں نہ تھی، بلکہ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے چیختی ہے، چلاتی ہے، میوزک ماسٹر دھمکی دیتی ہے کہ یہاں سے چلی جائے گی، وہ یہاں نہ رہے گی۔ دونوں زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دن دونوں کو پھر اسی کمرے میں دیکھتا ہوں اور لڑکی پھر اسی کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے، معلوم نہیں کیوں ———؟

ذرا سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل آجائے گی۔ یہاں ذرا ٹھہر جاؤ۔ ذرا دم لے لو یہاں ایک ہی آشیانے میں تمام ہندوستان نظر آئے گا۔ یہاں ایک کرسچین لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی، اس کا مجھے علم نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں پر کھیلتے رہتے ہیں اور یہ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑی ہو کر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس لڑکی کا کیا نام ہے اس کا مجھے علم نہیں اور نام پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بچاری کی بڑی حالت ہے، گو رنگ سفید ہے لیکن جسم پر گوشت نہیں، چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں، اوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں اور پنڈلیاں جو اکثر ننگی رہتی ہیں نہایت میلی اور بڑی بھدی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے اس کے خاوند کو کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی میں نے اس گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہر حال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہی ہوگا ورنہ یہ بچے کہاں سے آگئے اور بچاری کرسچین لڑکی گذارہ کس طرح کرتی ہوگی۔ جب تم یہاں پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے، وہ تمہاری طرف دیکھے گی اور پھر مڑ جائے گی وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے آنے والے محبوب کا انتظار ضرور رہتا ہے۔ وہ کب تک انتظار کرے گی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اسے دروازے میں کھڑا دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں، یہاں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کی بہت سی بدصورت لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں سب جوان ہیں، کاش ایسی لڑکیوں پر جوانی نہ آتی۔ وہ سب ہی کیا جو تمہیں اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک نظر دیکھنے کے لئے جی نہ چاہے۔ عورت کے حسن میں کشش ہونا چاہیے۔ اگر تم اسے ایک بار دیکھو تو تمہیں محسوس ہو جائے گا کہ تم ایک زندہ متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو۔ لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حسن مردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حسن سے پیدا ہوتی ہے خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں تو بدصورتی کا مقابلہ ہے، معلوم پڑتا ہے کہ لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے اور اس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی لڑکیوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے ان لڑکیوں کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ گھر کے دروازے اکثر بند رہتے ہیں اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو اس میں ایک بیوہ کا چہرہ تمہیں گھورتا ہے۔ ایک چہرے پر نفرت کی جھریاں ہیں، مٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے، بیوگی کی تلخیاں، زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار جو مدراسن کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کا پرتو تم ان جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتے ہو۔ صرف آنکھوں میں نہیں بلکہ اس نفرت، اس بھوک، اس تشنگی اور اس بیوگی کی تشکیل تم ان لڑکیوں میں دیکھ سکتے ہو۔ اکثر یہ لڑکیاں خاموش رہتی ہیں، اداس اور پریشان رہتی ہیں۔ ہم سب اکثر اپنے کمرے کی چابی ان مدراسنوں کو دے جاتے تب۔ اگر تم ان لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود انہیں دینا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ چابی لینے کے لئے کسی بیقرار رہتی ہیں۔ اکثر وہ دروازے میں کھڑی رہتی ہیں اور جب تم سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترو گے تو ایک بدصورت چہرہ تمہاری طرف دیکھے گا، اور ایک میلا گندہ سا ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا۔ میری انگلیاں کئی بار غیر شعوری طور پر ان بری انگلیوں سے ٹکرا گئیں۔ لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا ہوئی

جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے، ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، ان کے کام، ان کے چلنے پھرنے کا انداز، ان کے دیکھنے کا انداز ایک ہی سا۔ وہ اکثر تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی لیکن ان کی نگاہوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کے ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی ترتیب دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آرٹ کا پیکر بن جائیں۔ اس سوئی ہوئی زندگی ہی شعلہ بن کر چمکیں۔ گو ان کا رنگ سیاہ ہے لیکن کیا ہوا۔ جوانی کو رنگ سے کیا نسبت ہے؟ دو کیول جوڑ والے محلے میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ ان مدراسنوں سے بالکل ملتا جلتا ہے لیکن اس کے حسن میں کتنی کشش ہے۔ اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔ یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے۔ کالی رنگت والی کو سفید ساڑھی بہت اچھی لگتی ہے۔ کالی رنگت اور سفید ساڑھی۔ سفید ساڑھی اور کالی رنگت۔ لڑکی کو ساڑھی پہننے کا سلیقہ آتا ہے۔ ساڑھی پہننے سے جسم کا ہر نقش ابھر آتا ہے اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ لڑکی ایک مصور ہے جو ساڑھی کو مصور کے برش کی طرح استعمال کرنا جانتی ہے ——— حسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن لڑکی کا حسن اسی طرح قائم رہتا ہے۔

آؤ میرے قریب آؤ۔ وہ لڑکی آ رہی ہے، وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز، اس کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے اور کبوتر ہواؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔ ناریل کے پتے ہواؤں میں جھومتے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پہ ناچتی ہیں، ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے، جسم کا ہر خط واضح ہے، پنڈلیوں سے اوپر رانوں سے بڑھ کر کولہوں کا تسلسل، کتنا دلفریب ہے، مصور کو داد دو! اس کی انگلیوں کو چوم لو اگر چوم سکتے ہو۔ نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پہ زیادہ گوشت نہیں اور سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم، اور سمندر لہریں مار رہا ہے۔ لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں اور اوپر ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ، چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کبھی کبھی زبان، ان مرمریں ہونٹوں پہ پھرتی ہوئی ——— ہونٹ چمکتے ہیں جیسے سبز پتوں پر شبنم کے قطرے، نچلا ہونٹ کچھ کچھ کھنچا ہوا! آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئیں ——— یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں۔ آنکھوں میں فتح ہے، کامرانی ہے، لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے، سبری چند ایک آہ بھرتا ہے اور پھر کہتا ہے "مار ڈالا، مار ڈالا، ہائے مار ڈالا" اور چٹرجی کی ہنسی ——— جیسے مردہ زندہ ہو گیا اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور دگمبیر کا شعر پڑھنا "زندگی چاندی کی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پہ بیٹھ کر گالیاں بکنا خدا کو، تہذیب کو، سرمایہ داروں کو، گورنمنٹ کو، ماں باپ کو، اور کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگانا، چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اتارنا اور میلے میلے بدبودار بالوں میں کنگھی کرنا ——— اور پھر لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا ——— حتیٰ کہ حسن آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور شباب کی خوشبو ہواؤں میں گم ہو جاتی ہے اور صرف گالیوں کی آوازیں مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ "ابے او حرام زادے ساگو کے پٹھے ——— تیری ماں کو لے جائیں ...... "

رامانند ساگر

آبِ حیات

"ہیضہ ہوگیا ______"

اور پھر قے کرنے کی مسلسل اور پریشان کن آوازیں ۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ جنہیں میں بخوبی پہچان رہا تھا۔ کل سارا دن انہی لوگوں کے ساتھ ایک ہی لاری میں بیٹھ کر سفر کیا تھا۔ اس وقت یہ سب مسافر یہاں کیوں جمع ہو گئے ہیں ______ "آدھی رات ادھر آدھی رات اُدھر۔ مکان کی پچھلی طرف واقع ہزاروں فٹ گہری گھاٹی میں سے رو آندھی جیسی سرد ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی جیسے یہاں کے لوگ "ڈھوڈو" کہتے ہیں۔ ہوا کی آمد پر چیل کا جنگل بھیانک آواز میں سیٹیاں بجانے لگ گیا تھا۔ دن کی روشنی میں نظر آنے والا دور نیچے بہتا ہوا دریا اب جنگل کی سیاہی میں گم ہو چکا تھا۔ البتہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کی موجودگی کا ضامن تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کئی ہاتھی ایک ساتھ چنگھاڑ رہے ہوں اور پھر بغل والے کمرہ سے قے کرنے کی مسلسل آوازیں ....

میں جلدی سے اُٹھا۔ ماچس کی تیلی جلا کر چارپائی کے ساتھ پڑے ہوئے ٹرنک پر رکھی۔ اَدھ جلی موم بتی کو جلایا اور تیلی بجھنے سے پہلے نہایت پھرتی اور کفایت کرتے ہوئے .... سگریٹ بھی سلگا لی۔ کمرے میں روشنی ہو جانے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لگانے کے بعد اس ماحول کا خوف آور تاثر کسی حد تک دور ہوا۔

بڑی بڑی درزیں چھوڑ کر رکھے گئے تختوں کی دیوار کے اُس پار سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔

"صاف ظاہر ہے کہ ہیضہ ہی ہے"

"کس غریب الوطنی میں موت آئی ہے"

"کشمیر دیکھنے کے ارمان بھی دل ہی میں رہ جائیں گے"

"یہاں کوئی ڈاکٹر ...."

ڈاکٹر کی بات کہنے والے پہ مجھے غصہ آیا اور ہنسی بھی۔ یہاں جنت میں ڈاکٹر ڈھونڈ رہا ہے۔ جہاں گنتی کے چار شکستہ سے مکان کشمیر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں۔ رات کو اگر دو چار لاریاں یہاں پڑاؤ ڈال دیں تو کسبیوں کے "حجلۂ عروسی" کی مانند رات کی رات کے لئے یہ مکان بس جاتے ہیں۔ لیکن دن کے وقت اپنے مکینوں اور مالکوں کی طرح دھوپ میں اونگھتے ہوئے کشمیر یا جموں کی طرف جانے والی موٹروں اور لاریوں کو ارمان بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور اُن کی خاک ہی کو، جسے وہ کافی مقدار میں نہایت فیاضی کے ساتھ فضا میں معلق چھوڑ جاتی ہیں، اپنے دامن میں سمیٹے رہتے ہیں۔ یہاں پہ ڈاکٹر ——— ؟ تم لوگ خود ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے۔

مجھے اچانک کچھ یاد آیا اور میں سامنے کونے میں پڑے ہوئے سامان میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سامان اس بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر گڈمڈ کیا گیا تھا کہ مجھے کم بخت مزدور پہ غصہ آنے لگا۔ میں نے جلدی سے ایک چھوٹی سی صندوقچی اٹھائی اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

"ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کیوں گھیر رکھا ہے مریض کو"

سب لوگ چھٹ گئے۔ بے ترتیب کپڑوں، پریشان بالوں اور ایک ننھی سی صندوقچی کے ساتھ آتا ہوا اس وقت میں کوئی ایمرجنسی کیس کرنے والا ڈاکٹر نظر آ رہا تھا۔

میں نے کلائی پہ ہاتھ رکھا۔ نبض ہو رہی تھی۔

"کتنی مرتبہ قے ہوئی"

"چار دفعہ"

"اور دست"

"یہی کوئی دو تین دفعہ"

"تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ ابھی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے طفل تسلی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اور اس صندوقچی میں سے سوم رس نکال کر چند قطرے اسے پلا دیئے۔ سن رکھا تھا کہ ہر بیماری میں کارآمد شے ہے اور پھر اس کام کے لئے تھی بھی یہی ایک چیز میرے پاس۔ لمبے سفر اور خصوصاً پہاڑوں پر گھومتے جاتے وقت یہ صندوقچی ضرور ساتھ رکھتا ہوں جس میں برانڈی، سپرٹ، آیوڈین، کونین، سوم رس وغیرہ چند معمولی دوائیں کی شیشیاں اور پٹی کرنے کی روئی کے گالے دھرے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے دوست اس کا مذاق اڑا چکے ہیں اور اسی لئے کبھی کبھی مجھے ڈاکٹر بھی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو اگر ایک ہزار بار بھی میں اس صندوقچی کو لمبے سفروں پر یونہی بیکار اٹھائے گیا ہوتا تو اس کا صلہ مجھے اس ایک رات میں مل گیا ——— میں نے اسے بچا لیا تھا۔

اس وقت وہ میرے سامنے چارپائی پر قریب قریب بے سُدھ پڑی تھی۔ دوسرے تمام مسافروں کو میں نے کمرے سے نکال دیا تھا اور اُس کی ماں چارپائی کی پٹی پکڑے پرلی طرف بیٹھی مجھ پہ سے صدقے واری ہو رہی تھی۔

"تم نے جو احسان مجھ پہ کیا ہے۔ عمر بھر نہ بھولوں گی۔ میں اکیلی عورت ذات اس بیابان میں کیا کرتی۔ اور پھر صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے اس کی شادی کو ——— اس کے سسرال والوں کو کون سا منہ دکھاتی۔ تم نے میری لاج رکھ لی بیٹا ———"

اور وہ اپنا پروگرام سناتی چلی گئی کہ کس طرح اُس نے سوچا تھا کہ "چلو شادی سے پہلے اسے ایک بار کشمیر کی سیر ہی کرا لاؤں ——— ایک مدت سے کہہ رہی تھی۔ اور اس طرح سے گنے ہوئے دنوں میں خود بھی امرناتھ کی تیرتھ کر آؤں گی" اور اُس نے آپ ہی آپ یہ طے بھی کر لیا کہ اب میں بھی کشمیر میں انہی کے ساتھ رہوں گا۔ وہ اپنی باتیں کئے گئی اور شاید مجھ سے بھی اس نے چند سوال پوچھے۔ جن کے جواب میں میں نے بھی لاشعوری طور پر شاید کچھ نہ کچھ کہہ دیا۔ لیکن میرے تو حواس خمسہ کا اجتماع گویا صرف آنکھوں میں ہو گیا تھا..... آنکھیں جو اس حسن نیم خوابیدہ کے سراپا میں جیسے کھو کے رہ گئے تھے جا

رہتی تھیں ۔

سارا دن میں لاری میں بیٹھے بیٹھے اس کی طرف نگاہ بھر کر ایک دفعہ بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی ماں کا ڈر تھا۔ یوں بھی اگر ذرا سی کوئی بات ہو جاتی تو ساتھی مسافر کیا کہتے اور پھر میں اکیلا ——— ! وہ سب لوگ جو خود مجھے بار بار اس طرح تاک رہے تھے ۔ جیسے کچا ہی چبا جائیں گے ۔ ادھیڑ عمر کے مسافر دل کو اسے دیکھ دیکھ کر کس طرح انگڑائیاں آ رہی تھیں ۔ وہی سب لوگ ذرا سی بات اُٹھنے پر اپنی شرافت و نجابت کا ثبوت دینے کے لئے مجھے کس کس طرح نہ ڈانٹتے ۔ اور ——— ! لیکن ، لاری ہی میں اس بجلی کے کوندے نے نہ صرف میری آنکھیں چندھیا دی تھیں ۔ بلکہ ایک مرتبہ جب مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے کچھ نرم نرم سی شے مسلی جا رہی ہے اور جب میں نے جھک کر دیکھا تھا تو وہ اُسی کا پیر تھا ۔ تو اس بجلی کی رو مجھ ایک مرتبہ میری رگ و پے کو یک زبردست دھچکا پہنچا چکی تھی ——— اور اس وقت تو اس کے جسم سے چھو جانے پر آنے والی جھرجھری کی لذت کو بار بار محسوس کرنے کیلئے میں گھڑی گھڑی اس کی نبض دیکھ رہا تھا ۔ اُسے ہاتھ لگاتے ہی یوں محسوس ہوتا ۔ گویا برقی رو کی مدد سے کوئی میرے خون کو بلو رہا ہے اس کی ماں ابھی تک پوری طرح شکریہ ادا نہ کر پائی تھی ” تمہیں تو شاید بھگوان نے میرے لئے ہی .... “

میں نے ایک مرتبہ پھر صندوقچی کھولی اور سوم رس کے چند قطرے پانی میں ملا کر اسے پلا دیئے ۔

دوسرے دن ہم سب لوگ لاری میں بیٹھے ہوئے بھیانک اور پُرہول گھاٹیوں کے درمیان چکر کاٹتے چلے جا رہے تھے ۔ وہ میرے سامنے والی سیٹ پر اپنی ماں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی ۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح اس وقت بیٹھی ہوئی ہے ۔ لیکن اس روز آپس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی ۔ جتنی آج ہے آج تو .... ! بس صرف دس دن کا فرق ہے اور ان دس دنوں میں کیا کچھ نہیں ہو گیا ۔ اس روز کشمیر جانیوالی لاری میں بیٹھی ہوئی ایک جوان لڑکی اپنی جان بچانے والے محسن سے کوئی بات بھی کرتی تھی تو اپنی ماں کو مخاطب کر کے ، اور آج ——— واپس جموں آتی ہوئی ایک لاری میں وہی لڑکی ماں کی آنکھ بچا کر کبھی اس کے چٹکی لے لیتی ہے ۔ کبھی لاری کی کھڑکی میں سے باہر بازو نکال کر اس سے پنجہ ملا لیتی ہے اور کبھی ایک لمحہ بھر کے لئے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر مسکراتی ہوئی سر جھکا لیتی ہے ۔ ہم کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں محض دس دن میں ....

” ابھی کتنی دیر میں جموں پہنچیں گے ہم ——— ؟ “ اُس نے اچانک سوال کیا ۔

” بس دو میل تو رہ گیا ہے کوئی ایک گھنٹہ لگے گا اور ——— “ اور ساتھ ہی اُسے چڑانے کے لئے کہہ دیا ———

” اتنی سی دیر کے لئے اب اداس کیوں ہوئی جا رہی ہو ۔ بس آیا ہی سمجھو گھر ۔ پھر مل لینا سہیلیوں سے ، جتنا جی چاہے ——— “

اُس نے منہ موڑ لیا اور توی کی گھاٹی کے اس پار سلیٹ پتھر کے نیلے نیلے سے پہاڑ کو دیکھنے لگ گئی ۔ آنکھوں کے کونے بتا رہے تھے کہ کس بُری طرح چوٹ کھائی تھی اس فقرے سے ——— میں بھی باہر کی طرف دیکھنے لگا اور سڑک کے پیچ و خم میں اُلجھ کر میرے خیالات کا سلسلہ پھر سلجھ گیا ۔ میں پھر سوچنے لگا کہ آج سے دس دن پہلے بھی قریب قریب یہی وقت تھا ۔ جب اُس نے ایسا ہی ایک سوال پوچھا تھا ۔

” ابھی کتنی دیر میں کشمیر پہنچیں گے ہم ——— ؟ “

لیکن اس دفعہ یہ سوال اپنی ماں کو مخاطب کر کے پوچھا گیا تھا ۔ گو جواب کی توقع مجھی سے تھی اور پھر ..... کشمیر پہنچ کر کس طرح آہستہ آہستہ بے تکلفی کی دیواریاں اُٹھ گئیں ۔

” آپ کی بیوی تو بہت خوبصورت ہوگی “ کس انداز سے پوچھا ۔ گویا اس فقرہ میں لپیٹ کر مجھے یہ بات کہی ہو کہ آپ تو کسی کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے ہیں چنانچہ ہم کو نہ ایسے پیار سے .... ؟ کس نے بتا دیا اس کم بخت کو ۔ اس کی ماں نے اس ہیضہ والی رات جانے کیا کیا باتیں مجھ سے تھے کرا

ی تھیں اور کیا اسی لئے مجھ سے پوچھی گئی تھیں کہ سب کچھ اسے بتا دے۔ کہاں گئی وہ حتاذر پوچھوں تو ذرا اس سے ......

لیکن وہ تو اس وقت امرناتھ کی یاترا کر رہی تھی۔ اس تسلی بخش خیال سے مطمئن ہو کر کہ لڑکی اور دُوسرے بچے نہایت محفوظ اور معتبر ہاتھوں میں چھوڑ آئی ہے اسے مجھ پر کتنی جلدی یقین ہو گیا تھا ———— جانے وہاں ہمیشہ ہوا تھا بھی یا نہیں۔ لیکن اس وقت چند قطرے دوا کے پلا کر میں اس کے بے بمنزلہ مسیحا کے ہو چکا تھا۔ چنانچہ کیا کیا واسطے دیکر مجھے اپنے ساتھ ہی ٹھہرنے پر مجبور کر لیا گیا تھا۔ چلو۔ مجھے بھی تو آخر پردیس میں روٹی روٹی کی ضرورت تھی ہی۔ غنیمت سمجھا۔ لیکن اب اس پر ستم یہ ....

"تمہیں بتاؤ بیٹا کہ میں اکیلی عورت ذات۔ ان بچوں کو ساتھ لئے ان پہاڑوں میں کہاں ٹکریں مارتی رہوں گی۔ تمہیں بھی جب یہیں ٹھہرنا ہے تو کیا حرج ہے بس چار دن تو مجھے لگیں گے کل سے"

"اچھا بچے چھوڑ جائیے۔ لیکن جندرو کو تو ساتھ لے جائیے۔ برف کے پہاڑ دیکھ آئے گی —" میں نے بھی اُسے اسی نام سے بلانا شروع کر دیا تھا جو غالباً راجندر کماری کا مخفف تھا۔

"ارے بیٹا! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میں اکیلی عورت ذات۔ جوان لڑکی ساتھ لے کر کہاں ماری ماری پھروں گی۔ پھر سنا ہے کہ امرناتھ کے راستہ میں ایسی ایسی بوٹیاں بھی ہیں۔ جن کی خوشبو سے کمزور آدمی بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ گھر سے تو یہی خیال تھا کہ ساتھ لے جاؤں گی۔ لیکن جب تم سا دیوتا مل گیا تو خیال بدل گیا۔ اب جان بوجھ کر خطرہ کیوں مول لوں"

عجب عورت تھی۔ جیسے میں دیوتا نظر آ رہا تھا۔ جو اس کی جوان لڑکی کی حفاظت کرے گا اور جس دیوتا کے درشن کرنے وہ جا رہی تھی۔ پھر وہ کیا تھا؟ ہم ہندو لوگ اپنے ویدوں اور پرانوں کی کتھائیں سن کر انہیں سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا وہاں صاف نہیں لکھا ہوا کہ اگر انکا جنسی تعلق منظور نہ ہو تو سگے بہن بھائی کو بھی کبھی خلوت میں یکجا نہ ہونے دو۔ ایک روایت کے مطابق تو خود دھرم راج یدھشٹر کا دل اپنی سگی ماں کے خوبصورت بال دیکھ کر میلا ہو گیا تھا ———— اور میں تھا دیوتا ———— !

میری طرف سے جتنا انکار بڑھا۔ اتنا ہی اسکا اصرار بڑھ گیا۔ شاید میرے پیہم انکار کے باعث اس کا یقین اور پختہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری کوئی پیش نہ گئی۔

امرناتھ کے جاتریوں کے واپس آنے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا میں نے بیوی والے مذاق کا جواب ڈھونڈ لیا تھا۔

"تمہارا دولہا ہو گا کوئی بڈھا کھوسٹ۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بڑے پوپلے پوپلے منہ سے باتیں کیا کرے گا تم سے ...."

میں اور بھی کتنی ہی باتیں کہتا۔ اور وہ خوب سٹپٹاتی۔ لیکن ارے ———— اس کی آنکھوں میں پانی ڈبڈبا چھلکنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ میں کوئی کلمۂ حیرت مُنہ سے نکالوں۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ لیا۔

"ارے سوئی آنکھوں میں اُتر جائے گی —"

میں نے گھبرا کر اس کی اُنگلیوں سے کشیدہ کی سوئی چھیننے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ پرلیس میں لگا ہوا میز پوش پھینک کر جلدی سے اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ یہ ہو کیا گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ سسرال اور دُولھا کے متعلق باتیں کرنے سے لڑکیاں شرماتی ہیں۔ روتی نہیں۔

میں نے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔

"کیا ہوا۔ آخر کچھ بولو بھی ———— بھئی یہ رونا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ کچھ ہو بھی۔ کہ یونہی آدمی بات بے بات روئے جائے۔ اگر

کوئی غلطی ہو گئی ہو تو بھی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ادھر دیکھو۔ ہم ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔"

اور میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ بڑھایا اور میرے ہاتھوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے وُہی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا اور پھر بازو سے کھینچ کر اسے سیدھا بٹھا لیا۔

"آخر ہوا کیا —— کچھ کہو گی بھی —— کہ بس —— !" میں نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ——" اُس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا رنگ اتنی ہی دیر میں سفید ہو گیا تھا اور چہرے پہ پھیلے ہوئے آنسوؤں کے نشان اس طرح تھے۔ جیسے چنبیلی کا کوئی پھول شبنم کے کسی آوارہ قطرے سے لتھڑ جائے۔ میرے آ جانے پہ وہ بڑی گھٹی گھٹی سی سسکیاں لے رہی تھی ... —— کس بُری طرح وہ طوفان کے سامنے بند لگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں۔ کچھ تو ہے۔ مجھے تم پرایا سمجھتی ہو۔ تبھی چھپاتی ہو۔ میں آج ہی چلا جاؤں گا اور کہیں ——"

طوفان رُک نہ سکا۔ بندِ کشمکش کے پہاڑ کی طرح ڈھے گیا۔ بے قابو ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کا یہ عالم کہ ایک مسلسل دھار کی صورت میں ڈھلتے ہی چلے آتے تھے۔ آخر میں کہاں تک برداشت کرتا......

وہ شام بڑی بے چینی سے کٹی۔ بار بار اس کی بیان کردہ کہانی ذہن میں گھوم جاتی اور کہانی ہی کیا تھی۔ اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہا جا رہا تھا جس کے بچوں کے آگے بھی بچے تھے۔ ہونے والے خاوند کے نام کا تو اسے علم نہ تھا۔ لیکن وہ رہنے والا میرے شہر سے بیس میل کی دوری پر واقع ایک قصبہ کا تھا۔ مگر اُسے خیال کیا یقین تھا کہ اُسے اس مقام کا پتہ بھی غلط بتایا گیا ہے اور کہ اس کی سسرال کہیں مہذب دنیا سے بہت دور ہے۔ جہاں دن رات جھلسا دینے والی ڈھیری لُو چلتی ہو گی اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہو گا۔ اور........

اس کی چتا نے میرے ذہن کو اپنے گھریلو واقعات کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ہمارے پڑوس میں رہنے والی وہ پتھر دل۔ ظالم۔ سوتیلی ماں اور پھر مجھے اپنے پچاس سالہ بڑے بھائی کا خیال آیا۔ جنہوں نے والدین کی موت کے بعد مجھے اپنے لڑکوں کی طرح پالا تھا حتیٰ کہ میں مرنے والی بھابھی کو ماں کہا کرتا تھا اور جو اس وقت۔ جبکہ انہیں میرے اور اپنے بچوں سے دل بہلانا چاہیئے تھا۔ کسی نئی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ اس لڑکی کے جذبات بھی کیا جنیدو ہی کے مانند نہ ہوں گے اگر انہیں دوسری شادی ہی کرنا ہے تو کیوں نہیں وہ اپنی کسی ہم عمر اور بیوہ عورت سے شادی کرتے۔ حسین کنواری لڑکیوں کے چہروں پہ کیوں آنسو پھیلے جاتے ہیں اور پھر مجھے اپنے ننھے بھتیجوں کی ہونے والی سوتیلی ماں پہ ترس آنے لگا........ لیکن یہ سوتیلی مائیں تو روایتاً ظالم ثابت ہوتی ہیں..... شاید اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا انتقام وہ مرنے والی سوتن کے ننھے بچوں سے لیا کرتی ہیں انتقام کا انہیں حق ہے لیکن..... مجھے اپنے پڑوسی کے ننھے ننھے بچوں کے بدن پر قمچیوں کی مار کے اُبھرے ہوئے نشانات یاد آنے لگے۔ جنہیں میری مرحوم ماں آہستہ آہستہ سہلایا کرتی تھی اور میرے بسکٹ انہیں کھلا دیا کرتی تھی۔ گو ان دنوں میرا بچپن تھا لیکن انہیں دیکھ کر مرحومہ کی آنکھوں میں چھلک جانے والے آنسو مجھے ابھی تک یاد ہیں —— مجھے سوتیلی ماؤں سے نفرت ہے۔ یہ جنیدو جو آج یوں بلک... رہی ہے چند ہی دنوں میں یہ بھی ایک سوتیلی ماں بننے والی ہے —— دل میں جنیدو کے تئیں نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے لیکن —— اس کا وہ بے انتہا لپٹ جانا —— بدن میں ایک جھرجھری سی سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

صبح اس کی ماں کو آنا تھا۔ رات بھر ہم سو نہ سکے اور باتیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہو پاتی تھیں۔

"لیکن جنیدو۔ ایک بات ہے کہ ہم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا ہوا۔" کس قدر بے باکی تھی —— اور کتنی طمانیت، پشیمانی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اور پھر ایک طاقت ور لشکر کی طرح اس کے دل کی ایک ایک باریکی کو نمایاں کرنے والی اس کی باتیں..........

"دراصل میں تو یہاں امرت کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ امرت جو کسی کی زندگی کے لئے آبِ حیات کا کام دے نہ دے۔ لیکن اس زندگی کی حسرتوں کے لئے آبِ حیات ہو۔ تاکہ وہ حسرتیں مرنے والی رُوح کے دل میں بھی کانٹا بن کر رہ جائیں ——— اب کے بیاہ کے سلسلہ میں میرے ماں باپ نے جو میرے سسرال والوں سے بہت سے روپے وصول کئے تو سالہا سال کی تنگدستی سے ایک دم کے لئے چھٹکارا ہُوا مدت سے سُن رکھا تھا کہ کشمیر جنت نظیر ہے۔ دل نے کہا۔ چند ہی دنوں بعد جہنم میں جانا ہی ہے۔ کیوں نہ ایک مرتبہ جنت کا نظارہ کر لیا جائے ایسے مقام میں دل پر حسرتوں کے جو نقش بیٹھیں گے وہ زیادہ گہرے اور پائندہ تر ہوں گے اور ماں بھی امرناتھ کے درشنوں کے لالچ سے چلی آئی ——— کیا پتہ تھا کہ اس وادی میں تم مجھے وہ آبِ حیات پلاؤ گے ——— اب میں اس اطمینان کے ساتھ تو شادی کی موت کے گھاٹ اُتر سکوں گی۔ کہ ایک رات ہی کے لئے سہی۔ مگر میں نے زندگی پائی تو . . . . .

میرے دل نے چاہا تو تھا کہ اس کے ساتھ ابھی اسی وقت شادی کر لوں اور کہہ دُوں کہ ——— چاہے تو اب نہا بھی لے آبِ حیات سے" پھر اس کا جوبن بھی کیا گدرایا ہُوا ہے اس وقت ——— جوانی کے مارے حسن پھُوٹا پڑتا ہے۔ لیکن میری بیوی ——— اس کا بھی تو یہی عالم تھ کسی دن ——— تین چار بچے کیا ہوئے کہ بس یوں ہو گئی جیسے ——— اس کے بھی جب بچے ہو جائیں گے تو اس کی بھی وہی حالت نہ ہو جائے گی؟ اور یوں بھی ہمارے سماج میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی جوبن اور حسن سے مالا مال لڑکیاں ان ادھیڑ رنڈوے کھوسٹوں سے بیاہی جاتی ہیں جو مہذب دنیا سے دُور ان مقامات میں رہتے ہیں جہاں دن رات جُھلسا دینے والی لُو ہی لُو چلتی ہے اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسّر نہیں آتا ——— تو اکیلا میں کس کس کو آبِ حیات پلاتا پھروں . . . .

اچانک ایک دھچکے کے ساتھ لاری کھڑی ہو گئی۔ گذشتہ دس دن کے واقعات کا جو فلم میرے ذہن میں چل رہا تھا۔ اس کا جیسے ایک دم سے فیتہ ٹوٹ گیا۔ فلم ٹوٹ جانے پر سینما ہال میں جیسا بے ہنگم سا شور مچ جاتا ہے کچھ اسی طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کوئی محصول والی چیز تو نہیں آپ کے پاس" ——— کسی نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی نہیں ——— یہ کون سی جگہ ہے" میں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جموں کی محصول چنگی ہے" اور وہ شخص اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی سواریوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ تو ایسے سوئے ہیں اور ھم پورے کہ بس، یہاں تک تو کچھ ہوش ہی نہیں" چندرو مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔ میں نے مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

اتنے میں چنگی والوں کا ایک سواری سے جھگڑا ہو گیا۔ یہ لوگ محصول چنگی مانگ رہے تھے اور وہ بیچارا کہتا تھا کہ "میں نے اسی لاری میں جموں سے آگے نکل جانا ہے تو یہاں محصول چنگی دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر آپ دوسرے راستہ سے نکلیں گے تو وہاں کے محرر چنگی سے رسید لے آیئے گا۔ ہم محصول واپس کر دینگے"

"میں وہاں لاری چھوڑ کر پھر واپس آؤں۔ یہ کیسا ظلم ہے۔ کیا آپ کا یہی قانون ہے؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ محصول دیجئے جلدی سے" وہ بیچارا مدد طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ریاست میں کیا کیا ظلم قانون کی آڑ میں نہیں ہوتے۔ چھوڑیئے اس قصّہ کو۔ یہ جرمانہ تو بھرنا ہی ہوگا" اس کے ساتھی نے کہا۔ اسنے مجبور ہو کر ایک روپیہ ادا کر دیا۔ جو غالباً ریاستی خزانہ کی بجائے محرر کی جیب میں داخل ہو گیا ہو گا۔

لاری پہاڑی علاقہ چھوڑ کر میدان میں داخل ہُوئی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہُوئے چپٹے کھیتوں میں ہریاول لہلہا رہی تھی۔ مغرب میں ایک چمکدار

سُرخ رنگ کے بادل کا ٹکڑا ڈوبتے ہوئے سُورج کا پسماندہ نشان رہ گیا تھا۔ جندرو کی ماں اپنے بچّوں کے کوٹ وغیرہ ٹھیک کرنے لگ گئی تھی اُن کا شہر نزدیک آ رہا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی۔ وہ امرناتھ کا تیرتھ کر آئی تھی۔ جہاں بھگوان شنکر نے پاربتی کو امر کتھا سُنائی تھی یعنی ایک طرح کا آبِ حیات پلا دیا تھا جس کے چند چھینٹے دو کبوتروں کے حصّہ میں بھی آ گئے تھے۔ وہ ابھی تک وہاں رہتے ہیں۔ وہ بھی ان کبوتروں کے درشن کر آئی تھی۔ جن پہ آبِ حیات نے اثر کیا تھا اور خود اس کی لڑکی .... تیرتھ میں تمام گذشتہ گناہوں کے دھل جانے سے اس کی آتما کتنی ہلکی ہو گئی تھی اور اب وہ کس طمانیت قلب سے لڑکی کی شادی کا ثواب حاصل کرنے جا رہی تھی ....

لاری کو ایک اور دھچکہ لگا۔ سیالکوٹ آ گیا تھا —————— میں نے انہیں تانگے میں بٹھا دیا۔ اس کی ماں نے جندرو کی شادی پہ آنے کا جو وعدہ لیا تھا اُسے پھر پکا کرنے لگی۔

میں انہیں چھوڑ لاری میں قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"منوہر ——————"

مُڑ کر دیکھا تو جندرو تانگے سے اُتر کر میری طرف آ رہی تھی۔

"آپ کا فاؤنٹین پن رہ گیا ہے لیتے جائیے" اُس نے اونچی آواز میں کہا۔

مجھے یاد تھا اپنا قلم۔ میں تو جان بوجھ کر اس کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ لیکن —————— فاؤنٹین پن کا تو محض بہانہ تھا۔

"شادی پر آنے کا وعدہ پکا ہے نا ——————" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بالکل پکا ——————"

"میری آنکھوں کی طرف دیکھئے ——————" میں نے دیکھا۔

"یہ تب تک راہ میں بچھی رہیں گی ——————"

گھر پہنچ کر حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ بیوی میری عدم موجودگی میں محسوس کرتی رہی تھی کہ بھیّا جنہیں میں بابو جی کہا کرتا تھا کسی خاص تیاری میں منہمک ہیں۔ میں نے بھی تاڑا۔ غالباً وہ چوری چھپے کہیں شادی کی بات پکّی کر رہے تھے اور یا پھر کر چکے تھے — مجھے سخت صدمہ پہنچا اور کوئی بہانہ کر کے اس موقعہ پہ گھر سے چلے جانے کی سوچنے لگا۔ اپنے افسر سے کہا کہ فرنٹیر میں کہیں تبدیلی کر دو۔ جنگ کے زمانہ میں کوئی کلرک خود ہی فرنٹیر جانے کے لئے کہے اور پھر فوجی محکمہ —————— افسر کیا اور کیا چاہتے تھا۔ ہفتہ بھر کے اندر اندر تبدیلی کا حکم آ گیا۔

اس تبدیلی سے مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہُوا کہ میں وعدہ کر کے بھی جندرو کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اگر میں اپنے ہی شہر میں ہوتا تو کبھی وقت نکال کر اس کے سسرال ہو آیا کرتا۔ لیکن میں اپنے شہر میں بھی تو نہ رہ سکتا تھا۔ اگر بابو جی کو شادی کرنا ہی تھی تو برات کے موقعہ پہ اپنے بچّوں کی شکل تک دیکھنا اُن کے لئے بدشگونی ہوتا۔ یہ ظلم کون اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔

کوہاٹ میں بھی میں اس روز کا منتظر رہا۔ جب گھر سے کوئی بلاوا آئے تاکہ اسی بہانے جندرو کے قصبہ تک جانے کا موقع ملے چنانچہ اس روز صد شکر کیا۔ جب شادی کے عین نو ماہ بعد نئے بھتیجے کی آمد پہ گھر سے بلاوا آیا۔

واپس آتے وقت اپنے سٹیشن پہ گاڑی سے اترنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ صرف ایک ہی سٹیشن آگے —————— اور جندرو کا قصبہ —————— لیکن بچے جو ساتھ تھے اور پھر نئی بھابھی —————— بابو جی پہلے ہی لکھ چکے تھے کہ ہماری نئی بھابھی کے خیال میں

شادی کے موقع پہ گھر نہ رہ کہ میں نے ہی اظہارِ نفرت کی ابتدا کی تھی . . . .

جلدی سے آگے بڑھ کر میں نے نئی بھابھی کے پیر چھو لئے ۔

"خوب وقت پر آئے ———" کتنا گھٹیا اور طعن آمیز تھا فقرہ ۔ آخر بڈھوں کی اِن نوجوان بیویوں کے دِل اس طرح پتھر کے کیوں بنے ہوتے ہیں ۔ پہلے بچوں کے لئے ان کی زبان پہ دُعا یا آشیرباد کا لفظ کس مشکل سے آتا ہے ۔ چلو میں شادی کے موقعہ پر کھسک ہی گیا تو کیا اس کے لئے اتنا . . . .

میں نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا . . . . . . سامنے جیندرو کھڑی تھی ۔

اُس کی نگاہیں ———— یوں معلوم ہو رہا تھا ۔ جیسے کسی کو ذبح کر کے اس کی لاش کو آبِ حیات کے تالاب میں ڈال دیا گیا ہو . . . .

———

آغا بابر

باجی ولایت

"...... عورت اچھی بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے جو جو کچھ لاہور میں رہتے دیکھا ہے زبان پر نہیں لا سکتا۔ اتنی بدمعاشی ہے وہاں کہ خدا بچائے۔" یہ الفاظ جیسے نواز کے خون میں سرایت کر گئے تھے۔ خون جب دل کے پاس سے گذرتا چکے سے یہ الفاظ دل کے کان میں کہہ جاتا اور نواز سوچنے لگتا ____

دفتر والوں نے آج زیادہ وقت لاہور کی باتیں سننے میں صرف کیا تھا۔ ظہیر جو کوئٹہ سے ایک سال کے لئے ڈیپوٹیشن پر لاہور بھیجا گیا تھا، لاہور کی باتیں سنا رہا تھا۔ "وہ تو ایک شہرستانِ حسن ہے۔ وہاں کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی کا نظارہ کرنے کے بعد آنکھوں میں کوئی اور شہر نہیں بچ سکتا۔ پلے ہوئے گداز گداز سانولے بدن، پیارے پیارے زیتونی رنگ کے چہرے، جھکی جھکی آنکھیں اور سینے پر ڈھلے ہوئے دوپٹے کا چڑھا ہوا جھولا دل کو سینے میں جھکولنے لگتا ہے اور پھر خود نمائی اور عریانی کی نئی نئی حرکتیں اپنی بے عنانی اور بے تکلفی میں اتنی فزوں تر ہو جاتی ہیں کہ شباب کی للکار سُن کر قدم تھم جاتے ہیں۔" اس نے مزے لے لے کر بہت کچھ کہا، احباب نے چٹخارے لے لے کر سنا۔ مگر نواز پر ان باتوں کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہاں ظہیر کچھ باتیں ایسی ضرور کہہ گیا تھا جو اس کے سینے پر بوجھل پتھر بن کر رہ گئی تھیں۔ مثلاً جب اس نے مولانا سے خطاب کر کے کہا تھا "مولانا آپ کیا کہہ رہے ہیں ـــ عورت پر ابھی بندشیں ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ اسے بچپن سے کہا جاتا ہے سر پر دوپٹہ لو، سینہ ڈھکو، یہ کرو یہ نہ کرو تو یہ عالم ہے۔ اگر یہ بندشیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جیسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے آپ کے سامنے ننگی ہو کر ناچے۔" کیا یہ ظہیر کی زیادتی نہ تھی؟ ____

نواز کروٹ بدل کر سیدھا لیٹ گیا۔ سنبل کا تکیہ سر کے نیچے سے کھسکا تو اس نے اسے اکٹھا کر کے سر کے نیچے دے لیا۔ اس نرم لمس کے احساس نے جیسے چند سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چھت کی ایک کڑی اس کے سینے پر آن گری ہے جس سے وہاں پڑی ہوئی بوجھل سِل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر نیچے رکھتا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی تو ایک سنگریزہ ہی تھا۔ کہیں ادھر اُدھر پڑا ہوا۔ جسے جو چاہے اٹھا لے اور جس کو پسند آیا تھا اس نے اٹھا لیا تھا۔ اس کا بچپن ماں باپ کے سایہ میں نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں گذرا تھا جس نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ لڑکوں کی خوشامدیں کر کے انہیں نوکر کرایا اور پھر شادیاں بھی کیں اور

خوب صورت، بیویاں ولائیں۔ مہرِ مادری اور شفقتِ پدری کی محرومی کا اس کی ذہنی نشوونما پر اثر انداز ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ بچپن میں اپنے ہمجولیوں سے بہت کم کھیلتا تھا۔ زیادہ تر اپنی بھابی کے گھٹنوں کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا۔ بازار سے سودا سلف لا دیتا یا اپنے بھائی کے بچوں کو کھلاتا رہتا۔ بھائی اور بھابی دونوں اس کی اس برخورداری پر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ اور بھی پھیلتا اور جب بھابی سے ملنے ملانے والیاں آتیں تو وہ سارا سارا دن ان کی خدمت میں بیٹھا رہتا۔ اسے عورتوں کی صحبت اچھی لگتی تھی گھر کی کیا اور باہر کی کیا کسی عورت کو بھی نواز کے سامنے کسی قسم کی بات کرنے میں جھجک نہ ہوتی تھی جیسے ان کو نواز پر ایک اعتماد سا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح بھولا بھالا سا رہے گا۔ اس کی اداس اداس آنکھوں میں کبھی ہنسی نہ آئے گی اور اس کے چہرے پر پڑی ہوئی گرد تیمی کبھی دور نہ ہوگی۔

نواز پلنگ پر لیٹا ظہیر کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ سیبل کا نرم نرم تکیہ چھونے پر اس کے دماغ میں اس بیتے ہوئے بچپن کے واقعات دوڑنے بھاگنے لگے جب وہ منہ بہت دھیما جھپڑ کر بات کیا کرتا تھا۔ اس کے لب ولہجہ میں ابھی تک تسلیم و رضا اور عاجزی کی وہی آٹھویں جماعت والی ملائمت موجود تھی۔ اس وقت عورتوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے اس کی زبان پر عورتوں کے کئی محاورے چڑھ گئے تھے۔ رجو بیاں کی شادی پر عورتوں کو اس نے فرنی کی کتنی صحنکیں لا کر دی تھیں۔ مردانے میں سے چوری چھپے فرنی لانا کوئی آسان کام نہ تھا مگر عورتوں کا کام کر کے اسے کتنا اطمینان ہوتا تھا اور جب کوئی عورت اسے دعا دیتی تو اسے کتنی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ رجو بیاں کی برات چڑھنے سے پہلے اس کے ہمجولی چھپ چھپ کر سگریٹ پی رہے تھے۔ کئی باہر مردانے میں گاؤ تکیوں پر ناچ رہے تھے' کئی پان کی پچکاریاں مار رہے تھے اور وہ اندر عورتوں کو پھولوں کے گجرے پکڑا کر ان کی شلواروں میں ازار بند ڈال کر ڈبوں میں سے نئی نئی گوٹے کناریاں نکال نکال کر ان سے دعائیں لے رہا تھا۔ "نا جی بیٹا! اب ازار تیلی ادھر دے جانا" وہ ایک دالان میں سے دوسرے میں جاتا کبھی ازار تیلی اس کے ہاتھ میں ہوتی کبھی پاندان۔ کسی دالان میں شلوار پہنی جا رہی ہوتی' کسی کوٹھڑی میں قمیص اتر رہی ہوتی۔ اسے اندر دیکھ کر کئی عورتیں پہلے جھجکتیں مگر پھر نا جی کی مانوس صورت دیکھ کر ان کے چہرے کہنے لگتے "اچھا تم تھے ——— کوئی بات نہیں" دلہن والوں کے گھر بھی وہ عورتوں میں جا گھسا تھا۔ وہاں بھی کئی بنی ٹھنی لڑکیوں پر اس کی نظر پڑی تھی۔ مگر اسے ان میں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی تھی۔ بڑی عمر کی عورتوں کے مقابلہ میں وہ گم سم سی نظر آتی تھیں۔ ان کی گھٹی گھٹی ہنسی دبی دبی کھلکھل اسے قطعاً نہ بھاتی تھی۔ کام کہنے کو وہ ان کا بھی کر دیتا تھا مگر وہ اسے دعائیں نہ دیتی تھیں۔ دلہن والوں کے گھر ایک عورت نے یہ کہہ کر "اچھا نا جی پھوپھی بتول کا بیٹا ہے؟" کتنے پیار اور محبت سے اسے گلے لگایا تھا اور کتنے پرخلوص لہجہ میں دعائیں دی تھیں اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ اس وقت باجی کے ڈھلے ہوئے سانولے جسم میں سے زندگی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ باجی ولایت ان عورتوں میں سے تھیں جو نواز کو پسند تھیں اور باجی کی شکل اسے بے انتہا پسند تھی۔ باجی کے ماہتابی گال ہمیشہ چمکتے رہتے اور ان کی غلافی آنکھوں کی پلکوں میں سے ایک ساحرانہ گھلاوٹ جھانکتی رہتی۔ نواز کے لئے باجی کی شخصیت میں ایک گرفت تھی اور علاوہ اس کے وہ نواز سے پیار بھی بہت کرتی تھیں اور ان کا کام کر کے نواز کو بے حد خوشی ہوتی تھی' ایک مرتبہ ان کا کوئی کام کرتے ہوئے وہ گر پڑا تھا اور اس کی نکسیر پھوٹ پڑنے پر بھی پیار سے باجی ولایت نے جھٹ جھٹ اٹھا کر اپنی اوک سے اسے پانی پلایا تھا۔ اس دن سے نواز کو وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ نواز کی بھابی کبھی بچوں کو نہلا دھلا کر نواز کے ساتھ باجی ولایت کے گھر بھیج دیتی اور نواز باجی کے قریب بیٹھ کر گھنٹوں سکول کا کام کرتا رہتا۔ ساتھ ساتھ بچوں کی خبر گیری بھی کرتا' انہیں جھاڑی والے سے کچھ لا بھی دیتا اور باجی کبھی کہہ دیتی "نواز پکڑ لو یہ کپڑا ذرا۔ اس کنارے سے۔ کھینچو اپنی طرف ——— اور ——— اور ——— بس ٹھیک ہے ——— اب یہ کنارا کھینچو" مشین پھر چلنے لگتی اور نواز سکول کا کام کرنے لگتا۔ باجی ولایت کے بال بادامی تھے۔ نواز کو یہ معلوم تھا کہ وہ ہمیشہ صابن استعمال کرتی ہے۔ بال ریشم معلوم ہوتے تھے۔ ایک روز باجی کا سر دکھتا تھا۔ ان کی لڑکی نجمی ان کے بالوں میں تیل جھس رہی تھی کہ سالن جلنے کی بو آئی۔ نجمی باورچی خانہ کو بھاگی۔ باجی نے سر دبا کر کہا "ہائے ہائے ——— باجی میں تیل جھس دوں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ تیل

چھیڑنے لگا۔ "جیتے رہو باجی کتنے اچھے ہو تم!" بس ذرا سی بات سے باجی پھول گیا تھا۔

اسے ٹھنڈا ٹھنڈا تیل ڈال کر باجی کے بال سہلانے میں کتنا لطف آیا تھا۔ وہ اپنے سر میں بھی تیل لگاتا تھا بھائی کے بچوں کے سر میں بھی مگر باجی کے بادامی بالوں میں تیل لگانے میں اسے ایک عجیب طرح کا لطف آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کبھی جلی ہوئی ہنڈیا سے اُبلی اور چٹی رہے۔ سینے پروتے کے دوران میں باجی کو کئی مرتبہ پرانی قمیص اتار کر نئی قمیص سے ماپنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور نواز نے قمیص اترتے وقت بنیان کے ذرا کھورڑا اوپر اٹھ جانے سے کئی دفعہ باجی کی کسی ہوئی چھوٹی سی توند کو دیکھا تھا۔ باجی اپنی قمیص آپ بہت کم سیتی تھی زیادہ درزی سے سلواتی تھی۔ کہا کرتی تھی درزی قمیص میں جان ڈال دیتا ہے اور یہ بات نواز نے بھی محسوس کی تھی کہ جب باجی قمیص پہن کر سینہ چھلکاتی پھرتی تو اکثر عورتوں کی نظریں باجی کی قمیص پر جم جاتی تھیں اور کئی تو جل بھُن کر کہتیں:

"سب ڈھل گئے یہ نہ ڈھلی"

دوسری ناک بھوں چڑھاتی: "ڈھلنے کیونکر ——— وہ بنیان جن کر آرام سے بیٹھ گئی ہے۔"

تیسری کڑھتی: "ہم تو جن جن کر بوڑھی ہو گئیں بوا۔ ذرا سوچو ولایت مجھ سے دو سال بڑی ہے۔"

"دو سال بڑی! تمہاری بیٹی لگتی ہے وہ تو۔"

"وہی تو میں نے کہا۔ بیچی کیوں نہ لگے۔ نخرا کتھوڑا ہے اس کا جیسے نئی جوانی چڑھی ہو۔ کوئی پوچھے خاوند نے تو میم کر لی ہے۔ وہ اپنے گھر تھوہیں رکھتا نہیں اور تو یہ کیا بالوں میں آگ لگا کر میم بن رہی ہے۔"

"میں کہتی ہوں کیا یہ آن بان دکھاتے اس کا جی بُرا نہیں ہوتا؟"

نواز سوچتا واقعی باجی ولایت میں ایک آن بان تو ضرور ہے۔ عورتوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آن بان رکھنے کے لئے باجی کو کیا کیا خوشبودار اُبٹنے کوٹنے پڑتے تھے۔ چنبیلی اور گلاب کی کھدیاں اُبٹنے اور کیا کیا اور الابلا کوٹنے پھاننے میں نواز کو بھی کئی بار باجی کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ دہلی آنے سے پہلے اس کی بھابی نے اپنی ملنے والیوں سے کہا تھا "ولایت بجّو میری ایک سہیلی ہیں۔ جیسی باڈی وہ بناتی ہیں کوئی نہیں بنا سکتا۔ کبھی وطن گئی تو ان سے سلوا کر لاؤں گی۔" نواز نے دلی آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ باجی ولایت باڈی سینے پر کتنی جان مارتی تھیں۔ کس طرح ادیب سر پر کُتر کر باڈیاں بھر جوڑتیں۔ کئی باڈیاں آگے سے کھلتیں کئی پیچھے سے۔ کسی پر بٹن لگتے تھے کسی پر ڈوریاں اور کئی باڈیوں کو مختلف رنگ کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں سے اس طرح جوڑ کر بنایا گیا تھا کہ دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طوطے کے رنگدار پروں سے بنی ہوئی ہیں۔ باجی کو بس باڈیاں سینے اور پہننے کا شوق تھا۔

ہاں تو جب وہ عورت اس کو گلے لگا کر دعائیں دے رہی تھی تو اس کی پیاسی روح کتنی سرشار ہوئی تھی اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ نواز کے دل نے جیسے کوئی بٹن دبا دیا اور ذہن میں پر دوڑتے بھاگتے واقعات وہیں رُک گئے۔

"میں نے ۔۔۔ میں نے تو باجی کو مسکراتے ہنستے سینکڑوں بار پہلے دیکھا تھا مگر وہ مسکراہٹ مجھے کیوں اتنی اچھی لگی؟ ——— شاید اس لئے کہ اس وقت دعاؤں سے میری روح سرشار ہو کر مسکرا رہی تھی، اور اس پس منظر پر باجی کی مسکراہٹ نہایت موزوں اور مناسب نقش کا کام دے گئی۔ کتنی ہم کاری تھی کتنی مطابقت۔ میری روح مسکرا رہی تھی، اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے ——— واقعات پھر دوڑنے لگے ——— باجی کے بدن پر سفید لباس کتنا کھلتا تھا اور اسے شاید اس بات کا علم تھا جبھی وہ اکثر سفید لباس ہی پہنا کرتی۔ نصرت، باجی ولایت، خالہ نفیسہ اور کتنی اور عورتیں تھیں جو ہوریاں کی دلہن کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھیں۔ نصرت نے عطردان تھام رکھا تھا مگر جب وہ کھلکھلا کر ہنستی تو معلوم ہوتا کہ عطردان اب گرا اب گرا۔ ایک سرخ دوپٹہ پکڑے کھڑی تھی۔ باجی ولایت ہنس ہنس کر دلہن کے ہونٹوں پہ سرخی جما رہی تھی۔ خالہ نفیسہ دلہن کی آنکھوں میں

بڑی احتیاط سے سرمے کی دھاریاں کھینچ کر بولی "دلہا کو ذرا مست نگاہوں سے دیکھنا۔" اس پر پھر کھلکھلی مچی۔ دلہن اٹھ کر کھڑی ہوئی تو باجی ولایت نے عطر لگایا۔ ایک نے کہا "چشم بد دور خوب سجی ہے دلہن۔" باجی ولایت نے قمیص کو بغلوں کے نیچے سے کھینچ کر کہا "قمیص ذرا کھلی ہے۔ چنٹیں ٹھیک نہیں آئیں۔"

نصرت نے ہنس کر کہا "تو اپنی دے دو ایک باڈی دلہن کو۔ کیا ہرج ہے؟"

ایک عورت نے ایک بڑا ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا "اری ولایت، دلہن کو ابٹنا ذرا زیادہ دیا ہوتا۔ ہاتھ منہ دھونے میں ہی دھارہ گیا ہے۔"

"کہاں تھوڑا ہے بوا۔ تنا ابٹنا ملنے کے بعد پندرہ دن تک خوشبو نہ چھٹے گی بدن سے۔"

"ٹھیک کہا ہے باجی نے، جس چوکی پر باجی نہاتی ہیں، اس پر سے ابھی ابٹنے کی خوشبو آتی رہتی ہے۔" قہقہے، ہنسی اور کھلکھلاہٹ کے نقارخانے میں نواز کی آواز منمنائی۔

"ارے تو میرے ساتھ کب نہایا تھا؟" ہنستی ہنستی نصرت نے اپنی باہیں پیٹ لیں۔

اس ہجوم میں گھسے ہوئے نواز کی طرف بعض عورتوں نے اس طرح دیکھا تھا جیسے اس کی موجودگی کا انہیں اب احساس ہوا ہو حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے پاس کھڑا تھا۔

ایک عورت نے کہا "ارے نا جی تو کہاں آن گھسا ہے؟"

خالہ نفیسہ نے اپنے ساتھ لپٹا کر کہا "رہنے دو اسے یہ تو سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے۔ یہیں تو ایسی ایسی چیزیں کہہ دیتا ہے جو ہم کسی سے منگا نہیں سکتیں، کیوں ناجی؟"

اس فقرے کا لہجہ شرارت اور طنز سے بھرا ہوا تھا کہ اسے منہ چھپانے کے لئے اپنا سر خالہ کے پیٹ میں دینا پڑا تھا۔ پھر ہنستی کھیلتی عورتیں دلہن کو لے کر اس کمرے میں پہنچیں جو اس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ وہاں بھی کچھ عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ کمرے میں سلگتی ہوئی اگربتیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیل رہی تھی۔ ایک تخت پوش پر مصلیٰ بچھا تھا دوسرے پر کچھ چیزیں ڈھکی پڑی تھیں۔ سرخ لباس پہنی ہوئی دلہن کو چھپرکھٹ پر بٹھا دیا گیا۔ نصرت نے ڈھکی ہوئی چیزوں پر سے کپڑا اٹھا کر کہا تھا "دلہن یہ چیزیں پڑی ہیں، دیکھ لو۔" ایک چنگیر میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، ایک میں چھ ہارے، ایک ٹوکری مٹھائی سے بھری پڑی تھی۔ ان چیزوں پر توجہ دے کر نصرت نے پھر انہیں سرخ کپڑے سے ڈھک دیا۔

ہنستی ہوئی عورتیں سر جھکائی دلہن کو چھپرکھٹ پر تنہا چھوڑ کر باہر آگئیں۔ حویلی کے دوسرے حصے میں میراسنیں گا رہی تھیں۔ عورتوں کا ریلا سیدھا ادھر پہنچا۔ نواز دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ میراسنیں اس وقت کوئی نقل کر رہی تھیں۔ ایک سر پر پگڑی باندھے توے کی سیاہی سے مونچھیں بنائے مرد بنی ہوئی تھی اور دوسری نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ دونوں ناچتی اور گاتی تھیں۔ پگڑی والی میراسن کبھی کبھی ساڑھی والی کا منہ چومنے کو بڑھتی تو وہ کمر میں لچک ڈال کر علیحدہ ہو جاتی تھی۔ ڈھولک تیز تیز بج رہی تھی۔ گانے کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ کبھی کبھی پگڑی والی میراسن اپنے زیریں حصے کو اس طرح ہلاتی کہ مجلس زیر لب زیر لب قہقہہ بن جاتی تھی۔ عورتوں کے چہروں پر شریر مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں نواز کو ان کے چہرے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے۔ اسے ہر طرف سے نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک ڈیرہ میراسن جو قمیص کے نیچے بہت سے کپڑے ٹھونسے بڑا سا پیٹ بنائے آ دھمکی اور آتے ہی اپنے پیٹ کو پگڑی والی میراسن کے ساتھ ٹکرا کر اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگی۔ نواز کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس نقل کے دوران میں سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ جب کھلی تھی جب کوئی عورت اسے اٹھا رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا مجلس بہت مختصر سی رہ گئی تھی۔ کوئی عورت اس کا ہاتھ پکڑے ایک بستر میں لٹا گئی۔ اس کا جی ابھی اور جاگنے کو چاہتا تھا۔ اس نے لحاف میں سے منہ نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں دو پلنگ اور بچھے تھے جن پر کوئی لحاف اوڑھے سویا پڑا تھا۔ گانے والے کمرے میں سے ابھی تک ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔

وہ حیران سا ہو گیا کیونکہ میراثنیں اس لچر گیت کے آخری بول گا رہی تھیں جو اس نے بازاری لوگوں کو اکثر گاتے سنا تھا۔ اس کی نیند چند منٹوں کے لئے اُڑ گئی۔ ڈھولک پر تھاپ پڑنے کے ساتھ میراثنوں نے ایک اور فحش گانا شروع کر دیا تھا اور وہ حیرت میں ڈوبتا ڈوبتا نیند کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ جب اسے اپنی ٹانگیں کٹتی ہوئی محسوس ہوئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں ——"باجی! ——" "ہاں' ہاں سو جاؤ" باجی نے اسے بھینچ کر کہا۔ اس کی ٹانگیں باجی کی رانوں میں دب رہی تھیں۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے علیحدہ ہونا چاہا مگر اس کا ہاتھ الجھا ہوا تھا۔ باجی نے تو اس کی ٹانگوں کو آزاد کرتے ہوئے مری ہوئی آواز سے کہا "درد ہو رہا ہے۔" جب اس نے نواز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھ دیا تو نواز گھبرا سا گیا مگر اب اس کے لئے سوائے چپکی چپکی توند دبانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا اور باجی نواز کا ہاتھ پکڑ کر پیٹ پر اِدھر اُدھر رکھتی جا رہی تھی اور سوتا جاگتا نواز دباتا دباتا خواب سا دیکھنے لگا جیسے وہ رجو میاں کی پھولوں سے سجی موٹر کا ہارن بجا رہا ہے۔ یکایک ایک نئی سنسنی نے اسے بیدار کر دیا اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی اپنا ہاتھ کھینچا مگر باجی نے زور سے اس کا سر چوم کر کھینچ لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر باجی کی طرف دیکھا۔ سڑک کے بلب کی کمرے میں پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں باجی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی گہری گہری گرم گرم آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ نواز کو ایک نامعلوم ڈر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھا شاید پیٹ کا درد بڑھ رہا ہے۔ اس نے ہمدردی سے کہا "باجی!" مگر لفظ اس کے گلے میں پھنس گیا۔ باجی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ باجی اٹھ کر غسل خانہ میں چلی گئی۔ وہ سوچ رہا تھا —— باجی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بستر میں آن گھسی۔ نواز سمٹ کر ایک طرف ہو گیا مگر باجی اب لیٹ کر پھیکے اور بے رونق چہرے سے چھت کی طرف اسی طرح دیکھنے لگی تھی جس طرح اب نواز لیٹا ہوا چھت کی کڑیوں پر نظریں جما کر بچپن کے واقعات یاد کر رہا تھا۔

سیمبل کے تکیے کے نرم لمس نے آج اس کے ذہن میں کیا کیا پرانے نقشے نچانے شروع کر دیے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جیسے اس کی زندگی اسی ہاتھ میں منجمد ہو گئی تھی یا جیسے اس کی موجودہ زندگی کا ذمہ دار صرف یہی ہاتھ تھا۔ اس نے سگریٹ کے باقیماندہ حصے کو انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا اور نیا سگریٹ سلگایا۔ یہ سگریٹ پینے کی عادت بھی اسے کالج میں خواہ مخواہ ہی پڑ گئی تھی۔ کالج کے لڑکے کتنے شریر تھے۔ اگر وہ سگریٹ پینے سے انکار کر دیتا تو وہ کہتے "یہ یہ گھونگو ہے۔ یہ کھاتا بھی کتاب ہے' پیتا بھی کتاب ہے۔ ہم نے اس کا نام یونہی تو نہیں رکھا ہوا' نواز گھونگو" —— آخر اس نے مجبور ہو کر پیش کئے ہوئے سگریٹ قبول کر لینے میں ہی اپنی خیر سمجھی تھی۔ اس کی واقفیت محدودے چند لڑکوں سے تھی۔ جب وہ اپنی محبت کے کارنامے بیان کرتے تو وہ حیرت سے سنا کرتا اور جب وہ کسی لڑکی کو چھیڑتے تو وہ تھر تھر کانپنے لگتا۔ ایک کہتا "ارے نواز تم بھی کوئی آپ بیتی سناؤ۔"

اس سوال پر وہ ہمیشہ خفیف سا ہو جاتا۔ "یہ تو بس گھونگو ہے گھونگو" دوسرا کہتا اور بات ٹل جاتی۔ اب جب وہ کالج میں تھا' اسے اپنی آپ بیتی کے خاکے میں کچھ جان پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ واقعات نے اس کے ایف۔ اے تک پہنچتے پہنچتے ایسی کروٹ لے لی تھی جس کی اسے کبھی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بھابی کو خالق کے لئے باجی ولایت نے نجمی کا رشتہ دے دیا تھا اور سب سے بڑے بھائی نے اس پر صاد کیا۔ خالق نواز سے بڑا تھا۔ بی۔ اے پاس نوکر چاکر نجمی کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک مدت کے بعد اس شادی پر وطن جانا پڑا تھا۔ باجی کے خاوند کی اگرچہ اس سے اَن بن تھی مگر جب تک وہ آیا نہ تھا باجی کتنی اداس اداس نظر آتی تھی اور اس کا اداس چہرہ دیکھ کر نواز کا جی کتنا جلتا تھا۔ اس کو اب باجی ولایت کے ہونٹ بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ ہونٹ بھی کیسے تھے۔ عجیب عجیب آگے کو بڑھ کر نیچے کو مڑے ہوئے جیسے ابھری ہوئی گلاب کی پتیاں سُرخ سُرخ شاداب سی۔ جب وہ خالق بھائی کو دعائیں دیتی اور اس کے واری نیارے جاتی تو نواز کو یہ بات بُری سی لگتی جیسے ان دعاؤں پر پہلے اس کا قبضہ تھا اور اب خالق بھائی نے قبضہ جما لیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر آپ ہی آپ نادم ہو جاتا کہ وہ اس کا داماد ہے۔ اس کی بلائیں نہ لے گی باجی تو اور کس کی لے گی۔ مگر اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بھی وہ گوارا ہی نہ کر سکتا تھا یہ باتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باجی'

اپنے فرض سے کوتاہی کر رہی ہے جیسے اس گڑھے کو بھرنا باجی کا فرض تھا جو وہ اپنی یتیم روح میں محسوس کر رہا تھا۔ بی۔ اے میں داخل ہوئے ابھی پورا سال بھی نہ ہوا تھا کہ اسے بھائی کی کوششوں سے ملازمت مل گئی۔ اس بے روزگاری کے زمانہ میں ملازمت کا ملنا معجزے کم نہ تھا۔

اس نے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے سوچا۔ ظہیر نے سچ کہا ہے لاہور کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی دیکھ کر دل تڑپنے لگتا ہے اور شباب کی ملکارشن کو واقعی قدم تھم جاتے ہیں۔ شباب۔ شباب بھی کیا بلا ہوتا ہے۔ ان دنوں اسے نامعلوم کیا ہو گیا تھا جیسے اس کی آنکھوں پہ عینک لگ گئی تھی جس کے شیشوں میں سے ہر چیز اسے خوبصورت نظر آتی تھی۔ ہر نسوانی چہرہ اسے حسین و جمیل نظر آتا تھا، کبھی کبھی تو بدصورتی بھی اسے حسن اور دلکشی کا پرتو لئے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ سانولے اور زیتونی چہروں کو چھپنے اور سفید چہروں پہ سگریٹ کے دھوئیں کی چھتریں مانے کی عجیب سی خواہش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی اور جب وہ کسی مرد اور عورت کو سگرٹ پیتے دیکھتا تو اس کا شدت کے ساتھ جی چاہتا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی عورت ہو اور وہ بھی دیا سلائی جلا کر اس کے ہونٹوں تک لے جائے اور پھر عورت کے ہونٹ اس ہلکی سی روشنی میں سرخ سرخ شعلے نظر آئیں۔ سینما میں کبھی کبھی اس سے ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ اگر قریب بیٹھی ہوئی عورت کے منہ سے نکلا ہوا سگریٹ کا دھواں اس کی طرف آتا تو وہ اپنے سانس کے زور سے اندر کھینچنے لگتا۔ اسے عجیب عجیب بے ہنگم سے خواب آتے تھے مثلاً اسے اپنی ممانی جنگل بیابان میں نظر آتی ہے۔ جب وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا کہ یہ جنگل میں کیا لینے آئی ہے تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور اس کے گدگدانے کے بعد سے تعجب سے پکارتی رہتی۔ ایک روز اسے کسی کام کے سلسلہ میں ایک رئیس زادے کے ہاں جانا پڑا تھا جس کے بچھے ہوئے صاف ستھرے بستر پہ چار تکیے دیکھ کر اسے تعجب ہوا تھا۔ دو سرہانے کی طرف پڑے تھے۔ ایک دائیں، ایک بائیں۔ اس نے انہیں چھو کر دیکھا۔ ان میں سیمبل بھری تھی اور وہ نرم نرم مس ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ اس نے وہیں تہیہ کر لیا اور وہ تنخواہ پاتے ہی بازار سے سیمبل کے چار تکیے خرید لایا تھا۔ دونوں طرف کروٹ لیتے پر وہ نرم نرم تکیوں کو اپنے ساتھ لٹا لیا کرتا۔ اس کی انگلیاں کس طرح ان میں دھنس جاتی تھیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بیقرار جوان کی بڑھتی ہوئی حرارت کسی تسکین کی جویاں تھی۔ جب وہ خالی الذہن ہوتا تو رجو بیاں کی شادی والی رات کا واقعہ کسی خفیہ کمین گاہ سے نکل کر اس کے دل پہ ٹھونگیں سی مارنے لگتا تھا اور اسے یقین ہو جاتا کہ وہ واقعہ اس کے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہو چکا ہے اس کا جی چاہتا کہ باجی اب پھر کسی موقع پر اسے لپٹے ساتھ سلا کر اس کی ٹانگوں کو اپنی زندگی بھری رانوں میں دبا لے مگر اسے ان خیالوں سے شرم بھی آنے لگتی اور وہ سوچتا باجی اس کے بھائی کی خوشدامن بن چکی ہے۔ بھائی کو اگر ان خیالوں کا پتہ چل جائے تو کیا ہو۔ جتنا وہ ان خیالوں سے بچتا اتنا ہی یہ اس کے سر پہ عنبر بن کر سوار ہو جاتے اور جذبات کی فسوں کاری اسے دم نہ لینے دیتی۔ باجی کے سینے کی کامل گولائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتیں جیسے باجی نے اس کی جوانی پر کوئی افسوں پھونک دیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ باجی اس کے اندر سے نہیں نکل سکتی وہ تو اس کی ہڈیوں میں نفوذ کر گئی تھی، تو اس نے ہتھیار ڈال دئے اور کھلم کھلا اوٹ پٹانگ خیالات کے ہاتھ میں ہاتھ ملا کر اس لطافت گریزاں کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا جو اس کے نفس کے دروازے پہ بیباک دستک دے کر کہیں فضا میں گم ہو گئی تھی اور جسے نہ پا کر اس کی ترستی ہوئی روح ایک پیاسا اور مضطرب درد محسوس کرنے لگی تھی۔ باجی کے بھرے بھرے تیلیے بدن کا گرم اور معطر دباؤ، اس کے کسے ہوئے چھوٹے سے پیٹ کی چکناہٹ اور اس کی بے باکانہ اور سجیلی حرکات کی یاد اس کی جوانی کا محور تھی۔ اسے خیال آتا اگر باجی اسے کبھی ملی تو وہ اس سے کہہ دے گا۔ باجی تمہیں معلوم نہیں کہ تم میں کتنی طاقت ہے۔ وہ سوچتا باجی کو کیا شاید سب ہی عورتوں کو پتہ نہیں کہ ان میں کتنی طاقت ہے۔ دماغ کی بے بسیوں اور دل کی حکمرانیوں سے اس کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ مسرت کے دروازے پر سے ترسی ہوئی روح ان دنوں اس کی آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ جب کی بات ہے جب اسے خالق بھائی کا بمبئی سے خط آیا تھا کہ اگر تمہاری صحت ابھی تک اچھی نہیں ہوئی تو چھٹی لے کر بمبئی آ جاؤ۔ باجی اور زرینہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ یہ خط پا کر اسے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ خالق بھائی نے اگرچہ

پہلے بھی بمبئی آنے کے لئے اسے کئی بار لکھا تھا مگر اب کے تو اس نے ذرا دیر نہ کی اور دو مہینے کی رخصت لے کر بمبئی پہنچ گیا۔

خالق بھائی کے پاس چھوٹا سا فلیٹ تھا صرف دو کمرے اور ایک غسلخانہ، اور رہنے والے پانچ شخص۔ خالق، ان کی بیوی، باجی، ولایت، زرینہ اور نواز۔ ایک کمرہ خالق اور بھی کے دو پلنگوں سے ہی بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا اور دوسرے میں سنگار میز اور چند کرسیاں بچھی تھیں۔ رات کو زرینہ نے اس کمرے کی کرسیاں تہ کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیں اور کونے میں سے لپٹے ہوئے بستر نکال کر بچھانے لگی۔ موٹے موٹے دو گدے ان پر سفید چادریں اور تکیے۔ جب وہ اپنا اور باجی کا بستر بچھا چکی تو نواز کے بستر کی طرف بڑھی "بڑے نفیس تکیے ہیں آپ کے نواز بھائی" اس نے نواز کے بستر پر تکیے رکھتے ہوئے "مگر ایں!! چار تکیے؟" اس نے مذاق اور حیرت کے ملے جلے تبسم سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور باجی بھی مسکرا دی تھی "یہ بیمبل سر کے نیچے سے کھسک جاتی ہے اور مجھے نیچے تکیے تو نیند نہیں آتی ــــ"

"اچھا یہ بات ہے!" جھکی ہوئی زرینہ نے اپنا کھسکتا دوپٹہ سنبھال کر کہا۔ زرینہ اب خاصی جوان ہو چکی تھی۔ اس کی لمبی لمبی چٹیا کتنی موٹی تھی ساری گردن کو ڈھک رکھا تھا اس نے۔

بیچ میں باجی کا بستر تھا۔ دیوار کی طرف زرینہ کا اور دروازے کی طرف نواز کا۔ بستر فرش پر ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ نواز لیٹا ہوا تھا اور باجی اس کی طرف پشت کئے سنگار میز کے سامنے کھڑی منہ پر کریم مل رہی تھی۔ اس وقت اس کی پیٹھ کا اتار کتنا خوبصورت لگا تھا نواز کو اور کہنی کے پاس جو ڈمپل پڑ رہا تھا خاکستری رنگ کا۔ اس کا جی چاہتا تھا باجی کی کلائی پر پنجے گاڑ دے اور اس داغ کو چوم لے ــــ باجی جب اس کے پاس لیٹ گئی تھی تو وہ اسے اپنے ارمان کی طرح ایک نئی اور تازہ سی معلوم ہو رہی تھی۔

اگلے روز وہ تیار ہو کر سیر کے لئے نکلے تھے۔ باجی کی قمیص پر درزی نے کتنی اچھی چنٹیں دے رکھی تھیں جیسے خرگوش کے چھوٹے چھوٹے ننھے بچے پھدک رہے ہوں۔

"باجی آپ کو سفید لباس بہت اچھا لگتا ہے" یہ الفاظ اس کے منہ سے آپ ہی آپ نکل گئے۔

"فرخ نے بھی کل یہی کہا تھا، کیوں امی؟" زرینہ نے ٹانگ اڑائی۔

"فرخ کون ہے؟"

باجی بولی "فرخ زرینہ کی سہیلی ہے۔ ہمارے اوپر کے فلیٹ میں بھی کوئی پنجابی رہتے ہیں۔ ان کی بیٹی کا نام فرخ ہے۔ اکیلی اولاد ہے بڑے چاؤ چونچلے ہوتے ہیں اس کے۔ زرینہ سے اس کا بڑا پیار ہو گیا ہے۔ یہ تو کئی کئی راتیں اور دن اس کے پاس گذارتی ہے۔"

"اس نے ہماری دعوت بھی کی تھی۔" زرینہ نے کہا تھا مگر نواز نے یہ بات ان سنی کر دی تھی۔

نواز کو چند دنوں کے بعد یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک تکان، ایک اداسی بے کلی نے ڈیرے ڈال لئے ہوں مگر باجی کی غلافی آنکھوں میں وہی پرانی ساحرانہ گھلاوٹ موجود تھی بلکہ اب وہاں پلکوں کی چلمن میں ایک سحر رقیق کبھی اندر چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالتوں میں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب یہ نشے میں لپٹا ہوا جادو پلکوں کی چلمن سے جھانکتا تو وہ اپنی ہونٹوں کو اکٹھا کر رہا ہوتا کہ وہ سحر رقیق پھر چلمن کے پیچھے جا چھپتا اور اسے باجی کی غلافی آنکھیں اسی طرح ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگتیں جس طرح چوپاٹی کا ساحل پانی کا ریلا چلے جانے کے بعد نارمل حالت میں نظر آنے لگتا تھا ــــ وہ غسل خانہ میں باجی کو دروازے کی اوٹ میں سے صابن دانی بھی پکڑا چکا تھا۔ باجی اپنے جوڑے پر اس سے بیشتر پن بھی لگوا چکی تھی اور ایک شام جب وہ کرافورڈ مارکیٹ کے پاس کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے وہ جا کر جوڑے پر لگانے والے گندھے ہوئے پھول لے آیا تھا جو اس نے مرہٹہ عورتوں کو لگائے ہوئے دیکھا تھا۔ باجی نے پھول ہاتھ میں پکڑ کر اس کی طرف پیٹھ موڑ دی تھی۔ جب وہ باجی کے جوڑے پر پھول لگا چکا تھا تو زرینہ نے پھولوں کا دوسرا نصف حصہ باجی سے پکڑ کر خود اپنے

بالوں پر لگانا چاہا تھا مگر باجی نے پھول نواز کے ہاتھ میں دے کر کہا تھا "جوڑا باپ ہے وہی لگائے گا" چنانچہ زرینہ کو بھی اپنے بالوں پہ پھول نواز سے ہی لگوانے پڑتے تھے۔ اس کو باجی کا کام کر کے اب بھی ویسی ہی خوشی ہوتی تھی مگر اس خوشی کے ساتھ اب اسے بے چینی سی بھی ہونے لگتی تھی۔ ایک بار جب ان کی کریم بوری بندر کے پاس ٹھہری تھی تو نواز نے ایک گھاٹن کی طرف دو تین بار دیکھا تھا۔ اس کے سینے کی گولائیاں باجی کی چھاتیوں کی طرح سڈول تھیں اور باجی نے ایک دم پوچھ لیا تھا "بڑا دیکھ رہے ہو، کیا ہے اس عورت میں؟" اس بیباک سوال پر وہ گھبرا سا گیا تھا مگر اس نے ہمت کر کے کہہ دیا تھا "کچھ نہیں، دیکھئے باجی! کتنا متناسب بدن ہے اس کا!" اس پر باجی نے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا "کیا تمہیں ایسا بدن پسند ہے؟" یہ غیر متوقع جواب سن کر نواز کے بدن پر چیونٹیاں سی دوڑ گئی تھیں۔ اس نے ڈر کر کنکھیوں سے اُدھر دیکھا جدھر زرینہ اور نجمہ بیٹھی تھیں مگر وہ دونوں باہر دیکھ رہی تھیں — پھر ایک روز باجی کہنے لگی "زرینہ تیری بچپن کی عادت نہ گئی۔ کس طرح سوتی ہے رات کو۔ ٹانگیں مار مار کے میرا بُرا حال کر دیتی ہے۔ یوں دھکیلنے لگتی ہے مجھے میں نا بھی بچارے پہ جا چڑھتی ہوں۔" اگلی رات نواز کی آنکھ کھلی تو باجی واقعی نواز کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ نواز سوچنے لگا کیا کرے۔ اور آگے کھسکتا تو گدے سے نیچے فرش تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سکیڑ کر کہا۔ "باجی! باجی! دیکھئے آپ کھسک کر کہاں آ گئی ہیں۔" باجی نے نیند بھری آواز میں کہا "مجھے سردی لگ رہی ہے۔" اور نواز کی رضائی میں گھس آئیں —— چند منٹ کے بعد باجی کے بازو پر نواز کا سر تھا اور اس کے دل میں یہ خیال "باجی کتنی اچھی ماں بن سکتی ہے" عجیب عجیب نئی نئی صورتیں بدل رہا تھا۔

اگلے روز زرینہ کی سہیلی فرخ کا سر دکھتا رہا تھا اور زرینہ سارا دن اس کے پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی تھی۔ شام کا کھانا بھی اس نے اُدھر ہی کھایا تھا اور اپنی سہیلی کے پاس ہی سو گئی تھی۔ اس رات نواز نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ارادوں اور جرأتوں نے ہلکورے کھانے چھوڑ دیئے تھے۔ نئی حوصلہ افزائیاں سنسنیوں کے نئے ریلے پیدا کر رہی تھیں اور وہ باجی کے زیرِ جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پا رہا تھا۔ کمرے کے گاڑھے اندھیرے میں باجی کی گھٹی گھٹی آوازیں تحلیل ہو رہی تھیں۔ نواز کے خشک ہونٹوں کے راستے اس کے سارے بدن میں رس اتر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قوس قزح کے خوبصورت رنگوں میں سے گزرتا ہوا چاند کے پاس پہنچ رہا تھا۔ پھر ایک خوش آیند غنودگی اس پر چھانے لگی تھی اور وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی باجی کو اپنے ساتھ لگا کر سو گیا تھا۔

خالق بھائی تو اپنے کام پر جا کر شام کو لوٹتے تھے۔ بچی کو ان کے آنے کا انتظار، دوپہر گھر کا سو کام کاج۔ زرینہ کو پیار کرنے والی سہیلی مل گئی تھی۔ اکثر شام کو نواز اور باجی ولایت ہی سیر کرنے جاتے تھے۔ نواز بمبئی اور ولایت دونوں کی سیر کرتا رہا اور ولایت کیسے کیسے عمدہ اور نفیس کپڑے پہن کر اس کے ساتھ پھرتی۔ یہ بمبئی کتنا اچھا شہر تھا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپالو بندر پر گھومتے یا چوپاٹی کی گیلی گیلی ریت پر پھرتے کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ عورت کتنی محفوظ تھی وہاں اور پہلی بار جب دونوں نے جا کر ریسٹوران میں چائے پی تھی تو نواز نے کتنا اصرار کر کے باجی کو سگریٹ پلایا تھا اور وہ کتنی پیاری لگی تھی۔ اس کے ابھرے ہوئے مڑے مڑے ہونٹوں میں سگریٹ کتنا اچھا لگتا تھا اور ہونٹ سے ہونٹ لگنے پر کس طرح اس کی آنکھوں کی پلکوں کی چلمن سے سحر رقص جھانکنے لگتا تھا اور وہ بے قابو ہو جاتی تھی۔ وہ اس کی ایسی ایسی رگوں اور پٹھوں کو گدگداتی تھی کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا تھا کہ زمین آسمان کے بیچ میں گدگدی ہی گدگدی بھری پڑی تھی۔ لاہور جا کر وہ کس قدر شدت کے ساتھ چاہتا رہا تھا کہ وہی سنسناہٹ پھر پھر اس کے خون میں دوڑتی چلی جائے، اور اس کی پھریریاں اسے پھر بے چین کر دیں مگر اسے اطمینان تھا کہ اب باجی اس کی اپنی تھی اور اپنی ہی رہے گی کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کر لے گا اور یہی ایک طریقہ تھا باجی کے ساتھ تعلق استوار رکھنے کا —— اور جب اسے خالق بھائی نے لکھا تھا کہ تمہارا اس رشتہ کے متعلق کیا خیال ہے تو اس نے جھٹ رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ زرینہ بھی کٹاکٹ بولتی ریڈی ہو گی مگر تب دانتوں تلے آئی تو سیلی ہوئی۔ ماں کا بالکل عکس، سرد اور بے حس۔ مگر بے چاری اپنی نشانی چھوڑ کر خود چل بسی۔ تخیل کی سحر کاری کی ان مٹتی ہوئی کرنوں میں نواز نے کروٹ لے کر ساتھ والے پلنگ پر نظر ڈالی۔ ڈھائی برس کی ننھی منی بچی

لحاف میں پڑی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ نواز پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا مگر اب چھت کی کڑیوں سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے ان کڑیوں نے اس کے تمام رازوں کو اپنے اندر بھینچ رکھا ہو اور وہ جب چاہیں افشا کر دیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک لمبی بھاری بھرکم نعش کی طرح پھیلے ہوئے کوہ مُردار کی بلندیاں اسے فضا کی مٹی مٹی روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔ ملازم لڑکا جو نیچے ڈیوڑھی میں اپنا کوٹ رہا تھا مدت سے دھماکوں کی آواز ختم کر کے سو چکا تھا۔ اس نے سوچا، "باہر محلہ اتنی دور تو نہیں مگر عورتیں جب بیٹھ جائیں تو کب اٹھتی ہیں۔" وہ آ کر پھر بیٹھ گیا۔ رازوں سے آگاہ چھت کی کڑیاں اسے پھر گھورنے لگیں جیسے وہ اُگل دینا چاہتی تھیں، سب کچھ جو وہ دیکھتی رہی تھیں۔ اس نے کروٹ لے لی۔ سامنے کھونٹی پر دو باڈیاں ٹنگی تھیں ان کے پاس ہی تازہ اتری ہوئی سفید قمیص لٹکی تھی جس کی سطح پر چھوٹے چھوٹے ابھرے ہوئے شکن پہننے والی کے جسم کے کئی حصوں کی غمازی کر رہے تھے، وہ ہمیشہ بھینچی بھینچی فٹ قمیص پہنتی اور جب اتارتی تو اس پر سے سانپ کی اتری ہوئی کینچلی کی طرح اس کے گٹھیلے بدن کا ایک ایک پٹھا گنا جا سکتا تھا۔ تخت پر علیحدہ علیحدہ کئے دھوبی کے دُھلے کپڑے پڑے تھے جن میں مختلف ڈیزائن کی باڈیوں کا ڈھیر ننھی بچی کے کُرتوں کے برابر تھا۔ اس نے سوچا خیالوں کا اُڑن کھٹولا اسے آج کہاں کہاں لئے پھر رہا ہے اور جب اسے یاد آیا کہ وہ بڑا کہاں سے تھا تو اس نے سوچا کہ اسے ظہیر کی باتوں کی تائید کرنی چاہئے تھی۔ اس نے دل سے کہا۔ آج تو اس نے کسی پارٹی کا ساتھ نہیں دیا، بالکل غیر جانبدار رہا تھا۔ ہاں اگر کل ظہیر نے یہی باتیں دہرائیں کہ عورت اچھی بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ اور اگر بدنشیں بھی اتر جائیں تو عورت جیسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ولایت نے میلاد شریف کی شیرینی کا لفافہ تخت پر رکھتے ہوئے اک انداز سے کہا "ابھی تک آپ جاگ رہے ہیں؟"

سمبل کے تکیوں کو سر کے نیچے سمیٹتا ہوا نواز یوں اٹھ بیٹھا گویا بالکل خالی الذہن تھا "تمہارے انتظار میں جاگ رہا تھا!"

ولایت کی غلافی آنکھوں میں سے ایک گدلاہٹ نے جھانکا اور وہ مسکرا کر آئینے میں اپنا آپ دیکھنے لگی۔

شکیلہ اختر

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی۔ دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور سبب اس کی زندگی کا دُوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی کی سریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پہ چھائی رہتی۔ اس کی سجائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے جاتے موٹروں سے وہ اُکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھچ جاتے، برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دُوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ موٹی موٹی لال پیلی جلدوں کی کتابیں دبائے۔ کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بلّے اور گیند لئے ٹینس لان پر اچکنے لگتے۔ اور ہر روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے رہتے۔ ڈرائنگ روم برآمدہ اور کبھی کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیض باذوق ادیب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھا جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں۔ کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہیں دوڑائی جاتیں، گہرے اور دقیق مسئلوں اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے۔ قہقہے گونجتے، ہنسی کی لہریں اٹھتیں۔ اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو ایک بے تھاہ وسیع خلا میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصے تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو ڈبو دیتی رہی تھی، دیر دیر تک پردے کے پیچھے کسی کے دریچے پر بیٹھی ان کی باتیں سنتی، ان کے تماشے دیکھتی۔ اور بیل کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے اور چائے سے ان کی خاطر تواضع کرتی رہتی تھی۔ پس پردہ اس نے ان رنگینیوں میں اپنے آپ کو ملانا چاہا تھا۔ مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہراہ پہ ایک پُر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گذار کر اب تھک گئی تھی۔ تاش کے پتّے، کیرم کی گٹیاں، کھٹ اور مونوپلی کی بازی میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی شکست دیکھ رہی تھی۔ بلّے اور گیند کی ہر ایک

ضرب نے اس سے دل کو مجروح کر دیا تھا ادادب، دنیا، اور نظام حیات کے گہرے گہرے تبصروں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے ہونے ہوتے بھی وہ خود ایک اجاڑ بیابان میں ایک اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی۔ اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ، کتنا گھٹ گھٹ کے اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ رن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہتی تھی۔ مگر ان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا، ایک مدت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھر گئی تھیں۔ آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت ظروف پر مہین مہین گرد سے دیکھ کر بھی اب وہ بے پروا رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں رنگ برنگ کی لکڑی کی اور مٹی کی گڑیاں، جنگلے کپڑے بٹنے کی طرح گال گراب پھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں مگر وہ بے حس و حرکت تھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا لکڑی کی ایک بے جان گڑیا ہے۔ اس پر بھی ایک جگہ بیٹ گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی صورت کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں، اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ...... خراشیں اس کے دل پر پڑ گئی تھیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مردنی سی بے حس مسکراہٹ، اب تک وہ انجان طور پر ایک بچے کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی گلدانوں، اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے۔ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی بے اختیار یہ چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھونکا رہے، اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبا بانس لے کر ان چمکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ تاڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ بیزار و کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگار دان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے۔ اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک حصے میں وہ رسی کی بھدی بھدی الگنی ٹانگ کر ان پر ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دے عجیب عجیب طرح سے بے ہنگم کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بے کاری کھلتی رہتی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اٹھ کر اکیلی کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی۔ ڈاکیہ کی آواز سنتے ہی وہ خود ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری والی، دھوبن اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ کی مہمل باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی مگر ایسا کرتے ہوئے اس کی خود داری کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پر کھڑی رہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی ——— !

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو تھے۔ خوبصورت نازک سے، خوش نظر اور خوش سلیقہ، ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونا گلزار جنت بنا رہتا جنہیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا۔ وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول لگتیں! وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے۔ شگفتہ، خوبصورت رنگین اور خاموش ——— ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا! مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آگیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی، وہ بلا پتلا حسین سا بچہ جب خود نہا کر سے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہو کے "ماں" "ماں" کہہ کر شور مچانے لگتا تو ایک دن پروین اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو امی ..... اور میرا اس نام گلاب" وہیں امی نے ننھا تھا ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے تختے کو پکڑے وہ ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پروین کی امی امی کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اس کے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اوپر سے اچک اچک کر چیخنے لگا۔ "امی! امی!" پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب اپنا سبق یاد کر رہا ہے، نہیں ماں! مس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی امی کہہ کر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اٹھنے

دل میں پیدا ہوئی ۔ "امی ۔ امی" یہی پیاری سی آواز سننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی ۔۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی رُوح میں پُرخلش انگڑائیاں آچکی تھیں مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پر بیدار کر دیا تھا ۔ یاقوت کی طرح سُرخ لب اور چمکیلی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی ۔۔ "میرا گلاب ۔ میرا گلاب" ۔ وہ اس کے سارے گھر بھر میں ایک تیتری کی طرح منڈلاتا رہتا ۔ اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کسی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کس کا بچہ تھا ——— ! اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی رُوح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا ۔ !

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا ۔ مرتے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہلچل مچا دی تھی ۔ اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ——— "امی ۔۔ امی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی "——— ——— گلاب! تم گلاب ہو نا ! اور تمہیں ایک ننھا چمپا کا پھول دوں گی ، لوگے نا ؟" ——— پھر اس کی نگاہیں چمپا کے اس حسین سے پھول کے تصور پر جم جاتیں ۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ ۔ بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں ، سر پر اسی کی طرح گھنگریالے بال ، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا کانپتا ہوا ہونٹ" ——— یہ سب کیا ہو رہا تھا ۔ کیسے ہو رہا تھا ۔ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی ۔ اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے ۔

فیض نے جب یہ خبر سُنی مسرت سے وہ جھوم گیا ۔ پھر اس کی بڑی بڑی خاطریں ہونے لگیں اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ سُرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے ۔ فیض حُسن کا پرستار اور شعر و ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا ۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی ہوئی پروین کی نگاہوں کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور انہی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے اس آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ——— !

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوئے تھے جیسے میں دو دو ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہ تھی ۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں ۔۔ شاید عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے ۔ اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جُگ نہ بیت جاتا تو چمپا کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا ۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا ۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کانٹے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا ۔ گلاب کے لئے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پُرسکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کبھی قصور پر بلا کہے سُنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونے میں کھڑا ہو جاتا ۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا ——— "امی ! امی !" اور پروین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی ——— پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا ——— "امی! امی! ہم کو مار ۔ بہت بہت" ۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک لطیف انتظار تھا ۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اس کے پاس چکر لگاتے ۔ کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دُور ۔ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اس کی رُوح سے سرگوشیاں کرتے "چمپا ہی پھول" اسے ٹیگور کی کہانی یاد دلا دیتی پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اس کے بہت سے بھولے جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے "امی تا !" ——— ! اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ——— "امی تا" ——— "امی تا" ——— لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانہ کی وہ بچی یاد آ جاتی جسے تابوت نہ آتا تھا

اور وہ الماری، شلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امی جیکو" —— "امی جیکو" اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں سر کو دھنتی "امی جیکو" "امی جیکو" کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی۔ اور اب بھی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی، سارے دکھ خوشی تھے زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ رہی تھی —— وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابیاں مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے سارے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید۔ شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی —— اس کی کمرے کے چاروں طرف دیوار میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لا کر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی جگنو جھاگ کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا —— پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اس کے تھے صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے، بلکتے اور ہمکتے ہوئے ننھے سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جا کر پھولے پھولے گالوں اور ہلتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے بچے بہت دن ہوئے کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھا لوں"۔ —— سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتظام کرتی —— تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چرکے لگاتی رہی ہیں۔ اب یہ دیوار ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے، دودھ کی شیشی رہے گی پوڑوں کی بوتلیں رہیں گی اور دکھتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف، اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی، وہ اس کوٹھی کا منہ چڑا چڑا کر بہت سی لنگی ٹانگے گی اور ان کے سروں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی ترتیب اور صفائی سے وہ تھک گئی تھی۔ اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی —— گلاب بہت زیادہ نزدیک رہ کر اب اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ دمکتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے کبھی تصویر میں چھپی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کہتی "امی! امی" کہتا ہوا اس کے کلیجے سے لپٹ جاتا۔ مگر کبھی یاس کے مہیب ناگ جھولے میں اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا "ہاں" — "نہیں" —! جھولے کی پرانی رسی پر ایک پینگ لینے پر مچل رہی تھی اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں" اور "نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ مچلتا ہوا رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گزرتی ہوئی بھی "ہاں" کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے —!

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی ملی گھر آ کر باپ نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھر آتے ہی باپ کا غصہ برداشت نہ رہا وہ زور سے چلائے؟ "نکلو یہاں سے: نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا پچھلے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں، اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے زور زور سے بھینچ کر پیار کرتی تھی گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چیونٹیاں پکڑ کے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلدان چھن سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اٹھے اور وہ لپٹنے کو ماں کو بیٹے کو سنبھال کر اچھوتے کو چاہا۔ ہاتھ کہ پروین دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا "میرا بچہ! میرا لال!" پروین کو آج یہ پہلی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی — گلاب کے لئے اس کے تصور پر پروین کا تمنا بیتابانہ پیار

ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا: "امی! امی!"

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی۔ امیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پرانی کچپاتی ہوئی رسی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی "ہاں"، "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کی روح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چوترے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں مٹتی، ملتی اور تھکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امی تا" اور اس کی دیوانہ وار روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور بڑھتا جا رہا تھا "امی تا" "امی" اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی ——— ! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی اور پروین کے بے بس ہاتھ "امی تا" کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میرے بچے میرے لال!"

ہنس راج رہبر

اب اور تب

شربتی کا سر ننگا تھا۔ اور بال قدرے بکھرے ہوئے تھے۔ جنھیں وہ بائیں ہاتھ سے گاہے گاہے درست کر لیتی تھی۔ ورنہ اس کی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ ماحول سے بے نیاز وہ رضائیاں سینے میں منہمک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دن بھر محنت کر کے وہ جتنی رضائیوں میں دھاگے ڈال دیگی اُتنے ہی پیسے اسے مل جائیں گے۔ پہلے روز وہ بمشکل ایک رضائی میں دھاگے ڈال سکی تھی۔ لیکن اب دو میں ڈال لیتی تھی۔ اور اپنے کام کی رفتار اس سے کم ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس کا ہاتھ جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اسے تن کی سدھ بدھ بھول گئی تھی۔ وہ ایک قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اور رضائی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھی۔ جہاں بیٹھ کر اس نے کام شروع کیا تھا۔ دوپٹہ وہیں زمین پر پڑا رہ گیا تھا جس کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔ کیونکہ سر کو ڈھانپنے کی فکر کرنے سے کام میں ہرج واقع ہوتا تھا۔ کام ادھورا رہنے سے ٹھیکیدار آدھی مزدوری کاٹ لیتا تھا۔

سرکار فوج کے لئے رضائیاں تیار کروا رہی تھی۔ کام ٹھیکے پر ہو رہا تھا۔ روئی بھرنے کے بعد انھیں سینا درکار تھا۔ چنانچہ قرول باغ کے مغربی کونے پر جو نئی بستی آباد ہوئی ہے وہاں ایک کھلے میدان میں رضائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور سینکڑوں عورتیں ان میں دھاگے ڈالنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثریت مزدور عورتوں کی تھی۔ جو برسوں اور پشتوں سے مزدوری کرتی چلی آ رہی تھیں اس لئے محنت مزدوری کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اس کام میں انھیں ذرا بھی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اطمینان سے رضائیاں سی رہی تھیں، اور ان کے بچے قریب ہی کھیل رہے تھے۔

لیکن ان میں کافی تعداد ایسی عورتوں کی بھی تھی جنھوں نے پہلے پہل اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ محنت کو اُجرت میں تبدیل کرنے کا ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ انھیں اس جگہ تک پہنچنے میں بہت کچھ ذہنی تذبذب اور روحانی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور جب آ گئی تھیں تو ان پر ایک غیر قدرتی احساس طاری تھا۔ سانس پھولی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی دیوار پھاندنا پڑی ہو، بہت سے اصول توڑے ہوں۔

شربتی بھی ایسی ہی عورت تھی اس نے بہت ہی ناسازگار حالات میں محنت مزدوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور جب پہلے روز اپنے خاوند کرپارام سے کام پر آنے کی اجازت طلب کی تھی تو اس پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔ جیسے اس کی روح کو بجلی نے چھو دیا ہو۔ اس پر کافی دیر تک سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ جب شربتی نے اپنی بات ایک بار پھر دہرائی تو اس نے بے بس اور مغموم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ رہ گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ جب شربتی چلی گئی تو وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا نہ معلوم کیا سوچتا رہا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا اور جھنجھلاتا رہا۔

کرپارام مغربی پنجاب سے اُجڑ کر دہلی آیا تھا۔ کافی دیر تک وہ شرنارتھی کہلاتا رہا۔ لیکن اسے اور اس کے اکثر بھائیوں کو اس نام سے چڑ تھی۔ کیونکہ وہ کسی کی شرن میں نہیں آئے تھے۔ وقت کی ایک طوفانی اور خوفناک لہر نے انھیں یہاں لا پھینکا تھا۔ اس لئے حکومت نے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اُنھیں پرشارتھی کہنا شروع کر دیا۔ لیکن کرپارام کو یہ نام بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ نام اور الفاظ کیا اسے اپنی موجودہ زندگی تک سے کوئی اُنس نہیں تھا۔ وہ صرف کرپارام تھا۔ اور اسے اکثر اپنا ماضی یاد آتا تھا۔

میانوالی ضلع کے ایک گاؤں کلور کوٹ میں اس کی دوکان تھی۔ قصبہ کی آبادی دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی۔ چار پانچ گھر ہندوؤں کے تھے باقی سب مسلمانوں کے تھے۔ کرپارام کا کاروبار خوب چلتا تھا۔ گھر کے مکان اور مویشی تھے۔ دوکان کے علاوہ وہ بیج کا بیوپار تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ یہ سارا کاروبار اُسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ اور وہ ان کی دی ہوئی جائداد میں اضافہ کر رہا تھا۔

گاؤں کے مرکز میں اس کا پکا مکان تھا۔ جس میں متعدد کمرے تھے اور ایک تہہ خانہ تھا جس میں وہ نقد روپیہ اور زیورات چھپا کر رکھتا تھا۔ زیورات شربتی کے نہیں گاؤں کی عورتوں کے تھے۔ لوگ انھیں اس کے پاس گروی رکھ جاتے تھے۔ لیکن ایک بار اس تہہ خانے میں پہنچ کر باہر کم نکلتے تھے۔ اپنے زیور اور قیمتی کپڑے رکھنے کے لئے شربتی کے پاس ایک آہنی صندوق تھا جو دو مضبوط تالوں سے مقفل رہتا تھا۔

کرپارام کے نزدیک شربتی بذاتِ خود ایک ایسی شے تھی جسے روپے پیسے اور زیوروں کی طرح چھپا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بلکہ روپے اور زیوروں سے کہیں زیادہ۔ کیونکہ اس کے ساتھ خاندان کی عزت منسوب تھی۔ اس لئے کرپارام نہایت مستعدی سے شربتی کی حفاظت کرتا تھا اور اس کی ہوا تک مکان سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ کیا مجال غیر مرد کا سایہ تک اس پر پڑ جائے۔

جب تک گاؤں میں اسے اپنے مکان کے اندر رہنا نصیب تھا وہ شربتی کی یونہی حفاظت کرتا رہا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کا کام خاوند کی خدمت کرنا تھا۔ جب سے وہ بیاہی آئی تھی کرپارام نے کبھی بھی اپنی دھوتی خود نہیں نچوڑی تھی۔ خانہ داری کا سب کام اسے کرنا ہوتا تھا۔ کرپارام کا فرض اس کے کام کی داد دینا نہیں بلکہ اس میں نقص نکال کر سو طرح برس پڑنا تھا۔

شربتی حسین تھی۔ درمیانہ قد۔ سڈول اور متناسب جسم، گول چہرہ، گورا رنگ اور موٹی موٹی آنکھیں۔ یہ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اس پر جوانی کب آئی۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں اس کی شادی کرپارام سے ہو گئی تھی جسے کسی طرح بھی قبول صورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم بھاری اور رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اور ہونٹ موٹے تھے اس کے علاوہ اسے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی کھال بھینسے کی کھال کی طرح سخت اور کھردری ہو۔ اس کے اعضا میں گھلاوٹ اور ملائمیت کا نام تک نہیں تھا۔ روح تک بے حسی کے خول میں لپٹی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنی جائداد اور دھن دولت پر ناز تھا۔ اس کے بل بوتے پر وہ آسامیوں پر جبر کرتا تھا۔ اور خود شربتی پہ جبر کرتا تھا وہ اپنے کاروبار کو توسیع دے کر بہت بڑا سیٹھ بن جانا چاہتا تھا۔ جس طرح ہر کھاتے پیتے خوشحال مرد کے گھر میں بیوی ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں بھی شربتی موجود تھی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے کبھی اس کی دلجوئی نہیں کی۔ اس کے حسن کی تعریف نہیں کی۔ اسے عورت بھی ماں باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا اور وہ جائداد بھی چھوڑنی پڑی جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ بصد مشکل چند زیور اور کچھ روپیہ بچا کر لا سکا تھا۔ یا پھر شربتی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ دہلی پہنچ گیا۔ اور آخر وہیں رہنے لگا۔ کچھ دن رفیوجی کیمپ میں گذارے۔ وہاں سرکار کی طرف سے راشن مفت ملتا تھا۔ اور کرایہ وغیرہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ اس لئے گانٹھ کا پیسہ محفوظ رہا۔ مگر وہاں ایک مصیبت تھی۔ اور یہ مصیبت اسے اپنے اُجڑنے سے بھی زیادہ کھٹکتی تھی۔ یہاں شربتی کو پردے میں رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہر کس و ناکس کی نظر اس پر پڑتی تھی اور وہ بھی بے حیائی سے مڑ مڑ دوسروں کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ جیسے عجائب گھر میں آ گئی ہو۔ جیسے اس نے جب سے پیدا ہوئی ہے، لوگ نہ دیکھے ہوں۔

سامنے والے کیمپ میں شیخوپورہ کا جو ملکھراج رہتا تھا اسے دیکھ کر کرپا رام بہت کڑھتا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ اس پر کوئی الزام لگوا کر کیمپ سے نکلوا دے۔ ہتھکڑیاں پہنوا دے۔

ملکھراج کی مردانہ شبیہہ جاذب نظر تھی۔ وہ تندرست اور خوبصورت تھا۔ پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار واقع ہوا تھا سب کے ساتھ گھل مل کے رہتا تھا۔ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ دوسروں کا چھوٹا موٹا کام کر دینے میں بھی اسے کوئی دریغ نہ تھا۔ کیمپ کے سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے اس سے ہنس ہنس کر بولتے تھے۔ لیکن کرپا رام کو وہ چالاک اور حیلہ باز نظر آتا تھا۔ ورنہ کیا مطلب کہ وہ یوں عورتوں سے چھیڑ چھیڑ باتیں کرے اور ہنسے۔ جب وہ شربتی سے باتیں کرتا تو کرپا رام کی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور آگے سے شربتی کا مسکرانا تو بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس کے نزدیک یہ بے حیائی کی انتہا تھی۔ وہ اس حرکت کے لئے شربتی کو کئی مرتبہ سخت سست کہہ چکا تھا۔ لیکن شربتی کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اسے اکثر ملکھراج سے ہنستے اور باتیں کرتے دیکھتا تھا۔

ایک ملکھراج ہی کیا۔ وہ اسے کس کس سے باتیں کرتے سے روکے۔ طرح طرح کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ سبھی مل جل کے رہتے تھے۔ میدان میں کیمپ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ پھر ایک دوسرے سے دُکھ سُکھ کہنا ہوتا تھا۔ عام طور پر چوکے چولھے کی چیزوں کی بھی کمی تھی۔ جو کچھ برتن بھانڈے بچا کر لا سکے تھے انہیں عورتیں آپس میں لے دے کر استعمال کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ ربط ضبط بڑھانے میں خاص طور پر تیز واقع ہوئے تھے۔ بات کرتے ذرا نہیں جھجکتے تھے "بہن جی! تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ سب خیریت سے تو آ گئے؟" وغیرہ وغیرہ قسم کے سینکڑوں سوال پوچھتے اور جواب دینا ہی پڑتا۔ ان کی عورتیں بھی کتنی چونچال تھیں۔ پھرکی کی طرح ادھر اُدھر گھومتی پھرتی تھیں۔ سر ننگے صرف بلاؤز اور ریشمی کوٹ پہنے ہوئے کھلے بندوں سامنے نل پر کپڑے دھوتیں اور مردوں کی طرح صرف ایک کپڑا زیب تن کر کے نہانے لگتیں۔ مرد چاہے تو نگاہ نیچی کر لے۔ مگر ان کی نگاہیں ذرا نہ جھجکتیں۔

کرپا رام شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس دلدل سے دُور بھاگ جائے۔ اس نے ہم کیمپوں سے بارہا شکایت کی تھی کہ عورتوں کو اس بے حیائی سے روکا جائے۔ یہ سب کچھ تہذیب کے خلاف ہے۔ ہم نے بڑوں کی مریادا چھوڑ دی ہے۔ تبھی تو یہاں تک پہنچے ہیں۔ لوگ اس کی باتوں پر مطلق دھیان نہ دیتے۔ لیکن وہ رٹ لگائے رکھتا۔ جس کو ذرا ہمدرد پاتا۔ اسی کے پاس اپنا دُکھ درد لے بیٹھتا۔ یہاں تک کہ جب رفیوجی ایکشن کمیٹی کے رضاکار یہ پرچار کرنے آتے کہ ہم کب تک یوں بیٹھے رہیں گے۔ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ ہمیں بسانے کا، بنا وعدہ پورا کرے تو کرپا رام انھیں بھی اپنی رام کہانی سُنانے لگتا ——" اور تو سب کچھ پاکستان میں لٹا آئے ہیں ایک عزت بچی ہے وہ بھی محفوظ نہیں۔ کوئی اوٹ نہیں۔ پردہ نہیں۔ بہو بیٹیوں کی آنکھ کا پانی اُترتا جا رہا ہے؟"

شربتی کو اس کی ہر وقت کی بے کل کل بھی نہیں لگتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اس سے اُلجھ پڑتی۔ اور تنگ کر کہتی —— "اور کسی کو تو اپنی بہو بیٹی کی فکر نہیں ایک صرف تمہاری ہی عزت لُٹی جا رہی ہے۔ بڑے ایسے آئے ہیں کہیں کے، مجھے مکھی بنا کے ڈبی میں بند کر لو۔"

اسے شربتی کی یہ زبان درازی اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا تو اسے کبھی منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ مگر یہاں دوسروں کو کیا تماشہ دکھلائے۔ جب کبھی آپس کی کہا سنی میں ذرا اونچا بولنے کی نوبت آئی تھی تو لوگوں نے شربتی کو لعنت ملامت کرنے کی جگہ خود اُسے بُرا بھلا کہا تھا۔ اور وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔

شربتی دن بدن بدلتی جا رہی تھی۔ دوسری عورتوں کی روش اپنا رہی تھی۔ پہلے جہاں وہ مجبور ہو کر کسی غیر مرد سے بات کرتی تھی۔ لیکن اب بات کرنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ پہلے وہ کسی کی نظر اپنی طرف اُٹھتے دیکھ کر چھاتیوں پر نہایت احتیاط سے کپڑا ڈھک لیتی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھتی تھی کہ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ اس کا کیا چھین لے گا نہ اس کا جسم شہد ہے اور نہ اس کی آنکھیں مکھیاں جو اُسے چاٹ جائیں گی۔ وہ نگاہ کی ہوس کاروں سے بھی بے نیاز ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو چھپا کر رکھنے کے بجائے اسے اپنے ماضی پر غصہ آتا تھا، کرپارام پر غصہ آتا تھا جو دروازے سے باہر جھانکنے تک سے منع کر دیتا تھا۔ وہ کیوں اس پر اپنی اجارہ داری جتاتا تھا۔ وہ جتنا ہی ان باتوں کو سوچتی تھی اتنا ہی اسے کرپارام کریہہ اور بدصورت نظر آتا ——— وہ یہاں تک سوچنے لگتی۔ کہ اسے کیوں ناحق اس مرد سے باندھ دیا گیا؟

جب وہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر فساد کی باتیں کرتا، مسلمانوں کے فرضی اور حقیقی مظالم بیان کرتا تو اسے وہ مظالم یاد آیا کرتے جو کرپارام اس پر ڈھایا کرتا تھا۔

کرپارام دکان پر کام میں مصروف رہتا۔ اور وہ گھر میں تنہا بیٹھی بیٹھی تنگ آ جاتی ——— گھر میں ساس نند یا چھوٹا بچہ تک نہیں تھا۔ جس سے باتیں کرے دل بہلائے۔ ایک دن وہ یونہی اُٹھ کر ڈیوڑھی کے دروازہ پر آ گئی اور کواڑ کی درازوں میں سے گلی میں جھانکنے لگی۔ جانک اس کھڑکی سے جو دکان میں کھلتی تھی کرپارام اندر آ گیا۔ شربتی کو باہر جھانکتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسے چوٹیا سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا اور فرش پر پٹک کر اِدھر اُدھر سے دو چار لاتیں جما دیں۔

اب اُسے محسوس ہوتا کہ وہ یہ سب مظالم ناحق برداشت کرتی رہی ہے۔ اسی لئے اب کرپارام اگر ایک بات کہتا تو وہ چار سُناتی۔ اور جس حرکت سے وہ ناراض ہوتا اُسے بار بار دہراتی۔ مکھراج سے باتیں کرنے میں اُسے ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی وہ کرپارام کو دکھا دکھا کر اس سے بولتی اور مسکراتی تھی۔ اب اُسے کیمپ کے کسی مرد سے بات کرتے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کرپارام نے جب دیکھا کہ شربتی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ سیدھی بات کہنے سے مُنہ نوچنے آتی ہے تو اس نے دل پر جبر کر کے کیمپ چھوڑ دیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے قرول باغ میں ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا۔ اور وہ شربتی کو ساتھ لے کر اس میں رہنے لگا۔

لیکن اب روزی کی فکر سر پر سوار ہوئی وہ چار روز ہی میں اسے معلوم ہو گیا کہ پہلے ہی یہ بات کیوں نہ سوچی۔ راشن بازار سے خریدنا پڑتا اور مکان کا بیس روپلے ماہوار کرایہ بھی پیشگی دینا پڑتا تھا۔ اتنا کیا کم تھا کہ بنا پگڑی کے اسے یہ کمرہ تو مل گیا۔ جوں جوں دن گذرتے تھے فکر بڑھتی جاتی تھی۔ پہلے خیال تھا کہ سرکار کچھ مدد کرے گی۔ پاکستان میں وہ جو اتنی جائداد چھوڑ آیا ہے۔ اس کا کچھ معاوضہ ملے گا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا کیس رجسٹرڈ کرا دیا تھا۔ معاوضہ ملنے کی کچھ نہ کچھ اُمید بھی ضرور تھی۔ مگر جب تک کچھ نہیں ملتا اس وقت تک تو خرچ اُسے ہی چلانا پڑے گا۔

کرپارام نے معاش کی تلاش شروع کی۔ جان پہچان کے کئی آدمیوں نے کام کا چھوٹا موٹا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مثلاً لڈھیا رام نے لانڈری کی دوکان کھولی تھی اور لچھو کھتری نے حلوائی کی دوکان، وہ چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ساجھا کرے۔ لیکن کوئی رضامند نہ ہوا۔ کام اتنا تھوڑا تھا کہ ان کے اپنے ٹکڑے مشکل سے چلتے تھے۔

آخر اس نے جس خاندانی وقار کو اتنا عرصہ سنبھال سنبھال کر رکھا تھا، خیرباد کہہ دیا۔ اور پھلوں کا خوانچہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک روز صبح

سویرے منڈی گیا۔ کیلے، سنگترے خرید لایا۔ اور بازار میں بیٹھ کر بیچنے لگا۔

اب کرپارام کے لئے یہ بالکل نیا کام تھا۔ اور یوں بھی بازار میں کیلے سنگترے بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ہزاروں مہاجرین دہلی میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے دوکاندار یا خوانچہ فروش تھے انھوں نے بہت پہلے یہ کام شروع کر دیا تھا اور ایسی جگہوں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں پیٹ بھرنے لائق بکری ہو جاتی تھی۔

کرپارام ہزار کوشش کرنے کے باوجود آٹھ دس آنے روزانہ سے زیادہ نہ کما سکتا تھا۔ جس دن اُسے سوا تیرہ آنے بچت ہوئی اس دن وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوا اور رات گئے تک بیٹھا پیسے گنتا رہا۔ کئی بار گن چکا تھا۔ پھر بھی طبیعت نہیں بھرتی تھی۔ جی میں آتی کہ ساری رات گنتا ہی رہے۔ جیسے وہ سوا تیرہ آنے نہیں۔ سوا تیرہ ہزار روپے ہوں۔ گاؤں میں رہتے اس نے ایک دن میں کتنے ہی سوا تیرہ آنے کمائے تھے لیکن اسے اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

کبھی کبھار بکری کم ہوتی تھی اس لئے ایک دو آنے کا خسارہ رہتا تھا۔ ہاں پھل ضرور بچ جاتے تھے۔ ان میں کچھ خاص کر کیلے ایسے ہوتے تھے۔ جنھیں دوسرے روز اٹھا کر رکھنے میں خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے کرپارام انھیں کھا لینے میں مصلحت سمجھتا۔ جتنے پھل کھاتا۔ اتنی اناج کی بچت ہو جاتی بعض مرتبہ میاں بیوی شام کو روٹی ہی نہیں پکاتے تھے۔

پھل کے طور پر پھل کھانا اچھی بات ہے۔ لیکن مجبور ہو کر روٹی کی جگہ پھل کھانے پڑیں تو آدمی کی طبیعت جلد اُچاٹ ہو جاتی ہے اس لئے کرپارام کو من مار کر پھل کھانے پڑتے۔ اور کئی مرتبہ ضرورت سے زیادہ کھانے پڑتے۔ جس کی وجہ سے بدہضمی کی شکایت رہنے لگی۔ لیکن اس نے پھل کھانا جاری رکھا اور بدہضمی بڑھتی گئی جو آخر پیچش بن گئی۔ پھل بیچنا تو درکنار گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔

کرپارام مرتے مرتے بچا۔ دو مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ قریب ہی ایک وید کی دوکان تھی۔ شربتی اُسے بُلا لاتی۔ اور اس سے دوائی لے آتی۔ دوائی کے علاوہ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی اُسے خود خرید کر لانا پڑتی تھیں۔ کرپارام کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ بازار جائے اور دوکانوں پر گھومتی پھرے مگر کیا کرے بیماری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اتنا کیا تھوڑا تھا کہ بیوی کی دوا دوش کے کارن جان بچ جائے۔

وہ بدستور چارپائی پر پڑا تھا مگر افاقہ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے اندر ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ اسے اپنا جسم کچھ ہلکا پھلکا معلوم ہونے لگا۔ جیسے پیچش سے اندر کا میل دھل گیا ہو۔ اب شربتی کو دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ نگاہیں اکثر اس کے چہرے پر گڑی رہتی تھیں۔ اور اس میں خاص جاذبیت تھی۔ ملائمت اور ملاحت تھی۔ اس کا لہجہ بھی پہلے کی طرح کرخت اور تحکم آمیز نہیں تھا۔ اس میں نرمی اور متانت تھی۔ وہ پیار سے بولتا تھا۔

شربتی نے بھی اس تبدیلی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے بھی اب کرپارام کو دیکھ کر کراہت نہیں ہوتی تھی۔ تندی اور سختی سے پیش آنے کی بجائے وہ اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ بیماری دور ہو گئی ہے لیکن کرپارام ابھی پندرہ بیس روز اور کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ خود کوئی کام کرے۔ ایک روز بولی۔

"منگو اور بسنتی رضائیاں سینے جاتی ہیں۔ میں بھی چلی جاؤں؟"

"تم ——— تم مزدوری کرنے جاؤ گی؟" کرپارام تجویز سن کر حیران رہ گیا۔

"جب سب جاتی ہیں تو مجھے کونسا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے؟"

کرپارام چپ ہو گیا۔ اپنی حالت اور گھر کی کیفیت کا دل ہی دل میں جائزہ لیا۔ اور پھر دبی زبان میں کہا۔ "کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟"

"کہنے کو کون اپنا بیٹھا ہے۔ سبھی پردیسی ہیں۔" شربتی نے جواب دیا۔ اور مزید کہا: "پھر کہنے سننے کی بات ہی کہاں رہ گئی ہے۔ جس سے جیسے

بن پڑتا ہے۔ پیٹ کا دھندا چلا رہا ہے:!

اس دن سے شربتی رضائیاں سینے کا کام کر رہی تھی۔ شروع شروع میں وہ مزدور عورتوں سے کتراتی تھی۔ دوسری شرنارتھی عورتوں کے ساتھ ان سے ذرا فاصلہ پر بیٹھتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تمیز مٹ گئی۔ وہ ان سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے لگی۔ ہم پیشہ کی ہم پیشہ سے نفرت کیا۔ وہ بھی تو محنت مزدوری کرتی ہیں۔ کوئی عیب تو نہیں کرتیں۔

کرپارام کی نگاہ اب اور بھی بدل گئی ہے۔ اسے شربتی کے چہرے پر ہمت اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کے خدوخال ٹھوس اور مضبوط بنتے جا رہے ہیں۔ اگر کسی کارن ناراض ہو کر وہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا بھی چاہے تو نہیں آ سکتا۔ اور اس پر کسی قسم کا شک کرنا تو اسے خود اپنی حماقت نظر آتی ہے۔

صدیقہ بیگم

روپ چند

اگر ندی کے پاس سوکھے درخت کا تنا نہ ہوتا تو لوگ ضرور پوچھتے کہ آج تک بوڑھا روپ چند ندی کے کنارے کیسے بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ تیز و تند ہوا کے جھونکے اس کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکے تھے، ریت کے ٹیلے بنتے اور بگڑتے رہے مگر وہ درخت نہ تو کبھی ہرا ہوا اور نہ اس پر کبھی پھل پھول ہی کھلے اور نہ پت جھڑ میں اس کے نیچے سوکھی پتیاں ہی نظر آئیں ——— وہ بوڑھا آج بھی ندی کی لہریں گن رہا تھا۔ جب ندی کے دونوں طرف بستیوں میں خون کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بہہ رہی تھیں اور یہ ندی شاید اسی لئے اور بھی کروٹ سے بہہ رہی تھی ——— کہ کہیں یہ ندیاں اس سے آکر نہ مل جائیں ——— اور جب زمین کے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے تب بھی روپ چند ندی کے کنارے بیٹھا تھا اور کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟ ——— برس بیتے وہ اس ندی کے کنارے آیا تھا اور اس نے سوکھے پیڑ کا سہارا لے کر اپنی کٹیا بنائی تھی مگر دیکھنے والوں نے ہمیشہ ہی اسے لہریں گنتے ہی پایا۔ گویا وہ لہریں گننے ہی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اور لہریں گنتے گنتے ہی مر جائے گا۔ اس نے کبھی بھولے سے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ ندی جو شام کو تاریکی اور روشنی کا سنگم نظر آتی ہے دراصل شہر کے بیچوں بیچ سے بہہ رہی ہے اور کس طرح شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی چلی جاتی ہے ——— بالکل بے خبر ——— اگر وہ لوہے کا سرخ پل نہ ہوتا تو شاید یہ ایک شہر پہلے ہی سے دو ہو چکا ہوتا، تاہم یہ تقسیم قدرتی نہ ہوتے ہوئے بھی قدرتی تقسیم کا درجہ رکھتی تھی اور شہر والوں کے نزدیک اس کی وقعت روزمرہ کی زندگی میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت چوڑی ندی بھی نہ تھی اور اس کا پل کوئی بڑا پل نہ تھا۔ تاہم دریا کا وجود ایسا بھی نہ تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔ ویسے تو گھاٹوں پر شہر کی بساط کے مطابق کشتیوں کا بھی بندوبست تھا، مگر تپ دق کے مریضوں نے ان کے نرخ میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے دوسری طرف ناؤ سے پار کرنا عیاشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور پھر جب لوہے کا پل موجود ہے تو اب ناؤ پر سے جانا تو یقیناً فضول خرچی تھی، اور یہی ایک وجہ تھی جس نے لوگوں کو کشتیوں سے ذرا بدظن کر دیا تھا۔ اور یہ تھا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ——— کیوں کہ ایک عرصے سے شہر کی فضا میں نفرت گھلتی چلی جا رہی تھی اور اسی لئے یہ شہر روز بروز دو حصوں میں بٹتا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا دو صفیں منظم ہو رہی ہیں اور پل کے اس پار سے وہ

کی بستی بستے بستے بس گئی تھی۔ کہنے کو تو اس میں کچھ غیر مسلم بھی تھے۔ پھٹے چمار چوڑھے ہی جو کسی گنتی میں نہیں اس لئے کہ اچھوت تھے ان کو مار کر کون مسلمان اپنے جسم کو ناپاک کرتا۔

دریا کے پاس بیٹھا ہوا بوڑھا شہر کی تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی تو اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہ خود بھی اس کی بستیوں میں کھیلا کرتا تھا اس نے زندگی کی کتنی المناک راتیں اور کتنی طربناک شامیں اس شہر کی نذر کر دی تھیں —— ایک عرصہ سے وہ دریا کے کنارے آکر بیٹھ گیا تھا اور اسی لئے وہ شہر کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ آج شہر کی زندگی میں مذہب سیاست بن چکا ہے اور اگر وہ جانتا تو شاید تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو لیتا کہ اچھا ہی ہوا کہ جو وہ ندی کی لہروں کو گن رہا ہے۔

روپ چند اچھی طرح جانتا تھا کہ کس طرح دھرم پور کے بالمقابل اسلام پور کی یہ بستی ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر بسائی تھی اور وہ چمار چوڑھے کس طرح وہیں اپنے آبائی گھروں میں رہتے چلے آرہے تھے اور ان کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں کس طرح راکھ بن کر اس دھرتی کا جزو بن چکی تھیں۔ اور اسی لئے وہ شاید ڈھیٹھ بھی تھے۔ یہاں تک کہ شہر میں مشہور ہے کہ جب سنہ ۱۶ء میں ندی میں باڑھ آئی اور چمار ٹولی کے جھونپڑوں کے اوپر سے پانی بہہ رہا تھا تو دور سے صرف درختوں کی پھنگیاں نظر آتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف یہ نیم کا درخت ہے جو چمار ٹولی کا سب سے اونچا پیڑ تھا۔ وہاں لہرا رہا ہے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اب چمار ٹولی کبھی نہ بس سکے گی اور جہاں اس باڑھ سے ہزاروں اور لاکھوں کا نقصان ہوا، وہاں لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب چمار ٹولی تو کبھی نہ بس سکے گی۔ ہمارے شہر کا ناسور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ہمارے شہر کے درمیان سے یہ چمار ٹولی تو سدا کے لئے نیست و نابود ہو گئی۔

سیٹھ دھنی چند اور مُلّا دولت حسین دونوں خوش تھے کہ ان کی زمین واپس مل گئی جس کو ان چماروں نے موروثی کہہ کر غصب کر رکھا تھا اور اب وہ عالیشان عمارتیں بنا سکیں گے۔ اور اسی لئے وہ خوش تھے کہ بڑی عدالت نے ان کی سن لی اور جھونپڑوں کو زمین سے ملا دیا۔ مگر پھر کیا ہوا یہی نا کہ اس وقت اِسی رُوپ چند نے مُلّا دولت حسین بھائی کے بیٹے اور بہو کو پانی کے ریلے میں سے نکالا تھا۔ جب آدھی رات گئے پانی ان کے مکان میں چڑھ آیا تھا اور سارا شہر پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اس وقت نوجوان روپ چند نے چیخ کر سارا گھر اپنے سر پر اُٹھا لیا تھا۔ اور پھر جب سب لوگ گھر سے باہر نکل آئے تو بھی مُلّا دولت حسین کے بیٹے اور بہو اپنے کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ دولت حسین چلّاتے رہ گئے اور کوئی سننے والا نہ تھا۔ تب رُوپ چند نے اندر گھس کر کمرے سے دونوں کو باہر نکالا اور بہت سامان بھی دریا برد ہونے سے بچا لیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ باڑھ کے بعد جب دولت حسین نے خاندانی روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے روپ چند سے پوچھا کہ "مانگ کیا مانگتا ہے" تو نوجوان روپ چند کی زبان سے بےساختہ نکلا۔

"حضور ٹولی کو بسا دیجئے، نہیں تو پھر ہم کدھر جائیں گے —— آپ کی سیوا میں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ اور سیٹھ دھنی چند چاہیں تو پانی اُترتے ہی چمار ٹولی کو بسا دیں ——"

"مُلّا دولت حسین بھائی تیار ہو گئے اور سیٹھ دھنی چند بھی کیسے انکار کرتے کیونکہ وہ تو وہی کرتے جو دولت حسین سوچتے تھے اور ان کی اس دوستی کا چرچا بھی شہر کے اندر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر کیا ہوا یہی نا کہ پانی اُترتے ہی مہینہ بھر میں چمار ٹولی بس گئی۔ اور اس بار انھوں نے ایسی لکھا پڑھی کی کہ چمار ٹولی پھر موروثی نہ ہو سکے۔ وہ ناسور شہر کے سینہ پر بدستور قائم رہا۔ اس لئے کہ وہ چماروں کی ملکیت نہ تھا۔

روپ بھی چمار ٹولی کا ہیرو بن گیا۔ اور مائیں اپنے بچوں کو روپ چند بننے کی ترغیب دینے لگیں —— آخر روپ چند نے ان سب کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا —— جبکہ وہ چاہتا تو دو چار ہزار روپیہ مانگ لیتا۔ جو دولت حسین کے ہاتھ کا میل تھا۔ لیکن سنہ ۱۶ء کا زمانہ کتنے دن رہتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ دولت حسین اس بات کو بھول گئے اور یہ قصہ صرف گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو یاد رہ گیا۔ کیونکہ بیس برس کے بعد جب

روپ چند کی لڑکی جوان ہو گئی تو اس ندی کے کنارے وہ پانی بھرنے آتی اور دولت حسین کے لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا —— وہ چیخی رہ گئی مگر دریا کی لہروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس کی مدد کرتیں، وہ تو اُٹھ اُٹھ کر دیکھتی ہی رہیں اور پھر اس کی چیخ بھی فضا میں دب کر رہ گئی، اور شہر والوں نے اتنا سنا کہ دھنی چند نے خود اپنے ہاتھوں سے روپ چند کی لڑکی کو بُرے فعل میں پکڑا۔ چنانچہ اسی بدنامی کے خوف سے وہ ندی میں کود پڑی۔ چلو اچھا ہی ہوا جو اسلام پور کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگنے سے بچ گیا۔ مگر ندی کی لہروں کو بھی، اس پہ ترس آ گیا اور وہ اس کو بہا کر لے گئیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن کہ روپ چند اسی کنارے پر بیٹھا لہریں گن رہا ہے اور اپنی سرسوتی کو ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے سامنے آتی ہوئی شرماتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے پاپ کیا ہے اور سیٹھ دھنی چند کی موجودگی میں ان کے دوست کے پوتے کی عزت لی ہے۔

لیکن پھر اس کے گیارہ بارہ برس کے بعد شہر کی زندگی میں ایک اور زلزلہ آیا اور روپ چند نے وہیں ندی کے کنارے بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ پُل کے دونوں طرف کے لوگ گھبرائے ہوئے بھاگنے لگے اور دھرم پور اور اسلام پور آہستہ آہستہ الگ ہو گئے —— کسی ہندو کی مجال نہ تھی جو اسلام پور میں داخل ہو سکے اور اسلام پور کے مسلمان ندی کے پار جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ شہر کی زندگی میں یہ زہر کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ بچوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ندی کے پاس دوسرے گھاٹ کے ہندو ملاح آتے ہیں اور بچوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں اور عرصہ تک اس قسم کے قصے سننے میں آتے تھے جو اسلام پور میں روایات کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ابھی تک ندی کے دونوں طرف کوئی فساد نہ ہوا تھا۔ فساد سے میری مراد ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ ورنہ یوں تو بہت سے ایسے واقعات ہو چکے تھے جس سے اسلام پور اور دھرم پور کو کبھی بھی شرمندگی نہ ہوئی تھی یعنی آزاد ہند فوج پر جب لال قلعے میں مقدمہ چل رہا تھا تو ایک مسلمان نوجوان نے دھرم پور کے انگریز جج کو مار ڈالا تھا اور راحت علی کی اس جواں مردی نے دھرم پور کی سطح کو بلند کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دھرم پور کے پاس بہتی ہوئی ندی کا پانی بھی اُچھل اُچھل کر دھرم پور کے اس نوجوان کو دیکھنا چاہتا تھا اور راحت علی کے نعروں سے شہر کی فضا گونج رہی تھی۔ دھرم پور کے رہنے والے خوش تھے کہ ان کی دھرتی نے ایک ایسے دیر کو جنم دیا جس نے بھارت ماتا کی لاج رکھ لی اور برطانوی عدل و انصاف کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ اس وقت لال قلعے کے انصاف پسندوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں —— چنانچہ جب راحت علی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو سارے شہر میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اس کے ساتھ دھرم پور کے ہندوؤں نے بھی مل جل کر جلوس نکالے تھے اور سارا دھرم پور ہل گیا تھا۔ دریا کے دونوں طرف جشن ہو رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر کہیں اس روز گولیاں چلتیں تو دھرم پور اور اسلام پور ایک ہو جاتے اور پھر ندی کے پانی کو بھی اپنا رُخ بدلنا پڑتا اور شاید پھر اسی خوف سے سرکار کو اپنا حکم واپس لینا پڑا —— حکم حاکم مرگ مفاجات نہ بن سکا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر اپنے معبدوں کو سجایا۔ بھگوان اور خدا کے حضور میں شکر بجا لائے اور بیچارے سفید فام آقا منہ تکتے رہ گئے اور کم از کم اس وقت تو بدلہ نہ لے سکے مگر یہ خون ایسا تھا جس کو انگریز شاید کبھی نہ معاف کر سکیں، پھر انہوں نے اس کا ایسا بدلہ لیا —— کیونکہ جب نیا کلکٹر آیا تو شہر میں چراغاں بھی نہ ہوا اور اس کے بعد بھی کلکٹر صاحب نے عام جلسہ میں وہاں کے لوگوں کی تعریف کی اور اس وقت شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں زمین سے اُٹھتی ہوئی نظر آئیں۔

روپ چند ان تمام کھیل تماشوں کو بیٹھے بیٹھے دیکھتا رہا، اور کئی بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اپنی لڑکی کے قاتل کو بھول جائے اور اپنی بستی میں جا کر رہے اور ان جلسوں جلوسوں میں حصّہ لے، مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور یوں ہی بیٹھا تکتا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بوڑھا اپنی اکلوتی لڑکی کا انتظار کر رہا ہے، وہ پاگل ہو گیا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسے رات کے سناٹے میں زور زور سے چیختے سنا ہے، جب وہ اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہے کہ وہ اسے مُلا دولت حسین اور اس کی سات نسلوں سے انتقام لینے کی شکتی دے، مگر بڑھے کی صورت دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ داڑھی والا درویش فقیر جو دراصل چمار ٹولی کا رہنے والا ہے اور جس نے کبھی اپنی جوانی میں دولت حسین کے

لڑکے اور بہو کی جان بچ گئی تھی، دولت حسین سے انتقام لے سکے گا۔ اور اس کی سات نسلوں سے اپنی بیٹی کے خون کا بدلہ لے گا ——

ہاں تو نئے کلکٹر والی بات رہ گئی۔ وہ نیا کلکٹر جو شہر میں آیا تھا اس نے بڑے صبر و استقلال سے اپنے عہدے کو سنبھالا اور شہر کے عمائدین کا خیال تھا کہ ایسا حاکم اس شہر میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ بوڑھے دولت حسین کا بھی یہی خیال تھا۔ ہاں ہاں انھیں ملا دولت حسین کا جن کی پلکیں جھڑ گئیں تھیں اور بھویں سفید ہو گئی تھیں —— وہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے ہوش سنبھالنے کوئی حاکم شہر اس مزاج کا نہیں آیا۔ یوں تو انگریز افسروں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ملکہ کے زمانے سے یہ وقت آگیا ہے اور تیتے انگریز حکام سے اپنا واسطہ پڑا مگر ان جیسا حاکم شہر کبھی آیا نہیں۔ پھر ہندو مسلمان سب کے ساتھ اچھا سلوک اور رواداری بھی غضب کی۔

—— پھر اس کی وجہ بھی تھی۔ ملا دولت حسین کو بلانے کے لئے صاحب کلکٹر اپنی موٹر بھیج دیتے اور بڑے بڑے حکام اس وقت منہ تکتے رہ جاتے تھے۔ آخر یہ بات تو دو چار دن میں بنتی نہیں۔ اس کے لئے کتنا روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔ اور سیٹھ دھنی چند بھی ان کو موٹر میں بیٹھ کر جاتے دیکھ کر منہ تکتے رہ جاتے۔ حالانکہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی کہ ملا دولت حسین نے سیٹھ دھنی چند کی کوئی بات ٹالی ہو۔ کیونکہ وہ تو ایک جان دو قالب تھے ——

اب جو بات بگڑی تو یہی کہ ملا دولت حسین اور سیٹھ دھنی چند صاحب کلکٹر کے پاس ایک ساتھ دکھائی نہ دیتے تھے۔ حالانکہ دونوں کا بڑھاپا تھا۔ اور صاحب کلکٹر کے یہاں حاضری ہوتی تھی۔ اور جب پاس پڑوس کے نوجوانوں میں اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور ملا دولت حسین کے بیٹے نے ان سے کہا کہ آپ کا صاحب کلکٹر کے یہاں روز روز کا جانا لوگوں کو ناگوار گذرتا ہے تو انھوں نے بڑی لاپروائی سے کہا کہ ——

"بیٹا ہمارا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن، مگر وقت کی بات ہے۔ ہندوؤں کے تیور بھی تو، گر ایسے وقت میں تم ہندوؤں سے مل کر رہے تو پھر چمار ٹولی کے کمینے ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے —— ان چماروں کو کم مت سمجھنا —— اور پھر آدھی چمار ٹولی تو سیٹھ دھنی چند کے قبضے میں ہے —— سیٹھ دھنی چند کو بھی کم مت سمجھنا —— میں تو ان سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتا ہوں۔" ملا دولت حسین چمار ٹولی کا ذکر کر رہے تھے تو وہ روپ چند کو بھول گئے تھے، وہ ۱۹۴۶ء کو بھول گئے تھے، وہ سرسوتی کو بھول گئے تھے کہ وہ ندی میں ڈوب مری تھی۔ ہاں انھیں کچھ یاد تھا تو یہی کہ چمار ٹولی کے کمینوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ وہ ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے اور ملا دولت حسین جب ہندوؤں کے تیور پہچان رہے تھے تو وہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے تیور بھی بدل چکے ہیں —— آج وہ دھنی چند سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتے ہیں —— یہ اور بات ہے کہ سرسوتی کو اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ڈوب مرنا پڑا تھا۔

لیکن اپنے باپ سے یہ جملے سن کر ان کے لڑکے کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب دن اچھے نہیں بڈھے روپ چند کی لڑکی مرنے کے بعد بھی انتقام کی تیاری کر رہی ہے —— اور ملا کے چند جملوں نے اس کو سمجھا بجھا لیا۔

ادھر سیٹھ دھنی چند سے جب دھرم پور کے لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے دبی زبان سے کہا ——

"صاحب کلکٹر کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بال دھوپ میں تھوڑا ہی سفید کئے ہیں۔ ایسا ہنر و نیاز کا کلکٹر تو اس شہر میں کبھی آیا ہی نہیں۔ میں نے اس کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ ملا دولت حسین کتنا ہی اس کے دروازے کے چکر لگائیں مگر سیٹھ دھنی چند کی بات ہی کچھ اور ہے۔ دو چار اشارے ہی کافی ہیں۔ سارے اسلام پور کی بستی میرے اشارے پر موت کے گھاٹ اتر سکتی ہے ——" اور دھرم پور کے وہ لوگ جو سیٹھ دھنی چند کی باتیں سن رہے تھے اس وقت کانپ ہی تو گئے، آخر اسلام پور بھی دھرم پور کا ایک حصہ ہی تو تھا مگر بعد میں ان کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ یہ مسلمان تباہ ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے۔ پہلے اسلام پور اور دھرم پور کو دریا نے الگ کر دیا تھا۔ اور اب سیٹھ دھنی چند اور ملا دولت حسین کی نااتفاقیوں نے —— اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ صاحب کلکٹر نے پہلے ہی پوری کر دی تھی اور نفرت کا ایک

زہر سا گھول دیا تھا وہ زہر جو دھرم پور اور اسلام پور کی روح میں سرایت کرتا چلا جا رہا تھا۔

بڈھا روپ چند آج کی اس کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ دھرم پور اور اسلام پور کی بستی کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھی اور نئے صاحب لکھڑ نے وہاں کون کون سے بول بچ ڈے تھے

اور آج جبکہ شہر کی فضا میں اچانک ایک دھماکا ہوا۔ دونوں بستیوں کے دل دہل گئے۔ چاروں طرف سے مار دھاڑ کا شور سنائی دینے لگا اور روپ چند دریا کی ہریں گنتے گنتے چونک پڑا جب گولیوں نے دونوں بستیوں کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور روپ چند کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ گولیاں خود اس کے اپنے سینے پر پڑ رہی ہیں۔ ساری بستی میں آگ لگی ہوئی تھی اور دونوں طرف کی آگ کا عکس دن کی روشنی کے باوجود ندی میں پڑ رہا تھا، شعلے ہوا میں پرواز کر رہے تھے، بستی کے ساتھ وہاں کی تہذیب جل رہی تھی، روایات جل رہی تھیں، عورتیں جل رہی تھیں، بچے جل رہے تھے، حال جل رہا تھا، مستقبل جل رہا تھا، اور ندی کا پانی اُٹھا اُٹھ کر دیکھ رہا تھا —— روپ چند نے کئی بار اٹھنے کا ارادہ کیا —— وہ چمار ٹولی کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے چمار ٹولی کا کیا حال ہو —— ملّا دولت حسین نے چمار ٹولی کو جاکر بیٹا لا یا اپنی جائداد کو جلنے سے بچا لیا۔ سیٹھ دھنی چند نے نہ جانے اس کے آبائی گھر کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور آج بے طرح اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جا کر بڈھے دولت حسین سے ملے۔ سیٹھ دھنی چند سے جا کر پوچھے کہ دھن اور دولت کی بستی میں یہ آگ کے شعلے کیسے —— اس کے کانوں میں عورتوں کی چیخیں کیوں آ رہی ہیں، کیا انھیں اس عظیم سانحہ کی خبر ہو چکی ہے —— مگر فوراً ہی روپ چند کے چہرے پر اطمینان کی لہریں دکھائی دینے لگیں، بالکل ویسی ہی لہریں جیسے اس کے پاس بہتی ہوئی ندی کے سینے پر بہتی جا رہی تھی اور جو آس پاس کے ماحول سے بالکل بے خبر تھیں۔

روپ چند کو یہ نہ معلوم تھا کہ آج شہر کا نیک اور رحمدل نیا آقا کس طرح دونوں بستیوں پر گولیاں چلوا رہا ہے۔ شہر کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں اور کتنی لڑکیوں کی عصمتیں لٹی جا رہی ہیں —— وہ ان سب واقعات سے بے خبر تھا۔ لیکن دریا کے پاس بیٹھے بیٹھے روپ چند سوچنے لگا کہ ضرور آج دھرم پور کی آخری شام ہے، آج اسلام پور میں آخری بار چراغاں ہو رہا ہے۔ اس کے بعد یہ بستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور صبح کا سورج ندی کے دونوں طرف صرف راکھ کا ایک ڈھیر دیکھے گا۔ اس کی اپنی چمار ٹولی بھی ختم ہو جائے گی، اور ایک بار پھر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو اچھا ہی ہوا جو وہ دریا کے کنارے آکر بس گیا وہ ان ہزاروں سے اچھا ہے جو شہر کی گھٹی گھٹی فضا میں سانس لیتے ہیں اور جبکہ وہ صبح سے بھوکا ہے کوئی اس کو روٹی دینے والا نہیں آیا ہے وہ اور شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ضرور شہر میں کوئی ناشدنی واقعہ ہو گیا ہے۔ اور ابھی شام پورے طور پر نہ ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا کہ لوگوں کا غول پل کے پاس چلا آ رہا ہے اور اتنی دوری کے باوجود وہ گھبرا گیا، اور جب وہ لوگ روپ چند کی طرف بڑھنے لگے تو اس کی گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ مگر پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور ندی کی خاموش لہروں کو دیکھنے میں محو ہو گیا، یہ اٹھتی ہوئی لہریں یہ سانس لیتی ہوئی ندی اور اس میں جھلملاتا ہوا پل کا عکس اور پھر ڈھلتے ہوئے دن میں پل کا ڈوبتا ہوا سایہ بھی ندی میں جھلملا رہا تھا اور آسمان کی لالی کا عکس بھی ندی میں مرئی ہوتا جا رہا تھا۔ ان جلتے ہوئے شہر کے آدمیوں کو دیکھنے کے بعد وہ کتنی دیر دریا کی بے مقصد لہروں کو دیکھتا رہا۔ مگر اپنی طبیعت کے اس تضاد کو زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکا اور اس بار جب روپ چند کی نظریں اس غول پر پڑیں تو اس نے دیکھا کہ سیٹھ دھنی چند آگے آگے چلے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک آدمی نیزے میں سر گڑوئے چلا آ رہا ہے اور روپ چند کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے پہچانا کہ وہ سر ملا دولت حسین کا تھا اس کے چہرے کی جھریاں لٹک گئی تھیں، جیسے وہ سر اپنے محسن کو تلاش کر رہا تھا اور معاً روپ چند کو اپنی لڑکی کا خیال آ گیا۔ جس کے بعد اس کی نسل ختم ہو گئی تھی اور روپ چند لاوارث مرنے والا تھا:

ملا دولت حسین کا پوتا — وہی پوتا جس نے اس کے خاندان کو تباہ کیا تھا۔ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا جس نے اس کی اکلوتی لڑکی کی نورس تمناؤں کو ختم کیا تھا جس نے۔ تمام عمر بھر پیر اُمنگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا — اس کی اپنی سرسوتی کا قاتل — اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ملا دولت حسین کا سارا خاندان موجود تھا — عورتیں چیتھڑے لپیٹے چیخ رہی تھیں۔ جن کے آنچلوں کو بھی کسی نے آج تک نہ دیکھا تھا۔

« روپ چند نے لو اپنی لڑکی کا انتقام ان مسلمانوں سے، آج تمہاری تمنا پوری ہونے کا دن آگیا »

روپ چند دیوانہ ہوگیا، وہ لوگوں کی طرف جھپٹا، اور لوگ سوچ رہے تھے کہ وہ ملا دولت حسین کے ٹکڑے کو چبا ڈالنے کا — دیوتاؤں کو چھینے والا روپ چند آج اپنے دشمن کے مدمقابل کھڑا تھا اور اس کا بے پناہ دشمن بے دست و پا تھا — مگر روپ چند نے تانا ہوا برچھا دھمی چند پر ایک زور کا وار کیا کہ مجمع دیکھتا رہ گیا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے اس کی لاش کو اس نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر ندی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

« کمینے کہیں کے پنڈت اور سیٹھ بنتے ہیں » اس نے نیزہ چھین کر دور پھینک دیا۔ اور ملا دولت حسین کا سر لٹکتا ہوا ندی کی طرف بڑھ رہا تھا — لیکن روپ چند مجمع کی طرف دیکھ کر بدحواسی سے چیخ رہا تھا۔

— « چھوڑ دو دولت حسین کے بچوں کو — شرم نہیں آتی اپنی بستی کی عورتوں کی بے عزتی کرتے » اور مجمع کے لوگ حیرانی سے اس کا منہ تک رہے تھے۔

« آخر ہے نہ چمار ٹولی کا، مسلمانوں کا نمک کھاتا ہے »

اور بھیڑ میں سے ایک آدمی نے نکل کر روپ چند کے سینے پر چھری کا ایک وار کیا اور ذرا سی دیر میں روپ چند کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ نفرت سے کسی نے اس کو دریا کی آغوش میں پھینک دیا۔ اور وہ لہریں اس کو اسی طرح بہا کر لے گئیں — جیسے چند برس پیشتر اس کی سرسوتی کو لے گئیں تھیں۔

پھر دولت حسین کا سارا خاندان ان لہروں میں بہا دیا گیا — اور تمام لاشیں یکے بعد دیگرے ندی کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی سناٹا فضا پر چھا گیا۔

سورج کب کا ڈوب چکا تھا اور اس کا عکس بھی یونہی تاریکی میں مدغم ہوگیا۔ گویا وہ سورج یوں ہی ندی کے نیچے دب گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ لہریں بالکل ساکن و جامد ہیں جو کبھی سانس نہیں لیتیں، یوں ہی بے حس رہتی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ڈوبتا سورج اس میں ہولے ہولے اپنا عکس ڈال رہا تھا یہ لہریں جاندار معلوم ہو رہی تھیں گویا وہ آخری بار ہچکی لے رہی تھیں جس نے سارے دریا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب سورج کے ڈوبتے ہی بالکل بے جان ہو چکی تھیں۔ ایک بے حس و حرکت لاش کی طرح — بے بصر آنکھوں میں کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور ندی بھی یوں ہی ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب سڑک کے قمقمے جھلملا رہے تھے اور ایک عجیب بے کیفی کے ساتھ جل رہے تھے اور ان کا عکس بڑی مناسبت سے پانی میں جھلک رہا تھا۔ اور اگر ان کا عکس نہ پڑتا تو پھر شاید یہ رات کی تاریکی ندی کو بالکل ہی اپنی آغوش میں لپیٹ لیتی اور راہگیروں کی نظریں بھی کروٹ سے بہتی ہوئی ندی پر نہ پڑتیں لیکن روپ چند کی کٹیا کا عکس مدھم مدھم پڑ رہا تھا۔ گویا یہ کٹیا بھی ندی کی گہرائی میں روپ چند کی لاش کو ڈھونڈ رہی تھی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

تجاوز

اس کی عمر بہتر سال سے تجاوز کر گئی تھی اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی عمر بہتر سال سے تجاوز کر گئی ہے تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا اس وقت اس کے سرخ چہرے پر زندگی کا والہانہ پن موجود تھا۔ رگوں میں خون گرما رہا تھا۔ غلافی آنکھیں پپوٹوں سے ڈھکی ہوئی شاہین کے مانند معلوم دے رہی تھیں۔ آنکھوں کی چمک اور سرخ ڈوروں سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اس کی کچھ حقیقت ہے۔ اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ تھا۔ اپنے سے علاوہ بھی ہر چیز متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ انتشار ابھر رہا تھا، پل کی پل میں بدن شدت سے کانپنے لگتا تھا ——— صبح اس نے بڑے چاؤ سے داڑھی اور مونچھوں پر حنا لگائی تھی۔ حنا کا سیاہی مائل سرخ رنگ اس تندرست اور دمکتے ہوئے بھرے پر حیات افروز معلوم دے رہا تھا۔ جہاں جہاں اس کی نگاہ اٹھتی تھی ہر چیز اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ آئینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری ماں کا کہنا ہے جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو یہ آئینہ جوں کا توں اسی دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اٹھ کر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے۔ وہ جھکا رہا۔ آئینے کی سطح کے اندر اسے اپنا اور اپنے بالوں کا سرخ رنگ شام کی شعاعوں کے مانند بہت گہرا گہرا نظر آیا۔ اس نے کبھی اس آئینہ کی تاریخ پر غور نہ کیا تھا کہ یہ آئینہ کس کس نے دیکھا ہے اور کس کس عمر میں۔ اس نے آئینے کی سطح پر بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیرا۔ آئینہ آئینہ ہی تو ہے۔ اس کی آب و تاب میں سر مو فرق نہیں آیا۔ اسے یاد تھا، یک بار اسے اس کی ماں نے بڑے پُر وقار طریق پر آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا۔ آج اسے خیال آیا وہ شروع شروع میں خود بھی کئی بار گھڑی پل کے لئے اسی آئینہ کے سامنے رکی ہوئی کھڑی ہوتی ہوگی۔ آنکھیں کبھی جھپکتی ہی آئینہ کے سامنے۔ پھر زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ برسوں آئینہ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ سوچنے لگا۔ جہاں تک یاد داشت کام کرتی ہے آہستہ آہستہ ماں کو آئینہ کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہا تھا اور جب اس نے اسے روکا آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا۔ وہ شیشے اندر کا گدیاں محسوس کرنے لگا۔ وہ مسکرایا، وہ ہنس پڑا۔ یہاں تک کہ قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنے قہقہے کے ساتھ ایک اور قہقہہ سنا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا جیسے ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے آئینہ کے سامنے سے ہٹا دیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا مگر آنکھیں آئینہ پر لگی رہیں۔ اس کی نگاہوں میں ماں کی عزت دیوتا سے کم نہ تھی ——— کانسی کا کٹورہ پیاس بجھانے کی غرض سے اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسے پانی سے بھرے پیاس بجھائے

ت کی بناوٹ پر غور کرنے لگا اور کہنے لگا اس کی عمر گزشتہ بھی انسان سے کم نہیں ہے۔ اس پر میرے دادا کا نام اور دادا کے باپ کا نام کندہ ہے۔ وہ کتنا چمکیلا اور کتنا خوبصورت ہے۔ گھس گھس کر اس میں رس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر کا کوئی کیا اندازہ لگائے گا۔ تیوری چڑھا کر بڑبڑائے، تمام تر عمر کے سوال پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ آخر یہ عمر کا سوال ہے کیا؟ اور پھر یہ کم بخت لوگ عمر کے سوال کو طول دے کر زندگی آدھی کر دیتے ہیں انسان کی۔ میں بہتر سال کا جوان اڑھائی سو سال سے کیا کم بڑھا ہوں گا۔ سانپ کی طرح تن گیا اور انگوٹھی سے کھیلنے لگا جو اس کے باپ دادا کی نشانی تھی۔ اسے گھر میں ہر چیز کی عمر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آ رہی تھی۔ خود توانا توانا اور تازہ دم تھا۔

باہر سرما کی ہوا چل رہی تھی۔ اس کا دل بے قابو ہو کر اچھلنے لگا۔ دل سینے سے اچھل کر باہر نکل گیا جیسے بچہ ہی تو ہے؛ ابھی گیند کی طرح پھدکنے لگے گا۔ اور جہاں اس کا من بھائے گا منہ اٹھا کر چل دے گا۔ بظاہر کئی حرکتیں کرتا رہا مگر جو چاہتا تھا یا محسوس کر رہا تھا؛ ہلنے جلنے، چلنے پھرنے سے پورا اظہار نظر نہ آتا تھا۔ بدن کے اندر تشنگی سی پیدا ہو رہی تھی۔ چاہتا تھا کوئی قوت راہ میں حائل نہ ہو۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک ایک کا جائزہ لیتا رہا۔ یوں معلوم دیتا تھا جیسے ان کی عمر کا بھی اندازہ لگا رہا ہے۔ جس ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑ رکھا تھا اس کی گرفت میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر ضرورت کی چابی نگاہ میں تھی۔ اسے انگلیوں میں دبا کر سیف کی طرف بڑھا۔ لوہے کا بھاری اور مضبوط دروازہ ایک ہی جھٹکے سے پرے ہٹا دیا اور قدموں پر کھڑا کھڑا سیف کے اندر دیکھنے لگا۔ کرنسی نوٹ، سونے چاندی کے سکے آنکھوں کے سامنے تھے۔ زندگی کی ہر دھڑکن دولت کو چپ سادھے دیکھ رہا اسے کہیں سے کہیں بہا کر لے گئی۔ سناٹا اور غنودگی کا عالم طاری تھا۔ پر اس کا فولادی پنجہ پھیلتا اور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جو کچھ بھی اس کی کشادہ مٹھی میں آیا کھینچ لیا۔ کچھ ادھر کچھ ادھر دونوں جیبیں بھر لیں اور خدا کی بخشش پر ایک زہر آلود طنزیہ مسکراتے ہوئے سیف کو پھر مقفل کر دیا۔

وہ ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں ہوتا ہوا صحن میں آ گیا اور ڈیوڑھی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ مستعد اور بے فکر۔ نواسے، نواسیوں، پوتے، پوتیوں کا شور، گھر کی گہما گہمی کانوں میں سمائی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت موجود تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کچھ پھاند گیا —— باہر آیا تو سرد سرد ہوا سے دوچار ہونا پڑا۔ پیشانی پر گرم گرم پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ شانوں کو جھٹکا اور سر بلند ہو کر تن گیا۔ نواسے نواسیوں، پوتے اور پوتیوں کو، نیم کے درخت کو، اپنی عمر کو کسی کو خاطر میں نہ لایا۔ رخساروں کی سرخی پیشانی کی چمک دمک، اقبال کا ساتھ سب کچھ تھا۔ بغیر کسی الجھن اور سوچ بچار کے دور نکل آیا تھا۔ ادھر ادھر سے کئی آوازیں کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ ایک کھوپچے والے نے سامنے سے آواز دی۔ "چمن کا ہے میرا انگور، سونے کا کشتہ ہے، تازہ ہے تازہ۔ تازہ دم بناتا ہے۔" ابھی کھوپچے والا نظر سے اوجھل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ یکایک اسے بچوں کا شور سنائی دیا۔ جانے پہچانے بچے تھے۔ رلدو بابا! بابا رلدو کہہ کر لپٹ گئے۔ وہ اس سے پیسہ چاہتے تھے۔ یہ عادت اس نے خود ہی بچوں کو ڈال رکھی تھی۔ کہتا تھا ایسا کرنے سے اسے زندگی ملتی ہے۔ وہ تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ اور داناؤں کے ساتھ دانا۔ رلدو کا ہر وصف دنیا کو، اور اسے پسند تھا اور سب سے بڑی بات اس کی دولت اس کا دم بھرتی تھی۔ مگر اس وقت بچوں کو دیکھ کر بھی کچھ نہ ہوا نہ ان سے مخاطب ہوا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال دئے اور جو ہاتھ آیا نکال کر بچوں کی طرف پھینک دیا۔ کچھ سکے ابھی مٹھی ہی میں تھے۔ انہیں ٹٹولتا کھیلتا برابر چلتا رہا۔ موڑ کے قریب پہنچا جہاں ہمیشہ ایک اندھی بھکارن بیٹھی بھیک مانگا کرتی تھی۔ اس کی آواز پر کچھ سکے اس کی طرف بھی پھینک دئے۔ مگر چلنے میں ذرا فرق نہ آیا۔ موڑ مڑا ہی تھا کہ سامنے سے حسنا پہلوان مع اپنے دونوں مشٹنڈوں کے نظر آیا۔ حسنا پہلوان ہمیشہ بازار سے بڑے انداز میں گزرتا تھا۔ اس کا یہ انداز ہی تھا جو وہ پہلوان کہلاتا تھا۔ کانوں میں مرکیاں، گلے میں سونے کا کنٹھا، کلائیوں پر جڑاؤ کڑے، سفید چکن کا کرتا، ملتانی وضع کا تہبند، طلائی گلدار جوتا، سر پر سجی پوری مدین ٹوپی رہتی تھی۔ اس کا ایڑی اٹھا کر چلنا، بھاری بھرکم شانوں کو ہر سانس کے ساتھ جھٹکنا یہ حسنے پہلوان کے خصوصی نشان تھے۔ شہر بھر میں حسنے کا نام تھا۔ اس کے طمطراق اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک بازار سے دوسرے بازار تک جاتے جاتے دن کٹ جاتا تھا پر ملاقاتیوں کا جی نہ بھرتا تھا۔ حسنا تھا تو پہلوان مگر اس کی اخلاقی حالت

چمی تھی۔ مینڈھے حسے نے پال رکھے تھے کیا کمال کے تیار ہو رہے تھے۔ کہتا تھا ان کو سنوارنے اور بنانے میں جتنی ریاضت کی ہے یہ حسا ہی جانتا ہے۔ ان کی جسی سینگ جہاں ہلکی ہلکی ابھری تھیں اور یہ ابھرن حسے کے نزدیک اس کی محنت کا پھل تھا۔ نہایت نفاست سے تراشے ہوئے بال ہر سرا ہٹیں تھیں، اشارہ تھا ذرا سی حرکت پر تھنی اٹھا کر ہوا سونگھنے لگتے تھے۔ راہ گیروں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ بچے اکثر ان کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے، وہ جو ہنڈار اور شرارتی تھے، مینڈھوں کو چھوٹا پہلوان کہہ کر تنگ کرتے تھے۔ حسا ان پر ان کو زبردست ڈانٹ بتاتا تھا اور مینڈھوں کا رسا ڈھیلا چھوڑ دیتا تھا۔ بچے اس پر بڑے بڑے عجیب و غریب آوازے کستے تھے اور پہلوان کو بچا بھلا کہتے الٹے بھاگتے تھے۔ وہ غصے سے کانپتا تھا پر موٹے موٹے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ حسے پہلوان کے مینڈھے حسے کو پہچانتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ہوں جب وہ ان پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تو وہ ایک اطمینان محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس کی شخصیت پہ اتراتے تھے اور جب ایسا ہوتا تھا تو ان کا صحت مند جسم بھیگے لیپے لگتا تھا اور ان کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی تھیں۔ حسے کی بے کاری کا قصہ سلجھانے سے بھی نہ سلجھتا تھا۔ رلدو نے جب حسے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو اس نے اس سے آنکھیں ملانے میں دریغ نہ کیا۔ حسا اس کا پروردہ تھا۔ اس نے رلدو بابا کو دیکھتے ہی بڑے احترام سے کہا۔ آج تو میرا دادا جوش جوانی میں حسے سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہ الفاظ وہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے مینڈھے رلدو پر پل پڑے پہ رلدو نے بڑی بے پروائی سے دونوں کو پرے دھکیل دیا۔ حسا بابے رلدو کی اس حرکت پر ششدر سا ہو کر رہ گیا اور مینڈھوں کو دوبارہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس کی طرف جھکتے۔ حسا پہلوان آنے بہلنے اس وقت رلدو سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ آج غیر معمولی طور پر چڑھا جا رہا ہے۔ جب تک حسا رلدو بابا کے سامنے کھڑا رہا تو اس نے مینڈھوں کو پکارا اور نہ قصداً کوئی ایسی حرکت کی کہ اسے جواب دینا پڑتا۔

رلدو نے حسے کی مدافعت کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ویسے بھی اسے اس کی بے کاری نہ بھاتی تھی اور نہ اس نے اس بات پر غور کیا کہ پہلوان ایسی غیر معمولی شخصیت سے متاثر تھا۔ وہ اس کا سرپرست ضرور تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے خائف تھا۔ محض اس لئے کہ وہ شہر کا ایک نامی پہلوان تھا۔

بابا رلدو کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا اور حسا یہ محسوس ہی کرتا رہا کہ اس نے اسے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پہ کھڑا رلدو بابا کے الفاظ دہرا رہا تھا ——— بڑے آئے جوان۔ جوانی نام ہی اور جنس کا ہے۔ بچو تم نے اتنا پانی نہیں پیا جتنا ہم نے گھی کھایا ہے۔ حسا دودھ اور گھی کے چکر میں اتنا الجھا کہ رلدو اسے نامی پہلوان، بڑے پہلوان کہہ کر پکارتا تو وہ پھر بھی نہ سنتا۔ اسے اپنی بے کاری کے احساس کا صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا دولت کس کے پاس نہیں ہوتی۔ خوشیاں کس نے نہیں دیکھیں۔ مگر یہ رلدو بابا کی خوشیاں اور امنگیں رلدو بابا ہی جانے۔ دولت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

رلدو بابا تھا۔ اس کی عمر بھی بہتر سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس کی مصروفیتیں بھی دوسروں سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ تھا وہ تھا سب کچھ تھا۔ پر وہ ہفتہ میں ایک بار حنا ضرور لگاتا تھا۔ ہر دوسرے روز ایک پر تکلف جوڑا بدلتا۔ عطر لگاتا۔ فلم دیکھنا اس کا ایک من بھاتا شغل تھا۔ سیر تماشے، شکار، بندوق اور آتش دان کی مجلسیں ناقابل فراموش تھیں۔ اس پر بھی تشنگی بڑھتی رہتی تھی اور وہ اسے کبھی نہ بھولتا تھا۔

ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ جوں جوں وہ بازار کو چیرتا بڑھتا چلا جاتا تھا اسے ٹھنڈی اور تیز ہوا نہایت خوشگوار اور بھلی معلوم دے رہی تھی۔ وہ ذرا اور ابھرا، قدم تیز ہو گئے۔ جسم تن گیا۔ رگ رگ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے جذبات کی رو میں بہتا گیا۔ جذبات کا تار نہ ٹوٹا۔ اس وقت جب رلدو مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اذان ہو رہی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ تقدس سے سر جھک گیا۔ ادھر ادھر مڑ کر آگے پیچھے دیکھا اور مدوجزر میں بہت دور نکل گیا۔ طبیعت پر بوجھ محسوس ہوا تو واپس لوٹ آیا۔ غلبے کی صورت مسجد کی سیڑھیاں چڑھ گیا جیسے سارا بناؤ سنگار اس جذبے کا حل تھا۔

بازار میں پہنچا تو پھر ایک سرسراہٹ کروٹیں لینے لگی۔ وہی آرزوئیں وہی ارادے ساتھ تھے۔ چہرے پر وہی سرور وہی انبساط کے نشان تھے۔ بالکل ان تھک جدوجہد رہا تھا۔ ایک رنگین تجسس اس کا پیچھا کرتا رہا اور وہ ارادۃً اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

چلتے چلتے بے وجہ ایک پان فروش کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کبھی پان کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور کبھی سگرٹ کی طرف۔ پان کھاتا تھا نہ سگرٹ پیتا تھا۔ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور جو چاہتا تھا حلق سے باہر نہ نکلتا تھا کہ ایکا ایکی بازار کے سرے پر سے ایک شور اٹھا۔ شور میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایک بپھرا ہوا سانڈ بھاگا آ رہا تھا۔ راہ گیر مارے ڈر کے بھاگے جا رہے تھے۔ کیا بوڑھے، کیا جوان عورتیں اور بچے دیواروں سے چپٹے کھڑے تھے۔ رلدو اپنے بل بوتے پر سانڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور چٹان کی طرح ڈٹ گیا۔ اس نے بغیر سوچ بچار اور ہچکچاہٹ کے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سینگوں سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں ادھ مرا کر دے گا کہ سڑک کے درمیان اسے چند خوش پوش لڑکیاں بھاگتی، چلاتی اور بے دست و پا نظر آئیں۔ کسی کا پرس گر گیا تھا۔ کسی کی ساڑھی کا پلو الجھ گیا تھا۔ بابا رلدو پوری مردانگی سے بڑھا اور ڈٹ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ سانڈ سے دوچار نہ ہوا تھا کہ سانڈ راستہ چیر کر نکل گیا۔ اک اور شور بلند ہوا۔ سارے کا سارا بازار رلدو بابا کی یہ جرأت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ لڑکیاں دیر تک اس کے ساتھ لگی کھڑی رہیں۔ انہوں نے جی بھر کر رلدو کا شکریہ ادا کیا۔ رلدو کی مسکراہٹ میں لڑکیوں کی سی چاشنی نہ ہو لیکن وہ مطمئن تھیں اور کہتی جا رہی تھیں، بپھرے ہوئے سانڈ کا مقابلہ آسان تھوڑا ہے۔

اب وہ گڈ بازار کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ انبساط سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے قرضدار مولو کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مولو رلدو بابا کا قرض دار تو تھا ہی مگر وہ ویسے بھی رلدو بابا سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ اس کا اور رلدو کا سامنا نہ ہو۔ اگر اتفاقیہ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ بچا کر نکل جاتا تھا۔ آج بے وقت گڈ بازار میں بابے رلدو کا اسے نظر آنا اس کے لئے تعجب سے خالی نہ تھا اور جبکہ رلدو بابا اس کے چال چلن سے واقف بھی خوب تھا۔ مولو گھبراس افراتفری میں اور تو کچھ نہ سوجھا وہ پاس کے ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں داخل ہو گیا اور چھپ کر گدلے سے شیشے کے اندر سے بابے رلدو کو دیکھنے لگا جو ہیئر کٹنگ سیلون کے دروازے سے لگا ہوا تھا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس نے خیال کیا یہ رلدو آج بے وقت اس جانب اس کی تلاش ہی میں آ نکلا ہے۔

گڈ بازار کا نام اصل میں کھنڈ بازار تھا اور جب سے چھاؤنی والوں کی آمد و رفت اس بازار میں ہوئی ہے اس بازار کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ مدراسی، گورکھے، چھاچھی تو دھندے کے لئے آتے ہی تھے مگر جب سے چھاؤنی کا زور بڑھا ہے گورے بھی منہ اٹھائے نجات تلاش کرنے چلے آتے ہیں اور یہ ان کی زبان دانی کا کمال ہے کہ انہوں نے کھنڈ بازار کو گڈ بازار بنا دیا تھا اور وہ گڈ بازار کا مفہوم بھی خوب سمجھتے تھے۔ آتے تھے تو اس نام پر پھبتیاں بھی کستے تھے۔

جوں جوں وہ بازار کی رونق میں پہنچتا گیا اس کی امنگیں بڑھتی گئیں اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کی دھڑکنوں کا مزہ لیتا رہا —— کوئی اس کے شانوں سے شانہ مار کر نکل جاتا تھا اور کوئی نہایت بے تکلفی سے نگاہیں اوپر اٹھائے چوباروں پر بیٹھنے والیوں کو گھور رہا تھا۔ اس ہماہمی میں اگر کوئی اتفاقیہ اس سے ٹکرا بھی جاتا تو اسے کوئی صدمہ نہ ہوتا تھا اور نہ اس کے وقار میں فرق آتا تھا۔

ایک لذت، ایک سرسراہٹ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ اس طرح ٹہلنے اور سینہ تاننے کسی نے نہ کیا اس نے خود بھی اپنے تئیں محسوس نہ کیا تھا۔ روشنی کی زیادتی سے ایک چکا چوند سی پھیلی تھی۔ بازار میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ ہر کوئی انتشار اور جنسی لذتوں سے کھیلتا جا رہا تھا کہ دور دو شرابیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کا سر بوتلوں سے توڑنے پھوڑنے پر تل گئے تھے۔ ایک کہرام بچ رہا تھا۔ تماشائیوں نے سارا بازار سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ایک مجذوب جنسی لذتوں کا مارا وحشیانہ طور پر بھاگا آ رہا تھا۔ وہ پان والے کی دکان سے پان اٹھا لایا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے رلدو کے سامنے آ کر رک گیا۔ رلدو نے بھی بڑی بے نیازی سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور سکے نکالے اور

بغیر کسی جانچ پڑتال کے مجذوب کی دین بڑھا دیے۔ مجذوب نے سکے تو لے لئے مگر بڑی بے پروائی سے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور سکے بکھیر دیئے۔ جب زمین پر سکوں کے گرنے کی مختلف آوازیں پیدا ہوئیں تو ادھر اُدھر بیٹھی ہوئی کسبیوں اور رنڈیوں میں ایک قہقہہ بلند ہوا جیسے سب نے مل کر رلدو اور مجذوب دونوں کو داد دی ہو۔ اتنے میں مجذوب رلدو سے چمٹ گیا اور اس نے جی بھر کر رلدو کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ لذت یا ارتعاش سے تھرتھرا رہا تھا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو رلدو کو پکڑ کر گل فروش کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ وہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دے۔ رلدو نے وہی کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ مجذوب کا دل بھر آیا اور وہ جی سے دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔

پان سگرٹ بیچنے والے کی دکان کے ایک پہلو میں ایک چنچل سی رنڈی بیٹھی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے رلدو کو دور سے تاکا تھا۔ اس نے رلدو کو اشارہ کیا، اس نے ظاہر کیا وہ اس کی منتظر ہے مگر وہ منہ موڑ گیا۔ موڑ پر وہ ایک دوسری سے دوچار ہوا مگر وہ رلدو کی چمکیلی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی طرف سے ظاہر کرتی رہی وہ داشتہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنا چاہتی ہے مگر رلدو اس کی پیشکش کو خاطر میں نہ لایا اور نہایت اطمینان سے اپنے مقصد کا پیچھا کرتا رہا۔

اس نئے چوک میں نئی دنیا تھی۔ سب کچھ دیکھنا بھالنا تھا۔ مگر توجہ نہ دی۔ اس خیال سے بھی کہ آخر ہر کوئی رلدو تھوڑا ہے ——— گڈ بازار میں رلدو اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گڈ بازار کے بسنے والے اپنے حقیقی رنگ میں بسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ واقعات کی سرستیاں جنسی حدود سے بھی تجاوز کر رہی تھیں۔ قرینے سے بیٹھی ہوئی کسبیوں کی سج دھج اور ان کے زرق برق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا رک جائے۔ قدم قدم چلنے لگے۔ اپنا آپ بیچنے والیوں کو جی بھر کر دیکھے مگر قدم ایک پل کے لئے بھی نہ رکے اور نہ وہ تقدس سے جھکا۔ اس کی بائیں جانب ایک کسبی سر بازار کھڑی تھی۔ اس نے جرأت کر کے رلدو کو بازو سے پکڑا مگر جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اس کے جلال و جمال کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ایک اور کسبی جس کے گال کچھ پچک گئے تھے مگر آنکھوں میں زندگی تھی، حسن تھا، سب کچھ تھا۔ مگر ذرا سی مایوسی سے راہ گزروں کو اشارے کرنے پر اور بلانے پر اتر آتی تھی۔ اس نے بھی رلدو سے سودا کرنا چاہا مگر رلدو کی گاہکی کا طریقہ ابھی وضع نہ ہوا تھا۔

ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر ایک سیاہ فام لڑکی بیٹھی تھی وہ مشکل سے پندرہ سولہ سال کی معلوم دیتی تھی۔ اس کی جلد باوجود سیاہ ہونے کے خون کی سی معلوم دیتی تھی۔ اس میں لطافت کچھ اس طرح نکھر آئی تھی جیسے برسات کے بعد پتے خود بخود چمکنے لگے ہوں۔ بدن سڈول اور تناؤ سے بھرپور۔ وہ خوش وضع تھی۔ شکل و صورت میں ملاحت پائی جاتی تھی۔ غازہ لگنے سے اس کا حسین چہرہ اُودا اور سرخی مائل نیلا نیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس نیلے رنگ نے روشنی میں ایک ایسا طلسم پیدا کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ نگاہ اس پر اٹھتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ اسے غازہ لگانے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ رلدو کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ للچا اٹھا۔ وہ فیصلہ کر بھی نہ پایا تھا کہ کوئی دوسرا جو بڑی جرأت رکھتا تھا بغیر سوچے سمجھے سیاہ ناگن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا اپنا رنگ سفید تھا۔ عینک کے اندر سے آنکھوں کی چمک بہت بھلی معلوم دے رہی تھی۔ بارونق چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بغل میں چند کتابیں تھیں۔ اوپر والی جیب میں فونٹین پن اور پنسل دونوں قرینے سے لگا رکھے تھے۔ اس سیاہ فام چھوکری کسبی نے اس کا استقبال بڑے سلیقے سے کیا اور اپنی الگنی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بازار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ رلدو کو اس کے جی بھر کر نہ دیکھنے کا صدمہ تھا۔

ایک اور بلبلی سی بازار میں ادھر اُدھر پھدکتی پھرتی تھی۔ نظر تو یہی آتا تھا کہ اس نے اپنی بے قدری کر رکھی ہے مگر فطرتاً وہ چالاک تھی اپنے پیشے کی نوعیت کو خوب سمجھتی تھی اور اپنی برائی بھلائی کو کبھی نظر انداز نہ کرتی تھی۔ اگر کوئی اس کی بے تکلفی اور بے نیازی کو دیکھ کر اس سے دام پوچھ بیٹھتا تھا تو وہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس نے رلدو کو ایک بے بہا دینے والی شخصیت سمجھ کر اس کے دل کی

دھڑکنیں گنیں اور دوسروں کی پرواہ نہ کی جو اس کے گرد دیر سے چکر کاٹ رہے تھے اور اسے ایک روح پرور مجبوب سمجھ رہے تھے مگر رلدو اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔

کئی ایک کسبیوں نے رلدو کا راستہ بھی روکا۔ کئی ایک نے اسے بازوؤں سے پکڑا، اشارے کئے مگر وہ بغیر اپنی رفتار کو کم کئے اپنی دُھن میں جیسا تھا۔ اس کا بدن پسینہ سے تر تھا۔ اس کا اضطراب اب دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے جرأت والیوں کی دل ہی دل میں داد بھی دی مگر وہ یہ داؤ نہ ہارا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے مقصد سے دور ہے ـــــــ متانت سے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا یہ تو جگہ ہے جہاں نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے اور نہ اچھے بُرے کی پہچان۔ چند قدم ہی بڑھا ہوگا کہ دو نوجوانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میری نگاہ ہرگز ہرگز دھوکہ نہیں کھا رہی یہ بابا رلدو ہے۔ دوسرا بھی پورے اعتماد سے بولا دماغ تو نہیں پھر گیا تمہارا۔ کہاں یہ گندہ بازار اور کہاں بابا رلدو۔ دونوں میں شرط تک نوبت پہنچ گئی۔ وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے مگر رلدو نے بھی اپنے اعتماد کو ہاتھ سے نہ دیا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ بھونچکا سی ہو کر رہ گئی۔ مگر اندرونی طور پر اتنی خوش تھی کہ بازار بھر میں کوئی اس کی اس خوشی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ آج بن بلائے، بن مانگے رحمت چل کر اس کے پاس آ گئی ہے۔ رلدو روایات کا دیوتا مگن باوقار طریق سے بیٹھا اس کے انگ انگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت احترام سے جھکی چپ چاپ اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ اگر اس کی روح میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی تو جسم پر بھی نیکی اُبھر آئی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے روئیں روئیں سے کوئی خوابیدہ قوت بیدار ہو رہی ہے۔ وہ شدت انبساط سے اٹھ کھڑی ہوئی تقدس سے جھکی جھکی دروازے کے پاس پہنچی تو ملازم نیچے کھڑا آوازیں دے رہا تھا "نازلی بی بی! نازلی بی بی" اصل میں وہ رلدو کے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ نازلی انہی قدموں پر نیچے اتر گئی اور جاتے ہی اس کا گلا دبا دیا اور بڑے نرم سے لہجے میں کہا دوبارہ آواز نہ نکالے۔ خود خوشی میں لڑکھڑاتی پھولے نہ سماتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں چلی گئی۔ اول تو جرأت نہ ہوتی تھی کہ رلدو کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔ دوسرے یہ بھی چاہتی تھی کہ آئی رحمت کو کوئی دیکھ نہ پائے، کوئی سُن نہ پائے۔ بے سمجھے سمجھے غسل خانے میں جا پہنچی اور جاتے ہی ہونٹوں کی سُرخی اور رخساروں پر سے غازے کو دھو ڈالا۔ بال الٹے سیدھے کر کے صورت کو سیدھا سادہ بنا لیا۔ نہ سمجھ سکی اور نہ دیکھ سکی کہ وہ اس سادگی میں اپنے معصومانہ انداز سے کیا کی کیا بن گئی ہے۔

نازلی بازار والیوں سے ویسے بھی کچھ مختلف واقع ہوئی تھی۔ لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے آدھی ڈھکی ہوئی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سینے پر سے باڈی کو پیچھے کی طرف سرکا دیا تھا۔ رخساروں پر خوشی کے آنسو آ ٹھہرے تھے۔ اس خواب گاہ کی جہاں وہ اپنے گاہکوں سے ملتی تھی، روشنی بجھا دی تھی۔ زندگی کے بارے میں وہ لمحہ بھر کے اندر اندر اتنا کچھ سوچ گئی تھی شاید اس سے پہلے اس نے ساری زندگی میں اتنا نہ سوچا ہوگا۔ وہ تھرتھرا اٹھی۔ کبھی باہر آنے کی کوشش کرتی اور کبھی سامنے والے دریچے سے ادھر اُدھر جھانکتی اور پھر اندر چلی جاتی اور تخلیہ میں بیٹھ کر اپنے بھاگوں پر غور کرتی اور سوچتی آخر کرے تو کیا کرے ـــــــ اس کے پاس خدا کی رحمت چل کر آ گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکی تھی ہوش بھی بجا نہ رہے تھے۔ رلدو اس کی ان حرکات سے بوکھلا اٹھا۔ وہ سارا بازار چھپا پھرتا اس تک پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا آخر رنڈی ہی تو ہے۔ وہ رنڈی کے پاس آیا ہے۔ اس کے آ جانے سے وہ اتنی خوش اور بے قابو کیوں ہوتی جا رہی ہے ـــــــ پر وہ رلدو کی آمد کو قدرت کا کرشمہ اور معجزہ سمجھ رہی تھی اور کہتی تھی وہ انسانیت کا آئینہ دار ہے۔ آج اسے ایک انسان سے واسطہ پڑا ہے۔ جرأت ہوتی تھی اور نہ اسے کہہ سکتی تھی کہ وہ کس طرح اپنا دکھ درد کہنا چاہتی ہے کس طرح اپنی کیفیت کے اظہار کے لئے دل چیر کر سامنے رکھ دینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے نازک احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے یہی چاہتی تھی کہ آنے والا خود ہی اس کے جذبات، اس کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ وہ سمجھتی آئی رحمت میری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گی۔ اس کا

سیاہ و جلد میرا رازدار بن جائے گا اور کہے گا وہ اسے اچھی طرح سے سمجھ رہا ہے اور اس کی بخشش اور گناہوں کا کفارہ دینے میں اس کا مددگار رہے۔

رلدو چاہتا تھا وہ نازلی کرحتے پہلوان کی طرح ایک جھٹکا دے اور اس سے بے تکلف باتیں کرتا چلا جائے اور اپنے قرض دار برابر کی طرح اس کی عزت نہ کرنا نہیں دے دے لیکن نازلی کی بے کلی اور گردن کا جھکاؤ دیکھ کر سمٹ سا گیا ——— نازلی آخر ایک کسبی تھی۔ اسے اپنے اندر کئی طوفان اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے ——— کسی ہمسائی کو آواز دی۔ ملازم کو پھل پھول اور چائے دینے کا اشارہ کیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ جو کچھ بھی وہ کرے بڑے عقیدے سے انجام دے۔ نازلی اپنی دوسری بہنوں سے کچھ زیادہ ہی توہمات کی قائل تھی۔ دل بیٹھا اچھل رہا تھا اور رہ رہ کر دھیان اس طرف جاتا تھا کہ سارے بازار کو اپنے کوٹھے پر آنے کی دعوت دے اور سب کو زندہ کرامات، رحمت صورت ملدو دکھاتے۔ اور کہے بخشش کے طریق ہمیشہ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

دہلیز سے آگے بڑھا ہی تھا تو اس نے یقین کر لیا تھا آنے والا زندگی کا تمام بوجھ ہلکا کر دے گا۔ اس کی برکت نازلی کو دنیا پر بھاری بنا دے گی۔ اس کا نورانی چہرہ، فرشتہ صورت، سرخ داڑھی اسے وہ کچھ دے گی جو آج تک کسی نے کسی کو نہ دیا ہوگا۔ اس کا نامۂ عمل جو مدتوں سے سیاہ ہو چکا ہے، دھل جائے گا۔ وہ نئے قالب اور نئی روح میں ڈھل جائے گی۔

اس نے اپنی دولت، حسن اور شیریں کلامی پر بھروسہ نہ کیا۔ صرف عقیدت مندی سے اپنے پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتی رہی اور سمجھتی رہی آنے والا بھی اس کے خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا اور وہ دیکھتے دیکھتے دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز ہو جائے گی ——— اس نے بڑھ کر جرأت سے اپنے پورے خلوص سے اس کی گردن میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور خود تقدس سے اتنی جھک گئی کہ اس کا چہرہ بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہر کمزوری کو انتہائی طور پر چھپانے کی کوشش کی کہ رلدو اس کی معصومیت اور معصیت کے فرق کا اندازہ نہ کر سکا۔ ارادے باندھتا رہا۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

آخر کار سادہ دل نازلی اپنے گھر کی زینت بن مانگی رحمت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک انمول سی روشنی کھیل رہی تھی اور اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ یقیناً وہ اس وقت ایک عورت معلوم دے رہی تھی جس کے سینے میں گداز دل اور نیک آرزوئیں ناچ رہی ہوں۔ بار بار ایک آرزو، ایک سوال اس کے ہونٹوں تک آتا مگر وہ رلدو کا جلال دیکھ کر رک جاتی اور حیا سے آنکھیں جھکا لیتی۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ نازلی جوں کی توں دوزانو بیٹھی رہی۔ بازار کی ہاؤ ہو میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ روشنیاں مدھم ہوتی جا رہی تھیں رلدو کہتا تھا۔ دنیا کچھ نہ کہتی تو وہ بہتر سال کا جوان اور اڑھائی سو سال کا بڑھا ہوتا ——— نازلی کا دل اب دھڑک رہا تھا۔ رلدو اب اور بھی اس کے قریب تھا۔ اس کا بازو ایک اجنبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھا اور اس کی کمر کے گرد حائل ہو گیا۔ غمزدہ عورت سہم گئی۔ وہ آبدیدہ سی ہو گئی ——— "تم عورتیں اپنی اپنی قیمت کے مطابق محبت کرتی ہو ——— تم چپ ہو ——— شرما گئی ہو؟ میں تمہارے پاس تمہاری قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔ بھاری سے بھاری قیمت جو تم نے کبھی وصول نہ کی ہو۔" اس کا جسم سرد ہو گیا۔ گویا کسی نے اسے کسبی، حرامزادی، گشتی، دو کوڑی کی رنڈی کہہ دیا ہے ——— رلدو نے اسے زور سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ نازلی کی آنکھوں میں غیر معمولی روشنی موجود تھی ——— وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کیا چاہتی تھی۔ ابھی تک واقعات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا تھا۔

رلدو نے کھینچ کر نازلی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے دہکتے ہوئے لب اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور جب اس کا مضبوط اور بے باک ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گیا تو معاً اسے خیال آیا کہ وہ پیشے میں بیٹھی ہے۔ بکنے کے لئے، بار بار بکنے کے لئے۔ ہر آنے والا اس کا گاہک ہے۔

(۹)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

اشفاق احمد

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا، اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا ——— اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچے" میں نے ادنگھے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہو —— دفع ہو جاؤ —— میں نہیں —— میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا —— داؤ جی کے بچے —— کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی ...... اور میں بھی —— میں بھی ...... میں بھی" اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرے جاتے تھے، اور کہہ رہے تھے، بس اب چپ کر شاباش —— میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے راتو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو ......"

"نہیں نہیں" انھوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا —— شاباش اب بتا" تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے رو ٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا!"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے" انھوں نے سر سے ہاتھ اُٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کرتا!" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنانِ گزمہ خانہ را فورا توقیف کردند ——— کارکنان گزمرخانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے۔ نئی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو دادجی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھولنا نہیں! صبح اُٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے اُدھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں مُلّا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے ٹیڑھی ترچھی لکڑیوں اور خار دار جھاڑیوں کا اُونچا اُونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا تھا۔ پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا۔ اور فاصلے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں۔ اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہوگا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید سی مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پہ خالی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹھکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی ٹٹھیار کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا۔ اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گذرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کہا "داؤجی سلام۔"

اور داؤجی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو!"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنی منمنی آواز میں چلایا "داؤجی سلام"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو!" انھوں نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹاخ سے میرے زناٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کتے! وہ چینا جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا مزدرت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ۔ بھلا کون ہے وہ؟"

"دادُو جی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون دادُو جی؟" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کُتا ——— شیخی خورا!"

میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ دادُو جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

دادُو جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کرنے لگا ہوں کہ اس وقت گذرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دوچند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اُٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ——— سلام کا یہ سلسلہ کئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ دادُو جی گیروا رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں۔ اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر" مگر خدا کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا، تو وہی دادُو جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ دادُو جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے زیادہ ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی۔ اور چہرہ بلّی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں دادُو جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لئے وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا۔ اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن۔ سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ تلسی کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیروا رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں، اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر "بے بے نمستے" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے"

مشین رُک گئی

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے دادا جی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "امی جند کے ساتھ آیا ہے"

اندر سے دادا جی برآمد ہوئے۔ انھوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اُتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی پانی کی ہلکی سی بالٹی اُٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گول مٹول سا ہے" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس کا کاٹھ کا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اُٹھا کر انھوں نے آہستہ سے انھیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انھوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا"

"کیا لکھتا ہے"

"پتہ نہیں جی ابا جی کو پتہ ہے"

"اچھا" انھوں نے سر ہلا کر کہا "تو ابا جی سے پوچھا کرنا ——— جو پوچھتا نہیں سے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انھوں نے ویسے ہی چپ چاپ ٹانگوں پہ پانی ڈالتے ہوئے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تِلْکَ الرُّسُلْ" انھوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے کی مشین چلتی رہی۔ وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی جند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اُترتا جا رہا تھا، معاً دادا جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا ———

"سورہ فاتحہ سناؤ"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انھوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمد للہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمد للہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!!" پھر انھوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔ جب میں سنانے لگا تو انھوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا۔ اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا۔ اور جب میں نے وَلَا الضَّالِّین کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اُٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی دفعہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انھوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤجی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ اور بھی بیٹھ رہے گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں۔ نعادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤجی سلام" اور انھوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا "جیتے رہو"

بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کرو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں آجایا کر" داؤجی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انھوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کنجوس ہیں، حد سے زیادہ چُپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے اباجی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے" پھر اماں نے ہمدردی کر کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں اباجی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤجی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آ گیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا" اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں! پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے ایک سوال نکالو۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کر ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنگ کر جواب دیتا "جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ پچکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گولو ——— میں جو سکھاتا ہوں ——— سنو! فارسی میں بوریا عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سنی ان سنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا، عربی حصیر۔ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤجی کے الفاظ گھسنے چلے جاتے تھے ——— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤجی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے، لیکن اس کے وہ بھی جب پڑھتے پڑھتے تھے وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤجی نے کتاب سے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈوڑا کو ہوں لیا ہے" اس نے گلاس کے ساتھ منہ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤجی پھر پڑھنے میں

مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے اکیلے دادا جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تا شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور دادا جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں"، اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پہ اتر آتی۔ بی بی ٹوکتی تو دادا جی کہتے "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹیا اور گالیاں برسنے کو، تم انہیں روکو مت، انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجہ سے ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجونوں کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں، اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریروں، حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے، ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا، میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستانِ امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا۔ اور صبح دیر تک سویا رہتا، اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں، ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا، لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی، اور دن کلاس میں بینچ پر کھڑے ہو کر، سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا، ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانۂ آزاد، اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے، فسانۂ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے، لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں نہاں رہتی۔ آخری بینچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا...... بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھؤوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پہ آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے اور اب کدھر جانا چاہیئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمر و عیار کے ہتھکنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پہ بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی۔ اور صبح سویرے اپنے سفر پہ روانہ ہونا تھا، چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پہ دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا گوڈو اور ولسیو بیب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ولسیو بیب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست نیم چند کے مشکوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو بیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر خدمت چاہی تو گوڈو جھک کر بولا "یار ولسیو سب جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر ولسیو سے پوچھا "انارکلی دفتر بنائیں گے نا؟"

ولسیو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔"

میں نے کہا "انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں۔

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آکر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی دار دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ دادو جی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے دادو جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔

"بے شک" میں نے ایک مہذب سیلز مین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے، حرامزادے، ابھی تیری یہ سب . . ."

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" دادو جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو . . ."

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی۔ اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔"

"آپ فکر نہ کریں" دادو جی نے سر جھکا کے کہا "یہ تمہارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن . . ."

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کرے گا، کرے گا ــــ ڈاکٹر صاحب" دادو جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے۔"

اباجی ابھی تک غصے کے عالم میں بار بار جسم الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو دادو جی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

دادو جی مجھے ادھر ادھر گھمانے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اس پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انھوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے پوچھا

بند کر لیں اور کہا "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوّل نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا۔ . . . ."

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گوگو؟" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا۔ . . ."

اب کے دادو جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ان پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پرواہ نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی میں اپنے یہاں خوش"

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پرواہ نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ [illegible] اور بار بار پوچھنے لگے "میری بھی پرواہ نہیں؟"

"اور گوگو میری بھی پرواہ نہیں؟"

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر . . . . ." مگر انھوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا . . . . تو . . . تو . . . تو . . . . ." انھوں نے فوراً پگڑی اُٹھا کر سر پہ رکھ لی، اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاکِ پا۔ اس مدت بندہ ہو کر قلب سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟ خاندانِ ابوجہل کا خانزادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے جنتو کو منشی جنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمۃ اللہ علیہ کا کفش بردار . . . . . لوگ سمجھتے ہیں . . . ." دادو جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "دادو جی! دادو جی!" اور دادو جی "میرے آقا، میرے مولانا، میرے مرشد" کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اُٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ پل کی دیوار سے اُٹھے اور بولے "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے"

میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھسے پنساری یعنی دیسو بیب کے باپ کی دکان سے انھوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اُٹھا کر چل دیئے، میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا، اور وہیں پڑھا کروں گا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہریکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور پاں پاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انھیں لاہور سے پکڑ لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کر کے کونسے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا۔

دادو جی نے میری زندگی اجیرن کر دی، مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا، سارا دن سکول کی کلاس میں گذرتا، اور رات گرمیوں کی مختصر

رات، اس کے سوا وقت کا جواب دینے میں، کہ لیٹے یا ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے، اور وہ یونگ رسولی اور مرادہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں، میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے، تو وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں، میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے، اور انھوں نے پھر انہی نہروں کو آگے رکھ دیا ہے، میں بل جاتا اور جھنجلا کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا"، تو وہ خاموش ہو جاتے، دم سادھ لیتے، میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی لنگر بن کر پتلیوں میں اتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤ جی"

"ہوں" ایک گمبھیر سی آواز آتی۔

"داؤ جی کچھ اور پوچھو"

داؤ جی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ——— اس کی ترکیب نحوی کرو"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت مشکل فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دوں گا کوئی اور پوچھئے"

انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کہا "میرا گڈو بہت اچھا ہے"

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا بہت، اچھا صفت ہے حرف ربط مل کر بنا مسند ......

اور داؤ جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے ہاتھ اٹھا کر بولے جان پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بنایا کر"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ پنجابی کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں، روز بروز کہو یا دن بدن اسی طرح سے .. "

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملہ میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "داؤ جی اب تو نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد چاہے میں لاکھ بہانے کرتا ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا، مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے، بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

اسی جنہ کا یہ چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی۔ اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ پہلے سے بھی کسی قدر زیادہ، شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤ جی پرانے ملائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی، اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، علی الصبح اور وہ بھی صبح کی تقریباً سوئے نکلے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اٹھ گڈو، سورج نکل آیا" اور وہ بھی صبح کی ... دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کہتے رہتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا، مگر وہ ہمیشہ "بوڑھا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے، میں سنتا تو چڑ کر کہتا "بڈھا ہو جائے گا بنتا تو گھوڑے پر نسیم خان رہ کیسے کیا کرے گا!" اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤ جی خدا کے لئے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو، جان سے مار دو

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر صاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان دنوں بھی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤ جی ان سے بہت ڈرتے تھے، وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤ جی کو کوسنے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر دبا ہی رہ کر مجھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤ جی میری بیٹھک میں آجاتے، دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتے تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں، میں، میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی، ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا سخت رنگ کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا محراب دار اور آنکھیں چندھیاں سی۔ چلتی تو ایسی گربہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کُتی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بُری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤ جی سے پیار نہ تھا یوں تو بی بی بے چاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں داؤ جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "داؤ جی پڑھ نہیں رہا، تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے۔"

میں غصیلے بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا، نہیں پڑھتا، تو کیوں بڑبڑ کرتی ہے —— آئی بڑی تھانیدارنی۔"

اور داؤ جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ گڈو! بو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے۔"

داؤ جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤ جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤ جی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے ورنہ اسے کیا پڑی کہ مجھے تباتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے، مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤ جی کے یہاں آ جاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی داؤ جی سکول کی گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے، پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود دیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبے میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤ جی باقاعدہ کچہری میں گذارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آ جاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا۔ اس لئے وہ داؤ جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی —— ایک دن خلافِ معمول داؤ جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤ جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پہ بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے پرے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا۔ اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر

"چائے آج میں آپ کو پلاتا ہوں۔" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔

میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلیے، بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

داؤجی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے، تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔" پھر انھوں نے خوفزدہ ہو کر کہا "بس گرگٹ ہی اسکی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے داؤجی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس میں میں نے بے بے سے نہ کہنے کا ہی وعدہ کر کے ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤجی کے ہاں دودھ، پھل، اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤجی کو کبھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے عاجزانہ برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا لوٹا ان کے یہاں لے کر آیا تھا۔ بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساؤن کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی، اور گھر میں صرف داؤجی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤجی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دوکان سے گڑ لے آتا ہوں، تم پانی چولھے پر رکھو۔" بی بی نے جلدی جلدی چولھا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا، اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤجی گڑ لے کر آ گئے تو انھوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں۔" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ اِن ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤجی چولھا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گلیلیو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔" گلیلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔ پانی اُبل رہا تھا داؤجی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ "او گولو! او گولو! گلیلیو کی بات مت بھولنا، گلیلیو کی بات مت بھولنا۔" انھوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولھے پر ہی تھا اور داؤجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پاؤں کی تال کے ساتھ "گلیلیو! گولو گلیلیو" گائے جا رہے تھے، میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا، بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پر ڈال پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے پتے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولھے کی طرف دیکھا اور داؤجی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤجی کی کمر میں مارا اور کہا "بڈھے بڑھتا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر تہارا بھرے تجھے ہم بیٹھے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھے کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے جنازے میں کل کی مرتی آج مرو، تیرا اس راضی ہو۔ تیری آسیں پوری ہوں کس مرنے جوگی نے جنا اور کس بیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا۔ . . . تجھے موت نہیں آتی . . . اور ہوں تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے نے بھبڑنی کی طرح چوکے پر چڑھ کر کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولھے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے، اوہ تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ اندازِ فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لئے چاروں دیواروں سے

ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا۔ لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری ہمت نا بڈھے سے تیرا کیا ناطہ ہے۔ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟"

بی بی بچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ دادا جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے پاؤں سہلا رہے تھے پتہ نہیں انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا، انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ معصیتے"

تھوڑی دیر رک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سرِ مطہر پہ کبھی کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیمؑ مجھے جرأت عطا کرے اور مولائے ایوبؑ مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "دادا جی آقائے نامدار کون؟"

تو دادا جی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جانِ پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر، وہ میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی، اور میرے استاد بھی وہ تیرے دادا استاد ہیں۔ . . . . دادا استاد . . . . . ." اور انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت معجزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار دادا جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "دادا جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

دادا جی نے مسکرا کر کہا "جو طالب علم کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام جی ہیں وہ مسیحا نہ ہو آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا، اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر دادا جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ——— کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ——— حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا چرواہے لڑکے ہمارے پاس آؤ، میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ، پٹھار اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا، اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی ——— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بھئی ہم تم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو ——— پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمھارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو ——— حضرت مسکرائے ——— تھوڑا سا ہنسے بھی ——— فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہوگا ——— میں نے سر ہلا دیا ——— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا۔ پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں دھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پہ سرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری . . . . . .

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چراتے تھے داؤجی؟"

"ہاں ہاں" وہ فخر سے بولے "میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔"

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے" داؤجی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی۔ اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے "جانِ پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اِردگرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو اُن کے پاس بھیج دیتے ——— ان کا سارا خاندان زیورِ تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دُنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدِ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے، فارسی، عربی۔ جبر و مقابلہ۔ اقلیدس۔ حکمت اور علمِ ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہُوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحرِ علمی کی سب داستانیں سُنیں۔ شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومنؔ سے ان کے بڑے مراسم تھے۔ اور خود مولانا کی تعلیم دِلّی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ ......

مجھے داؤجی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا۔ اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا؟"

"ہاں" داؤجی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے "ان کی باتیں پھول تھیں۔ ان کی نگاہیں پارس تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے بندے موہ کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرّے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے ——— میں تو اپنی لاٹھی زمین پر ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا، اپنے بھائیوں کے پاس بوریئے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گذر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروفِ ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے ——— سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف، بے، پے، تے"، اور داؤجی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر کہا اُدھر مسجد تھی۔ اور اس کے ساتھ مجیبوں کا حوض۔ پھر انھوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "اور اس طرف مزارعین کے گھر تھے، دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ دریائے فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی . . .

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد با ادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا "حضرت مولانا کا اسمِ گرامی تشریف کیا تھا؟" تو پہلے انھوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انھیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤجی اچانک رُک گئے اور بولے "سب سٹڈی ایریا سسٹم کیا تھا؟ ان انگریزوں کا بُرا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوائے کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سٹڈی ایریا سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گلاس اٹھائی اور بولے "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا یا نہیں" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

داؤجی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے، تو وہ پکار کر کہتے "سب ایک ایک شعر سناؤ" پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ———

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "ادبیں شعر نہ سنوں گا، اُردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔"
میں کہتا مجھے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سنائے "
بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم درکشید
چو خسرو بہ اسمش قلم درکشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر اَرڈر اَرڈر پکارتے۔
بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم ——۔

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بٹیا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"
پھر وہ سب لے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک سنائے گی" مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر گبت۔"

اس پر داؤ جی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤ جی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گورو مورو کی شادی پر سُرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامے میں شہادت کے دستخط کرونگا۔ میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی، ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہشیار ہوگی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا ——— سُن گورو! پھر میں تیرے ہی پاس رہونگا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پہ بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا" پھر وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر جھکتے جھکتے خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جانِ پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی ۔ ۔ ۔ ۔ خوب ۔ ۔ ۔ یاد دارم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دُنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے ——— ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دُنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔

اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سوانگ یہ مسلم لیگ یہ بلیچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آئے گی۔

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لئے ہُوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات

نکل گئی جس سے دادا جی کو بڑا دُکھ ہوگا ——— میری اور امی چند کی تو خیر بانچھیں ہی تھیں، لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آگئی۔ جیجا جی رام پرتاپ کے بارے میں دادا جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انھوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اُترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی دادا جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے اُستاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی ہے، امی چند آنسو بہا رہا ہے۔ اور محلے کی عورتیں پھُس پھُس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور دادا جی میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں "آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔" جیجا جی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا، عورتیں ہوا کرنے لگیں اور دادا جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹیا۔ اُٹھو! یہ تو تمھاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ" بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے دادا جی سے لپٹ گئی۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاپ بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا جھکا سر تیرے سامنے خم ہے" یہ سُن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور دادا جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں میں بیٹی کو کریما پڑھا دوں گا" دادا جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو یہ پڑھ چکی ہے، گلستان، بوستان بھی ختم کرا چکا ہوں، لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی" اس پر وہ ہنس کر بولے "ساری گلستان تو میں نے بھی نہیں پڑھی۔ جہاں عربی آتی تھی آگے گذر جاتا تھا" ——— دادا جی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے، بی بی نے گوٹہ لگی سُرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ دادا جی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "تو بھی لڑکھڑا رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گودو.. .. او مردم دیدہ.. .. تجھے کیا ہو گیا...... جانِ پدر تو کیوں......"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان دادا جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو دادا جی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اُٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹیا لاحول پڑھو"

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

مانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا، بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اسی کا تھا اس میں بھینسیں بکریاں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام مانو گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر دادا جی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ دادا جی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن مانو نہیں مانتا تھا، اپنی مونچھ کو چبا کر کہتا "ارے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو وہی پنڈت ہوتا ہے" ——— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ۔ بی بی کے جانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "مورنی تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں مور کیا لے گا" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ نہا کے غوطہ

منگایا کہ نہیں" مجھے اس بات پر غصہ آگیا اور میں نے تانگوٹ گھما کر اس کے سر پہ دے مارا۔ اس ضرب شدید سے ٹوٹ وغیرہ تو برآمد نہ ہوا۔ لیکن وہ چکرا کر تختے پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں ڈنڈا دوڑا اپنے گھر گیا اور اباجی سے ساری شکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا۔ اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چیچی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی، لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں وہاں سنگھ میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پہ وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہوگا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو! میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے، ہنس کر فرمانے لگے جینت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لئے دوا نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر کر دوں لیکن میرا بس نہیں چلتا —— خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پہ میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے" —— داؤجی گزرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آگیا" "مستورات ایک طرف ہو جائیں" تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا، وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "بھئی جینت رام ان گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھاؤ" میں سبدِ گل کی طرح انھیں اٹھاتا اور کمر پہ لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو، کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے جینت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انھیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انھیں اس طرح جاتے دیکھا تھا اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے ہم جانتے ہیں جینت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پہ لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے —— جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انھیں سنایا۔ اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پہ پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجرِ اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے تجھے یہ سعادت نصیب کی۔ جینت رام تیرا مرشد جوان

کا پیشہ ہے نوش و ابھا کا بیر ہے! اس نے خدائے عزّ و جل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا تجھے اور کتنی خوشی میسر آئے گی . . . .

دادا جی یہ باتیں کرتے کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا۔ اور دادا جی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام چھپا دیا تھا۔ ایک مضمون سے ختم ہوتا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے، کھانے تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے، ورنہ نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے شام کے وقت سکول پہنچنے کا انھوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انھوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑ اور ضدی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ دادا جی کے نیچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی باتوں کی سختی بڑھ جاتی تو میں انھیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انھیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انھیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انھوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انھیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گودڑ انھیں بہت مرغوب تھا طنبورا دوسرے درجہ پر مسرت ہوتی۔ اور خفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سامنے جھول کی بجائے کر ضرب دے کر تنگ آ چکا ہوں تو پھر کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیئوں دسنا •

دادا جی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیئوں نیئوں نیئوں دسنا۔ تے دکھ تینوں نیئوں دسنا —— دسنا دسنا دسنا دسنا . . . . . تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گا ما رونا رونا رونا سارے گا ما رونا رونا —— تے دکھ تینوں نیئوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اٹھاتے، صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔

"سن بیٹے" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے؟" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا

"دیکھ بھیرو میں تیرا دادا نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچی سرکار" میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ سچی سرکار، وہ سب کا پالنے والا —— بول بکرے سب کا والی کون؟"

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "دادا جی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا —— مجھے پانی تو پی آنے دے!"

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا "دیکھی جب مجھے سوال سمجھانا ہوا دادا جی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "خفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہیں کرتا تو . . . . ."

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤجی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤجی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انھوں نے کہا کہ یاد ن پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انھیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح کو بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں حل کرا کے اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکتا تھا اور انھیں بہت کوفت ہوتی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤجی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے داؤجی کی عزت بچانے کے لئے یہ ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور کوئی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤجی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤجی نے میرا سر چوم کر کہا "ارے بھئی طلبہ بیٹے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا" پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا۔ اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انھوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے، میں سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا۔ لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں سے مجھے الجھن ہوئی تھی وہاں حضرت مولانا کی طبیعت رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "چیت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہئیے" میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر نقطہ میرے لئے حکم ربانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بہت جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی، میں نے سر جھکا کر کہا ارشاد! فرمایا "دلی میں حکیم ناصر علی سیستانی علمِ ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی بیائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔

چند روز بڑے اضطراب کی حالت میں گذر گئے۔ میں دن رات اس شکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ میں نہج مسئلہ

سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ توقع، وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے، آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی پوٹلی سے اس کی کل پونجی دو روپے چرا لئے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرمفرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مکتب کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ کھنڈر کے پاس جھک کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا "بدقسمت ہوں۔ بے اجازت جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔" اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا ——— سُن رہا ہے؟

داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی ؟"

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جاگل جنید بر سے حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا رستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا، اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں دلی پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی۔ لیکن گوہرِ مقصود کا سُراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ قول مشہور ہے جو بندہ یابندہ۔ آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی، وہ پتھر پھوڑوں کے محلہ کی ایک تیرہ و تاریک گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے۔ اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کرکے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے"۔ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسمِ گرامی" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور....." میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے "اوہو! چنت رام ہو؟" میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے "مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا۔" میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ تو پاٹ دار آواز میں بولے "میاں اندر آ جاؤ کیا چُپ کا روزہ رکھا ہے؟" میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروسِ نو کی طرح بیٹھے رہے پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ" میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا "بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔" پھر حکم ہوا "بتاؤ ہندسہ کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کُرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر ننگی ہو گئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک متساوی الساقین۔" مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے "میاں جلدی کرو۔ نابینا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔" میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتی ہوئی انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے "اب اس نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔" ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا۔ تو تیزی سے بولے

ہے ہے کیا کرتے ہو یہ مقدس ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے مقدس ہے وہاں خط کھینچو ——— اللہ اکبر، اللہ اکبر کیا علم تھا۔ کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر اُبھر آئیں گی۔" پھر دادو جی دلی کے دکھوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا دادو جی؟" انھوں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گذر چکی ہے اب تم سو جاؤ پھر بتاؤں گا" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انھوں نے کہا "پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ مایوس نہیں ہوگے اور ان چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو تماشے سمجھو گے" میں نے جواب دیا "ہاں سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں" انھوں نے کمرے سے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحرِ علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے "جنت رام گر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں۔" میں یہ سن کر رو دیا تو دستِ مبارک محبت سے میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے "ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔" یہ کہتے ہوئے دادو جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ دادو جی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے ننھے ننھے ہاتھ پکڑ کر کہتے "اسپ تازی بن طویلہ خر نہ بن۔" مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مون برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے جگایا اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اُٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور دادو جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے "ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورا بڑبڑا رہا ہے۔" تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کہتے "کوئی سُر نکال طنبورے کسی آہنگ پر تو یہ کیا کر رہا ہے!" جب ہم بستی سے دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو دادو جی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ مرداروں کا ہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی، قبرستان گذر گیا مگر دادو جی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب قصبہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں۔ اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو دادو جی نے میرے گلے کا گرم مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔

سامنے ان دو کنگروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑ دو۔ تب میرے پاس آؤ میں یہیں بیٹھتا ہوں۔ میں قصبہ سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کنگروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گذر چکا ہو گا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کنگروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس بھی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے پیٹ کی پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ قصبہ پر جا کر دادو جی کو سوئے ہوئے اُٹھاؤں اور گھر سے جا کر خوب خاطر کروں۔ غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ دادو جی قصبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور زور زور سے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔ ـــ

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے، اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو، سوچ لو، میں تمھیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمھیں بتا رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ سنا رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دھمکی دیئے جاتے تھے پھر تڑپ کر تھبکڑیوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بھاگ کر قصبہ کی طرف بھاگ گئے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داد جی ضرور اسمِ اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ کی تصویر والا جن تھا۔ جب داد جی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ——— تھوڑی دیر بعد داد جی آئے۔ انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا، "چل طنبورے" اور میں ڈنڈا ڈنڈا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انھوں نے مجھے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لمے لمے وال فریدا اڑ پاجا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ——— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح داد جی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی "بڈھے تو کیا یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری خارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں مر گئی، میں جل گئی، لوگو اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا سادھن کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے، میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" امی چند تو داد جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی شرارت ساری انھیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داد جی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے اور تیری بے بے ام الجاہلین ——— میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں فرق کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ ہائے وائے کہ تو شعور کی بجائے عورتوں کے ضعف کا غلام نکلا۔ افسوس ——— صد افسوس" بے بے کو اسی طرح بلبلاتے اور داد جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا۔ ——— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستے میں رالو نے بڑے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمھارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں!!"

میں نے اس مینڈک کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داد جی مجھ سے جن بھوتوں کی باتیں پوچھتے رہے "بیٹا کیا تو سچ مچ جن، بھوت یا پریت اور چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے "دوست نادان ہے اور میں نے خوامخواہ جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو دولت ہو پہلے مزدوروں کو بلا کر بہ ساتی بنوائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے کا کام

ہی کرتے ہیں کہ شتائی بھی کر سنے ہیں" "بیاسے مت ۔ لہٰذا جتنے مذاق چاہو کرو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا دادو" دادو جی سنے کہ
"تیرے جیسی کی چینی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لئے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے یہ یا تیری بے بلے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے "سن! علم طبیعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی ——— سمجھ گیا؟"
"سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ اور اس ہجوم سے دادو جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انھیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور دادو جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر وہ سم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے لے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟
"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ "اور وہ عورت" "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ——— "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟"

میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے مثالیں؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا۔ تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ ہر یک ان اور ہر یک ہاں تو ڑ کر فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ...... مادیاں گھوڑی ...... ماکیاں ...... مرغی ——— ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی اتوار کی صبح کو دادو جی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا دادو جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر! اسی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انھوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر للچائی سے پوچھا "کون سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "چار دیواری والا"۔ جھلا کر بولے "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہیر کی طرح جھلاتے ہوئے کہا "ہاں جی ہاں جی ——— گولی مارو کھڑکیوں کو" دادو جی دبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں بکار پکار کر کہتا رہا سطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع گئے ... پورے بیس نمبر ..."

اور دادو جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر تو ضرور دے گا، تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے" اس پرچے کے بعد دادو جی

امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا۔ وہ بے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ جوا مردوں کی گاستے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں COW ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر شخص جو اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی TO COW کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور میرا ان دنوں کی باتیں میں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ـــــــ پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار۔ بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر سامنا ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر ہوا کرتے۔ افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے میں شرارتاً خلیے خوب خیخوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور ابا جی لڈوں کی چھوٹی سی ٹوکری لیکر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر میں بیٹھے تھے۔ ابا جی کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اندر سے کرسی اُٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ لیکن نہ آسکی۔ بقیا دکھ رہی تھی۔ ....."

"ایک ہی تو نمبر کم ہے" میں نے چمک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے، "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے خیر میں اسے منیات اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر ابا جی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ۔ پتلون۔ اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتب ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور رکھتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر انہیں دیکھ جاتے۔ ان ہی چند وجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا۔ اور دلّی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی منتظر جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ـــــــ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپو ٹاپو کھیلا کرتی تھیں تہذیب کم بن گئی تھیں ـــــ بیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپو ٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔

انہی ایام میں مَیں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ اور ان پر نہ ابا جی کو خط لکھے جا سکتے تھے نہ ہی داؤ جی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤ جی سے ملاقات ہو سکی۔ نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسٹر گذر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے . . . . . ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلبے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں، ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لئے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی!! ایک دن ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی، اور دوناکوں پہ سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والے اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا۔ اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے، دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آکر بتایا کہ داؤ جی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤ جی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤ جی ایسے بے وفا تھے!——

کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو چاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔

"ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رفتگی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر کیا انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا!"

اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا "اوئے رانو جلدی آ——اوئے جلدی آ——تیری سامی——پنڈت——تیری سامی!"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ جیسے انھوں نے داؤ جی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔

یہ بڑا اچھا آدمی ہے بڑا نیک آدمی ہے——اسے کچھ مت کہو . . یہ تو . . . . . . یہ تو" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی——آگیا بڑا حمائتی بن کر——تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "انصار ہوگا شاید!"

میں مڑ کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "اب بول بیٹا اب بول" اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا "پہلے بودی کاٹ لو دی" اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا "بلا دیں بجے؟" اور رانو

نے کہا ”جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا“ پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا ”کلمہ پڑھ پنڈتا“،
اور داؤجی آہستہ سے بولے۔

”کون؟“

راتو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا ”سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!“
جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو راتو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھماکر کہا ”چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔“
اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!

اے حمید

راون کے دیس میں

ہمارا اسٹیمر بڑی ہموار رفتار کے ساتھ لنکا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آسمان پر اکا دکا تارے نمودار ہونے لگے تھے اور سمندر کا گہرا سبز رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ آبی پرندے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ساحل کی جانب اڑ گئے تھے مرطوب ہواؤں میں رچی ہوئی خنکی، ہمارے کپڑوں سے موم بن کر چپک رہی تھی۔ تقریباً اڑھائی گھنٹے کے پرسکون سمندری سفر کے بعد ہمیں دور ـــــ لنکا کے ساحل پر روشنی کے مینار کی جلتی بجھتی بتی نظر آئی۔ امی اور چھوٹا بھائی بے تابی سے اس روشنی کو دیکھنے لگے جو جگنو کی مانند پل بھر چمک کر پھر بجھ جاتی تھی۔ ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگے کھڑے اور مسافر بھی اسے اشتیاق بھری نگاہوں سے تک رہے تھے جوں جوں ساحل قریب آ رہا تھا، کئی اور جگہوں پر بھی دھندلی دھندلی روشنیاں ابھرنے لگی تھیں۔

کھاڑی میں پہنچ کر سٹیمر نے دو تین بار وسل دیا اور ڈیک پر لگی ہوئی مشین گڑگڑاہٹ کے ساتھ لنگر پھینکنے لگی۔ گودی پر بالکل تیار کھڑے ادھ ننگے مزدوروں نے موٹے موٹے رسے ڈیک کی طرف اچھالے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارا اسٹیمر بڑے آرام سے کنارے آن لگا۔

یہ لنکا کی شمال مشرقی بندرگاہ ٹالی مینار تھی۔

گودی پر ایک طرف کولمبو ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ کسٹم والوں سے بمشکل تمام چھٹکارا پانے کے بعد جب ہم گاڑی میں سوار ہو گئے تو بائیں طرف طرف ناریل اور سپاری کے درختوں تلے چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں گراموفون ریکارڈ بجنے لگے۔

"ساون کے بادلو ـــــ اور دل کے بچھڑ گئیں اکھیاں۔"

ہمارے چہرے حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساسات سے چمکنے لگے۔ اپنے وطن کے گلی کوچوں میں سنے ہوئے گیتوں کی ایک ہی لے نے پردیس کی اجنبیت کو ایک دم زائل کر دیا اور ہمیں یوں معلوم ہونے لگا، گویا ہم کسی طویل سمندری سفر کے بعد اپنے وطن میں داخل ہو رہے ہوں۔

رات بھر کولمبو ایکسپریس برق رفتاری کے ساتھ جزیرہ سنگلدیپ کے مہیب جنگلات اور تاریک غاروں میں سے گزرتی رہی۔ علی الصبح میری آنکھ کھلی تو گاڑی ایک چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا کر باہر دیکھا۔

آسمان بھورے بھورے بادلوں کے لطیف نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی اور پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی سرخ بجری دھل کر چمک رہی تھی۔ بانس اور صنوبر کے نوکیلے پتے نکھر کر گہرے سبز ہو گئے تھے اور فضا میں ان کی سوندھی سوندھی مرطوب مہک بسی ہوئی تھی۔ بھیلونی لڑکیاں، سفید ململ کے باریک کرتوں پر خوب کس کر دھوتیاں باندھے، ننگے پاؤں، بالوں کے جوڑوں میں رنگ برنگے پھولوں کے گچھے لٹکائے، پان، سگرٹ، سگار، اور اناس کے قتلے بیچ رہی تھیں۔ ان کے رنگ زیادہ تر زرد، قد چھوٹے، اکہرے جسم گٹھے ہوئے، مضبوط اور صحت مند تھے۔ ایک لڑکی اناس کے قتلے لے کر میری کھڑکی کے قریب آئی :-

"پائن ایپل سر ــــ ویری سویٹ سر ــــ فائیو پیسنٹ سر"

اس کا جسم بھی ایک چھوٹا سا پائن ایپل تھا، لیکن ابھی ویری سویٹ نہیں تھا، اس کی رنگت زرد زرد سنہری مائل تھی اور وہ ابھی پوری طرح پکا نہیں تھا۔ اس نے ابھی سورج کی کرنوں سے رس، پرسکون ٹھنڈی راتوں سے مٹھاس اور نیلگوں چاندنی سے رنگ حاصل کرنا تھا۔ میں نے ایک قتلہ لے کر پانچ پیسنٹ ادا کر دیئے پیسنٹ اپنی لنگیا میں چھپا کر وہ جلدی سے دوسرے ڈبے کی طرف مڑ گئی۔ یہ کام اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ پائن ایپل کتنا پک چکا ہے؟

گاڑی اس مضافاتی اسٹیشن سے چلی تو ایک دم بارش شروع ہو گئی اور دور دور تک سرسبز پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیاں دھندلا گئیں، نیچے ان کی وادیوں میں جہاں بانس کے گنجان جنگل کھڑے تھے۔ بارش کی دھواں دھار چادر سی تن گئی۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ پے در پے معمولی اسٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ ہر پھاٹک پر ہمیں ناریلوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں، نیم برہنہ عورتیں اور مرد، کیلوں کے گچھے یا پانوں کی ٹوکریاں اٹھائے نظر آتے۔ ایک جگہ ایک زرد اور نیلے رنگ کی بس دکھائی دی، جس کی پیشانی پر انگریزی الفاظ میں کولمبو لکھا تھا، اور ہم سامان وغیرہ درست کرنے لگے، کولمبو قریب آ رہا تھا اور دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں اور بانس کے جھنڈ کا قدرتی سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ ایک نیلی سی کالی تارکول کی سڑک، ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ نمودار ہو گئی تھی اور کہیں کہیں کوٹھی نما پکے مکانات بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جب کولمبو کا پہلا بڑا جنکشن "مرادانہ" آیا تو گاڑی تقریباً آدھی خالی ہو گئی۔ یہاں بھائی جان اور صدیقی صاحب مل گئے۔ تین میل پر دوسرے بڑے جنکشن "فورٹ" اترنا تھا۔ یہ لوگ ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔ بھائی جان نے صدیقی صاحب سے میرا تعارف کرایا جو ملٹری ریڈیو پر ان کے مددگار اناؤنسر تھے۔

فورٹ پر ہم لوگ بھی اتر پڑے۔

گھر پہنچ کر تازہ دم ہونے کے بعد جب ہم صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے تو میں نے دیکھا کہ برسات کی مرطوب ہوا میں ہمارے سامنے [illegible] کے شعب میں ناریل اور پام کے چھریرے درخت مست ہوتے ہوئے جھوم رہے ہیں اور ایک طرف دیوار پر چڑھی ہوئی گنجان بیل میں سرخ سرخ پھول روشن ہیں اور سہ پہروں پر کیلے کے درختوں کے جھاڑ میں قرمزی پرندے لٹک رہے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے صدیقی صاحب کے بالوں میں سے یارڈلے برل کریم کی مدھم خوشبو اٹھ رہی تھی۔

دوسرے روز صدیقی صاحب ماؤنٹ لیوینیا لے گئے۔ اس مقام تک ریل سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ ہم سہ پہر تک وہاں رہے شام کی چائے ہم نے صنوبر کے درختوں میں گھرے ہوئے لیوینیا ہوٹل میں پی اور پھر کنارے والی گیلی ریت پر سگریٹ سلگائے گھومتے رہے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور اس میں مچھلیوں کی بو تھی، جیسے وہ سمندر کی سطح پر منہ نکالے لمبے لمبے سانس لے رہی ہوں، تیز رفتار لہریں ساحل پر جا بجا بکھری ہوئی بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں تک آتیں اور ان کے گرد حلقے کی صورت میں گھوم کر، جھاگ اڑاتی، واپس چلی جاتیں۔

لیونیا کلب کے باہر دو تین انگریز عورتیں نہا رہی تھیں، اکمی ہوئی دھوپ میں ان کے گیلے اور سُرخ و سفید جسم چمک رہے تھے۔ ناریل کے لمبے لمبے، جھومتے ہوئے درختوں کی بے ڈھنگی قطاریں کنارے کنارے دُور تک چلی گئی تھیں۔ ان درختوں تلے سنہلی عورتیں، امریکی عورتیں، اینگلو انڈین عورتیں، خوبصورت اور بدصورت عورتیں، اپنے مردوں، غیر مردوں، پچکے ہوئے گالوں اور سوکھی ہوئی ٹانگوں والے مردوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ گہرے سبز سمندر کے بیکراں سینے پر دُور ایک مچھلی پکڑنے والی کشتی کے دودھیا بادبان ہوا میں پھول رہے تھے۔

ہم سگریٹ پیتے لیونیا اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

ہمارے قدم سیلی سیلی ریت پر نرمی سے پڑ رہے تھے۔ ہماری دائیں جانب چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کا سلسلہ تھا، جہاں اکثر جگہوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، جھونپڑوں کے باہر سیاہ گھنگھریالے بالوں والے پستہ قد آدمی، جن کے جسم کی کھال کرومبیدر سے ملتی جلتی تھی، میٹھے ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ کرومبیدر کے جوتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے جسم بھی بڑے مضبوط تھے، ان کی دبلی پتلی مگر مخملی جسموں والی عورتیں کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

صدیقی صاحب نے بتایا:-

"یہ لوگ لنکا کے اصلی باشندے ہیں۔ لیکن شہریوں نے انھیں سمندر کے کنارے پھینک دیا ہے۔"

ان کے قریب سے گذرتے ہوئے ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ بعض عورتوں کے سیاہی مائل سانولے جسم تنی ہوئی کمانوں ایسے تھے۔ سوائے ایک میلی سُرخ دھوتی کے اُن کے جسموں پر اور کچھ نہ تھا، دھوپ میں ان کے جسم سانپ کی کھال کی مانند چمک رہے تھے، اس چمک اور لیونیا کلب کے باہر نہلانے والی انگریز عورتوں کے جسموں کی چمک میں رات دن کا فرق تھا۔ وہ جسم نیلے نیلے سمندروں کی شفاف جھاگ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان جسموں نے کیچڑ اگلیوں کی سڑاندھ اور تعفن میں جنم لیا تھا، اور اب یہ تعفن اور سڑاند سنگلدیپ کے ساحلی علاقوں میں پھیل رہی تھی، شاید اسے لیونیا کلب تک پہنچنا تھا۔ لیونیا کلب ——— جہاں ریشمی پردوں والی کھلی کھڑکیوں میں سے نکلتی ہوئی ارغنوان کی دلنواز موسیقی، بحرِ ہند اور خلیج بنگالہ کی پردیسی لہروں کو دُور دُور سے کھینچ لاتی تھی ——— جس کے بال روم میں ہر ماہ کی آخری رات کو پانچ منٹ کے لئے تمام روشنیاں بجھ جاتی تھیں، پھر رقص کرتے ہوئے نیم عریاں جوڑوں کے قدم خود بخود ڈگمگانے لگتے اور پانچ منٹ کا مختصر رقص پومپیائی کی آخری رات میں تبدیل ہو جاتا، اور جب یہ قلیل عرصہ گذر جاتا اور پومپیائی کی آخری رات ختم ہو جاتی تو کوئی جوالا مکھی نہ پھٹتا۔ کسی طرف سے دہکتے ہوئے لاوے کا مہیب طوفان، لیونیا کلب کو اپنی آتشیں لپیٹ میں نہ لیتا، وہاں ہر ماہ کی آخری رات پومپیائی کی اوّلین رات تھی اور یہاں تاڑ اور ناریل کے درختوں تلے یہ کرومبیدر کے جسم، ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے، اور میلی کچیلی سُرخ دھوتیاں باندھے عورتیں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، ایک نوعمر لڑکی جس کے بال اس کی پیٹھ سے بھی نیچے تک پہنچ رہے تھے، ایک ہاتھ میں بٹے ہوئے رسّوں کا گچھا سا لئے ہمارے قریب سے ہو کر گذری، اس کے سیاہ جسم میں سے کچے ناریل کی رسیلی خوشبو اُٹھ رہی تھی، اس نے جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر گردن گھمائی اور ہمیں غور سے دیکھا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔

اُس کی قرمزی آنکھوں میں وحشی ہرنیوں ایسا الھڑپن اور معصومیت تھی۔

اُس کا جسم کس قدر کھُردرا سا تھا؟

اُس کی آنکھیں کس قدر نرم اور معصوم تھیں؟-

مجھے اناناس کے رسیلے قتلے یاد آگئے۔ صدیقی صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا، ریڈیو پروگرام کا وقت ہو رہا تھا، ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے اسٹیشن

پھر وہاں سے فورٹ اور فورٹ سے بس میں بیٹھ کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔

ریڈیو اسٹیشن کی دو منزلہ عمارت کولمبو کی بیشتر عمارتوں کی مانند بدھی مندروں سے ملتی جلتی تھی۔ عمارت کے اندر دالان میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا، جہاں ناریل اور شریفے کے تین چار درخت تھے۔

برٹش سیکشن، ہندی سیکشن کے ساتھ ہی تھا۔ انگریز اناؤنسرز، نیوز ایڈیٹرز اور سکرپٹ رائٹرز، دن بھر خالی نیکریں پہنے گھومتے رہتے تھے۔ ان کے جسموں پر بھورے بھورے بالوں کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، بعض جسموں پر چتکبرے داغ تھے، انھیں دیکھ کر مجھے گلے سڑے ٹماٹروں کا خیال آجاتا تھا اور بڑی کراہت محسوس ہوتی تھی۔ ان میں دو لیڈی اناؤنسرز بھی تھیں۔ ایک انگریز لڑکی تھی جس کا نام فیلس ڈکنز تھا اور دوسری مسز کنداسوامی جو مدراس کی پیداوار تھی۔ فیلس ڈکنز کی آواز میں رس اور لوچ تھا اور اس کی سفید رنگت میں ہلکی سبزی کی جھلک تھی۔ کچی خوبانیوں کی مانند ——

اس کے لہریا بالوں کا رنگ بھوسلا تھا، خزاں نصیب پتوں ایسا اور اس کی آنکھوں میں نیلے اور سبز رنگ کا دلکش امتزاج تھا۔ یہ رنگ روم کے ساحلی سمندروں کا رنگ تھا اور ان آنکھوں میں بحیرۂ روم کی اتھاہ گہرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

مسز کنداسوامی کی آواز کافی اچھی تھی، مگر اس کا جامنی جسم دن بدن سوکھ رہا تھا۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے جنھیں وہ دو چوٹیوں میں گوندھے رکھتی تھی۔ لیکن اس کا نام ان بالوں سے بھی زیادہ لمبا تھا اور جسے میں کبھی ایک سانس میں ادا نہیں کر سکا تھا۔ وہ ہر تیسرے روز نئی ساڑھی پہن کر آتی۔ اسے اپنی لوچدار آواز پر بڑا ناز تھا۔ اور یہ آواز ریڈیو پر بڑے بڑوں کو دھوکا دے جاتی تھی۔ کاش وہ خود بھی اپنی آواز کی مانند ہوتی ——— میرے ذہن میں اس کی آواز کا زندہ تصور، فیلس ڈکنز کا مدور شانوں، ریشمی کانوں اور بھرے بھرے بازوؤں والا جسم تھا اور مجھے ہمیشہ مسز کنداسوامی کی آواز پر فیلس کے جسم کا دھوکا ہوتا تھا۔

فیلس ڈکنز سے میری پہلی ملاقات سٹوڈیو نمبر ۳ میں ہوئی۔

میں اکیلا اندر بیٹھا چند پنجابی ڈسکیں (DISCS) ٹسٹ کر رہا تھا کہ فیلس کا نیم سبز آنکھوں والا، نیم سنہری بالوں والا چہرہ دروازے کے چوکور شیشے پر نمودار ہوا۔ وہ بالکل کسی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ سٹوڈیو آف تھا۔ وہ اندر آگئی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے ململی لباس میں اس کی سپید سینہ کا ابھار کسی دودھیا بادل کے ٹکڑے کی مانند تھا، جو کہر آلود رات کے دھندلے آسمان پر چپ چاپ سو رہا ہو۔ ٹائپ کیا ہوا پروگرام چارٹ، دیوار سے لٹکا کر وہ لاؤڈ سپیکر پر ذرا سے جھک کر کھڑی ہو گئی، اور بڑے غور سے پنجابی موسیقی سننے لگی، ملتیہ جان ہیر گا رہی تھیں۔

ہیر آکھدی جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندا ای

ڈسک ختم ہوئی تو وہ میرے قریب آگئی۔

"یہ کیا گا رہی تھی۔؟"

فیلس میرے اس قدر قریب تھی کہ پونڈز کی خنک مہک میرے دماغ پر ایک خوشگوار کیفیت طاری کر رہی تھی۔

میں نے ڈسک لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا: "یہ ہیر گا رہی تھی"

"ہی اَر؟ ——— یہ کیا ہوتا ہے" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ ہوتی ہے میڈم"

"تو یہ کوئی عورت ......"

"ہاں، وہاں عورت ——— یہ پنجاب کی ہیر ہے۔ ہیر کی محبت کا گیت تھا اور ہیر تو ہدری چوچک کی بیٹی تھی اور جو چوچک جھنگ سیال کے سردار تھے۔ ہیر بہت خوبصورت تھی۔ ... اب بہت پوچھا کہ جھنگ سیانہ کیا ہوتا ہے؟"

فیلس ہنسنے لگی۔ بے اختیار ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی ایک بچے کی ہنسی تھی جو سوتے میں اپنے آپ مسکرانے لگے۔ معصوم، بے لوث، بے داغ۔ اس میں ایک خوابناک سرگوشی تھی، ایک والہانہ موسیقی تھی ——— وہ مجھ پر ذرا جھک کر بولی: "کیا تم شاعر ہو؟"

میں اب پونڈز کی خنک مہک کے علاوہ اس کی خوبانیوں کی نیم گرم، نیم ترش خوشبو بھی سونگھ رہا تھا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں، مگر تمہاری خوبانی کے عنوان سے ایک بھرپور نظم لکھ سکتا ہوں، کئی بھرپور نظمیں، کئی مثنویاں، کئی دیوان لکھ سکتا ہوں۔" لیکن میں نے کہا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں، BUT I FEEL POETIC" اور اچھوتے سیب کا منہ پھر کھل گیا اور نوکیلے اور کنوارے موتیوں کی لڑیاں جھلملانے لگیں، وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں سٹوڈیو میں بیٹھا دیر تک اس کی خوبانیوں کی نیم گرم، نیم ترش خوشبو سونگھتا رہا۔ جیسے میرے آس پاس ان کے ڈھیر لگے ہوں۔ میں نے برٹش پروگرام سننے کے لئے دوسرے سٹوڈیو کا بٹن دبا دیا۔ مسز کنڈاسوامی انگریزی میں خبریں سنا رہی تھی، اس کی آواز میں کس قدر رس اور لوچ تھا۔ فیلس کے جسم کی مانند ——— اس کی آواز کا لوچ اور رس فیلس کے جسم کی یاد دلانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں خوبانیوں کے ڈھیروں میں دبا جا رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے سپیکر بند کر دیا اور سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔

ریڈیو گھر میں داخل ہوتے ہی مس گلیش کی صورت دیکھنا پڑتی تھی۔

پینتالیس سال کی ڈھیلے ڈھالے، بدنما جسم والی عورت جس کے سر کے سفید بال خضاب کے مسلسل استعمال کی وجہ سے جامنی رنگ اختیار کر چکے تھے، صحن میں ٹیلیفون ایکسچینج کے سوئچ بورڈ کے پاس بیٹھی تھی اور قریب سے گزرنے والے کو ایک بار اپنے پاس ضرور بلا لیتی تھی۔ ننگ دھڑنگ گوروں سے باتیں کرتے ہوئے اس کے بھدے چہرے پر کنواری لڑکیوں ایسا حجاب پھیل جاتا۔ میں اس کے کنواری لڑکیوں ایسے حجاب سے بڑا گھبراتا تھا۔ اس کا نام ہمیشہ مجھے فرانس کی گلوٹین کی خوفناک یاد دلاتا۔ گلیش ——— گلیش . . . اس نام ہی میں گلے کو بڑے اطمینان سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی تھی۔ اس سے باتیں کرتے وقت میرے جسم پر سر سے لیکر پاؤں تک کپکپی کا عالم طاری رہتا، جیسے لوگوں کا ہجوم مجھے گلوٹین کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہو۔ صدیقی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ گلا کٹوانے سے بال بال بچ گئے۔ وہ ایک ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے مس گلیش سے کسی خبر کی بابت گفتگو کر رہے تھے کہ اس نے صدیقی صاحب کی ہتھیلی کی گرم مٹی دیکھ لی اور اس کا چہرہ کنواری لڑکیوں ایسے حجاب کے نقاب میں پہلے سے زیادہ بھدا ہو گیا۔

"تمہاری گرم مٹی بڑی پسند ہے مسٹر ڈکی۔"

اور مسٹر ڈکی نے محسوس کیا ... اپنی گردن کے بالکل قریب محسوس کیا۔ انھوں نے آہستہ سے پوچھا: "تمہاری عمر کیا ہو گی میڈم؟"

"قریباً پچیس سال . . . . . ."

کہتے ہوئے میڈم گلوٹین مسکرانے لگی اور کاریگر کے بنائے ہوئے دانتوں کی بتیسی چمک اٹھی اور صدیقی صاحب تیزی سے کنٹرول روم کی طرف

سال مہینے سے پہلے میں نے سونے کی اس سرزمین کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا، ایک حسین، پُراسرار خواب ——— میں نے دیو پیکر ... سے ... ہوئے چھوٹے چھوٹے پُرسکون، چپ چاپ، آرام پسند شہر دیکھے تھے جن کے ارد گرد بانس، تاڑ، ناریل اور صنوبر کے گنجان جنگلات

کا حسین سلسلہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا، جہاں بڑے بڑے مندروں کے سنہری کلس نکھری ہوئی دھوپ میں چمک رہے تھے، اور ان مندروں کے نیم روشن ایوانوں میں، پُرجلال دیوتاؤں کے سنگین مجسّموں کے روبرو، کالی آنکھوں والی سیم تن دیوداسیاں عود و عنبر کے نیلگوں، دھوئیں میں بےخود ہو کر والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ موم کی روشنیوں کی ملائم دھند میں ان کے نیم عریاں جسم پُراسرار دھبے بن کر اجاگر ہو رہے تھے اور ان مندروں کے باہر مرمریں سیڑھیوں کے کناروں پر بیٹھی ہوئی بُدھ کی کنواری بیٹیاں، مندر جانے والے عقیدت مندوں کو گلِ صد برگ، موگرہ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کر رہی تھیں، ان کے سیاہ بال پھولوں میں بسے ہوئے تھے اور کانوں میں مونگے کے مندرے لٹک رہے تھے۔

میں نے عظیم الشان محلات کی مرمریں بارہ دریوں میں شاہی رقاصوں کو اناس کی شراب میں بدمست آسمانی ناچ ناچتے دیکھا۔ ان بارہ دریوں کے جالی دار جھروکوں میں لچکیلی بیلوں کی پھولوں بھری ڈالیاں داخل ہو رہی تھیں، باغوں میں صنوبر اور آم کے پیڑوں پر رنگین پرندے چہچہا رہے تھے جگہ جگہ کنول کی شکل ایسے دودھیا پتھر کے پیالوں میں چاندی کے فوارے اُبل رہے تھے اور گلاب کے جھاڑوں پر سیاہ بھونروں کی ٹولیاں منڈلا رہی تھیں۔

لیکن لنکا یعنی کولمبو پہنچ کر میرا یہ پُراسرار حسین خواب جیسے اپنا منہ چھپا کر کہیں گم ہو گیا، مجھ سے روٹھ گیا، منتشر ہو گیا۔

کولمبو میں سوائے ایک دھوبی کے اور کوئی شخص لنکا کے نام سے واقف نہ تھا، اس دھوبی نے اس خبرگیری کے ثبوت میں، اپنی دوکان کی پیشانی پر "لنکا واشنگ فیکٹری" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ لوہے اور کنکریٹ سے بنے ہوئے اس عظیم الشان شہر کے سنگین ہوٹلوں میں ملکی اور غیر ملکی جوڑے شراب کے ہلکے ہلکے سُرور میں ڈوب کر بے دلی سے ناچ رہے تھے اور بدھ کے مندروں کے ویران ایوانوں میں چمگادڑیں غوطے لگا رہی تھیں۔ عود و عنبر کی نیلگوں دھند میں والہانہ رقص کرنے والی سیم تن دیوداسیاں اور مندروں کی سیڑھیوں پر گلِ صد برگ، موگرہ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کرنے والی، سیاہ بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی، بدھ کی کنواری بیٹیاں اب کولمبو کی پتھریلی سڑکوں اور کارخانوں کی گھٹی ہوئی فضا میں دن بھر مشقت کرتی تھیں اور رات کو گندے تاڑی خانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تاڑی پیتی تھیں، لڑتی جھگڑتی تھیں۔ اور نشے میں محبت بھری کردہیں پڑھ رہی تھیں اور سونے کی لنکا کے بیٹے، راون کے غیور سپاہی، شہر سے باہر ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ شہروں نے انھیں کڑوی شے کی مانند تھوک دیا تھا۔ کونے کھدروں میں رینگنے والے کیڑے سمجھ کر انھیں دھرتی کے آخری کناروں پر پھینک دیا تھا اور یہ سنہل دیپ کے اہل، لنکا کے راج دلارے، سمندر کے کنارے، چمکیلی ریت پر شام کے بعد الاؤ روشن کر کے اس کے گرد بیٹھ جاتے اور ناچ گانوں میں مگن ہو جاتے تھے۔ ڈھولک کی تیز تھاپ پر صدیوں کا پرانا غم، ان کے تاریک سینوں کی تہوں سے لمبی، گہری اور درد انگیز تانوں میں ڈھل کر بہہ نکلتا، الاؤ کی تابناک روشنی میں ان کے نیم عریاں سیاہ جسم کسی ان دیکھے، ان جانے کیف میں بھیگ کر اپنے آپ جھومنے لگتے اور ان کے سروں پر ناریل کی ترچھی شاخوں میں چاند چمکنے لگتا۔ دودھیا چاندنی کے نقرئی تالاؤں میں لنکا کے بھوکے ننگے بیٹوں کے گیتوں کا طلسم مرمریں خواب بن کر پھیل جاتا، یہ خواب ایک خاموش اور پُرسکون جھیل تھی جس کی سطح پر ان کے جسم، محبت، اخوت اور آزادی کے کنول بن کر تیر رہے تھے اور شہروں نے انھیں کڑوی اور گندی شے سمجھ کر سمندر کے پاس تھوک دیا تھا اور یہ اپنے وطن، اپنے گھر میں بے وطن، بے گھر اور پردیسی لوگ الاؤ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے گرد دائرہ بنائے کسی نئی تہذیب کا گیت گا رہے تھے۔ شاید وہ نیم خوابیدہ حالت میں منتظر نگاہوں سے اس وقت کی راہ دیکھ رہے تھے جب اس تہذیب کا قافلہ سمندر کے بیکراں سینے پر اپنی کشتیوں کے بادبان پھیلائے اُن کی سمت بڑھا چلا آئے گا اور وہ آنکھوں میں مسرت کے آنسو لیے اس قافلے میں شامل ہو کر، محبت، خوشحالی اور آزادی کا سنہرا خواب دیکھیں گے۔

ان کی نگاہوں میں انتظار کی بے کلی تھی اور ان کے گیتوں میں پہاڑ کی اونچائیوں سے بہنے والی ندیوں ایسا اضطراب اور دفعتاً بھڑک اٹھنے والے شعلوں ایسا ہیجان تھا، تڑپ تھی، درد تھا، میٹھا اور عزیز ترین درد، جو سیپ کے پہلی بار منہ کھلنے سے پیدا ہوتا ہے اور جب

سیب کا منہ کھل جاتا ہے تو فیلس ڈکنز مسکرانے لگتی اور اچھوتے موتیوں کی آبدار لڑیاں جھلملا اٹھتی ہیں اور یہ تبسم ایک چھوٹے سے آبشار کی مانند فیلس کے سرخ ہونٹوں سے گلپوش وادیوں میں گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فیلس ہوٹل گال فیس کے بال روم میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور کوئی خوبصورت چرواہا آرچے کی پھولوں بھری لمبی ڈالیوں کو ہلا رہا تھا اور سپید سپید، نرم نرم، کومل پتیاں گھاس پر گر رہی تھیں۔ آج فیلس کی سالگرہ تھی۔ روشنی میں اس کے بھورے بال سونے کے تاروں کی مانند چمک رہے تھے جیسے جنگل میں کسی مکڑی کے جال پہ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں تھرک رہی ہوں۔ شیمپین کا سلگتا ہوا خمار اس کی آنکھوں کی نیم سبز جھیلوں پہ صنوبر کا سایہ بن کر جھکا ہوا تھا اور جھیلوں کا رنگ گہرا اور پُراسرار ہو رہا تھا۔

ڈائس پر موسیقی شروع تھی۔ ایک پھولے ہوئے سرخ گالوں والی موٹی سی لڑکی پورا منہ کھولے گا رہی تھی:-

" O! NIGHT IN JUNE
IF I WER NEVER TO SEE YOU AGAIN "

اس کی تیز اور کرخت آواز میں بیابانی عقاب ایسی جھپٹ تھی اور یہ عقاب اپنے خوفناک پنجے پھیلائے ہر آدمی کو اپنی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ لوگ گانا سننے کی بجائے عورتوں سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے، اور عورتوں کی ٹانگیں رانوں تک ننگی تھیں، ان کے بازو شانوں تک کھلے تھے، اور سینے چھاتیوں تک عریاں تھے، ہال میں گداز اور خمار آلود جسموں کی نیم گرم خوشبو رچی ہوئی تھی اور فیلس اپنی سالگرہ کا پانچواں جام خالی کر رہی تھی اور جھیل کی سطح پر صنوبر کے سائے زیادہ گہرے اور گدلے ہو رہے تھے۔ اس کی دائیں جانب بیٹھا، ریڈیو اسٹیشن کا موسیقار وکٹر ڈول دسویں بار اس کے ریشمی گال چوم رہا تھا۔ بوڑھا اناؤنسر ہربیس، تھوک میں بھیگا ہوا سگریٹ منہ میں دبائے، شراب میں تر انگلیاں اپنی کھوپڑی پہ رگڑ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شراب کے نشے میں گھٹ کر سکڑ گئی تھیں لفٹیننٹ گرفن نے جام ہوا میں لہرایا اور فیلس کی سالگرہ کا بارہواں جام بھی خالی ہو گیا۔ ہونٹوں پہ زبان پھیرتا وہ فیلس پہ جھکا اور اپنے شراب آلود لب اس کے نیم عریاں مرمریں سینے پہ رکھ دیئے۔ وکٹر بڑبڑاتے ہوئے گلاس میں شیمپئن انڈیلنے لگا اور ہربیس نے اتنے زور سے کش کھینچا کہ گیلا سگریٹ ایک دم سکڑ گیا۔ فیلس کا مخمور جسم ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میری پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ہم ایشیائی طبعاً شریف ہوتے ہیں۔ ہم ایسے مناظر برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم محبت کرنے سے پہلے روشنی بجھا دیتے ہیں۔ ہماری محبت تاریکی اور تنہائی کے غار میں جنم لیتی ہے اور اسی غار میں دم توڑ دیتی ہے۔ ہمیں غاروں سے محبت ہے، محبت کے غار، نفرت کے غار، ذلت کے غار اور شرافت کے غار۔ ہم فطرتاً غار نشین ہیں اور یہاں روشنی ہی روشنی، لوگ ہی لوگ . . .

اور لفٹیننٹ گرفن کے شرابی لب فیلس کے پتلے ریشمی ہونٹوں سے پیوست تھے۔ پھولے ہوئے سرخ گالوں والی امریکن لڑکی بدستور چلا رہی تھی:-

" O! NIGHT IN JUNE .... "

اور بیابانی عقاب اپنے خوفناک پنجے کھولے ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ قریب ہی ایک میز پر کوئی نوعمر ملاح، نیلی اور سفید وردی میں ملبوس، کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے، ذرا آگے کو جھکا، ایک اینگلو انڈین دبلی پتلی بے زبان سی لڑکی سے اظہارِ محبت کر رہا تھا اور وہ لڑکی گائے کی زبان کے ٹھنڈے قتلوں پر ٹماٹر کی چٹنی لگائے انہیں چبا چبا کر کھا رہی تھی۔

ایک خالص سیلونی ادھیڑ عمر جوڑا بڑے دروازے پہ نمودار ہوا۔ ویٹر نے ہاتھ پھیلا کر ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ عورت کا تھل تھل پل پل کرتا جسم جامنی رنگ کی ساری میں لپٹا تھا۔ اس کے مریل سے خاوند کا مختصر ہاتھ بمشکل اپنی بیوی کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ عورت کے ہونٹ سرخ تھے، گہرے سرخ۔ خون کے رنگ ایسے ——— گویا وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آ رہی ہو، اس کے بازوؤں پہ کالی [illegible] پڑ گئے

بیش قیمت ہیرے موتی جھلملا رہے تھے، اس کے خاوند کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سوکھی گردن قمیص سے خشک ٹہنی کی مانند نکلی ہوئی تھی۔ سیلونی عورت نے ڈانس پہ گاتی امریکن لڑکی کو دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

لڑکی نے یکدم گانا بند کر دیا اور عقاب نے اپنے پنجے سمیٹ لئے اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دفعتاً ہال کے درمیانی حصے کے سوا ہر طرف روشنیاں گل ہو گئیں اور سازوں پر ہلکے ہلکے سُروں میں کوئی اداس سی دھن شروع ہو گئی۔ اِدھر اُدھر میزوں پر سے نیم برہنہ عورتیں اور مدہوش مرد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنارے پر سے کھسکتی ہوئی کشتیوں کی مانند اُٹھے اور ان کے جسم موسیقی کی پُرسکون لہروں پر اپنے آپ ڈولنے لگے۔ سبز روشنی کے غبار میں اُن کے لہراتے ہوئے جسم خواب آلود منظر پیش کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پھیکے پھیکے اندھیرے کا غبار پھیلا ہُوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے چہرے بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گرم سُلگتی ہوئی شرابی آنکھیں مدھم اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وکٹر اپنے پیچھے کرسی گراتا ہوا اُٹھا اور فیلس کو اپنے لمبے بازوؤں میں تھام کر محوِ رقص جوڑوں میں شامل ہو گیا۔ لفٹیننٹ گرفن شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر، ناک سکیڑ کر بولا: "بدمعاش گوریا!"

ہریس نے پانچوں انگلیاں شراب میں ڈبو کر انھیں اپنی کھوپڑی پر رگڑا، اور سر کرسی کی پشت سے جا لگا، بازو لٹکائے بولا:-

"___ AND TIS IS THE END OF THE NEWS!"

گھومتیں، لہراتیں، کبھی آگے بڑھتیں کبھی پیچھے سمٹتیں، سانولی، گندمی، زرد اور سپید سپید عریاں پنڈلیوں کے ہجوم میں مجھے فیلس کی چکنی چکنی پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وکٹر اسے اپنے ساتھ چمٹائے بڑے بھونڈے انداز میں ناچ رہا تھا اور فیلس کا شرابی جسم اس کے لمبے بازوؤں کی شاخوں پر پکی ہوئی انجیر کی مانند لٹک رہا تھا اور میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں سینک اُٹھ رہا تھا۔ اِرد گرد میزوں پر اب صرف بوڑھے اور بدصورت چہرے ہی تھے، جھلملاتے، بیش قیمت ہیرے موتیوں والی، بھاری بھرکم سیلونی عورت کل مجھے دُور سے خاکہ ہی نظر آ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مریل اور زیادہ پھیکے خاکے پر جھکا ہُوا تھا۔ میری آنکھوں میں سُرخ سُرخ ہونٹ پھر گئے۔ گہرے سُرخ ہونٹ اور مجھے یوں لگا جیسے پہلا خاکہ، دوسرے خاکہ پر جھک کر اُس کا خون پی رہا ہو۔

گلاسوں کے بوتلوں سے ٹکرانے کی کھنکاریں اور بوڑھے قہقہوں کی بے جان آوازیں، ڈانس کے لمبے لمبے سُروں میں مدغم ہو رہی تھیں اور نیوز اناؤنسر ہیریس خبریں ختم کرنے کے بعد ٹانگیں پھیلائے مدہوش پڑا تھا۔ لفٹیننٹ گرفن پی رہا تھا اور بی بی سی کے نئے ریکارڈوں کی مختلف دُھنیں گنگنا رہا تھا۔ کسی وقت وہ اپنی گھٹی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر، ہچکی روک کر مجھ سے پوچھتا:-

"DO YOU LIKE GYPSY SONGS?"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کوئی اور دھن شروع کر دیتا۔ شمپین کا جام میرے ہاتھ میں ختم ہو رہا تھا اور فیلس کا جسم وکٹر کے سینے سے چمٹا ہُوا تھا اور انجیر اپنی شاخ پر لٹک رہی تھی اور وہ پک چکی تھی اور گرنے والی تھی اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گرے، ہال کی تمام بتیاں ایک ساتھ روشن ہو گئیں، بوڑھے اور بدنصیب چہروں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے رقص کے ٹوٹتے دائروں کو دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ عورتیں اپنے ڈھیلے بلاؤز درست کرتیں، پریشان بال سنوارتیں، مردوں کے سہارے اپنی اپنی میزوں کی سمت بڑھنے لگیں۔ وکٹر کے بالوں کی ایک لٹ اس کی چوڑی پیشانی پر جھول رہی تھی۔ فیلس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وکٹر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ یوں اسے اپنے بازوؤں میں تھام رہا تھا جیسے فیلس کوئی مجسمہ ہو جس کے پاؤں تلے سے چبوترہ کھسک گیا ہو۔ وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی شراب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کسی جگہ نہ ٹھہرتی تھیں وہ کبھی ہریس کو دیکھتی، کبھی گرفن کو اور کبھی مجھے۔ جیسے ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ لفٹیننٹ گرفن پُرانا شرابی تھا، چنانچہ اس نے اُٹھ کر فیلس کو تھام لیا۔ وکٹر نے ہریس کو

دوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بلند آواز میں بولا :-

"HERE IS THE NEWS !"

ہم سب ایک دوسرے کا سہارا لئے لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں ڈھیر ہوگئے۔ پرائیویٹ ہوسٹل کے احاطے میں آکر ہم نے ہیرلیس اور فیلس کو بمشکل برآمدے تک پہنچایا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی فیلس صوفے پر گر پڑی اور لفٹیننٹ گرفن اس کا سر دبانے لگا۔ ہیرلیس کا نشہ جیسے سو کر بالکل ہی اُڑ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے گرفن کو فیلس پر جھکے دیکھا، وہ گالیاں بکتا ہوا اُٹھا اور اندر سے وسٹ چیں کی ایک اور بوتل لے آیا، ڈکٹر پول آرام کرسی میں لیٹا، ٹانگیں قالین پر پھیلائے بڑے مزے میں گا رہا تھا :-

"I KNOW

WHERE YOU SING O SEA !"

میری آنکھیں جل رہی تھیں اور بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ میرے ارد گرد ہر شئے دھندلا رہی تھی۔ ڈکٹر پول کے گانے کی نرم آواز جیسے کسی ویران اور اندھیرے کنوئیں میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آواز مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ دور ——— اور دور ——— یہاں تک کہ وہ بالکل ڈوب گئی اور میں سو گیا۔

جانے میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ ڈکٹر پول مجھے دوسرے کمرے میں کھینچے لئے جا رہا تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

"ڈان جوائے یُو ایلیفنٹ برائے !"

میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں ملتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمزور لیمپ کی مدھم روشنی میں فیلس ڈکنز پلنگ پر بھورے رنگ کا ریشمی کمبل اوڑھے بے سُدھ پڑی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے اس پر جھک گیا۔ فیلس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، پتلے ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل بے سُدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کر نرمی سے ہلایا: "فیلس، فیلس !"

فیلس کی مخمور پلکیں آہستگی سے اوپر اُٹھیں جن میں شراب کا سُرور دھند بن کر چھایا ہوا تھا وہ ہولے سے مسکرائی، میں نے اپنے ہونٹ اس کے نیم وا ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ شراب اور پسینے کے نمکین ذائقے نے میرا منہ بدمزہ کر دیا۔ میں نے کمبل منہ پر کر لیا، کیونکہ کمرے میں روشنی تھی اور ہم ایشیائی اندھیرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں روشنی راس نہیں آتی، لیکن کمبل پر منہ کرنے سے ایک عجیب قسم کی بُو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی، جیسے میں نے گندے ٹماٹروں سے بھری ہوئی بوری میں منہ ڈال دیا ہو، یا جیسے میں کسی مچھلی مارکیٹ میں داخل ہوگیا ہوں، وہ خوبانیوں کی میٹھی خوشبو کہاں گئی تھی، وہ پاوڈر کریم کی ٹھنڈی مہک کہاں غائب ہوگئی تھی ؟ میرا دماغ پھٹنے لگا، میں نے جلدی سے منہ باہر نکال لیا لیکن باہر وہی روشنی تھی اور ہم ایشیائی ....

میں جلدی سے مچھلی مارکیٹ میں داخل ہوگیا اور تمام رات وہاں بغیر ناک پر رومال رکھے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر جب میں مچھلی مارکیٹ سے باہر نکلا تو ڈرائنگ روم میں لفٹیننٹ گرفن، ہیرلیس اور ڈکٹر پول نیم برہنہ حالت میں قالین پر اُلٹے سیدھے پڑے تھے۔ میں نے میز پوش اُٹھا کر ان پر ڈال دیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا، سڑک پر پہنچ کر مجھے فیلس ڈکنز کا خیال آگیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نائی نے شیو کے بعد صابون بھرا جھاگ میرے منہ پر پھینک دیا ہو، میں نے زور سے تھوک دیا۔

ہماری ساتھ والی کوٹھی میں ایک اچھے خاصے بدصورت سیلونی بیرسٹر کی اچھی خاصی بدصورت بیوی رہتی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو خوبصورت عورتوں کی تصویریں جمع کرنے کا بیحد شوق تھا، بھائی جان نے مجھے بتایا کہ اس کے ذاتی البم میں دنیا جہان کی حسین ترین عورتوں کی تصویریں موجود ہیں، اور وہ اس البم کو اپنی بیوی سے چھپا کر رکھتا ہے۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہتے۔ وہ بولتے کم اور مسکراتے زیادہ تھے۔ بیگم صاحبہ کو پیانو سیکھنے کا خبط تھا، رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر اپنے کمرے میں جاکر ذاتی البم کھول لیتا۔ اور اس کی بیوی پیانو پر جا بیٹھتی، پھر ان کے گھر سے پیانو کے، بھدے، کرخت، بے ڈھنگے اور بے ربط سُر سنائی دینے لگتے۔ جیسے وہ اُن سُروں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی ہو۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ وہ پیانو بجا نہیں رہی بلکہ اس سے جھگڑ رہی ہے اور جب پیانو کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو پردوں پر زور سے انگلی مار کر پوچھتی ہے "کیا کہا؟"

کبھی کبھی جی بے اختیار چاہتا کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر، پیانو کے پاس جاکر، زار و قطار رونا شروع کر دوں۔ جب وہ حیران ہو کر وجہ دریافت کرے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں، یہاں تک کہ وہ ڈر کر بھاگ اُٹھے اور میں اطمینان سے آنسو پونچھ کر باہر نکل آؤں۔ وہ ہر رات بلاناغہ گھنٹہ بھر پیانو سے لڑتی اور اس دوران میں اس کا خاوند بھی کھول کر اپنے ذاتی البم کا مطالعہ کرتا۔

سامنے والی کوٹھی میں ایک عیسائی انجنیئر کا کنبہ رہتا تھا۔

انجنیئر کی دو لڑکیاں تھیں، ایک کی عمر بارہ سال ہوگی اور دوسری لڑکی سترہ اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی لڑکی کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور آنکھیں بالکل بلی کی مانند ــــ اس کی چال بھی بلی کی طرح سمٹی سمٹائی اور دبی دبی تھی اور ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی تھی۔ اس کی سیدھی اور چکنی پنڈلیاں بڑی سڈول تھیں۔ اس کے سینے کی گولائیاں ابھی بن رہی تھیں اور ان کی طرف دیکھنے پر کسی وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے قہوہ پینے والی دو پیالیاں قمیص کے اندر اوندھی کر کے رکھی ہوں۔

بڑی لڑکی کا رنگ زردی مائل گندمی تھا، وہ دبلی پتلی اور بے اختیار لمبی تھی، اس کی بائیں آنکھ ذرا ٹیڑھی تھی اور ناک اس کے قد کا چوتھا حصہ تھی۔ اس کا نام مس ایملی تھا یہ نام سن کر مجھے ہمیشہ کھٹی املی کے درخت یاد آجاتے اور منہ میں پانی بھر آتا تھا اس کی آواز تیز، تیکھی اور کرخت تھی، وہ بولتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ریل کے انجن کا کوئی پرزہ لیک کر رہا ہے اور تیز بھاپ سیٹی بجاتی خارج ہو رہی ہے، اُسے اپنے مریل کتے سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر شام کوٹھیوں کے درمیان والی سڑک پر اسے ساتھ لئے ٹہلا کرتی تھی۔

چوک میں کسی بدھی بھکشو کی خانقاہ تھی جہاں ہفتے میں کئی بار میلہ ہوا کرتا، اس روز عورتیں، بچے، مرد، زرد زرد لبادوں والے بھکشو خانقاہ میں جمع ہو کر دن بھر مذہبی گیت گاتے رہتے، یہاں اگربتی عطروں کی تیز خوشبو پھیلی رہتی تھی۔

اس خانقاہ کے عقب میں شہر کے غریب دھوبی رہتے تھے، لکڑی اور گھاس پھونس سے بنے ہوئے ڈربہ نما مکانوں کے بیچوں بیچ ایک خستہ حال سڑک چلی گئی تھی، اس سڑک کا نام ٹمپل روڈ تھا یہاں رات کو عموماً اندھیرا چھایا رہتا، ان مکانوں کے اندر سرخ سرخ سبز سبز بتیاں ٹمٹماتی رہتیں، یہاں بجلی کے کھمبے ضرور تھے، مگر بلب کسی ایک پر بھی سلامت نہ تھا۔ ایک جگہ ناریل کے درختوں تلے تاڑی خانہ تھا، جہاں صبح و شام مرد عورتیں دم دو تاڑی پیتے، شور مچاتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ اس جگہ، انہی ڈربہ نما مکانوں میں، چوری چھپے جسم بیچنے والیوں کے دلال رہتے تھے، ٹمپل روڈ در اصل قحبہ روڈ تھی یہ کسی مندر کی طرف نہیں بلکہ کوٹھی خانوں کی طرف جاتی تھی۔ شام ہوتے ہی جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو رنڈیوں کے دلال تاڑی کے نشے میں مگن، اکڑے ہوئے بھینسوں کی طرح ٹمپل روڈ پر منڈلانے لگتے کسی وقت وہ تاڑی کے درختوں تلے یا بجلی کے کھمبوں کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے اور بیڑی پیتے، اپنی خطرناک چمکیلی آنکھوں سے ہر راہگیر کو گھورنے لگتے، پھر وہ ایکا ایکی پلٹتے اور کسی نہ کسی حاجتمند پر حملہ کر دیتے۔

"مُرغی صاحب؟ — اگر — اچھا والا" صاحب؟"

"اچھا والا" — سے میری مراد ایسی عورت سے ہوتی تھی جو پیشہ ور نہ ہو، بلکہ عطائی ہو۔

ایک رات میں بھی ایک "اچھا والا" کے پاس چلا گیا۔

اس رات ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، میں برساتی اوڑھے فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے سے ہو کر گذر رہا تھا، فضا میں درختوں کے گیلے تنوں کی مرطوب خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سڑک پر کبھی کوئی موٹر روشنی کا سیلاب لئے گذر جاتی تو گرتی بارش کی لڑیاں، کانچ کے ریزوں کی مانند چمک اٹھتیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ کھائی میں جھینگر، مینڈک — میں پیچھے چوک میں پہنچا تو ٹمپل روڈ کی طرف گھوم گیا، سڑک پر حسبِ معمول اندھیرا تھا کہیں کہیں مکانوں کے بالائی خانوں میں سے روشنی جھانک رہی تھی، ایک جگہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیا گیا۔

"مرغی صاحب —— ؟"

اور اس کے "اچھا والا" کہنے سے پہلے ہی میں اس کے ساتھ ہو لیا، جیسے سودا پہلے ہی سے طے تھا، اپنی فوری کامیابی پر وہ پستہ قد دلال اینٹھ اینٹھ کر میرے آگے چلنے لگا، کچھ دور چل کر ہم ایک تنگ گلی میں گھوم گئے، یہاں کچی نالیوں اور سڑے ہوئے پیازوں کی بو بسی ہوئی تھی، دلال نے دھوتی میں اڑسی ہوئی ٹارچ جلائی اور اس کی کمزور روشنی میں مجھے ایک مکان میں لے گیا، مکان بالکل ڈربہ معلوم ہو رہا تھا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے واقعی میں وہاں مرغیاں خریدنے آیا ہوں۔ ایک کمرے میں پھیکی سی روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکیوں پر زرد رنگ کے پرانے پردے کھچے ہوئے تھے، وہ مجھے اس کمرہ میں چھوڑ کر چلا گیا، کمرہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر سلیقے سے سجا ہوا تھا، فرش پر ایک مٹیالی دری بچھی تھی اور قریب ہی تپائی پر کانسی کے تھال میں مہاتما بدھ کی سیاہ پتھر کی مورتی رکھی تھی جس کے قدموں میں کچھ سپید پھول مرجھا رہے تھے، فضا میں ایک مانوس قسم کی گھریلو کیفیت تھی، مجھے وہاں کی ہر شے پیاری اور خوبصورت لگ رہی تھی، میں نے برساتی ایک طرف رکھ کر سگریٹ سلگایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ ابھی میرا سر دیوار سے لگا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک پتلی دبلی لڑکی اندر داخل ہوئی اور مسکراتی ہوئی میرے قریب ہی پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں کی مانند گہرے سیاہ تھے، جنہیں اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں اس نے گردن پر باندھ رکھا تھا۔ جوڑے میں ننھی ننھی زرد کلیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ اس کا رنگ مونگرہ کی کلی ایسا زردی مائل سپید اور کومل تھا۔ وہ ہلکے عنابی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے ادھ ننگے بازو گداز اور گورے تھے، پیشانی پر سرخ بندی خون کا داغ معلوم ہو رہی تھی۔ میری نظروں میں ایکا ایکی وہ مقدس معبد پھر گئے جن کے نیم روشن تہہ خانوں میں کالی کالی آنکھوں والی دیوداسیاں، عود و عنبر کی نیگوں دھند میں والہانہ رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی روشن اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی اپنے آپ مسکرا رہا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اپنے ہمسائے —— بیرسٹر صاحب اور ان کی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔

"آپ ذرا کھل کے بیٹھ جائیں" اس نے بڑی صاف انگریزی میں کہا۔ اس کی آواز نرم اور خواب آلود تھی۔

"تم انگریزی جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں، ہمیں سیکھنا ہی پڑتی ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں، سیلون میں عیسائی زیادہ ہیں"

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے"

وہ ہنس پڑی اور اس کے گدرائے ہوئے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے، میں نے سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے دبانے لگا۔ اس دیوداسی کی سیاہ آنکھوں میں پر نور اجالا جھلکنے لگا، وہ جلدی سے اٹھ کر گوتم بدھ کی مورتی کے پاس گئی اور کانسی کے تھال میں اپنے جوڑے کی زرد کلیاں رکھ کر واپس چلی آئی، اب اس کے لمبے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے، پلنگ پر بیٹھ کر

اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے سیاہ بال میرے بازوؤں پر بکھر گئے اور مجھے غالب کا مشہور شعر یاد آگیا۔ میں نے ان بالوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھتے ہوئے پوچھا:۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ میرا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ہوئے خواب آلود آواز میں بولی: "یشودھرا! ——— اور تمہارا نام؟"

میں اُن آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک گیا: "سدھارتھ!"

وہ چونک اُٹھی: "سدھارتھ؟"

"ہاں!"

"یہ تو ہمارے مقدس بدھا کا نام تھا!"

"ہاں!"

"اور یشودھرا اس کی بیوی تھی!"

"ہاں!"

"کیا تم بدھسٹ ہو؟"

"ہاں!"

اور اس نے کسی پُراسرار طاقت سے مغلوب ہو کر اپنے آبنوسی بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر کسی آفاقی رقص میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا، جیسے ملایا کی طرف سے آنے والی مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے مجھے ان مندروں میں اُڑا لے گئے ہوں جن کے دھندلے تہہ خانوں میں نیم عریاں دیوداسیاں بدھ کی کنواری بیٹیاں، گجرے پہنے، عنبر و لوبان کی خوشبوؤں میں مقدس بدھا کے روبرو تھرک تھرک کر رقص کر رہی ہوں۔ دھیمی روشنی میں ان کے لچکدار اعضاء دمک رہے ہوں۔ رقص نغمے، گلِ صد برگ، مونگرہ کلی، چمپا کلی، گومتی، اندومتی اور یشودھرا ——— صندلیں، نیم عریاں، کنوارے جسم اور سیاہ بالوں والی یشودھرا ——— حسین ساکیہ شہزادی!

اور یشودھرا کا جسم کانپ رہا تھا، لرز رہا تھا، کسے ہوئے تار کی طرح، جسے زور سے جھنجھنا دیا گیا ہو۔

یشودھرا نے دراز پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں دن کا اُجالا، شفق کا زریں سونا پگھل رہا تھا، صبح ہو رہی تھی، شام ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر بن مُو سے شیریں مہک کی لہریں اُمڈ رہی تھیں، اس کے ہونٹوں میں شراب، اور پسینے کے کسیلے ذائقے کی بجائے، سنگلدیپ کے جزیرے کے جنگلی شہد ایسی مٹھاس تھی۔ اس کے گداز جسم کی ریشمی سطح پر ایک کنواری اور لذیذ تھرتھراہٹ تھی جیسے وہ اپنی دوشیزگی کا سرمایہ پہلی بار کسی کو سونپ رہی ہو۔

یہ ایک شرمیلی دلہن کا اچھوتا اور بے داغ جسم تھا۔

اس میں نرمل خوشی کی حدت اور پاکیزگی تھی۔

"تم سدھارتھ ہو، میں یشودھرا ہوں۔ ساکیہ شہزادی، میں تمہاری بیوی ہوں، میرے جسم کی سیج پر تم زندگی کے آخری ... تک ... کر سکتے۔ اس سیج کے پھول تمہارے انتظار میں سوکھ رہے تھے، تم کہاں تھے، کدھر تھے؟"

یشودھرا جیسے خواب میں بول رہی تھی، اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں، اس کے بازوؤں کی گرفت میری گردن میں زیادہ سخت ہو

ہو رہی تھی۔ مجھے ایک طرح کا خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میں کوئی شرمیلی دلہن ہوں اور کسی اکھڑ مرد کا کھردرا ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہو۔

میرے دل پر ہاتھ رکھ دو میرے شہزادے، مجھے اپنے سینے سے لگا لو، تاکہ میری سانس تمہاری سانس میں ڈوب جائے، اور میرا دل تمہارے دل کی تال پر دھڑکنے لگے، اور قریب آ جاؤ سائیہ ——— میرے ساتھ لگ جاؤ، آج میں تمہیں ان سرحدوں تک لے جاؤں گی جہاں پہنچ کر عورت کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے، میرے ساتھ رہو میرے سدھارتھ، ہم زمین کی نچلی تہوں میں اترتے رہے ہیں۔ نیچے نیچے، اور نیچے، یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھے گی، وہ گرم سے گرم تر ہوتی جائے گی، ہم ایک نجانے خلا میں پہنچ جائیں گے۔ غیر مرئی، فوزنی، ان دیکھا، ان دیکھا، نیم روشن، نیم تاریک، جہاں بے شمار چاند تاروں سے چکر لگا رہے ہوں گے، وہ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، سینہ بسینہ بڑھتے چلے جائیں گے، آگے ہی آگے

یشودھرا کی آواز بتدریج جیسے کسی تاریک غار میں ڈوب گئی، دو ہماری سانس ایک دوسرے سے لگی، دو ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑکنے لگے، زمین کی تہیں ہمارے قدموں تلے سرکتی چلی گئیں اور ہم نیم روشن، نیم تاریک گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ نیچے، نیچے اور نیچے ——— یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھی، وہ گرم سے گرم تر ہوتی چلی گئی اور پھر ———

پھر ——— جب ہمارے دل پھر اپنی تال پر دھڑکنے لگے اور ہم ایک بار پھر زمین کی اصلی سطح پر آ گئے، تو میں نے برساتی کاندھے پر رکھی، باقی دو سگریٹ سلگایا اور بستر پہ بے سدھ پڑی ہوئی، یہ رات بھر کی جوگی، سائیہ شہزادی کو جھک کر دیکھنے لگا۔ بجلی کی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ، چہرہ، جسم یوں ڈھال پڑا تھا جیسے یکے بعد دیگرے اس نے کئی بچوں کو جنم دیا ہو، اس کی آنکھیں بند تھیں اور پیشانی پہ سرخ بندی کا خون پسینے میں گھل مل رہا تھا، ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہموار دانتوں کی سپید لکیر چمک رہی تھی، تنفس کے ساتھ اس کا سینہ آہستہ آہستہ ڈوب ابھر رہا تھا، سیاہ لانبے بال گول گول مقدس چھاتیوں کی مخملیں ڈھلانوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔

یہ صندل کے سایوں میں چھپے ہوئے بدھ مندروں کے دودھیا گنبد، یہ آندھرا پردیش کے نیلے نیلے تالوں میں کھلنے والے کنول کے پھول ——— انہی گنبدوں کے مقدس سایوں میں بیٹھ کر کالیداس نے شکنتلا لکھی تھی اور یہی وہ کنول کے پھول تھے جن کی کومل پتیوں پر شکنتلا نے راجہ دشینت کو اپنا پریم سندیسہ لکھ کر بھیجا تھا۔

یہ تعفن اور کیچڑ بھرا غلیظ جسم نہیں تھا۔ یہ تیل روڈ کی بازاری عورت نہیں تھی۔

یہ کھجوراہو، مہابلیشورم اور ملایا کے معبدوں کی سبز جھیلوں پہ عظیم ستونوں کے سایوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی دوشیزہ تھی ——— یہ مس ایلی، گلیٹی اور فیلس ڈکنز نہیں تھی ——— یہ سیتا تھی۔ رام کی سیتا۔ جسے بھوک، غریبی اور افلاس کا راون اس کے وطن سے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا، اور جسے کسی رام اور لچھمن کا انتظار تھا۔

یہ یشودھرا تھی، ساکیہ شہزادی، جس نے جنوبی ہند کے نیلے پانیوں کے جھاگ سے جنم لیا تھا۔

یہ سنگلدیپ کی افروڈائٹی تھی، یہ لنکا کی لاڈلی تھی۔

یہ مچھلی مارکیٹ نہ تھی، پھول مارکیٹ تھی، لوگ اس کے قریب سے ہو کر گزر رہے تھے۔ یہ پاؤڈر کی نقلی مہک نہ تھی، بلکہ جنگلی پھولوں کی قدرتی خوشبو تھی
یہ دھوپ میں چمکنے والا سنہری کلس تھا۔

یہ لنکا تھی، ازناہ لنکا ——— سیتا کی لنکا، سونے کی لنکا۔

میں نے سونے کی لنکا پہ الوداعی نظر ڈالی، جیسے شہزادہ سدھارتھ نے، رتناگری کے مہیب جنگلوں میں نکل جانے سے پیشتر، اپنی بیوی یشودھرا کو آخری مرتبہ دیکھا ہو، اور باہر نکل آیا ——— باہر چوک والی خانقاہ میں جیسے پہر کا گجر بج رہا تھا، اور اس کے چمکیلے کلس کے اوپر ایک بڑا سا نیلا ستارہ پھٹتی سحر کی نوری جھلکیوں میں ماند پڑ رہا تھا۔

میں یوں مطمئن اور پرسکون تھا، جیسے میں سچ مچ گوتم بدھ ہوں، اور مجھے ابھی ابھی گیان حاصل ہوا ہے۔

شوکت صدیقی

تیسرا آدمی

دونوں ٹرک سنسان سڑک پر تیزی سے گزرتے رہے!

پتھریلی روڈ مشرق کی طرف مڑتے ہی ایک دم سے نشیب میں چلی گئی ہے۔ اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رات اب گہری ہو چکی ہے اور آغازِ سرما کی بپھری ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دونوں ٹرک ڈھلوانوں پر کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا ہے۔ ایکا ایکی اندھیرے میں سے کسی نے چیخ کر کہا ——

"اے، کون جا رہا ہے ٹرک روک لو!"

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پُراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں تیزی سے گزرتے رہے۔ اس دفعہ ذرا دور سے آواز سنائی دی ——

"روکو، روک لو ٹرکوں کو!" اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ اُبھرنے لگی۔ اس کی تیز روشنی کبھی کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر لہرا جاتی ہے۔ لیکن ٹرک رک نہیں سکتے، اس لئے کہ یہ خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل ویران ہے۔ اور دونوں ڈرائیور بڑے اکسپرٹ ہیں۔

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جا رہی ہے، اور قریب! اور قریب!! اور اس کا شور ٹرکوں کے نزدیک ہی دھڑکنے لگا ہے۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے، اس لئے کہ ڈھلوان پر ٹرکوں کے بے قابو ہو جانے کا پورا اندیشہ ہے۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن نیلی آنکھوں والا خاموشی سے بیٹھا ہوا سگرٹ پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ پھر ایک بارگی کوہستانی ٹیلوں کی گہرائی میں ریوالور چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز سے گرجنے لگی، اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا ——

"روک لو ٹرک کو نہیں تو میں ٹائر برسٹ کر دوں گا"

اور اس وارننگ کے ساتھ ہی دونوں ٹرک ٹھہر گئے۔ ٹرک کے اندر سے صرف وانچو اُتر کر نیچے آیا۔ باہر بت جھڑ کی شوریدہ سر ہوائیں چل رہی تھیں، اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے ملیسے اوور کوٹ کے کالروں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجلاہٹ کے سے انداز میں سڑک پر پھینک کر جوتے سے مسل ڈالا اور بڑے تیکھے لہجہ میں پوچھنے لگا

"اس طرح ٹرکس کو رکوا لینے کا مطلب، کیا چاہتے ہیں آپ؟"

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر وانچو کے اس انداز سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا "میں انٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں اور دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں"۔

وانچو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا، اور ریوالور ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ وانچو نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر پوری طرح وحشت زدہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جھٹ سے کاروباری پینترا بدلا اور بڑے بے تکلفی سے کہنے لگا "اچھا تو آپ ہیں" اور پھر وہ مسکرا دیا "اگر آپ تسلی پوچھتے ہیں تو سنئے دونوں ٹرکوں پر آلو کے بورے لدے ہوئے ہیں جن کے ثبوت میں ڈسٹرکٹ ایگزائز آفس کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا محصول ابھی پچھلے ہی ناکہ پر ادا کیا ہے۔ اور جو کچھ اصلیت ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے اس لئے کہ آئرن شیٹ کو اس طرح لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں یہ سلسلہ تو ایک مدت سے چل رہا ہے"۔

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا ـــ

"جی ہاں سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر تپسیا کر رہا تھا"

وانچو ہنسنے لگا "یہ تپسیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر مول لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ ٹیلیفون کیا۔ اگر آپ دفتر میں مل جاتے تو آپ کو اس طرح کیوں پریشانی اٹھانا پڑتی اور خود مجھے بھی یہاں سردی میں نہ آنا پڑتا۔ مگر چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا۔ اس بہانے آپ کے درشن تو ہو گئے!"

اور وہ تین سو روپے جو احمد پور کے اس ٹرپ میں وہ بچا لینا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب میں سے نکالا اور انسپکٹر کی طرف ان کو بڑھا کر کہنے لگا۔

"آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجئے ان کو رکھ لیجئے۔ فرمائیے اور کیا سیوا کی جائے!"

انٹی کرپشن کا انسپکٹر روکھے پن سے بولا۔

"اس مہربانی کا شکریہ! اب اتنی اور مہربانی کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے"

وانچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے رہے۔ اور کوہستانی چٹانوں میں پت جھڑ کی بپھری ہوئی ہوائیں چیختی رہیں، آگے ٹھہرے ہوئے ٹرکوں کے اندر سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں۔

وانچو غور کرنے لگا کہ یہ آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور بھی دکشنا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن کے اندر ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ سودا بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے ہیں۔ اسی لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ ہسٹری شیٹر بن سکتا ہے۔ اور کارہائے نمایاں انجام دینے والا سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہسٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے اور سرمایہ داری کے لئے گورنمنٹ سے سازباز کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ وانچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی نوٹ نکالے اور آہستہ سے کہنے لگا

"انسپکٹر تیواری جب تک اس سرکل میں تعینات رہے ہماری انڈسٹری کی طرف سے ان کو اسی حساب سے ان کا حق برابر پہنچتا رہا" پھر خوشامد کے سے انداز میں وہ مسکرا کر بولا "لیکن آپ کو اس طرح جاڑے پالے میں رکر پریشان ہونا پڑا ہے، اب اس پریشانی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔ لیجئے یہ

دو سو اور ہیں۔ دیکھئے اب کچھ نہ کہئے گا اور اپنا یہ ریوالور تو آپ اب اندر رکھ لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

مگر بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اسی طرح ناراضگی کے سے انداز میں بولا ـــــ

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں ان دونوں ٹرکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت خراب کر رہے ہیں اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اور وہ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی تیکھی نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس کو خطرے کی نوعیت کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے کہ دونوں ٹرکس کسی طرح بھی پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا یہی ہدایت تھی۔ اور اس ذمہ داری کے لئے ہی اسے اس کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ منیجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے چھ سو روپے اکسٹرا الاؤنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اب اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔ کمپنی اس کی کارگزاریوں کو سراہتی رہی ہے۔ وہ بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ میں بہت سی باتوں کے لئے اس کو جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور اکثر ایسے بے تکے سوالوں سے اس کو سابقہ پڑتا کہ وہ بدحواس سا ہو جاتا۔ اس لئے وہ پانچسو روپے سے زیادہ دو ٹرکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا۔ ورنہ آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائرکٹر الجھ گیا تو بہت ممکن ہے کہ یہ رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ دراصل ابھی تک فیکٹری کی تعمیر کے لئے کمپنی اپنے پاس سے صرف روپیہ ہی لگا رہی ہے۔ شوگر پلانٹ کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ البتہ کمپنی کے وہ فارم جن میں اکھ کی کاشت ہوگی ان میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں۔ اور یہ آلو گنی بیگس میں بھر کر قصباتی بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں۔ آلوؤں کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور آئرن شیٹس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر بلیک مارکیٹ میں جاتے ہیں۔ کمپنی کو اپنی انڈسٹری کی تعمیر کے لئے سیمنٹ اور آئرن کا بہت بڑا سرپلس کوٹا مل گیا ہے جس کی سمگلنگ سنسان راتوں میں بڑے پُراسرار طریقے پر ہوتی ہے۔ اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک ہیں۔

وانچو غور کرنے کے سے انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ اور چہرے کے تیکھے نقوش مجسموں کی طرح ٹھوس نظر آ رہے ہیں۔ پھر یک بارگی اس نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ انہیں دہشت ناک موقعوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے اس کے فیصلے کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے۔ اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں وہ کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا ـــــ

"نیل کنٹھ، اے نیل کنٹھ مہاراج"

اور ٹرک کے اندر سے سفید چٹیوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا ـــــ

"کیا ہے سکٹری ساب؟"

پھر وہ اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کا آبنوسی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔

وانچو کہنے لگا "دیکھو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو مانتا ہی نہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ دونوں ٹرک تھانے پر بھی نہیں جا سکتے۔"

وہ سینہ تان کر بولا

"تو جو حکم ہو!"

گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر سازش کرنے کے سے انداز میں اس نے ایک آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا

"مجھ کو تو صرف لاش کلیئر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہئے۔" پھر مڑتے ہوئے اتنا اور کہا "میں جا کر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تم ٹرکوں کی پشت پر سے گھوم کر آ جانا۔ سمجھ گئے نا!"

اور نیل کنٹھ جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں۔ وانچو وہاں سے سیدھا انٹی کرپشن کے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے بولا

"آپ نے ٹرکوں کو سٹارٹ نہیں کروایا، بلا وجہ دیر ہو رہی ہے۔"

وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا "آپ تلاشی لیں گے یا ٹرکس اسی طرح چلیں گے؟"

وہ کہنے لگا "بظاہر تو اب کوئی ایسی ضرورت نہیں، یوں جیسے آپ کی مرضی!"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرا دیا "انسپکٹر صاحب مرضی ہماری کہاں، مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

وہ بے نیازی سے بولا "دیکھئے ان بے کار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو آپ تھانے پر چل کر کہہ لیجئے گا۔"

وانچو سنجیدہ ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آئرن شیٹس اور سیمنٹ کا سرپلس کوٹا بے سکتے ہیں۔ اور جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ جو چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا رستہ بھی پہلے دیکھ لیتا ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس لئے کہ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کے وڈ ڈائرکٹر ایم، ایل، اے بھی اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے۔ اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے اور رسوخ بھی ہے۔ لیکن بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ان تمام باتوں کو نہیں جانتا۔ اس سرکل میں ابھی اس کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقہ میں وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ایک آدھ بڑا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی۔ اور پولیس کی تکنیک کے مطابق ایک بار جہاں ہوا بندھ گئی پھر تو لکشمی آگے تو دو قدم چومتی ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آسکتا۔ وانچو کی باتوں پر جھنجھلا کر اس نے جواب دیا ——

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ چل کر ذرا سوالات میں ٹھہرئیے۔ پھر دیکھیں گے کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔"

اس دفعہ وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا

"انسپکٹر صاحب مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانہ تک جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی طے کر سکتا ہوں۔ آپ کے ایسے انٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے یہاں اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اگر ان میں سے آپ کو کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔"

انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آ گئی۔ وہ اس کو بڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا۔ اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیل کنٹھ نے اس کے سر پر آہنی راڈ اٹھا کر زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے پھٹی ہوئی بھیانک آواز نکالی، اور لڑکھڑا کر سڑک پہ گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے بوجھل جوتے سے رگڑ دیا۔ اور ریوالور کو چھین کر ٹیلوں کی طرف پھینک دیا۔ اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا ——

"دھت تیرے کی، سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔" اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا "مہاراج ڈال دو سالے کو ادھر کنارے کی طرف۔" اور پھر اطمینان سے ایک سگریٹ سلگا کر پوچھنے لگا "ہاں یہ دیکھ لو کہ زخم گہرا تو نہیں، ورنہ بلاوجہ بات اور بڑھ جائے گی۔"

نیل کنٹھ کہنے لگا "ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پہ بے سدھ پڑے ہوئے بھاری بھرکم جسم والے انسپکٹر کا بازو پکڑا اور اس کو گھسیٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا کرخت چہرا خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ اور سانس سہمی ہوئی سی چل رہی تھی۔ وہ اسی طرح جھکے ہوئے کوہستانی ٹیلوں کے دامن میں کہیں لا

کی طرح بے جان پڑا رہا۔ اور آغازِ سرما کی ٹھنڈی ہوائیں پتھریلی چٹانوں میں ہانپتی رہیں۔ اور ایک بار گیدڑ کہیں نزدیک ہی گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔
دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ سنسان رات میں اُبھرنے لگی۔ اور وہ موٹر سائیکل کو بُری طرح روندتے ہوئے سڑک پر پھر چلنے لگے۔ لیکن احمد پور جانے کے بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے۔ اور کوئی سترہ میل کا چکر کاٹنے کے بعد دونوں ٹرک پیڈرا کی چونگی پر پہنچ گئے جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا:۔

بلیر گھاٹ اکیاون میل۔
سجنواں کلاں، اٹھارہ میل
شیام باڑہ، چوراسی میل
احمد پور ایک سو باون میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ اکٹرائے ٹیکس آفس تھا جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا۔ اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھولے ہوئے کھانس رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں پر دونوں ٹرکوں کی چونگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔ واینچو ٹرک پر سے اُترا اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا اور سرگوشی کے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

"منشی جی میرے خیال میں آپ کے رجسٹروں میں نام تو درج نہ ہوتا ہوگا۔" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تیس روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دئے۔ "لیجئے ان کو رکھ لیجئے۔ اگر کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرکس کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نہ آپ؟"

اور بوڑھے محرر نے اپنی گردن ہلا دی۔ "ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں؟"

واینچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا

"جب تک ہم موجود ہیں اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آ سکتی ہے؟"

وہ بھی ہنسنے لگا۔ "سو تو ہے، پر بات اتنی ہے سرکار کہ اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سسرے بال کی کھال نکالتے ہیں۔"

اور پھر چونگی کے بوڑھے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہو گئے۔ سامنے تیمر پور روڈ اندھیرے میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس پر جانے کی بجائے راہیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ واینچو نے گھڑی میں وقت دیکھا، اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اور پھر وہ پہنچنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک بیرگڑھ پولیس سٹیشن کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ واینچو تھانہ کے اندر چلا گیا۔ اور ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپے دے کر اس نے ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں درج کر دیا گیا۔

"ٹرک نمبر ۲۱۲۳، نو بجے شب کو راہیل روڈ پر سے گزرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائٹس کے پایا گیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکورہ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے۔ اور اس میں آلو کے بورے لدے تھے۔"

اور اسی طرح کھیم پور کے تھانہ پر مزید ڈیڑھ سو روپے رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا گیا۔ اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری روزنامچہ میں اندراج کرنے لگا۔

"پونے دس بجے شب کو ٹرک نمبر ۲۲۲۶ راہیل روڈ پر اتنی تیز رفتار سے گزر رہا تھا کہ کسی حادثہ

کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈپوٹی انسپکٹر ہرنام سنگھ نے اس کو زکوا کر تحقیقات کی تو یہ بھی معلوم ہوا
کہ ڈرائیور مسمی نذر محمد کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔"

اس کے بعد دونوں ٹرک پھر راہیل روڈ پر تیزی سے گزرنے لگے اور صبح کاذب کی گہری دھند میں دونوں ٹرک بلبیر گھاٹ پہنچ گئے۔ پھر چھ بجے سے پیشتر ہی واپچو بھارت انجینئرنگ ورکس کی نئی اسٹوڈی بیکر پر واپس لوٹ پڑا۔ اور ابھی دھوپ اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

واپچو اپنے دفتر میں جا کر حسبِ معمول کمپنی کے کاموں میں اُلجھ گیا۔ ورات کے حادثہ کی اہمیت سنیچر کے روز ہونے والے اس ڈریلمنٹ سے زیادہ نہ رہی، جس میں ریلوے کی ایک بنکرج فیکٹری کے یارڈ کے اندر ڈیمج ہو گئی تھی۔ اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار روپے کا کلیم کیا تھا۔ اور عدالتی کارروائیوں کے لئے ہیرندر پرشاد ایڈووکیٹ کمپنی کے مشیر قانونی موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی، تفتیش برابر ہوتی رہی اور اینٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ہسپتال میں پڑا کراہتا رہا۔ اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ بھنگ چڑھا کر بٹالہ سے گالیاں بکتا اور اپنے کوارٹر کے اندر لیٹا ہوا رات گئے تک اونچی آواز میں الہا گاتا رہا۔

"اور اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو؟"

"پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"

"لیکن دلیپ چند تمہیں معلوم ہے کہ میں کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں؟"

کمرے کے اندر اسی طرح تیز لہجے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آتشدان میں کوئلے چٹخ رہے تھے۔ دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں واپچو کا گنجا سر چمکنے لگا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بھدا سا پائپ پیتا رہا۔ دریچے سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے اندر آ رہے تھے اور فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے، اور اس دھند میں لپٹی ہوئی مینجنگ ڈائریکٹر کی خوبصورت کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، جس کے باہری برآمدے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ لگائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ برآمدے میں بالکل اندھیرا تھا، اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا سیاہ آبنوسی جسم آسیب زدہ سایہ کی طرح ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

نیل کنٹھ اسی طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب کبھی دیپ چند تیزی سے بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف گھبرا کر دیکھتا جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔ لیکن دیپ چند اندر بیٹھا ہوا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے "شیڈ" کی پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ اور اس دھندلی روشنی میں اس کا ننھا جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر دیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔ کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا واپچو بھی جانتا ہے اور اس کی اہمیت مینجنگ ڈائریکٹر کو بھی معلوم ہے، جس کو فیکٹری کے اندر سب لوگ کنور صاحب کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مانی بازار کے علاقہ کا جاگیر دار ہے۔ وہ کاروباری تکنیک سے زیادہ گھوڑوں کی نسلوں اور عورتوں کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے زندگی بھر ریس میں گھوڑے دوڑائے ہیں۔ اور عورت کے جسم پر کسی کیمیاگر کی طرح کوک شاستری تجربے کئے ہیں۔ اور جب سے جاگیرداری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں اس نے بھی اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا۔ اور اس دور اندیشی نے اس کو کنور شیوراج سنگھ سے ایکبارگی یونائیٹڈ انڈسٹریز کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے۔ لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے بے نیازی سے کہہ دیا ——

"اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں۔"

مینجنگ ڈائرکٹر یک بارگی برافروختہ ہو کر بولا ——

"ٹھیک ہے کہ تمام رجسٹر تمہاری نگرانی میں رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے تمہارا مطلب؟"

وہ کہنے لگا "چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کنور صاحب، آپ میرے ساتھ حق تلفی کریں گے تو میں بھی سارے رجسٹروں کو کل ڈائرکٹروں کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں۔"

مینجنگ ڈائرکٹر کے سانس کی رفتار ایک دم سے تیز ہو گئی۔ اور وہ مخنی جسم والے دیپ چند کو عقابی نظروں سے گھورنے لگا لیکن دیپ چند بیٹھا ہوا مزے سے اپنی کنپٹی کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مینجنگ ڈائرکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔

دیپ چند ان کی سازش کے اتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن داموں میں چور بازار میں فروخت ہوتا ہے کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے۔ اور اس طرح اب تک مینجنگ ڈائرکٹر نے پوشیدہ طور پر کئی دو لاکھ روپیہ غبن کر لیا ہے۔ لیکن دیپ چند کو اپنے اعتماد میں رکھنے کے لئے ہی نے دس فیصد کا شرکت دار بنا لیا تھا اور اس بیس ہزار روپے کی دائیگی کے لئے اس کی نیت بدل گئی اور دیپ چند کے اکثر توجہ دلانے پر بھی وہ برابر ٹالتا رہا۔ لیکن دیپ چند یہ طے کر کے آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر کے جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی بڑی لڑکی کی شادی کے بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی ہے، گھر اچھا ہے اس کے لئے کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے کاسُتھوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ ملاکت میں دینا ہے۔ ورنہ یہ سگائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مینجنگ ڈائرکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائرکٹرز سے سفارش کر کے اس کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہانہ سے ساڑھے تین سو کروا دے۔ مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں ہے۔ اسے بیس ہزار روپیہ چاہئے —— اس لئے کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلدی کر دینا چاہتا ہے۔

مینجنگ ڈائرکٹر کا چہرہ جھنجھلاہٹ کے اثر سے برابر غضبناک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یک بارگی وہ کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر سے صرف رانی بازار کے علاقہ کا کنور شیو راج سنگھ رہ گیا۔ اس نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا "تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ۔" وہ پھر وہ چیخ کر زور سے بولا "جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

اور مخنی جسم والا ناٹک کا مسخرہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے ہیں اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پھر واچو نے اپنا پائپ میز پر رکھ دیا اور مینجنگ ڈائرکٹر سے کہنے لگا ——

"کنور صاحب، آپ نے کیا کر دیا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے علیحدہ کر دو!"

واچو گھبرا کر بولا

"لیکن اس طرح سے کام تو نہیں چلے گا۔ بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے ہم کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ڈاکومنٹری ثبوت موجود ہیں۔"

کنور شیو راج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا، اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا ——

"اچھا تو اب کچھ تم ہی کرو۔"

وانچو کہنے لگا "آپ ذرا اندر کوٹھی میں تشریف لے جائیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آسکتا ہے"۔
کنور شیوراج سنگھ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا اور اس سے کہنے لگا ——

"نیل کنٹھ مہاراج " دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ، کہنا کہ سیکرٹری صاحب نے بلایا ہے "۔ وہ نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہمراہ دیپ چند بھی تھا۔ نیل کنٹھ پھر جا کر برآمدے میں ٹھہر گیا اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا
"اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں بوڑھے ہونے کو آ گئے مگر مزاج پہچاننا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے"
لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا "تیر" ٹھیک پڑا ہے، اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا ——
مگر سیکرٹری صاحب یہ تو دیکھئے کہ کنور صاحب تو میرا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کرتا بھی کیا؟"
وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا۔
"کمال کر دیا آپ نے، اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے میں آ کر پھنسے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے۔ دیکھئے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گُر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے "۔
اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا
"اب کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب مجھے بھی اس وقت نامعلوم کیا سوجھی کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا۔ دراصل میں اپنی لڑکی کی سگائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے۔ اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں، بس اب تو یہی لگن ہے "۔
وانچو ہمدردی کرنے لگا
"جی ہاں لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہی ہے۔ لیکن بات کے اسی پہلو پر آپ نے زور دیا ہوتا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ ریس بازی پر تباہ کیا ہے۔ کیا اس کنیا دان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے"۔
"اچھا تو آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"
وانچو کہنے لگا "کیجئے گا کیا! کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو ہزار روپیہ ملے گا "۔
منحنی جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر یک بارگی زندگی کی رمق ہویدا ہو گئی۔ وہ مسکرا کر بولا "تو پھر اس کام کو اب کر ہی دیجئے سیکرٹری صاحب! آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا "۔
وانچو جلدی سے بولا ——
"آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں "۔ پھر اس نے میز کی دراز سے کنجی نکالی اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا "لیجئے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال لیجئے۔ میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کئے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ صوبے آفس بھیجنے سے پہلے ہی میں ان سے دستخط کروا کے آپ کو چیک دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں "۔

اور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہو گیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی اور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے سبزی مائل چھوٹے سے بلب کو دیکھا جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔ آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا۔ اور وانچو گردن موڑے ہوئے مجرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا اسی وقت وانچو نے دیوار میں لگے ہوئے سوئچ کو دبایا۔ دیپ چند ایکا ایکی بڑی بھیانک آواز سے چیخا۔ پھر اس کے کراہنے کی دبی دبی آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں۔ اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کے اندر اندھیرا کر دیا۔ آتش دان کی گہری سُرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ سامنے والی دیوار پر بڑا مہیب نظر آنے لگا۔ دیپ چند کے حلق کے اندر سے بلیوں کے غرانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور باہر فیکٹری کے ورکشاپ میں لوہے کے ٹکرانے کی جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف گہرا دھندلکا چھایا ہوا تھا اور کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں کھڑا ہوا وانچو بڑا پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی اور اس کے گنجے سر پر پسینہ کی نمی آگئی تھی۔ پھر وہ خواب میں بھٹکنے والے سایوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آہنی سیف کے قریب جا کر ٹھہر گیا اور ذرا دیر تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل سے اُلجھا ہوا تھا، اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وانچو خونخوار نگاہوں سے کھڑا ہوا اس کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیل کنٹھ کو آواز دی۔ اور نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا ——

"کیا حکم ہے سیکرٹری صاب ؟"

وانچو کہنے لگا "جاؤ ورانڈے میں لگے ہوئے مین سوئچ کو آف کر دو۔ اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر آہنی سیف پر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب بھی بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل پر سے چھوٹ گیا اور اس کا بے جان جسم فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نیل کنٹھ اندر آگیا۔ وانچو اس سے کہنے لگا ——

"اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں" اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا۔ پھر اس نے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لاد لیا اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوئچ کو احتیاطاً دبا کر آف کر دیا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب میں سے ٹارچ نکال کر اس کو روشن کیا۔ اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا اور اس کی پشت پر لگے ہوئے نلکس ایل وائر کو علیحدہ کر دیا اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لیڈ شیٹ چڑھا کر دونوں اسکرو اچھی طرح کس دیئے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ اور جب وہ اس کے دروازے کو بند کرنے لگا تو یک بارگی اس کو دیپ چند کی پھٹی ہوئی آنکھیں یاد آگئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا اور آتشدان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح چیخنے لگے۔ وانچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی اور بدحواس سا کمرے کے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے مین سوئچ آن کر دیا اور ایک دم سے دریچوں پر روشنی کی ہلکی ہلکی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے ورانڈے کی سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا باہر لان میں چلا گیا جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وانچو نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کو دھیرے سے آواز دی۔ اور وہ دونوں گہری دھند میں کھوئے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے

قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستے پر دور تک سنائی دیتی رہی ——!!

رات گئے جب نیل کنٹھ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دُبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ دیپ چند اکاؤنٹنٹ کا لڑکا منا تھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا۔

"پربھو بابا، اے پربھو بابا!" اور پھر پربھو بابا اندر سے کھانستا ہوا باہر نکلا اور اس کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا

"ارے تم اس سمے کہاں نکل پڑے، ہائے رام کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے؟"

سردی سے سکڑا ہوا منا کہنے لگا ——

"بابو جی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں۔ سو انہوں نے مجھ کو پوچھنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور کرشنا دیوی تو رات کو نکلتی ہی نہیں۔"

بوڑھا چوکیدار کہنے لگا کہ "وہ کنور صاحب کی کوٹھی پہ گئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر ان سے کہہ دوں گا۔ چلو بیٹے تم کو کوارٹر تک چھوڑ آؤں۔" اور وہ لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر چل دیا۔ نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر یک بارگی، اس نے سنا کہ منا ٹھہر کر کہنے لگا تھا۔

"پربھو دادا تم جا کر بابو جی کو لے آؤ، میں کوارٹر چلا جاؤں گا۔ تم جلدی سے آجانا۔ وہ ننھی بلو ہے نا بابو جی کے بنا اس کو نیند نہیں آتی۔ خوب زور زور سے روتی ہے۔"

اور جیسے نیل کنٹھ کے کان کے پاس کوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا "جاؤ منا اب تمہارے بابو جی کبھی نہیں آئیں گے۔ اور ننھی بلو روتے روتے ان کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے اندر چپ چاپ پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کی کچھ سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی۔"

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی طرح پگھلنے لگا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف جیسے دبی دبی سسکیاں دھڑک رہی ہیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا اور اس کو کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اس شور سے وہ اچانک چونک پڑا اور اس کو یاد آ گیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر کوارٹر کی پشت پر جا کر صحن کی پچھلی دیوار کو پھاند کر وہ اندر آ گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں والی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہرے داروں کی بھیانک سیٹیاں دیر تک چیختی رہیں۔ اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا وہ بڑی رات تک نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہو گئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی۔ اس نے الیکٹرک جنریٹر کے "سوئچ بار" کو غلطی سے چھو لیا تھا، اور اس حادثہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے یارڈ میں یہ بھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خودکشی کر لی ہے۔ اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور کنور شیوراج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے بے سہارا خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔

فیکٹری کی تعمیر ایکا ایکی سست پڑتی جا رہی ہے ——!

پھاگن کی مہکتی ہوئی ہوائیں چلنے لگی ہیں اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگی ہیں۔ اور کھیتوں میں جیسے بسنتی آنچل لہرا جاتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانجیں بجا کرتی ہیں اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے ہیں۔ پھر

گاؤں کے اندر بڑے بڑے الاؤ دہکنے لگیں گے اور عبیر و گلال اڑنے لگے گا۔ پھاگن کی ہوائیں چیختی پھر رہی ہیں کہ ہولی آ رہی ہے، ہولی آ رہی ہے۔ پھر گیہوں کی لہلاتی ہوئی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی اور دور کے شہروں میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں جھیلوں پر اکٹھے ہونے والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے قلی دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی ہے۔ اس بات سے قلیوں کے روکھے چہرے پر ہر وقت جھنجھلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ ٹائم کیپر آفس میں اکٹھے ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں ——

”یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

”یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آ رہا ہے۔ ہم کو پیسہ چاہئے ہے۔“

”ہاں، ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔ ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔“

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی، اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے کہ شوگر کا پلانٹ جلدی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ مگر مزدور لوگ اس کے باوجود بھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں۔ سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائرکیٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے ——

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

مگر ان تین ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بلکہ ہولی کا الاؤ دہکتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام پر سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینیجنگ ڈائرکیٹر کے آفس میں جاتا اور سہمی ہوئی سی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینیجنگ ڈائرکیٹر جھنجھلا کر مزدوروں کے ساتھ سہمے ہوئے ٹائم کیپر کو بھی گالیاں دینے لگتا۔ پھر ایک روز اس نے واپچو کو اپنے دفتر میں بلایا اور پریشانی کے عالم میں اس کو کہنے لگا ——

”مسٹر واپچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا؟“

مگر واپچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا ——

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کنور صاحب۔ بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے، یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ بھی سن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انہیں یہ فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی۔ اور یہ زمینداری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔“

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا ——

”تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو۔“

واپچو ذرا دیر تک مینیجنگ ڈائرکیٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا

”میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہو گا۔“

مینجنگ ڈائریکٹر جلدی جلدی کہنے لگا

"ذرا اپنے کو بچا کر کام کرنا، اور روپیہ کی تم فکر نہ کرو۔ میں ڈائریکٹروں سے نپٹ لوں گا۔ اور یوں بھی کچھ کم خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر آئندہ سیزن تک فیکٹری اسٹارٹ نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی"۔

وانچو پوچھنے لگا "آپ کے خیال میں یہ بنگالی کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے، اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

وہ گردن ہلا کر بولا

"میں سمجھتا ہوں کہ آدمی تو وہ کام کا ہے۔ انارکسٹ پارٹی میں کئی سال تک رہ چکا ہے۔ انہی دنوں پولیس نے ایک بار گرفتار کر لیا تھا۔ بہت بری طرح اس کو مارا پیٹا گیا مگر اس نے ذرا سا بھی سراغ نہ دیا۔ تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو"۔

پھر وانچو نے چپراسی کو آواز دی، اور اس کو سانیال کے بلانے کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بھدے چہرے والا کیمسٹ دفتر کے اندر آ گیا۔

وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر پوچھنے لگا

"مسٹر سانیال، نومبر کے مہینے میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں آپ نے گورنمنٹ لیبارٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں کوئی آپ کا جاننے والا تو نہیں ہے؟"

بھدے چہرے والا سانیال ذرا دیر تک غور کرنے کے بعد بولا۔

"جی ہاں میری والف کے ایک رشتہ دار اس میں کام کر رہے ہیں جن کے فلیٹ میں میں دو روز تک ٹھہرا بھی تھا"۔

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ یک بارگی جیسے دمک اٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا "پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھئے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچ جائیے۔ آپ کو گورنمنٹ لیبارٹری کے ذریعے ایک بڑا اہم کام کرنا ہے"۔

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دے دیا۔ پھر شام کے وقت مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر سانیال وانچو کے ساتھ بند کمرے کے اندر دیر تک رازدارانہ باتیں کرتا رہا اور پروگرام کے مطابق شب کی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گیا۔

پانچویں دن فیکٹری میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلیگرام آیا، لکھا تھا

"بارڈویئر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا"۔

وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا اس "گڈ نیوز" پر غور کرتا رہا۔

پھر کئی روز اور گزر گئے کوئی اطلاع نہ آئی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک روز فیکٹری کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔

وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا

"کیا خبر لائے ہو؟"

"کام تو بن گیا!"

وانچو مسکرانے لگا "تو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

سانیال دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا۔

مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے"

وانچو لحظہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا

"اچھا آپ جاکر ذرا نہا دھو کر آرام کیجئے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا، پھر دفتر سے باہر چلا گیا۔ اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ بعد سے چہرے والا کیمسٹ فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔

وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا اس کو دیکھتا رہا، اور جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر اپنی میز پر آگیا اور ٹیلیفون اٹھا کر مینجنگ ڈائرکٹر کو رنگ کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی، اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی اور گہرے سناٹے میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی۔ جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ فیکٹری کے احاطے سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک ہے، اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی کے ساتھ گزرتی رہی۔ مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آگئی تو جیپ کو جھٹکے لگنے لگے اور وہ کھڑکھڑانے لگی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بڑا پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا، اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے باہر پھاگن کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ پھاگن کی ہوائیں جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہیں، اور ہولی جواب ختم ہو چکی ہے۔ اب تو گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور ہوا کی تیز باڑ سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں جانے اکبر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے جس کی کتھائی کا چوپال پر بڑا چرچا رہا کرتا تھا۔ اور ایکا ایکی بانبی کی لے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں ایک کسان ہوں، ہاں میں کسان ہوں"

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا، نہیں تو مجرم ہے تو مجرم ہے۔ پولیس تیرا وارنٹ لئے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور جیپ پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھا رہی تھی اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر یک بارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔ نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔ لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی آہستہ آہستہ گنجان درختوں کے نیچے کچھ دور تک چلتی رہی اور پھر گہرے اندھیرے میں جاکر ٹھہر گئی۔ اور دونوں اتر کر نیچے آگئے۔

وانچو نے آگے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنامیٹ کے بھاری کیس کو باہر نکالا۔ یہ ڈائنامیٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جس کو گورنمنٹ لیبارٹری سے سمگل کیا گیا تھا۔ اور جس پر پینی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پھر نیل کنٹھ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ اور درختوں سے الجھتی ہوئی کوہستانی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اندھیرا بہت گہرا تھا، اور پتھریلی چٹانوں میں بہنے والی کوکیلا ندی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں اسی طرح نی فرلانگ تک چلتے رہے۔ پھر ایک جھکے ہوئے ٹیلے پر سے گزر کر جب وہ نشیب میں پہنچے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا دریا کا شور بڑا ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس وادی میں کوکیلا ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ دونوں طرف سر بلند کوہسار ہیں۔ اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اس مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کر دیا ہے۔ اس باندھ کے پار پانی گرجتا ہوا اونچائی پر سے گرتا ہے اور قریب ہی میں پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے۔ جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو

سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وانچو کی ہدایات کے مطابق نیل کنٹھ ڈائنامیٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے لگا۔ اور پھر وانچو اس کے واڑ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی چٹانوں کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی تیکھی نظریں سامنے پتھروں پر جاتے ہوئے نیل کنٹھ کا پیچھا کرتی رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر اچانک وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور دریائے کوکیلا کا تیز دھارا ڈیم کے نیچے گرجتا رہا۔ اور مہیب شور میں پھاگن کی ہوائیں جیسے سو گئی تھیں اور سربلند کوہساروں خوابوں میں ڈھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ پھر اچانک ڈیم کے اوپر دھندلی روشنی میں ایک انسانی سایہ لہرایا اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے پہرے دار نے چیخ کر کہا ——

"ہالٹ!"

"کون ہے، ٹھہر جاؤ!"

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دھڑکنے لگی۔ لیکن نیل کنٹھ آہنی گاڈر سے چپٹا ہوا ڈائنامیٹ کو فٹ کرتا رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے پاس سے ایک بار زن سے گزر گئی۔ وانچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں گونجنے لگی۔ اور اس کی دھڑکن کوہساروں کی گہرائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ وانچو کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ پھر ایک دم سے ڈائنامیٹ کا دائرہ دور زور سے ہلنے لگا۔ گویا اسے اب اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے۔ مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کوئی ایک منٹ اس کے انتظار میں گزر گیا۔

پھر کئی منٹ بڑی بے چینی کے عالم میں گزر گئے!!

وانچو نے یک بارگی جھنجھلا کر سوچا کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر کرنا بہت خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ طے نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ وہیں مر گیا اور بعد میں اس کی لاش شناخت کر لی گئی۔ تب تو بہت خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں سے گزرتا رہا اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر بات کی مدھم روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ وہ پتھروں پر جھکا ہوا آہستہ آہستہ آ رہا تھا جب وہ بالکل قریب آ گیا تو وانچو نے آہستہ سے صرف اس قدر پوچھا "سب ٹھیک ہے؟" اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ وانچو نے مزید تاخیر کئے بغیر یک بارگی ڈائنامیٹ کو "آن" کر دیا۔ اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سربلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم چیتھڑوں کی طرح بکھر کر رہ گیا اور دریائے کوکیلا کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا وانچو، نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر درختوں کے گہرے اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کے کندھے پر سے برابر خون بہہ رہا تھا جو گولی سے بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا بے جان ہو کر پچھلی سیٹ پر گر پڑا اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ راستہ بھر وہ کراہتا رہا اور اس کے زخم سے خون بہتا رہا۔ جیپ تیکھے گھاٹی تیزی سے گزرتی رہی۔ اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آنوک جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا تھا۔ اور اسی لئے کوارٹر پر بھیجنے کی بجائے اسے مینیجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر ٹھہرا دیا گیا۔

دریائے کوکیلا پر بنے ہوئے ڈیم کے اس طرح تباہ ہو جانے پر ترائی کے علاقہ میں بڑی سنسنی پھیل گئی ہے اور سرکاری حلقوں میں ایک ہنگامہ مچ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس باندھ کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کئی کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے تمام سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی، اس لئے فیکٹری کے "گیسٹ ہاؤس" میں مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر

دلیس بُری طرح "مارچ" کر رہی ہے۔ اور انہیں دنوں اچانک ریونیو منسٹر کا داماد نرائن ولبھ فیکٹری میں آگیا۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائرکیٹر ہے۔ رات کو مینجنگ ڈائرکیٹر کے پرائیویٹ کمرے میں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو ایک دم سے اس پر برس پڑا۔

"کنور صاحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ فیکٹری اب برباد ہونے والی ہے"

مینجنگ ڈائرکیٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے بوکھلایا ہوا تھا۔ نرائن ولبھ کی باتوں پر وہ اور بھی بدحواس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں تو یہاں سے بڑا عاجز آگیا ہوں"

مگر وہ کہتا ہی رہا "اب تو آپ ایسا کہیں گے ہی۔ مگر آپ کو کم سے کم یہ تو سوچنا چاہیئے تھا کہ گورنمنٹ کا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں کہ اتنی بڑی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہوم سیکریٹری کے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے۔ اس میں فیکٹری پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے کہ ادھر جو لیبر کی بارش کی پڑ گئی تھی اور جس طرح یہ مشکل خود بخود ختم ہو گئی ہے اس بات پر کون نہیں شبہ کر سکتا ہے۔ دراصل ہوا بھی ایسا ہی ہے، اس لئے کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گرد و نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کمپنی کا بیرا تیسر ہر روز سویرے صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے، اور وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر کھریا سے سفید نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس فیکٹری میں نام مل گیا ہے اور جو وہ آئے روز مزدوری ملے گی۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھاٹک سے باہر کھڑے ہوئے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سہمے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔۔!!

مینجنگ ڈائرکٹر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ بڑے شکست خوردہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وانچو تو مجھے یہی کہتا رہا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھ کر جیسے وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا اور اس کی بات کا اثر بھی ٹھیک ہی ہوا۔ یوں بھی کمپنی کا مینجنگ ڈائرکیٹر ہونے کے علاوہ وہ سائی بازار کے علاقہ کا جاگیردار بھی تھا۔ اس لئے نرائن ولبھ ایک دم سے وانچو پر بگڑنے لگا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وانچو مجھ کو بڑا خطرناک آدمی معلوم پڑتا ہے۔ آپ اس کی سازشوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دیکھئے۔ اب یہی بہتر طریقہ ہے کہ وانچو کو اسی اشورنس پر فیکٹری سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہر وقت خطرہ سامنے ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا"

مینجنگ ڈائرکیٹر گہری خاموشی میں کھو گیا اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا تھا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔ وہ اس کے ہر خطرناک راز کو جانتا ہے۔ اس طرح نوکری سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا پورا خوف تھا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بات پر اگر وہ کمپنی کا مخالف ہو گیا تو سرکاری گواہ بن کر بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی طریقہ سے اس کو یہاں سے ابھی ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا" اور یہ بات نرائن ولبھ ایم، ایل، اے کی سمجھ میں بھی آگئی اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ویٹنگ کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

اور جب نرائن ولبھ کمرے سے باہر چلا گیا تو کنور صاحب نے وانچو کو بلوا لیا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی سرحد پر کھٹمنڈو چلا جائے۔ سرحد کو پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ اس لئے کہ رانا دلیر جنگ جو ریاست کے ایک اہم رکن تھے وہ کنور صاحب

کی شکارگاہوں میں اکثر شکار کھیل چکے تھے۔ اور دونوں کے آپس میں اچھے مراسم تھے۔ اور جب تک وہ کھٹمنڈو میں رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ مینجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔ پھر ایک روز فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کلکتہ جا رہا ہے۔ اور وانچو کار میں خاموش بیٹھا ہوا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں۔ اور وہ فیکٹری اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بڑی پُر اسرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری ڈیم کے تباہ ہو جانے سے کوکیلا ندی میں بڑا بھیانک طوفان آگیا ہے۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے میدانی علاقوں میں شب خون مارنے والے غنیم کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔ گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں پانی کے بہاؤ میں بہہ گئی ہیں۔ ساری بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں اور تباہ حال کسان اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اور رامپل روڈ پر مرلی افسانوں کے قافلے گزرا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سیلاب زدگان کے لئے امیر گڑھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں گورنمنٹ کا جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کمیونسٹوں کی دہشت پسندی کو دخل ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر سے کمرے میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آہنی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا ہے۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے۔ جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا۔

انتظار حسین

اجودھیا

وہ آج بھی چلتے چلاتے ریوڑی کی ریوڑیاں خرید لایا تھا۔ کتے کی دم اور انسان کی عادت یہ دو چیزیں تو ایسی ہیں جیسی ہو گئیں ہو گئیں۔ بدلتی بدلاتی نہیں ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ لیکن اسے تو اتنے پیسے پھونکنے کے بعد بھی عقل نہ آئی تھی۔ کسی خوانچہ والے کے پاس اجلی ریوڑیاں نظر آئیں اور وہ پھسلا۔ لیکن جب خرید کر وہ ایک ریوڑی منہ میں ڈالتا تھا تو اس کی صورت اس خان کی سی بن جاتی تھی جس نے صابن کے چکر میں صابن خرید لیا تھا لیکن گر ایمان کی پوچھو تو اس بے چارے کی بھی کیا غلطی تھی۔ وہ نہ تو شراب پیتا تھا نہ سگریٹ۔ وہ تو ریوڑیوں سے ہی اک گونہ بے خودی پیدا کرنے کا عادی تھا۔ کفر جس چیز میں بھی ہو وہ پھر ایسی منہ کو لگتی ہے کہ چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اب یہ دیکھو کہ اسے گھر چھوڑے ہوئے ایک ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا ہوگا لیکن وہی روز کی ایک شام والی بات تھی۔ وہ جب انارکلی بازار سے گزرتا تھا تو اوہاکر چار چھ پیسے کی ریوڑیاں خرید ڈالتا تھا اور ہر مرتبہ انہیں منہ میں ڈالتے پر اس پر وہی ایک قسم کی کیفیت گزرتی تھی۔ آج وہ خوانچہ میں بچھے ہوئے رنگین پتنگیا کاغذوں پر لٹو ہو گیا تھا۔ ان کی ترک مڑک کو دیکھ کر اسے یہ امید بندھ گئی کہ ریوڑیاں کچھ اچھی ہوں گی لیکن جب اس نے ایک ریوڑی منہ میں ڈالی تو حسب معمول وہی تباکو میں بسا ہوا سا گڑ منہ میں گھل گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ شاید اگر خوانچہ والا اس وقت سامنے ہوتا تو وہ انہیں اس کے منہ پر دے مارتا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اس وقت تو وہ لمحات میں لپٹا لپٹایا ہوا تھا اور پھر کسی تو کسی بہانے نہ جانا بھی ضروری تھا۔ یوں بھی وہ صابن خریدنے والے خان کے اصول کا قائل تھا بلکہ شاید اس سے چار قدم آگے ہی تھا کیونکہ پٹھان نے تو ایک دفعہ ہی اپنا پیسہ کھایا تھا لیکن وہ بار بار ریوڑی خریدتا تھا اور پیسہ کھاتا تھا۔ اس نے ہاتھ روکا تو نہیں۔ ہاں یہ سوچ کر اس کا خون ضرور کھولتا رہا کہ یہاں والوں کو ریوڑیاں بنانی بھی نہیں آتیں۔ اس نے سوچا یار یہ تو کچھ نہ ہوا۔ رمیش سے ریوڑیوں کی فرمائش کرنی چاہئے۔ اس میں شرم کی بات بھی نہیں ہے۔ تحفے تحائف کا سلسلہ چلتا ہی ہے۔ آموں کی تو مثال ہے لو۔ لوگ منہ سے کہہ کہہ کر آموں کی فصل میں آموں کے تحفے قریب و دور سے منگاتے ہیں۔ چچا غالب کی بھی یہی عادت تھی۔ دنیا بھر سے فرمائش کرتے تھے۔ برسات میں جس کو خط لکھا آموں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور خود ریوڑیوں کے سلسلے میں یہی چکر چلتا ہے۔ رامچندی ریوڑی والے کے زیادہ

گاہک تو تحفہ تحائف بھیجنے والے ہی ہوتے تھے ۔ تو اگر رمیش بھی اسے تھوڑی سی ریوڑیاں تحفتاً بھیج دے گا تو ایسا غضب تو نہ ہو جائے گا ۔ لیکن پھر اس کی قومی غیرت نے یکایک جوش مارا ۔ نہیں جی کوئی مار دو ۔ رمیش سمجھے گا کہ سالا بڑا گیا تھا پاکستان ۔ روٹی کپڑا الگ رہا ، ریوڑی کے دانے تک کو محتاج ہو گیا ۔ ابھی دیکھا کیا ہے ۔ ابھی تو معلوم پڑے گی ۔ بیٹا کی طبیعت ہری ہو جائے گی اور اس خیال نے اسے جواز پیدا کرنے کی کوشش پر مائل کر دیا ——— آخر ریوڑی بنانا ایسے کون سے کمال کی بات ہے ۔ یوں کہہ کر یار لوگوں نے ہاتھ پیر ڈال رکھے تھے اور ہندو سکھ حلوائیوں سے ساری چیزیں خریدتے تھے ۔ کیا اگر وہاں پر دھر لیں تو اچھی ریوڑیاں نہیں بنا سکتے ۔ اور پھر یہاں بھی اور سب جگہ کون سی کمال کی ریوڑیاں بنتی تھیں ۔ بس ایک میرٹھ ہی تو تھا ۔ وہ لکھنؤ اور علی گڑھ کا نام تو وہاں والوں نے خواہ مخواہ چمک مارا ہے ۔ لکھنؤ تو ہر بات میں نفاست کی ٹانگ توڑتا ہے اور اسی میں مارا جاتا ہے ۔ ہر چیز اپنی معراج پر اچھی ہوتی ہے ۔ جسے حسن کہتے ہیں وہ نام ہی تناسب کا ہے اور یہ علی گڑھ کے حلوائی تو خواہ مخواہ منہ چڑاتے تھے ۔ ریوڑیاں تھوڑا ہی بناتے تھے مکھیاں مارتے تھے ، مختصر یہ کہ ریوڑیاں اگر کہیں بنتی تھیں تو وہ میرٹھ میں بنتی تھیں ۔ باقی سب جھوٹا جھگڑا تھا ۔

رمچندی ریوڑی والے کی دکان ——— اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرنے لگی ——— جاڑوں میں کیسی رونق رہتی تھی اس پر ۔ شیشے کے صاف شفاف مرتبانوں میں ریوڑیاں اور مختلف قسم کی گزک رکھی رہتی تھی ۔ پیتل کی دھلی منجھی تھالوں میں حلوا سوہن اور تل بھگا رکھا رہتا تھا ۔ کبھی کبھی تو اس دکان پر اتنی بھیڑ ہوتی کہ کھڑے کھڑے پاؤں دکھ جاتے اور باری نہیں آتی تھی ۔ حق یہ ہے کہ بی ۔ اے کا امتحان تو اس نے رمچندی کی ریوڑیوں کے بل پر ہی دیا تھا ورنہ ایک ڈیڑھ بجے رات تک کتابوں سے مغز پچی کرنا کس کے بس کا تھا ۔ ایک دفعہ تو وہ کوئی بارہ بجے رات کو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی دکان پر جا پہنچا ۔ اس کی دکان پر بالکل دن پھیل رہا تھا اور وہ ڈھائی من کی لاش رمچندی گاہکوں کے بھیڑ بھڑکے کو نبٹا کر اب ذرا اطمینان کا سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ اس کا بس چلتا تو وہ رمچندی کی دکان کی ساری ریوڑیاں باندھ لاتا اور پاکستان کی ہر ریوڑی کی دکان کو رمچندی ریوڑی والے کی دکان بنا دیتا ۔ لیکن اسے بھلا کون ایسا کرنے دیتا اور پھر اس وقت اتنی فرصت اسے تھی ہی کہاں ۔ ورنہ چلتے ہوئے کیا جیسے اس نے گیارہ آنے کے سنترے اور سات آنے کے کیلے خریدے تھے ، بارہ چودہ آنے کی وہ ریوڑیاں نہ خرید سکتا تھا ۔ شاید اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان سے پاکستان آنے کے معنے کیا ہوتے ہیں اس نے معنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی ۔ وہ تو بس دھرا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے ایک بستر اور صندوق کے ساتھ اسٹیشن پر دھرا تھا ۔ اسٹیشن ——— اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ پھر گیا ۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپنے میں مذہبی کتابوں میں واقعۂ محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا ۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں عام طور پر سناٹا سا چھایا رہتا تھا ۔ بعد کنٹونمنٹ اسٹیشن کا کون رخ کرتا تھا ۔ کوئی مارا پڑا مسافر پہنچ گیا تو پہنچ گیا ۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اڑتی لیکن اس روز وہاں آدمی پٹا پڑا تھا ۔ ایسے ایسے وضعدار آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے جن کا مستورات کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے گیا ہی نہیں جا سکتا تھا ۔ وہ آج اپنی ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رسہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں یکایک ایک دن اپنی داڑھی منڈا ڈالے ۔ ہر طرف سامان کے اٹنگ سٹنگ لگے ہوئے تھے اور اسٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پر کیفیت یہ تھی کہ آدمی پر آدمی گرا تھا ایک دفعہ تو کوتوال کو بھی غصہ آ ہی گیا اور اس نے ٹکٹ گھر پر کھڑے ہو کر ہنٹر برسا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کھدر پوش داڑھی والے صاحب نے مجمع لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے "مسلمانوں کا یہ براحشر مسلم لیگ نے کرایا ۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں یہ لوگ جنت سمجھ کر جا رہے ہیں وہ جہنم ہے" ——— "اور جسے جہنم سمجھ کر چھوڑ رہے ہیں وہ جنت ہے" کسی صاحب نے پیچھے سے فقرہ کسا اور توفیق نے اسے یکایک پیچھے سے آ کر جھنجھوڑا تھا کہ "ابے مسخرے باتیں بنا رہا ہے ذرا سامان پر تو نظر" اور وہ ہڑبڑا کر ——— مگر خیالات کی زنجیر الجھ کر ٹوٹ گئی اور اسے یاد آیا کہ وہ ریوڑیاں کھانا تو بھول ہی گیا ہے ۔

اس نے جیب میں سے چھ سات ریوڑیاں ایک ساتھ نکال لیں اور چبانے لگا ۔ ریوڑی کا گڑ بار بار دانتوں کے درمیان چپک کر رہ جاتا ۔ وہ سوچنے لگا

عجب چم چچیر قسم کی ریوڑیاں ہیں۔ یہ سالے ریگل کے سامنے والے خوانچہ والے تو آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ انار کلی میں کم از کم اس سے بہتر ریوڑیاں ہوتی ہیں ——— یہ انار کلی بھی خوب بازار ہے ——— بچھڑے ہوؤں کے ملنے کی جگہ ——— ایک زمانہ میں تو اچھا خاصا مہاجروں کے ملنے کا اڈا بن گئی تھی۔ رشید صاحب اسے ایک روز یہیں تو ملے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے تھے "ارے بھئی کب آئے۔ میں کہتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا کہ چلے آئے۔ ابھی یہاں کچھ نہ سہی مگر میں کہتا ہوں صاحب کہ ایمان تو محفوظ رہے گا ———" اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا۔ شاید رشید صاحب طنز کر رہے تھے لیکن اس نے تو ان کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ان کے تیوروں سے تو بڑا خلوص ٹپک رہا تھا۔ تاہم اگر یہ طنز نہیں تھا تو کیا تھا؟ وہ تو اپنا ایمان بچا لایا مگر ——— اچانک ایک کتابی قنوطیت کی رو آئی اور اسے بہا کر ایک ادبی طرف لے گئی ——— یہ ایمان کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں محض ایک واہمہ ہے۔ بے ایمانی بھی تو ایک طرح سے ایمان ہی ہوتی ہے۔ نہ ٹوٹنے والا کفر سب سے زیادہ پختہ ایمان ہوتا ہے اور پھر ایمان کو ہجرت سے کیا واسطہ؟ یہ ہجرت کا لفظ اس کے حلق سے اتر نہ سکا پھر وہ کون ہے ——— مہاجر، مفرور، بھگوڑا، پناہ گزین؟ اسے بلکا پھلکا سیدھا سچا لفظ بھگوڑا بہت پسند آیا ویسے بھی وہ ٹھیٹھ اردو لفظ تھا لیکن ان مترادفات میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا ذہن ایک اور لفظ کی طرف جا لپکا ——— بن باس، اس لفظ میں اسے بڑی مٹھاس معلوم ہوئی تو وہ بن باسی ہے۔ اپنے وقت کا راجہ رامچندر ——— وہ پھر اپنے فعل کو آدرشی جامہ پہنا رہا تھا! یہ خیال آیا کہ جرمن اپنے وطن کو باپ تصور کرتے ہیں لیکن اس نے ان کی تقلید کرنا مناسب نہ سمجھی۔ ماں بھی تو آخر بن باس دے سکتی ہے۔ راجہ دسرتھ نے سوتیلی ماں کے کہنے سے راجہ رام چندر جی کو بن باس دے دیا۔ اس کی ماں نے اسے اس کے سوتیلے بھائی کے بہکانے میں آ کر بن باس دے دیا۔ یہ بھائی کا رشتہ بھی خوب ہے۔ اس نے ہمیشہ فساد پیدا کیا۔ اسے برادران یوسف کا قصہ یاد آیا اور پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ سارا فساد ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ بھائی نے بھائی کا ہمیشہ یہی حشر کیا ہابیل قابیل کے وقت سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن رام چندر جی کے بھی تو بھائی تھے ——— اور یہاں آ کر اس کا ذہن دوسرے رستہ پر پڑ گیا۔ رام لیلا کے بہت سے مناظر اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اجودھیا رام چندر جی کے جانے کے بعد کیسا ویران ہو گیا تھا۔ ساری رونق تو راجہ رام چندر کے دم سے تھی۔ راجہ دسرتھ خود انہی کو دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ رامچندر جی بن کو سدھارے۔ راجہ دسرتھ دنیا سے چل بسے۔ وہ تو من کا سانپ تھے من پہ ناند ڈھک دو سانپ اندھا ہو جائے گا اور ناند سے ٹکریں مار مار کے مر جائے گا۔ دسرتھ جی اکیلے ڈھنڈار میں ٹکریں مار مار کے مر گئے۔ اس کے اجودھیا میں بھی اب خاک اڑتی ہو گی اور من کا سانپ ناند سے ٹکرا ٹکرا کے دم توڑ چکا ہو گا۔ من بھی کیا چیز ہوتا ہے جب رات کو من کا سانپ نکلتا ہے تو سارے جنگل میں اجالا ہو جاتا ہے۔ من اگر کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو اس کے تو بس وارے کے نیارے ہیں۔ وہ سالا نتھی سنار گپ ہانکا کرتا تھا کہ اسے من مل گیا تھا لیکن ایک چوٹا سے چوٹ دے گیا۔ وہ بھی سب کی اڑاتا تھا ویسے ایک بات ہے۔ آدمی خوب تھا۔ اس کی دکان پہ ہر وقت چوکڑی جمی رہتی تھی اور وہ آلہا اودل کا بھی موقعہ رکھتا تھا۔ دوپہر ہوئی اور وہ جھلنگا چارپائی دوکان کے نیچے نالی کے قریب بچھ گئی۔ گھنٹوں گذر جاتے تھے اور آلہا اودل گھٹتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں اک گدگدی سی اٹھی کہ وہ آلہا اودل کے شعر گنگنائے۔ وہ شعر یاد کرنے لگا لیکن اس کے حافظہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کسی مصرعہ کا کوئی ٹکڑا یاد آتا تھا اور اٹک کے رہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ایک مصرع یاد آیا ؎

آلہا اودل بڑے لڑیا!

اس نے بہت زور مارا لیکن دوسرا مصرع اسے یاد ہی نہیں آیا۔ اسے پسینہ آ گیا۔ وہ یادوں کے سہارے جینا چاہتا تھا اور یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں، ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جا رہی ہے اور اب تھوڑی دیر میں وہ خلا میں گر پڑے گا۔ وہ

بہت دیر تک چپکا پڑا رہا۔ اس چپکے پن میں ایک مبہم خوف کی بھی جھلک تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن پھر اپنے کام سے لگ گیا۔ اسے خیال آیا کہ آم ادل کے پڑنے جانے کا زمانہ برسات کا ہوا کرتا تھا اور برسات کے خیال کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں ایک سُریلی آواز گونجنے لگی ——— باغ میں پپیہا بولا 'میں جانوں میرا پیا بولا'۔ پپیہا کو وہ ہمیشہ پپیا کہتی تھی اور خود بھی وہ کچھ پپیا سی ہی تھی جب دیکھو پٹ پٹ کرتی رہتی تھی۔ اس روز جب وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ پپیا بجانے میں مصروف تھی تو اس نے پیچھے سے آکے چپت جما دی تھی "کیوں ری تو نے میرا پپیا کیوں توڑا ہے؟" ...... وہ آم کی گٹھلیاں کتنی محنت اور خلوص سے جمع کرتا تھا۔ ان پر راکھ ڈالتا تھا۔ انہیں روز پانی دیتا تھا۔ پھر ان میں سُرخ زرد کلّے پھوٹتے تھے۔ پھر ہلکے عنابی پتوں کی ایک شاداب چھتری سی بن جاتی تھی۔ کس کی مجال تھی کہ اس کے پپیوں کو ہاتھ لگا جائے لیکن وہ خسیس بھی نہیں تھا۔ ترنگ میں جب وہ آجاتا تھا تو ایک چھوڑ کئی کئی پپیے وہ لڑکوں کو بخش ڈالتا تھا۔ جب بادل گھر گھر کر آرہے ہوتے تھے اور ننھی ننھی بوندیاں پڑنے لگتی تھیں تو پپیے کی پیں پیں کیسی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ برسات بھی خوب موسم ہوتا ہے۔ چیزوں کا رنگ روپ ہی بدل جاتا ہے۔ پھر روز سر پر ایک تیوہار کھڑا رہتا ہے۔ آج چھڑیوں کا میلہ ہے کل رکھشا بندھن ہے۔ پرسوں جنم اشٹمی ہے اور ہر تیوہار پر بارش ہونی ضروری۔ جنم اشٹمی پر اگر مینہ نہ برسا کرتا تو کنھیا جی کے پوتڑے کیسے دھلا کرتے۔ اور رکھشا بندھن پر مینہ پڑے اور پھر پڑے۔ خواہ ایک بوند ہی پڑے۔ رکھشا بندھن کے ساتھ ساتھ اسے پھر رمیش کا خیال آگیا۔ رکھشا بندھن پر وہ رمیش کو ضرور ڈیڑھ دو روپے سے کٹوا دیا کرتا تھا۔ رمیش ذات کا برہمن سہی لیکن دل کا بنیا تھا۔ اس لئے بات اٹھنّی سے شروع کرتا تھا لیکن جب وہ ایک دفعہ حلوائی کی دکان پر آجاتا تھا تو پھر وہ رمیش کو ایسے اڑنگے پہ لاکے مارتا تھا کہ ڈیڑھ دو روپے پہ بھی مشکل سے ہی چھوٹتا تھا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچتا تھا تو بملا اس کی کلائی میں راکھی باندھ دیا کرتی تھی۔ ویسے راکھی ہوتی ہی کیا ہے۔ چند ریشمی دھاگے اور سنہری پنیاں۔ لیکن جب وہ کلائی پر بندھ جاتی ہے تو پھر دیکھو آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ اس نے اس رکھشا بندھن والے دن کا تصور کیا۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا رمیش کے گھر پہنچا تھا۔ بملا نے اس کے راکھی باندھی تھی۔ پھر وہ اور رمیش شام تک سجے ہوئے بازاروں اور گلیوں کے چکر کاٹتے رہے اور مختلف دکانوں پر رک رک کے مٹھائی بھی اڑائی تھی لیکن وہ اس دن کا کوئی چمکتا ہوا تصور قائم نہ کر سکا۔ اسے وہ دن خواب آلود دھندلکوں میں لپٹا ہوا سا دکھائی دیا۔
اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ کوئی شیریں خواب ہے جسے وہ ہزار کوشش کے باوجود بھولا چلا جا رہا ہے یا پچھلے جنم کے کسی واقعہ کا ایک خیال ہے جس کی خوشبو اڑتی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سہارا لے دے کے چند ایک یادیں رہ گئی تھیں اور یہ یادیں چپ چاپ ایک ایک کرکے کھسکتی جا رہی تھیں۔ شاید اسے واضح طور پر یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیوں کا مزا کیسا ہوتا ہے۔ بس ایک خیال سا تھا۔ اس خیال کے بل پر وہ اظہارِ خیال کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ خود اس کے قصبے کے حلوائی تو علی گڑھ اسکول کے حلقۂ اثر میں تھے۔ وہی علی گڑھ کی طرز کی چھوٹی چھوٹی گول گول بھربھری ریوڑیاں بناتے تھے۔ لیکن وہ خود میرٹھ کی ریوڑیوں کا رسیا تھا اور اس اسکول کے سب سے بڑے نمائندے رمچندی کی ریوڑیوں پر جان دیتا تھا۔ ان ریوڑیوں سے رمیش کی نہ معلوم کتنی یادیں وابستہ تھیں ——— وہ، رمیش، ریوڑیاں ——
لیکن اب یہ تثلیث بکھر گئی تھی۔ اس سے رمیش اور ریوڑیاں دونوں چھوٹ گئے تھے۔ رمیش کے پاس ریوڑیاں رہ گئی تھیں اور وہ الگ ہو گیا تھا۔ اب وہ ریوڑیاں نہیں کھاتا اپنا بھیجہ کھاتا ہے۔ رمیش اب ریوڑیاں کھاتا نہیں ہوگا، زہر مار کرتا ہوگا۔ رمیش کے ساتھ مل کر وہ بھی کیسی عجیب عجیب حرکتیں کر ڈالتا تھا۔ ویسے تو ہمیشہ اس کی رونی صورت بنی رہتی تھی۔ لیکن جب رمیش ایک دو دن کی چھٹی لے کر دلی سے آجاتا تھا تو وہ بالکل کینچلی بدل تا تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ اس روز ریوڑیاں کھاتا ہوا محلے میں سے گذر رہا تھا۔ ایک لڑکی کھڑکی میں کھڑی انہیں یونہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ریوڑی

اسے دکھ کر گپ سے منہ میں ڈال لی تھی ——— اس کے سٹ پٹا کر بھاگ جانے کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی اور وہ بے ساختہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑا۔ پھر یہ ہنسی رفتہ رفتہ ایک اداسی کی کیفیت میں بدل گئی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی ——— وہ سوچنے لگا ——— اب وہ دن کاہے کو لوٹ کر آئیں گے۔ یہ زمانہ بھی عجیب بے ہنگم قسم کی چیز ہے۔ اس کا سر پیر تو ہے ہی نہیں۔ اسے تو بس بے پیندی کا لوٹا سمجھو۔ کسی طرف کو بھی لڑھک جاتا ہے اور ساتھ میں ساری چیزوں کو بھی لڑھکائے جاتا ہے۔ گزری ہوئی باتیں خواب دھجیاں بن کر رہ جاتی ہیں۔

رمیش کی باتیں سوچتے سوچتے اسے محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی بادشاہ کی بھولی بسری کہانی ہے جو اس نے بچپن میں نانی اماں سے سنی تھی اور جسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ کے دو شہزادے تھے۔ ایک دفعہ وہ شکار کو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا جا رہا ہے۔ بڑے شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ دوسرا شہزادہ بھی پیچھے چلا لیکن وہ کسی اور راستہ پر نکل گیا۔ وہ دونوں راستہ بھول گئے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے .... یہاں آ کر اس کے حافظہ نے دم دے دیا۔ اسے اتنا تو یاد تھا کہ بہت سی مصیبتوں کے بعد وہ بالآخر آپس میں مل جاتے ہیں اور اندھے راجہ کی آنکھوں میں نور آ جاتا ہے لیکن کب ملے، کیسے ملے یہ اسے بالکل یاد نہیں آیا۔ اسے کہانی کا آغاز یاد تھا انجام وہ بھول گیا تھا۔ انجام یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے ——— وہ سوچنے لگا ——— آج کل کہانیوں کا انجام بھی نرالا ہوتا ہے۔ اب شہزادے بچھڑ جاتے ہیں ملتے نہیں ہیں۔ پہلے بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جایا کرتے تھے اور پھر ان کے کھوئے ہوئے لال مل جایا کرتے تھے اور ان کی آنکھوں میں نور آ جایا کرتا تھا۔ اب شہزادے گھر سے نکل جاتے ہیں اور بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں اور شہزادے نہیں پلٹتے اور محل کھنڈر بن جاتے ہیں اور کھنڈروں میں جن بھوت رہنے لگتے ہیں ——— اور پھر رام چندر جی کی کہانی یاد آ گئی۔ اس کا ذہن عجیب اینڈی بینڈی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے لگا۔ اسے ایسے لگا گویا اجودھیا پھر ویران ہو گیا ہے۔ رام چندر جی بن کو نکل گئے ہیں اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں اور سارے اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے۔ لیکن ——— اس کے خیال نے پٹڑی بدلی ——— اجودھیا کے دن چودہ برس بعد پھرے تھے اور اب .... اس کا تصور دھندلا گیا۔ گویا ایک لاری تیزی سے اس کے پاس سے گزر گئی اور وہ گرد میں اس بُری طرح اَٹ گیا کہ سوائے ایک سنیاپے پن کے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کا ہاتھ پھر بوتل کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن جنبش نہ کر سکا۔ اس کا ہاتھ ایک جگہ رکھے رکھے سو گیا تھا۔ اس نے ایک تھوڑی سی کوشش سے اسے جنبش دی اور ایک میٹھی میٹھی گدگدی پیدا کر دینے والی سرسراہٹ اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے اکڑایا اور پھر کروٹ لیتے ہوئے ایک لمبی سی جمائی لی۔ اس کی زندگی میں ——— اس نے سوچا ——— اب رہ ہی کیا گیا ہے ——— یادیں اور جمائیاں۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں اور جمائیاں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے دل میں وہ جو ایک بوند لہو کی نظر آتی تھی وہ سکڑ رہی تھی، معدوم ہو رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کا مستقبل ایک طویل بے کیف جمائی ہے۔ اس احساس سے سہم کر اس نے پھر ایک بار اپنے حافظہ کو جھنجھوڑا۔ کئی تصویریں ایک ساتھ ابھریں اور آپس میں متصادم ہو کر گڈمڈ ہو گئیں۔ اس نے کسی شام کا تصور کرنا چاہا جو اس نے رمیش کے ساتھ گزاری ہو۔ لیکن یہ شامیں، یہ راتیں بہت کثیر تعداد میں اور پھر پتنگ کے مانجھے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تو بے طرح الجھا ہوا تھا اور تو اور خود رمیش کے چہرے کے خطوط اب اس کے تصور میں ایسے بہت واضح نہیں رہے تھے۔ اسے یہ وسوسہ ستانے لگا کہ رمیش اب اس سے چپ چاپ دور ہوتا چلا جا رہا ہے پہلے وہ کتنی جلدی جلدی خط بھیجتا تھا اور بعض دفعہ تو وہ خطوں کی ریل گاڑی چھوڑ دیتا

تھا۔ لیکن اب تو اس کے پاس کوئی ڈیڑھ دو مہینہ سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ شروع میں وہ اپنے خطوں میں اس پر کس بری طرح برسا تھا لیکن اب تو اس کا لہجہ بہت دھیما پڑ گیا تھا۔ یہ دھیما پن کسی کمزوری کی علامت تو نہیں ہے ——— اس کے دل میں ایک سوال اندھیرے سے ابھرا اور مبہم سی کپکپی پیدا کر کے ڈوب گیا۔ اسے رمیش کا وہ پاکستان آنے پر پہلا خط یاد آ گیا جس میں اس نے اسے بڑی جلی کٹی سنائی تھیں۔ اسے بھی خاصا جوش آ گیا تھا اور تیر کا جواب تلوار سے دینے کی نیت سے اس نے قلم اٹھا کر بے لکان لکھنا شروع کر دیا تھا۔

"تم پوچھتے ہو کہ یہ تیرا دامن سیاست میں کیسے سن گیا۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ کسی شہر میں زوروں کا طاعون پھیل جائے اور کوئی شخص طاعون کے کسی مریض کے پاس پہنچے اور کہے کہ میاں تم تو اپنی تندرستی کی بڑی بڑائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ تمہارے گلٹی کیسے نکل آئی۔ رہا تمہارا یو۔پی چھوڑ دینے کا طعنہ تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ یو۔پی کہاں ہے، کدھر ہے؟ اسے تو میں مٹی دے کر آیا ہوں ...." اور یہاں آ کے اس کا قلم رک گیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کے طعن آمیز فقرے وہ اور نہیں لکھ سکتا تھا۔ مانگے تانگے کر وہ ایک وقت کی ہنڈیا کا تو انتظام کر ہی سکتا تھا۔ لیکن وہ کسی بات پہ جم کب سکتا تھا وہ تو نرا تھالی کا بینگن تھا۔ لیکن وہ جو انہیں کرتے ہیں تو بہت مرد تھا ——— آدمی ہے ہی تھالی کا بینگن۔ ہو گی زمین گول۔ ویسے وہ دکھائی تو تھالی کی طرح چپٹی ہی پڑتی ہے۔ کوئی ایک بات پکڑ لینا اور اسے عقیدہ بنا لینا تو ذہنی جمود کی نشانی ہے۔ یہ تو گویا زمین کی گردش سے کشتم کشتا کرنا ہے لیکن ——— ایک مخالف لہر ابھری ——— یہ بات بھی تو ایک عقیدہ ہی ہوئی۔ اس کا ذہن مناظرے کا میدان بنتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ رسہ تڑا کر بھاگ نکلا۔ اس نے ہٹ دھرمی کے انداز میں سوچا کہ مارو گولی۔ جو لوگ لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے قسم کی چیز بننا چاہتے ہیں شوق سے بنیں۔ محمد چھوڑ قطب مینار بنیں اس کی بلا سے۔ وہ تو تھالی کا بینگن ہے۔ عقیدہ والوں کو عقیدہ کی دم مبارک۔ وہ تو لنڈورا ہی بھلا ہے اور اس بحث سے چھٹکارا پا کے اس نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ آخر بات کہاں سے چلی تھی اور یہ تھالی کا بینگن بیچ میں کیسے لڑھک آیا۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ بات کچھ رمیش کے متعلق تھی۔ لیکن رمیش کا تھالی کے بینگن سے کیا واسطہ۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ کوئی تک بھی ہے۔ رمیش، تھالی کا بینگن ——— آخر کیا ربط ہے ان دونوں باتوں میں.... اسے یکایک خیال آیا کہ وہ جو خود تھالی کا بینگن ہے اس لئے رمیش کا تھالی کے بینگن سے تعلق ہوا ——— اور اب اسے یاد آیا کہ وہ درحقیقت اسی تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رمیش سے اس کا کیا تعلق رہ گیا ہے۔ رمیش اب مہینوں خط کے پڑھنے سے بھی یاد نہیں کرتا، اور خود اسے اب رمیش کی صورت بھی شاید اچھی طرح یاد نہیں رہی ہے۔ غلط ——— اس نے نعرہ لگایا ——— اور کوئی ہوتا تو ——— خیر مان بھی لیا جاتا لیکن رمیش کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ آخر کون سی بات ہے جو اسے یاد نہیں ہے اور اپنی بات کی پچ میں وہ ایک دفعہ پھر اپنے حافظہ سے کشتم کشتا کرنے لگا۔ دھند میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے آئیں اور گم ہو گئیں۔ اس کی کیفیت تو کچھ ایسی ہو رہی تھی گویا کوئی بل میں ادھر گھسے سانپ کی دم پکڑ لے اور وہ دم پھسل کر سٹاک سے غائب ہو جائے۔ اس پر پھر افسردگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

آخر یادوں کا کیا اعتبار، وقت پڑنے پر تو ایسی سٹکتی ہیں کہ دور دور تک ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ یادیں تو چار دن کی چاندنی ہوتی ہیں پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا پھر اپنی روح کی اس بھائیں بھائیں کرتی ہوئی اندھیری رات سے پالا پڑتا ہے۔ رام چندر جی بن کو سدھارتے ہیں اور ایودھیا میں اندھیر ہو جاتا ہے۔ آدمی کی روح تو اجودھیا ہوتی ہے۔ اس کی رونق تو دوسرے کے ہاتھ ہے اور یہ دوسرے وفا نہیں کرتے ——— اجودھیا کی تقریب سے اسے رام لیلا کے دن یاد آ گئے۔ اس کا ذہن اس دسہرے کی طرف منتقل ہو گیا جو اس نے آخری بار رمیش کے ساتھ گذارا تھا۔ وہ دسہرہ بھی ——— اس کے ذہن میں پوری تصویر ابھر آئی تھی ——— عجب رنگ کا آیا تھا اس کا طور ہی بے طور تھا۔ ساری فضا میں ایک وحشت ایک ڈراؤنے پن کی

کیفیت بسی ہوئی تھی ویسے آدمی اس مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ بازار سے لے کر میلہ تک تانگوں، بگھیوں اور چھکڑوں کی لمبی ڈوری لگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی کھمبوں کے اس اونچے دروازے میں گھستے ہوئے اس نے شدت سے محسوس کر لیا تھا کہ یہ وہ پچھلے سال والا میلہ نہیں ہے اس میں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ میلہ کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورے میلے میں وہ اکیلا اس کھوئی ہوئی چیز کی نمائندگی کر رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے رمیش یکایک چونک پڑا تھا۔ "بے کشن کہاں گیا؟" اور پھر وہ لمبے شامیانہ کے نیچے کھڑاک کے ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا نہ معلوم کدھر نکل گیا تھا۔ وہ وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ دور کھمبیل کے تین دیوقامت ڈھانچے کھڑے تھے۔ گردن تک کالے سیاہ کانوں میں بڑے بڑے پتے، منہ سے ہیبت والے۔ کالی لمبی لمبی مونچھیں، ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال۔ یہ وہی رسمی قسم کے ڈھانچے تھے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا اور جنہیں دیکھ کر اس کا تخیل ماضی کی پُراسرار خواب میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھٹک نکلتا تھا لیکن آج خوف کی ایک سہمی سہمی سی لہر اس کے دل میں سرسرا رہی تھی بھیڑ اتنی تھی کہ کئی چکر کاٹنے کے باوجود انہیں وہ زرد پوش زرد رو زندہ شبیہیں نظر نہ آئیں جو ان بھیانک ڈھانچوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو اپنی حدوں سے آگے نہیں بڑھنے دیتیں اور یہاں کھڑے کھڑے جب اسے کشن کے کھو جانے کا خیال آیا تو وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ بھیڑ اسے بھی نگل جائے تو...... اور اتنے میں رمیش آ گیا تھا۔ چل بھئی کشن تو ملا نہیں ——— وہ خاموش سر نیوڑھائے گھر پہنچے تھے لیکن گھر پہ کشن موجود تھا اور اپنے تاؤ کی گود میں بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ "تاؤ رے راجہ نے شمبھا لے کی سنکھوں سے رومال چھپایا تا تو اس میں کیا تھا جو راجہ کو چھینے لگا۔" اور اب وہ خود سوچ رہا تھا کہ اس رومال میں کیا تھا۔ یہ سوال اس کے خیالات کی زنجیر میں کچھ اس انوکھے ترچھے طریقہ سے اٹکا کہ وہ زنجیر ہی ٹوٹ گئی وہ سوچتے سوچتے اب تقریباً با ــ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے پھر سو گیا تھا اور جب اس نے ہاتھ کو جنبش دی تو پھر وہی ننھی سی لہریں اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگیں۔ اس کا دماغ خالی ہو گیا تھا۔ شاید سوچنے کے لئے فی الحال اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ایک خیال دھند کی پرچھائیں کی طرح اب بھی اس کے ذہن پر منڈلائے جا رہا تھا۔ گویا رام چندر جی بن کو چلے گئے ہیں، اجودھیا میں اندھیرا چھا رہا ہے اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں۔

پرکاش پنڈت

سمجھوتہ

وہ چھت سے نیچے اتر آئی اور چوبارے میں بچھے ہوئے پلنگ پر آلیٹی لیکن خیالات کا وہ لامتناہی طوفان بدستور اس کے ذہن میں مدوجزر بنا رہا۔ رفتہ رفتہ وہی مہمل سے خیالات نئے سرے سے اس کے ذہن میں اجاگر ہونے لگے کہ جن کی وجہ سے وہ تمام رات ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکی تھی۔ رت جگے کے سبب اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور چہرے پر خاص قسم کی تھکن کے آثار ابھر آئے تھے۔

وہ اس قسم کی ذہنی الجھنوں اور بے قراریوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک مدت ہی سے تو اس کا دل اس قسم کے سوچ بچار میں ہنپ رہا تھا۔ وہ بے ہنگم غیر واضح سے خیالات تو جیسے اس کی زندگی کا ایک اہم ترین جزو بن کر رہ گئے تھے لیکن آج نہ جانے کیوں اسے کچھ یہ محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی میں پہلی بار اس کے احساسات درد کی ٹیسوں میں الجھ رہے ہوں اور جیسے پہلی ہی مرتبہ اس کا دل اس قسم کے دکھوں کی وحشت سے آشنا ہو رہا ہو۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے دودھیا ہو آئے تھے اور پلکوں سے کچھ ایسے ہی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہوا سیاہ و سپید لاوے کی قسم کا مادہ ان کے کونوں پر ہلکے خاکستری رنگ میں جم چکا تھا۔ ہونٹوں پر گل کی مستی کے چمکیلے رنگ نے بھی ادھر ادھر سے سمٹ کر پپڑیوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور جگہ بہ جگہ ان پپڑیوں کے اکھڑ جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہایت شدت سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی تھی۔

اس کی عمر یہی پندرہ برس کی تھی شہروں کی تنگ اور غلیظ گلیوں میں بسنے والی عام لڑکیوں کی طرح دُبلی پتلی اور زرد رو لیکن کھٹی میٹھی چیزیں، چٹنی، اچار وغیرہ کی دلدادہ ہونے سے جو شئے شاید اس میں دو برس بعد پیدا ہوتی اس نے قبل از وقت ہی اپنا رنگ نکھار دیا تھا۔ اس عمر میں جو بھولپن کسی بھی کنواری کے چہرے سے جھلک سکتا ہے وہ گویا کسی نے بُری طرح سے کھرچ لیا تھا۔ اس کی ہنسی میں عجب قسم کی درشتی اور تلخی گھلی رہتی جیسے ہنسنے پر اس کی روح کھلکھلانے کے بجائے مرجھا جاتی ہو۔ جیسے وہ ہنسنا تو چاہتی ہے لیکن کسی نامعلوم طاقت نے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔

اس کا دل ہر وقت ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔ عرصے سے ایک غیر معمولی خلا ہر وقت اس کے ذہن میں پھیلتا سمٹتا پھلا کرتا تھا

ہر لمحے اسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا۔ ایک طرح کی بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلاتی۔ یہ غیر معمولی خلا کس طرح پُر ہو۔ یہ خیال اُٹھتوں پہر اسے مضطرب رکھتا جیسے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ ذہن کی گہرائیوں میں خلط ملط کر سکنے کے ناقابل ہو چکی تھی۔ وہ آتشیں جذبہ کسی نہ کسی طور اُبھرتی آتا کہ اس کے انگ انگ میں ایک تیزابی کیفیت برپا ہو جاتی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے باکی، خلوص اور التجا ایک ساتھ بھری رہتی۔ ہر جذبہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتا۔ کبھی کوئی طاقت عود کر آتی، کبھی کوئی جذبہ غالب آجاتا۔ اس کش مکش کے ردِ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ناممکن تھا کہ دراصل ان آنکھوں میں کیا ہے؟ وہ نگاہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا گویا التجا کا جذبہ دوسرے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر کے نمایاں صورت اختیار کر گیا ہے اور نہایت ہی دردمندانہ انداز میں گڑگڑا رہا ہے ——— "کچھ ہو، واضح غیر واضح بس کچھ نظر آجائے۔"

اسے کائنات کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ اپنے آپ سے، اپنے ان غیر اختیاری اضطراری کیفیات برپا کرنے والے اوٹ پٹانگ خیالوں سے، ان سہیلیوں سے جو بڑی چنرائی اور دلچسپی سے اپنی محبت کے قصے سُنا سُنا کر اس کے دل میں بھی کچھ اسی طرح اترانے اور فخر سے باتیں بنانے کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے، کیا وہ اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح گھر کے کام میں جُتی رہے۔ اپنے ماں باپ کے اس جھوٹے پیار سے بھی بے انداز نفرت تھی جو خواہ مخواہ اس کے تئیں جتایا جاتا تھا۔ ماں باپ کی میٹھی میٹھی باتیں بھی اسے بالکل ہی بے مزہ اور پامعلوم ہوتیں۔ بلکہ اسے غصہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ان کے لاڈ پیار میں محبت کی نہیں، ہمدردی کی آمیزش ہے۔ ہمدردی جو کسی بھی بیگانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ رات کے دس بجتے ہی وہ چار بچوں کو اس کے سپرد کر کے علیحدہ کمرے میں سونے کو چل دیتے تھے اور بچے آدھی آدھی رات تک ریں ریں کرتے ہوئے اس کے لئے وبالِ جان بنے رہتے تھے۔ پھر وہ طویل، بھیانک اور تاریک راتیں، وہ تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں——

ایک ایک رات میں وہ کئی کئی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور سہمی سہمی بیٹھی ہوئی پہروں کمرے کی تاریک فضا میں اِدھر اُدھر آنکھیں بھٹکاتی رہتی۔ کبھی کبھی انتہائی کوشش کے باوجود سو نہ سکنے سے وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر آسمان کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگ جاتی جیسے کسی آسمانی طاقت کی راہ دیکھ رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کا مذاق اڑانے لگتے۔ خاموش فضا، وحشیانہ قہقہے لگا کر اسے چڑانا شروع کر دیتی کہ وہ جھنجھلا اٹھتی۔ کچھ یونہی دیوانوں کی طرح اس کا دل چیخنے چلانے کو چاہتا۔ یہ ستارے مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے۔ یہ چاند کیوں چاندنی بکھیر رہا ہے۔ یہ موت کا سا سکوت کیوں؟ یہ سب کیا ہے، یہ سب کیوں ہے؟ لیکن کوئی پھانس اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی اور وہ پھر اپنے تئیں چارپائی پر گرا دیتی ———

دن تو کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں، گھر کے کام کاج میں اور اسے اس قسم کے خیالات سے قدرے نجات مل رہتی لیکن جونہی شام ہونے کو آتی اس کا دل پھر بیٹھنے لگتا۔ اس وقت اسے کچھ اچھا نہ لگتا۔ ساری رات یونہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہنے کے احساس سے ایک جان لیوا سی افسردگی اس کے چہرے پر دھرنا دے بیٹھتی اور اداس مضمحل سی وہ یہاں وہاں گرنے پڑنے لگتی۔ یہ دن کب ختم ہوں گے یہ راتیں کب ختم ہوں گی؟ اسے یقین ہو چکا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی ایک آرزو سے ناتمام ہی تھی۔

اس ذہنی انتشار اور اس قسم کی بیزاریوں کو اندر ہی اندر دبائے رہنے سے اس کا ذہن ایک طرح کی دلدل بن چکا تھا جس میں کئی طرح کی امنگیں، امیدیں اور تشنہ کامیاں اور حسرتیں دھنس کر رہ گئی تھیں۔ ہر لحظہ وہ کئی کئی ڈھنگوں سے اُبھر اُبھر پڑتیں اور تڑپ تڑپ کر اس کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتیں ——— سوچو ہمارے لئے، ہماری رہائی کے لئے کچھ سوچو ———

گم وہ سوچ سوچ کر عاجز آچکی تھی۔

بسا اوقات سوچتے ہی سوچتے وہ اپنے خیالوں کی زندگی کو بھی پالتی تھی گوناگوں مسرتوں سے لبریز زندگی۔ زندگی کہ جس میں اسے سوچنا نہ ہوگا۔ اس وقت

اس کا ذہن کئی قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتا۔ اسے اپنے چاروں طرف سینکڑوں پیار بھری نگاہیں سرگرشیانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں۔ اس احساس سے معاً پیاری پیاری لہریں اس کے جسم میں سرسرا اٹھتیں۔ اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑنے لگتی جیسے وہ کسی نئے ولولے کسی نئی امنگ سے آشنا ہو رہی ہو۔ اس کا دل کسی نامعلوم خواہش کے زیرِ اثر جھنگا سا اٹھتا اور خواہ مخواہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایک اُڑتا قہقہہ فضا میں بکھیر دے۔ کہ اسے گرد و پیش کی ہر شے ہنستی ہوئی نظر آنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بجلی کے کوندے کی سی تیزی کے ساتھ کوئی دل شکن احساس اس کے قلب کی گہرائیوں سے اُبھر آتا اور کُہرے کی صورت میں ہر گوشے پر چھا جاتا۔ اس پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی —— پھر وہی بھیانک طویل راتوں کی گمنامیاں، پھیکے اُداس دن —— جھنجھلاہٹ اور وہی اس کا وجود۔

کسی رات اسے کوئی سہانا شیریں خواب بھی دکھائی دے جاتا جو بعد میں کئی کئی دن تک اس کے دل میں لذت انگیز گدگدی کرتا رہتا۔ پھر وہ ہر رات اسی قسم کے کسی خواب کی توقع میں، اپنے دل میں رنگینی لانے کی کوشش کرتی۔ بارہا اسے محسوس ہوتا کہ کمرے کی فضا میں میٹھے سپنے منڈلا رہے ہیں لیکن وہ ان تک کیونکر پہنچے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ انہیں پا سکنے میں کامیاب نہ ہوتی ——

سورج کافی اونچا اٹھ چکا تھا اور پچھواڑے کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں لٹکتی ہوئی بھاری بھرکم کائی کانے کی چق سے ہلکی ہلکی دھوپ کی اداس اداس لہریں فرش پر جال سا بن رہی تھیں۔ اس جال پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے لیٹے لیٹے پورے زور سے ایک انگڑائی لی۔ اس کا انگ انگ چٹخ اٹھا۔ اسی دوران میں اس کی ماں نے رسوئی گھر سے اسے نیچے آنے کو آواز دی لیکن وہ اَن سُنی سی کر کے اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا ذہن ایک ماہ پہلے کی طرف پلٹ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بات ابھی تک اس کے ذہن پر مرتسم تھی اور اکثر وہ بات اسے یاد آجاتی تھی۔ اس وقت بھی اپنے دل میں اسے دہرانے سے وہ طنزاً ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ بھاری بھرکم کائی کانے کی چق خود اسی نے ماں سے یہ کہہ کر یہاں لٹکوائی تھی کہ وہ موا درزی یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا ہے —— "بھینگا کلموہا" —— طنزیہ حقارت سے وہ بڑبڑائی "یوں دیدے مٹکا مٹکا کر دیکھتا تھا گویا اسے اپنی آنکھ کے پھولے کا احساس ہی نہ ہو —— بڑا چھیلا بنتا ہے۔ اونہہ! کوئی اس سے کہے کہ تمہیں تو کوئی چڑیل بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی"

جب کبھی وہ کھڑکی میں جاتی۔ درزی یوں تیزی سے مشین چلانے لگتا گویا دکھانا چاہتا ہو۔ میں دن بھر اسی رفتار سے مشین چلاتا ہوں اور پھر بھی بانہوں کے پٹھے تھکتے نہیں —— یونہی اسے خیال آیا کہ وہ ذرا اٹھ کر دیکھے کہ کیا وہ دوکان کھول چکا ہے لیکن پھر نہ جانے کس خیال سے وہ اسی طرح لیٹی رہی —— وہ ایک اور ہی حیران کن بات سوچنے لگی —— آخر وہ کیوں اس شدت سے میری طرف تاکتا ہے جبکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔

وہ لنگڑی تھی۔ یہی غم اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا اس کی ماں کے کہنے کے مطابق بچپن میں کہیں وہ گھر کی سیڑھیوں سے لڑھک پڑی تھی جس سے دائیں ٹانگ کا ٹخنہ اتر گیا تھا۔ بہتیرے حیلے کئے گئے مگر اصلی حالت پر نہ ٹک سکا۔ یہ قصہ اکثر اس کی ماں سائے ڈھلے گلی کی عورتوں میں بیٹھ کر چھٹی سے خربوزے تربوز کے بیج نکالتی ہوئی دہراتی اور جب وہ سب عورتیں اس کے بُرے نصیب پر چچ چچ کرنے لگتیں تو اس کے دل میں کئی قسم کے اضطراری شعلے ایک ساتھ بھڑک اٹھتے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ جان بوجھ کر ایک بار پھر سیڑھیوں پر سے لڑھک پڑے اور اپنی دوسری ٹانگ کو بھی ناکارہ کر لے کہ وہ چل پھر تو نہ سکے گی۔ نہ کوئی اسے دیکھے گا نہ اس کی حالتِ زار پر افسوس کرے گا اس کے وقار کی ہیٹی تو نہ ہوگی۔

یوں وہ بناؤ سنگھار کی بڑی دلدادہ تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کنگھی لئے وہ بال سنوارتی رہتی۔ اس کے بال گو چھوٹے اور چھدرے تھے لیکن وہ ایک ایک لٹ کو چن کر اس طرح جما لیتی کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پھبن پیدا ہو اٹھتی۔ وہ اپنے ابروؤں کے بال بڑی محنت کے ساتھ

موچنے سے تراشتی کہ قدرتی بے ترتیبی ناپید ہو کر سہانا تناؤ آسکے۔ آنکھوں کی پلکوں پر کریم مل مل کر وہ انہیں دراز کرتی اور کاجل سرمہ کی سلائیوں کو اس ہنرمندی سے آنکھوں میں پھیرتی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود آنکھیں کنپٹیوں تک لانبی دکھائی دینے لگتیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر مسّی گھستی رہتی، جس سے ہونٹوں میں غضب کی دل آویزی اور رسیلی چمک پیدا ہو اٹھتی تھی۔

کپڑے پہننے میں بھی وہ بڑی احتیاط برتتی۔ کس جمپر کے ساتھ کون سی شلوار کا میل ہے۔ چنری کے کون سے رنگ میں وہ زیادہ جاذبِ نظر دکھائی دے گی۔ آنچل کس طرح لہرائے کس ڈھنگ اوڑھنے سے اوڑھنے زیادہ چمک سکتے ہیں۔ ان سب باتوں میں اسے کمال حاصل تھا لیکن یہ سبھی جادو تو جیسے کسی بہت بڑے آسیب کے زیر اثر ہر دم رہتے ہی رہتے۔ وہ غیر مطمئن تھی۔ وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر اس کی حالتِ زار پر افسوس کرنا شروع کر دے، اس سے ہمدردی جتانے لگے۔ بلکہ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ اس کی تسکین کا محض ایک ہی ذریعہ تھا کہ کوئی بھی نوجوان اسے کسی اور ہی جذبے کے زیرِ اثر دیکھے ——— وہ سحر طراز جانا پہچانا جذبہ جو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کی طرح لڑکوں سے چھپ چھپ کر ملنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ کسی خوبرو نوجوان کے ساتھ پہروں میٹھی پیار و محبت کی باتیں کرتی رہے، کوئی اس کی تعریفوں کے پل باندھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے ان نگاہوں سے دیکھے جن نگاہوں کا تصور ایک مدت سے اس کے خیالوں میں رچ چکا ہے۔

دھوپ لحظہ بہ لحظہ گرمی پکڑ رہی تھی۔ اس کی ماں نے نیچے سے ایک اور آواز دی لیکن اس نے کروٹ بدل لی۔ سامنے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سُرمئی رنگ کا پھولدار پردہ ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اس کی طرف نظر جاتے ہی یک لخت نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ وہ پردہ پھبتی آمیز قہقہے لگاتا ہوا اس پر نہایت ذلیل فقرے کس رہا ہے، وہ جھپٹ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس قدرے زور سے چلنے لگا۔ ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ لپک کر اس پردے کو کھینچ لے اور چیتھڑا چیتھڑا کر کے ہوا میں اچھال دے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اس پردے سے ایک طرح کی وحشت آنے لگی گویا سچ مچ ہی وہ اس سے مخاطب ہو ——— "سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے ———"

اس پھولدار سرمئی رنگ کے پردے سے اس کی کس قدر رنگین اور پیاری گھڑیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک ہی ہفتہ پہلے اس نے خود اپنے ہاتھ اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ کر کے یہ پردہ یہاں لٹکایا تھا گو اس میں اس کی ماں کا بھی ہاتھ تھا۔ تاہم اس پردے کے ساتھ ایک اور بھی پردہ پڑا رہے گا، اس نے اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ دی تھی ——— ایک ہفتہ ——— یعنی کل سات دن ——— وہ سوچنے لگی۔ کتنا مختصر وقت ہے لیکن اس نے اس دوران میں کیا کچھ نہیں پایا ——— اس سنہری دور کا وہ پہلا دن جب اس نے مہندر کو سامنے کے مکان کے چھجے پر آرام کرسی پر لیٹے پڑھتے دیکھا تھا۔ صبح ہی صبح جب وہ چوبارے کی اس کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوتی تو ایک دم جیسے اس کا دل بول اٹھا تھا۔ "ہاں جس کی تلاش میں تم برسوں سے سرگرداں ہو آج وہی تمہارے سامنے آموجود ہوا ہے۔ یہ پرستار تمہارے دل کے تاروں پر وجد آور نغمے گائے گا ——— یہ مسیحا تمہاری صدیوں کی تڑپ ہرنے آیا ہے" اور واقعی مہندر کی ایک ہی میٹھی نظر نے اس کی تڑپ ہر لی۔ صدیوں کا روگ مٹ گیا۔ اسے دنیا کی ہر شے مسکراتی اور خوشی سے ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

مہندر اٹھ کر اندر چلا گیا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی۔ کس قدر تعجب کی بات ہے، اس نے سوچا گھر کے بالکل مقابل کے مکان کو اس سے پہلے اس نے غور سے نہیں دیکھا ——— وہ تو جب بھی اپنی کسی نئی سہیلی کو اپنے مکان کا پتہ بتایا کرتی تھی تو محض اتنا ہی کہ فلاں گلی میں ہے۔ دائیں ہاتھ کے تین چار مکانوں کے بعد پیلے رنگ کے چھجے والے مکان کے ٹھیک سامنے ہی اس کا گھر ہے۔ بھلا وہ یوں کیوں نہ کہتی تھی کہ اس پیلے مکان کے چھجے کے جنگلے میں انیس سلاخیں ہیں جن میں سے تیرہ سلاخیں تو شاید دھوپ اور بارش میں رہنے کے سبب زنگ آ

ہر جگہ میں لیکن باقی چھت پر لگا ہوا تارکول ابھی اپنی پوری آب پر ہے اس مکان کے دروازوں پر نہایت ہی چمکیلا سبز روغن کیا ہوا ہے لیکن آتے جاتے تختوں کو چھوتے رہنے سے ان کے درمیانی حصے کی کچھ جگہ میلی بھی ہو گئی ہے یا یہ کہ چھجہ کافی کھلا ہے اور وہاں تھوڑا آسانی سے آرام کرسی بچھا کر کوئی پڑھ سکتا ہے۔

اس واقعہ نے اسے یکسر بدل دیا۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی درد و کرب کی چیخیں جانے کہاں دفن ہو گئیں اور ان کی بجائے نہایت لطیف تسکین دہ احساسات نے جگہ پالی جیسے کسی لق و دق صحرا میں بھٹکتی ہوئی یکایک وہ کسی سرسبز رنگین وادی میں پہنچ گئی ہو۔ ایسی وادی جو اس کے خیالوں کی وادی سے بھی کہیں زیادہ خوشنما تھی جہاں کُل کُل کرتے ہوئے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے اس کی تڑپ اور تشنگی مٹانے کو محو انتظار تھے۔ اس میں ایک غیر معمولی پھرتی آ گئی۔ گھر کے کام کاج میں بھی وہ بڑی مستعدی دکھانے لگی۔ اس سے پہلے برتن مانجھنے سے وہ اکثر کنی کترا جاتی تھی اور اس وجہ سے اسے ماں کے سینکڑوں کوسنے سننے پڑتے تھے لیکن اب وہ خود بخود ہی چٹکیوں میں برتن چمکا کر الماری میں جوڑ دیتی اور منٹوں میں دوسرے رسوئی کے کاموں سے بھی نبٹ جاتی۔ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے تئیں بھی وہ بڑی محبت جتانے لگ گئی تھی۔

لیکن اس کی ماں بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ پہلے ایک دو دن تو اس نے اس اچانک تبدیلی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ عمر کا تقاضا سمجھ کر درگذر کرتی رہی لیکن جب پانی سر سے گذرتا ہوا دکھائی دیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سامنے کے مکان میں آ کر بسے ہوئے نئے کرایہ دار کے لڑکے مہندر کو بھی وہ اکثر چھجے پر بیٹھے اور اوپر کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا کسی قسم کی انگشت نمائی کے ڈر سے اس نے کھلے طور پر تو کوئی قدم نہ اٹھایا۔ صرف اپنی لڑکی کو طرح طرح کی دلیلیں دے کر اور باتوں باتوں میں بات لگا کر سمجھانے کی کوشش کی اور اسی کے کہنے پر ہی کھڑکی میں یہ پردہ لٹکا دیا گیا تھا لیکن وہ ماں کی آنکھ بچا کر دن میں بیسیوں مرتبہ کھڑکی میں چلی آتی تھی۔

چوبارے کی یہ کھڑکی سامنے کے چھجے سے قدرے اونچائی پر تھی۔ اس طرح چھجے پر سے کھڑکی میں کھڑے کسی شخص کی کمر تک ہی کا حصہ دکھائی دے سکتا تھا۔ پھر بھی وہ وہاں کھڑی ہو کر پردے کو اس انداز سے سرکائے رکھتی کہ مہندر صرف اس کا منہ یا زیادہ سے زیادہ چھاتیاں ہی دیکھ سکے۔

دن کو تو زیادہ تر ماں اسے نیچے اپنے پاس بٹھائے رکھتی تھی لیکن رات کو کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے سے وہ اپنے بہن بھائیوں کو تھپکا کر سُلا کر کھڑکی میں چلی جاتی۔ گو اس کی ماں ایک بار سونے کے لئے جا چکنے کے بعد پھر کبھی اس کے پاس نہ آتی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ چوبارے کی بجلی بجھائے ہی رکھتی۔

چھجے کے اندر کی طرف دروازہ مہندر کے کمرے میں کھلتا تھا جسے شاید وہ ہوا آنے کی غرض سے کھولے رکھتا تھا۔ کھڑکی میں سے وہ بجلی میں اسے پڑھتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ پہروں وہ اندھیرے میں کھڑی اسے تاکے جاتی۔ مہندر کو شاید اس بات کا علم نہ تھا وہ بے خبر اپنی پڑھائی میں مگن رہتا اور جونہی گھڑیاں بارہ بجاتیں اس کے کمرے کی بجلی بجھ جاتی۔ کئی بار اس کے دل نے بغاوت بھی کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنی موجودگی کا احساس دلائے اور التجا کرے کہ خدا را کچھ دیر کے لئے اور رہ جاؤ —— تم اتنی جلدی کس طرح سو جاتے ہو —— لیکن وہ بے دلی سے کھڑکی سے ہٹ جاتی۔

لیکن تیسرے دن کے بعد مہندر نے بھی کمرے میں بیٹھنے کے بجائے باہر چھجے پر آ کر ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ کبھی کبھی وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی بھی باندھ لیتا۔ کوئی اشارہ یا بات تو نہ ہوتی لیکن اس دن کے بعد دونوں ہی اس دھن میں رہنے لگے کہ ایک دوسرے سے پہلے مخصوص جگہ پر پہنچ جائیں۔ اسے گھر کے کام کاج میں اکثر دیر ہو جاتی۔ ماں کوئی بیگار ڈال دیتی یا بچے ہی سونے کا نام نہ لیتے تو وہ جھنجلا جھنجلا کر اس اونچی آواز میں ہنس دیتی کہ مہندر اگر چھجے پر پہنچ چکا ہے تو اس کی آواز اس تک پہنچ سکے یا اگر ماں جاگ رہی ہے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو اور جونہی سب صحیح ٹھیک دیکھ کر وہ کھڑکی میں آ کر مہندر کو انتظار کرتا ہوا پاتی تو اس کا رواں رواں خوشی سے کھل اٹھتا۔

اب اس کی سہیلیاں جب اسے ملنے آتیں اور حسب معمول اپنے کسی محبت کے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتیں تو خلاف معمول وہ ان میں

زیادہ دلچسپی لینے لگتی۔ بات بات پر وہ کھلکھلا اٹھتی گویا ان کی محبت کا مذاق اڑا رہی ہو ——— "اچھا کل اس نے تمہاری گلی میں بارہ چکر لگائے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ قہقہے لگا کر ہنسنا شروع کر دیتی۔ ہنستے ہنستے اسے اوتھو آنے لگتا۔ کئی بار اسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ ان سے کہے آخر میں بھی تو محبت کرتی ہوں، ہماری طرف دیکھو۔ وہ میری بابت سوچتا ہے میں اس کی بابت سوچتی ہوں اور بس۔ اور یہ جو تم گلیوں کے چکر کاٹنے والی باتیں سُنا رہی ہو یہ سب لغویات ہیں ——— فضول ——— واہیات ———

مگر وہ اپنے تصور کی کل یکسوئی کے باوجود کچھ بھی کہنا پسند نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اس کا مذاق اڑانے لگیں گی۔ ایسے ایسے دل شکن فقرے دہرائیں گی کہ اس کی روح کا ہر ذرہ رو اٹھے گا۔ کسی کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہ آئے گا۔ وہ سب تو شاید یہی سمجھے بیٹھی ہیں کہ دنیا بھر کے کسی بھی شخص کی دلچسپیوں کا مرکز اگر کوئی ہو سکتا ہے تو محض انہی کی ذات۔ ہونہہ! وہ سوچتی، یہ خود اعتمادی دراصل کس قدر بے وقعت ہے، اسے یاد تھا کہ ای شانتی کا چاہنے والا جس کے متعلق وہ بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتی تھی اور جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تک ملاتے نہ چوکتی تھی، پچھلے دنوں گھر کی نوکرانی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔

سرمئی رنگ کا پھولدار پردہ بدستور ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا اور کانی کانے کی بوجھل، گم سم چھت سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کمرے میں گھسی بھر رہی تھی ——— پردے کی طرف دیکھتے سے پھر اس کے سینے میں کسک سی ہوئی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما اٹھا۔ کسی غیر معلوم خواہش کے زیر اثر ایک دم اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے پردے کی اوٹ میں جا کر کھڑی ہو جائے۔ یونہی ——— لیکن فوراً ہی بعد پھر اسے اپنے اس احساس سے بھی وحشت سی ہونے لگی۔ پردہ جیسے پھر کچھ کہنے کو دکھائی دیا ———

وہ تن کر سیدھی لیٹ گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ آنکھیں آگ برساتی تھیں اور اس کا ذہن کسی فیصلہ کن راہ پر چلنے کے بجائے اِدھر اُدھر بھٹکنے سے جواب دینے لگا۔ نڈھال سی ہو کر وہ چھت کی کڑیاں گننے لگی لیکن اس سمت بھی اس کا دھیان زیادہ دیر نہ جم سکا۔ سینے کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

ماضی کی اس کٹھن سرد مہری اور مستقبل میں بھی روشنی کی کسی ہلکی سی کرن کے لئے ناامیدی نے اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی ——— بیاہ ——— یکایک یہ خیال نہ جانے اس کے ذہن کے کس گوشے سے اُمڈ آیا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس خیال نے اسے ذرا سی قوت بخشی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے لیکن پھر جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا تجزیہ کرنے لگی تو اسے یہ خیال بھی محض دل بہلاوے ہی کا ایک سامان معلوم ہونے لگا۔ کئی بار اس کی سگائی کا چرچا اٹھا تھا۔ جس دن لڑکے والوں کی طرف سے کسی عورت کی آمد آمد ہوتی وہ لگاتار کئی کئی گھنٹے ٹک پلک درست کرنے میں گذار دیتی لیکن جونہی اس عورت کا سامنا ہوتا ساری سحر انگیزی ٹوٹ جاتی۔ خود نمائی کا جادو اپنے ہی سر چڑھ کر بول اٹھتا۔ اسے انتہائی یقین ہو چکا تھا کہ کسی بھی حالت میں وہ شادی کے قابل نہیں سمجھی جا سکتی۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی گذرتا کہ یہ جو چہروں پر چیچک کے بدنما داغ، پھلبہری کے نشان، چپٹے موٹی، بھدی، کالی، بھینگی، سینکڑوں عورتیں گھروں کی رانیاں بنی بیٹھی ہیں۔ یہ بھلا کیونکر قبول کی گئی ہوں گی؟ اور اس خیال سے اس کے دل کو ذرا دیر کے لئے ڈھارس بندھ جاتی کہ شاید، شاید۔ لیکن جونہی یہ پیوند لگتا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ شادی کے بعد ظہور میں آیا ہو تو وہ اپنی ہی قسمت پر لعنت ملامت کر کے خاموش ہو جاتی۔ کاش کہ قدرت نے اسے لنگڑی نہ کیا ہوتا۔ شادی ہو جانے کے بعد چاہے اس کے کل جسم کو فالج مار جاتا ——— وہ کوڑھی ہو جاتی ———

نیچے سے ماں کی ایک زوردار آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا۔ اسے خیال آیا کہ اٹھ کر نیچے چلی جائے۔ ماں جانے اس کے متعلق کس واہمے میں مبتلا ہو گی۔ لیکن پھر اسے اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ سب اسی کی تو لگائی ہوئی ہے۔ اگر وہ کل پڑوسن کے ہاں نہ گئی ہوتی تو.......

کل کے واقعے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو اٹھیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ماں پڑوسن کے یہاں

گئی ہوئی تھی کہ سورج ڈھلتے آتے ہی وہ بھی کھڑکی سے جا لگی۔ سامنے مہندر بھی کرسی بچھائے پڑھ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے ___ وہ کس قدر چالاکی سے کتاب کو منہ تک سرکائے بظاہر پڑھنے میں منہمک نظر آتا تھا مگر اس کی آنکھوں کی آسیبی چمک سورج کے سامنے رکھے ہوئے آئینے کے لشکارے کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں ____؟ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ یکایک پڑوسن کی لڑکی نے جو اس کی سہیلی بھی تھی اسے نیچے گلی سے پکارا۔ انہی کے ہاں سے ماں نے اس کو بلانے کے لئے اسے بھیجا تھا۔ دفعتہً بجلی کے جھٹکے سے جس طرح کوئی سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا ہے وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ وہ کیونکر گلی میں جائے گی؟ یہ خیال اسے کسی غیر معمولی طوفان کا پرتو معلوم ہونے لگا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں ایک ہیجان امنڈ پڑا۔ اسے محسوس ہوا گویا ماں اس سے پچھلے جنم کا انتقام لینا چاہتی ہے۔

اس کی سہیلی اب اوپر اس کے پاس آ چکی تھی اور ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے سر درد کا بہانہ کیا پھر پیٹ درد حتیٰ کہ ہر درد گنوا ڈالا۔ کئی اور بھی بہانے بنائے مگر اس نے ایک نہ سُنی اور آخر اسے کھینچتی ہوئی نیچے لے ہی گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ ذرا سی دیر میں آنے کو کہہ کر اوپر کھڑکی میں چلی جائے اور بے باکانہ انداز میں گڑگڑا کر مہندر سے التجا کرے کہ اے میری روح کے نور، میرے مسیحا، آج تک میں نے تجھ سے بات تک نہیں کی۔ چاہت بھری نگاہوں کی دین کے علاوہ کچھ نہیں چاہا۔ آج میں جھولی پھیلا کر تجھ سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اندر کمرے میں چلے آؤ۔ مگر وہ ابھی تک پوری طرح یہ سب سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی سہیلی گھسیٹ کر اسے باہر لے گئی۔

اس پر غشی کا سا عالم طاری تھا۔ کل جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ کاش اس وقت زمین پھٹ سکتی کہ وہ اس میں سما جاتی۔ اپنی سہیلی کا کندھا تھامے رہنے اور ٹانگ کو پوری قوت سے اکڑا لینے کے باوجود اس کا پاؤں گھوم کر لڑکھڑا ہی جاتا۔ ہر قدم پر اسے محسوس ہوتا گویا سینکڑوں بچھو ایک ساتھ اس کے جسم پر ڈنک چلا رہے ہوں۔

ماں کی باتوں پر وہ پوری طرح سے توجہ نہ دے سکی۔ ہر لحظہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ صرف اتنی ہی بات اس کی سمجھ میں آ سکی کہ تمہارے پتا جی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے چولہے پر چائے کے لئے پانی رکھ دو اور نیچے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بیٹھو۔

وہ جلدی ہی واپس لوٹ آئی۔ آتے ہوئے اس نے اوپر چھجے کی طرف دیکھا۔ مہندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرتی پڑتی سیڑھیاں طے کر کے جب وہ چوبارے کی کھڑکی میں پہنچی تو مہندر چھجے پر موجود نہ تھا۔ چھجے اور کمرے کو ملاتا ہوا رات دن کھلا رہنے والا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔

شام تک وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ ماں نے جب اوپر آ کر چوٹی سے پکڑ کر کھینچا، گالیوں اور دھول دھپوں کی بوچھاڑ کی تب کہیں وہ نیچے اتری۔ باپ الگ خفا ہو رہا تھا لیکن اسے تو اب جیسے کسی کی پرواہ ہی نہ تھی۔ جیسے وہ کچھ سُن ہی نہ رہی تھی۔

رات بھی وہ آدھی رات تک کھڑکی میں کھڑی رہی لیکن اس کے دل کی طرح سامنے کا چھجہ بھی ویران ہی رہا۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ دروازہ کبھی نہ کھلے گا۔ پھر جانے اس خیال سے وہ وہاں جمی رہی کہ گذشتہ سات دنوں کی اس زندگی کو وہاں سے کھرچ کر اپنے دل میں سنبھال کر رکھ لے۔ ماضی کی طرح پھر جب خیالات کا تصادم ہوگا تو اسے اپنی اس زندگی سے تھوڑی بہت تو تسکین مل سکے گی۔

چھجے کے دروازے کی درزوں میں سے تیز دھار کٹاریوں کی صورت میں اس کے کلیجے کو چھلنی کرتی ہوئی بجلی کی روشنی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ پڑھ رہا تھا۔ "یقیناً وہ پڑھ رہا ہوگا۔" اس نے سوچا، اسے تو کچھ بھی نہیں ہوا اتنے بڑے انقلاب کا اثر کائنات کی کسی بھی چیز پر تو نہیں ہوا۔ ستارے اسی طرح جھلملا رہے ہیں۔ چاند چاندنی بکھیر رہا ہے۔ لوگ نیند میں گھوک سو رہے ہیں...... یہ خوفناک طویل بھیانک رات۔ یہ تنہائی۔ یہ خلا ______

اس کی حالت پیاس سے مرتے ہوئے اس انسان کی سی تھی جس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے لبالب پیالہ دے کر پھر اسی دم چھین لیا گیا ہو۔ جس نے صدیوں کی تشنگی کو دبا کر اس ساعتِ خوش کن کا انتظار کیا ہو اور جو ناکام ہونے کی صورت میں بجھتے ہوئے دیئے کی لو کی مانند بھڑک اٹھے۔

اس کا دھیان پھر پردے کی طرف گھوم گیا۔ ہوا کے زور سے پردہ بدستور پھڑپھڑا رہا تھا ——— ان تھک زبان سے کہے جا رہے وہ فقرے اس کی روح کو تڑپانے لگے ——— سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے۔ کسی غم یا غصے کے بجائے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی گویا گرد و پیش کی ہر شے سے پوچھ رہی ہو۔ "کیا سچ مچ یہ انصاف ہی ہے؟"

پھر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں چپ چاپ تکتی ہوئی کاٹی کاٹنے کی بوجھل چق کی طرف اٹھ گئیں اور ایسے ہی وہ سوچنے بھی لگی۔ آخر اس چق پر ہوا کے جھونکے کیوں اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ کیوں خاموش ہے؟ ——— کہ یکایک اس چق پر تیز تیز ہاتھوں سے مشین چلاتا ہوا درزی اُبھر آیا اور جیسے اس کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی "میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں ——— میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں۔"

وہ دونوں کھڑکیوں کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لینے لگی۔ صرف ایک ثانیہ کے لئے اس کے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی جذبہ پکارا ——— ایک خلیج ہی تو ہے۔ گہری، ناقابلِ عبور ——— لیکن دوسرے ہی لمحے کسی خوفناک عزم کے دبدبے سے گویا وہ جذبہ پھر ذہن کی گہرائیوں میں لڑھک گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کاٹی کاٹنے کی بوجھل چق سے ڈھک گئی اور پچھواڑے کی کھڑکی میں پھولدار پردہ ہوا کی لہروں پر ناچنے لگا۔

سرلا دیوی

چاند بُجھ گیا

جب سے ڈاکٹر ہو کر گیا تھا گھر میں ایک منحوس سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سب غیر معمولی طور پر چپ ہو گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے ہنسی یکسر غائب ہو گئی تھی۔ وہ چل پھر رہے تھے، مگر سایوں کی طرح خاموش۔ ان کے چہرے ایک ساتھ لمبے لمبے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی سفیدی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور چیزوں کو پکڑتے اور اٹھاتے وقت ان کی انگلیاں کانپ کانپ جاتی تھیں۔ گھر کے لوگوں میں اس تبدیلی کو موہنی نے بخوبی محسوس کیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کمرے میں جو شخص بھی داخل ہوتا ہے، اُس سے آنکھیں نہیں ملاتا بلکہ جلد سے جلد باہر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس نے ایک دو بار دریافت بھی کیا کہ ڈاکٹر کیا مرض بتا گیا ہے۔ مگر کسی نے تسلّی بخش جواب نہ دیا تھا۔ سب لوگ اس سے کچھ چھپانا چاہتے تھے۔ وہ اس کی آواز سُن کر چونک پڑتے تھے اور ایک بار آنکھیں ملا کر فوراً نظریں چرا جاتے تھے موہنی کو کسی نے کچھ نہ بتایا لیکن وہ سب کچھ جان گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ اس قسم کے تجربہ سے وہ پہلے بھی ایک بار دوچار ہو چکی تھی۔

لیکن پہلے تجربہ میں اور دوسرے تجربہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُس دفعہ موہنی چارپائی پر نہیں پڑی تھی۔ اُن دنوں وہ تندرست تھی، خوبصورت تھی۔ اس کے رخساروں کی رنگت گلابی، اور ہونٹوں کی سُرخی تازہ تھی۔ چارپائی پر اس کے پتا پڑے تھے۔ بخار نے ان کا خون اور گوشت گھلا ڈالا تھا۔ اور ہڈیاں پیلی مردہ کھال کے نیچے بے ڈھنگے سے انداز میں پڑی رہ گئی تھیں۔ وہ چار مہینے سے بیمار تھے۔ پہلے ڈاکٹروں نے معمولی بخار بتایا۔ پھر ملیریا، ٹائیفائڈ اور پھر ایک دن سارے گھر میں آج کی طرح سناٹا چھا گیا۔ خوف و ہراس سے سب کانپ اٹھے۔ ہمت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ گھر میں موت کے سیاہ پروں کا سایہ پھیلتا دکھائی دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے پتا کو تپِ دق کا مریض قرار دے دیا تھا۔ آج پھر موہنی کی آنکھوں کے آگے اس کے بیمار پتا کی تصویر گھومنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تصویر دھندلی پڑنے لگی اور اس میں سے ایک نئی تصویر اُبھرنے لگی ——— یہ دوسری تصویر موہنی کی تھی ——— موہنی کو سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ اس نے اپنے پتا کی چارپائی سنبھال لی ہے۔

دق — ٹی بی ——— موہنی کی چھاتی میں برچھیاں سی اُتر گئیں۔ وہ لرز اُٹھی۔ اس کا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ کیا اسے واقعی دق ہو گئی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں ناقابل گھن لگ گیا ہے؟ موت!

موت کا خیال آتے ہی موہنی کا سر چکرا گیا۔ موت کے خوف نے اس کی روح کو جکڑ لیا ——— لیکن دوسرے لمحے یہ خوف کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ جس نے لے لی: میں مر جاؤں گی تو میرے بعد میرے بچوں کا کیا ہو گا؟ میری سویٹ کا اور میرے اس منے کا جس کا ابھی نام بھی نہ رکھ پائی ہوں؟ اور یوں موہنی کے لئے زندگی اور موت کے تمام مسائل سمٹ کر اس مسئلہ میں سما گئے ——— میرے بچوں کا کیا ہو گا۔ میرے بچوں کا کیا ہو گا؟

اس کا تخیل تصویر پیش کرنے لگا ——— وہ موت کا شکار ہو گئی ہے ——— مر گئی ہے۔ اس کے بچے بھوکے پیاسے بلک رہے ہیں۔ کسی نے ان کے بالوں کو نہیں سنوارا۔ کسی نے ان کے کپڑے نہیں بدلے۔ کسی نے ان کے ماتھوں پر نظر سے بچنے کے ٹیکے نہیں لگائے۔ یکایک اس کا پتی ایک غیر عورت کو لے کر گھر میں آیا۔ وہ عورت بہت خوبصورت ہے۔ اس نے اس کے کپڑے اور زیور پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس کے بچوں کو دیکھتی ہے اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ چہرے کے خطوط بگڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں اور پھر ——— پھر وہ بچوں سے دن بھر گھر کا کام کراتی ہے اور شام کو ان کی چھوٹی چھوٹی شکایتیں کر کے اپنے شوہر سے پٹواتی ہے اور رات کے اندھیرے سناٹے میں بچے اپنی ماں کو یاد کر کر کے روتے رہتے ہیں، بلکتے رہتے ہیں اور پھر تھک کر سو جاتے ہیں؟ کیا میرے بعد میرے بچوں کا یہ حال ہو گا؟ ——— موہنی پریشان ہو اٹھی۔ نہیں، نہیں، میں جیوں گی۔ میں اپنے بچوں کی خاطر مرض سے لڑوں گی۔ مرض کو شکست دوں گی!

موہنی زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سدا زندوں کی طرح رہنا چاہا تھا۔ اس نے غریب شنکر سے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف صرف اس لئے شادی کی تھی کہ شنکر سے جدا رہ کر وہ جیتے جی مر جاتی۔ مُردوں کی طرح جینا اسے پسند نہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غریب ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے اچھے گھرانوں کے رشتے آئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو کسی امیر گھرانے میں شادی کر کے زندگی عیش سے گزارتی۔ لیکن اس نے ہر قسم کے لوبھ اور لالچ کو تیاگ کر شنکر سے پریم وواہ کر لیا ——— شنکر جو ۱۲۵ روپیہ ماہوار کا کلرک تھا۔

شادی کے بعد ایک سال انہوں نے بڑے سکھ اور شانتی میں بتایا تھا۔ جیون مسکراہٹوں اور قہقہوں کی لڑی بن گیا تھا۔ ان کی صبحیں روشن، شامیں سلونی اور راتیں اجیاری تھیں۔ گھر میں فرنیچر نہ تھا۔ ٹرنک میں ریشمی کپڑوں کے ڈھیر نہ تھے۔ مخملی ڈبیوں میں زیور نہ تھے۔ سیر کے لئے کار اور تفریح کے لئے روپے نہ تھے۔ مگر محبت تھی۔ خوشی تھی۔ شانتی تھی۔ گھر میں دو پرانی تھے۔ جو تنخواہ ملتی اس میں گزر کر لیتے اور زندگی کی دوسری آسائشوں کی کمی کو ان خوابوں سے پورا کرتے جو دونوں مل کر اس وقت دیکھا کرتے جب رات کا کاجل رچ جاتا۔ ستارے بڑے بڑے ہیروں کی طرح آسمان کی نیلی مخمل پر جگ مگ کرنے لگتے اور چاند آسمان کی پیشانی پر جھومر کی طرح جھمکنے لگتا۔ وہ خواب دیکھا کرتے ——— ہمارے بچہ ہو گا۔ ہم اسے بڑے پیار سے پالیں گے۔ پڑھائیں گے۔ لکھائیں گے۔ وہ بڑا ہو کر ایک خوبصورت جوان نکلے گا اور ہم بوڑھے ہو کر آرام کی زندگی گزاریں گے۔ سیدھے سادے معصوم خواب۔ زندگی سے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے بچے کے لئے ایک درخشاں مستقبل کی آس۔ جس دن ان کو اپنے اس خواب کے پورا ہونے کی آس بندھی دونوں کتنے خوش تھے۔ ان کی آنکھوں میں تارے ناچتے رہتے تھے اور ان کے کانوں میں ان کے ہونے والے بچے کی قلقاریاں گونج رہی تھیں۔ دونوں نے بڑے شوق اور بے قراری سے اس دن کا انتظار کرنا شروع کیا جب ان کا بچہ ان کی گود میں آئے گا۔

لیکن موہنی کو جوں جوں دن چڑھنے لگے، یہ شوق، یہ بے قراری مرجھاتی گئی۔ موہنی کی صحت گرنے لگی۔ وہ تھکی تھکی سی رہنے لگی۔ اس کے گالوں کا گداز پن اور ہونٹوں کی سرخی غائب ہونے لگی۔ نازک پتلیوں پر تھکی ہوئی پلکیں گری رہنے لگیں۔ شنکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور بتایا کہ جسم میں خون کی بہت کمی ہے۔ اسے وٹامن چاہئیں، یوٹرا ایکسٹرکٹ چاہئیے۔ خوراک میں مکھن، گھی، دودھ، پھل زیادہ ملنے چاہئیں، اور پورا آرام دیا جائے۔ وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے لیکن اب ان کے درمیان ایک پیار کا سمندر ہی نہ تھا۔ ان کے درمیان دوائیں، پھل، دودھ، گھی اور ایک نوکر بھی تھا۔ موہنی سوچ رہی تھی۔ بناسپتی کی بجائے اسے اصلی گھی کھانا چاہئے۔ صحت اچھی ہونے پر ہی بچہ تندرست پیدا ہو سکے گا۔ مگر ان سب چیزوں کے لئے روپیہ چاہئے، روپیہ۔ اور پہلی بار اس کی زندگی میں روپے کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شنکر

کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ پہلی بار اسے خواہش پیدا ہوئی کہ شنکر کے پاس بہت سی دولت ہو، اس کی تنخواہ زیادہ ہو ——— عیش کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لئے۔ ایک صحت مند بچے کی ماں بننے کے لئے، ایک جیو آتما کو جنم دینے کے لئے۔

لیکن شنکر ایک کلرک تھا۔ اس کی تنخواہ بندھی ہوئی تھی اور بندھی ہوئی آمدنی میں بناسپتی گھی اور چائے کے بھورے پانی کے علاوہ کسی اور چیز کی آشا کرنا پاگل پن تھا۔ موہنی کا چہرہ مرجھا گیا۔

اب ہر لمحہ اور ہر قدم پر موہنی کے سامنے تلخ حقیقت آکھڑی ہوتی۔ زندگی کے متعلق جو رومان انگیز تصور اس نے باندھے تھے وہ اب منہ چڑاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ موہنی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہ رہی تھی۔ جن چیزوں کی ضرورت کو اس نے شنکر کی محبت میں فراموش کر دیا تھا وہ اب کانٹوں کی طرح اس کی زندگی کے راستے میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اب موہنی کے دن شنکر کے دفتر سے آنے کی آس میں، اور راتیں چاند تاروں کے رومان کی تلاش میں گزرنے کی بجائے الجھنوں، تشنگیوں اور محرومیوں کے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے ہوئے احساس میں بیتنے لگیں۔ ہر لمحہ ایک نئی محرومی کا احساس ہوتا ——— اور یہ احساس اس کے اور شنکر کے درمیان جھنجھلاہٹ کی ایک دیوار کھڑی کرنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ایسے لمحوں میں ہوتا جب موہنی تھکی ہوتی۔ اس کی طبیعت گری ہوتی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہ کرتا اور کام کا اونچا پہاڑ اس کے سامنے ہوتا۔ موہنی کے لئے کچھ طاقت کی دوائیاں لانے اور دودھ وغیرہ منگانے کی وجہ سے تنخواہ ضرورت سے زیادہ ناکافی معلوم ہونے لگی ——— اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوائیں پیتے وقت یا غذا کھاتے وقت موہنی کے ذہن میں حساب کی گردان سی ہوتی رہتی ——— یہ چار روپے کی وٹامن کی گولیاں ہیں، پورا ایکسٹریکٹ کی گولیاں، گیارہ روپے کی آتی ہیں۔ اور دودھ کا بل اب کے تیس روپے آئے گا۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اگلے مہینے گھر کی گاڑی کسی صورت میں نہ چل سکے گی۔ اور کھایا پیا اسے کچھ نہ لگتا۔ تکان، کمزوری، پریشانی، جھنجلاہٹ ——— اور جیسے موہنی کے مزاج میں ایک غیر معمولی تبدیلی آنے لگی ——— ہونٹ بھنچے رہتے اور ماتھے پر ایک شکن ہر وقت پڑی رہتی۔ مگر ایسے لمحے بھی آتے جب ایک لمحے کے لئے گھٹائیں چھٹ جاتیں اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے نکل آتا۔ انہیں حالات میں موہنی نے ایک بچی کو جنم دیا۔

بچی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا گورا گول مٹول معصوم چہرہ دیکھ کر دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ وہ اسے گود میں لے کر کھلاتے تو ان کے ماتھے سے پریشانی اور تردد کی لکیریں تھوڑی دیر کے لئے مٹ جاتیں۔ وہ غیر شعوری کشیدگی جو موہنی اور شنکر کے درمیان پچھلے چار پانچ مہینے میں پیدا ہو گئی تھی ایک حد تک دور ہو جاتی۔

اب ان کی زندگی میں پھر ایک ایسی چیز آگئی تھی جسے وہ مشترک طور پر پیار کر سکتے تھے۔ جس کے متعلق ہم آہنگی سے باتیں کر سکتے اور جس میں دونوں اپنے غموں کو بھلا سکتے تھے۔ ماحول کی کشیدگی کم ہو گئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ جذبات کی سطح پر تھا۔ حقیقت کی سطح پر حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ بچی کے ہونے سے اس طرح کے خرچ بڑھ گئے تھے۔ آمدنی کسی طرح نہ بڑھی تھی۔ تنخواہ آتی اور پچھلے مہینے کا حساب چکاتے چکاتے ختم ہو جاتی اور پورے اکتیس دن کاٹنے کے لئے صرف پندرہ روپے ہاتھ میں رہ جاتے۔ وہ تمام خواہشیں اور وہ تمام منصوبے جو وہ اگلے مہینے پورا کرنے کی امید سے باندھتے خاک میں مل جاتے۔ اور پھر تنگی اور کفایت شعاری اور من مارنے کا دور شروع ہو جاتا۔ اس تنگ حالی کے نشانات گھر میں بھی دکھائی دینے لگے۔ کمروں، تکیوں، چادروں اور پلنگ کی چادروں میں جوڑ اور پیوند نظر آنے لگے۔ جو گلاس یا پیالے ٹوٹ جاتے ان کی جگہ نئے نہ آپاتے۔ بچی کے کپڑے بنانے کی آرزو پرانی ساڑیوں کو پھاڑ کر اور ان میں سے بن پہنے کپڑے نکال کر پوری کی جاتی۔ آنے دو آنے کے خرچ پر میاں بیوی میں کھینچا تانی ہوتی۔ سینما اور تھیٹر کرنا یکسر بند ہو گئے۔ پیسے پیسے کا حساب رکھا جانے لگا۔ دونوں میں سے جس کا رشتہ دار یا مہمان آجاتا اس کی گویا شامت آجاتی ——— دونوں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ بدمزاجی اور چڑچڑاپن ان کے سبھاؤ میں رچ گیا ——— ہر وقت گھر میں یہی سنائی دیتا ——— کھانا ضائع نہ کرو، کپڑے نہ بگاڑو، کپڑے ہاتھ سے دھوؤ۔ کوئلہ کم خرچ کرو۔ غرض یہ کہ ذرا ذرا سی چیز پر روک ٹوک شروع ہو گئی۔ اب جب کبھی وہ ساتھ ساتھ بازار جاتے تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے اور ایک دوسرے میں مگن رہنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں دوسرے مرد عورتوں کے سوٹ، ساڑیاں، بلاؤز، اوور کوٹ، زیور، بالوں کے جوڑے کھٹکتے۔ زندگی کا سکون

غائب ہو گیا۔ محرومی کا احساس ہر لمحہ زیادہ شدید اور گہرا ہونے لگا۔ اور پیار کی وہ دنیا جس میں شادی کے بعد ایک سال تک وہ مسکراہٹ اور پیار کے دن گزارتے رہے تھے اب مکمل طور پر برباد ہو گئی تھی۔

شاید اس حد تک بھی موہنی زندگی کے مقابلے میں ڈٹی رہ سکتی تھی۔ لیکن زندگی نے اس کی صحت کو بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت تھکی تھکی رہتی۔ اس کی کمر درد۔ گھٹنوں میں جان نہ رہی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی کے دائرے سے پھیلتے اور سمٹتے۔ اس کی جلد کی سفیدی میں سرخی کے بجائے ہلدی جیسی زردی جھلکنے لگی۔ رخسار جو کبھی مسکراہٹ کی وجہ سے سدا دمکتے رہتے تھے، اب مرجھائے مرجھائے رہتے اور ہونٹ کنیر کی باسی کلیوں کی طرح بے رنگ ہو گئے۔

شیکھر کو موہنی کی گرتی ہوئی صحت کا احساس تھا۔ وہ جب دیکھتا کہ بلاؤز جو کبھی موہنی کے، تنگ تنگ کو اجاگر کر دیتے تھے، اب ڈھیلے ڈھیلے لٹکتے رہتے ہیں اور چوڑیاں جو کبھی موہنی کی کلائیوں میں چینسن کی ریکھاؤں کی طرح نظر آتی تھیں اب پونہچوں میں پڑی رہتی ہیں تو اس کی چھاتی میں گھونسا سا لگتا۔ وہ اس کو آرام پہنچانے کا پورا خیال رکھتا۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اور من مار کے اس کے لئے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ مگر مہنگائی اسے مات پہ مات دے رہی تھی۔ تنگی کر کے وہ جتنا خرچ کم کرتا تھا اتنا ہی چیزوں کے مہنگا ہو جانے سے بڑھ جاتا تھا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں سے بھی موہنی کی مدد کرتا اور اسے زیادہ سے آرام دیتا۔ کپڑے خود دھوتا بستر خود بچھاتا۔ دفتر سے آ کر بچی کو کھلاتا اور جب کبھی موہنی کی کمر یا اس کے سر میں درد ہوتا تو اپنی تھکن بھول کر گھنٹوں اس کا سر دباتا ——— لیکن اس کے قدموں کے نیچے کی زمین سرکتی جا رہی تھی۔ گھر کی حالت سنبھلنے میں نہ آتی تھی اور موہنی کے جسم کی ہڈیاں نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اسی طرح آرام اور خوشی کے لئے چھینا جھپٹی کرتے کرتے زندگی کے دو سال گزر گئے۔ اب ان کی حالت اس قدر تنگ ہو گئی تھی کہ کھانے میں تنگی کرنے کی نوبت آ گئی۔ گوشت کی بجائے اب ان کے ہاں دونوں وقت دال پکنے لگی۔ کوئی مہمان آ جاتا یا کچھ لینا دینا پڑ جاتا تو قرض سر پہ سوار ہو جاتا ——— زندگی کی چکی میں پستے پستے ان کے جذبات بھی سرد پڑ گئے۔ اب کئی کئی دن تک وہ ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔ انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ انہوں نے کئی دنوں سے ایک دوسرے سے باتیں نہیں کی ہیں۔ موہنی اپنے حلقہ میں گھومتی رہتی، شیکھر اپنے دائرہ میں گردش کرتا رہتا ——— رات کو دونوں اپنے اپنے جوئے سے کھلی پا کر نیم جان سے چارپائی پر پڑ رہتے۔ پیار کرنے کو، چاؤ سے باتیں کرنے کو، دیکھ کر مسکرانے کو، زندگی میں کچھ نہ رہا تھا۔ چاند ان کے لئے بجھ گیا تھا اور تارے ان کے لئے چیچک کے سوکھے ہوئے داغ بن گئے تھے۔ اب ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ گھر میں چلتے پھرتے، کام کرتے، پڑ کر سو جاتے۔ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ منہ سے نکل جاتا۔ چونک کر نگاہیں مل جاتیں مگر راکھ کی چنگاری کی طرح صرف ایک لمحہ کے لئے ——— پھر وہی غیریت ——— بے حسی ——— مٹیالی مُردنی۔

اسی غیریت، بے حسی، مٹیالی مُردنی کے سائے میں موہنی دوبارہ حاملہ ہو گئی ——— زندگی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ موہنی کے جسم میں بچہ جوں جوں پرورش پانے لگا موہنی کے ہونٹوں کی خشکی، آنکھوں کا پھیکا پن اور رگوں کا نیلا پن زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ جسم نے اس دوسری جان کو سینچنے سے انکار کر دیا۔ موہنی نے کھاٹ پکڑ لی۔ بچہ ہونے سے پہلے ہی حرارت رہنے لگی۔ بچہ ہوا تو بخار نے آ دبوچا۔ بخار جڑ پکڑ گیا۔ اور موہنی کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہو گئی۔ اور ایک دن ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا "موہنی کو دق ہو گئی ہے"۔

موہنی کمرے میں پڑی تھی۔ شیکھر اور اس کی بہن جو تیمارداری کے لئے آئی ہوئی تھیں، نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کمرے ہی میں نہیں بلکہ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ پاس ہی پالنے میں بچہ پڑا سو رہا تھا ——— "میرا لال، میرا چاند ——— کیا میں اپنے چاند کو اپنی گود میں لے کر نہ کھلا سکوں گی، جس کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ کیا اسے بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں گی، نہیں نہیں! میں نہیں مروں گی۔ میں جیوں گی! ——— میں نے اس دنیا میں ایک نئی زندگی کو جنم دیا ہے۔ کیا دنیا اس کے بدلے مجھے میری زندگی کا دان نہیں دیگی؟ مجھے میری زندگی کا دان دیا جا سکتا ہے۔ میرا علاج کر کے، مجھے اچھی غذا دیکر، ہوا اور روشنی دیکر۔ یہ میرا حق ہے۔ میرا حق مجھے ملنا چاہئے۔

——— میرا حق مجھے ملنا چاہئے!" اس کی آتما پکار اٹھی۔

لیکن اس کی آتما کی پکار کسی نے نہ سنی کیونکہ کمرے میں کوئی نہ تھا، اور کھڑکیاں اور روشندان بند تھے۔

جیلانی بانو

موم کی مریم

آج بھی اندھیرے کمرے میں بیٹھا میں خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔

اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہو؛ اور مجبوراً مجھے جلے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح تمہیں بھی زمین پر جھٹک دینا پڑتا ہے۔

میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کبھی تمہارے اوپر نظمیں نہیں لکھیں۔ کبھی تمہاری یاد میں تارے نہیں گنے۔ پھر کیوں میں تمہیں یاد کئے جاؤں ــــــ؟

زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اس رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ میں جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی۔ پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے مرتے ہوئے جذبے جگانا چاہتی ہو ــ؟

آج صبح عائشہ کے خط سے مجھے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ مگر میں اس موت پر اظہارِ افسوس نہ کر سکا۔ روز نہ جانے بنا برسے کتنے بادل گذر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں، کتنے انسان ایک لمحہ کی خوشی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کتنی ہی بار ہو چکی ہے، اگرچہ ظاہری طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔

جب سے میں نے عائشہ کا خط پڑھا ہے میرے خیالات کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتے پھرتے ہیں اور نہ جانے کیوں بہت سی دھندلی دھندلی یادیں جھلملانے لگی ہیں اور اس اندھیرے اجالے میں بہت سے چہرے غلط ملط ہو گئے ہیں۔

مگر میں اس وقت تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہاری جانی پہچانی سسکیاں مجھے تمہاری موجودگی کا یقین دلا رہی ہیں، تو میں اسے واہمہ کیسے تصور کر سکتا ہوں ــــــ؟

تمہارا اور اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ تم زندگی بھر جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گُل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں اسیر کئے رہے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصوّر نے نور کا ہالہ کھینچ دیا ہے۔ عصمت، تقدس اور معصومیت کی لکیریں، جن کے اندر پاک مریم کی روح کو

محصور کر دیا گیا ہے۔

اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے آنسو یوں چمک رہے ہیں جیسے پرامید بچہ ہن نے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چھوڑ دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اُجالے کی امید قائم رکھی ہے ——— ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشن چراغاں مناتے آئے ہیں ———

تمہارے متعلق لوگوں نے کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں وہ بالکل سطحی تھیں اور اسی لئے میں نے حقیقت کی سطح پر اتر کر تمہیں سمجھنا چاہا تھا۔ تم کیا تھیں! اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت سے دلوں میں امید کی کرن چمکا کر غائب ہو جائے ——— ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑا دینے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گاہکوں کی لمبی فہرست سمیت خود ہی میرے کمرے میں آگئی ہو تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام سی لڑکی ہونے کے باوجود دوسروں سے اس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئی تھیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا۔ مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکاندار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دکان پر رکھ جائے ——— شیشے کے کیس میں بند رہنے والی گڑیا ——— آج تم اتنی صاف صاف باتیں سن کر حیران ہو رہی ہو۔ جبکہ تم نے اپنے آس پاس کے شیشِ محل چکنا چور کر ڈالے تھے اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آنگن میں دھما چوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

"اونہہ مت روکو نگوڑی ماریوں کو ——— کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں۔ کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہو گا" اس تیت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کا پورا فلم دیکھ ڈالا تھا۔

جب تم کسی ناصر یا شاہد کلرک سے بیاہی جاؤ گی اور آنسو پونچھتے ڈولے میں سوار کرائی جاؤ گی۔ پھر ہر سال ایک ننھے منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ساتویں یا آٹھویں ننھے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی۔ ہر لڑکی انہی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے۔ مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈھنا چاہا جس کی سزا میں موت و زندگی تم پر حرام ہو گئی۔

تم منجھلے چچا کی دسویں یا گیارھویں اولاد تھیں ——— پھر نامراد لڑکی ——— "اونہہ لڑکی ہے تو کیا ہوا ——— نصیب اچھے ہوں ——— لڑکے کون سا خیفتی پہنچاتے ہیں ——— ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہوتی ہے۔"

اور اپنی موت کی نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہی کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔

اپنے اردگرد کے ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت کی نظروں نے خودی کا احساس بیدار کیا اور تم نے کچھ کرنے اور کچھ پانے کی قسم کھا لی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل، بد دماغ، بدصورت اور مغرور ——— دن بھر تمہیں ان ہی خطابوں سے یاد کیا جاتا مگر تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اِترا اِترا کر گھتی رہیں ——— جو میرے پاس ہے وہ رانی کے محل میں بھی نہیں۔

اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئیں جس کے غالب کے شارحین کی طرح ہر ایک نے الگ معنی نکالنا چاہے مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہ تک پہنچ سکے۔

اور میں نے بہت دور رہ کر ہی تمہیں سمجھنا چاہا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا کبھی اس قدر نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پا سکوں۔ پھر بھی میں نے اس شعر پر کافی ریسرچ کی، دماغ کی لیبارٹری میں دو سال تک تجربے کئے مگر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

ایک بار مجھے اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا:

"احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں، اور یہ نہیں چاہتی کہ گونگوں کی رسوائی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں ——" مگر یہ کتنا بڑا حزنیہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوئلوں کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی سے ملوث نہ ہوں —— نہ میری بہت عزت کرتی تھیں —— ایک نوجوان مرد کی —— جو تمہارے ذرا سے سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا —— جس نے تمہاری اٹھارہ سال کی زندگی میں مسلسل فریب دیئے تھے، جس نے تمہیں منزل کے قریب لا کر بھٹکا دیا تھا۔ بدنامی کی کوٹھڑی میں دھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں اور بیچ چوراہے اپنے سب ظاہری بندھن توڑ ڈالے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں اور میں تمہیں سمجھنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ جذبات کے انگشن قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا ایک دن میری خودداری اور عزت تمہارے قدموں میں پڑی بخشش کی طلبگار ہوتی اور تم اٹھر کی طرح مجھے ایک چٹان پر چھوڑ کر کہتیں:

"میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے چھونے سے پہلے، نئی بلندی پر پہنچ گئی کہ جب تم وہاں پہنچے میں سراب بن چکی تھی۔"

گھبراؤ نہیں۔ تم نے یہ الفاظ ٹھہرایا۔ آنکھ سے خود نہیں کہے مگر آج تک انہوں نے کون کون سی باتیں زبان سے کی ہیں تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے۔

صرف اٹھارہ سال کی زندگی میں تم نے اتنی ساری باتیں کیسے کہہ لیں۔

بظاہر تم کتنی معمولی تھیں —— چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہرائے ہوئے بال جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد دائرہ سا بنائے کانپتی رہتیں۔ معمولی ساقد —— دبلا پتلا، دھان پان جسم جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لے جائیں گے، جیسے تمہاری جانب ہاتھ بھی بڑھایا تو چھوئی موئی کی طرح کملا جاؤ گی —— ایک دائرہ —— ایک ادھورا خاکہ —— کتنے ہلکے ہلکے تھے تمہارے خدوخال پتلے پتلے یہ لب جو ہمیشہ سرد مہری سے بند رہتے، ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں جو اپنے سارے گناہ آشکار کرنے کو تیار نہیں، وہ اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں، تاکہ ان کی گہرائیوں کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔ اور ہر لمحہ بدلنے والا رنگ جو کبھی شعلے کی طرح دہکنے لگتا، کبھی راکھ کی طرح میلا پڑ جاتا۔

اور جب باتیں کرتیں تو تمہارے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہ آتی کتنی مشکل بات تھی تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا۔

اس معمولی سی شکل و صورت ہی نے تمہیں گھر میں ایک ناقابلِ التفات چیز بنا دیا تھا۔ اپنی خوبصورت سمارٹ بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ خرید و فروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی ہی فائدہ اٹھاتی ہے۔ —— اور یہ خیال چچا اور چچی کے لئے سوہانِ روح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔

تم اس وقت نہا کر آئی تھیں۔ نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی، سویٹر کا ایک نمونہ بنا بنا کر ادھیڑ رہی تھیں۔ نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔ چچا پیچھے بیٹھی نئے نئے نمونوں میں دھاگے پرو رہی تھی۔ اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے، بھیگے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ کوئی تشبیہ دماغ میں نہیں ابھری۔ عائشہ، نسرین اور فرزانہ کے فروزاں حُسن نے وہاں تمہارے چراغ کو ٹمٹمانے نہیں دیا —— کتنی کمتر تھیں تم اپنی مغرور اور اپنے حُسن پر خود ہی مرنے والی بہنوں کے حلقے میں —— اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حُسن کے اس جمگھٹ میں تمہاری کہانی کتنی مختصر اور پھیکی ہوگی۔

ان ہی دنوں مسلسل بیکاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کر دیا تھا اور گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار رہا تھا تو عائشہ کا خط پڑھ کر پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا ——— تم لڑکیوں کو خط لکھنے کر بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔ عائشہ کے خط بھی اسی کی طرح خوبصورت اور معصوم ہوتے تھے جن میں وہ ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے، زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی سہیلیوں کے رومان تک ——— سب کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتی۔ ساتھ ہی وہ مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی ——— میری بے وقوف بہن نہیں جانتی تھی کہ میں رومانوں، سرگوشیوں اور رنگینیوں کی دنیا سے کتنی دور تھا مگر وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود ایک ہنگامہ پرور گھر کے کمرے میں بیٹھی بار بار منہ پر جھک آنے والی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر لکھتی رہی ——— "آپ نے ایک اور خبر سنی بھائی جان؟ قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود آگسان سے کہہ دیا کہ وہ امجد سے شادی نہیں کرے گی۔

سنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں اور سارے خاندان میں کھسر پھسر ہو رہی ہے۔"

اس دن بہت دنوں کے بعد میں جیل کی تنہا کوٹھڑی میں مسکرا سکا۔ اس دلیرانہ جرأت پر میں نے غائبانہ طور پر تمہاری پیٹھ ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہا کہ فوراً چچا ابا کو زہر کی ایک شیشی بھیج دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔ تم پھر ایک بار میرے سامنے آ گئی تھیں۔ جھنجھلا کر سویٹر ادھیڑتی ہوئی۔

پھر میں اس واقعے کو بھول گیا۔ عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے ——— اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی۔ لیکن ریاض تمہارے ہاں کا لے پالک تھا، تمہارے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس کی سن گن ملی تو ریاض گھر ہی سے نہیں شہر ہی سے نکال دیا گیا اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا ——— لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ مردار کھانے والے گدھ جو ایسے موقعوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، اس لاش کو باہر کھینچ لائے، جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا اور پھر اسے چیر پھاڑ کے پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے خوفناک معنی پہنائے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے کمرے ہی میں نہیں پڑی رہتیں بلکہ ریاض کے ساتھ فرار ہو چکی ہو۔

یہ باتیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سنیں اور ہر بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابلِ یقین بات بھی تو نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کے اپنی من مانی کرنے کا عزم کر لیا تھا ——— پھر تم جیسی محبت کی ماری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا کیا ثبوت دے سکتی ہیں ———؟

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا ایک اہم موضوع بن چکی تھیں یا عائشہ کے الفاظ میں کچھ کر دکھانے کی دھن میں پندار اور وقار بھی کھو بیٹھی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے بھی محبت کر چکی تھیں جو تمہیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک سیدھا سادا، خطرناک حد تک شریف انسان، جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں شرافت اور عزت کے سبق پڑھائے۔ اپنی بے چارگی اور دکھ کے افسانے سنائے، اس کی محبوبہ نے اسے دھوکا دیا تھا محض غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا (یہ مجبوریوں کے دھوکا دینے کا دکھڑا بھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے؟) پھر اس کی پیاسی دنیا میں تم نے اپنی ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے طرزِ عمل سے اس کا دکھ کم کرنا چاہا، اپنے غم کی کہانی بھی اسے سنا ڈالی ——— پھر کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسلی اور تسکین کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

پھر تمہارا ماسٹر بیمار ہو گیا اور چچا ابّا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تم اسی ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں اور اس کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر جانے پر مُصر تھیں۔

یہ ساری باتیں گھر کے چھوٹے بچوں تک نے مجھے سُنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں تھی، صرف ہمدردی تھی۔ یہ انسانیت کا جذبہ ہی تھا جو تمہیں ایک رات چپکے سے اٹھا کر ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم ابھی دروازہ ہی کھٹکھٹا رہی تھیں کہ چچا ابّا کے ڈنڈے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئیں۔

پھر مہینوں گھر والے تمہارے سائے سے اچھوتوں کی طرح بچتے پھرے۔ گھر کی لمبی لمبی ناک والی عورتوں نے خاندان میں نکلنا چھوڑ دیا۔ چچا ابّا نے وقت سے پہلے پنشن لے لی اور سارے خاندان کے ماتھے پر تم کلنک کا جھومر بن کر لہرانے لگیں اور بیچ آنگن میں کھڑی ہو کر تم نے اپنی اماں سے کہا کہ امّی جو میرا جی چاہے گا کروں گی یا پھر آپ لوگ مجھے مار ڈالئے۔ پھر سب نے دوسری بات سے اتفاق کر لیا۔ یعنی تم مار ڈالی گئیں۔ سب نے تم پر فاتحہ پڑھا۔ لیکن شمیم ماموں اس فاتحہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسرا زخم بھی بھرنے لگا تھا پھر شمیم ماموں کی نازبرداریوں نے اسے مٹا ڈالا تھا ——— وہ تم پر بہت مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی،

"شمیم ماموں کی عذرا تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے جیسی ان کی لڑکی ویسی قدسیہ" پھر کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مر جانے دیں گے شمیم ماموں، مدتوں سے اپنی بیوی بچوں سے قطع تعلق کر کے اکیلی زندگی گزار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساڑھی نہ باندھ سکیں۔ ایک بار مجھے عائشہ نے لکھا تھا کہ تم بہترین ساڑی باندھنے پر اسکول سے انعام لے چکی ہو۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں سیر کرانے لے جاتے تمہارے صدقے میں سارا گھر سینما دیکھتا، پکنک پر جاتا۔ تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابّا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس لئے بچارے شمیم ماموں، اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کے، بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے اور عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے۔

سب کے ٹھکرائے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کے برابر میں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی دیکھی نہ گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کر دیا ہو۔ مگر تمہاری روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نگاہیں پھر تمہارے چہرے پر گڑ گئیں ——— ایک رات جب شمیم ماموں تمہیں پڑھا رہے تھے۔ کمرے میں کچھ شور سا ہوا۔ پھر تم بغیر دوپٹے کے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئیں اور پلنگ پر گر کے رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگا۔

چچی نے تمہارے کمزور جسم پر اپنی دانست میں بڑے زوردار دھماکے رسید کئے اور بہت سی مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔ جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا:

"میں جدھر بھی جاؤں سب مجھی کو بُرا کہتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اتنا کمینہ ہے"

اور مجھے ہنسی آگئی ——— کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا، ماسٹر نہیں ہوتا، شریف نہیں ہوتا، صرف کمینہ ہوتا ہے جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔

شمیم ماموں نے سوچا ہو گا کہ اگر ریاض یا ماسٹر تمہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔ جبکہ وہ کسی ناطے رشتے سے تمہارے فرضی ماموں بھی بنے ہوئے تھے۔

پھر تو ان کی بیوی نے شہر بھر میں یہ خبر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے بوڑھے مردوں کو بھی بھٹکا سکتی ہو۔ پھر کسی میوزیم میں رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی ممی کی طرح تم ایک نمائش کی چیز بن گئیں۔ لمبی لمبی چوٹیوں کو چھلا لگتی ہوگی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی۔ عورتیں دور دور سے بچے کولہوں پر ٹکائے، ناک پر انگلیاں رکھے تمہیں دیکھنے کو آتیں، مردوں کی محفلوں میں بلند قہقہوں اور فحش گالیوں کے درمیان تمہارا نام آ جاتا تو خود بھی اس نگلنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی۔

اظہر اسی مالِ غنیمت کی امید میں آیا تھا۔

میرا چھوٹا بھائی جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا، کالج سے نکالا دیا گیا تھا اور متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا تھا کہ اسے کوئی اپنی بیٹی نہ دے گا۔ متوسط طبقے کا ایک بیکار نوجوان جس سے سب لوگ مایوس ہو گئے تھے۔

باہر کی تفریحوں کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو مشہور ہے کہ صرف اظہر کی وجہ سے اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے اور وہ میکے میں دن گذار رہی ہے۔

مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہ لوٹا۔

ساری دنیا سے دھتکارا ہوا لبے رحم، منہ پھٹ، چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا اظہر جسے ابا روز گھر سے نکال دیتے، امی کوسنے دیتیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی ——— اگر بہنوں کے بھائی قابلِ فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں۔ خوبصورت کم ہو بھائیوں ... بھروسے پر ہی تو وہ کتنی ہی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں اور عائشہ کی ساری توجہ مجھ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے میری خشک اور بے لطف زندگی میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔ مگر پھر بھی میری شخصیت کو گھر میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔

تمہاری بارگاہ میں اظہر کو کیسے شرفِ نیاز بخشا گیا، یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی۔ وہ تو صرف اپنے خوبصورت جسم، دو سے باک آنکھوں سے معرکے سر کرتا تھا اور تم نے ہمیشہ بجھے ہوئے دل اور بیدار ذہن تلاش کئے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بیکار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانا چاہی۔ مجھے گھر میں رہنے کا اتفاق بہت کم ہوتا، خصوصاً تم سے تو کبھی بے تکلفی سے بات بھی نہ کر سکا تھا۔ اس لئے ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم بہت دور رہتے۔ تم ہمیشہ مجھ سے چھپنا چاہتیں۔ کیونکہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کر دی تھی۔ اس دن ہماری ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ تم شاید میری سنجیدگی یا اپنے عائشہ سے پہلے ہی سن چکی تھیں اور مجھ تک اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کر رہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلو ڈالے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری جانب بڑی بامعنی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"بھائی جان! دیکھئے یہ ہیں قدسیہ" ——— عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے بیچ میں سے ہی پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر شکستہ لہجے میں کہا۔ "تو احمد بھائی بھی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟"

اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

پھر برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پر کیف بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک فیض کی "نقش فریادی" پڑھنے کے بعد میں حسبِ عادت سگریٹ کے دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔

عائشہ، پروین، چھوٹی بھابی اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زوردار بحث کر رہی تھیں جس میں ایک ہیرو دو لڑکیوں سے محبت کرتا ہے اور ڈائریکٹر ہر بار اس محبت کو سچی محبت بنانے پر مصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بوالہوسی۔

تم ان کے قریب والی کرسی پر بیٹھی سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں جن کی بہت سی شعاعوں نے مل کر تمہارے چہرے پر

مشعلیں سی جلا دی تھیں۔

اپنی رائے کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے عائشہ نے مجھ سے پوچھا:

"آپ بتائیے بھائی جان! کیا محبت ایک بار سے زیادہ کی جا سکتی ہے؟"

اور میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا: "قدسیہ سے پوچھو۔"

تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رُک گئے۔ چہرے پر جلتی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور تم گہری شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بھابھی اور پروین آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں، فرزانہ بات ٹالنے کو گنگنانے لگی اور عائشہ نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زرتار لباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم کا شعر مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں۔ فیض کے دلنشیں شعر ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہو گئے اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہو رہا ہے!"

"ہوں ہاں"

"جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جاؤں۔"

"تو جائیے۔" تم حسبِ عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

"مگر کوئی ساتھ چلنے والا جو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر نہیں آیا۔ کتنا غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہو گیا ہے یہ لڑکا ——"

جان بوجھ کر اطہر کی بُرائی کر کے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈا۔ تمہاری آنکھیں سامنے کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ ٹیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف۔ پھر بڑے طنز سے تم نے کہا:

"اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ آپ لوگ تو انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا۔"

یہ تم کہہ رہی تھیں ـــ تم! جس کے متعلق مشہور تھا کہ سارے خاندان کی عزت جوتے کی نوک پر اچھال کر تم اطہر سے شادی کرو گی۔ سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو۔ وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔ اتنے بُرے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں جبکہ پچھلی زندگی میں کئی قابلِ اعتبار مرد تمہیں دھوکا دے چکے تھے۔

تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی اچھی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اسے میں نے اپنے دماغ سے کھرچ دیا۔ تم سب کے لئے ناقابلِ فہم بن گئی تھیں۔ بھول بھلیوں کے پیچیدہ راستوں کی طرح تم نے اپنے مکر و فریب کے جو جال بچھا رکھے تھے انہیں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔ پھر ایک دن بڑی سوچ بچار کے بعد میں کچھ بوکھلایا ہوا سا تمہارے کمرے میں آیا۔

"میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ! اگر تم مجھے اجازت دو تو ——— تو" ——— اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔ اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار ڈر کی پرچھائیاں دیکھیں جن پر حیرانی غالب تھی۔ تم یوں کھڑی ہو گئیں جیسے شمیم مامون تم پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کے کہا:

"آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ پھر آپ کیوں کوئلوں کی دلالی میں اپنے ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں۔"

اور تم پیچھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئی تھیں۔

ان ہی دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا جو تم نے ریاض کو لکھا تھا مگر اسے بھیج نہ سکی تھیں یا شاید اسے بھیجنے کو لکھا ہی نہ ہو کیونکہ یہ صرف تمہاری روح کی پکار تھی جس کو ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سمجھ سکتا۔ اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب تھا اور

اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔ بارش بہت زور کی ہو رہی تھی اور درختوں سے نیچے گرنے والے قطروں کو بچے ہاتھوں میں روک کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں بھابی کا چھوٹا بچہ راشد ناؤ بنانے کو ایک کاغذ لے کر آیا۔ یہ نیلے کاغذ پر لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا خط تھا۔ نیچے تمہارے بہت ہی بگڑے ہوئے دستخط۔ وہ خط راشد تمہاری اٹیچی سے نکال کر لایا تھا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لئے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔ ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا ایک نکما انٹلکچوئیل —— تمہارا یہ خط بہت سی ڈھکی چھپی باتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں ریاض کو لکھا تھا کہ بچپن سے تم نے ہر دل میں اپنے لئے حقارت اور نفرت پائی اور صرف کسی کی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی تمہیں ریاض کی جانب لے گیا جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا دوسرا فرد تھا۔ ریاض کی نیاز مندی اور احساس کمتری نے اسے دوبالا کر دیا۔ گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔ پھر تم نے ہر قیمت ادا کر کے ریاض کو پانے کا تہیہ کر لیا مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ ابا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔ خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا —— بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ پہلے ہی میری عزت کون سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا بلند اور رشن ہے —— کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی جہاں تک خود میرا ہاتھ بھی نہ جا سکتا۔ اب میری روح اس وسیع سمندر میں اس تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

تو اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم —— جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں۔ کسی کی تیز نگاہوں سے سُلگ سکتی تھیں۔ پھر اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی اس بھیانک آگ میں تمہارے قدم کیسے نہیں ڈگمگاتے ——؟

دوسرے دن میں نے اطہر کو تمہارے سامنے خوب ڈانٹا۔

"کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے بعد کیوں نہیں آئے؟ کبھی تو تمہیں اپنے وعدے کا خیال کرنا چاہئے۔ میں یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور بقول قدسیہ کے جناب کسی بار میں پڑے رہے۔"

اطہر کے بے ساختہ قہقہے رک گئے اور وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑا پشیمان میرے پاس آیا۔

"اور اس نے میرے متعلق کیا کہا —— ؟ اسے میری عادتوں کی خبر ہے؟ کیا اس نے میری شکایت کی تھی۔ وہ بہت رنجیدہ ہو گی ——؟" زندگی میں آج پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی کی شکایت سننے کو تیار تھا، اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔

"یہ تو نئی بات ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ سے فریب دیتے آئے ہو اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے۔"

"آپ بھی اسے ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان!" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر اسے کچھ نہ دے سکوں تو اس کی بدنامیوں میں اضافے کا سبب بھی نہ بنوں۔ میں سچ مچ بہت برا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان ہی میں رہوں گا۔"

وہ باہر چلا گیا اور ایک بار پھر تم میرے سامنے نئی گتھیاں لئے آگئیں۔ اطہر کونسا راستہ اختیار کر رہا تھا!

وہ بے رحم انسان جو اپنے "او" کے آگے کسی پر رحم نہ کر سکتا تھا —— تم مجھے ایک کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں

چمک اٹھتے ہیں۔

"گناہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟"

پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ میں خود نہ دیکھ سکا۔ میری مسرت نیتیں مجھے کلکتہ کھینچ کر لے گئیں اور وہاں سے مجھے آندھرا کے علاقوں میں جانا پڑا اور آندھرا کی بیدار زندگی اور پُرجوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رینگتی ہوئی کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے بچھوٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔

ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نافرمانیوں کے سبب ابّا نے اسے عاق کر دیا ہے اور وہ گھر سے چلا گیا ہے اور معلوم ہوا کہ تم اچانک گھر سے غائب ہو گئیں اور کسی نے ایک بار مجھے بتایا کہ تم دونوں اب لکھنؤ میں رہتے ہو چچا ابّا اب تمہیں گھر بلانے پر تیار نہیں ہیں۔

اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سُنائی، مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب اطہر اپنا اثر سیدھا کرنے کو تمہیں بمبئی لے جائے گا۔ جہاں کئی برس تک ٹھوکریں کھانے کے بعد میں تمہیں ایک دن کسی فلم میں دیکھوں گا۔ ہیروئن کے پیچھے' ایکسٹرا اڑکیوں کے لچک مٹکاتے ہوئے کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہوگا' جو تمہارے مصنوعی چہرے' چھاتیوں' پنڈلیوں اور کمر کی نمائش کرے گا۔ تم ایک جھوٹ کا خول ہوگی' مسلولائیڈ کی گڑیا' جس کی ہر جنبش دوسروں کی بیع ہوتی ہے' اور تم اپنی خودداری کی لاش پر ناچ رہی ہوگی۔

ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان ہمیشہ یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے ——— مجھے تم دونوں کے نام سے نفرت ہو گئی عائشہ نے ایک بار لکھا تھا کہ قدسیہ دہلی کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکر ہو گئی ہے' اطہر بیمار ہے اور وہ دونوں بڑی تکلیف کے دن گذار رہے ہیں۔

لیکن میں نے بڑی سختی سے اسے لکھ دیا کہ میں اب قدسیہ کے متعلق کچھ سُننا نہیں چاہتا۔ اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی اتنی ہی تعجب خیز بھی تھی۔ وہ کسی کی شادی کی خبر سُن کر بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "ایک ہی راگ مسلسل لوگ کیسے سُنے جاتے ہیں۔ میں تو دو ہی دن میں پاگل ہو جاؤں۔"

پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سُنا؟

امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں' ان کی زندگی کے دونوں کڑوے پھل گئے۔ میں تو خیر اپنی خطرناک زندگی سے انہیں کوئی فیض نہ پہنچا سکتا تھا مگر ابّا یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی قسمت اچانک پلٹا کھائے' وہ کوئی اچھی ملازمت حاصل کر لے۔

پھر امی کے آنسوؤں نے ابّا سے خط لکھوا دیے جس میں اطہر کو اپنی خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور تمہیں اطہر کی محبت کا۔ اور آج عائشہ نے لکھا ہے ——— "بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہئے کیونکہ آئندہ اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہوگی جو میں آپ کو سناؤں گی۔ آج اطہر بھائی کو ابّا تنہا گھر لے آئے ہیں' قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے۔"

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔ یہ ہم دونوں کی اپنی اپنی ذہنیت کا قصور ہے' اور مرمنہ کرو ——— تمہاری آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو کیا کہہ رہے ہیں؟

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا ——— اطہر سے بھی نہیں۔ مجھ سے بھی نہیں جو تم سے نفرت کرتا رہا۔

تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہیں بہانا چاہئیں کیونکہ تم نے اطہر کو وہ تحفہ دے دیا جس کے لئے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں۔ اب تمہاری روندی ہوئی سسکیاں اور جھلملاتے آنسو ہی مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

تم آج گھٹی گھٹی آہوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لئے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو، مگر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ جلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر' تمہارے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دوں۔

———

انورِ عظیم

لڑھکتی چٹان

رات بھر بادلوں کے گرجنے کی آواز آتی رہی۔ جیسے اونچی اونچی پہاڑی چوٹیوں سے مسلسل بڑی بڑی چٹانیں پھسل رہی ہوں، لڑھک رہی ہوں۔

تنگ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس اندھیرے میں تمام رات چمگادڑ پھڑپھڑاتے اور دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔ شاہد اپنی بیوی کے لچھے دار نرم بالوں میں اپنا منہ لپیٹے پڑا تھا۔ بالوں سے تل کے تیل کی ناگوار خوشبو نکل کر اس کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی اس کی بے خواب کملائی ہوئی روح میں تیرتی، گھستی اور رستی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ناک سے چھوٹتی ہوئی زہریلی سانسیں بالوں کے گھونسلے میں گرمی بھر رہی تھیں۔ اور اس کا تھکا ہوا چہرہ اس گھونسلے میں ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور جب پہلی بار اس کی نظریں دریچے کے کھلے ہوئے شیشے سے باہر گئیں تو اندھیرے کا رنگ پھیکا ہوتا ہوا نظر آیا۔ مدھم مدھم! جیسے ہر چیز دھواں دھواں ہو رہی ہو۔ کمرے نے وسم آنوں میں اڑتی ہوئی بھاپ کا طوفان سا اٹھا رکھا تھا۔ اسے ہر چیز خواب میں کھوئی ہوئی، رکی دبی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اس کے حلق میں کھٹی کھٹی کوئی چیز رقیق سی پھنسی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے وہ جلے ہوئے پیاز اور سرکے کو چاٹ رہا ہو۔ اس کی طبیعت میں مالش سی ہوئی۔ اس نے اپنا ذہن دوسری طرف پھیرنا چاہا! لحاف کے اندر سر گھسیڑ کر اس نے ایک کرب کے سے عالم میں ثروت کے بالوں میں چھپے ہوئے چہرے کو اپنے چہرے سے قریب کیا اور اس کے ٹھنڈے لبوں کو چوس کر آہستہ سے بولا ــــ جیسے نشے میں ہو! جیسے اس کا تیزابی نشتر ٹوٹ رہا ہو۔

"میری جان، میری ثروت، صبح ہو رہی ہے! آخر صبح ہو ہی گئی۔ آخر صبح ہو ہی جاتی ہے۔ یار خاں کا باپ بھی صبح کو نہیں روک سکتا..... میری ثروت، میری جان......"

ثروت کے ہونٹ شاہد کے تھوک سے گیلے ہو گئے تھے۔ اور وہ شبنم میں نہائے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ٹھنڈے تھے۔ زندگی اور سپردگی کی آنچ سے خالی، شاہد کے لب..... جن سے سڑے ہوئے سرکے اور جلے ہوئے پیاز کی بو آ رہی تھی، بے طرح جل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں میں بجھتے ہوئے انگاروں کی راکھ کسمسا رہی تھی۔ ثروت کا جسم گرم تھا! پالتو بلی کے جسم کی طرح نرم۔ آنکھیں بند تھیں، ہونٹ پھر بھی شل تھے۔ شاہد کو محسوس ہوا کہ وہ شعلوں کے دریا میں بہتے بہتے ڈوبنے لگا ہے۔ شعلوں کا دریا جم کر برف بن گیا ہے۔ اور اس کے منہ میں برف کی دو قاشیں ایک

دودھ سے بھری ہوئی، چھپی ہوئی تھیں۔ کیا وہ ثروت ہی کے ہونٹ تھے۔ پھر ان میں وہ آگ کیوں نہ تھی جس میں اُس نے اپنی ساری زندگی کو، زندگی کے سارے رس کو، شعور کے تمام آدرشوں کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔

منی جاگ پڑی۔ ثروت نے اُس کی طرف کروٹ لے لی اور منی کے پوپلے منہ میں اپنی ٹھنڈی چھاتی ڈال کر اُسے تھپکنے لگی۔

شاہد کو اپنی منی کا یہ دخل در معقولات بہت بُرا معلوم ہوا۔ اس کو اپنی تنہائی اور محرومی کے احساس نے آ دبوچا۔ نیم غنودگی کے عالم میں وہ ایک خواب کے ریلے سے گزر گیا۔ ٹائپ رائٹروں کی آواز۔ سپرنٹنڈنٹ کی منحوس کھنکتی ہوئی ڈانٹیں۔ عینک کے شیشے کو توڑ کر جھپٹتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کی کمین گاہ میں چھپے ہوئے کتنے گدھ، کتنی چیلیں، دوسری طرف ہیڈ اسسٹنٹ کا رعب، اس کے سڑے ہوئے دانت، سڑی ہوئی بدبودار مسکراہٹ، مسکراہٹ کی جھریوں میں پھیلتا ہوا، رینگتا ہوا رحم، چھچھورا پن، احساس برتری ــــ "تم اب تک دفتر کا کام نہیں سمجھ سکے۔ ان فائلوں کو دیکھ کر ریکارڈ ٹھیک کر لو، ہاں! مسٹر معشوق کے دوپٹے اور سرکاری کام میں بڑا فرق ہے۔ نوکری نوکری ہے۔ دعوت کی میز پر رکھا ہوا کیک مکھن کیک نہیں ہے۔ طلائی، ملائی، اوں، اوں ــــ ہو ہو ہو ــــ" سپرنٹنڈنٹ اسے اسی طرح دھمکایا کرتا تھا۔ اور وہ اپنی سانسیں پھیپھڑوں میں لیکر زینے پر سے اُترتے ہوئے اپنے آفس کے کمرے میں پہنچتے پہنچتے دانت پیس کر کہتا، "معشوق کا بچہ، دوپٹے کی اولاد، کیک کا سالا" ــــ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ بے بسی سے اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی فائلوں کو دیکھتا۔ ان پر رینگتے ہوئے اعداد کے کچھوؤں کو دیکھتا جو خرگوش سے بازی لگا کر تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ٹائپ رائٹروں کے منقروں سے کھٹ کھٹا کھٹ کا نغمہ چھنتا رہتا اور اس کی روح کے پرخچے اڑتے رہتے۔

گذشتہ شام کو ہی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے کہا تھا: "مسٹر تم دیکھنے میں آدمی انٹیلی جنٹ معلوم ہوتے ہو لیکن تمہارے کام سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ تم ٹمپریری کلرک ہو۔ اگر تم نے کام اچھا نہیں کیا تو تم ہی بتاؤ ــ"

وہ پوری بات سنے بغیر ہنستا ہوا نکل آیا تھا۔ فائلوں کو میز پر پٹک کر اور صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر غٹا غٹ اتار گیا تھا۔ روز کی دھمکی، روز کی دھونس، نوکری کی ایسی تیسی۔ چپراسی اُسے گھور رہا تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا۔ "بابو جی یہ کالا صاحب بڑا کائیاں ہے۔ بخرا مانگتا ہے۔ مچھلی، کھلونے، مٹھائیاں!"

شاہد نے بڈھے چپراسی کا منہ دیکھا۔ وہ تین بار اپنے پھٹے ہوئے گرم کوٹ اور دیمک کھائے ہوئے مفلر کو مٹھیوں میں بھینچتا اور سکریٹریٹ کی اژدہا نما زرد عمارت سے نکل کر باہر چلا آیا۔

ابھی سڑک پر ہی پہنچا تھا اور بڑے پھاٹک سے باہر نکلنے والا تھا کہ ایک وزیر کی فاسی کار پھرپھراتی ہوئی نکل گئی۔ یکہ رُکا اور اُس میں سے قربان ہوٹل کا مالک نکل پڑا۔

"کہیے شاہد صاحب! آپ نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے"

شاہد کا دم گھٹنے لگا۔ یہ بجلی کہاں سے گر پڑی۔ "آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کب تک میں کمرے کا کرایہ بھرتا رہوں گا۔؟"

"بس اب کے ضرور دے دوں گا۔ میں تو خود ہی آپ کے یہاں آنے والا تھا۔ اور کہیے سب خیریت ہے نا؟"

"آپ کی دعا ہے۔ مگر دیکھیے اب کے وعدہ خلافی نہ"

"توبہ کیجئے ــ" اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مفلر کو مسلتا رہا۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی موت سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

اس سے جان چھوٹی تو اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ کئی مہینے سے اس ہوٹل والے کو جُل دے رہا تھا۔ اُس نے اس سڑک پر چلنا چھوڑ دیا تھا جس پر وہ ہوٹل تھا۔ اسی لئے وہ بس سے نہیں جاتا تھا۔ بس ہوٹل کے سامنے رُکتی تھی۔ اور روز خطرے کے منہ میں سے گزرنا اس جیسے مرد میدان کا کام نہ تھا۔

وہ پُرانے شہر سے بسیں میں روانہ ہوتا اور وقت سے کافی پہلے روانہ ہوتا اور یہاں آکر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ اس کی اس مصیبت کی وجہ سے اس کی ......
بیوی کو سویرے سویرے اس کا کھانا پکانا پڑتا۔ وہ اسے بار بار کہتی تم بس سے کیوں نہیں جاتے۔ لیکن وہ اس کے مشورے کی اہمیت کو حسبِ معمول بہت سی مرعوب کرنے والی باتیں کرکے دبا دیتا تھا۔ بس کیا ٹھکانا تھا۔ اکثر پٹرول ختم ہو جاتا ہے! اور بس راستے میں بچہ جننے لگتی ہے۔ اب ایسے میں ——— خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ آفس میں میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کام بڑا پختہ کرتا ہوں اور اب کے چانس ہے ، سپرنٹنڈنٹ ہونے کا۔ میں کسی طرح آفس دیر سے پہنچ کر بدنام ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ذرا کبھی کبھار پودینے کی چٹنی تو بنا لیا کرو ۔۔ بڑا روکھا کھلاتی ہو ——" ثروت کا ذہن بس سے ہٹ کر روکھے کھانے اور پودینے کی چٹنی کی طرف چل دیتا۔

ہوٹل کا قرض تو اس پر اخبار کی نوکری کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اخبار کی نوکری بھی خوب تھی۔ ایڈیٹر نے ایک وزیر کے اشتہار کا ٹھیکہ لے رکھا تھا وہ روپے دیتا تھا۔ زیادہ بڑا حصّہ تو خود ایڈیٹر کے پیٹ میں چلا جاتا تھا۔ تھوڑے سے حصّے میں کاتب ، چپراسی ، کلرک اور شاہد جیسے مترجموں کی روٹی کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک کا پیٹ بھرتا تو دوسرے کا خالی رہتا۔ اور پھر شاہد پر ایڈیٹر کا احسان ہی تھا۔ وہ تو کہتا تھا محض مروّت میں اس نے اس جیسے ہونہار نوجوان کی فاقہ کشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور اسی لئے ترجمہ اور اداریہ سے لے کر کاپی جوڑنے کا کام تک اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ اپنی میلی قمیص اور بوسیدہ پاجامے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ ریڈیو سے خبریں اڑاتا ، ترجمے کرتا ، دو کالمی تین کالمی سرخیاں لگاتا جاتا۔ ناراض کاتبوں کی خوشامدیں کرتا جاتا اور جب رات کے دو بجے آخری کاپی جوڑ کر پریس بھیجتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کا دماغ چھچھوندر کی طرح شرارے اُگلتا ہوا ناچ رہا ہے۔ وہ چکرا کر دری پر گر جاتا جس پر مسطر ، اخبار ، گوند اور دواتیں بکھری ہوتیں۔ وہ کئی کئی دن نہ نہا پاتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی کھٹی کھٹی سی تہیں جمی رہتی تھیں جب لوگ اس سے نہانے کا مطالبہ کرتے تو وہ جھلا کر کہتا ۔ سالے نہانے کو سب کہتے ہیں۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ نہانے کا مطلب ہوتا ہے کپڑا ، صابن ، تیل ———

اسے جو کچھ بھی پیسہ چھین جھپٹ میں ہاتھ لگ جاتا ثروت کو بھیج دیتا۔ اس نے اپنی بیوی کو اپنے ڈاکٹر ہم زلف کے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان میں تھی۔ وہ اسے پیسے بھجوانے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ کلکتے میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پاکستانی سکوں میں ہندوستانی سکّے تبدیل کرواتا۔ اور اس طرح اُس کی بیوی کا ہر ماہ ایک شکریہ کا خط آجاتا۔ اور اس کی جان میں جان آجاتی۔ ثروت اس کی قربانیوں کو سمجھتی ہے۔ اس کی مصیبت کو سمجھتی ہے۔ ثروت اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔

وہ لکھتا ——— میری پیاری ثروت ، زندگی کا یہ اندھیرا دُور ہونے والا ہے۔ بہت جلد میں ایڈیٹر ہو جاؤں گا۔ میرا ایڈیٹر ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ایران جانے والا ہے۔ اس کے بعد میں بھی کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ ہوگی۔ پھر سمندر ہوگا۔ سمندر سے نکلتا ہوا انیا نیا سورج ہوگا۔ سروں پہ گاتے ہوئے پرندے ہوں گے ——— گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں ——— یہ دن ہمیشہ ایسے ہی نہیں رہیں گے ۔۔۔ کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کی راتیں۔ نہیں سمجھیں ۔۔۔ جاڑے کی راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمی کے دن۔ یہی حال زندگی کا ہے ——— جاڑے کی راتیں بھی آئیں اور گرمی کے دن بھی۔ لیکن اس کے دن جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اس کی زندگی سُکڑتی گئی۔ گھٹتی گئی۔ اس کے کپڑے میلے ہوتے گئے۔ ہوٹل کا قرض چڑھتا گیا۔ ہوٹل والے نے تو انتظار سے گھبرا کر اب سیکریٹریٹ کا پھیرا لگانا شروع کر دیا تھا۔ دو مہینے وہ ٹال گیا تھا۔ لیکن اب کے ٹالنا مشکل تھا۔ اب کے تو اس نے حلق میں انگلی ڈال کر قرضہ نکلوا لینے کا عہد کر رکھا تھا۔

سبزی منڈی کے پاس ہی پہنچا تھا کہ زوروں کی بارش ہونے لگی۔ سامنے پٹرولیم میں موبل آئیل کے کنستروں پر اولے برسنے لگے۔ اور چھوٹے سے بنگلے کے سبز پارک میں برف روئی کی طرح بچھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف روئی دھن دھن کر اُڑ رہی ہے اس کی جیب میں پیسے بہت کم تھے مشکل سے وہ واپسی کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور وہاں پر کھڑا رہتا تو یقیناً بھیگ جاتا۔ اُس نے دوڑ کر سامنے کے

پیراڈائز بار میں پناہ لی۔ وہاں یار خاں، اس کے مکان کا مالک کھڑا تھا۔ اس کی تیلی تیلی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ اور وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شاہد وہاں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں مکان کے کرائے کا تقاضا نہ کر دے۔ کہیں کیا یہ تو یقینی تھا۔

"کہاں شاہد صاحب! دفتر سے آ رہے ہیں کیا؟" اس کے ایک ہاتھ میں بنڈل تھا جس میں ایک ریشمی ساڑھی جھانک رہی تھی۔

"آداب عرض ہے۔ جی ہاں! اُف کتنی خوفناک بارش ہو رہی ہے میں تو پانی سے بچنے کے لئے یہاں چلا آیا۔"

"آئیے اندر آ جائیے۔ باہر کب تک کھڑے رہیں گے؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ دروازہ خود بخود اسپرنگ سے بند ہو گیا۔ اندر جتنے چہرے تھے۔ اس کے چہرے سے مختلف تھے۔ اس کے چہرے کی سی تھکن، اضمحلال، شکست اور گھبراہٹ کسی کے چہرے پر نہ تھی۔

ایک طرف کونے میں ایک سرخ میز خالی تھی۔ باہر بجلی چمکتی تھی تو شیشے کا رنگین دریچہ جھلک اٹھتا تھا۔ سگار، سگریٹ اور پائپ کے دھوئیں سے اندر کی نم آلود فضا بسی ہوئی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہی یار خاں کا لہجہ بہت دوستانہ ہو گیا۔ وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم پر چلا آیا۔ "کہو تم کیا پسند کرو گے؟"

"جی؟"

"کیا پیو گے؟" اور اس کی آنکھوں میں ایسی عیاش اور مکار چمک پیدا ہوئی کہ اس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔

"میں نہیں پیتا۔" شاہد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بکواس" جب بیرا اس کے سامنے آ کر جھکا تو اس نے کہا "سولن وہسکی، ایک بوتل"۔

بیرا نے پہلے سولن کی بوتل کھولی پھر دو گلاس لا کر رکھے۔ اور دو پلیٹ میں کباب۔ سوڈے کی بوتلیں پھک سے کھلیں اور بیرے دوسری طرف چلے گئے۔

یار خاں نے ہنستے ہوئے کہا "تم بہت تکلف کرتے ہو بھئی پینے کے لئے ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو فرق کیا ہے۔ پینے والوں کی ایک ذات ہوتی ہے۔"

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا اندر چلا آیا۔ شاہد کا پورا بدن جھرجھرا گیا۔ کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی بجلی چمکی اور اولے برسے۔ ایک کھدرپوش تنومند بابو جی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اینگلو انڈین عورت تھی۔ اور پیچھے پیچھے ایک بڑا سا بھورے رنگ کا کتا تھا۔ جسے وہ عورت "ہلو ٹائیگر، ٹائیگر ——" کہتی ہوئی چمکارتی رہی۔ وہ کھدرپوش بابو جی کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئی۔ اور کتا اپنی دم پر بیٹھ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں آئینے کے پس منظر میں ایک بلند شوکیس میں طرح طرح کی شراب کی بوتلیں چمک رہی تھیں۔ دلہنوں کی طرح۔

یار خاں نے سنہری شراب گلاسوں میں انڈیلی۔ ماچس سے دونوں کی مقدار کا اندازہ لگایا۔ اپنی نیلی ٹائی کی گانٹھ کو چھو کر دیکھا۔ دور بیٹھی ہوئی چھوکریوں کے پاس بیٹھے ہوئے دو تین کالج کے لڑکوں کو دیکھا جو بڑے لوگوں کے سپوت تھے اور فضا کی رنگینی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس نے شاہد کو گلاس اٹھانے کا اشارہ کیا۔ شاہد نے گلاس اٹھا لیا۔ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شراب لرز رہی تھی۔ سوڈا کی وجہ سے اس کا رنگ ہلکا ہو گیا تھا۔ یار خاں نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا —— "سرما کی اس حسین شام کے نام" شاہد نے شراب کا گھونٹ پیٹ میں انڈیل لیا۔ اس کے جسم میں ایک تلخ سی حدت دوڑ گئی۔ وہ اپنے لب چوستے ہوئے یار خاں کو دیکھنے لگا۔ جو اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

شاہد نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اُس کی میخواری کا بڑا چرچا تھا۔ وہ روز شام کے بعد کسی نہ کسی بار میں پہنچ جاتا تھا اور کسی نہ کسی نئے آدمی کو پھانس لیتا تھا، اور اُسے اپنی جیب سے شراب پلاتا تھا۔ جب سیر ہو جاتا تھا تو نشے میں اُسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ نئے آدمی کو نشے میں گالیاں دینے اور اس کی زندگی کا حال سننے اور سنانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ پرانے لوگوں کے ساتھ شراب پینے سے شراب بھی پرانی ہو جاتی ہے۔

دو تین گھونٹ حلق میں اُترنے کے بعد شاہد کی سراسیمگی مٹنے لگی۔ اُس نے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپکیں۔ جیسے اب کسی پرندے پر بندوق سے نشانہ باندھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ "لاؤ آج اس خاص مالکِ مکان کو بھی جھیل لوں۔ اور اس طرح جھیلوں کہ یہ سالا بھی کیا یاد کرے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ کئی بار میرے منشی نے تمہاری شکایت کی کہ تم وقت پر کرایہ نہیں دیتے۔ خیر یہ تو ایسی بات ہے جسے بار میں چھیڑنا غلط ہے۔ کیوں؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔" شاہد نے جھلا کر اور ایک حد تک بیزار ہو کر کہا۔

"ہا ہا۔ تمہاری بچی بہت شور مچاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے دودھ نہیں ملتا۔ تم ماما کیوں نہیں رکھ لیتے۔ لیکن جب تم کرایہ وقت پر نہیں دے سکتے تو پھر ــــ خیر چھوڑو۔"

شاہد کے کان جل اٹھے اور اس نے اپنے مفلر کو اتنی سختی سے مروڑنا شروع کیا کہ وہ اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سور مجھے چھیڑنا چاہتا ہے۔ ستانا چاہتا ہے۔ سمجھتا ہے اس طرح کچوکے لگا کر اپنا کرایہ وصول کر لے گا۔ بڑا خبیث ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ حالانکہ اب میں جس منزل پر ہوں وہاں ذلت اور عزت ایک ہی انڈے کے چھلکے ہیں زردی اور سفیدی کی طرح جذب ہو جاتی ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھایا اور ایک بڑا سا جلتا ہوا شراب کا گھونٹ مزا لے لے کر حلق کے پار اتار دیا۔ گلاس کو ہاتھ میں پکڑے گھورتا رہا۔ پھر مسکرایا اور پھر ایک گھونٹ حلق میں انڈیل لیا۔ یہاں تک کہ گلاس خالی ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ اتنے زور سے کہ یار خاں چونک گیا۔ اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"شاہد تم آدمی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تو واقعہ ہے۔"

"بہت خوب۔"

شاہد نے جیب میں سے ٹین سے ایک سگریٹ نکالی، سلگائی اور رئیسانہ ٹھاٹھ سے دھواں پھینکنے لگا۔ اور پھر اس خود پرست نظر سے اُس نے یار خاں کو دیکھا کہ وہ بھی گھبرا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود یار خاں اُس کی میز پر بیٹھا اس کی عطا کی ہوئی شراب پی رہا ہو۔

"اچھا بتاؤ تم کتنے اسٹیشن تک چلتے ہو؟"

"میں یہاں سے دہلی تک جا سکتا ہوں۔ یہاں سے لندن تک کتنے اسٹیشن ہیں۔ تم ہی بتاؤ، بتاؤ، ہاں بتاؤ، بڑے آدمی بنتے ہو۔ جنگلے میں رہتے ہو ــــ ہو ہو ہا ہیں؟" وہ پورا گلاس پی گیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اور ان میں نشاط انگیز چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے تم کتنے پیگ پی سکتے ہو؟" یار خاں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتے؟ کتنے اسٹیشن، کتنے اسٹیشن ــــ تم پیگ کو اسٹیشن کہتے ہو۔ کچھ لوگ ایک پیگ کو ایک زینہ کہتے ہیں۔ اب پوچھو گے کہ کتنے زینے چڑھ سکتے ہو۔ میں قطب مینار پر چڑھ سکتا ہوں ــــ تمہارے سر پر چڑھ سکتا ہوں۔" وہ ایک پیگ اور چڑھا گیا۔ اب وہ خود ہی پیالہ پیگ بنا رہا تھا۔ اور یار خاں کو پیچھے چھوڑتا ہوا پیتا چلا جا رہا تھا۔

یارخاں کا منہ لال ہو گیا۔ اُس نے اپنے ہونٹ چبائے اور ارد گرد نظر دوڑائی۔ کبھی کبھی لوگ ان کی میز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ بغل میں ایک میز پر ایک حسین سی سکھ عورت فر کا لانگ کوٹ پہنے بیٹھی بیر سپ کر رہی تھی۔ اور سردار جی موج میں آکر قہقہہ لگاتے اور ایک آدھ دھول بڑے پیار سے اس کے کندھے پر جماتے۔ اس کا موٹا ہاتھ بلی کے رویں کی طرح نرم کوٹ میں چھپ جاتا۔ پھر دونوں قہقہہ لگاتے۔

شاہد کو زور سے ہچکی آئی۔

”تم بہت پی گئے ہو۔ اب تم گھر چلے جاؤ۔“

”تم گھر جاؤ۔ میں تو ابھی اور بیوں گا۔ میں دہلی اسٹیشن تک جاؤں گا۔“ شاہد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”بیکار بات ہے۔ اب مت پیو۔ میں سمجھتا تھا۔ تم ڈھنگ کے آدمی ہو۔ تم شراب ہضم بھی نہیں کر سکتے۔“

”کیا کہا ــــ؟“ اُس نے اپنے کان پکڑ لیے ”لو معافی مانگتا ہوں۔ اب گستاخی نہیں کروں گا۔ بس پینے دو مجھے ــــ بس جینے دو مجھے۔“ اُس نے گانے کی سی آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔

تھوڑی دیر شاہد بڑی متانت سے بیٹھا رہا۔ وہ خرگوش کی آنکھوں کی طرح اپنی سُرخ آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھماتا رہا۔ دھوئیں سے بھرا ہوا ہال ٹھنڈا تھا۔ برف کے سے قہقہے، برف کے سے گلاس، برف کے سے سفید بیروں کے سائے۔ کھدر پوش بابو کا برف کی طرح خاموش طمانیت سب کچھ برف تھا۔ شراب برف، بوتلیں برف، مسکراہٹیں برف، تمنائیں برف۔ برف حیات، برف موت ــــ صرف اسے اپنا وجود آتشیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہنسا اور گویا اس کی روح کا منہ توڑ کر لاوے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن برف ہال کے باہر برس رہی تھی۔ اور برف ہال کے اندر جم رہی تھی۔

اب یارخاں سرور میں آگیا تھا۔ یکایک اُس کی گنگناہٹ ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مونچھوں کے اُوپر سُلگ اٹھی تھیں۔ اور باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے بھی پورا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

”اب گلپ کا وقت آگیا ہے۔ رات پُراسرار ہو گئی ہے۔ خون چیخ رہا ہے۔ کیا چیخ رہا ہے ــــ بتاؤں ــــ بتاؤں ــــ بتاؤں ــــ عورت، عورت“ ــــ اُس نے بوتل کی تہ میں چمکتی ہوئی زیتون کے رنگ کی شراب اپنے گلاس میں انڈیل لی اور بغیر سوڈا ملائے اسے اپنے منہ سے لگا لیا۔

”شاہد تم سے ملاقات ہو گئی اچھا ہوا۔ میں اکیلا نہیں پیتا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے لیکن عام طور پر مجھے اونچے درجے کے لوگ مل جاتے ہیں۔ تم ذلیل آدمی ہو۔ تمہارا لباس بھی ذلیل ہے۔ تم میرے مکان میں رہتے ہو۔ مجھے کرایہ بھی نہیں دیتے۔ تمہاری تنخواہ کے میرے ملازم ہیں۔ تمہاری بیوی عشق لڑاتی ہے تو تمہاری روٹی چلتی ہے۔“

”چپ سؤر کے بچے۔ چپ۔ چپ، چپ“ شاہد کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اُس نے گلاس کو دبوچ لیا۔ یارخاں چپ ہو گیا۔ ”تم نے مجھے شراب پلائی ہے تو کیا تم گالیاں بکو گے؟“

یارخاں نے بیرے کو بلا کر دو گلاس رم کے منگائے اور شاہد سے کہا ”پی لو“ شاہد پی گیا۔ شاہد کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جانتے ہو شاہد، میرا بھتیجا ہی میرا منشی ہے۔ میں اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ جاہل ہے، آوارہ ہے۔ خاندان کا شریف ہے جیسے تم خاندان کے شریف ہو۔ پہلے تمہاری شکایت کرتا تھا۔ اب وہ شکایت نہیں کرتا۔ اور یہ بری بات ہے۔ سوال کرائے کا ہے۔“

”یارخاں تمہارا کرایہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے گالی نہ دو۔ میری ثروت بہت پیاری عورت ہے۔ وہ گاتی ہے وہ شہد ہے ــــ

اور اب میں جاتا ہوں۔ تم اپنے بھائی کو امریکہ بھیجنا چاہتے ہو بھیجو۔ تم تیسری جنگ کا انتظار کر رہے ہو کرو۔ تم نفع کمانا چاہتے ہو کماؤ۔ مجھے گالی نہ دو۔"

"بیٹھو بیٹھو ——— یہ سب میرے بھتیجے نے بتایا ہوگا۔ اس کا بچہ بہت حرامی ہے۔ لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ پچھلی لڑائی میں کتنے رئیس بن گئے۔ میں بھی ———"

"میں اب جاتا ہوں۔" شاہد کھڑا ہو گیا۔

جب وہ بھیگتا ہوا بس سے اتر کر گھر پہنچا تو اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آواز دے کر دروازہ کھلوایا۔ ثروت کی آنکھیں خواب سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شاہد نے اپنی نشے سے بھری ہوئی آنکھوں سے اُسے گھور کر دیکھا "ثروت یار خاں بہت برا آدمی ہے۔ وہ خبیث ہے۔ اس نے مجھے شراب پلائی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔" اس نے اپنا منہ ثروت کی گود میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دیر تک چارپائی میں ثروت کے پاس سویا ہوا وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ثروت کے لئے ہی اپنی زندگی کی بلندی سے کود پڑا تھا۔ اس کے دوست، اس کے ساتھی، اس کی عملی سیاسی زندگی اس سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑا خطرناک زمانہ تھا۔ اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند تھا۔ اسے مچھر کاٹے کھا رہے تھے۔ وہ بار بار موم بتی جلاتا تھا۔ اور کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا۔ اور موم بتی بجھ جاتی تھی۔ پولیس مزدوروں کے علاقے میں دورے لگا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس وقت اسے اپنی بیوی کے خیال نے آ جھپٹا تھا۔ ثروت کی بڑی بڑی بیتاب پلکیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی جب وہ اس سے ملا تھا تو اس نے اس کے کان میں کہا تھا "آپ کچھ نہیں سمجھتے۔ آپ کچھ تو سمجھئے۔"

"کیا؟ کچھ کہو بھی تو۔ تم کہتیں تو کچھ نہیں اور مجھے کند ذہن کہتی ہو۔"

"کچھ پیسے جمع کر رکھئے۔ ہم تین ہونے والے ہیں۔"

شاہد کی سانسیں رک گئیں۔ اس نے ثروت کے گھنے بالوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا تھا۔ اور بڑی سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا "ہو جائے گا سب ہو جائے گا۔"

شاہد کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کا وہ جھوٹ تھا جو وہ ثروت کے سامنے ایک خوبصورت زندگی کا عینی نقشہ کھینچتا چلا جاتا تھا۔ اس میں اس کی کبھی ہمت ہی نہ ہوتی۔ کہ وہ اسے ان تمام تلخ حقیقتوں سے آگاہ کر دے۔ بتا دے کہ اس کے گھر کی چھتیں کبھی مرمت نہیں ہوں گی۔ یہ چھتیں گر جائیں گی۔ کمرے برسات میں مٹی کے گھڑے کی طرح پگھل کر بہہ جائیں گے۔ چھتوں کی مرمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک کہ ایک نئی زندگی، کھیتوں میں، گاؤں میں، شہروں میں جنم نہ لے۔ اور ابھی اس میں دیر تھی۔ ابھی ہزاروں چھتیں اور بیٹھنا تھیں۔ ابھی ہزاروں دل اور خون ہو ملتے۔ یہ سب اس کی زبان سے کبھی نہ نکلا۔ وہ ثروت کے گھر کے کھوکھلے، روایتی اور بے رنگ جاگیردارانہ ماحول میں اپنے آپ کیسے بس پاتا تھا۔ اس کا سارا شعور باہر کے لئے وقف تھا۔ وہ ثروت کے پاس پہنچ کر تیزی سے جھکتا تھا اور جھکتا چلا جاتا تھا۔

"آپ جب بڑی تنخواہ پانے لگیں گے تو بڑا اچھا رہے گا۔ ایک چھوٹا سا سفید مکان بنوائیں گے۔ باورچی خانے کا حصہ الگ ہوگا جس کی چمنی سفید رنگ کی ہوگی۔ باغ میں جوہی، بیلا اور موتیا لگائیں گے۔"

"ضرور لگائیں گے اور میں پھول توڑ کر تمہارے بالوں میں لگاؤں گا۔ ایں؟" وہ چاندنی میں چمکتے، ادھ گھنے کسانوں کے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہتا۔ الاؤ کی چمک اس کی سسرال کی پچھلی دیوار تک پہنچتی تھی۔

"ریڈیو کتنے کا مل آتا ہے؟"

"ریڈیو ۔۔۔ لاحول ولا ۔۔۔۔ ریڈیو کی فکر نہ کرو۔ دو تین سے ہر شریف گھر میں ہوگا۔ میں کوئی معمولی آدمی ہوں۔ میں بڑا اشٹیچول ہوں۔ لیکن تم اشٹیچوں کے معنی نہیں جانتیں"

ثروت بمشکل سے خط لکھ سکتی تھی۔ وہ البتہ سو تک گنتی ضرور جانتی تھی۔ اس کا سارا جادو اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں کی خوابیدہ مسکراہٹوں میں تھا۔ جیسے کسی شاخِ گل پر کوئی روپہلی چڑیا پر تول رہی ہو۔ جیسے بہار کی صبح گا رہی ہو۔ اُس کی بے خودی نے شاہد کو ایسی تمناؤں کا شکار بنا دیا تھا۔ جو اُس کی موجودہ زندگی کبھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔

شاہد اس جھونپڑی میں بیٹھا اپنے تمام وعدوں کو یاد کر رہا تھا جو اس نے شہد کے بلبلوں کی طرح ثروت کے کانوں میں اس کے خون میں اتار دئے تھے۔ جب دوبارہ موم بتی جلی تو اسے گپتا کی تیز تیر کی طرح چبھتی ہوئی آنکھوں ۔۔۔۔ سے بڑا ڈر معلوم ہوا۔ یہ کامریڈ اس طرح کیوں گھور رہا ہے۔

"کامریڈ تم بہت گھبرا گئے ہو۔ روپوشی کا پہلا تجربہ ہے نا؟"

"ہاں!"

"ڈٹے رہو۔ سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہتھکڑی اور پھانسی کی بہت منزلیں آئیں گی۔ اس موڑ سے گزرنا مشکل ہے۔ لیکن گزر جاؤ گے تم۔ مجھے یقین ہے"

"آخر تم مجھے اتنی نصیحت کیوں کر رہے ہو؟"

"یونہی۔ اِس لئے کہ میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں"

وہ رات بھر نہیں سو پایا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ثروت کی آنکھیں اُسے پکارتی رہی تھیں۔ وہ اس [illegible] تو اس کے شوہر نے اپنے آقا کو زہر دے کر حاصل کیا تھا اور خود اس کی بیوی کو بیاہ لیا تھا۔ پھر بڑی خاصی زمینداری اس کی ہوگئی تھی۔ [illegible] زمیندار کے چہرے پر ہمیشہ محرم کی دسویں تاریخ لکھی رہتی تھی۔ اور یہ کیلنڈر کبھی نہیں بدلتا تھا۔ وہ ثروت کو اپنی قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوتا۔ ثروت [illegible] پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کٹیا میں بند تھا۔ اس کے پرانے مکان کی چھت پر ثروت بال کھولے کھڑی تھی۔ چاند بادلوں میں تیر رہا تھا۔ اور اس کے پیٹ میں خون ایک زندگی کی گردش کھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور وہ [illegible] رہی تھی۔ اور وہ [illegible] اندھیری کٹیا میں بند تھا۔ جہاں موم بتی جلتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ جہاں گپتا اسے نصیحت کر رہا تھا اور اُس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ لیکن اس کی ہمت تنکے کی طرح ثروت کے آنسوؤں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

شاہد صبح سویرے کٹیا سے غائب ہو گیا۔ گپتا گرفتار ہو گیا اور اُس کے گھر پر جاسوسوں کی آمد و رفت بے تکلف شروع ہو گئی۔ اُس کا رشتہ اس کے پیارے اصولوں سے، قربانیوں سے، ساتھیوں سے کٹ گیا۔ اور وہ زندگی سے بھاگ کر ثروت کی آغوش میں چھپ گیا۔

اس رات کو جب یار خاں کے پاس سے شراب پی کر آیا اور ثروت کے پاس سو گیا تو وہ دیر تک نیند سے محروم رہا۔ زندگی کے واقعات اُس کے سینے میں چبھتے رہے اور اُسے ایسا لگا کہ اس کے سینے سے ثروت نہیں لگی ہوئی تھی۔ بلکہ اس کی شکست کا کانٹا تھا۔ جو اندر اور اندر چبھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ثروت بھی اُس کی وحشت سے ڈر رہی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ڈر رہی ہو۔ آج یار خاں نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اُس کی کھال ادھیڑ دوں گا"

"تم سو رہو، تم نے بہت پی لی ہے"

"ہاں میں سو رہوں گا۔ تم بھی سو رہو۔ مُنّی بھی سو رہے گی۔ ساری دنیا سو رہے گی۔ سالا یار خاں جاگتا رہے گا۔ اُس نے مجھے شراب دی —— اُس نے مجھے گالی دی۔ اُس کی ایسی تیسی —— تمہاری ایسی تیسی۔" تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بکتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھیں دوبارہ کھلیں تو دوپہر کی پیلی دھوپ اپنے اجلے پر پھیلاتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کے منہ میں ابھی تک جلے ہوئے پیاز اور سڑے ہوئے سر کے کا مزا باقی تھا۔ اس نے اپنا منہ بگاڑ کر ایک انگڑائی لی۔ کمرے کے باہر سے کسی کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ثروت کا قہقہہ آہستہ سے گونجا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سلاخوں سے گھری ہوئی چھت کی طرف دیکھا۔ چولھے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ کبھی آنچ لہرا کر نکلتی تھی۔ دھوئیں کے لچھوں میں سونا سا گھلتا ہوا نظر آتا تھا۔

ثروت چولھے کے پاس سے اٹھی اور رات کا بھیگا ہوا شاہد کا پاجامہ نچوڑنے لگی۔ اس کی آستین اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کی پتلی کلائی میں چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ چوڑیاں دھانی رنگ کی تھیں اور نئی ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ جب دوبارہ کسی کے بولنے کی آواز آئی تو شاہد باہر نکل آیا۔ یار خاں کا منشی اسٹول پر بیٹھا کش لگا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب کب تک کرائے کا انتظار کرائیں گے آپ؟"

"اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اطمینان رکھئے۔"

"یار خاں نے آج صبح ہی صبح ڈکا تو میں چلا آیا۔ مجھ سے آپ کی بیوی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"تکلیف وکلیف چھوڑیئے۔ آج ہی تنخواہ ملے گی۔ اور آج ہی آپ کا حساب صاف ہو جائے گا۔ کہہ دیجئے گا یار خاں سے۔ ہاں ——"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے زور پہ ہے مزاج۔ اچھا بھائی یہی سہی۔" جاتے جاتے منشی نے ایک خاص نظر سے اپنے کاندھوں کو اوپر کھینچتے ہوئے اور پتلون کی کریز سیدھی کرتے ہوئے ثروت کی طرف دیکھا۔

جب منشی چلا گیا تو ثروت نے طیش میں آکر کہا: "آپ کرائے کے پیسے بھی ادا نہیں کرتے اور اوپر سے رعب گانٹھتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ منّی کو لے کر میں سڑک پہ ماری ماری پھروں۔"

"کیا مطلب؟ —— اچھا تو یہ بات ہے؟"

اب جو اس نے اپنا حلیہ دیکھا تو شرما گیا۔ وہ اپنی بیوی کا میٹی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ رات اسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں گیا۔ اور سوٹ کیس میں اپنے کپڑے تلاش کرنے لگا۔ اس کا پھٹا ہوا پاجامہ نکل آیا۔ ساتھ ہی اس کے ایک نیا دوپٹہ، ایک خوبصورت سی ریشمی شلوار اور جمپر بھی سلا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پاجامہ گر گیا۔ وہ ان اجنبی کپڑوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دریچے سے باہر بھیگی ہوئی دیوار کو دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے غریب اور گھٹے ہوئے مکانوں کو، اور اس کے آگے یار خاں کے بڑے سے مکان کو جس کی کھڑکیوں پہ نیلے دھاری دار پردے ہل رہے تھے۔ اور اس کے باغ میں پھولوں کے نہ جانے کتنے کنول جل اُٹھے تھے۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلا۔ سر جھکائے ہوئے اُس نے کھانا کھایا۔ جب جانے لگا تو ثروت نے کہا "آج آلو اور چاول ختم ہیں۔ تنخواہ کے روپے میں سے منّی کا گرم کپڑا ضرور لیتے آیئے گا۔"

"کہاں سے آنا چاہئے گرم کپڑا؟"

"بازار اور کہاں سے؟"

"اور کرایہ کہاں سے دیا جائے گا؟"

"کرائے کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہماری بچّی سردی میں —— خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو؟"

وہ جب اپنی سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ تو اس کی ملاقات گپتا سے ہوگئی۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہوگیا تھا، وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ بیڑی پیئے جا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب اب تم کیسے ہو؟ تمہارے بارے میں مَیں نے بہت بُری بُری خبریں سُنی ہیں"

شاہد کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ اور صرف کھسیانی سی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گپتا کسان سبھا کے دفتر میں چلا گیا جاتے ہوئے اس نے شاہد کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہتا گیا ــ "شاہد انسان کمزور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم ہار گئے۔ میں جیل سے ہو آیا۔ زندہ ہوں۔ تم جیل سے باہر ہو ـــ میں نہیں جانتا تم اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتے ہو۔ کیا تمہارے مسئلے حل ہو گئے؟ تم خوش ہو؟ اچھے ہو؟"

شاہد ایک مجرم کی طرح مرجھائے ہوئے آگے چلا گیا۔ اس دن بار بار اس کے ذہن میں گپتا کا کالا، طنز کرتا ہوا، بیڑی کا دھواں پھینکتا ہوا چہرہ اُبھرتا ڈوبتا رہا۔

شام کے وقت اسے تنخواہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے سپرنٹنڈنٹ کا وارننگ لیٹر ملا۔ "ایک مہینہ اور موقع دیا جاتا ہے۔ اگر کام میں ترقی نہیں ہو سکی تو تمہارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو چھانٹ کی فہرست میں ہیں"

ہوٹل کا مالک بھوت کی طرح آ موجود ہوا۔ اُس نے بہت جُل دینا چاہا۔ لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخر پچھلے دروازے سے ہو کر نکل بھاگا۔ دوڑ کر رکشے پر بیٹھا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی۔ کہ ہوٹل کا مالک ڈبے میں داخل ہو گیا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔

"شرافت سے روپیہ دے دو۔ چوکا دینے ہو۔ شریف بنتے ہو۔ آج میں چھٹی کا دودھ اُگلوا دوں گا"

اور جب شاہد نے اپنی جیب سے چالیس روپے نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھے تو واقعی اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے چھٹی کا دودھ اُگل دیا ہے اس کی آنکھوں میں تیزاب سا بھر گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ڈبے میں واپس آیا۔ تماشائیوں کی آنکھیں اُسے ملامت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ آنکھیں اُس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ لیکن ایک آنکھ سے بھی ہمدردی کا نور نہیں چھن رہا تھا۔ انسان انسان کی ذلتوں، غلاظتوں اور بے پائیوں سے اپنے لئے کتنی تسکین پیدا کر لیتا ہے۔ وہ گھبرا کر ڈبے سے اُتر گیا۔ گاڑی چل دی۔ چھک چھک۔ اور اُسے معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے دس دس کے نوٹ اڑے چلے جا رہے تھے۔ چھک چھک۔ اور مسافر جو چلے گئے تھے۔ وہ بھی کمینے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے دل سے غم اور اداسی کے سیاہ سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے رات کا میل اس کی آنکھوں میں چل رہا ہو۔ اس کی روح میں ٹپک رہا ہو۔

جب اندھیرا ہو گیا تو پھر گزشتہ شام کی طرح اسی بار میں گھس گیا ـــ پیرا ڈائیز بار جس کے دروازے پر اردلی بیٹھا ہوا تھا۔ اور جس کے لمبے سفید کوٹ میں پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔

اُس نے اپنی جیب سے روپے نکالے۔ تریسٹھ روپے۔ اُس نے اردگرد نظریں نچائیں بار بھرا ہوا تھا۔ کھچا کھچ۔ فضا صاف تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اور آسمان ننگا نظر آ رہا تھا۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کاریں گزر رہی تھیں۔ اور دور امپیریل بنک کی عالی شان عمارت کے پیچھے چاند سونے کی روٹی کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ اور ایروڈرم سے فلیش لائٹ کی شعاعیں گندھکی جھاڑو کی طرح آسمان کا منہ جھاڑنے کے لئے اُٹھتی تھیں۔ لپکتی تھیں اور ناچتی تھیں۔

"بیرا آج میں سب سے قیمتی شراب پیوں گا۔ اسکاچ ہے؟"
بیرے نے سر ہلاتے ہوئے اپنے دانت نکال دیئے۔

اس نے اسکاچ کو گلاس میں انڈیلا سوڈا ملایا۔ چاروں طرف دیکھا۔ دل میں زور سے چیخا۔ "دیکھو یار خاں کے بچے! عیش کرنے والے کس طرح عیش کرتے ہیں۔" اور جب شراب کا سونا طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اس کے پیٹ میں اتر گیا تو اس نے بیرے کو قریب بلایا "انڈے لاؤ۔ ہاف فرائیڈ ——"

جب بیرا انڈے لے کر آیا تو وہ اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ "اسکاچ شراب صبح کی طرح سبک، عورت کے سینے کی طرح گرم اور حسین ہوتی ہے۔"

"بھئی مجھے لوہے کا پرمٹ مل گیا ہے۔"

"تمہاری گیتا تو غضب کرتی ہے۔ ٹینس میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یار میں ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔"

"ڈارلنگ کشمیر کب چلیں گے۔ دلی سے اب لفٹ اچھا رہے گا۔"

"دیکھو وہ لونڈیا کی کمر ہے یا بید مجنوں۔"

"تم گھاس کھا گئے ہو۔ رہنے دو یہ تو مصنوعی کمر ہے۔ اصل کمر تو وہ گھر چھوڑ آئی ہے۔"

"اور تم اپنی عقل نیلام گھر میں چھوڑ آئے ہو بیٹا۔"

"دیکھو سالا کیا پھٹے حال میں ہے۔ چہرے پر پھٹکار ہے مگر اسکاچ سپ کر رہا ہے۔ ہو گا یار کوئی پاکٹ مار۔"

دو دن جمعوں کی آندھی میں تناور درخت کی طرح جھومتا رہا۔ گلاس پر گلاس خالی ہوتے رہے۔ "بیرا یار خاں آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دو۔ اس سے کہو اس کا باپ آج اسکاچ پی رہا ہے۔ کل اس نے مجھے گالی دی تھی۔ آج میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر کھڑا ہو گیا۔ ڈرکر اور دوسرے لوگوں نے اپنے گلاسوں کو ہاتھ میں لے لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اے اس کو سنبھالو۔ اس کو روکو۔ بھگاؤ۔"

"مجھے کوئی نہیں بھگا سکتا۔ مو چھے کائی نائی بھگا سکتا —— سیاں بھئے کوتوال" وہ گانے لگا۔

ایک لڑکی نے اپنے عاشق کے کان میں کہا —— "مستک۔"

بیروں نے اسے آکر سمجھایا۔ لیکن وہ گم تھا۔ اس کی بکواس جاری تھی۔ "میں یار خاں سے انتقام لوں گا۔ میں سپرنٹنڈنٹ کو زینوں پر سے دھکیل دوں گا۔ میں کرایہ نہیں دوں گا۔ میں ثروت کو —— میں ثاروت" اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

بیروں نے اسے بار سے باہر کر دیا۔ اس کی جیب سے پیسے نکال کر اپنے بل کا حساب چکایا۔ اور اسے رکشے پر بٹھا کر چلتا کیا۔ شاہد کی ہچکیاں جاری تھیں اور وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"لے لو سب لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ ہوٹل والے کی ایسی تیسی، یار خاں کی ایسی تیسی۔ اس کے منشی کی ایسی تیسی ——"

جب وہ نشے کے عالم میں گرتا پڑتا، کیچڑ میں لتھڑتا اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا تو اس کی ٹکر ایک سائیکل سے ہو گئی۔ اور وہ گر گیا۔ کسان سبھا کے آفس سے نکل کر گپتا نے اسے اٹھایا ——

—— اس نے لیمپ کی روشنی میں ایک آنکھ مشکل سے کھول کر گپتا کو دیکھا —— اس کے دماغ میں بم سے پھٹنے لگے اور اس نے اپنے آپ چھڑا کر وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ "گپتا تم زندہ ہو۔ میں مر گیا ہوں۔ میں مر گیا ہوں۔ مجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا ——"

وہ اندھیری گلی میں گرتا پڑتا لڑکھڑاتا ڈگمگاتا اپنے مکان کے قریب ہو رہا تھا۔ گپتا کا دبلا پتلا چہرہ اس کی آنکھوں میں انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ "میں نے تمہیں جیل بھجوا دیا۔ میں نے اپنے ضمیر کو مار ڈالا۔ میں۔ میں۔"

"ارے شاہد میاں ——— یہ کیا حال ہے۔ میں تو کرایہ لینے آیا تھا۔ اور تمہارا منہ تو بھٹی کی طرح مہک رہا ہے ——— جاؤ جاؤ ثروت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" منشی جلدی جلدی ناک پر رومال ملتا ہوا یار خاں کے مکان کی طرف چلا گیا۔

وہ ہانپتا ہوا زینے پر چڑھا۔ اوپر کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی اڈے کی طرف فلیش لائٹ چمک رہی تھی۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چاند سونے کی روٹی معلوم ہوتا تھا۔

ثروت لیمپ کی دھیمی روشنی میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ لیمپ کی ٹوٹی ہوئی چمنی سے دھوئیں کا ایک تار اوپر اٹھ رہا تھا۔ کروسن تیل کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

"کتنا بھیانک کمرہ ہے یہ" شاہد زور سے گرجا۔ کونے کے پاس تھرتھراتے ہوئے جالے والی دیوار سے چمگادڑ زور سے ٹکرایا۔ شاہد نے زور سے ہاتھ بڑھایا۔ لحاف کھینچ لیا۔ منی صرف جانگیان پہنے سوئی ہوئی تھی۔ ثروت صرف پیٹی کوٹ پہنے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔ شاہد کو اس کے گھلتے ہوئے جسم پر بہت رحم آیا۔ اس کا جسم کبھی کتنا تندرست تھا۔ اس کے ہونٹ کیسے صحت مند تھے۔ سنگترے کی قاش کی طرح۔ اور آج ——— اسی کے لئے اس نے کیا نہیں کیا تھا۔ اسے اچانک یار خاں یاد آیا۔ منشی اور پھر گپتا کا مسکراتا ہوا چہرہ رحم اور طنز سے بھرا ہوا۔

"ثروت ——— " وہ اتنے زور سے چیخا کہ کمرہ گونج اٹھا۔

ثروت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آج پھر شراب پی لی ہے کیا؟"

"ہاں پی ہے۔ اپنی پی ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں پی ہے" ثروت سہم گئی۔ "ڈرو نہیں میں آج بے حد خوش ہوں۔ آج پہلی بار میں تمہیں سچ بتاؤں گا۔ دیکھو میں تمہیں ریڈیو نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں سلکن سوٹ نہیں دے سکتا ——— !!! ——— میں تو تمہیں اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتا" ہچکی لیتے ہوئے اس نے چند آنے پیسے اس کی گود میں پھینک دیئے۔

"آپ نے کیا کیا؟ اب ہمارا کیا ہوگا؟"

"ڈرو نہیں۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ میں تمہاری گردن نہیں دباؤں گا۔ اسی گردن کے لئے تو ———" اس نے اپنی انگلی سے اس کی گردن کو چھوا۔ اور ایک خباثت سے بھری ہوئی ہنسی ہنسا۔

"خدا کے لئے" ثروت گڑگڑائی۔

"خدا تمہارا دیکھو اس بڑے مکان میں رہتا ہے۔ ہے نا؟ وہ اس وقت کسی رنڈی کے ساتھ سویا ہوا ہوگا۔ ہے نا؟"

اسے زور سے ہچکی آئی اور ایک زبردست ابکائی کے ساتھ اس نے سب کچھ ثروت کی گود میں اگلنا شروع کر دیا۔ ثروت مجسمہ بنی بیٹھی رہی۔ اس کا تو جیسے دم ہی نکل گیا تھا۔

"تم سمجھتی ہو میں نشے میں ہوں۔ بالکل نہیں" وہ چارپائی پر پڑی ہوئی منی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میں شراب پیوں گا۔ تم اپنے راستے پر چلتی رہو۔ منشی سالا کبھی کرایہ نہیں مانگے گا ———"

"کیا مطلب؟"

"مطلب ——— تم پرسوں صبح کے شو میں ریشمی سوٹ پہن کر گئی تھیں یا نہیں۔ وہاں سے تم دریا کی سیر کو گئی تھیں ——— غلط؟ ڈرو نہیں۔ ——— میں تم سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں ———"

وہ چپ ہو گیا اور جھومتا رہا۔ "گپتا نے ٹھیک کہا تھا۔ چٹان جب ایک بار پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتی ہے تو کوئی نہیں جانتا ——؟
ثروت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلے گی۔ شاہد نے سوٹ کیس سے ریشمی شلوار اور جمپر نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ اور دوپٹہ خود اوڑھ کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے رکا۔ ثروت کو اپنے سینے سے چمٹا لیا —— اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے ——

"ثروت، میری جان —— چٹان کو لڑھکنے دو۔ مجھے بھوت پسند ہے ——"

اتنا کہہ کر وہ آندھی میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ منی جاگ پڑی اور زور زور سے رونے لگی۔

———

(۱۰)

مضامین

وقار عظیم

داستان سے افسانے تک

کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مسئلہ سے اس کا لگاؤ، اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ انسان اپنی حیاتِ اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی جن قوتوں سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار تھا اس پیکار اور کشمکش میں اسے سختی کی جن منزلوں سے گزر کر فتح و ظفر کا روئے تاباں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوتی تھی اس کی روداد میں اس کے لئے قندِ مکرر کی چاشنی تھی۔ کام و دہن کو اسی چاشنی سے آشنا کرنے کی خواہش نے اسے آپ بیتی دہرانے کا عادی بنایا۔ یہی کہانی کہنے یا داستان سرائی کا آغاز ہے۔ تھکے ہارے انسان کو اپنے سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لئے فطرتاً کسی ایسے مشغلے کی جستجو ہوتی تھی جو اس کے فطری احساسِ برتری کو بھی تسکین دے سکے اور اس پر عارضی طور پر ایسی خود فراموشی بھی طاری کر سکے کہ اس ماحول میں حقائق کی سختیاں اور تلخیاں اسے یہ ستا ئیں۔ انسانی زندگی میں یہی رومان کی لذتوں کی ابتدا ہے۔ اپنی ان کشمکش کو دہرانے اور رومان کی لذتوں میں گم ہونے کے علاوہ اس مشغلہ میں ایک اور بڑی بات یہ تھی کہ یہ ساری کہانیاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آنے کا بھی وسیلہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی وہ زندگی جس کا پس منظر کوہ و بیاباں کی سنگینیاں اور پہنائیاں ہیں، اس کی داستان سرائیوں سے گونج رہی ہے —— اس کی ساری رنگینیاں اور اس کا سارا رومان انہیں کہانیوں اور داستانوں کی بدولت ہے۔

انسان نے کوہ و بیاباں سے نکل کر، اور سنگِ خارا کی سختیوں سے اپنا رشتہ توڑ کر، لہلہاتی کھیتیوں سے اپنا ناطہ جوڑا اور اس ناطے کے ساتھ اس کے جسم کو راحت و آسائش میں زیادہ لطف محسوس ہونے لگا تو اس کی کہانیوں کا انداز ذرا بدلا لیکن اس بدلے ہوئے انداز میں بھی کہانی کے وہ بنیادی محرکات قائم رہے جو اس کی حیاتِ اجتماعی کے ابتدائی دور کی خصوصیت تھے —— وہ اب بھی کہانیوں میں اپنے کارناموں کی روداد سن کر خوش ہوتا تھا، اب بھی کہانیاں اس کے جذبۂ برتری کی تسکین کا باعث تھیں اور اب بھی کہانیوں میں اسے حقیقت سے الگ ہٹ کر رومان، تصور اور تخیل کی ایک ایسی دنیا نظر آتی تھی جس میں اسے حقیقت کی آزمائشوں سے مکمل نجات حاصل ہو جاتی تھی۔ انسانی زندگی کی مدنیت کی پیچیدگیوں اور تہذیب کی شائستگیوں نے بھی کہانی کی کشش میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ جب اس نے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا

تو کہانی کے ساتھ ہی ابتدائی تصورات وابستہ رکھے ——— کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے، کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے، کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور، تخیل، تصور اور رومان کی ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے ——— کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔

ہماری داستانوں کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوتی ہے[1] اور جن تصانیف کو ہم باقاعدہ داستان کہہ سکتے ہیں ان میں سب سے پہلی تحسین کی نوطرزِ مرصع ہے[2]۔ اس کے چند ہی سال بعد فورٹ ولیم کالج کا دور شروع ہو جاتا ہے اور زرین کی نوطرزِ مرصع یا باغ و بہار (تالیف ۱۸۰۲ء) اور انشا کی رانی کیتکی کی کہانی" (تصنیف ۱۸۰۳ء) کو چھوڑ کر بیسویں صدی میں جتنی داستانیں لکھی گئیں وہ سب کی سب فورٹ ولیم کے منصوبہ کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس دور کی داستانوں میں باغ و بہار (میر امن) حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر، مظہر علی ولا اور للّو لال کی بیتال پچیسی، کاظم علی جوان اور للّو لال کوی کی سنگھاسن بتیسی زیادہ معروف و مقبول ہیں اور ۱۸۰۱ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے دور کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک جو بے شمار داستانیں تصنیف ہوئیں[3] ان میں محمد بخش مہجور کی نورتن (۱۸۱۴ء) سرور کی فسانۂ عجائب، نیم چند کشمیری کی گل صنوبر (۱۸۳۷ء) الف لیلہ (۱۸۴۲ء، ۱۸۴۴ء) بوستانِ خیال، طلسم ہوش ربا،[4] سحر دہلوی کی سروشِ سخن (۱۸۶۰ء) شیون کی طلسم حیرت (۱۸۷۲ء) اور الف لیلہ (مرزا حیرت اور رتن ناتھ سرشار) زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان مشہور و معروف داستانوں کے علاوہ جن کا حجم کئی ہزار صفحے ہے، اسی دوران میں سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں سے بہت سی چھپیں اور بہت سی اب بھی کتب خانوں میں غیر مطبوعہ کتب کے خزانوں میں شامل ہیں۔

ان سب داستانوں کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والا (ایسا پڑھنے والا جو کتابوں کو طالب علم کی طرح پڑھتا ہے) بڑی آسانی سے کچھ ایسی باتیں تلاش کر لیتا ہے جن سے یہ سب تصانیف ایک خاص صنف کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ ان سب داستانوں میں بوستانِ خیال اور داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا جیسی ضخیم و حجیم اور لحیم شحیم داستانیں بھی شامل ہیں اور بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی اور انشائے نورتن میں چھپی ہوئی ایک ایک دو دو صفحوں کی کہانیاں بھی، اور ان دونوں کے بیچ میں الف لیلہ کے نسبتاً بڑے اور رانی کیتکی کی کہانی جیسے متوسط قد و قامت کے قصے بھی۔ لیکن ضخامت اور حجم سے قطع نظر ان سب میں کچھ مشترک باتیں ایسی ہیں جو انہیں ترتیب، ساخت اور اس سے بھی بڑھ کر دلچسپی کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بناتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا قاری، ان کی تفصیلات کے فرق کے باوجود ان سب میں ایک ہی قسم کی دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کا تاثر قبول کرتا ہے اور ایک ہی قسم کے ردِ عمل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب داستانیں پڑھنے والوں کے لئے ایسی تفریح، دلچسپی اور ذہنی انبساط کا سرمایہ مہیا کرتی ہیں جس میں منطق اور استدلال کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان سب داستانوں اور کہانیوں کا مقصد بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکیں۔ اس دلچسپی کے حصول کے لئے لکھنے والوں نے عموماً ایک ہی سے نسخے استعمال کئے ہیں۔

ان چھوٹی بڑی سب داستانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قصہ کو جہاں تک ممکن ہو طول دیا جائے تاکہ پڑھنے والا زیادہ

---

[1] میں نے وجہی کی سب رس، کو جو بعض نقادوں کے نزدیک اردو کی پہلی داستان ہے اس خیال سے اپنے بیان کا جزو نہیں بنایا کہ وہاں مصنف کا مقصود کہانی سنانا نہیں۔

[2] نوطرزِ مرصع کا سنہ تصنیف (یا تالیف) ۱۷۶۵ء اور ۱۷۸۰ء کے درمیان ہے۔

[3] و [4] ان دو کتابوں کے ساتھ میں نے مصنفوں کے نام اور کتابوں کے سنہ تصنیف اس لئے نہیں لکھے کہ ان کتابوں کے حصے مختلف مصنفوں نے مختلف سنوں میں دہلی اور لکھنؤ میں تالیف کئے۔

سے زیادہ عرصہ تک حقیقت کی دنیا کو بھول کر رومان اور تخیل کی دنیا کی سیر کر سکے۔ کہانی کو طویل بنانے کے لئے ہمارے داستان نویسوں نے عموماً یہ انداز اختیار کیا ہے کہ وہ اصل قصہ کے ساتھ ضمنی قصے بڑھا کر پڑھنے والے کی توجہ اور انہماک کے لئے نئی نئی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ باغ و بہار جیسی متوازن اور فسانۂ عجائب جیسی ادبی داستان میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے اور سنگھاسن بتیسی بیتال پچیسی اور طوطا کہانی جیسی کہانی نما داستانوں میں بھی ایک کہانی سے دوسری کہانی پیدا ہوتی ہے۔ آرائشِ محفل، بوستانِ خیال اور طلسم ہوش ربا اور داستانِ امیر حمزہ کی تحریریں بھی امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو کی سب داستانوں میں رانی کیتکی کی کہانی اور انشائے نورتن صرف دو مستثنیات ہیں۔ اصل کہانی میں ضمنی کہانیوں کا اضافہ کرکے انہیں طول دینے کی کوشش میں کہانی کی وحدت، اس کے تناسب و توازن اور مجموعی تاثر میں جو کمی آتی ہے (اور جسے اب کہانی کے فن کا ایک ناگزیر عنصر سمجھا جاتا ہے)، اس کا احساس ہمارے داستان گویوں کو بالکل نہیں تھا۔ کہانی کی ابتدا کے بعد اس منزل کا آنا جب مسئلہ ایک واضح شکل اختیار کرتا ہے اور کہانی ایک خاص راستہ پر چل کر ارتقا کے مختلف مرحلے طے کر کے نقطۂ عروج اور خاتمہ تک پہنچتی ہے، داستان کے فن کی روایت میں شامل نہیں تھا (کہانی میں اٹھان بھی کوئی چیز ہے، اس کا تصور سید انشا نے رانی کیتکی میں البتہ پیش کیا ہے[1]) کہانی میں جس چیز کو SUSPENSE کہتے ہیں اور جو کہانی کی دلچسپی کا لازمی عنصر ہے داستانوں میں ہے ضرور، لیکن عموماً اس پر ایک طرح کا تصنع غالب ہے۔ اسی مصنوعی تصنع کی وجہ سے داستان پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتی ہے —— لیکن داستان گو کے پاس داستان میں دلچسپی پیدا کرنے اور قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کے اور بہت سے وسیلے ہیں۔

ان بہت سے وسیلوں میں ایک وسیلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا سے الگ، پڑھنے والے کے لئے رومان کا ایک جہانِ دلکش آباد کرتا ہے۔ اس دنیا میں ان لوگوں کی کثرت و فراوانی ہے جنہیں خدا نے تاج داری و جہاں بانی کا شرف بخشا ہے۔ بادشاہ، وزیر، امیر، تاجر سے اس دنیا کی رونق اور آبادی ہے۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور تاجروں کی اس دنیا کی رونق، اس کے شان و شکوہ، اس کی شانِ جلال و جمال میں ہی قاری کے لئے وہ کشش ہے جس سے وہ اپنی سیدھی سادی حقیقت کی دنیا میں محروم رہتا ہے۔ اس رنگین، حسین و جمیل اور پرشکوہ دنیا کی تشکیل و تعمیر داستان گو کے فن کی روایت کا حصہ ہے اور اپنی روایت کی اس دلکشی سے وہ قاری کے دل کو موہتا ہے۔

بادشاہوں، وزیروں، امیروں کی اس دنیا پر پریوں کا سایہ بھی ہے۔ پریاں، جن، دیو، ساحر اور نجومی رومان کی اس عجیب و غریب دنیا کے باسیوں کے مسرت و غم میں ان کے شریک ہیں اور اس لئے پڑھنے والے کو اس دنیا میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہیں۔ ان غیر معمولی اور مافوق الفطرت باتوں کو عقل کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے لئے یہ سب کچھ انوکھا اور نرالا ہے۔ لیکن داستان گو کا دائرۂ عمل دنیائے حقائق کے بجائے عالمِ سحر اور جہانِ نظر کے بجائے عالمِ تخیل و تصور ہے اس لئے داستان کا قاری اسی دنیا کی سیر سے مطمئن و مسرور ہوتا ہے اور یوں داستان گو کے اس فنی منصب کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ وہ قاری کے لئے سرور و انبساط کا سرمایہ مہیا کرے۔

تخیل و تصور کی اس دنیا کے باشندے یوں دیکھنے میں ہماری دنیا کے انسانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں لیکن اپنے غیر معمولی عمل اور قوتوں کی بنا پر ان کی سیرت اور شخصیت مثالی بن جاتی ہے —— جو نیک ہے وہ نیکیوں کی ان سب خصوصیات کا حامل ہے جو انسان کے تصور میں آسکتی ہیں، جو بد ہے وہ بدی کا ایسا مجسمہ ہے کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں کے حامل اور علمبردار ان مثالی کرداروں کی شناسائی

---

[1] انشا نے اسے اُبھار کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ تمہید کے بعد رانی کیتکی کی کہانی میں یہ عنوان ہے:

"کہانی کا اُبھار اور بول چال کی دولہن کا سنگار"

پڑھنے والوں کو اس لئے مطمئن کرتی ہے کہ یہاں انہیں وہ اہم اقدار بر سرِ عمل دکھائی دیتی ہیں جن کا حقیقت کی دنیا میں وہ صرف تصور کر سکتے ہیں۔ وہ بدی جو اسے زندگی میں ہمیشہ سختیوں اور آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے، یہاں نیکی سے متصادم ہوتی ہے تو ہمیشہ شکست کھاتی ہے اور یہی چیز اس کی خوشی کا سرچشمہ ہے۔ داستان گو نے اپنی داستانوں کے ذریعہ انسان کو یہی خوشی دی ہے اس لئے عقل و منطق سے عاری ہونے پر بھی وہ اس کی دلچسپی کا وسیلہ ہے۔

داستانوں نے انسان کے لئے عملی زندگی کا ایک ایسا ضابطہ مرتب کیا ہے جس میں عیش و عشرت کی فراوانی ہے، جرأت، ہمت، شجاعت اور مردانگی کے بدلے ابدی سکون و راحت کا انعام ہے، مروت، محبت اور دردمندی کے بدلے جاہ و ثروت ہے۔ عارضی سخت کوشی کے بدلے دائمی راحت ہے۔ یہ دنیا مشاہدہ اور فکر نے نہیں تصور و تخیل نے آباد کی ہے اور اس کی تزئین میں ادبیت و شعریت نے اپنی پوری توجہیں صرف کی ہیں اس لئے ہر طرف حسن و جمال کے جلوے ہیں اور یہی بات تاری کے لئے کشش کی ہے۔

ہماری داستانوں نے کہانی میں دلچسپی و دل فریبی کی، تخیل و تصور کی کشمکش اور جد و جہد کی اور پھر شادمانی و مسرت کی، سکون و راحت کی، باطل پر حق کی فتح کی، انسان اور فطرت کے تصادم اور ہم آہنگی کی، مادہ، روح اور سحر و افسوں کی نیرنگیٔ عمل کی فضا بنائی اور اس طرح ایک ایسی دنیا بسائی جو کبھی بھی حقیقت کی دنیا سے بھی زیادہ دلچسپ اور قابلِ یقین نظر آتی ہے۔ جو کچھ فطری نہیں وہ یہاں فطری اور جو نا قابلِ یقین ہے وہ یقینی اور قابلِ قبول بن جاتا ہے۔ یہاں فن کی ساری روایت دل کے تقاضوں پر قائم ہے کہ اسی تقاضے کی منطق وہ واحد منطق ہے جس میں مخاطب کی دلچسپی اور اس کی خوشنودی کا مقام سب سے پہلے بھی ہے اور سب سے اونچا بھی۔

ابھی اردو میں داستان گوئی کا عہدِ شباب ختم نہیں ہوا تھا[1] کہ کہانی کی ایک نئی صنف نے جنم لیا اور اس طرح کہانی کی روایت نے ایک دوسری طرف رُخ موڑا۔ نذیر احمد کے ناولوں نے کہانی کو تخیل اور تصور کی دنیا بسانے کے بجائے حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔ کہانی کو محض دلچسپی اور تفریح کی چیز سمجھنے کے بجائے اسے معاشرتی زندگی کے مقاصد کا حامل اور علم بردار بنانے کی تعلیم دی۔ رومانیت کو کہانی کے لئے جنسِ غریب قرار دے کر حقیقت کو اس کی بنیاد بنایا۔ خیر اور حق کے عالمگیر تصورات کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص معاشرے کے مسائل کو کہانی کے رگ و پے میں جذب و سرایت کیا۔ اور بیان میں شعریت، ادبیت اور رنگینی کو مقصود بالذات سمجھ لینے کے بجائے اسے زندگی کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور تکلف و تصنع کی جگہ سادگی کو (ایسی سادگی کو جس پر تصنع کا سایہ نہ پڑا ہو) حسنِ بیان کا زیور جانا اور سادگیٔ بیان کی معنوی وسعتیں اور اس کے امکانات واضح کئے۔ پھر بھی داستان کی قائم کی ہوئی اس روایت کو اپنا رہنما بنایا کہ کہانی کے کردار حقیقی سے زیادہ مثالی ہوں اور ان سے ایسے غیر معمولی افعال و اعمال وجود میں آئیں کہ دنیا محوِ حیرت رہ جائے۔ وہ نیکی کے جس راستے پر گامزن ہوں وہی راستہ زندگی کا سب سے پسندیدہ راستہ معلوم ہو اور اس راستے پر چلنے والے کو بہر صورت کامیاب و کامران دکھایا جائے اس لئے کہ ناظر کی خوشنودی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ نیکی کے ساتھ داستان گویوں کو جو جذباتی اور مبالغہ کی حد تک غیر منطقی لگاؤ ہوتا تھا اسے نذیر احمد نے بھی اسی طرح قائم رکھا اور اس کی خاطر فن کی ہر نزاکت و لطافت کی قربانی دی۔ ابتدائی دور کے ناول نگاروں میں شرر اور سرشار نے بھی داستان کی روایت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ قائم رکھا۔ سرشار کی ٹھوس حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فسانۂ آزاد میں واقعہ نگاری کی رنگینی، طرزِ بیان کی صنعت گری اور کرداروں کے عمل میں حد درجہ کی سنجیدگی کے ساتھ مبالغہ اور مضحکہ کا امتزاج اور قدم قدم پر

---

[1] اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوا اور ذیل کی داستانیں اس سنہ کے بعد تصنیف، تالیف و ترجمہ ہوئیں:
داستانِ امیر حمزہ —— سید محمد عبد اللہ بلگرامی (۱۸۷۱ء) طلسم حیرت —— جعفر علی شیون (۱۸۷۲ء) بوستانِ خیال —— محمد عسکری و آغا جو (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۱ء) داستانِ امیر حمزہ —— تصدق حسین، محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر (۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۱ء) ہزار داستان —— حامد علی خان (۱۸۸۹ء)
شبستانِ حیرت —— مرزا حیرت دہلوی (۱۸۹۲ء) الف لیلہ —— رتن ناتھ سرشار (۱۹۰۱ء)

معمولی سے نسل کو مہم کا رنگ دینے کا رجحان داستان کی روایت کے باقیات الصالحات ہیں۔ اسی طرح شرر کے ناولوں میں (خصوصاً تاریخی ناولوں میں) بہادری اور جاں بازی کے مبالغہ آمیز کارنامے، ناموں کی کثرت، ہیرو کی تاریخی شخصیت کی صداقت میں تخیل کی رنگ آمیزی، مناظرِ فطرت کے بیان میں واقعہ نگاری کے بجائے شاعرانہ تصور آفرینی کا غلبہ اور منطق کے احساس کو بھلا کر کہانی کو طرب انگیز انجام دینے کی کوشش اور ان سب باتوں میں فن کے مطالبات کی پیروی کے بجائے قاری کی خوشنودیٔ مزاج کی تسکین کا خیال داستان کی روایت کے عناصر ہیں۔ ناول اپنے ابتدائی دور میں، یا یوں کہنا چاہیئے کہ نذیر احمد، شرر، اور سرشار کے ہاتھوں حقیقت کی زندگی کا مصور، ترجمان، مفسر، نقاد اور خدمت گذار بن کر بھی اپنے آپ کو تخیل، تصور اور شعریت کی ان قدروں سے جدا نہیں کر سکا جن کی مدد سے داستان نے ایک جہانِ نو بنانے کی روش کو اپنا شیوہ بنایا تھا۔ نذیر احمد، شرر اور سرشار نے داستان کی روایت کو عزیز رکھتے ہوئے بھی کہانی کو حقیقت نگاری اور احترامِ فن کا جو انداز سکھایا تھا اسے ان کے بعد آنے والوں نے تکمیل کی راہ دکھائی۔ ہماری ناول نگاری کا دوسرا دور تکمیلِ راہ کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین کے علاوہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناول بعض حیثیتوں سے کہانی کے فن کے ارتقا میں ایسے مدارج طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کے طے کئے بغیر فن کے نصب العین تک رسائی ناممکن ہے۔

سجاد حسین نے لکھنوی معاشرے کو اپنے ناولوں کا پس منظر بنا کر مرقع کشی اور اصلاحِ معاشرت کے جو مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ان کے سامنے ہمیشہ یہ بات بھی رہی ہے کہ قاری اصلاحی مقصد میں ان کا ہم نوا ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی میں دلچسپی بھی محسوس کرے۔ کہانی میں دلچسپی کے عناصر کا وجود کہانی کی روایت کے تسلسل کا مظہر ہے اور روایت کے اس پہلو کو ہمارے کہانی کہنے والوں نے (جن میں ناول نگار اور افسانہ نگار بھی شامل ہیں) اکثر یاد رکھا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید بھی، جو فلسفیانہ فکر، منطقی ترتیب اور نفسیاتی تجزیہ کو ناول کے ضروری اجزا مانتے ہیں۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے کہ فلسفہ، منطق اور نفسیات میں جب تک ایسے عناصر شامل نہ کئے جائیں کہ وہ قاری کے لئے قابلِ قبول بن سکیں، کہانی میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اس طرح کہانی نے جو سفر داستان کی رنگین، رومانی اور تخیلی سرزمینوں میں شروع کیا تھا اور پھر نذیر احمد کی رہنمائی میں محض تخیل و تصور کو چھوڑ کر حقیقت کی سادہ دنیا میں قدم رکھا تھا۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کی رہبری نے اسے نفسیات کی پیچ پیچ وادیوں سے آشنا کیا۔

نذیر احمد نے کہانی کو محض نشاطِ خاطر کا ایک ذریعہ سمجھنے کے بجائے اس سے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا اہم کام لیا۔ شرر نے اصلاح کے اس مقصد و منصب کو اور زیادہ واضح شکل دے کر اسے وسیع تر قومی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ سرشار نے بھی، گو ایک مصنوعی انداز میں سہی، زمانے کی روش سے متاثر ہو کر اپنے ناولوں میں تزئینِ اخلاق کی طرف اشارے کئے۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناولوں (امراؤ جان ادا اور خواب ہستی) میں مقصدیت کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط اور اس کی جڑیں اور زیادہ گہری ہوئیں۔ نذیر احمد کے یہاں زندگی کے پس منظر کے باوجود مصنف کی اصلاح کا جذبہ اور مقصدیت قاری کی خوشنودی کے احساس پر غالب ہے۔ شرر کے یہاں کم اور سرشار کے یہاں نسبتاً زیادہ قاری کو اپنے آپ سے قریب لانے کا احساس نمایاں ہے لیکن اس احساس کو شرر اور سرشار دونوں نے جو عملی شکل دی ہے اس میں ہر جگہ تصنع نمایاں ہے کہیں شاعرانہ منظر نگاری کی شکل میں، کہیں سستے اور جذباتی رومان کے پیرایہ میں، کہیں جوشیلے اور ولولہ انگیز واقعات کے ذکر میں اور کہیں کہانی کے ایسے انجام میں جو کہانی کے اٹھان، ارتقا اور نقطۂ عروج کے ساتھ منطقی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ قاری کے تصورات کی ہم نوائی کو اپنا مقصد جانتا ہے۔

مرزا محمد سعید اور مرزا رسوا کے ناولوں میں قاری کی خوشنودی کے یہ موضوعی اور جذباتی وسیلے اعتدال و توازن کا قرب حاصل کرتے ہیں اور لکھنے والے فکر، تخیل اور مقصدیت میں مناسب امتزاج پیدا کر کے فن کی اس روش کا آغاز کرتے ہیں جو واضح طور پر ناول کے فن کی روش ہے۔ کہانی کے مختلف اصناف میں، اس رشتہ کی بنا پر کہ انسان کی یہ فطرت اس کی محرک ہے کہ وہ انسانی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے اور اس کے

احساسِ برتری کو زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان میسر آئے۔ ایک خاص طرح کا ربط اور تسلسل ہے اور اس لئے داستان اور ناول کی بنیادوں میں یہ مشترک محرکات مچلتے اور تڑپتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان مشترک عناصر کے علاوہ جنہیں فنی تسلسل کا لازمی اور منطقی تقاضا کہنا چاہیے' ناول نے ایک منفرد صنفِ ادب کی طرح جنم لیا اور اس کے باوجود کہ دیکھنے والی نظر فن کے پردوں کو اٹھا کر داستان اور ناول کے ادبی رشتے کو آسانی سے محسوس کر لیتی ہے' اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناول کا ایک علیٰحدہ فن ہے۔ اس فن کی ابتدا نذیر احمد سے ہوئی۔ شرر اور سرشار نے اس فن میں بعض چیزوں کا اضافہ کیا لیکن داستان اور ناول کو ایک دوسرے سے پوری طرح الگ نہ کر سکے۔ یہ صورت سب سے پہلے امراؤ جان ادا اور خوابِ ہستی میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد تقلید کا ایک ایسا دور آیا جس میں محمد علی طبیب اور راشد الخیری نے بنی بنائی روشوں کی تزئین و ترتیب کی اور پھر ناول کا فن ایک ایسی منزل پر پہنچا جسے پریم چند کی منزل کہنا چاہئے۔

پریم چند کی ناول نگاری کئی حیثیتوں سے اردو میں ناول نگاری کے فن کی تکمیل کی منزل ہے۔ پریم چند کے معاشرتی اور سیاسی زندگی کے گہرے مشاہدے' اس مشاہدے کے ساتھ فرد اور جماعت کی زندگی کے اہم مسائل کے مطالعے' اس مشاہدے اور مطالعے کے بعد فکر' تخیل اور جذبات کی صحیح آمیزش اور پھر ان سب چیزوں کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کے واضح احساس اور احساس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ عملی شکل دینے کی کوشش نے پریم چند کے ناولوں کو اردو ناول نگاری میں فن کا معیار بنایا ہے۔ پریم چند کے ناولوں کا قائم کیا ہوا معیار واقعہ نگاری کی تفصیلات و جزئیات' کردار نگاری کی جذباتی و نفسیاتی بنیاد اور فن کی ترتیب و توازن کی کسوٹی بھی ہے اور ایک سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کے تجربات و محسوسات کی ایسی تصویر بھی جس میں زندگی کی صداقتوں اور فن کی نزاکتوں کا یکساں احترام کیا گیا ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری کا ابتدائی دور تو یقیناً ایک شدید قسم کی جذباتی اصلاح پسندی کا دور ہے لیکن اس کے آخری ایام یقیناً زندگی اور فن کے امتزاج کا بے حد دلکش نمونہ ہیں۔ اس نمونے کو کہیں کہیں مغرب کے بلند ترین معیاروں کا ہمسر تسلیم کرنے میں ضرور تامل ہوتا ہے لیکن اس میں یقیناً کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں ناول نگاری کے فن کی معراج وہی ہے جہاں پریم چند نے اسے پہنچایا تھا۔ گئودان اور میدانِ عمل پریم چند کے ایسے ناول ہیں جن میں کہانی کی روایت کے بہترین عناصر مجتمع ہیں۔ ہماری داستان نے کہانی کو حسنِ تہذیب کا نقش' رنگینیٔ رومان و تخیل کا مرقع اور جذباتی اور ذہنی تسکین و لطف اندوزی کا وسیلہ بنا کر کہانی کے فن میں ایک مخصوص صنعت کا اضافہ کیا' اسے ہمارے ناول نے پوری طرح اپنے اندر سمو کر کہانی کو ایک صنعت دی جس میں بھرپور زندگی بھی ہے اور بھرپور فن بھی' ایک کا پھیلاؤ' دوسرے کی گہرائی' ایک کی پیچیدگیاں' دوسرے کی نزاکتیں' ایک کا حسن و جمال اور دوسرے کی اثر انگیزی۔

لیکن جس طرح زندگی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی فن بھی اس کی بے چینی اور بے قراری کا ساتھ دیتا رہتا ہے۔ زندگی آگے بڑھتی ہے' فن بھی آگے بڑھتا ہے' اس لئے کہ زندگی فن سے اسی بات کی طالب اور متقاضی ہے اور فن زندگی کی اس طلب اور تقاضے کا ساتھ نہ دے سکے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔

زمانے نے ادیب اور فن کار سے کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضا کیا تھا جو رومان کی رنگینیوں کے بجائے زندگی کی سادہ و پُرپیچ حقیقتوں کی حامل ہو ——— ایک ایسی صنف جس میں فن کار کے تخیل اور تصور کی جدت پسندی نہیں بلکہ تفکر کی گہرائی شامل ہو' جس میں انسان زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر ایک ان دیکھی دنیا کی سیر کرنے کی جگہ اس کی کشمکشوں سے دوچار اور نبرد آزما ہو' جہاں اسے زندگی سے فرار کی نہیں اس سے اُلجھنے اور اس کی اُلجھنوں کو سلجھانے کی تعلیم ملے ——— جہاں فن کار محض مصور نہیں' مبصر' نقاد اور معلم کے فرائض اور منصب پورے کرنے کی خدمت انجام دے' جہاں جذبات اور احساسات پر فن کی منطق حاوی اور غالب نظر آئے۔ زمانے کی اسی طلب اور تقاضے نے ناول کی تخلیق کی اور آہستہ آہستہ اس نے داستان کی جگہ لے لی۔

ناول شروع ہوا، اس نے ارتقا کے مختلف مدارج و مراحل طے کیے لیکن زمانہ بدلا تو اس کے تغیر پسند مزاج نے ایک دوسری طرح کی کہانی کا مطالبہ کیا، ایسی کہانی جو زندگی کی ساری وسعتوں پر حاوی اور اس کی گہرائیوں کی ترجمان ہونے ہوئے بھی ایک ایسے فن کی علم بردار ہو جہاں ایجاز و اختصار کی حکمرانی ہو۔ جاگیردارانہ نظام اور عشرت پسند تہذیب کے تقاضوں نے داستان جیسی صنف کی تخلیق کی تھی۔ حقائق کے تلخ احساس اور زندگی کے مسائل کو کہانی کے ذریعہ حل کرنے کی خواہش نے ناول کو جنم دیا۔ لیکن وقت میں پہلا سا پھیلاؤ باقی نہیں رہا اور انسان کو اپنے تفریحی مشاغل میں کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کرنی پڑی تو اس کا وہ مزاج جسے کہانی سننے کا چسکا ہمیشہ سے ہے افسانہ کی ایک ایسی صنف کا طلبگار ہوا جو زندگی اور فن کو اس طرح سموئے کہ انسان کو اس سے ذہنی سرور و مسرت کا سرمایہ بھی ہاتھ لگے، زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور اپنے ماحول کو حسین تر بنانے کی آرزو بھی پوری ہو اور اس کے باوجود اتنی مختصر ہو کہ وقت پر اس کی گرفت مضبوط رہے، وہ اپنے بے شمار مشاغل میں سے بھی کہانی پڑھنے کا وقت نکال سکے، زمانے کے یہ سب تقاضے اور انسان کی یہ سب ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیق کی بنیاد بنیں۔

اردو میں جس طرح ناول کی ابتدا ہو جانے کے بعد بھی داستان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانہ میں مختصر افسانہ پیدا ہوا اور پروان چڑھنا شروع ہوا۔ افسانہ کی پیدائش کے دن وہ ہیں جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے —— پھر ایک بات اور بھی ہے کہ ناول کہانی کی ایک منفرد اور ممتاز صنف ہونے کے باوجود مدتوں اپنے آپ کو داستان کے سحر و افسوں سے آزاد نہ کر سکا اور ہمارے ابتدائی ناول نگاروں میں سے ہر ایک کے یہاں داستان کے رنگ کی جھلکیاں اور اس کے نور کی کرنیں برابر اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ یہی صورت مختصر افسانہ کے ساتھ پیش آئی۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دلکش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے، سوز وطن، پریم پچیسی اور پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوز وطن، ان کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں خارستان و گلستان، سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص کیوپڈ اور سائکی اور الحمرا کا گلاب وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگاریں ہیں۔

سوز وطن کے افسانوں میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "شیخ مخمور" کی فضا اور ماحول سرتاسر رومانی ہے، اس رنگین اور رومان انگیز فضا میں کرداروں کا مزاج، ان کا جذباتی انداز فکر و نظر، گفتگو کا شاعرانہ اور پُرتصنع اسلوب، افسانے کے انجام میں حق کی اقدار کی فتح، یہ سب داستانی رنگ کی باقیات ہیں۔ اسی طرح پریم پچیسی اور پریم بتیسی کی کہانیوں میں تاریخ و روایت کا افسانوی اسلوب، کرداروں کی دلیرانہ اور حق پرستانہ سیرت، ان کے افعال و کردار پر غیر فطری جوش کا غلبہ، حق کی حمایت میں عمل کے جذباتی اور بعض صورتوں میں غیر منطقی حدود —— یہ سب کچھ بھی افسانہ نے داستان کی روایت سے حاصل کیا اور اسے برقرار رکھا ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں افسانوی فن کے مزاج اور اس کی فطرت کے احترام اور انہیں فکر و عمل کے منطقی حدود میں رکھنے کی عام روش کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کی رنگینیوں اور بہار آفرینیوں کو جذبۂ محبت اور رومان کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات اور حسن فطرت میں باہمی ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کا رجحان داستانی فن کی روایات سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں موضوع سے لے کر اس کی ہیجان انگیز و نشاط آفریں ترتیب و تشکیل اور کرداروں کے پُرجوش رومانی عمل اور ردعمل تک ساری چیزیں داستانوں کے تخیلی اور نشاط انگیز اسلوب سے مستعار ہیں۔ ان افسانوں کے

واقعات اور کرداروں میں حقیقت کی رنگ آمیزی کے باوجود رومانی جذباتیت اور فکری ترتیب کے باوجود شاعرانہ حسنِ بیان کا غلبہ بھی داستان کی زندہ کی ہوئی روایت کی پیروی ہے اور پھر سلطان حیدر جوش کے معاشرتی اور اصلاحی افسانوں میں ایک خاص وضع اور انداز کے سوچنے والوں اور اخلاق کی مخصوص اقدار کو پسندیدہ سمجھنے والوں کو مسرور و مطمئن کرنے کی کوشش بھی داستان کی اس روایت کا عکس ہے جس میں قاری کی خوشنودی کو فن کی سب سے اہم قدر سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ابتدائی دور کے ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں مختلف حیثیتوں سے داستان کی قائم کی ہوئی فنی روایت کا جو گہرا عکس ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ سب تخلیقات کہانی کی ایک نئی صنف کے نقشِ اول بھی ہیں ——— ایسا نقش جس سے زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور افسانوی فن کی روایت میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے کہانی سنانے اور قاری اور سامع کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی قدیم روش پر قائم رہ کر بھی کہانی کو فن کی حیثیت سے بعض نئی چیزیں دیں۔ داستان اور ناول میں اب تک تخیل اور تصور کی پیدا کی ہوئی عالمِ ذہن کی پہنائیاں اور مشاہدے اور تجربہ کی دی ہوئی دنیا کے حقیقت کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں کہانی کا پس منظر بنتی تھیں اور اس پس منظر میں واقعات، کردار، زندگی کے مسائل کی کثرت و فراوانی اور فطرت اور اس کے حسن کی رنگینی اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہوتی تھی کہ پڑھنے اور سننے والے کے لئے (داستان کی روایت میں پڑھنے اور سننے کی جگہ ایک ہی ہے) ایک چیز کو دوسری سے الگ کرنا ناممکن تھا۔ افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔ مختصر افسانہ میں اختصار اور ایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسنِ ترتیب و توازن کی ضرورت پیدا کی اور یہ سب چیزیں ہمیں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے ان افسانوں کے ذریعہ ملیں جنہوں نے داستان کی روایت کو بھی زندہ رکھا اور کہانی کی ایک نئی صنف کی بنیاد بھی ڈالی۔

پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی رکھی ہوئی بنیاد پر اگلے ۲۰، ۲۵ برسوں میں علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، ل۔ احمد اکبر آبادی، حامد اللہ افسر، محشر عابدی، مسعود علی ذوقی، طالب باغپتی، کوثر چاندپوری اور فضل حق قریشی نے افسانوی فن کی ایک ایسی عمارت کی تعمیر کی، جس میں زندگی کی حقیقتیں اور فن کی رعنائیاں دست بدست ایک دوسرے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں نے افسانہ کو حقیقت و شعریت، صداقت و تخیل اور زندگی و فن کے امتزاج کا جو نقشِ اوّل بنایا تھا۔ اسے ان افسانہ نگاروں نے زیادہ ابھارا، چمکایا اور رنگین بنایا۔ ان سب نے تخیل کے بجائے مشاہدہ کو اور شعریت کی جگہ غور و فکر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لینے کو کافی جانا ہے۔ بحرِ حیات میں کود کر اس کے "تلاطم" کا مقابلہ کرنے کی عادت ان میں ابھی پیدا نہیں ہوئی زندگی کے ایوان میں داخل ہو کر اس کے رازہائے دروں سے واقف ہونے کی خواہش اور طلب، انہیں بے چین اور بے قرار نہیں کرتی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں زندگی کا رنگ نسبتاً زیادہ شوخ ہونے پر بھی اتنا تیکھا نہیں کہ دیکھنے والے کی نظر کو مسحور کر سکے۔ ان میں فن کی ترتیب پہلے کے مقابلہ میں زیادہ متوازن ہونے کے باوجود اب بھی اتنی منطقی نہیں کہ کہانی کا انجام اس کے گزرے ہوئے اجزاء کا منطقی، لازمی اور ناگزیر نتیجہ معلوم ہو۔ اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر اور قاری کے نقطۂ نظر سے دل خوش کن انجام اب بھی عموماً ان کا فنی مطمحِ نظر اور نصب العین ہے۔ اب بھی اتفاقات کو، ایسے اتفاقات کو جو پیچیدہ سے پیچیدہ صورتِ حال کو مصنف اور اسی طرح قاری کی پسند کے سانچے میں ڈھال سکیں ان افسانوں کے فن میں خاصا دخل ہے۔ اب بھی جذباتیت اور مثالیت فن کے توازن و اعتدال کے راستہ میں حائل ہیں۔

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد سے البتہ افسانوں میں زندگی کے نقش نسبتاً زیادہ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ کے شدید معاشی اور سیاسی

ہیجان و اضطراب نے ہر حساس انسان کے دل میں انسان اور انسانیت کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اسے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا فنی منصب سمجھنے کی طرف پہلی مرتبہ قدم بڑھایا۔ پریم چند نے اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کی اور زندگی کے گھمسان میں کود کر ایک سپاہی کی طرح ان قوتوں کو مٹانے کا تہیہ کیا جن کے ہاتھوں انسانیت درد میں مبتلا تھی۔ یہ خدمت فن کار اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک زندگی اور اس کے مسائل پر اس کی گرفت پوری طرح مضبوط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ہمیں افسانہ نگاری ایک ایسے دور سے گزرتی دکھائی دیتی ہے جس میں افسانہ نگاروں نے زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن پر وہ پوری طرح حاوی ہیں افسانہ نگاروں نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے اور اس کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہونے کو اپنے فنی نصب العین کی پہلی منزل بنایا ہے۔ پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، اعظم کریوی، مجنوں گورکھپوری، سدرشن، ل۔ احمد اکبر آبادی، راشد الخیری، عظیم بیگ چغتائی —— سب کے افسانے صرف اس ماحول کے مصور ہیں جس پر ان کی نظر گہری ہے، اور صرف اس مقصد کے ترجمان جس سے انہیں پورا جذباتی لگاؤ ہے زندگی سے، اس قرب کے ساتھ فن کا احساس بھی ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں اب تیز تر ہے۔

اسی فنی احساس کی ایک دوسری نمایاں صورت یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے دوسری زبانوں کے افسانے اردو میں منتقل کر کے اردو افسانہ کو فن کی ان نزاکتوں اور لطافتوں سے روشناس کرایا جن تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ ایسے ترجمہ کرنے والوں میں محمد مجیب، خواجہ منظور، منصور احمد اور جلیل قدوائی کے نام اہم ہیں۔ ان ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ لکھنے والوں کا ایک گروہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے جس نے مغربی شاہکاروں سے متاثر ہو کر ایسے طبع زاد افسانے لکھے جو زندگی اور فن کے امتزاج کے موثر اور دلکش نمونے ہیں —— حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احمد علی اور فیاض محمود اس گروہ کے ایسے نمائندے ہیں جنہیں مختصر افسانے کے فن کی تاریخ میں اس لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ ان کی تخلیقات نے افسانے کو مغرب کے بلند ترین معیاروں سے قریب لانے کی مہم کو آسان بنایا۔

مختصر افسانے کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اول تو اس لئے کہ اس سال تک مختصر افسانے نے فنی ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں ان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ جس کا آغاز اردو میں ایک ایسی صنف کی طرح ہوا جس پر فن اور اسلوب کے اعتبار سے داستان کا خاصا گہرا اثر تھا سادگی اور رنگینی کی اس فضا سے نکل کر ایسی ایسی راہوں سے گزرا جن پر اسے زندگی کے قرب اور فن کے احساس نے برابر نئی نئی چیزوں سے آشنا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء تک پہنچتے پہنچتے اس نے فن کے بے شمار مراحل طے کر کے ایسی صورت اختیار کی، جس میں تکمیلِ فن کے سراغ موجود ہیں۔ پھر یہ کہ اس منزل پر پہنچ کر ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جو ایک طرف تو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کی بڑی لطیف آمیزش ہے اور دوسرے اس لئے کہ مغرب کا جو فن آہستہ آہستہ ہمارے مختصر افسانے کے اسلوب کو متاثر کرتا اور اسے تکمیل کی راہیں دکھاتا رہا تھا وہ ان افسانوں کے ذریعہ ایک باغیانہ انداز میں اردو افسانے کی روایت میں داخل ہوا۔ پہلی قسم کے افسانوں کی سب سے نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ 'کفن' ہے اور دوسری طرح کے افسانوں کا نمونہ افسانوں کا وہ بدنام مجموعہ جو 'انگارے' کے نام سے چھپا۔ 'کفن' زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے اور 'انگارے' کے افسانے اس ذہنی اور باغیانہ روش کے علم بردار جس کے بغیر فن میں نئی راہوں کا کھلنا بند ہو جاتا ہے اور اس لئے فن کے لئے ہر ترقی کے مدارج مسدود و ممنوع ٹھہرتے ہیں۔ 'کفن' اور 'انگارے' کے بعد اور اسی کے ساتھ وجود میں آنے والی ترقی پسندی کی تحریک نے مختصر افسانے کو بڑی تیزی سے ایسا بننے میں مدد دی کہ اگلے دس برسوں کے اندر اس کی بعض تخلیقات دنیا کی بہترین افسانوی تخلیقات کی ہمسری کے قابل ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانوں کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے۔ افسانہ کے اس عروج و شباب

کے آغاز تک داستان اپنی زندگی پوری کر چکی تھی اور میر باقر علی داستان گو کی وفات نے اس بزم کی آخری شمع کو گل کر دیا تھا۔ ناول نے البتہ اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ارتقا کے بہت سے مراحل طے کئے اور پریم چند کی وفات کے وقت تک انہی کے ہاتھوں، ناول اس بام عروج تک پہنچ چکا تھا جس سے اونچا پریم چند کے پیشرو اسے نہیں لے جا سکے اور اس طرح گویا ۱۹۳۶ء تک فن کی حیثیت سے داستان کا وجود باقی نہیں رہا اور ناول کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکا اور اس طرح اب افسانوی ادب کی صرف ایک صنف (یعنی مختصر افسانہ) پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ وہ زندگی کی خدمت گزاری اور فن کی ناز برداری کے دوہرے منصب کو پورا کرے اور اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانے نے یہ دونوں منصب اس طرح پورے کئے کہ زندگی اور فن دونوں کے لئے باعث ناز و افتخار ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، اختر انصاری ـــــ حیات اللہ انصاری، منٹو، حجاب، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور ان کے مابعد غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، شفیق الرحمٰن، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، اور تسنیم سلیم چھتاری اس دور کے وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے پڑھنے والوں کے ایک وسیع حلقے میں مقبولیت بھی حاصل کی اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں افسانے کے فن کو کوئی نہ کوئی نئی چیز بھی دی۔ اس دور کی افسانہ نگاری میں مجموعی حیثیت سے تین خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر افسانہ نگار نے اس چیز کے شدید احساس کے ساتھ کہ افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں بڑا گہرا اور ناگزیر ربط ہے اپنے افسانوں کے لئے زندگی کے اس مخصوص پہلو کا انتخاب کیا ہے جس کی جزئیات کا علم اسے سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے علی عباس حسینی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی اور دیوندر ستیارتھی کے افسانے دیہاتی زندگی کے افسانے ہونے کے باوجود ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے رنگ رنگ دیہاتیوں کے مصور اور ترجمان ہیں۔ اشک، بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، غلام عباس، عصمت، تسنیم سلیم، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر، حسن عسکری وغیرہ شہری زندگی کے افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو ان کے مشاہدہ سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا ہے پھر بھی کشمیر کے متعلق سب سے زیادہ لکھا ہے۔ منٹو کی نظر سینکڑوں چیزوں پہ ہے پھر بھی بلیٹی ان کا سب سے عزیز موضوع ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مشاہدہ اور مطالعہ میں زندگی کے کسی خاص پہلو کی تخصیص کو اس دور کے افسانہ نگاروں نے اپنی خصوصیت بنایا ہے۔

اس دور کے افسانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت کا بہت گہرا پرتو ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے جس موضوع پر بھی افسانہ لکھا ہے اس پر اپنے اندازِ فکر، اپنے طرزِ تخیل اور اپنے جذبات و احساس کی بڑی گہری مہر ثبت کی ہے اور اس طرح ماحول کی تخصیص کے ساتھ ساتھ مصنفوں کی انفرادی شخصیتوں کی گوناگونی نے اس دور کے افسانے کو ہزار رنگ دے دئے ہیں۔

اور پھر تیسری بات یہ کہ اس دور کے افسانہ نگار اسلوب اور فن میں نئے تجربے کرنے سے نہیں گھبراتے۔ ان میں دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنا لینے کا حوصلہ بھی ہے اور نئے اسلوب تلاش کرنے اور انہیں بے جھجک سامنے لانے کی جرأت بھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ماحول کے صد گونہ تنوع اور شخصیتوں اور مزاجوں کے رنگارنگ فرق نے ہمارے افسانے کو جو نئے سے نئے انداز دئے تھے ان میں نئے تجربوں کی شوخی اور جرأت نے اور چار چاند لگائے اور اس طرح اس نئے دور کا افسانہ موضوع کے تنوع کے اعتبار سے، اسلوب کے نئے پن کے لحاظ سے اور فکر، تخیل اور احساس کی گوناگونی کے نقطۂ نظر سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں جدت اور روایت کا بڑا شیریں اور لطیف امتزاج ہے اس میں ایک خاص عہد کی سیاسی زندگی اور اس سیاسی زندگی سے پیدا ہوتے ہوئے معاشی

اور معاشرتی نتائج کی بڑی واضح اور مکمل تصویریں ہیں اور خارجی حقائق کی تصویروں کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات، احساسات، افکار اور نفسیاتی ردِ عمل کا بڑا صحیح عکس بھی۔ اجتماعی زندگی کے مسائل فرد کے ذہن اور اعصاب پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا مطالعہ اس دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی باریک بینی سے کیا ہے اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں فرد کے فکری اور جذباتی ردِ عمل کی جو صورتیں دیکھی ہیں انہیں ملے جلے علمی اور فنی انداز میں اپنے افسانہ میں جگہ دی ہے اور مشاہدہ کی اس وسعت اور دقتِ نظر نے اسے جو نئے نئے موضوع دیئے، ان کے اظہار کے لئے اس نے فن کے نئے نئے تجربے کرنے کی طرف قدم بڑھایا اور اس طرح اس دور کے افسانوں میں زندگی کی پوری گہما گہمی اور فن کے نئے سے نئے اسالیب نے ایک دوسرے کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ فن زندگی کا خدمت گزار اور معاون ہے اور اس کے بدلے میں زندگی فن کو نئی راہیں سجھاتی اور اس خدمت گزاری کا حق ادا کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی زندگی میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کے ظاہر ہونے سے پہلے ہمارا افسانہ فن کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی کے حقائق، فن کار کی شخصیت اور فن کا حسن ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہو جاتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد خاصے عرصے تک معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر انتشار اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ انسان ایک ناقابلِ بیان بحران میں مبتلا رہا اور اس کے جذبات، احساسات اور افکار، اعتدال و توازن کی اقدار سے عاری و بیگانہ ہو گئے اور اس طرح فن کار کے لئے متوازن فنی تخلیق کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ ان حالات میں اکثر افسانہ نگاروں نے کچھ نہیں لکھا اور پھر جب آہستہ آہستہ انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانوں کا موضوع یہ زبردست انقلاب اور اس انقلاب کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی شاخسانے تھے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت اکثر لکھنے والے اپنے آپ کو جذباتی ہیجان سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور جنہوں نے اپنے جذبات و اعصاب پر قابو پا کر کوئی متوازن افسانہ لکھا اس میں واقعات کی عکاسی اور اصلاح پسندی کا رجحان اس درجہ غالب ہے کہ فنی اقدار کو پوری طرح ابھرنے کا موقع بہت ہی کم ملا ہے۔

تقسیم سے پہلے جن افسانہ نگاروں نے اس فن میں رہنمائی کا شرف حاصل کیا تھا یا جنہوں نے زندگی اور فن پر پوری گرفت حاصل کر کے اپنے لئے کوئی امتیازی جگہ بنائی تھی انہوں نے بھی تقسیم کے بعد کے زمانہ میں جو کچھ لکھا اس میں فن کا شعلہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا ہے ـــــ کم از کم علی عباس حسینی، جگن ناتھ آزاد(؟) بیدی، حجاب امتیاز علی، اپیندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری کا یہی حال ہے۔ یہ بات البتہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اسلوبِ خاص کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں کہیں کہیں ضرور نظر آ جاتی ہیں۔ کرشن چندر اور منٹو نے تقسیم کے بعد بھی حسبِ معمول کثرت سے لکھا اور میر کی طرح کبھی بہت اچھا اور کبھی بہت برا لکھنے کی روش قائم رکھی۔ فن تو ان دونوں فن کاروں کے ہاتھوں انحطاط اور زوال سے زیادہ آشنا ہوا ـــــ ترقی کا روئے زیبا اسے کم دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن اس دور کے جن افسانوں کو "حسن و زیبائی" کی سند ملی ہے ان میں موضوع، شخصیت اور فن کا رچاؤ موجود ہے۔ یہ رچاؤ، ٹھہراؤ اور استقلال احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور غلام عباس کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہے اور ہاجرہ مسرور، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، مہندر ناتھ، دیوندر ستیارتھی، تسنیم سلیم، قدرت اللہ شہاب اور شفیق الرحمٰن کی جستہ جستہ کہانیوں میں۔ ایک چیز البتہ ان سب لکھنے والوں کی یہاں صاف نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا وہ اسلوبِ فن جس کی تخلیق میں ان کے مخصوص ماحول، ان کے منفرد اندازِ فکر و تخیل، ان کے جذباتی میلان اور شخصیت کے مختلف اجزاء نے پورا حصہ لیا تھا اب بھی قائم ہے اور اس اسلوب کی بدولت ہر ایک کا افسانہ دوسرے سے الگ ایک ایسے رنگ کا حامل نظر آتا ہے جس میں ایک مخصوص دلکشی اور تاثیر ہے۔

ان افسانہ نگاروں کی ان دکا دکا فنی تخلیقات کے علاوہ جن میں فن کا رچاؤ موجود ہے یا ان دو چار افسانہ نگاروں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر آیا (ندیم، غلام عباس، بونت سنگھ اور کبھی کبھی منٹو اور کرشن چندر) اس دور کے پورے فن پر انحطاط کی اقتدار کا سایہ ہے۔ فن کار جیسے یا تو تھک گیا ہے یا سیاسی اور اقتصادی حالات کے بوجھ نے اس کی ساری تخلیقی قوتیں سلب کر لی ہیں یا ماحول میں اسے ایسے محرکات میسر نہیں ہیں جن میں ادب اور فن پوری آزادی سے پروان چڑھتے ہیں۔

یہ حال تو پرانے لکھنے والوں کا ہے ——— لیکن ان پرانے لکھنے والوں کے علاوہ تقسیم کے بعد بعض نئے لکھنے والے افسانوی ادب اور فن کے ایوان میں داخل ہوئے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ——— ان نئے آنے والوں میں انتظار حسین، اے حمید، دیوندر اسر، انور، ضمیر الدین، انور عظیم، خلیل احمد، ابن الحسن اور اشفاق احمد کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نئے لکھنے والوں میں سے ہر ایک نے موضوع کے انتخاب اور اسے پیش کرنے کے فنی اسلوب میں اپنے ذہنی و جذباتی رجحانات کو دخل دیا ہے اور اس لئے ہر ایک کے افسانے ماحول کے بعض مشترک تاثرات و رجحانات کے حامل ہونے کے باوجود اس کے مخصوص فکری، تخیلی اور جذباتی میلانات کا عکس ہیں۔

ان نئے افسانہ نگاروں نے عموماً اپنے مشاہدہ کے لئے ایک خاص میدان منتخب کر کے اسے اپنی کہانی کا پس منظر بنایا ہے، اس مخصوص اور محدود ماحول سے الگ ان سب نے عموماً بین الاقوامی سیاست اور معیشت کے بدلتے ہوئے حالات پر بھی نظر رکھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں ماحول اور فرد کے رشتے کا پوری شدت سے احساس ہے اور اس لئے ان سب نئے لکھنے والوں کی کہانیاں ایک مخصوص اور محدود ماحول کی کہانیاں ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی زندگی کے رجحانات کا عکس اور فرد کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

موضوع کے ان مشترک پہلوؤں سے قطع نظر، اندازِ بیان میں بھی ان سب لکھنے والوں نے تفصیل و تشریح کے بجائے ایجاز و اختصار اور اشاریت و ایمائیت کو اپنے مقصد کے لئے زیادہ پسندیدہ جانا ہے۔ ان لکھنے والوں نے ادبیت و شعریت، طنز و مزاح اور بیان کی جدتوں کو اظہار کا موثر وسیلہ سمجھ کر اپنے اسالیب میں انہیں پوری آزادی سے جگہ دی ہے ——— اور پھر ان وسائل سے کام لے کر افسانوں میں صرف اس موضوع کو جگہ دی ہے جو ان کی پسند اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ——— مثلاً خلیل احمد کے افسانے انسان کی اس ذہنی کیفیت کی مصوری کرتے ہیں جو زندگی اور ماحول سے بیزاری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ——— ابن الحسن کی کہانیاں عموماً ایسے کرداروں کی کہانیاں ہیں جنہیں ماحول کا رنگ اتنا پختہ کرتا ہے کہ کوئی طوفان، کوئی انقلاب اسے ہلکا اور پھیکا نہیں کر سکتا۔ ضمیر الدین نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ انسان کے ظاہری عمل اور باطنی کیفیت کے ربط و تعلق کی وضاحت کی ہے۔ انور عظیم کے افسانے بھی ذرا تیکھے انداز میں کرداروں کے ماحول اور مزاج کے اسی رشتہ کی تصویریں کھینچتے ہیں ——— شوکت صدیقی کے افسانوں میں ایسے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جنہیں ماحول کی ستم ظریفیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ماضی کی یادوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ دیوندر اسر نے تصور و تخیل کی دنیا میں پناہ لینے کے بجائے آزادی کے نغمے گانے اور حقیقت کی ایک ایسی دنیا آباد کرنے کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے جس میں زندگی دکھوں سے آزاد ہو سکے ——— اے حمید کے افسانوں کا پسندیدہ موضوع زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ حسین مناظرِ فطرت ہیں ——— انتظار حسین کی کہانیاں ایک مخصوص معاشرے اور اس معاشرے کے کرداروں کی کہانیاں ہیں اور اشفاق احمد کی کہانیاں کسی مخصوص ماحول کی پابندی کے بغیر اسی محبت کی کہانیاں ہیں جس کا نور ہر دل میں موجود ہے۔

موضوع کی ندرت کی یہ راہیں افسانہ نگاروں کو ان کے مخصوص مزاج اور ذاتی پسند و ناپسندیدگی نے دکھائی ہیں اور انہی راہوں پر چل کر ان نئے لکھنے والوں نے کبھی کبھی ایسی کہانیاں لکھی ہیں کہ وہ ذہنی انحطاط کے اس دور میں بھی ہمیں مایوسی کے احساس سے بچاتی ہیں لیکن یہ احساس اب بھی ہر ایک کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کہ یہ کارنامے اس سطح تک کبھی نہیں پہنچتے جس تک وہ اپنے دورِ عروج یعنی کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو وغیرہ کا عہد، میں پہنچتے تھے۔ لیکن اس کھٹک اور خلش کے ساتھ ایک بات تسکین کی بھی ہے اور وہ یہ کہ ان نئے لکھنے والوں میں سے اکثر میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن سے فن کو عظمت ملتی ہے ــــــــ شرط صرف یہی ہے کہ فن کار فکر، تخیل اور احساس کی گہرائیوں میں جذب ہو کر اپنے کام کو پورے خلوص، پوری دیانت اور پوری مشقت سے انجام دینے کے عادی بنیں کہ افسانہ نگاری کی جوئے شیر بھی کوہ کنی کے بغیر ممکن نہیں بنتی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مختصر افسانے کا فن

مختصر افسانہ وہ افسانہ ہی نہیں ہوتا جو صرف مختصر ہو۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے ——— اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ضرور ہے لیکن اس اختصار کے ساتھ ساتھ جب تک اس میں دوسری خصوصیات موجود نہ ہوں، اس کو مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا ——— مختصر افسانہ تو ایک فن ہے جس کے اپنے جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات ہیں ——— افسانہ جب تک ان اصول اور مقتضیات کو پورا نہیں کرتا، اس وقت تک اس کو مختصر افسانے سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ ایسے افسانے جن میں محض اختصار ہوتا ہے اور جو ان جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ تو ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک تاریخ کے مختلف ادوار میں برابر تخلیق کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان جمالیاتی اور فنی مقتضیات نے مختصر افسانے کو جو مخصوص شکل دی ہے وہ دورِ جدید کی پیداوار ہے ——— ویسے کہیں کہیں ان اصول اور مقتضیات کی جھلک ان افسانوں میں بھی جگہ جگہ نظر آ جاتی ہے جن میں محض اختصار ہے اور جو ہر ملک اور ہر قوم کی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ——— مختلف ملکوں کے علم الاصنام اور دیومالا میں ان کہانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بائبل اور دوسری مذہبی کتابوں میں ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں ——— ان کہانیوں اور داستانوں کو مختصر افسانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں کہیں کہیں مختصر افسانے کی سی بات پیدا ضرور ہو جاتی ہے اس لئے مختصر افسانے کی روایت یوں زندگی اور ادب میں بہت پرانی ہے لیکن اس نے ایک مستقل فن کی صورت موجودہ دور ہی میں اختیار کی ہے اور اس کی بنیاد جدید دور کے جمالیاتی تقاضوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ افسانہ جو صرف مختصر ہو مختصر افسانہ نہیں ہے بلکہ مختصر افسانہ وہ صنفِ ادب ہے جس کے فن کی اپنی ایک دنیا ہے، اور اس دنیا کے اپنے اصول ہیں، اپنی قدریں ہیں، اپنے معیار ہیں، اپنے قواعد و ضوابط ہیں ——— مختصر افسانہ انہی اصولوں، قدروں اور معیاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ انہی سے عبارت ہے۔

یہ اصول، قدریں اور معیار کیا ہیں؟ ان کا وجود کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کون سے حالات تھے جن میں ان کی تخلیق ہوئی؟ اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ان کو پروان چڑھایا اور اس طرح ان کو فروغ دینے کا باعث بنے؟ ——— یہ سوالات مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ——— اور ان سوالات کو حل کرنے ہی میں مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے کا راز مضمر ہے۔

مختصر افسانے کا فن انیسویں صدی کے دورِ آخر کی پیداوار ہے۔ اس سے قبل یہ فن کسی مستقل صورت میں نظر نہیں آتا۔ ویسے اس سے قبل بھی افسانے لکھے ضرور جاتے تھے۔ ان افسانوں میں اختصار بھی ہوتا تھا لیکن اس اختصار کے باوجود وہ داستانوں اور ناول سے زیادہ قریب تھے ان میں ایک پھیلاؤ ہوتا تھا، ایک وسعت ہوتی تھی۔ پلاٹ کی پیچیدگی اور کرداروں کی رنگارنگی کے سہارے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اسی لئے مجموعی طور پر ان کا میدان رنگین اور بھی وسیع ہوتا تھا۔ وحدت اور ہم آہنگی کی طرف ان میں بہت کم توجہ دی جاتی تھی —— بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہر زبان میں ایسے افسانوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ انگریزی میں ڈکنس نے ایسے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ فرانس میں بالزاک ایسے افسانے لکھنے میں پیش پیش رہا ہے۔ روس میں ٹالسٹائی کے یہاں اس قسم کے افسانے موجود ہیں۔ — اردو میں سرشار، شرر، نذیر احمد، راشد الخیری وغیرہ کے یہاں ایسے افسانوں کی فراوانی نظر آتی ہے —— غرض مختصر افسانے کی تخلیق سے قبل کوئی عہد بھی ایسے افسانوں سے خالی نہیں رہا —— لیکن یہ افسانے فنی اعتبار سے اپنا کوئی انفرادی شان پیدا نہ کر سکے —— اور اسی لئے ان افسانوں کی کوئی فنی و جمالیاتی اہمیت نہیں ہے۔ صرف کہانی کا نشیب و فراز انہیں دلچسپ بناتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں میں دلچسپی کا محور ہیئت اور فن کے مقابلے میں موضوع اور مواد زیادہ ہوتا تھا اور اسی کے سہارے وہ زندہ رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں مختصر افسانے کے جس فن کا آغاز ہوا اس کو ان افسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ وہ تو ان افسانوں سے موضوع اور مواد فن اور ہیئت دونوں اعتبار سے مختلف تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے حالات بڑی حد تک بدل چکے تھے۔ زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی تھی اور اس کے نتیجے میں معاملات و مسائل میں تغیر ہوا تھا۔ افراد کے مذاق میں تبدیلی ہوئی تھی۔ ان کے فنی شعور نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا اس لئے ان کے جمالیاتی تقاضے بھی کچھ اور تھے۔ —— مختصر افسانے کو اسی بدلتے ہوئے فنی شعور اور نئے جمالیاتی تقاضوں نے پیدا کیا —— ایک عام خیال یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے زیر اثر انسانی زندگی کو جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اس نے مختصر افسانے کی تخلیق کی۔ اس خیال کو بنیاد بنا کر بعض نے اس رائے کا اظہار کیا کہ انیسویں صدی تک آتے آتے چونکہ انسان بہت مصروف ہو چکا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ بڑی تخلیقات سے دلچسپی لے سکے۔ اس لئے اس نے ناول کی جگہ مختصر افسانے کو پیدا کیا —— اس خیال میں ایک حد تک تو صداقت ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں بڑی ہی سطحیت کا احساس ہوتا ہے —— یہ بات تو صحیح ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے انسان صنعتی انقلاب کے باعث خاصا مصروف ہو گیا تھا، اس کے پاس فرصت کے لمحات بہت کم رہ گئے تھے اس لئے وہ اپنی جمالیاتی تسکین کی خاطر ادب اور فن کی ایسی اصناف کو تخلیق کرنا چاہتا تھا جن سے دلچسپی لینے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ اسی صورتِ حال نے مختصر افسانے کی بنیاد رکھی لیکن اس سے کہیں زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ صنعتی انقلاب نے جو حالات پیدا کئے تھے۔ انہوں نے انسانی مزاج کو تبدیل کیا تھا۔ ان کے مذاق میں ایک بدلی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنی جمالیاتی تسکین کے لئے نئے اصناف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ادب کے ہر شعبے میں نئے اصناف کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ شاعری میں ہیئت اور اسالیب کے نئے تجربے کئے۔ ناول کو نئے سانچوں میں ڈھالا —— مختصر افسانہ بھی بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے تجربات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مختصر افسانے نے ایک نئی صنفِ ادب کی حیثیت سے موجودہ دور میں ان گنت افراد کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد تمام تر مختصر افسانے کے اختصار ہی پر نہیں ہے —— اگر ایسا ہوتا تو مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ناول کے فن کا ارتقائی تسلسل جاری نہ رہتا اور مختصر افسانے کے فن میں طویل مختصر افسانے کے نت نئے تجربے نہ ہوتے۔ ناول کا فن مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا ہے لیکن نئے جمالیاتی احساس نے اس میں نئے تجربے کئے ہیں اور اس طرح اس کی ہیئت بھی بدلی ہے۔ بہت سے نئے ناول نگاروں کے یہاں اس صورتِ حال کا

احساس ہوتا ہے ——— اور ناول کے ان تجربات میں بڑی حد تک ان ایمائی، اشاراتی اور کنایاتی پہلوؤں کو دخل ہے جو موجودہ دور کے تمام اصنافِ ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور اس کا احساس نہ صرف ان ناولوں میں ہوتا ہے جن کو نئے تجربات نے مختصر کر دیا ہے بلکہ طویل ناولوں میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے ——— وہ ناول جو اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان میں ورجینیا وولف کے بعض ناول خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر (THE LIGT HOUSE) اور THE WAVES مختصر ناولوں کے ان تجربات کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جس نے انہیں شاعری اور نظم سے زیادہ قریب کر دیا ہے ——— اور طویل ناولوں میں جیمس جوائس کا ناول یولاسی سینرد (ULYSSES) اس کی بہت اچھی مثال ہے ——— ہر چند کہ اس ناول میں تفصیل اور جزئیات کا بیان ہے لیکن اس تفصیل اور جزئیات کے باوجود مجموعی طور پر جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا اشاراتی اور کنایاتی پہلو ہے ——— بلکہ جیمس جوائس کے فن کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے ان دونوں کا ایک سنگم بنایا ہے ——— اور ورجینیا وولف اور جیمس جوائس ہی پر منحصر نہیں جدید دور کے ہر اچھے ناول نگار کے یہاں اس قسم کے تجربات نظر آتے ہیں ——— اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نئے دور کا انسان بڑی حد تک بدل گیا ہے ——— بدلتے ہوئے حالات نے اس کے مزاج اور اس کے جمالیاتی احساس میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور ناول میں ہیئت کے یہ تجربے جن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، درحقیقت اسی بدلتے ہوئے جمالیاتی احساس کا نتیجہ ہیں ——— صنعتی انقلاب کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں انہوں نے زندگی کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے اور زندگی کی اس پیچیدگی سے افراد کچھ مانوس سے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ کچھ مطابقت سی پیدا کر لی ہے۔ چنانچہ سیدھی سادی باتوں میں انہیں لطف نہیں آتا ——— سامنے کی باتوں سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن تو زندگی کی تہوں کو کھولنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی تہوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے بغیر ان کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم نہیں ہوتا ——— جدید دور کے پیچیدہ ماحول نے افراد کے ذہنوں کو تیز کیا ہے، ان کے احساس میں شدت پیدا کی ہے اور ان کے تخیل کو بلند پرواز بنایا ہے ——— یہ سب باتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ موجودہ دور کے افراد فن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز سے دلچسپی لیں کیونکہ اس طرح اشاروں اور کنایوں کی تہوں کو کھولنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اس طرح اپنی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ——— ان کے نزدیک اسی اشاراتی اور کنایاتی انداز سے فن میں حسن کی قدر پیدا ہوتی ہے ——— مختصر افسانہ موجودہ دور کی اسی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی پیداوار ہے۔ اس کے پیچھے اس نئے جمالیاتی احساس کے تقاضے ہیں جو اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کے زیرِ اثر ایک نیا روپ اختیار کر رہا تھا اور جس نے ادب اور فن کی اقدار میں بعض اہم تبدیلیاں رونما کر دی تھیں۔ مختصر افسانے کا فن ان تبدیلیوں کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔

ناول اور مختصر افسانہ یوں بظاہر دیکھنے میں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصنافِ ادب کی حیثیت سے ان کا ایک دوسرے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ناول بہر حال ناول ہے اور مختصر افسانہ بہر حال مختصر افسانہ ہے۔ موجودہ دور میں مختصر افسانے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ناول کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مختصر افسانہ ناول کی کوئی ارتقائی صورت ہے۔ ناول اور افسانہ چونکہ دو مختلف اصناف ہیں اس لئے ان میں کسی آویزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ جدید دور میں افسانے کے ساتھ ناول کے فن میں بھی ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے ——— مختلف زبانوں میں بہت اچھے افسانوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے ناول بھی لکھے گئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ ان دونوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے ——— وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول اور مختصر افسانہ دونوں کے پیمانے مختلف ہیں۔ ناول زندگی کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کی عکاسی کرتا ہے اور مختصر افسانے کے پیشِ نظر زندگی کے ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا وسعت اور پھیلاؤ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختصر افسانہ تو زندگی کی کسی وقتی اور لمحاتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کی وسعت اور کسی طرح کے پھیلاؤ کی ترجمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ناول میں انسان کی زندگی کے سامنے

نشیب و فراز کی تصویریں ہوتی ہیں۔ بچپن سے لے کر مرتے دم تک افراد کو جو واقعات پیش آتے ہیں' جن معاملات و مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ سب ناول کے فن کا موضوع بنتے ہیں۔ اسی لئے ناول میں تفصیل و جزئیات ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مختصر افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے' کسی ایک فرد پر بیتا ہوا کوئی ایک واقعہ' اس کی کوئی ایک مخصوص وقتی کیفیت' کوئی ایک ذہنی اُلجھن افسانے کا موضوع بن سکتی ہے۔ ظاہر ہے کسی وقتی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے تفصیل و جزئیات سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسی لئے مختصر افسانے میں اختصار اور اجمال ہوتا ہے ___ لیکن مختصر افسانے کا فن کار اس اجمال و اختصار میں بھی معنویت کی دنیا سمو دیتا ہے ___ کچھ نہ کہہ کر بھی بات کہہ جانا اس کے فن کی بنیادی خصوصیت ہے ___ لیکن افسانہ نگار کے اس اظہار میں انتشار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے اس اظہار کے لئے ایک محور ضروری ہے۔ یہ محور خیال کی وحدت کے سہارے پیدا ہوتا ہے اور اس خیال کی وحدت سے تاثر کی وحدت پیدا ہوتی ہے ___ اس وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر کے بغیر مختصر افسانے کو فنی طور پر مختصر افسانہ نہیں کہہ سکتے۔

ویسے ناول کی طرح مختصر افسانے میں بھی ان عناصر کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر اس کو افسانے کے تحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے بھی پلاٹ ضروری ہے' کردار یا کردار کا کوئی پہلو ضروری ہے' کوئی نقطۂ نظر یا نظریۂ حیات ضروری ہے' ایک مخصوص اسلوب اور اندازِ بیان ضروری ہے ___ ان کے بغیر نہ تو اس میں وہ ایمائی اور اشاراتی انداز پیدا ہو سکتا ہے' نہ وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر ___ کیونکہ ان سب پہلوؤں کو برتنے ہی کی صورت میں یہ خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں ___ ان کی بنیاد تو وہی افسانے کے بنیادی عناصر ہیں جن سے اس کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مختصر افسانے میں آج کل جو نئے تجربات ہوئے ہیں انہوں نے اس کو بہت سی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے ___ چنانچہ بعض ایسے افسانے بھی موجودہ دور میں لکھے گئے ہیں جن میں پلاٹ نہیں ہے حالانکہ پلاٹ افسانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے ___ پلاٹ کہانی کی ترتیب کا نام ہے اور اس ترتیب کے بغیر افسانے میں افسانویت نہیں رہتی ___ اس لئے مختصر افسانے میں پلاٹ کا وجود لازمی ہے۔ کیونکہ مختصر افسانہ سب سے پہلے افسانہ ہوتا ہے ___ اور افسانہ ہونے کے لئے اس میں کسی نہ کسی حد تک کہانی کے عنصر کا ہونا ضروری ہے ___ اس عنصر کی اہمیت کا احساس ہی پلاٹ کا وجود بخشتا ہے۔ وہ اس پلاٹ کو مختصر افسانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے ___ ناول میں بھی پلاٹ کی وہ اہمیت نہیں جو مختصر افسانے میں ہے۔ ناول میں تو کردار بڑا کام کرتے ہیں لیکن مختصر افسانے میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت کی تفصیل نہیں ہوتی ___ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں پلاٹ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہونا چاہئے ___ ناول میں تو اس پلاٹ کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور کرداروں کے فطری ارتقاء کے ساتھ اس کی ارتقائی رفتار ہم آہنگ ہوتی ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت پیش نہیں کی جاتی۔ اس لئے کہانی اور پلاٹ سے اس کے ہم آہنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ___ برخلاف اس کے مختصر افسانے میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی ایک معمولی سا واقعہ ہی پلاٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ___ اس واقعے میں چونکہ بظاہر کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اس لئے اس کے بیان میں کسی پیچیدہ اور پر پیچ انداز کو دخل نہیں ہوتا ___ اس واقعے کے بیان میں ناول کی سی تفصیل ممکن نہیں کیونکہ یہ واقعہ بذاتِ خود زندگی کے کسی ایک لمحے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس واقعے سے مختصر افسانے میں پلاٹ کی جو ترتیب عمل میں آتی ہے اس میں سادگی کا احساس ہوتا ہے ___ لیکن اس سادگی میں فن کار کا رنگ وہ رمزیت اور ایمائیت بھرتی ہے جس کو مختصر افسانے کا فن کار کسی حال میں بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا۔ اس سے پلاٹ میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ پلاٹ کو پیش کرنے کا یہ رمزیاتی اور ایمائی انداز مختصر افسانے کو سپاٹ ہونے سے بچا لیتا ہے۔ کیونکہ پڑھنے والے کے ذہنی تقاضے اس سے پورے ہوتے ہیں ___ ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ سے اس کی تخئیل کو تحریک ہوتی ہے اور وہ خود اس میں اس تفصیل کو تلاش کر لیتا ہے جو ان الفاظ اور فقروں کے پردوں میں چھپی ہوتی ہے ___ اس مختصر اور سادہ پلاٹ کی بنیاد حقیقت اور صداقت پر

استوار ہونا یقینی ہے کیونکہ وہ واقعہ ذہن پر کسی اُبھرے اثر کے نتیجے میں مختصر افسانے کے فن کار کو متوجہ کرتا ہے اور پھر چونکہ اس کے حدود وسیع نہیں ہوتے اس لئے اس میں غیر فطری باتوں کے راہ پانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی ہوتا ہے ——— پلاٹ کے محدود ہونے کے باعث اس کے نشیب و فراز پر فن کار کی توجہ زیادہ رہتی ہے ——— اس لئے وہ اس کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے خیال کو پس پشت نہیں ڈالتا ——— یہی اس کا تخلیقی عمل ہے جو مختصر افسانے کے پلاٹ کو ان خصوصیات سے مالا مال کرتا ہے جو اس کے لئے کیا ناول اور کیا مختصر افسانہ ہر جگہ ضروری ہوتی ہیں ——— پلاٹ میں وحدت اور تسلسل ایک بنیادی چیز ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں یہ وحدت اور تسلسل کی خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ موضوع اور مواد محدود ہوتا ہے اور دوسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ سادگی اور اختصار اس کو پیش کرنے کی بنیاد ہوتا ہے ——— ان حالات میں وحدت اور تسلسل کا باقی رکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے مختصر افسانے کے پلاٹ کی تشکیل میں فن کار سے اس کے تقاضے زیادہ ہوتے ہیں ——— بظاہر مختصر افسانے کے پلاٹ میں اس SUSPENSE کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے جو ناول کے پلاٹ میں واقعات یا کرداروں کے حرکات و سکنات سے پیدا ہوتا ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں نہ تو واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور نہ کرداروں کے حرکات و سکنات ہی کا ایسا کچھ زیادہ پتہ چلتا ہے۔ ناول کے برخلاف مختصر افسانے کے سارے پلاٹ ہی میں ایک SUSPENSE کی کیفیت ہوتی ہے ——— وہ SUSPENSE سے شروع ہو کر SUSPENSE ہی پر ختم ہوتا ہے ——— اور یہی مختصر افسانے کے پلاٹ کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

اس پلاٹ میں کردار نمایاں نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ کردار کا کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے ——— کسی کردار کی کوئی حرکت نمایاں ہوتی ہے ——— اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں کردار نگاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے ——— بات یہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار تو محض چند لمحوں کے لئے منظر عام پر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی صرف ایک جھلک دکھائی دیتی ہے ——— لیکن اس جھلک سے بھی ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کردار میں کونسی خصوصیات ہیں ——— لیکن ظاہر ہے اس کی ساری تفصیل مختصر افسانے میں نہیں سما سکتی۔ اسی لئے مختصر افسانے میں کردار تو ملتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت بھی ہوتی ہے لیکن ان کی ترجمانی میں بھی پلاٹ کی طرح تفصیل اور جزئیات کو دخل نہیں ہوتا ——— یہاں بھی کردار کی طرف کچھ اشارے ہوتے ہیں ——— ان اشاروں ہی کے سہارے کردار کی تصویر سامنے آتی ہے ——— یہاں تک کہ بعض ان افسانوں میں بھی جن کا موضوع ہی کوئی ایک مخصوص کردار یا اس کردار کی کوئی مخصوص ذہنی کیفیت ہوتی ہے، یہی اشاراتی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار نگاری کا انداز ناول سے بالکل مختلف ہے ——— ناول میں اشاراتی انداز کے بجائے توضیحی انداز ہوتا ہے جس سے کردار کی بہت واضح اور نمایاں تصویر ابھرتی ہے ——— مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا ——— وہاں تصویر ابھرتی نہیں ——— وہ سامنے آنے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہے ——— ویسے جہاں بھی مختصر افسانے میں کرداروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے وہاں کچھ ڈرامائی سا انداز ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور کردار کی بنیادی خصوصیت کی طرف توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے اس ڈرامائی انداز کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس سے تخیل کو تحریک ہو اور اس طرح کردار کی وہ خصوصیات جو نظر سے اوجھل ہیں، سامنے آ سکیں ——— بہرحال مختصر افسانے میں کردار نگاری مقصد نہیں ذریعہ ہے ——— مختصر افسانے کا فن کار اپنے بنیادی خیال کی وضاحت کے لئے ان کو ذریعہ بناتا ہے ——— یہ حرکت افسانے کا بنیادی موضوع بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مقصد کردار نگاری نہیں ہوتا۔ اسی لئے مختصر افسانوں میں ایسی کردار نگاری نظر نہیں آتی جس کی بنیاد تفصیل اور جزئیات ہو ——— لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کردار کے افسانے لکھے ہی نہیں گئے ہیں ——— ایسا نہیں ہے ——— ہرچند مختصر افسانے میں ناول کی طرح کردار نگاری کوئی بنیادی حیثیت نہ رکھتی ہو لیکن ایسے افسانے

موجودہ دور میں ضرور لکھے گئے ہیں جن کی بنیاد بعض کرداروں کے مطالعے پر قائم ہے۔ محمد حسن عسکری کا افسانہ "چائے کی پیالی"، "تنزلہ"، مرزیل اور ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے اس قسم کے افسانوں کے بہت اچھے نمونے ہیں —— یہ افسانے اور ایسے ہی بہت سے دوسرے افسانے کرداروں کے نفسیاتی مطالعے پر مبنی ضرور ہیں لیکن ان میں بھی ان کرداروں کی زندگی کی ساری تفصیل نہیں ہوتی۔ صرف زندگی کے کسی ایک پہلو کا بیان ہوتا ہے جس سے ان پر روشنی پڑتی ہے —— یا ان کی زندگی کے کچھ معاملات ان کے کردار کی بنیادی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں —— افسانے کا فن کار ان کو پیش کرتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا —— ان کرداروں کی زندگی کا جو پہلو پیش کیا جاتا ہے وہ خود انہیں بے نقاب کر دیتا ہے —— جس بات کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں وہ انہیں سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے —— اس لئے مختصر افسانے میں کردار نگاری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے جس میں تمثیلی انداز اور اشاراتی زاویۂ نظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے —— موجودہ دور کے بڑھتے ہوئے نفسیاتی شعور نے اس انداز کو مختصر افسانے کے فن میں کچھ اور بھی ابھارا ہے —— اور آج جو مختصر افسانے کے فن میں کرداروں کی تصویر کشی نئے سے نیا انداز اختیار کر رہی ہے وہ اسی کا بنیادی نتیجہ ہے۔

پلاٹ اور کردار مختصر افسانے میں اپنی اپنی جگہ تو ایک حیثیت رکھتے ہیں لیکن ویسے ان دونوں کی کوئی بڑی فنی اہمیت نہیں ہے —— ان کی بنیاد کسی نہ کسی مرکزی خیال پر استوار ہوتی ہے —— یہ کسی نہ کسی بنیادی نقطۂ نظر کے گرد گھومتے ہیں —— بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کا نقطۂ نظر ہی پلاٹ اور کرداروں کی عمارتوں کو کھڑا کرتا ہے —— اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نقطۂ نظر ہی درحقیقت افسانے کا موضوع ہوتا ہے —— پلاٹ اور کردار وغیرہ کی حیثیت تو اس میں ضمنی ہوتی ہے —— زندگی میں اَن گنت واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں لیکن افسانے کا فن کار ان میں سے ہر ایک کو اپنے فن کا موضوع نہیں بناتا۔ وہ تو اسی واقعے کو اپنا موضوع بناتا ہے جس کو اس کے بنیادی نقطۂ نظر کے ساتھ مطابقت ہوتی ہے جو اس کے نظریۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے —— اس کا سبب یہ ہے کہ پلاٹ اور کرداروں میں بذاتِ خود اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی —— کیونکہ اس کا فن اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا —— اس کا فن تو اپنے محدود ہونے کے پیشِ نظر اس سے صرف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی اہم پہلو کی طرف متوجہ ہو اور اہم پہلو اس کے نزدیک اپنے بنیادی خیال، نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مختصر افسانے کو اسی نقطے سے اپنے فن کا ارتقائی سفر شروع کرنا پڑتا ہے اور یہی اس کے سفر کی آخری منزل بھی ہوتی ہے —— ناول کے فن کار کی طرح مختصر افسانے کے فن کار کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ کرداروں کے ذریعے یا کہانی کے نشیب و فراز کے توسط سے اپنے مقصد کی وضاحت کرے کیونکہ اس محدود میدان میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اپنے نقطۂ نظر کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہر فقرے اور ہر لفظ میں ایسی لہریں ہوتی ہیں جن میں سے اس کا نقطۂ نظر اپنے آپ کو رونما کرتا رہتا ہے —— ناول میں نقطۂ نظر کی وضاحت مختلف طریقوں سے ہو جاتی ہے —— کہیں کردار اس کو واضح کر دیتے ہیں، کہیں خود ناول کا فن کار اس پر اظہار خیال کرنے لگتا ہے۔ مختصر افسانے کا فن اس کو سہار نہیں سکتا —— مختصر افسانے میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں نقطۂ نظر پر بحث نہیں ہو سکتی —— اس پر وعظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس پہلو کی طرف جگہ جگہ اشارے ہوتے ہیں —— اور ان اشاروں کا سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے —— مختصر افسانہ اسی لئے تو کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہتا ہے اور اس سے دلچسپی لینے والے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود بہت کچھ سمجھتے ہیں۔

مختصر افسانے میں بظاہر تو فضا اور ماحول کا بیان بہت ہی کم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں بیانیہ انداز اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ جس بنیادی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اس کی تخلیق کی جاتی ہے وہ کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور رکھتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے —— اور انہی کے سہارے اس میں فضا اور ماحول کے نقوش ابھرتے ہیں —— اس فضا اور ماحول سے صد درجہ موانست پیدا کرنا اور پڑھنے والے کے لئے ان کو قابلِ قبول بنانا فن کار کا ایک بہت ہی اہم کام ہے —— مختصر افسانے کے فن نے اس کام کو انجام تو دیا ہے لیکن چونکہ ناول کے مقابلے میں اس کا

میدان محدود ہے اس لئے فضا اور ماحول کی ترجمانی میں ناول کی سی بات افسانے میں پیدا نہیں ہو پاتی ——— ویسے مختصر افسانے کا فن کار اپنے مخصوص انداز سے فضا اور ماحول کا احساس ضرور دلاتا ہے، اس کی طرف متوجہ ضرور کرتا ہے ——— یہاں بھی چونکہ اس کے پاس تفصیل اور جزئیات کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے وہ صرف اشاروں کے ذریعے فضا اور ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن یہ تصویر کشی بڑی ہی موثر ہوتی ہے ——— کیونکہ پڑھنے والے کا ذہن اور شعور برابر اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں اس فضا اور ماحول کی ترجمانی بذاتِ خود اہمیت نہیں رکھتی ——— کیونکہ وہ تو فن کار کے بنیادی نقطۂ نظر کو اُبھارتی ہے۔ اس کے نقوش کو نمایاں کرتی ہے۔ اس لئے خود اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ——— چنانچہ مختصر افسانوں میں جہاں جہاں فضا اور ماحول کی ترجمانی ملتی ہے وہاں فن کار بعض بنیادی خیالات کو اشاروں میں واضح کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ——— لیکن یہ فضا اور ماحول ناول کی طرح مختصر افسانے کا بنیادی جز نہیں ہوتے ——— یہ بھی کرداروں کی طرح ایک ذریعہ ہیں ——— ویسے موجودہ دور میں ایسے مختصر افسانے لکھے ضرور گئے ہیں جن میں ماحول کی ترجمانی اور فضا کی عکاسی نمایاں نظر آتی ہے ——— لیکن ان میں بھی فن کار کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے ——— کسی نہ کسی بنیادی خیال کی ترجمانی ضرور ہوتی ہے ——— بہر حال مختصر افسانے میں فضا اور ماحول کی ترجمانی سے احساس اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے ——— اور اس طرح پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ یہ ترجمانی بھی مختصر افسانے کے فن کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر، فضا اور ماحول، ان تمام عناصر کی اہمیت مختصر افسانے کے فن میں مسلّم ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں سارا کھیل اسلوب، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کا ہوتا ہے ——— یوں تو ہر صنفِ ادب میں اسلوب، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کو نمایاں جگہ حاصل ہے لیکن مختصر افسانے کے فن میں اس پہلو کو کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل ہے ——— بات یہ ہے کہ مختصر افسانے کا میدان بہت محدود ہوتا ہے اس لئے اس سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر فن کار کو ایک ایسا اندازِ بیان اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جو اس اختصار سے مطابقت رکھتا ہو لیکن جس سے اظہار و ابلاغ میں کسی قسم کی اُلجھن پیدا نہ ہو۔ گویا مختصر افسانے کا فن کار ایک ایسے اسلوب کی تشکیل کرتا ہے جس میں محدود ہونے کے باوجود ایک وسعت ہو۔ اسی لئے مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ——— ایک ایک لفظ اور اس کے استعمال سے مختصر افسانے کا فن کار بڑے بڑے کام لیتا ہے ——— بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ صرف ایک لفظ ہی پر سارے افسانے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر اسی ایک لفظ کو ہٹا دیا جائے تو افسانے کا وجود ہی قائم نہیں رہتا ——— کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ افسانے میں اپنا اصل مفہوم بدل دیتے ہیں اور فن کار کا سحر کار قلم اس میں نئی معنویت پیدا کر دیتا ہے ——— یہی حال جملوں کی ساخت اور فقروں کی دروبست کا ہوتا ہے ——— اس کی بھی مختلف صورتیں مختصر افسانے میں نظر آتی ہیں ——— فن کار ان سب سے اپنے مقصد کے پیشِ نظر کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے زبان و بیان پر پوری قدرت مختصر افسانے کے فن کار کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ساری تکنیک اس سے متاثر ہوتی ہے ——— لیکن مختصر افسانے میں زبان و بیان کی اس قدرت کا مطلب محض انشا پردازی کا خیال ہی نہیں ہوتا، کیونکہ مختصر افسانے کے فن میں انشا پردازی کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ وہاں تو ہر لفظ خیال سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر فقرے کو موضوع کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ ہر جملہ مراد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ——— اسی لئے تو مختصر افسانے میں ایک لفظ بھی بیکار استعمال نہیں ہوتا ——— صرف انشا پردازی کے خیال سے اگر کوئی فن کار ایک لفظ بھی زیادہ استعمال کرے تو وہ افسانے میں بُری طرح کھٹکتا ہے ——— چنانچہ مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ اپنی بہترین ترتیب کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ——— ان الفاظ میں تہیں ہوتی ہیں ——— یہ پہلودار ہوتے ہیں ——— ان میں جب تک ہیرے کی سی ترشی ہوئی کیفیت نہ ہو، یہ خاطر خواہ اثر نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کو ایسا کرنے میں بڑی ہی جانکاہی سے کام لینا پڑتا ہے ——— لیکن اس میں کسی کاوش کو دخل نہیں ہوتا ——— اس کی یہ کوشش شعوری نہیں ہوتی ——— موضوع کی مناسبت سے اس کا فن کارانہ شعور اس صورتِ حال کو پیدا کر لیتا ہے ——— موضوع اور مراد کی بنیادی خصوصیات مختصر افسانے میں اسلوب اور اندازِ بیان کو پیدا کرتی ہیں ——— اور اسی لئے وہ افسانے کے ہر فن کار کے یہاں ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔

ان تمام عناصر کی بنیادی خصوصیات جب یکجا ہوتی ہیں تب مختصر افسانے کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور وہ ایک مخصوص ہیئت اختیار کرتا ہے۔ اس ہیئت میں بنیادی تو وہی اختصار ہے جو مختصر افسانے کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے پلاٹ، کردار اور اسلوب سب کے سب اس میں ایک نیا روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ——— یہ نیا روپ اس فن میں ایک انفرادیت کو پیدا کرتا ہے ——— اس انفرادیت کے سہارے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اور اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی ——— بقول پیکس مختصر افسانے کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور اس کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنی ایک دنیا پیدا کرے ——— چنانچہ وہ اپنی دنیا پیدا کرتا ہے اور بذاتِ خود ایک دنیا بن جاتا ہے۔

مختصر افسانے کی اس دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کے تاثر کی وحدت ہے۔ اس کی ہیئت چونکہ فروعی یا ضمنی باتوں کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی اس لئے صرف مرکزی خیال کو پیش نظر رکھنا اور مختلف زاویوں سے اس پر روشنی ڈالنا اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور یہ مرکزی خیال بھی پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اس میں بھی وسعت اور ہمہ گیری نہیں ہوتی اس لئے مختصر افسانہ اس محدود دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ فن کار اسی بنیادی خیال پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے ——— چونکہ خیال ایک سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے اس میں بذاتِ خود بھی ایک وحدت ہوتی ہے۔ اور جب فن کار اس کو ایک وحدت سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خود اس کے اظہار میں بھی ایک وحدت کی خصوصیت نمایاں ہونے لگتی ہے ——— بلکہ شعوری طور پر وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ یہ وحدت پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر کرے۔ چنانچہ تاثر کی یہ وحدت مختصر افسانے کا بڑا اہم جزو بن جاتی ہے ——— مختصر افسانے کے تمام نقاد اس خیال پر متفق ہیں کہ اس میں شروع سے آخر تک تاثر کی یہ وحدت کارفرما ہونی چاہئے ——— اڈگر ایلن پو جو مختصر افسانے کا نقاد بھی تھا اور جس نے خود بھی مختصر افسانے میں تجربے کئے ہیں۔ اس نے تو اس حد تک کہہ دیا ہے کہ مختصر افسانے میں سب سے زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ تاثر کی وحدت ہے ——— اور اس کا یہ خیال ایسا کچھ غلط نہیں ہے ——— کیونکہ تاثر کی اس وحدت کے بغیر اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا ——— اس کے بغیر اس کی ہیئت خاطر خواہ اثر نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر یہ خصوصیت مختصر افسانے کے فن میں نہ ہو تو وہ مختصر افسانے کے فنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے ——— اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا باعث نہیں بنتا ——— لیکن مختصر افسانہ چونکہ کسی ایک واحد مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جاتا ہے ——— اس لئے اس مقصد کی وحدت اس میں تاثر کی وحدت کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ تاثر کی اس وحدت کا خیال شعوری نہیں ہوتا ——— وہ موضوع اور صورت، مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

تاثر کی اس وحدت کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے کے فن میں اس کی رمزیت اور ایمائیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک اس میں ایک ایمائی انداز کا ہونا ضروری ہے ——— اس کا آغاز کسی ایسے واقعے سے ہوتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن جس کو زندگی کے درمیان سے لے لیا جاتا ہے اور پھر اس پر جس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے وہ شروع سے آخر تک اس کو پوری طرح واضح نہیں ہونے دیتا ——— فن کار اس کو واضح کرنے کے لئے صرف اشاروں سے کام لیتا ہے ——— اور خاتمے پر یہ پُراسرار ایمائی کیفیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے ——— بے شمار پہلو غور کرنے کے لئے اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ——— اگر افسانے میں یہ خصوصیت نہ ہو تو اس کو فنی اعتبار سے مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور انشا پرداز اسٹیونسن نے اس کو بڑی خوبی سے اپنے ایک خط میں واضح کیا ہے ——— سر سڈنی کالون نے اس کے ایک افسانے پر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اس کا اختتام ٹھیک نہیں ہے اس لئے اس کو بدل دینا چاہئے ——— اس کے جواب میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ:

میں اس طرح نہیں لکھتا۔ میرے لکھنے کا یہ انداز نہیں ہے کہ ہر بات کو پوری طرح واضح کر دوں ——— میں تو کہانی میں ایک اثر سے بہت اثرات پیدا کرتا ہوں ——— اگر میں اپنے اس افسانے کے خاتمے کو تبدیل کر دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ از سر نو اس کا آغاز کروں ——— افسانہ تو

ایک مستقل وحدت ہوتا ہے ——— اس لئے مجھے تو اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے اختتام میں کوئی تبدیلی کروں گا ——— کیونکہ میرے خیال میں تو افسانے کی ابتدا اور اس کے خاتمے میں وہی تعلق ہے جو گوشت اور ہڈی میں ہوتا ہے ——— اس لئے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" ——— اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی خط میں اس نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ افسانے کو مجموعی طور پر بہت واضح نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں تو ایک رمز و ایما کی کیفیت سب سے زیادہ ضروری ہے ——— اور یہ خیال صحیح ہے کیونکہ جب تک افسانے میں یہ ایمائی کیفیت نہ ہو وہ اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ اس ایمائی انداز سے ایک طرف تو دلچسپی برقرار رہتی ہے اور دوسرے افسانے کے معنوی پہلوؤں میں وسعت کا احساس بڑھتا ہے ——— لیکن اس رمز و ایمائیت میں جو پہلو سب سے زیادہ اہم ہے وہ جمالیاتی ہے ——— ہر فن میں کسی نہ کسی حد تک یہ ایمائی انداز احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مختصر افسانے کے فن میں بھی اس کا مقصد یہی ہے ——— اسی لئے تو مختصر افسانے کے فن میں اس کو اس درجہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک مصنف نے تو اپنی کتاب میں مختصر افسانے کے اختصار کا سبب اسی ایمائی اور رمزیاتی کیفیت کو بتایا ہے ——— اس کے خیال میں وہ مختصر افسانہ جو واقعی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہو اس میں تو یہ خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے ——— اس خصوصیت کو VERY CURIOUS HUNTING AND SUGGESTIVE QUALITY سے تعبیر کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے۔

اس ایمائی کیفیت اور رمزیاتی انداز کا اثر مختصر افسانے میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک ایک احساسِ تحیّر کی لہری دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے ——— اور یہ احساسِ تحیّر مختصر افسانے کے فن کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے پڑھنے والا اس کی طرف پوری طرح متوجہ رہتا ہے ——— اور ساتھ ہی افسانے میں اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے ——— یہ احساسِ تحیّر پڑھنے والے کے شعور میں تحریک پیدا کرتا ہے اس لئے تخیل کی رو اس سے تیز ہوتی ہے ——— اور وہ افسانے میں زیادہ دلچسپی لیتا اور اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے ——— اس طرح یہ احساسِ تحیّر ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جو مختصر افسانے کے فن کار کو اپنے پڑھنے والوں سے ہوتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ افسانے کے پہلے جملے سے یہ تحیّر کا احساس پڑھنے والے پر چھانے لگتا ہے اور جیسے جیسے افسانے میں ارتقائی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ احساسِ تحیّر تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے ——— اور اس کا منتہا افسانے کا اختتام ہوتا ہے ——— گویا افسانہ احساسِ تحیّر سے شروع ہو کر احساسِ تحیّر ہی پر ختم ہوتا ہے ——— اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس میں حد درجہ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس میں پیش کئے ہوئے کسی مسئلے کو حل نہیں ہونے دیتی اور ہر بات کو زیادہ سے زیادہ الجھا دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختصر افسانہ تخیل پر پہرے نہیں بٹھاتا۔ جو مسائل اس کا موضوع ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے ذہن ہی میں حل ہوتے ہیں ——— اس کا تخیل انہیں حل کرتا ہے ——— ان کو حل کرنے ہی کے لئے تو اس میں احساسِ تحیّر کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے ——— ایک نقاد نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ مختصر افسانے کا فن کار اپنی طرف سے بہت کم دیتا ہے لیکن اپنے پڑھنے والوں سے بہت زیادہ کا تقاضا کرتا ہے۔

یہ عناصر جب تک موجود نہ ہوں مختصر افسانہ فن کے حدود میں داخل نہیں ہوتا ——— یہی عناصر تو اس فن کی بنیاد ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کا فن جامد اور غیر متحرک ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ——— بس ان عناصر کو یکجا کرنے ہی سے اس کی فنی تشکیل عمل میں آجاتی ہے ——— یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مختصر افسانے کے فن کی مختصر سی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں شروع ہی سے تغیرات کا ایک سلسلہ جاری رہا ہے اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے نئے رنگ بدلے ہیں ——— وہ اس طرح کہ اس فن میں ہمیشہ سے رنگا رنگ تجربات کا سلسلہ جاری رہا ہے ——— اپنی محدود دنیا میں رہ کر اس نے

ان تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے — لیکن ان تجربات نے اس کی بنیادی فنی خصوصیات پر پانی نہیں پھیرا ہے —— ان کو ختم نہیں کیا بلکہ اس فن میں نئے نئے گل کھلائے ہیں اور اس کے نتیجے میں یہ فن ترقی کے نئے امکانات سے آشنا ہوا ہے۔ مختصر افسانہ جو اوّل اوّل صرف کسی واقعہ یا کسی خاص جذبے کا بیان ہوتا تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلا کہ اس میں کردار کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی۔ کسی حد تک تفصیل و جزئیات کو بھی دخل ہونے لگا —— اور اس کے نتیجے میں مختصر افسانے نے کہیں کہیں طویل مختصر افسانے کی صورت بھی پیدا کر لی۔ کہیں کہیں یہ محض کرداروں کا ایک خاکہ بھی بن کر رہ گیا — کہیں کہیں واقعات کے فن کارانہ بیان نے اسے "رپورتاژ" بھی بنا دیا۔ اور کہیں کہیں زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے اظہار نے اسے مضمون اور انشائیہ کی شکل بھی دے دی —— غرض یہ کہ بدلتے ہوئے حالات سے [illegible] نے بہت سی شکلیں بدلیں لیکن اس کے باوجود وہ مختصر افسانہ رہا۔ کیونکہ ان تجربات کے باوجود اس نے ان خصوصیات کو ترک نہیں کیا جو مختصر افسانے کے فن کا بنیادی حصہ ہوتی ہیں —— اس میں وہ تمام عناصر ان حالات میں بھی برقرار رہے۔ جب وہ مختصر افسانے سے بڑھ کر "طویل مختصر افسانہ" ہو گیا تب بھی وحدتِ تاثر باقی رہی، رمزیاتی اور ایمائی انداز باقی رہا۔ جب اس نے خاکے کی صورت اختیار کی تب بھی یہ عناصر اس کے دم کے ساتھ رہے اور جب وہ "رپورتاژ" ہو گیا تب بھی ان عناصر کو اس نے نظر انداز نہیں کیا —— اسی لئے اس میں فنی اعتبار سے کوئی ایسی انقلابی تبدیلی نہیں ہوئی جو اس فن کی صورت ہی کو بدل دیتی —— تجربات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کی فنی اقدار کو ان سے ٹھیس نہیں لگی —— اور یہ فن ان تجربات کے باوجود ترقی کی راہوں پر گامزن رہا۔

مختصر افسانے کے فن کی بنیادی خصوصیات جو تجربات کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دم کے ساتھ رہتی ہیں ان کو سمجھنے اور ان کی اہمیت کو محسوس کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی تربیت کی ضرورت ہے اور یہ ذہنی تربیت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کی جائے —— نئے حالات سے مطابقت نئے جمالیاتی احساس کا شعور عام کرتی ہے —— بدلتی ہوئی قدروں کی پاسداری سکھاتی ہے اور مختصر افسانے کا فن ان سب کا تقاضا کرتا ہے —— وہی لوگ اس سے دلچسپی لے سکتے ہیں جن کے پاس بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر بدلتے ہوئے مذاق کا شعور ہے —— جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی آج حد درجہ پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اس کو سمجھنے اور بسر کرنے کے لئے بلند تخیل کی ضرورت ہے تاکہ اس کے نشیب و فراز کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے —— جن کے پاس یہ حقیقت [illegible] صورت موجودہ دور کے پیچیدہ ماحول میں بیانیہ انداز سے کہیں زیادہ اشاروں اور کنایوں کی ضرورت ہے —— مختصر افسانے کا فن اسی انداز کا متقاضی ہے اور موجودہ دور چونکہ ایسے ہی انداز کا دور ہے اس لئے اس دور کو مختصر افسانے سے تمام مناسبت ہے —— زندگی کا آج جو عام انداز ہے اس میں اس صورتِ حال کے بدلنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا —— یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے کے لئے ترقی کی بہت سی راہیں کھلی ہوئی نظر آتی ہیں —— مختصر افسانے کے فن کو آج حساس ذہن اور تیز پڑھنے والے کی ضرورت ہے جو موجودہ زندگی میں اس کی فراوانی ہے —— اور اسی لئے اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

اس مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں ان فن کاروں کا ہاتھ بھی کچھ کم نہیں ہے جنھوں نے مختصر افسانے کے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور جن کی تخلیقات نے افسانے کے ان فنی اصول اور مقتضیات کو برت کر اس سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی ہے —— ان فن کاروں میں گوگول، ایڈگر ایلن پو، ملویل، برٹ ہارٹے، او ہنری، چیخوف، موپاساں، ٹالسٹائی، گورکی، کیتھرین مینسفیلڈ وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں —— روس میں گوگول اور امریکہ میں ایڈگر ایلن پو سے مختصر افسانے کے اس فن کا آغاز ہوتا ہے —— گورکی نے یہ بات غلط نہیں کہی ہے کہ ہم سب (یعنی مختصر افسانے کے فنکار) گوگول ہی سے پیدا ہیں WE ALL SPRING FROM GOGOL'S OVER)

CRAT —— گوگل نے افسانے کے فن کو آسمان سے اتارا اور اس کی بنیاد زمین پر رکھی —— اسی لئے اس کے یہاں مختصر افسانے کے مخصوص انداز میں عمومی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں —— ایڈگر ایلن پو نے اس فن کو عوامی زندگی سے قریب تو نہیں کیا لیکن افسانے کے فن کو نوک پلک سے درست کرنے کی کوشش ضرور کی —— اور اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ کوشش مختصر افسانے کے فن کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے —— امریکہ میں اس کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان سب پر اسی کا اثر ہے —— امریکی زندگی اس عرصے میں بدلی ہے اور اس میں تیزی پیدا ہوئی ہے —— اس بدلتی ہوئی کیفیت نے وہاں ایڈگر ایلن پو کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں کو پیدا کیا اور اس طرح فن کی روایت طویل، بیٹ ہارٹ اور او ہنری وغیرہ کے ہاتھوں میں نئی سے نئی شکلیں اختیار کر کے ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ پھر روس میں چیخوف نے اور فرانس میں موپاساں نے مختصر افسانے کی فنی روایت کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے چار چاند لگا دئے —— مختصر افسانے کے فن میں چیخوف اور موپاساں کے سے بلند مرتبہ فن کار ذرا مشکل ہی سے مل سکتے ہیں —— چیخوف نے روسی عوام کی زندگی کو افسانے کا موضوع بنایا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ایک ایسے انداز میں کی ہے جو بظاہر تو سیدھا سادہ ہے لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو اس میں بہت سی تہیں نظر آتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پیچھے چیخوف کی اپنی شخصیت زیادہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے —— موپاساں کو اس کی فکر نہیں ہوتی —— وہ تو جو کچھ دیکھتا ہے اس کو بیان کرتا ہے —— اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے کردار کیا کر رہے ہیں اور اس کے واقعات کا رخ کس طرف ہے —— وہ جس طرف بھی جانا چاہتے ہیں وہ انہیں جانے دیتا ہے —— اس لئے انسانی نفسیات کے ایسے اسرار و رموز اس کے افسانوں میں بغیر کسی کاوش کے کھلتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ——
بہر حال چیخوف اور موپاساں نے ان پہلوؤں کو اس طرح افسانے میں سمویا ہے کہ اس سے فن کے لئے نئی راہیں نکلی ہیں —— روس میں چیخوف کے بعد یہ فن ٹالسٹائی، تُرگنیف اور گورکی کے ہاتھوں میں پہنچا ہے —— اور فرانس میں موپاساں کے بعد فلابیر، داؤدے اور اناطول فرانس وغیرہ فن کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں —— ان سب میں اکثر ناول نگار ہیں لیکن ان میں سے بیشتر نے فنی اعتبار سے مختصر افسانے میں بھی اضافہ کیا ہے —— گورکی ان سب میں سب سے بڑا فن کار ہے —— وہ انقلابی تھا اور اس کی زندگی کے انقلابی انداز نے اس کے فن میں بھی انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ گورکی کے مختصر افسانوں کا کمال یہ ہے کہ مجموعی طور پر تو وہ زندگی کے اہم پہلوؤں کو پیش کرتے ہی ہیں لیکن ویسے اس کے افسانوں کا ایک ایک لفظ منہ سے بولتا ہوا نظر آتا ہے —— اس کے فقروں کی ایک ایک بندش کچھ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے —— انگلستان میں مختصر افسانے کو ایسا کچھ زیادہ فروغ نصیب نہیں ہوا لیکن انگریزی زبان میں ایک افسانہ نگار ایسی ضرور پیدا ہوئی ہے جس کو چیخوف کا معنوی شاگرد کہا جا سکتا ہے —— انگریزی افسانے میں نیوزی لینڈ کی کیتھرین مینسفیلڈ کی ویسے اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے لیکن اس کا مزاج چیخوف کے فن سے مناسبت رکھتا ہے اس لئے اس کے یہاں چیخوف کے فن کے سے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ——
غرض افسانے کے فن نے ان فن کاروں کے ہاتھوں ترقی کی ان گنت منزلیں طے کی ہیں اور ان کے بعد ایسے ہی بہت سے فن کاروں نے اس کو ترقی سے ہم کنار کرنے میں بڑا کام کیا ہے —— ہر ملک کے ادب میں ایسے فن کاروں کے سلسلے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک فن کار کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح مختصر افسانے کے ان فن کاروں سے ضرور ملتا ہے جو صحیح معنوں میں اس فن کے معمار ہیں —— مختصر افسانے کے فن کار، چاہے وہ کسی نظریے سے تعلق رکھتے ہوں، ان فن کاروں میں سے ہر ایک کو مختصر افسانے کے فن کا امام تسلیم کرتے ہیں —— اس لئے افسانے کا ہر فن کار، خواہ وہ کسی ملک کا کیوں نہ ہو، ان سے اکتسابِ فیض کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہے —— یہی وجہ ہے کہ ان کے فنوں نے مختصر افسانے کے فن پر جو اثرات چھوڑے ہیں ان میں ایک ہمہ گیری ہے۔ کوئی شعوری طور پر چاہے بھی تو ان اثرات سے دامن نہیں بچا سکتا ——

یہ دور مختصر افسانے کا دور ہے کیونکہ آج کل کی زندگی کے حالات اس فن سے مطابقت رکھتے ہیں ——— بدلتے ہوئے ماحول کی رفتار اس فن سے پوری طرح ہم آہنگ ہے ——— اس لئے مختصر افسانے کا فن، اور جن فن کاروں نے اس فن کو صحیح معنوں میں فن بنایا، نئی تہذیب میں، نئی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کہ تہذیب، معاشرت، ادب اور فن، فلسفہ اور جمالیات سے دلچسپی رکھنے والا کسی حال میں بھی ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ——— کیونکہ مختصر افسانے کا فن بہر صورت ایک نئی تہذیب اور معاشرت کا نقیب، ادب اور فن کے نئے میلانات کا عکاس اور فلسفہ و جمالیات کی نئی قدروں کا ترجمان ہے ——— اور اس فن کو اسی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ اس کے خد و خال کا صحیح اندازہ جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں!

مغربی افسانہ کا اثر اردو افسانہ پر

ممتاز شیریں

چیخوف اور موپاساں ——— مغربی افسانہ کے ذکر کے ساتھ فوراً یہ دو بڑے نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ یہ دو نام جو آج بھی مختصر افسانہ کی تاریخ میں سب سے اہم مانے جاتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں جدید مختصر افسانہ کا آغاز چیخوف اور موپاساں ہی سے ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے ٹولسٹائے نے ایک مرتبہ چیخوف کو داد دیتے ہوئے کہا تھا:

"چیخوف روسی موپاساں ہے"

ٹولسٹائے نے تو یہ لقب، داد و تحسین عطا کیا تھا۔ لیکن آج نصف صدی بعد دونوں فن کاروں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کی ادبی حیثیت کو جانچا جائے، تو بہت ممکن ہے ہمیں یہ شبہ ہو کہ آیا چیخوف کے لئے روسی موپاساں کہلانا باعث تحسین ہے یا موپاساں کے لئے یہ زیادہ باعث فخر ہوگا۔ کہ موپاساں کو فرانسیسی چیخوف کہا جائے۔

بہرحال وقت کے اعتبار سے موپاساں کو چیخوف پر تھوڑی سی اولیت حاصل ہے۔ اور خود چیخوف کو موپاساں اور موپاساں کی حقیقت نگاری پسند تھی۔ اپنے ایک افسانے " A WOMAN'S KINGDOM " میں انھوں نے موپاساں کا ذکر یوں کیا ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار ایک دوسری کردار آنا سے کہتا ہے:

"موپاساں! عزیز من! موپاساں کو پڑھو۔ اس کے ایک ایک صفحے میں روئے زمین کی ساری دولت سے زیادہ تمول ہے۔ اس کی ہر سطر میں ایک نیا افق ہے ۔۔۔ نرم و نازک روحانی محسوسات کے ساتھ ساتھ شدید طوفانی بسنسنی خیز جذبات۔ شیطانی شہوت ۔۔۔۔۔ نازک ریشمیں کا جال ۔۔۔۔"

انا آنا اس لڑکی کی دھند کے پرے صرف ایک چیز دیکھ رہی تھی "زندگی! زندگی، زندگی، زندگی موپاساں کے ان زندگی ہے زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے"[1]

[1] FAGNET نے یہ بات موپاساں کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہی ہے۔ اور ان معنوں میں کہ زندگی اور حقیقت کو جیسی کچھ وہ نظر آتی ہے، بالکل اسی طرح پیش کر دینا سہل انگاری ہے۔ اور موپاساں کا اپنا کوئی فلسفہ، کوئی تصور حیات نہیں تھا، جو حقیقت میں اور معنی پیدا کر سکے۔ لیکن اسی بات کو ہم تعریفی معنوں میں بھی لے سکتے ہیں کہ زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی تھی۔

"چیخوف زندگی سے بھی بڑھ کر ہے"[1]

موپساں براہ راست بات کہنے کا عادی ہے۔ صاف سیدھے تیز تند انداز میں موپساں نے یوں افسانے تخلیق کئے جیسے صفائی سے زندگی کے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں۔ چیخوف نے جیسے زندگی سے پرے ہٹ کر، کہیں دُور رہ کے، ایک ترچھے زاویے سے زندگی کو دیکھا۔ یونہی بظاہر بے خیالی میں، بے اہتمام، سیدھے سادے واقعات سمیٹ لئے اور انہیں بغیر کسی شعوری قرینے اور ترتیب کے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا لیکن ان افسانوں میں زندگی یوں سمٹ آئی، جیسے ان میں زندگی کا عطر نچڑ گیا ہو۔

موپساں کے افسانوں میں تیز بھڑکیلے جذبے ہیں، عمل ہے، تیزی ہے۔ آگ ہے۔ چیخوف کے افسانے ایک مدھم شیلی فضا میں ملفوف ہوتے ہیں۔ ان میں عمل کے ساتھ ساتھ کیفیات اور احساسات ہیں۔ نازک گہرا احساس اور سارے افسانے پہ کہرے کی طرح چھایا ہوا دھیما دھیما غم اور لطیف مایوسی۔

موپاساں کے پاس "جسم" ہے۔ چیخوف کے پاس "رُوح"۔ یعنی موپاساں کے ہاں وہ فطری، ہیجانی جذبات اور PASSIONS ہیں جن کا تعلق جسم سے ہے۔ اور چیخوف کے ہاں انسانی رُوح کی ٹیسیں۔

موپاساں کے ہاں حقیقت سخت ٹھوس شکل میں ملتی ہے۔ چیخوف کے ہاں یہ ایک روشن، سیال بہتی ہوئی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

موپاساں نے گویا تیز گاڑھے رنگوں میں زندگی کی مصوری کی، چیخوف کے رنگ ہلکے، نرم اور لطیف ہوتے ہیں۔ SUBTILITY چیخوف کے فن کا کمال ہے۔

چیخوف اور موپاساں، ایک رُوسی دوسرا فرانسیسی، یہ دو بڑی قوتیں ہیں جو مغربی افسانے پہ اور لہٰذا ہمارے افسانے پہ بھی اثر انداز ہوئیں۔ دونوں برابر کے قد کے تھے۔ اگر ایک طرف چیخوف کے اچھے افسانوں ——— WARD NO.6 ‘ THE STEPPE ‘ THE PARTY ‘ THE DARLING اور THE SCHOOL MISTRESS کو رکھ جائے اور دوسری طرف موپاساں کے اچھے افسانوں مثلاً DONLE DE SAIF ‘ MADEMOISELLE FIFI MAISON TELLER وغیرہ کو رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کس کا پلڑا بھاری ہے۔ دونوں افسانہ نویسی میں نئے اور نرالے طرز کے بانی اور موجد تھے۔ بر اعظم کے افسانوی ادب پہ دونوں کا اثر برابر کا تھا مگر دونوں کا اثر اپنی نوعیت میں متوازی نہیں، مختلف بلکہ بڑی حد تک متضاد تھا۔ کیونکہ دونوں صاحب طرز ادیب تھے، اور مختلف طرز کے ادیب۔

چیخوف اور موپاساں کا ہمارے افسانوی ادب پر بھی زبردست اثر پڑا ہے۔ افسانے کے یہ دونوں طرز، جن کے یہ دو استاد اور موجد تھے، اور جنہیں انہوں نے تکمیل تک پہنچایا بھی تھا، شروع ہی سے ہمارے افسانوی ادب میں رواج پائے، بلکہ ان دو مختلف طرز کے افسانوں کی سرفہرست نظر دوڑائیں، تو ہم اپنے ادب میں بھی ایک موپاساں اور ایک چیخوف کو ڈھونڈھ نکالیں گے۔

موپاساں کو پہچاننے میں تو ہمیں چنداں دقت نہ ہوگی کیونکہ بھلا موپاساں کے طرز کا افسانہ نگار ہمارے ہاں منٹو کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟
چیخوف کی البتہ جھلکیاں کئی ایک ادیبوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً بیدی، حیات اللہ انصاری، محمد حسن عسکری، غلام عباس۔ بخصوصیت سے چیخوف کے افسانوں کی فضا، رنگ اور لہجہ (TONE) بیدی کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

منٹو اور بیدی جو ہمارے دو صف اول کے افسانہ نگار ہیں، ان دونوں کی تحریروں میں ہم وہ فرق واضح پائیں گے جو چیخوف اور موپاساں کا فرق ہے۔ فنی شخصیت کا اظہار ہے موپاساں اور چیخوف (اسی طرح منٹو اور بیدی) انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ چنانچہ فنکار چیخوف اور

---

[1] ولیم جرارڈی: "چیخوف"۔

فن کار موپاساں کا فرق اسی فرق کا پرتو ہے۔

منٹو اور بیدی کا فرق چیخوف اور موپاساں کی طرح رویہ کا فرق ہے۔ منٹو کا رویہ اگر سنگی نہیں تو اپنے دوسرے دور کے افسانوں میں منٹو کا انسان کی انسانیت پر مکمل اعتماد تھا وہ سنگی بالکل نہیں رہا، ایک حد تک سادی ضرور ہے۔ زندگی اور انسان کو اور انسان کے وحشیانہ ہیجانی جذبات عریاں کرنے میں اور اپنی تحریروں میں شاک (SHOCK) اور دھچکا پہنچانے میں منٹو کا رویہ موپاساں کی طرح تقریباً سادی ہے۔ اس کے برخلاف بیدی کا نہایت ہی ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسے چیخوف کا۔

گو چیخوف کی نظر میں بھی زندگی میں اتنی ہی قنوطیت ہے کہ کوئی ادب قنوطیت میں زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چیخوف نے کہا تھا:۔

"NO LITERATURE COULD OUTDO REAL LIFE IN CYNICISM"

لیکن چیخوف کی نظر ایک معالج کی نظر تھی۔ ایک معالج کے لئے دنیا میں کوئی چیز گندی نہیں۔ ایک ادیب کو چاہئے کہ اپنے داخلی ذاتی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر ایک معالج کی سی معروضیت برتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کوڑے کے ڈھیر بھی لینڈ سکیپ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کے بڑے وحشی، ہیجانی جذبات بھی اتنے ہی فطری ہیں جتنے اچھے اور نیک جذبات"

موپاساں کی نظر زندگی اور انسانی سیرت کو جانچنے میں بہت تیز تھی لیکن موپاساں کی پیش کش میں خارجیت، علیحدگی اور معروضیت ہے۔ ایک فن کار کی علیحدگی اور معروضیت چیخوف میں بھی تھی۔ وہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ اپنے کرداروں کے جذبات و احساسات، اور کیفیات کو اپنے آپ پر اس طرح طاری کر سکتا تھا جیسے وہ خود اسی تجربہ سے گزر رہا ہو۔ انسان کی حیثیت سے وہ اپنے کرداروں میں گھل مل جاتا تھا لیکن ایک فن کار کی حیثیت میں وہ علیحدگی برابر قائم رکھتا تھا جو ایک بڑے فن کار میں ہونی چاہئے۔ معالج کے رویہ میں ہمدردی کے ساتھ وہ سائنسی معروضیت بھی درکار ہے جو اسے مرض کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کے علاج کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چیخوف کی سچی ہمدردی نے کبھی رقت اور جذباتیت کی شکل اختیار نہیں کی۔ چیخوف اور موپاساں میں وہ دونوں باتیں ایک ساتھ موجود نہیں ہوئیں۔ ایم فارسٹر کی رائے میں ایک ادیب میں ایک ساتھ ہونی چاہئیں۔ یعنی جذبہ (PASSION) اور علیحدگی اور معروضیت (DETATCHMENT)۔

زندگی کو دونوں نے سمجھا تھا۔ انسانی زیست اور انسانی سیرت کی پیچیدگی تنوع اور رنگارنگی دونوں کے حیطۂ نظر میں تھی۔

چیخوف نے زندگی کو بڑی آگہی سے سمجھا۔ ان میں انسانوں کو سمجھنے کی بے پایاں صلاحیت تھی، انسانی مسرت کا عکس اتارنے کی نادر قدرت اور ہمدردی اور رحم کا بے پناہ جذبہ۔

موپاساں کو پڑھنے کے بعد بھی مجموعی طور پر انسان کی یہ تصویر مرتب ہوتی ہے کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، غلاظت اور حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کے اس مخصوص رویے سے منٹو کے دوسرے دور کے افسانوں میں، انسان کی یہی تصویر مرتب ہوتی ہے۔

منٹو کے موضوعات بھی موپاساں کی طرح انسان کے وحشیانہ، ہیجانی جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنس، شہوانیت، ظلم، ایذا دہی، قتل و خون۔ تیز ہیجانی جذبات، غیر معمولی واقعات۔ غیر معمولی، انوکھے کرداروں کے ساتھ منٹو نے چونکا دینے والے افسانے تخلیق کئے۔ بیدی کے ہاں تیز جذبات، غیر معمولی واقعات طوفانی حادثات شاذ ہی ملتے ہیں۔ روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات، عام جذبات و احساسات، اور سیدھی سادی حقیقت کو نرمی، لطافت اور پاکیزگی سے پیش کرنے کا ان میں چیخوف کا سا سلیقہ ہے۔ اور ان کے افسانوں کو یہ سیدھی سادی حقیقت ہی لطیف اور دلکش بنا دیتی ہے۔

چنانچہ ان کے مشہور افسانے "گرم کوٹ" کو دیکھئے۔ اس افسانہ کے متعلق یہ افواہ پھیلائی گئی کہ یہ گوگول کے "اوور کوٹ" کا چربہ ہے۔ مجھے تو اس میں گوگول والی کوئی بات نظر نہ آئی البتہ نچلے متوسط طبقے کے ایک معمولی گھرانے کے افراد کی، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، محبتوں، دکھ درد اور مصیبتوں کی یہ سچی اور نرم لطیف

ہمدردانہ پیش کش میں چیخوف کا رنگ چھایا نظر آتا ہے۔

یا پھر 'لاجونتی' میں عورت کی شبیہہ دیکھئے۔ اس افسانہ میں جو فسادات سے متعلق اپنے انداز کا یکتا افسانہ ہے، عورت کی روح کے نازک تاروں کو کس طرح چھیڑا گیا ہے۔ لاجونتی کا شوہر ایک سیوک ہے اور اغوا شدہ عورتوں کو واپس لے آنے اور ان کے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کروانے کی مہم اٹھا رکھی ہے۔ انسانی ہمدردی سے اس کا دل معمور ہے، وہ دل جو خود چوٹ کھایا ہوا ہے کیونکہ اس کی بیوی بھی اغوا کر لی گئی ہے۔ وہ جب اسے واپس مل جاتی ہے وہ اس سے اتنا نرم سلوک کرتا ہے جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور ٹوٹ نہ جائے جیسے وہ لاجونتی ہو۔ اس کے پہلے ہی چوٹ کھائے ہوئے دل کو ٹھیس نہ پہنچے اور اس کی زخمی روح تڑپ نہ اٹھے۔ اس کے واپس ملنے کے بعد وہ اپنی بیوی کو دیوی پکارتا ہے اور دیوی ہی سمجھتا ہے۔ اور لاجونتی چاہتی ہے وہ اسے دیوی نہ سمجھے ایک کمزور عورت ہی سمجھے۔ اغوا کے دوران میں اس پر جو کچھ بیتی تھی اسے سننے سے یوں گریز نہ کرے۔ اسے سن کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور اس کی زخمی روح پر مرہم رکھے۔

بیدی کے لاجونتی میں بھی وہی چیخوفی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چیخوف کا فن ایک طرح سے انسانی نفسیات کا فن ہے لیکن نفسیاتی ان معنوں میں نہیں جن میں پروست کا فن نفسیاتی کہا جاتا ہے۔ بلکہ روح پر چھایا ہوا ہلکا سا غبار، درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں، وہ ناقابل عبور خلیج جو انسان انسان کے درمیان حائل ہے۔ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ دوری وہ بیگانگی، وہ ناقابل بیان تنہائی جو انسان اپنے وجود اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔

لاجونتی بھی یہی تنہائی اپنی روح میں محسوس کرتی ہے۔

بیدی کے ہاں عورت یا لاجونتی ہے یا گرم کوٹ کی محبت کرنے والی بیوی شمی یا 'ترمبنی' کی ستائی ہوئی ہندوستانی عورت ہولی۔

منٹو کے ہاں وہ سوگندھی ہے، نیم ہے، نمرتا کور ہے، موذیل ہے۔ اپنے تیز جذبات کے ساتھ جاندار پھڑکتی ہوئی جس کے بیان میں وہی موپاساں والی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس تحریر کا کاغذ تک جس پر اس کا ذکر ہوتا ہے زندہ گوشت کی طرح پھڑکنے لگتا ہے:

"ہتک" کی سوگندھی میں منٹو نے بھی طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو پایا ہے اور اس کی روح کو چھیڑا ہے۔ لیکن سوگندھی بھی ایک فطری عورت ہے۔ تیز جذبات والی جو سیٹھ کی "اونہہ" کی توہین کا بدلہ مادھو کی توہین کر کے لیتی ہے۔ اپنے جذبات کا بخار اس پر نکالتی ہے۔ اور آخر میں سارے مردوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر اپنے خارش زدہ کتے کو پہلو میں لپٹائے سو جاتی ہے۔

منٹو کے ایک تازہ افسانے 'سڑک کے کنارے' میں البتہ عورت کی روح ہی روح ہے۔ ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی تڑپتی ہوئی روح؛ لیکن منٹو نے اس افسانے میں بھی ایسا SITUATION پیدا کیا ہے کہ اس روح میں ایک طوفان ہے ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف لاجونتی کی روح میں ہلکی ہلکی ٹیسیں ہیں جنہیں وہ خاموشی سے چپ چاپ برداشت کر لیتی ہے۔

چیخوف کی 'ڈارلنگ' بھی منٹو کے ہاں جانکی بن جاتی ہے۔

اور نچلے طبقے کا وہ سیدھا سادا کردار جو بیدی کے 'رحمن کے جوتے' میں ہے، منٹو کے ہاں 'نیا قانون' کا استاد منگو بن جاتا ہے۔

موضوع اور بنیادی رویہ کے فرق کے علاوہ انداز پیش کش اور افسانے کی تکنیک میں بھی موپاساں اور چیخوف کے طرز الگ الگ ہیں۔

موپاساں کے افسانے زندگی سے کاٹے ہوئے ایسے ٹکڑے ہیں جو بذات خود مکمل ہیں۔ ان میں ایک پلاٹ ہوتا ہے، ایک آغاز ایک وسط، ایک منتہا۔ ایک ایسا منتہی جو افسانے کو واقعی اختتام تک پہنچائے یا ایک ایسا چونکا دینے والا موڑ جس سے ایک ضرب کے ساتھ داستان کے ٹوٹ جانے کا احساس ہو۔ موپاساں کا افسانہ مناسب تراش خراش، تعمیر اور بندش کے ساتھ مکمل مختصر افسانہ ہے۔

چیخوف کی حقیقت نگاری، جیسا کہ ولیم جیرارڈ نے لکھا ہے، گوگول، ترگنیف، دستائیفسکی اور ٹولسٹائی کی حقیقت نگاری کی ارتقائی صورت ہے۔ حقیقت نگاری دراصل زندگی کے خاص خاص اور نمایاں خدوخال کو اخذ کرنے سے عبارت ہے۔ ورنہ آرٹ کے فوکس کے باہر زندگی ایک بیکراں سمندر ہے۔ مبہم، دھندلی، بغیر کسی شکل، بغیر کسی ہیئت کے ایک بے پایاں وسعت۔ چیخوف کے افسانوں میں زندگی ایک خاص ہیئت کی قید و بند میں

جکڑی نہیں جاتی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چیخوف کے افسانے تکنیک اور ہیئت سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ ان میں ہیئت ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں کی جا سکتی۔

چیخوف کا فن اشارہ (IMPLICATION) کا فن ہے۔ چیخوف کے افسانوں کے اختتام کسی بات کو انجام تک نہیں پہنچاتے۔ افسانے کے آخر میں چیخوف جیسے کچھ کہتے کہتے رک سا جاتا ہے اور ہمیں حیران چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ بات ادھوری دیکھ کر پہلے تو ہم کچھ سمجھ نہیں پاتے لیکن پھر ہمیں کوئی اہم معنی خیز اشارہ، کوئی گہری حقیقت چھپی ہوئی مل جاتی ہے۔ جس سے افسانے کا انجام خود بخود ہمارے ذہن میں تشکیل پا جاتا ہے۔ چیخوف کے افسانوں میں یہ ادھورے رہ جانے اور تکمیل نہ پانے کا احساس ہمیں ایک اور شدید احساس دلاتا ہے کہ یہ خارجی واقعات جو پیش آتے ہیں۔ دراصل بہت معمولی، غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے ذرے ہوتے ہیں اور اس حقیقت کا جسے زندگی کہتے ہیں محض ایک چھوٹا سا جزو ہیں۔ کوئی چیز بذات خود مکمل نہیں۔

چیخوف کے افسانوں میں شعریت بلکہ تغزل کی سی کیفیت پائی جاتی ہے، اور چیخوف کے افسانوں میں ترتیب و تشکیل کا انداز موسیقی کا سا ہے۔

موپاساں کا افسانہ ہمارے ادب میں اپنی مکمل ارتقائی صورت میں (اسی طرز کا افسانہ او ہنری جیسے افسانہ نگاروں کے ہاں اپنی خام معمولی صورت میں ملتا ہے) منٹو کا افسانہ ہے۔ ہمارے ہاں منٹو کے سوا کسی اور ادیب نے موپاساں کے طرز کو اس کامیابی سے نہیں اپنایا ہے۔

نہیں معلوم منٹو نے موپاساں کے اثر کو شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں۔ منٹو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو بذات خود موپاساں یا کسی بھی مغربی ادیب کے اثر سے انکار تھا۔ یہ منٹو کی انا تھی (اور یہ انا منٹو کو نبھاتی بھی تھی) جو کسی کے اثر سے سر بسر منکر تھی۔ ورنہ یہ قرین قیاس ہے کہ منٹو نے پہلے پہل رسالوں کے روسی اور فرانسیسی نمبر مرتب کرتے ہوئے مغربی افسانہ کے اثر کو قبول کیا ہوگا۔ چنانچہ منٹو کے ایک آدھ افسانے میں گورکی کا اثر بھی ملتا ہے۔ دیوندر ستیارتھی نے اپنے منٹو پر طنزیہ افسانے "نئے دیوتا" میں یہ ظاہر کیا ہے کہ منٹو پر سامرسٹ ماآم کا بہت زیادہ اثر تھا۔ بلکہ ماآم سے زبردست ادبی عقیدت تھی۔ ممکن ہے موپاساں کا اثر بالواسطہ ماآم کے ذریعہ پڑا ہو کیونکہ سامرسٹ ماآم موپاساں کے عقیدتمندوں اور مقلدوں میں سے ہیں، بہرحال منٹو پر موپاساں کا اثر شعوری ہو یا غیر شعوری، براہ راست یا بالواسطہ منٹو موپاساں کے اس قدر قریب پہنچ گیا جہاں تک سامرسٹ ماآم کی بھی رسائی نہ ہوئی۔

منٹو نے بھی موپاساں کی طرح زندگی کا زہر اس طرح چکھا تھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے اتر کر قلب و روح تک پہنچ گئی۔ لیکن پھر بھی منٹو نے موپاساں کی طرح ہمیں یہ احساس دلایا کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، گندگی ہے، حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں وہی احساس ہوتا ہے جیسے موپاساں کے متعلق چیخوف کے ایک کردار کو ہوا تھا: (جسے اب صرف ایک ہی چیز دیکھ رہی تھی)

زندگی، زندگی، زندگی، منٹو کے ہاں زندگی ہے!
زندگی منٹو کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے!

چیخوف کا اثر بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ چیخوف کا اثر سارے مغربی افسانہ پر خاصا زبردست تھا کہ JAMES T. FARREL اپنے مضمون THE LEAGUE OF FRIGHTENED PHILISTINE میں لکھتے ہیں کہ چیخوف کی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ مختصر افسانے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک واحد اور زبردست اثر امریکہ، انگلستان اور سارے براعظم کے افسانوی ادب پر پڑا ہے تو وہ چیخوف کا اثر ہے۔ ہمارے ہاں چیخوف کا اثر نمایاں اور واضح طور پر کسی ایک افسانہ نگار میں ظاہر نہیں ہوا (جیسا کہ موپاساں کا منٹو میں)، لیکن یہ زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ اور ایک UNDECURRENT کی طرح بہتا ہے۔

بیدی کے افسانوں کا رنگ اور لب و لہجہ چیخوف کا سا ہے۔ خواہ یہ اثر شعوری ہو یا غیر شعوری۔ اور محمد حسن عسکری نے جو ہمارے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے مغربی ادب کو پوری آگاہی سے سمجھا ہے، چیخوف کے شعوری اثر کا اعتراف کیا ہے۔

حسن عسکری اپنے مجموعے "جزیرے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں اور وہ چیخوف کا افسانہ "اسکول مسٹرس" ہے۔ یہ خالص موسیقی ہے۔ اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کر سکوں۔ میرا افسانہ "حرامجادی" چیخوف کے اسی افسانہ سے متاثر ہے۔ گر اس میں کچھ ہے تو اسے جمالِ ہم نشیں کا عکس ہی سمجھیے۔ اور اسی طرح "چائے کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا .... لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن معنوی ہو یا حسن صوری سب روح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔

یوں تو کرشن چندر کا "حسن و حیوان" بھی چیخوف کے THE STEPPE کی طرز پر لکھا گیا ہے اور کافی کامیاب کوشش ہے۔ اس زمانے میں جب کرشن چندر نے پہلے پہل لکھنا شروع کیا تھا، اور جو ہمارے نئے ادب کا اور افسانہ کا ابتدائی زمانہ تھا، کرشن چندر نے مغربی افسانہ سے متاثر ہو کر کئی ایک نئے تجربے کئے۔ بلکہ ان کا ہر افسانہ ایک نیا تجربہ ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں کرشن چندر نے بعض بہت اچھے افسانے لکھے چنانچہ "حسن و حیوان"۔ "پورب دیس ہے دلی"۔ "دو فرلانگ لمبی سڑک"۔ "زندگی کے موڑ پر"۔ "گرجن کی ایک شام"۔ "اَن داتا"۔ "بالکونی" اور سچ پوچھئے تو آج بھی کرشن چندر کے یہی بہترین افسانے ہیں۔

کرشن چندر کے پاس ذہانت تھی، کسی چیز کا فوری اثر قبول کر لینے والا مزاج، ایک زود نویس، تیز رفتار قلم، چلتی ہوئی رنگین زبان۔ جس سے انہیں اظہار میں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ جس مغربی افسانے سے بھی متاثر ہوئے "اسی طرز کے افسانے کو فوراً اردو میں منتقل کیا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ کرشن چندر کے افسانے مغربی افسانوں کے چربے ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مختلف طرز کے مغربی افسانوں سے بیک وقت اثر قبول کریں اور فوری طور پر انہیں اردو میں تخلیق کریں۔ اور یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں ہر افسانہ ایک نئے طرز کا لکھ کر انہوں نے فوراً پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ لیکن کرشن چندر کا رویہ ان دنوں بھی جب انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص سیاسی آئیڈیولوجی سے وابستہ نہیں کیا تھا ہمیشہ ایک صحافی کا سا رہا ہے۔ وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پر قبول کرتے ہیں۔ فوری اظہار بھی ان کے لئے آسان ہے۔ چنانچہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کی تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں گے جیسے CREATIVE AGONY کہتے ہیں۔ یا انہوں نے جس "حسن" کی تخلیق کی ہے اُوہ روح کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ گو یہ حسیات (SENSES) اور جذبات (SENTIMINTS) کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

کرشن چندر نے کسی ایک مغربی ادیب یا کسی خاص تحریک کا اثر یوں قبول نہیں کیا کہ وہ ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر گئی ہو۔ بلکہ انہوں نے وقتی طور پر مختلف طرز تحریر اور مختلف مغربی رجحانات سے دلچسپی لی۔ حتیٰ کہ کوئی نیا تکنیک یا کسی اور طرح کا تجربہ کرنا ان کے لئے کھیل سا ہو گیا۔ اور انہوں نے ایک سوریلی تصویر (SURREALISTIC) بھی کھینچی اور ایک افسانہ میں الفاظ بدل کر نئی زبان بنانے کا صوتی تجربہ بھی کیا۔ یہ نہیں کہ ہم میں کوئی جیمس جوائس ہو گا جو ایرویکر (EARWICKER) کے خواب میں آفاقی اور کائناتی اصولوں کی تحویل کرے گا۔ اور کسی (FINNEGAN'S WAKE) کے لئے ایک نئی زبان کی تخلیق کرے گا۔ لیکن کرشن چندر کی یہ کوشش تو بس ایک مذاق کی بات تھی۔ اور یہ اپنی جگہ کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں تھی۔ اسی طرح انہوں نے "غالیچہ" میں ایک پر اسرار سی رمزیت پیدا کرنے کی کوشش کی، جس میں کچھ تو ایڈگر ایلن پو کے پُر اسرار افسانوں مثلاً PIT AND THE PENDULUM کی سی ذہنی اذیت کی پیش کش تھی اور کچھ کافکا کے انداز کو اپنانے کی کوشش۔

کافکا کی گہری رمزیت اور کافکا کا انداز اگر ہمارے ہاں کسی ادیب میں ہے تو وہ احمد علی میں ہے۔ ممکن ہے احمد علی کافکا سے شعوری طور پر

متاثر نہ ہوئے ہوں، اور اظہار کی مطابقت ادبی مزاج کی مطابقت کا نتیجہ ہو۔ چنانچہ ابھی ایک نئے فرانسیسی ادیب کی تخلیق AMINDAB کا کافکا کی تخلیقات سے موازنہ کرتے ہوئے ژاں پال سارتر نے لکھا ہے کہ مصنف کو خود کافکا کے اثر سے انکار ہے۔ بلکہ اس کا یہ کہنا ہے کہ جن دنوں یہ تجربہ ہوئی اس نے کافکا کو پڑھا تک نہیں تھا۔ تو پھر ژاں پال سارتر کی رائے میں یہ مطابقت اور بھی حیرت انگیز ہے۔[۵۱]

کافکا کی جینئس کچھ ایسی غیر معمولی اور یکتا UNIQUE تھی کہ وہ ایک MYTH ہی بنا رہا۔ عام ادیبوں کی رسائی سے بہت دُور، ایک مبہم کشش اور ترغیب ——— ژاں پال سارتر کے الفاظ میں ———

"HE REMAINED ON THE HORIZON A PERPETUAL TEMPTATION. KAFKA COULD NOT BE IMITATED."

لہٰذا کافکا کی فکر سے مناسبت اور کافکا کا سا رمزی طریقۂ اظہار خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری، بہت بڑی بات ہے اور ایک مشابہ جینیس کا تقاضا کرتی ہے۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں احمد علی کی جینئس غیر معمولی ہے اور وہ ہمارے دقیع ترین (SIGNIFICANT) افسانہ نگار ہیں گو وہ منٹو یا کرشن چندر کی طرح مقبول عام نہیں۔ منٹو کی تحریروں کی اپیل خاص و عام کے لئے یکساں تھی۔ لیکن احمد علی کی تحریریں اپنی نوعیت میں ESOTERIC ہیں جنہیں معدودے چند، ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے ہی APPRECIATE کر سکتے ہیں۔

احمد علی کی رمزی تحریروں کے علاوہ دوسری تحریریں بھی ایک خاص پایہ اور مقام رکھتی ہیں ( ) چنانچہ "ہماری گلی" "استاد شمو خاں" اور مارچ کی ایک رات وغیرہ لیکن احمد علی کا مخصوص لب و لہجہ اور رنگ رمزی اور فلسفیانہ ہے۔ رمزیت[۵۲] کو انہوں نے شروع ہی سے اپنایا تھا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی کتاب "انگارے" میں بھی ان کے افسانے سرریلزم اور آزاد تلازمِ خیال کے مظہر تھے۔ "پریم کہانی" میں انہوں نے محبت کا فلسفہ پیش کیا۔ "قلعہ" میں سیاست کو بھی فلسفیانہ رنگ دیا۔ "گزرے دنوں کی یاد" میں انہیں وقت کی، ماضی کی، پراسرار حیران کن آواز آئی۔ یہ افسانے سب سے بڑی شدت (INTENSITY) اور گہرائیوں کے حامل ہیں۔

احمد علی کی جن تحریروں میں خاص طور پر کافکا کی رمزیت اور طریقۂ اظہار پایا جاتا ہے وہ "قید خانہ" "تیسرا کمرہ" اور "موت سے پہلے" ہیں) جن میں کافکا کے افسانوں سے نہیں بلکہ "THE TRIAL" اور "THE CASKE" سے مناسبت پائی جاتی ہے جو فکشن میں رمزیت کے پیشرو ہیں۔ اگرچہ امریکی کلاسیکی ناول نگار ہرمن میلول ہیں (موبی ڈک) جن کے نزدیک ساری دنیا ہی ایک سمبل تھی۔ لیکن جدید رمزیت کا سرچشمہ کافکا ہی سے پھوٹا ہے۔ کافکا میں ایک حقیقت نگار کے مشاہدہ کی گہرائی اور باریک بینی بھی ہے اور ایک شاعر کی قوت تخیل بھی۔ وہ اشاریت کو ایک طرح کی الہامی بے خودی (DELIRIUM) کی حد تک لے جاتا ہے جس میں تصورات ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری حقیقت سے دُور ہوتے ہوئے بھی ان چیزوں کی اندرونی تہوں اور ان کی اصلی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں ہمیں سطحی نہیں بلکہ عمیق گہری حقیقت ملتی ہے۔

"کاسل" (CASTLE) تک سفر کائنات کے اسرار و رموز کی کرب ناک جستجو بن جاتا ہے، ایک وجودِ مطلق کی جستجو، خدا اور انسان کے درمیان ایک صحیح رشتہ کی جستجو، ایک صحیح طرزِ زندگی کی جستجو۔ کافکا کے ان تلاش کی راہیں بظاہر آسان ہونے کے باوجود اتنی دشوار گزار ہیں کہ انسان جیسے بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

احمد علی نے "قید خانہ" میں ایک انسانی روح جکڑی ہوئی ہے۔ ایک قید کے اندر دوسری قید، دائرے تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ گھٹن بڑھتی

---

۵۱ JEAN PAUL SARTRE : LITERARY AND PHILOSOPHICAL ESSAYS.

۵۲ SYMBOLISM.

جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کا جسمانی وجود ہی ایک قید ہے۔ "قید خانہ" میں احساس مجسم بن گیا ہے۔ اس افسانہ کا کردار ہی ایک حساس آدمی کا ذہن ہے احساس کے زیر اثر نہ صرف ذہن سوچتا ہے اور آنکھ دیکھتی ہے بلکہ احساس جسم کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ذہن جسم و روح سب اس کرب، گھٹن اور قید میں جکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور "موت سے پہلے" ایک طرح کا بھیانک رمزیہ خواب (SYMBOLIC NIGHTMARE ہے۔ اس میں "THE TRIAL" کی کیفیت ہے۔

کافکا کا ایک "ماورائے ادراک حقیقت TRANSCENDENTAL REALITY" پر ایمان تھا۔ یہ حقیقت جس کی جستجو میں انسانی ذہن و روح بھٹکتے ہیں، لیکن جو انسان کی رسائی سے بہت دور ہے۔

اس حقیقت کی تلاش میں میلول نے بحر بیکراں کی وسعتوں میں سفر کیا اور عمیق، وسیع و عریض سمندر کو گنج معانی اور ان رازہائے سربستہ کا سمبل بنایا جن کی تلاش میں انسانی عقل بھٹکتی پھرتی ہے۔ موبی ڈک کے کپتان اہیب کو اس بحر بیکراں میں اتنی دور جانے کی سوجھی جہاں کسی اور سیاح کی رسائی نہ ہو۔ اور وہ ایک ناقابل شکست، ناقابل فہم UNSCRUTIBILITY ایک OPAQUE دبیز سفیدی (جس کی سفید وھیل مچھلی سمبل ہے) سے ٹکرا کر فنا ہو گیا۔ میل ول کی PROPHECY ایک حقیقت مطلق کی جستجو اور زندگی کے معانی پانے کی کوشش انسان کی فنا تک لے جاتی ہے۔

اسی FATALITY کا احساس کافکا کے ہاں بھی ہے۔

جہاں احمد علی کے ادبی مزاج نے کافکا کی گہری رمزیت میں یگانگت محسوس کی، وہاں عزیز احمد نے ایمیل زولا کی نیچریت (NATURALISM) اور غیر مشروط حقیقت نگاری میں کشش پائی۔ لیکن زولا کی یہ نیچریت اور "ریلزم" "NANA" میں کچھ اور ہے۔ "EARTH" میں کچھ اور۔ جب زولا نے NANA کے لئے ایک ایسی موت تجویز کی جس سے اس کے شفاف، بے داغ حسن پر اس کے گناہ کی گندگی اور باطن کی سڑاند ابل پڑے تو زولا نے ایک سپیشلسٹ کے پاس سے چیچک کی کیس ہسٹری منگائی اور ایک ایسے کیس کا خصوصیت سے بغور مطالعہ کیا جس میں بدترین قسم کی چیچک سے موت واقع ہوئی تھی اور اس کیس کی ساری تفصیلات سے نانا کی موت کی تصویر کھینچی۔ ظاہر ہے کہ جب حقیقت نگاری اس حد تک STUDIED ہو تو اس میں فطرت کی وہ بے پناہ، غیر ارادی سی بے ساختگی کہاں پائی جا سکتی ہے؟ لیکن زولا کے EARTH میں فطرت نگاری اس بلا کی ہے کہ اس میں زندگی دھڑکتی، زرخیز دھرتی FECUND EARTH کی کوکھ سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد فطرت نگاری کے قائل ہیں۔ واقعات اور کردار زندگی میں جیسے ہیں، جیسے گزر رہے ہیں۔ انہیں اسی طرح پیش کرنے کی انہوں نے کوشش کی ہے۔ وقت کے سلسلے، واقعات کے تسلسل اور افسانے کی تعمیر میں بھی ان کا انداز فطری ہے۔ گو کبھی کبھی ان کی یہ حقیقت نگاری STUDIED معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد کا اپنا کہنا ہے کہ وہ آلڈس ہکسلی سے بھی متاثر ہیں۔

ہکسلی ...... سائنسی علوم سے واقف، ذہین، سنجیدہ اور انٹلیکچوئل ...... ہکسلی کا رویہ ایک فن کار سے زیادہ ایک انٹلکچوئل کا ہے۔ فکشن ان کے لئے بعض خاص IDEAS اور اصولوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ان کی تحریریں یا تو ALLEGORIES ہیں جیسے THE BRAVE NEW WORLD یا APE AND ESSENCE یا ان کے ناول "NOVEL OF IEAS" کے تحت آتے ہیں اور ان کے کردار مختلف خیالات اور تصورات (CONCEPTIONS) کے مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" میں مارکس ریمپین اور فلپ کوارلس خود مصنف کی شخصیت کے دو رخ ہیں، جو مجسم کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی منقسم انا (DIVIDED EGO) کے دو مظاہر ——— ALTER-EGO، اور اصلی کرداروں میں اتنی تفاوت نہیں ہوتی، دو کردار

ایک دوسرے سے اتنے آزاد نہیں ہوتے، اتنے مکمل طور پر ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ فلپ کوارلس اور مارک ریمپین میں۔ یہاں دو مختلف اور متضاد میلانات کو بڑھا چڑھا کر انہیں مجسم کر دیا گیا ہے۔ فلپ کوارلس کی عقلیت اور منطق حد سے تجاوز کر گئی ہے حتیٰ کہ اس کے فطری جذبات اور حسیں بھی عقل و دماغ کے تابع ہیں اس کے برخلاف ریمپین آزاد فطری جبلتوں اور بے لگام ہیجانی جذبات کا نمائندہ ہے۔

اپنے تازہ ترین ناول THE GENIUS AND THE GODESS میں ہکسلی نے اسی SPLIT CHARACTOR یا ALTER EGOS کی تجسیم کو ایک اور ہی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ "INTELLECT" اور "INSTINCT" کی وہی تکرار اور تضاد ہے۔ لیکن یہاں "عقلیت" کا نمائندہ مرد ہے اور "جبلت" کی نمائندہ عورت۔ یعنی "پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ" کی وہ محبت کی پیاسی بیئٹرس جو اپنے شوہر کی جذبات سے عاری نری عقلیت اور منطق سے تنگ آ گئی تھی اب محض SENSULITY کی نمائندہ بنا دی گئی ہے۔ یہاں جینئس ایک PHYSICIST ہے اور "GODESS" اس کی حسین بیوی، جو اس کی جینئس کے لئے وجدان کی محرک ہے۔ یہ دونوں ایک نوجوان، معصوم، آئیڈیلسٹک رومانی لڑکے کے زاویۂ نظر سے دکھائے گئے ہیں جو مرد کو اپنی INTELLGT کے ساتھ ایک جینئس اور ہیرو سمجھتا ہے اور عورت کو اپنے حسن کے ساتھ ایک دیوی اور وہ PHYSICIST کی "ہیرو ورشپ" کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی خوبصورت بیوی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں کی ایک ساتھ پرستش کرتا ہے لیکن آخر میں اسے دونوں سے ڈزالوژن ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں نامکمل تھے۔

آلڈس ہکسلی نے ان دو حدوں "INTELLECT" اور "INSTINCT" کو مجسم پیش کر کے گویا دونوں قسم کی افراط تفریط میں اعتدال اور توازن کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ عزیز احمد نے اسی طرح دو حدوں کے درمیان اعتدال اور توازن کی ضرورت کو "اور بستی نہیں یہ ....." میں ALTER-EGOS اور SPLIT CHAPACTOR کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اور ہکسلی کی طرز پر ایک تجربہ کیا ہے۔ چنانچہ اس افسانہ میں الف خاں اور بے خاں دو الگ الگ میلانات کے مجسم مظہر ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی پوری ضد تو نہیں، لیکن ایک ہی کردار کے دو رُخ ضرور ہیں۔ ایک میں جبلت کی بے لگام تیزی اور افراط ہے، دوسرے میں اعتدال اور توازن، اکثر کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اور ذہنی اور قلبی کشمکش میں دو آوازیں سنتے ہیں۔ بے خاں، الف خاں کی دوسری آواز ہے۔ چنانچہ الف خاں گویا "جبلت" ہے (INSTINCT) اور بے خاں ضمیر (CONSCIENCE)۔

ہکسلی کے ہاں تو مجرد بڑے کھلے طریقے پر ایک کردار کو دو کرداروں میں بانٹا گیا ہے۔ ورنہ یوں دیکھا جائے تو واقعی بڑے ادب میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں یہ فرق ایک زیریں حقیقت ہے۔ اور ایک کردار دراصل ایک پیچیدہ مکمل اور بڑے کردار کا ایک جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ پرومیتھیس اور اپیمیتھیس دراصل ایک ہی ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی بڑی شخصیت کے INTROVERT اور EXTRAVERT پہلو ہیں۔ JUNG، میفسٹوفلیس دراصل فاوسٹ ہی کی شخصیت کا دوسرا یعنی "EVIL" رُخ ہے جو اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور یہ اوتھیلو کی شکی طبیعت ہی تو ہے جو IAGO بن کر اُسے اکساتی ہے اور اس کی آتشِ رقابت کو بھڑکاتی ہے!

ہکسلی کے شعوری اثر کے تحت اس خاص تجربہ کے علاوہ عزیز احمد ہکسلی سے یوں بھی متاثر ہیں کہ ان کے ناول اور افسانوں کے STRUCTURE بھی "IDEAS" کے گرد کھڑے کئے جاتے ہیں۔ جو کبھی کرداروں کی بحث کے ذریعہ پیش ہوتے ہیں یا کبھی کبھی اور طریقہ

اوپر میں نے چند ایسے انفرادی اثرات کا جائزہ لیا ہے، جس میں بعض خاص خاص مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں پر انفرادی طور پر ہوا ہے۔ لیکن ہمارے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں بعض ایسے ہیں، جن میں کسی خاص مغربی ادیب یا کسی خاص مغربی رجحان یا کسی خاص تحریک کا اثر واضح طور پر نمایاں نہیں ہے لیکن ان کے افسانے پڑھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کو سمجھ کر پڑھا ہے اور اسے غیر محسوس طور پر اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانوں میں کسی کا واضح اثر نظر نہیں آئے گا۔ لیکن ان کا ہر افسانہ پڑھتے ہوئے ہمیں

یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی بہت اچھا مغربی افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ "آنندی" "حمام میں" "ہمسائے" "تجواری" اور "سایہ" جیسے افسانے کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کی بہترین کوششوں کے ساتھ شمار ہو سکتے ہیں۔

مغربی ادب کا اثر ہمارے افسانے پر دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک تو انفرادی اثر یعنی بعض انفرادی مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے خاص خاص لکھنے والوں پر، دوسرا مجموعی اثر یعنی مجموعی طور پر مغرب کے ادبی مزاج، مغرب میں نئے نئے رجحانات اور نئی نئی تحریکوں کا اثر۔

افسانہ مغرب میں بھی سب سے نئی اور کم عمر صنفِ ادب ہے۔ اردو افسانے کی عمر تو مشکل سے بیس پچیس برس کی ہوگی۔ ہمارے ان افسانہ کی پیدائش بھی اُس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے اور اس سے مستفیض ہونے لگے تھے۔ اور یہ مغربی ادب کا مطالعہ، نیا شعور اور آگہی سب سے زیادہ اسی صنف یعنی افسانہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مغربی ادب سے نئی نئی تحریکوں، رجحانوں، تکنیکوں اور نئے نئے طرز اپنانے کا شعور افسانے کے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوا اور ہمارے افسانے نے بھی مغربی افسانے کے دوش بدوش ہی ترقی کی منزلیں طے کیں۔

افسانے کے لئے ہمارے اپنے ادب میں کوئی روایات نہ تھے۔ افسانہ کا ازلی ماخذ روایتیں اور حکایتیں ہیں جو سب سے پہلے عبرانی (HEBREW) عربی اور یونانی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کی الف لیلوی حکایتیں ہمارے ہاں "قصہ چہار درویش" اور "حاتم طائی" کے سے حکایاتی (EPISODIC) اور PICAREQUE قسم کی کتابوں میں نمودار ہوئیں۔ لیکن یہ الگ الگ مختصر کہانیوں کی بجائے سفرناموں اور ناولوں کی صورت میں پیش ہوتی تھیں۔

افسانہ یوں پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند اور ان کے سکول کے افسانہ نگاروں مثلاً سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی وغیرہ کے ہاں ناول اور افسانہ کا فرق ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ اور ان دو صنفوں کے درمیان حدِ فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ فرق صرف طوالت کا تھا یعنی افسانہ ناول کے مقابلے میں مختصر کہانی ہوتا تھا، لیکن ایسی ہی بھرپور کہانی۔

پرانی صنف ناول اور نئی صنف افسانہ کا یہ درمیانی وقفہ (TRANSITIONAL STAGE) دوسرے ملکوں کے ادب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان دنوں افسانے، مختصر افسانے (SHORT STORIES) نہیں کہانیاں (TALS) کہلائے جاتے تھے۔ چنانچہ امریکی ادب ہی کی مثال لیجئے۔ میلول نے اپنی کہانیوں کے مجموعے کو PIAZZA TALES کا نام دیا اور ہاتھوران کی کہانیاں "دہرائی گئی کہانیاں" "TWICE TOLD TALES" کے نام سے مشہور ہوئیں۔

پریم چند کے آخری دَور کے بعض افسانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جدید مختصر افسانے کی تکنیک اور مواد سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ ان کا مشہور افسانہ "کفن" جدید افسانے کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یا شکوہ شکایت جو سارا ایک "مانولاگ" ہے۔

لیکن صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا آغاز نئے ادب کی تحریک کے ساتھ ہی ہوا اور اسی تحریک کے ساتھ ایک خاص آرٹ فارم کی حیثیت سے مختصر افسانہ نے عروج پایا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی ضبط شدہ کتاب "انگارے" گویا روایت سے بغاوت تھی۔ رشید جہاں نے اس میں عورت کی آزادی اور عورت کے حقوق کی پاسبانی کا مسئلہ پیش کیا۔ احمد علی نے آزاد خیال کو سرریلزم کے ذریعہ پیش کیا۔ یعنی خیال اپنی اصلی شکل میں، جب کہ وہ کسی عقلی یا جمالیاتی یا اخلاقی پابندی یا رکاوٹ کے بغیر انسانی دماغ میں اپنا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ چنانچہ سرریلزم کی اس تحریک سے جو مغرب میں ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی تھی، اردو افسانہ کے آغاز ہی میں احمد علی نے روشناس کرایا۔

اردو افسانہ پر گو کئی مختلف مغربی تحریکیں اور ادبی رجحانات بہ یک وقت اثر انداز ہوئے، نئے ادب کی یعنی ۱۹۳۶ء کی تحریک میں "سوشل ریلزم" سماجی حقیقت نگاری سب سے نمایاں رجحان بن کر آئی۔ اس دَور کی حقیقت نگاری میں معاشرتی مسائل کے علاوہ سیاسی

مسائل کو بھی نمایاں دخل تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاں کی ترقی پسند تحریک اسی کا حصہ تھی جو ایک آفاقی تحریک بن چکی تھی۔

سیاست اس دور میں زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بن چکی تھی۔ یہ دو عظیم جنگوں کا درمیانی وقفہ تھا، ایک طرف فاشیت سر اٹھا رہی تھی دوسری طرف ادیبوں کے سامنے روس کا انقلاب اور نیا نظام تھا جس کے متعلق انہیں یہ الوژن تھا۔

BLISS WAS IT IN THAT DAWN TO BE ALIVE
AND TO BE YOUNG WAS VERY HEAVEN!

"POPULAR FRONT" بن چکا تھا۔ سپین کی خانہ جنگی میں ادیب بنفس نفیس حصہ لے کر جمہوریوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ژید کے پایہ کے ادیب بھی سیاست کا ساتھ دینے پر تیار تھے!

ترقی پسند تحریک کے لئے وجدان کا سرچشمہ روس اور روسی ادب تھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے عام طور پر ٹولسٹائے، ترگنیف، دستاوسکی یا چیخوف کی بجائے گورکی اور گورکی کے بعد کے ادیبوں سے زیادہ اثر لیا۔ ان دنوں ہمارے افسانہ نگار خصوصیت سے ۳۵ء کے انگریزی ادیبوں کے نیو رائٹنگ والے، یعنی آڈن، اسپینڈر، اشروڈ، جارج آرول، پرپچٹ گروپ سے بھی متاثر تھے۔ ۳۵ء کے یہ ادیب جوئس، لارنس اور ورجینیا وولف کے رد عمل میں "خارجی" حقیقت نگاری کی تحریک لے کر آئے تھے۔ ہمارے ہاں نئے ادب کی حقیقت نگاری بھی ایک طرح سے نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ کی رومان نگاری کا ردعمل تھی۔ نیاز فتحپوری گروپ کے رومانی رجحان کا اس وسیع تحریک سے کوئی خاص اور گہرا تعلق نہ تھا، جسے مغربی ادب میں ROMANTICISM کہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی ادب میں انیسویں صدی کی رومانٹزم یا فرانسیسی ادب میں CHVALRY کا رومان۔

نئے ادب ۳۶-۳۷ء کی تحریک کے ساتھ ادب برائے زندگی اور "ادب اور انقلاب" کی آواز اٹھی۔ یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے نقادوں کی بھی آواز تھی اور زندگی کو اپنی ساری حقیقتوں میں پیش کرنے کا رجحان اردو افسانہ پر اس طرح چھایا رہا کہ ہمارے بہت سے اچھے افسانہ نگاروں کو "REALISTS" کے اسی گروہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، رشید جہاں، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، انور، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور...... ابوالفضل صدیقی شوکت صدیقی...... یوں یہ طویل فہرست کبھی ختم نہ ہوگی۔

اپنے دور کے سیاسی اور سماجی مسائل کے علاوہ سماجی حقیقت نگاری کے جس خاص جزو پر ہمارے ادیبوں نے توجہ دی وہ جنسی حقیقت نگاری تھی۔ ہمارے بعض اچھے اچھے افسانہ نگار جنسی حقیقت نگاری ("SEX REALISM") سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ جنس کا موضوع ان کے لئے ایک OBSESSION سا بن گیا۔ چنانچہ منٹو۔ عصمت چغتائی۔ ممتاز مفتی۔ عزیز احمد وغیرہ

عزیز احمد کی رائے میں (ترقی پسند ادب) ہمارے جنس نگار ڈی، ایچ لارنس سے متاثر ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ان کی جنس نگاری ڈی۔ ایچ لارنس کو ہضم نہ کر کے ایک کھٹے ڈکار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ مجھے عزیز احمد کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے ادیبوں نے ڈی۔ ایچ لارنس کو پڑھ کر ہضم نہیں کیا بلکہ ہمارے ادیبوں کا رویہ ڈی۔ ایچ لارنس سے قطعی مختلف تھا۔ ہمارے ادیبوں نے سماج کو یوں عریاں کرنا چاہا کہ ساری ڈھکی چھپی گندگی باہر آ جائے۔ ان کی تحریریں سماج کی اخلاقی قدروں اور پابندیوں اور ان سے مسخ سماج کی گری ہوئی جنسی حالت پر بھرپور طنز تھیں۔

ڈی۔ ایچ لارنس نے بھی سماج کی اخلاقی قدروں پر حملہ کیا تھا اور انہیں ان بے جا پابندیوں اور مصنوعی قدروں اور سماجی انسان کی ریاکاری سے جیسی بے پناہ نفرت تھی وہ ان کی گمراہ روی پر تنقید سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن لارنس کا مقصد جنسی بے راہ روی اور گندگی کی زندگی پر تنقید نہیں تھی، بلکہ

یک صحت مند جنسی توازن کی تبلیغ۔ لارنس کی جنسی تحریروں میں جسمانی مظاہروں کے ساتھ ساتھ، لطیف سے لطیف، نازک سے نازک احساس کی عکاسی ہے۔ وہ جنس کی پیش کش میں، جو ان کی نظر میں "زندگی کی قوت" ہے، لارنس جسمانی لذت کے ساتھ حسن، مسرت، روشنی، قوت اور امن کا احساس دلاتے ہیں۔ لارنس نے جنس کو ایک فلسفہ بنا لیا تھا، بلکہ ایک مذہب کا درجہ دے دیا تھا۔ انہوں نے خود کو اس کا پیغامبر گردانا اور آخر میں اس کے، جیسے کہ مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب SONE OF WOMAN میں لکھا ہے:

"اس کے صلیب زدہ شمار ہوتے۔"

فطری جبلت اور فطری زندگی کے PURITAN PROPHET کی حیثیت سے شاید لارنس اور منٹو میں تھوڑی سی مناسبت ہو۔ اپنے آخری ڈرامے "اس منجدھار میں" میں منٹو نے لارنس کی لیڈی چیٹرلیس لور والی تھیم کا استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی منٹو کا رویہ اور ٹیکنیک لارنس سے مختلف ہے۔

عزیز احمد کی جنس نگاری فرانسیسی جنس نگاروں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ممتاز مفتی نے مغرب کے جنسی ادب سے اثر نہیں لیا بلکہ وہ براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع ہوئے۔ فرائڈ کی علم نفسیات میں جنسی تحلیلیں، ہیولاک ایلس کرافٹ ایبنگ، سٹیکل وغیرہ نے جو مثالی واقعات (CASE HISTORIES) دئے ہیں جنسی نفسیات کے ایسے ہی (CASES) سے ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کے لئے مواد حاصل کیا۔ اس طرح خالص نفسیاتی افسانہ ہمارے ادب میں ایک انفرادی رجحان تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ممتاز مفتی نے بعض کامیاب نفسیاتی افسانے لکھے اور تحت الشعور کی بہت سی ڈھکی چھپی ان کہی حقیقتیں اُجاگر کیں۔ لیکن ان کے بعض افسانوں خصوصیت سے بعد کے افسانوں میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ ایک نفسیاتی کیس کے گرد بُنا گیا ہے۔ ان کے بہترین افسانے وہی ہیں جن میں نفسیات ایک زیریں حقیقت ہے اور جہاں بڑے ہلکے نفسیاتی ٹچس کے ساتھ ہماری معاشرتی زندگی کی نازک اور سچی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ چنانچہ "آپا"، "ماتھے کا تل"، "مورا"، "یہ دیوی"۔

یوں نفسانی نفسیات کی پیش کش ہمارے کئی ایک افسانوں میں ہوئی ہے اور جنسی نفسیات کو منٹو اور عصمت چغتائی نے بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ منٹو کے افسانوں میں "دھواں"، "بو"، "ٹھنڈا گوشت" وغیرہ جنسی نفسیات کی کامیاب مثالیں ہیں۔ اور عورت کے جنسی جذبہ، جنسی الجھاؤ اور ارتقاء اور نفسیات کو تو عصمت چغتائی سے بہتر کوئی ترجمان شاذ ہی مل سکے۔ عصمت نے بےباکانہ جرأت سے عورت کو پہلی دفعہ اصلی روپ میں پیش کیا تھا۔ اور اس لئے عصمت کو ہمارے ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

عصمت پر کسی مغربی ادیب کا اثر پڑا ہے یا نہیں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ غالباً پطرس یا مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ عصمت اپنے ڈراموں میں برنارڈ شا سے بہت متاثر ہیں اور اسی طرح کا WITTY طنزیہ ڈائلاگ انہوں نے استعمال بھی کیا ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے، اور عصمت سب سے پہلے افسانہ نگار ہی ہیں۔ کسی خاص اثر کا ان میں اظہار نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مغربی ادب میں جنسی حقیقت نگاری سے مجموعی طور پر متاثر ہوئی ہیں۔

آگے چل کر ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی عصمت کی طرز اختیار کی، اور گو ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر کا ادبی پایہ عصمت چغتائی کے برابر نہیں ہے۔ لیکن ان دونوں بہنوں نے عصمت کی طرز کے افسانوں میں بہت سے اضافے کئے اور جنسی حقیقت نگاری سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے موضوعات کو وسعت دی اور معاشرتی حقیقت نگاری کے اور پہلوؤں کی بھی اپنے افسانوں میں ترجمانی کی۔

جس طرح ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے عصمت چغتائی کی طرز اختیار کی، قرۃ العین حیدر نے حجاب امتیاز علی سے مطابقت محسوس کی۔ اور پہلے پہل انہوں نے حجاب امتیاز علی کے رنگ میں افسانے لکھنے شروع کئے۔ حجاب امتیاز علی کے افسانے کچھ GOTHIC قسم کے پُراسرار رومان

ہوا کرتے تھے، اور فینٹیسیاں، یا فینٹیسی FANTASY کا عنصر اب بھی قرۃ العین کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں انھوں نے ورجینیا وولف کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ (چونکہ یہ بات کہ قرۃ العین کا انداز ورجینیا وولف کا ہے سب سے پہلے میں نے ہی کہی تھی، میں یہاں واضح کر دوں کہ یہاں قرۃ العین کا ورجینیا وولف یا ورجینیا وولف کی ادبی حیثیت سے تقابل مقصود نہیں۔ اور نہ یہ مناسبت ان معنوں میں دی گئی ہے جیسے منٹو کے متعلق کہا جائے کہ منٹو موپاساں ہے یا احمد علی کے متعلق کہ ان کے ہاں کافکا کی سی گہری رمزیت پائی جاتی ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ قرۃ العین نے شعوری طور پر ورجینیا وولف کا اثر قبول کیا ہے)

ظاہری فارم کی حد تک قرۃ العین کی ورجینیا وولف سے مناسبت ہے، "مافیہ" کی نہیں۔ ورجینیا وولف کے نزدیک زندگی کی قدریں کچھ اور ہیں۔ اور ورجینیا وولف میں وہ "ادبی قابو" اور توازن بدرجۂ اتم موجود ہے جو وقت اور جگہ اور ہیئت کی پابندیوں کو توڑنے کے بعد لازمی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں یہ مکمل ادبی قابو اور توازن نہیں ہے۔

ای ایم فارسٹر نے کہا ہے کہ زندگی فکشن میں دو شکلوں میں پیش ہوتی ہے ایک LIFE IN TIME دوسری LIFE IN VALUES جب وقت کے تسلسل کو توڑا جائے تو VALUES بڑے اور وزنی ہونے چاہئیں۔ جیمس جوائس نے جب وقت اور زمانے کی حدیں توڑ دی تھیں تو کئی علوم اور کائناتی اصول اپنی تخلیقات میں سمیٹ لئے تھے۔ قدیم کلاسیکی ادب اور قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY کو موجودہ زمانے میں ڈھالا تھا۔ پروست نے اپنے کھوئے ہوئے اور پھر پائے ہوئے وقت میں موجودہ زمانے کا شعور MODERN CONCSIOUS-NESS سمیٹ لیا۔ اور ورجینیا وولف نے وقت کے ایک ایک لمحے کو وسعت اور تکمیل بخشی۔

قرۃ العین کے ہاں زندگی کی بڑی حقیقتوں اور اقدار کا اور زمانے کا کوئی گہرا شعور نہیں ہے۔ بلکہ ایک ADOLESCENCE کی سی رومانی آئیڈیلزم اور اس سے ملتج ڈز الوژن اور رومانی شکست خوردگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین کی اگر کسی نے نقل کی تو وہ عموماً جذباتی قسم کی ADOLESCENT لڑکیوں نے جنھوں نے قرۃ العین کی طرزِ تحریر کی بعض خاص خوبیوں کو چھوڑ کر قرۃ العین کے افسانے کو اپنی بالکل BARE شکل میں اپنایا جس میں ایک ہی طرح کے رومانی ماحول میں ازلی رومانی تثلیث ہوتی ہے۔ (سوائے جیلانی بانو کے جو آجکل کی لکھنے والیوں میں ایک ہی ہیں جو ایک اچھی افسانہ نگار کی حیثیت سے اُبھری ہیں، اور جنھوں نے ایک افسانہ اس طرز میں اتنا ہی اچھا لکھا ہے جتنا کہ قرۃ العین کا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس افسانے میں بھی جیلانی بانو کا رویہ قرۃ العین کے برخلاف ترقی پسند ہے اور جیلانی بانو اپنی دوسری تحریروں میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے زیادہ قریب ہیں)

قرۃ العین کا طرز گو مغربی ادب سے مستعار تھا، لیکن اُردو کے لئے نیا تھا اور اس نئے انداز میں ایک شگفتگی اور جاذبیت تھی۔ لیکن اس انداز کے اُردو افسانہ میں ارتقا کے جو امکانات تھے انھیں یا تو بعض نئی لکھنے والیوں کی اس سستی تقلید نے ختم کر دیا۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قرۃ العین خود ایک سطح پر آکر رُک گئیں اور اپنے آپ کو یُوں دُہرانے لگیں کہ ان کے بیشتر افسانے اور ناول بھی ایک دوسرے کے REBASH معلوم ہونے لگے۔ ایک ہی سی فضا، ایک ہی سا ماحول۔ ایک ہی سے کردار جو ایک ہی طرح کی باتیں کرتے اور ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں۔ ورجینیا وولف کے ہاں یہ ہمیشہ کی یکسانیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کا فرق احساسات اور موڈس کے نازک فرق کے ذریعہ واضح کر دیتی ہیں۔ ورجینیا وولف کا اسلوب ایک ایسا شفاف اور ذی حس ادبی آلہ ہے جو حس کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو پکڑ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی تخلیقات میں بھی تنوع ہے۔ چنانچہ ان کی دو بہترین اور نمائندہ تخلیقات کا واضح فرق دیکھئے "THE LIGHT HOUSE" "THE WAVES" سے بالکل الگ چیز ہے۔

بہر حال اُردو افسانہ میں ایک نیا طرز لے آنا بجائے خود قابلِ قدر ہے اور قرۃ العین کے طرز کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ گو وہ خود

ایک محدود دائرے میں گھری رہ کر اس کی وسعت اور امکانات کا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکی ہیں اور کوئی بڑی تخلیق انھوں نے پیش نہیں کی ہے۔ انھوں نے دوسروں کے آگے ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ اور ممکن ہے کوئی زیادہ پڑھا لکھا ادیب جس نے بڑے ادب اور کلاسکس کو پوری آگاہی سے سمجھا ہو اور اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہو اور جس کی INTELLECT زیادہ پختہ MATURE اور گہری ہو، اس طرز میں کوئی بڑی تخلیق پیش کر سکے۔

گو مغرب کے کئی ادبی رجحان اور تحریکیں ہمارے نئے ادب اور خصوصیت سے افسانے پر اثر انداز ہوئیں، لیکن ہمارے ادب میں یہ مختلف رجحان الگ الگ مجموعی تحریکوں کے طور پر نہیں ابھرے بلکہ ہمارے چند منفرد شعوری فنکاروں نے انھیں اپنانے کی کوشش کی۔ یا کم از کم ان رجحانوں کے زیر اثر چند تجربے کئے۔ یہ بات خصوصیت سے داخلی رجحانات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ "رمزیت" SYMBOLISM ہمارے ہاں کوئی مجموعی تحریک نہیں بنی اور اس کے واحد اور وقیع نمائندہ احمد علی ہی رہے۔ "شعور کی رو" FLOW OF CONCIOUSNESS عسکری ہی سے وابستہ ہو گئی۔ اور "سرریلزم" میں احمد علی کی پہلی کوششوں کے بعد شاذ ہی کسی نے کوئی تجربہ کیا۔

"اظہاریت" EXPRESSIONISM میں البتہ دو تین ادیبوں نے خاصے تجربے کئے۔ "ایکسپریشنزم" ـــــ اظہاریت یا باطن نگاری ایک قسم کی ذہنی کیفیات اور تصورات کا اظہار ہے۔ یہ جوائس یا پروست کے شعوری تسلسل STREAM OF CONCIOUSNESS سے مختلف چیز ہے۔ "اظہاریت" میں ذہن خاص قسم کے تصورات دیکھتا ہے جو دیکھنے والے کو دنیا کے حقائق سے دور لے جاتے ہیں۔ اس سکول کا نظریہ یہ ہے کہ فن کار کو اپنے انفرادی محسوسات کا اظہار کسی ظاہری وسیلے سے کرنا چاہیئے۔ اطالوی مصنف لوئی جی پیرانڈیلو اس سکول کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ اس سکول کے مقلد کہتے ہیں کہ کروچے کے اصول اور نظریئے اس کے آرٹ کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ لیکن کروچے نے "ایکسپریشنزم" کا لفظ الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کروچے کے لئے ایکسپریشن فن کار کے ذہن میں آمد ہے۔ آرٹسٹ کی نظر جب کسی چیز یا واقعہ کو دیکھتی ہے تو اس کا تأثر ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس تاثر کو احساس، وجدان اور تخیل ذہن ہی میں ایک خوبصورت شکل دے دیتے ہیں۔ اور یہی "اندرونی اظہار" ہے۔ لیکن خود فن کار تو اس خوبصورت ذہنی تخلیق کو جسمانی شکل دے کر دائمی بنانا چاہتا ہے۔

"ایکسپریشنزم" ایک غیر معمولی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہے جس میں ذہن ایسی عجیب تصویریں دیکھتا ہے جو حقیقت میں موجود نہ ہوں بلکہ اسے ایک خواب سحر DAY-DREAMING میں نظر آتی ہوں۔ چنانچہ عزیز احمد کے "جھوٹا خواب" میں اظہاریت ہے۔ نفسیاتی تجزیہ میں خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ خواب ایک خالص نفسی کیفیت ہے جس میں ہمارے تحت الشعور کو بیدار کر کے واقعات دکھلائے جاتے ہیں، ایسے واقعات جو بیداری میں دکھائی نہیں دیتے۔ عزیز احمد کے جھوٹے خواب کے علاوہ فسادات پر ان کے افسانے "کالی رات" میں شدید بیماری کی حالت میں ایک ہیجانی تصویر اور HALUCINATION ہے جس کے ذریعہ انسان کی افتاد دکھائی گئی ہے۔ منٹو کے ایک تازہ افسانے "فرشتہ" میں شدید بھوک، ذہنی پریشانیوں اور بیماری کے دوران میں جب وہ موت سے قریب پہنچ جاتا ہے ایک بھیانک "ذہنی تصویر" ہے۔ ایک

حیات اللہ انصاری نے جنھوں نے "حقیقت نگاری" میں آخری کوشش کا سا شاہکار پیش کیا تھا، اپنی دو ایک تازہ تحریروں میں خیالی اور رمزی طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ "ماں بیٹا" "اور شکر گذار آنکھیں" میں۔ "ماں بیٹا" میں تو خارجی حقیقت نگاری کے ذریعہ ہی ایک رمزی SYMBOLIC SIGNIFICANCE پیدا کی گئی ہے، لیکن "شکر گذار آنکھیں" میں ایک شدید باطنی انفعالی کیفیت ہے جس میں ایک نوجوان اس کی طرف اٹھتی ہوئی دو شکر گذار آنکھوں کو اپنے جسم اور گوشت پر [illegible] رہتا ہے۔ یہ شکر گذار آنکھیں اس کے جسم پر

بے شمار زخم بن کر اُسے اذیت دیتی ہیں۔ اپنے سینے پر یہ زخم کاڑھ کر اور اپنے آپ پر کاری ضربیں لگا کر وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ یہ "سرخ نشان" اس کی روح میں اسی طرح گڑ گئے ہیں جیسے "ہاتھورن" کے "سکارلٹ لیٹر" کے پادری کی روح میں۔ اور ان زخموں سے اس کی روح کو ایک سکون ملتا ہے۔

ہمارے ہاں اظہاریت کی سب سے کامیاب پیش کش جاوید اقبال کے تمثیلچوں میں ہوئی ہے۔ خصوصیت سے "پیغمبر" میں معصوم گناہ اور گناہ کے امکان اور ترغیب کے باوجود انسان کی ازلی معصومیت اور ملائکانہ پاکیزگی کی بڑی مکمل اظہاری تصویر ہے۔

"خود وجودیت" EXISTENTIALISTS مابعد جنگ کی سب سے تہلکہ مچا دینے والی تحریک ثابت ہوئی، گو یہ فرانسیسی ادیبوں تک ہی محدود رہی۔ اس تحریک کا منبع بھی فلسفہ تھا۔ کیر کے گارد کے فلسفہ سے شروع ہو کر وہ ادب میں سارتر کے ذریعہ آئی لیکن سارتر کا خود بھی فلسفہ اور ادب دونوں سے تعلق تھا، لہٰذا انھوں نے بڑی کامیابی سے اس فلسفہ کو ادب میں پیش کیا خصوصیت سے اپنے ڈراموں میں۔ جہاں تک فکشن کا سوال ہے، میرے خیال میں دوسرے EXISTENTIALISM مثلاً کامو CAMUS اور سیمون دی بووار نے خود وجودیت کے فلسفہ کو کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر اپنے ناولوں میں سمو دیا ہے۔

ہمارے ہاں ژاں پال سارتر اور ادب میں ان کے فلسفہ "خود وجودیت" پر تنقید میں تو خوب نظریاتی بحث چلی لیکن تخلیقی ادب پر اس تحریک کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ انتظار حسین نے البتہ "چاند گہن" میں ایک ایسی انفعالی کیفیت کی عکاسی کی ہے، جو سارتر کے NAUSEA سے بہت مشابہ ہے۔ LA NAUSEA اب بھی سارتر کا بہترین ناول تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس انفعالی کیفیت سے نکل کر ایک "نیا وجود" کیسے اپنے آپ کو ASSERT کرتا ہے، یہ اس ناول میں اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ سارتر کے ڈراموں میں، مثلاً ان کے شاندار ڈرامے THE FLIES میں جس کی تھیم مشہور یونانی اوریسٹس والی تھیم ہے سارتر کا اوریسٹس ORESTES ایک نرم طبیعت، نازک، اخلاقی پابندیوں کے ماحول میں پالا لڑکا ہے، (یہ گویا اس کا ESSENCE ہے) لیکن جب وہ ایک "عزم" کر لیتا ہے تو ایک دوسری ہی ہستی بن جاتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں اس کا وجود (EXISTENCE) اس وقت قائم ہوتا ہے۔ اوریسٹس کا نیا وجود وہ ہے جسے دیکھ کر خود ذیوس ZEUS پکار اٹھتا ہے۔

"ایک وقت کے پورا ہونے کے بعد ایک انسان آنے والا ہے، ایک ایسا انسان جو میری (یعنی خدا کی) اُفتاد کا اعلان کرتا اور تم اوریسٹس، ایسا معلوم ہوتا ہے، تم وہ انسان ہو"

"چاند گہن" کا مرکزی کردار LA NAUSEA کے کردار کی طرح آخر تک ہی انفعالیت کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔ اس کے سامنے ایسا کوئی واضح CHOICE نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کچھ اور بنا سکے۔ ایک مثبت، نیا وجود بن جائے۔ اور موجودہ دور کے انسان کے لئے جس کے سامنے ابہام، شکوک و شبہات اور UNCERTAINITIES کے سوا کچھ نہیں، کوئی واضح انتخاب شاید ممکن بھی نہیں۔

انتظار حسین کی "بن لکھی رزمیہ" بھی جو تقسیم کے بعد لکھی گئی ساری چیزوں میں ایک خاص وقیع تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے، انسانی شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش ہے۔ یہاں انتظار حسین آندرے ژید سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور طرح کا افسانہ جو کسی تحریک یا رجحان کے تحت نہیں آتا لیکن جو افسانہ کی ترقی یافتہ اور بالکل نئی شکل ہے تینوں بُعد کا (THREE DIMENSIONAL) افسانہ ہے۔ اس طرز کے چند ہی افسانے لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ "ان داتا" (کرشن چندر)، "مدن سینا اور صدیاں" "زریں تاج" (عزیز احمد) "دیپک راگ" اور "میگھ ملہار" (ممتاز شیریں)۔ تینوں بُعد کے معنی ہیں لمبائی،

چوڑائی اور گہرائی یعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی، ایک ایسی تراشیدہ شبیہہ کے ذریعہ ظاہر ہو سکتی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکے۔ چنانچہ کرشن چندر کے "ان داتا" میں ایک موضوع یعنی بنگال کے قحط پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی سفیر کی اس المیہ سے بے اعتنائی، طوفان سے دور ساحل پر کھڑے طبقوں کی جھوٹی ہمدردی اور آخر میں خود اس انسان کا المیہ جو اس طوفان سے گذر رہا ہے، سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر EXHAUSTIVE بنانا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر پہلو سے کوئی اور پہلو نکل آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہ ایک ہمہ گیر اور وسیع سے وسیع تر دائرے میں ایک مسئلہ کو گھیرا جا سکتا ہے۔ "دیپک راگ" میں جنس و محبت سے متعلق کئی مختلف رویے (ATTITUDES) ہیں، جو متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی۔ اور یہ رویے اتنے ہی مختلف اور متنوع ہو سکتے ہیں جتنی کہ انسانی سیرت پیچیدہ ہے۔ "ان داتا" اور "دیپک راگ" میں زاویے مختلف ہیں لیکن زمانہ ایک ہے۔ "زریں تاج" میں زمانے مختلف ہیں، جن میں ایرانی عورت کو مختلف شبیہوں میں پیش کیا گیا ہے، لیکن مکان ایک ہے۔

"مدن سینا اور صدیاں" اور "میگھ ملہار" میں زماں اور مکاں دونوں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کوشش ہے۔ قدیم سے قدیم زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک یعنی صدیوں کا فاصلہ۔ اور دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں اور بڑی بڑی قدیم تہذیبوں اور مذہبوں کے مشترکہ اور متضاد عناصر کو یکجا کرنے کی سعی۔

عزیز احمد کے افسانے میں (مدن سینا اور صدیاں) جس کی مرکزی تھیم "عاشق، معشوق اور رقیب" کی تثلیث ہے اور وہ ازلی سوال "ان تینوں میں فیاض کون ہے؟" اس میں مختلف ملکوں کی پرانی مشہور داستانیں ہیں، ہندوستانی، یونانی، ایرانی، مدن سینا، شیریں فرہاد، ڈوری گن آرے لیس وغیرہ اور داستان گوئی کے ساتھ اس میں تاریخ اور تحقیق کا امتزاج ہے۔

"میگھ ملہار" کی، جس کی مرکزی تھیم موسیقی کا سحر اور فن کار کی حیاتِ جاودانی ہے، بنیادی دنیا کی قدیم تہذیبوں کی MYTHOLOGY پر رکھی گئی ہے۔ ہندو دیو مالا اور یونانی اساطیر جن میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اور جہاں MYTHOLOGY سے تھوڑا سا گریز کیا ہے، وہاں میں نے انجیلی، عیسائی رمزیت CHRISTIAN SYMBOLISM اور ہومر، ورجل، ملٹن کے ہاں سے ٹکڑے دیئے ہیں، جن کی داستان سے مناسبت ہے۔ اور آخر میں آرفیس، یوریڈیس اور نارسسس کی یونانی MYTH ایک ایرانی رومان میں دہرائی گئی ہے جو اسی زمانے کا ہے، لیکن افسانے کے دوسرے حصوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اسے بھی اسطوری MYTHICAL لون دیا ہے۔

روایاتی تصور کے مطابق اسطوری حقیقت مادی حقیقت سے کہیں گہری ہوتی ہے گو یہ مبہم ہوتی ہے اور MYTH میں ہمیشہ کوئی گہرے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں، اور بظاہر سادہ اور حسین LEGENDS کسی آفاقی UNIVERSAL حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے افسانے کی رینج ہر لحاظ سے وسیع ہے۔ تکنیک، رجحان، موضوع و مواد، ہر اعتبار سے ہمارا افسانہ متمول اور متنوع ہے۔ چنانچہ اگر معاشرتی حقیقت نگاری میں "آخری کوشش" (حیات اللہ انصاری)، "کلیاں اور کانٹے" (اختر اورینوی) اور "زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) کے سے شاہکار ہیں تو "رمزیت" میں "قید خانہ" (احمد علی) کا سا نہایت گہرا اور مکمل افسانہ۔ ایک طرف "بابو گوپی ناتھ" (منٹو) اور "حرامجادی" (عسکری) کے سے انفرادی افسانے ہیں تو دوسری طرف "آنندی" (غلام عباس) کا سا اجتماعی افسانہ ایک طرف بلونت سنگھ کے "رنگ" کا سا ہلکا پھلکا نازک افسانہ ہے، جس میں محض رنگوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ذریعہ مختلف چھوٹے چھوٹے تاثرات یکجا کئے گئے ہیں یا قدرت اللہ شہاب کا "تلاش" جس میں صرف ایک "موڈ" کی گرفت ہے، یہ نازک، مرصع زیورات کے سے ترشے ہوئے افسانے، تو دوسری طرف یہ تینوں بعد THRE DIMENSIONAL کے افسانے "ان داتا"، "مدن سینا اور صدیاں"، "میگھ ملہار" جو ایک وسعت و گیرائی، عظمت و شان، اور ایک COLASSUS کا احساس دلاتے ہیں۔

ان افسانوں کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا افسانہ کسی بھی لحاظ سے مغربی افسانہ سے پیچھے رہ گیا ہے؟

امریکہ کے اس دور کی ایک بہت ذہین اور ہونہار افسانہ نگار یوڈورا ویلٹی افسانہ پر اپنے ذاتی انفرادی تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہر افسانہ میں ایک "جستجو" ہوتی ہے۔ ہر افسانہ کی اپنی ایک "فضا" ہوتی ہے۔ افسانے آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی طرح ہیں جن پر اپنے ذہن کو الگ الگ مرکوز کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ اور ہر ایک کی اپنی ایک الگ روشنی۔ ان میں سے بعض ستاروں کی طرح ساکت و جامد ہوتے ہیں، بعض سیاروں کی طرح اپنے اپنے دائروں میں گھومتے ہیں۔ بعض شہاب ثاقب کی طرح اچانک شعلہ زن ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں اور بعض دمدار سیاروں کی طرح ہیں جو اصل ستارے کی مرکزی روشنی کے علاوہ ایک اور ہی کہانی اپنے جلو میں لئے ہوتے ہیں جو دمدار سیارے کی دم کی طرح بہت پیچھے تک اپنی روشنی چھوڑتی ہے۔

ہمارے افسانوں میں بھی یہی تنوع ہے۔ ہمارا افسانہ مغربی ادب سے ضرور متاثر ہوا ہے لیکن ہمارے افسانے نے نہ صرف مغربی افسانہ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے بلکہ اپنی اُپج اور انفرادیت کا بھی مظہر ہے۔ یہ ہماری اپنی قومی زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس میں ہمارے اپنے مسائل پیش ہوئے ہیں خواہ وہ معاشرتی ہوں یا معاشی یا جنسی یا سیاسی مسائل۔ اور آج ہمارا افسانہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ وہ مجموعی طور پر کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

محمد حسن عسکری

اردو افسانے کا مستقبل

ہمارے ادب پر جمود طاری ہے یا نہیں؟ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں کمی واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ پچھلے پانچ سال میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی ادبی حیثیت کیا ہے اس کا کتنا حصہ قابل قدر ہے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں بعض لوگ ممکن ہے ضرورت سے زیادہ مایوس ہوں اور بعض ممکن ہے ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ بہرصورت ادبی قدر و قیمت کے سوال سے الگ ہٹ کر بھی پچھلے پانچ سال کے ادب پر غور کیا جا سکتا ہے اور اسکی بحث سے بعض ایسے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جنکا تعلق صرف ادب ہی سے نہیں بلکہ پورے معاشرے کی حالت اور خصوصاً ملک کی ذہنی فضا سے بھی ہوگا۔ اسکے ساتھ موجودہ ادب کی نوعیت بھی کسی نہ کسی حد تک متعین ہو سکیگی۔ فی الحال میں اپنی بحث کو محض افسانوی ادب تک محدود رکھنا چاہتا ہوں خصوصیت کیساتھ ان افسانوں تک جو پچھلے ڈھائی تین سال میں ہمارے سامنے آئے ہیں یعنی مجھے دیکھنا یہ ہے کہ جب فسادات سے متعلق افسانوں کا زور کم ہو گیا تو پھر افسانہ نگاروں نے اپنا مواد زندگی کے کن حصوں سے حاصل کیا، اور اپنے موضوع کے بارے میں انکا رویہ کیا رہا۔ اس عرصے میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں میں نے سب کے سب نہیں پڑھے نہ مجھے اس وقت اس سارے افسانوی ادب کا جائزہ لینا ہے۔ جو رجحانات پچھلے پندرہ سال سے ہمارے ادب میں حاوی ہیں، وہ تو بہرحال اپنی جگہ ہیں ہی مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے تین سال میں کوئی نئے رجحانات نظر آتے ہیں یا نہیں۔ وہ رجحانات کس قسم کے ہیں اور ان کا مجموعی سماجی حالات سے کیا تعلق ہے؟ یوں ابھی میں اپنی تفتیش کا دائرہ محدود رکھوں گا۔ نئے ادب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس تحریک نے سیاست اور جنس کے بارے میں بہت صاف گوئی سے کام لیا۔ فی الحال میں یہ دیکھوں گا کہ آج کل کے افسانوں میں جنس کے بارے میں کیا نیا رویہ پیدا ہوا ہے۔ اور ملک کی سیاسی حالت سے اس رویے کا کتنا تعلق ہے۔ یہ بات واضح کر دینا بہتر ہے کہ انفرادی حیثیت سے میں کسی افسانہ نگار پر بحث نہیں کر رہا ہوں اور نہ ان افسانوں کی ادبی حیثیت پر کچھ مقصود ہے بلکہ دراصل اس وقت میرا موضوعِ بحث افسانوی ادب سے زیادہ ملک کی ذہنی فضا ہے۔ جو افسانوں میں جھلکتی ہے۔

اردو افسانوں کے جنسی رویے پر کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ادب میں جنسی موضوعات کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک بڑی خطرناک اصطلاح چل نکلی ہے جو ظاہر ہے تو بے ضرر سی ہے لیکن اسکے مبہم استعمال سے ادبی بحثیں اور الجھ جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ادب کو صحت مند ہونا چاہئے۔ دراصل یہ توصیفی فقرہ بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر کوئی تحریر ادب کی حدود میں آتی ہے تو اپنے آپ سے صحت مند ہوگی۔ کیونکہ ادب کی تخلیق بذاتِ خود جمالیاتی اور جذباتی توازن کی تلاش ہے۔ عام طور سے اس فقرے کا مطلب لوگ یہ لیتے ہیں کہ ادب میں جنسی کجروی اور جنس کے تخریبی پہلوؤں کا ذکر نہیں ہونا چاہئے

لیکن اگر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں تو دنیا کے ادب کا بہت بڑا حصہ قربان کر دینا پڑے گا۔ سوفوکلیز نکل جائیگا۔ راسین نکل جائیگا۔ مارلو نکل جائیگا اور شیکسپیر کے بہت سے حصے خارج کرنے پڑینگے۔ اس طرح ادب کے نقصان کے باوجود اگر اس میں عوام الناس کی بھلائی ہو تو چلئے یہ بھی سہی لیکن اجتماعی زندگی کی صحت کیلئے لازمی ہے کہ جنسی تجربات براہ راست اور وسیع پیمانے پر بروئے کار نہ آئیں بلکہ ادب اور فن میں ان کا اظہار کر کے ان پر قابو پالیا جائے مثلاً یونگ کے خیال میں ہر قدیم یونانی اپنے اندر ایک ای۔ڈی پس لئے پھرتا ہے۔ اور واقعی ای۔ ڈی۔ پس بن جانے سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ تھیٹر میں یہ سارا قصہ دیکھ لیا جائے چنانچہ یہ ناٹک محض تماشا نہیں تھا بلکہ پوری یونانی قوم کا ایک ذہنی علاج تھا۔ اگر جنس کے تخریبی پہلوؤں کو ادب سے بالکل خارج کر دیا جائے اور انہیں شعور میں آنے سے پہلے بالکل روک دیا جائے تو اس سے سماج کا ذہنی توازن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ کلیہ تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا کہ ادب میں صرف غیر صحت مندانہ افعال اور جذبات کا بیان ہو۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ جو غیر صحت مندانہ عناصر افراد میں اور سماج میں موجود ہیں۔ وہ ادب اور فن کے ذریعے شعور میں آجائیں اور یوں کسی حد تک ان کا ازالہ ہو جائے، اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ متوازن اور تندرست شخصیت کی جسمانی اور نفسیاتی ضرورتوں کو بھی اظہار کا موقع ملتا رہے۔ غیر صحت مندانہ عناصر کے ادب میں ظاہر ہو جانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماج میں غیر شعوری طور پر کس قسم کے رجحان پرورش پا رہے ہیں مثلاً پچھلے سو سال کا مغربی ادب اور آرٹ دیکھ کر دو بڑی جنگوں سے پہلے ہی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یورپ میں کس قسم کے ہولناک واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اسی طرح ہمارے برصغیر میں فسادات کے دوران میں جو کچھ ہوا اسکا پرتو پچھلے پندرہ برس کے ادب میں موجود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ادب اور آرٹ پر ہے۔ بعض لوگ چند سیاسی اور اجتماعی نظریات کے تحت اس قسم کے نتیجے نکالتے ہیں مگر وہ یہ بات نظر انداز کر جاتے ہیں کہ فن تو بذات خود ایسے تخریبی رجحانات سے نبرد آزمائی کرنے کا ایک ذریعہ ہے بلکہ زیادہ خطرے کی بات تو یہ ہے کہ ادب میں تجربات کا ذکر آنے ہی نہ پائے اور ادب سہانے خوابوں اور نیک ارادوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ سماج کے لاشعور میں تخریبی رجحانات اندر ہی اندر پل رہے ہیں اور ایسی جڑ پکڑ گئے ہیں کہ انہیں شعور میں لانا بھی مشکل ہے۔ لہذا تجربات کے بیان سے گھبرانا اور اس پر پابندیاں عائد کرنا جسمانی اور ذہنی تندرستی کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر صحت مند اور پختہ شخصیت کی ضرورتیں ادب میں بالکل ظاہر ہی نہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سماجی شخصیت اندرونی ہم آہنگی اور توازن حاصل کرنے کے لئے پوری جدوجہد نہیں کر رہی۔ مختصر یہ کہ ادب کو جنسی کج روی اور اس قبیل کے موضوعات اختیار کرنے سے ڈرنا تو نہیں چاہیئے کیونکہ ادب انسانی وجود کی حقیقتوں سے پہلو بچائے تو وہ ادب ہی کیا ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متوازن اجتماعی زندگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ادب صحت مندی کی تلاش سے خالی نہ ہو۔

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ جنس کے معاملے میں صحت مند اور پختہ شخصیت کے مطالبات کیا ہوتے ہیں۔ جنس کی اعلیٰ ترین اقدار کیا ہیں۔ اور ادب میں کہاں کہاں ملتی ہیں، یہ بحث تو فی الحال چھوڑ دیجیے۔ جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے۔ انکی صحیح جنسی تسکین کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو خالص جسمانی تسکین ہے جس میں انسان اور حیوان برابر کے شریک ہیں۔ اس جبلت کی شرکت کے بغیر محبت میں قوت اور گہرائی آ ہی نہیں سکتی لیکن اس حیوانی خواہش کی تسکین انسان کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس میں ان لطیف جذبات کی آمیزش بھی ہونی چاہیئے جو انسان نے اپنی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے دوران میں پیدا کئے ہیں۔ جنسی خواہش کی شدت اور انسانی جذبات کی نرمی، ان دو کے بغیر صحت مندانہ اور متوازن جنسی رویہ مکمل نہیں ہوتا ہم اس رویے کو معیار سمجھ کر اردو کے افسانوی ادب کا جائزہ لیں گے۔

سنہ ۳۶ء سے پہلے اردو میں وہ صنف بہت مقبول تھی جسے رومانی افسانہ کہتے ہیں۔ ان افسانوں میں محبت کے جنسی اور جسمی پہلو کا اعتراف قطعاً نہیں ہوتا تھا۔ لیکن محبت کو روحانیت بنانے سے بھی گریز کیا جاتا تھا۔ اس دور میں محبت ہلکے سے جذباتی تلاطم کا نام تھا۔ یعنی اس دور کے ادیبوں کی ذہنیت پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کی سی تھی۔ جب جنس مخالف کی طرف کشش تو ہونے لگتی ہے، مگر اس کشش کی جنسی نوعیت کو تسلیم کرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لئے آدمی اس جذباتی ہیجان کی اصلیت پر غور نہیں کرتا، کیونکہ ڈر یہ ہوتا ہے کہ اگر ان جذبات کی جنسی آلودگی کو قبول کر لیا تو یہ جذبات قابل قبول نہیں رہیں گے۔ جو ادب کسی جذبے کی تہ تک پہنچنے سے گھبرائے اس میں ہلکا پن اور سطحیت ہونی ہی چاہیئے۔ ان رومانی افسانوں کے ساتھ ساتھ ٹیگوری نثر بھی خوب چلتی تھی۔ وہ بھی بلوغت کی

زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ اس عمر میں انسان جنسی خواہش محسوس بھی کرتا ہے اور اسے گندی چیز سمجھ کر اس سے بھاگتا بھی ہے۔ چنانچہ جنسی جذبہ بڑی آسانی سے عبودیت اور مذہبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یونگ نے سچی مذہبیت کی تعریف یوں کی ہے کہ آدمی شعوری طور پر جانتا ہو کہ میں اپنی فطرت کے کن فاسد عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے مذہب کا اخلاقی نظام قبول کر رہا ہوں اور جھوٹی مذہبیت یہ ہے کہ آدمی ان فاسد عناصر کا اعتراف کئے بغیر کسی اخلاقی نظام میں پناہ لینا چاہے۔ یہ جھوٹی مذہبیت بلوغت کے زمانے میں ہر لڑکے اور لڑکی کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے موجود رہتی ہے۔ وہی اس زمانے میں ہمارے ادیبوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ پھر ایک تیسری چیز تھی۔ نیاز فتح پوری اور ان کے ساتھیوں کی جمال پرستی۔ اُن لوگوں کو دعویٰ تھا کہ ہم میں ذرا ریاکاری نہیں ہے۔ اپنی خواہش کا اظہار بے لاگ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی مزعومہ لذت پرستی بس یہ تھی کہ عورتوں کے اعضا کا نام بار بار چٹخارے کے ساتھ لیتے تھے۔ یہ بھی بلوغت کے اس دور کی خصوصیت ہے جب جنسی حس تو بیدار ہو گئی ہو مگر عملاً اس کی تکمیل کی اہلیت نہ آئی ہو اور آدمی کی ساری جنسی لذت دوسروں کو یہ جتانے پر منحصر ہو کہ وا خیر سے ہم بھی جوان ہو گئے ...... غرض اُردو ادب کے اس دور میں جنسیات کا ہر اظہار کھوکھلا اور بے بنا تھا۔ پھر اس قسم کے ادب کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھئے۔

سنہ ۲۲ء سے سنہ ۳۶ء تک مسلمانوں کی حالت بھی ایسی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ انہیں ملک کی سیاست میں اپنی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کی ذمہ داریوں اور فریضوں سے انہوں نے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔ اجتماعی حیثیت سے ان کے لئے کوئی کشمکش اور جدوجہد باقی نہ رہی تھی۔ ان کا ایمان یہ رہ گیا تھا کہ "ہونے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"۔ ...... انفرادی حیثیت سے ایک عام مسلمان کا مطمح نظر اتنا تھا کہ کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا" جو بچکانہ پن اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاست میں تھا وہی ادب میں بھی تھا۔ ... پھر ایک قابل غور بات یہ ہے کہ افسانوں میں زن مریدوں کے کردار کتنے عام ہو گئے تھے۔ غرض مسلمانوں پر ایک عجب مجہولیت اور مفعولیت طاری تھی۔ وہی رویہ جنس کے متعلق افسانوں میں بھی ملتا ہے۔

سنہ ۳۶ء میں نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی جس کے ساتھ سیاست کے متعلق زیادہ دلیرانہ رویہ اور جنس کے بارے میں زیادہ حقیقت پرستانہ رویہ ابھرا .... لیکن سنہ ۳۶ء سے لیکر سنہ ۴۷ء تک افسانوں میں جنس کے متعلق جو انداز نظر ملتا ہے۔ اُسے بھی متذکرہ بالا معیار کے مطابق مکمل طور پر صحت مندانہ اور متوازن نہیں کہہ سکتے۔ سنہ ۳۶ء سے پہلے عشقیہ افسانوں میں محض جذباتی گداز اور نرمی ہی تھی، جسمانی پہلو کا اعتراف نہ تھا۔ اب وہ نرمی غائب ہو گئی، محض جسمانی بلکہ حیوانی پہلو پر زور دیا گیا۔ یہ رجحان اُس دور کی نمائندگی کرتا ہے جب لڑکا جنسی تفتیش کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس وقت جذبات کا سوز و گداز اُس کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا اور وہ ہر جنسی مظہر کو خالص جسمانی معاملہ سمجھتا ہے۔ اس عمر میں لڑکے کے لئے یہ انداز نظر انتہائی حقیقت پرستانہ ہوتا ہے، اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے پھر جنسی جذبات کو خالص جسمانیت تک محدود کر دینے کے بعد لڑکے میں جنس اور جسم سے بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور گھن آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس دور کے افسانوں میں یہی جنسی خصائص ملتے ہیں۔ لیکن یہ ذہنیت متوازن اور پختہ نہ سہی، مریضانہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ جنسی تفتیش ہر قسم کے علمی اور روحانی تجسس کی بنیاد بن سکتی ہے۔ یہ رویہ اختیار کر کے ہمارے افسانوی ادب نے کم سے کم آنکھ تو کھولی تھی، خواب خرگوش سے تو بیدار ہوا تھا۔ اب سے سات آٹھ سال پہلے بعض حضرات نے نئے ادیبوں کو بلوغت ناپختگی کا طعنہ دیا تھا۔ یہ طعنہ بالکل درست ہے لیکن اسی بلوغت ناپختگی کے طفیل ادیبوں میں اتنی جان آئی تھی۔ کہ زندگی کے ہر پہلو سے دلچسپی لیں، خوش آئند خواب نہ دیکھیں، بلکہ ہر چیز کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کریں، سیاست میں دلیری اور جرأت سے کام لیں، اپنے سیاسی مسائل کو دنیا کے معاشی اور سیاسی پس منظر میں دیکھیں۔ اس بلوغت ناپختگی نے ہمارے ادیبوں کو دو بڑی باتیں سکھائیں، حقیقت بینی اور صاف گوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے ان سے کام کتنا لیا۔ بہر حال یہ دو رجحانات ایسے پیدا ہو گئے جن کے بغیر جاندار ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ پھر اجتماعی زندگی میں بھی ایسی تحریکات پیدا ہوئیں جو ان رجحانات کو تقویت پہنچا رہی تھیں۔ مسلمانوں نے بھی مجہولیت چھوڑ کر ایک واضح رویہ اختیار کر لیا۔ یہ رویہ غلط ہو یا صحیح، بہر صورت مسلمانوں نے بعض حقیقتوں کو بالکل حتمی طور پر قبول کر لیا، اور ان کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے کام لیا جو نئی قوت مسلمان قوم میں نظر آتی ہے وہی اس دور کے اردو ادب میں دکھائی دیتی ہے مگر سیاسی اور ادبی تحریکیں دونوں کی دونوں نرمی سے خالی ہیں۔ اگر ادیب اپنے ادبی فرائض کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہوتے تو ممکن تھا کہ پختہ شخصیت کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ان میں آ جاتی، اور وہ جنس کے جسمانی پہلو اور انسانی محبت کے سوز و گداز کو سمو سکتے۔ لیکن بہت سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے جن کی

وجہ سے ادیبوں کی صحیح نشوونما نہ ہو سکی۔

بنگال کے قحط اور فسادات کے دوران میں ادیب حقیقت بینی چھوڑ کر نیک نیتی پر آ رہے۔ اس نیک نیتی کے پیچھے کتنی اذیت پسندی چھپی ہوئی تھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ ادیب زندگی کی حقیقتوں سے کیا دوچار ہوں گے، اب تو وہ خود اپنی حقیقت سے آنکھیں چار کرتے گھبراتے ہیں۔ بہر صورت نیک نیتی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حقائق کو تسلیم نہ کیا جائے۔ لیکن حقائق سے بچنے کے لئے بعض دفاعی انتظامات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا غرض حقیقت بینی کے بعد نیک نیتی آئی اور اس کے بعد خواب آوری۔ یہ ہے ۳۶ء سے لیکر اب تک ہمارے افسانوی ادب کی داستان۔

اگر ہمارا ادب صحیح معنوں میں ترقی کرتا تو جنس کے متعلق اتنی حقیقت بیانی کے بعد یہ ہونا چاہئے تھا کہ انسانی تہذیب میں جنسی اقدار نے جو نشوونما حاصل کی ہے ادیب اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے اور اپنے جنسی رویے میں قوت، توانائی، نرمی، ملائمت، نفاست، عظمت کے عناصر لاتے۔ لیکن ہمارے افسانے نے ایک بالکل دوسرا رُخ اختیار کیا ہے۔ ۳۶ء سے ۴۵ء تک عام طور پر جو افسانے لکھے گئے ہیں انہیں عشقیہ نہیں کہا جا سکتا، گو ان میں جنسی معاملات کا ذکر نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن اب پچھلے دو ڈھائی سال سے عشقیہ افسانے پھر نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ عشقیہ سے مراد وہی لڑکوں والا دھیما دھیما ساجذباتی ہیجان ہے جس میں اس ہیجان کی جنسی نوعیت کا اقرار کرنے سے پہلو بچایا جاتا ہے۔ یعنی نئے ادب کی تحریک افسانے کو جہاں تک لے آئی وہاں سے آگے بڑھنے کے بجائے ہمارا افسانہ پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے مگر ۳۶ء سے پہلے کی جذبات پرستی تو لڑکوں کی سی تھی آج کل افسانے اس طرح کے لکھے جا رہے ہیں جیسے چودہ پندرہ سال کی لڑکیاں بیداری میں خواب دیکھتی ہیں۔ ہمارے بیشتر افسانے نہ صرف معاشرے کی حقیقت سے دُور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ جنسی حقائق سے بھی گریز کرتے ہیں جو افسانے ترقی پسندانہ اثرات کے ماتحت لکھے جاتے ہیں ان کی ادبی حیثیت کچھ بھی سہی، اُن میں حقیقت کو کتنا ہی مسخ کیوں نہ کیا گیا ہو۔ بہر حال ان میں زندگی کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے اور زندگی میں چند تبدیلیاں پیدا کرنے کی دعوت تو ہوتی ہے۔ ترقی پسند افسانے کم سے کم حقیقت سے ٹکر لینے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر یہ نئی عشقیہ افسانہ نگاری سیاسی، سماجی، نفسیاتی، جنسی، ہر قسم کی حقیقت سے آنکھیں چراتی ہے۔ اگر ترقی پسند افسانہ ادب نہیں ہے تو یہ افسانہ بھی ادب نہیں ہے۔ ترقی پسند افسانہ کم سے کم اس بات میں بہتر ہے کہ اتنی مجہول انفعالیت تو پیدا نہیں کرتا۔ ان عشقیہ افسانوں میں اور جنس کی گندگی سے گھبرا کر روحانیت میں پناہ لینے والی لڑکیوں کے تخیلات میں کتنی مماثلت ہے اس کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ان کہانیوں کا پس منظر عموماً کوئی غیر ملک ہوتا ہے اور یہ عشق عجیب و غریب ناموں والے درختوں کے سائے میں یا امریکی گانوں کی تال پر پروان چڑھتا ہے۔ انجام ہمیشہ عشق کی شکست اور آنسوؤں پر ہوتا ہے۔ یہ ذہنیت صوفی صدی اسکول کی لڑکیوں کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے ادب میں یا ہمارے مزاج میں نرمی اور نفاست بڑھتی جا رہی ہے۔ کوئی سماجی مظہر اپنی جگہ اکیلا نہیں ہوتا، اس کا تعلق دوسرے مظاہر سے بھی ہوتا ہے۔ اور انہی کے ساتھ مل کر اس میں پورے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو افسانوں میں یہ رونا دھونا اور سوز و گداز ہے۔ دُوسری طرف جو فلمیں مقبول ہو رہی ہیں ان کی کیفیت ہی اور ہے۔ ایسی فلمیں لوگوں کو بہت پسند آتی ہیں جن میں ہیرو ہیروئن سے بد سلوکی کرے اور اُسے اپنا غلام بنا کر رکھے۔ بلکہ بعض فلموں کا اشتہار تو اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس میں ہیرو، ہیروئن کو پیٹتا ہے۔ ان فلموں اور متذکرہ بالا افسانوں سے اثر لینے والے تقریباً ایک ہی ہیں۔ ان دو چیزوں کو ساتھ ملا کر دیکھئے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے متوسط طبقے میں فاعلی اور مفعولی دونوں قسم کی ایذا پرستی بڑھ رہی ہے، لیکن وہ اس سے واقف نہیں ہونا چاہتا۔ یہ عشقیہ افسانے اس ایذا پرستی پر پردے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ایسے خطرناک رجحانات اندھیرے میں اور تیزی سے پلتے ہیں۔ اگر ہمارے ادب میں پہلے کی طرح حقیقت بینی اور صاف گوئی کا مادہ ہوتا تو کم سے کم ہمارا شعور ان رجحانات سے واقف تو ہو سکتا۔ اب یہ زہر اندر ہی اندر پک رہا ہے اور خدا جانے ہمارے معاشرے کے لئے اس سے کیا نتیجے نکلیں گے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا تو بھی یہ کیا کم ہے کہ ایسے ادب کے زیر اثر آنے والا طبقہ صحیح قسم کی جنسی تسکین کا تصور اپنے ادب سے اخذ نہ کر سکے، اور یا تو لڑکپن کی جذبات پرستی میں پڑا رہے یا جنسی اذیت پسندی کی طرف مائل ہو جائے۔

ہمارے افسانے میں یہ ترقی معکوس کیوں ہو رہی ہے؟ ہماری شخصیت میں پختگی آنے کی بجائے لڑکپن کیوں آتا جا رہا ہے؟ اس کی نفسیاتی وجوہ

تو بہت کچھ موس ہی مگر ان کی تفتیش کی اہمیت مجھ میں نہیں۔ یہ صورت سماجی اسباب کا سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ہم نے ابھی آزادی حاصل کی ہے، بلکہ ایک نیا ملک اور نئی قوم بنائی ہے۔ ایسی صورت میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہماری ذہنی دلچسپیاں اور سنجیدہ تفکر کی عادت بڑھتے، ہم اپنے معاشرے کو معاشی انصاف اور سماجی مساوات کی بنیادوں پر تشکیل دینے کی تجویزیں سوچیں لیکن ہوا یہ ہے کہ ہم نے آزاد ملک کے باشندوں کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف حکومت کو یہ پسند نہیں کہ عام آدمی رموز مملکت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ملک کی سیاسی حالت کے متعلق رائے قائم کرتے ہی آدمی کمیونسٹ بن جاتا ہے، یقینی طور پر ملک میں آزادی رائے ہو یا نہ ہو، مگر عملی اعتبار سے عموماً لوگ اس جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے گھبرانے لگتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں حب الوطنی کی ایسی شدت ہے کہ غداری کی بو دور سے آجاتی ہے۔ جب سماجی حقیقتوں کے سمجھنے سمجھانے میں ایسی دشواریاں ہوں تو ذہن جنسی تصورات میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ حال ہے کہ ذرا کسی جنسی فعل کا ذکر کر دیجئے اور فحش نگاری کے جرم میں کھینچے کھینچے پھریئے۔ غرض دسیاست کے متعلق صاف گوئی سے کام لے سکتے ہیں نہ جنس کے متعلق۔ بالغ نظر کے انسانوں کی جتنی دلچسپیاں ہیں ان سب کو ڈر کے مارے ادب سے خارج کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ ادیب بے چارے سکنڈ ممبٹ کے اسکول کی لڑکیاں نہ بنتے چلے جائیں تو اور کیا ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن کیا بالغ انسان اطمینان کے ساتھ لڑکیاں بنے رہ سکتے ہیں؟ اگر وہ اس پہ قانع نہیں رہ سکتے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ پسوزد یرم کا معاملہ ہے۔ بہر حال اگر اس میں نفسیاتی رجعت کا نتیجہ ناخوشگوار نہ نکلے تب بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک نئے نئے آزاد اور جمہوری ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا اس طرح بچوں کی سطح پر اترنا ملک کے لئے اور اس کے مستقبل کے لئے کس حد تک فائدہ مند ہے؟ ایک ادبی بحث تا ہیں اس جگہ لے آئی ہے۔ جہاں بات ادب سے بہت دور نکل گئی ایک معمولی مضمون نگار نتنے بڑے سوال کا کیا جواب دے۔ یہ تو ان لوگوں کے سوچنے کی بات ہے جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لئے خاکے تیار کرتے ہیں۔

(نقوش ۲۵، ۲۶)

اُردو افسانے میں روایت اور تجربے

(سمپوزیم)

حصہ لینے والے:

سعادت حسن منٹو　احمد ندیم قاسمی　سیّد وقار عظیم　ڈاکٹر عبادت بریلوی

ہاجرہ مسرور　خدیجہ مستور　انتظار حسین　شوکت تھانوی　حمید اختر۔

یہ سمپوزیم اس سے پہلے بھی نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس نمبر میں اسے دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس نمبر میں اس کی شمولیت بعض کوتاہیوں کے باوجود ناگزیر تھی۔

آخر میں تین چار افسانہ نگاروں پر قدرے تفصیلی تبصرہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مدیر نقوش نے کہا — آج کی نشست کا مقصد یہ ہے کہ ہم "اردو افسانہ میں روایت اور تجربے" کے عنوان کے ماتحت گفتگو کریں۔

احمد ندیم قاسمی — پہلے وہ صاحب بولیں جنہیں اس کا تجربہ ہو۔

سعادت حسن منٹو — پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو افسانے سے بحث ہے یا افسانہ نگار سے، دوسری بات یہ کہ افسانے کی روایت کو بہت دور سے TRACE کرنا پڑے گا۔

عبادت بریلوی — ہم ان افسانوں کی روایت سے بحث کریں گے جو اردو میں لکھے گئے۔

ندیم — منٹو صاحب کا یہ کہنا کہ ہر افسانہ نگار کی ایک روایت ہے، صحیح ہے لیکن یہی روایت آگے چل کر افسانے کی روایت بن جاتی ہے۔ موجودہ دور کے افسانوں سے پہلے جو اردو افسانے لکھے گئے ہیں ان کی ہیئت کے اعتبار سے جو صورت مرتب ہوتی ہے ہم اسی کو بنیاد بنا کر بحث کریں گے۔ ذاتی اسٹائل کو ہم اسلوب اور روایت کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم — بنیادی طور پر ہر صنف ادب کے کچھ فنی لوازم ہوتے ہیں۔ یہی لوازم اس صنف اور دوسری اصناف میں فرق و امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہی صورت افسانے کی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ جب ہمارے پہلے افسانہ نگار نے افسانہ لکھا تو کن چیزوں کو بنیاد بنایا اور پھر آگے چل کر نئے تجربوں کے ذریعہ اس میں کیا اضافے ہوئے؟

منٹو — لیکن پرانے زمانے میں جو لوگ افسانے لکھتے تھے کیا وہ ان روایات پر قائم رہتے تھے — میرے خیال میں تو ان کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

وقار عظیم — ہر تجربہ آگے چل کر روایت کا جزو بن جاتا ہے اور جب وہ روایت بن جاتا ہے تو آگے آنے والے وقت کے تقاضوں کی بنا پر نئے تجربے کرتے ہیں اور ہوتے ہوتے یہ بھی روایت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ندیم — سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اردو افسانے کی بنیاد کہاں سے ہوئی، اور کیا اردو افسانے کی روایت اتنی وسیع ہے کہ ہم اس پر بحث کر سکیں۔ غالباً اردو افسانے کی ابتدا اسی صدی میں ہوئی ہے۔ ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوشؔ، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری شامل ہیں۔ دیکھنا ہمیں ان کے ساتھ آج کے افسانہ نگاروں کا تعلق قائم کرنا ہے۔

وقار عظیم — اس طرح بات یہاں آ کر ٹھہری کہ ہمارے ابتدائی افسانہ نگار سلطان حیدر جوشؔ، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری ہیں —

منٹو — سجاد حیدر کو میں افسانہ نگار نہیں مانتا کیونکہ وہ سب ترجمے کرتے رہے ہیں۔

وقار عظیم — انہوں نے ترجمے ضرور کئے ہیں لیکن طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں۔

ندیم — تو سب سے پہلے ہمیں یہ متعین کر لینا چاہیئے کہ اردو افسانے کی روایت وہیں سے شروع ہوتی ہے یا اس سے بھی پہلے۔

منٹو۔ افسانے کی روایت تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے قصّے کہانیاں شروع ہوتی ہیں۔

وقار عظیم۔ لیکن ہماری بحث کا تعلق اردو افسانے سے اور خاص کر مختصر افسانے سے ہے۔

منٹو۔ پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ افسانہ ہوتا کیا ہے؟

انتظار حسین۔ غالباً پریم چند سے افسانے کی باقاعدہ روایت قائم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے زمانے میں افسانے کا کیا تصور تھا ... اور بعد میں کیا ہوا۔ دیکھا جائے کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس سے کیا تجربے کیا۔

عبادت۔ یوں تو افسانہ ہر کہانی کو کہتے ہیں لیکن مختصر افسانے کے چند فنی لوازم ہوتے ہیں۔ مثلاً وحدتِ تاثر، مرکزیت، ایجاز، کردار کی تشکیل، ترتیب وغیرہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ افسانے کی یہ روایت کب سے شروع ہوئی۔ پریم چند سے یا اس سے پہلے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ مختصر افسانہ خود یورپ میں بھی بہت بعد کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی کے دورِ آخر سے قبل اس کا وجود باقاعدہ ایک صنف کی صورت میں نہیں تھا۔ البتہ اس کی روایت دوسری اصنافِ ادب میں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی شاعری میں BALLAD کو جو صنف ہے اس میں مختصر افسانے کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو میں جو داستانیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی جگہ جگہ ایسے حصّے ہیں جن میں مختصر افسانے کی روایات تلاش کی جا سکتی ہیں مثلاً سرشار کے فسانۂ آزاد میں اور میر امن کی باغ و بہار میں یہ چیز ضرور موجود تھی۔ بعد میں اس پر مغرب کا اثر ہوا جس کی وجہ سے مختصر افسانہ نئے سرے سے ترقی کی اور جدید صنعت تک پہنچ گیا۔ اس عرصے میں مختصر افسانہ مختلف تجربات کی منزلوں سے گزر گیا اور اس طرح اس میں روایت صورت پذیر ہوئی۔ آج بھی روایات اردو مختصر افسانے کا سرمایہ ہیں ——— اور یہ سامنے رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختصر افسانہ کیا ہے اور کس حد تک ان اصولوں پر قائم ہے؟

منٹو۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مختصر افسانہ کے دو الگ اصول کیا ہیں؟

وقار عظیم۔ ہمارے افسانے نے موجودہ صنعت مغرب کے اثر کے تحت حاصل کی لیکن اس میں ہماری قدیم کہانیوں اور داستانوں کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے امتزاج سے ہمارا افسانہ بنا ہے۔ مغرب کا افسانہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افسانہ میں ایک چیز کے متعلق کوئی بات کہی جائے اور اس کا ایسا اثر ہو کہ اس میں انتشار نہ ہو۔ یہ چیز ہم نے مغرب سے لی ہے۔ ایک واحد تجربہ یا تاثر افسانہ کا اصل موضوع ہے۔

منٹو۔ ایک تاثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کرنے اسے اس انداز سے پیش کر دینا کہ وہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے، یہ افسانہ ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں! ——— جب افسانے کی ایک تعریف متعین ہو گئی تو اسے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائی افسانہ نگار کس حد تک اس بنیادی بات کو پورا کرتے ہیں اور کس حد تک داستانوں سے متاثر ہیں۔

عبادت۔ پریم چند کے یہاں افسانے کی جو روایت ملتی ہے اس میں ابتداً داستانوں کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی اور پریم چالیسی کے بیشتر افسانے اسی انداز میں لکھے گئے ہیں اور مختصر افسانے کی تکنیک کے بنیادی اصولوں کا پوری طرح لحاظ نہ رکھنا بھی داستانوں کی تکنیک سے متاثر ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مختصر افسانے کی خصوصیات کو برتنے لگتے ہیں۔

وقار عظیم۔ لیکن پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے افسانے پریم چند کے ابتدائی افسانے نہیں۔ حقیقت میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کی بلکہ ہمارے افسانے کی بنیاد ہے۔ اس میں پانچ افسانے ہیں جو تمام کے تمام داستانوں کے رنگ میں گہری مقصدیت کے حامل ہیں۔ کرداروں کے ناموں تک میں یہی رنگ موجود ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا وہی تصور ہے جو داستانوں میں تھا۔ اندازِ بیان شروع سے آخر تک شاعرانہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہر افسانے میں ایک واحد مقصد ہے جسے بڑی کامیابی سے داستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ پس منظر بالکل داستانوں کا سا ہے۔ افسانہ نگار کے پیشِ نظر ایک خاص مقصد ہے جسے وہ ناظر تک پہنچانا چاہتا ہے وہ بار بار اس کی تکرار کرتا ہے۔ کبھی یہ اعادہ بڑا معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار اپنا مقصد اتنا عزیز ہے کہ وہ تکرار کے بوجھ کو محسوس بھی نہیں کرتا۔

عبادت۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ پریم چند کی یہ مقصدیت جو "سوزِ وطن" کے افسانوں میں ملتی ہے وہ مغرب کے اثرات کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس میں ایک انفرادیت ہے۔ بہرحال ان افسانوں کی تکنیک پر داستانوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں اردو افسانہ جو داستانوں سے الگ ہوا ہے تو اس میں افسانہ نگاروں کے دو گروہ تھے ——— ایک وہ جو یلدرم کی طرح رومانیت کو پیش کرتے تھے، دوسرے وہ جو پریم چند کی طرح سوسائٹی کی خرابی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کی اصلاح کا پہلو پیش کرتے تھے۔ ہمیں اس اصلاحی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کیونکہ یہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھے۔

وقار عظیم۔ سلطان حیدر جوشؔ اور پریم چند دونوں کا سیاسی ماحول ایک سا تھا۔ لیکن مسلمانوں پر سرسید کی تحریک کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی معاشرت سے متنفر نظر آتے تھے۔ ہندوؤں کا زاویۂ نظر خالص سیاسی تھا۔ مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رجحان کا حامل ہے۔ اس افسانے کی ابتدا طلسمی ہے اور اس کے دوسرے حصوں کا انداز بالکل داستانوں کا سا ہے یہی رنگ اس مجموعہ کے دوسرے افسانوں کا ہے ———

اس کے برعکس سلطان حیدر جوشؔ کے افسانوں میں مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں اور مغرب زدہ نوجوانوں کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند اور سلطان حیدر جوشؔ دونوں کے افسانے مقصدی ہیں لیکن دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

عبادت۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ پریم چند نے جو روایت قائم کی اس میں انہوں نے مغرب سے بھی اثر لیا ہے یا نہیں۔

وقار عظیم۔ پریم چند نے خود بھی لکھا ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں پر داستانوں کا رنگ ہے ——— وہ بچپن میں چھپ چھپ کر طلسمِ ہوشربا پڑھتے تھے۔ بڑے ہو کر ٹالسٹائی کا مطالعہ کیا اور اس کی سادگی و سلاست کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی ہے۔

عبادت۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

منٹو۔ کیا طلسمِ ہوشربا میں مقصدیت اور افادیت نہیں تھی؟

وقار عظیم۔ ضرور تھی۔

منٹو۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسمِ ہوشربا میں کیا فرق ہے؟

عبادت۔ یہ الگ سوال ہے۔

منٹو۔ ہم مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور دوسری چیزوں کو بھول جاتے ہیں لیکن ایچ۔ جی۔ ویلز نے سائنس کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا جھوٹ تخلیقی تعبیر تھا۔ اور افسانے سے جھوٹ نکالا نہیں جا سکتا۔

ندیم۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسمِ ہوشربا میں FANTASY ایک قدرِ مشترک ہے صرف دور کا فرق ہے۔

وقار عظیم۔ یہ بحث بے حد دلچسپ لیکن ہمارے دائرۂ گفتگو سے باہر ہے۔ میں نے جو طلسمِ ہوشربا کا نام لیا وہ محض اس لئے لیا کہ پریم چند نے اس سے اثر قبول کیا۔

ندیم۔ اب ہمیں پریم چند کے "سوزِ وطن" سے افسانے "کفن" تک یہ طے کرنا ہے کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہوتے۔

وقار عظیم۔ پہلے مقصد اصلاحی تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے انحراف کس نے کیا اور اس کے کیا اثرات ہوئے اور مقصدیت کے نقطۂ نظر سے سجاد حیدر یلدرم، جوشؔ اور پریم چند میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔

ندیم۔ سجاد حیدر ان سے الگ ہیں۔

عبادت۔ خود پریم چند کے افسانوں میں یہ بات ہے کہ وہ خالص مقصدیت کے حامل نہیں بلکہ ان کے ہر دور کے افسانوں میں زندگی کو سمجھنے، اس کو برتنے اور اس کو بہتر بنانے کا خیال بھی ملتا ہے خصوصاً ان کے بعد کے افسانوں میں یہ جمالیاتی اور صحت مند پہلو کچھ اور بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ چیز بعد کے افسانوں میں آتی ہے۔

عبادت۔ لیکن انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے پیش کیا ہے۔ مثلاً "خیالستان" کے بعض افسانوں میں یہی بات ملتی ہے۔ خارستان اور نسرین نوش کی کہانی ترجمہ ہے جس کی فضا اجنبی ہے لیکن اس کا موضوع انسانی زندگی کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے ——— یعنی مرد اور عورت کا جذباتی اور جسمانی رشتہ!

وقار عظیم۔ سجاد حیدر پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ خیال عام کیا کہ اصلاحی مقصد افسانے کے فن کو مجروح کرتا ہے۔ آگے چل کر پریم چند نے بھی مقصدیت اور اصلاح کے ساتھ فن پر پوری توجہ دی۔

عبادت۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے انقلاب سے قبل کے ترکی افسانے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ اس دور کے ترکی ادب اور خصوصاً افسانے پر جذباتیت اور رومانیت کا غلبہ تھا۔ یہ رومانیت یلدرم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ خصوصاً ہر افسانے میں انہوں نے ایک رومانی فضا قائم کی ہے جو ان کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بن گئی ہے ——— اس کو نکال دیجئے تو سجاد حیدر یلدرم کے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

وقار عظیم۔ کیا نیاز فتح پوری اور یلدرم کی رومانیت میں کوئی مماثلت ہے؟

ندیم۔ یلدرم نے افسانے کی ہیئت میں بڑی تبدیلی کی ہے۔ اس وقت تک افسانے میں پلاٹ کا تصور تھا لیکن انہوں نے مرقع نگاری کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھایا اور ایسے SKETCHES لکھے جن میں صرف ایک کردار ہے۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے ——— موضوع کے اعتبار سے جو سب سے اہم چیز ہے وہ یہ کہ سلطان حیدر جوشؔ اور پریم چند نے معاشرتی اور سیاسی پہلو لئے ہیں لیکن یلدرم نے ایسے موضوع اپنائے جو زندگی سے تعلق رکھتے تھے

اس طرح موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے۔

انتظار حسین - بہر حال ان میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل تھے اور موجودہ مختصر افسانے کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تسلسل کی منکر ہے - اس میں ایک الگ حادثہ ہے جسے زندگی سے کوئی ربط نہیں۔

عبادت - سوال یہ ہے کہ یہ جو روایت بلدرم نے قائم کی اس کے بعد نیاز فتحپوری اور ل۔ احمد نے اس میں کوئی اضافہ کیا یا نہیں؟

وقار عظیم - نہیں —— ان لوگوں نے اور مجنوں گورکھپوری نے افسانہ کسی مقصد کی خاطر نہیں بلکہ اسے کہانی سمجھ کر لکھا۔

ندیم - لیکن اس سے پہلے پریم چند کے آخری افسانے کامیاب تکنیک پر کیسے پہنچے میرے خیال میں انہوں نے مغربی افسانوں سے اثر قبول کیا۔

عبادت - پریم چند کی کہانی 'کفن' میں ان کے ابتدائی افسانوں کی تکنیک سے بڑا انحراف ہے اور اس میں مغربی افسانوں کی تکنیک کا اثر پایا جاتا ہے۔

وقار عظیم - 'کفن' افسانہ نگار کے مخصوص رجحانات کے ذہنی ارتقا کی ایک شکل ہے اس لئے ہمیں اس کے بعد کے افسانوں پر غور کرنا چاہئے۔

عبادت - "انگارے" ۳۶ء میں شائع ہوئی ہے اور اس میں شامل ہونے والے افسانہ نگاروں پر بھی پریم چند کا خاصا اثر معلوم ہوتا ہے - شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک خود پریم چند جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے بڑی حد تک بدل چکے تھے۔

ندیم - تو کیوں نہ ہو —— اگر ہم اس سے انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں روایت کے تسلسل سے انکار ہے۔

انتظار حسین - ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ انہوں نے پریم چند سے کتنا اثر قبول کیا بلکہ یہ کہ اس سے انحراف کس طرح کیا۔

وقار عظیم - "انگارے" کے افسانوں میں ہندوستانی زندگی کی مسلمہ قدروں کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے - یہ چیز پریم چند کے یہاں نہیں۔

عبادت - "انگارے" کے افسانوں میں جو شدت ہے وہ انقلابی ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک پریم چند کا اثر ضرور ہے - ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ "انگارے" کے افسانہ نگار جوان تھے - ان کے خون میں گرمی تھی - بغاوت ان کی گھٹی میں پڑی تھی - اس لئے انہوں نے اپنے فن میں ایک شدت کو پیدا کیا —— لیکن ان کی اس انتہا پسندی نے فن کو ٹھیس پہنچائی۔

وقار عظیم - لیکن یہ ایک تجربہ تھا اور خود اس کے مصنف آگے چل کر بہت کچھ سنبھل گئے۔

ندیم - جی ہاں! بعض تو بالکل ہی بدل گئے۔

وقار عظیم - پھر بھی "انگارے" کے ان مصنفوں نے جہاں جہاں روایت سے شدت کے ساتھ انحراف کیا وہ آگے چل کر فن کے لئے مضر ثابت ہوئی۔

عبادت - لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا - اس کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں شدت اور بے باکی پیدا کی - شاید ہی سوسائٹی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس پر انہوں نے شدت اور بے باکی کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو - مثال کے طور پر ہم اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو پیش کر سکتے ہیں۔

وقار عظیم - لیکن منٹو 'انگارے' کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے۔

منٹو - میں نے 'انگارے' پڑھی بھی نہیں۔

انتظار حسین - 'انگارے' نے ایک غلط روایت کی طرح ڈالی - بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانہ میں سنسنی کی ضرورت ہے۔

عبادت - بات یہ ہے کہ وہ زمانہ سیاسی دہشت پسندی کا زمانہ تھا اور ان افسانوں میں جو شدت پیدا ہوئی اس میں ماحول کی اس کیفیت کا بھی اثر ہے - ویسے ہر تجربے میں شروع شروع شدت اور انتہا پسندی ہوتی ہے —— بعد کے لکھنے والوں نے اس شدت اور انتہا پسندی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ندیم - میرے خیال میں انگارے کی سنسنی کی روایت غلط ہے کیونکہ بعد میں لکھنے والوں نے اسے روایت کا جزو نہیں بنایا اور اس سے انکار کیا - ممکن ہے اکا دکا مثالیں مل جائیں لیکن بہ حیثیت مجموعی نہیں - عصمت، منٹو وغیرہ کسی نے بھی شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین - لیکن ہم افسانے میں آج بھی شدت INTENSITY ڈھونڈتے ہیں جو مختصر افسانے کی خوبی نہیں۔

منٹو - شدت کس چیز کی؟

وقار عظیم - شدت احساس کی۔

منٹو۔ یہ تو افسانے کی بنیادی چیز ہے۔

عبادت۔ غالباً انتظار صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "انگارے" میں سماجی موضوعات پر جارحانہ انداز میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو پیش کرتے ہوئے طنز اور نشتر زنی کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں —— یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کن باتوں کا ذکر ضروری ہے اور کن کا نہیں —— مثلاً جنس کے بارے میں خاصی بے اعتدالی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

منٹو۔ جنس کے بارے میں تو اس سے پہلے بھی کافی کچھ لکھا جا چکا تھا مثلاً داستانوں میں۔

عبادت۔ لیکن داستانوں میں جن جنسی موضوعات کا تذکرہ ہے ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں تو وہ ایک طرح کی لذت پرستی اور تعیش پسندی کا نتیجہ ہیں۔ 'انگارے' کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ ان میں جنسی موضوعات کا ذکر زیادہ ہے لیکن 'انگارے' کے افسانوں کے موضوعات صرف اسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں سماجی زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے آگے چل کر ترقی کے اس رجحان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

وقار عظیم۔ ایک طرف 'کفن' دوسری طرف 'انگارے' —— دونوں کو سامنے رکھ کر ہمیں آگے بڑھنا ہے —— پریم چند نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمیں زندگی کے متعلق کس طرح لکھنا چاہیئے۔ ہیئت کے اعتبار سے اس مجموعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئی راہوں کو اپنانا چاہیئے اور یہ کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم ۳۶-۱۹۳۵ء تک پہنچ چکے ہیں۔ بعد میں یہی رجحان منٹو، کرشن چندر اور ندیم میں پیدا ہوا کہ وہ جس معاشرے میں رہتے بستے ہیں اسی کے متعلق لکھیں۔

ندیم۔ روایت کی بحث یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی۔

وقار عظیم۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں نے خاصے تجربے کئے ہیں ہیئت اور موضوع دونوں کے اعتبار سے۔ نئے لکھنے والوں نے اپنے ذہنوں میں سادگی پیدا کی ہے اور زندگی کی کشمکش کو نئے زاویں سے دیکھا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی انہوں نے تکنیک کو نکھار دیا ہے اور یہ چیز پڑھنے والوں پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ "انگارے" کا کینوس زیادہ وسیع نہیں اور اس میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے بعد میں آنے والوں نے "انگارے" کے افسانوں کے مقابلے میں اپنے ماحول کی زیادہ وسیع اور باشعور ترجمانی کی ہے۔ جذباتی رومانیت کی تحریک نے جو رجحان پیدا کیا تھا وہ اور زندگی کی باشعور ترجمانی کا رجحان دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ رومانیت کی اہمیت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ خصوصیت کے ساتھ جب یہ رومانیت ہمارے یہاں جذباتیت کی حدود سے باہر نکلتی ہے تب تو اس کی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے رومانیت کے اس نئے رجحان کو پیش کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانہ ۱۹۳۵ء تک جو تھا اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں دو لکھنے والے بہت نمایاں ہیں۔ عصمت اور منٹو۔

وقار عظیم۔ اس میں احمد علی، حیات اللہ انصاری، بیدی اور ندیم بھی شامل ہیں۔

ندیم۔ ان پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس دور تک افسانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔

عبادت۔ حیات اللہ انصاری اور احمد علی کے ہاں ایک خاص قسم کی واقعیت اور حقیقت نگاری REALISM ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان تو ہر افسانہ نگار کے ہاں ہے کہ وہ زندگی کو ایک خاص قسم کی حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے —— مثلاً کرشن چندر کے افسانے کشمیر اور بمبئی سے متعلق ہیں —— منٹو بمبئی کے متعلق لکھتے ہیں —— ندیم پنجاب کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کے کردار لاہور میں سانس لیتے ہیں۔

انتظار حسین۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں کرشن، ندیم جن کا انداز تحریر شاعرانہ ہے۔ دوسرے احمد علی، منٹو۔

ندیم۔ مجھے احمد علی اور منٹو میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً احمد علی کے "ہماری گلی" اور "قید خانہ" میں بڑی مجرد قسم کی انفرادیت ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن ان سب نے ایک محدود دائرے میں رہ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ بین الاقوامی حالات کا اثر ہمارے ماحول پر کیا ہے۔ خصوصاً منٹو اور کرشن نے —— یہ بات پہلے نہیں تھی۔

عبادت ۔ احمد علی اور حیات اللہ انصاری کی حقیقت نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم ۔ وہ ایک خاص ماحول سے باہر نہیں نکلتے عصمت بھی ایک خاص ماحول کی عکاسی کرتی ہیں ——— وہ ماحول جس کی تفصیلات کا انہیں اچھی طرح علم ہے۔

عبادت ۔ لیکن منٹو اور ندیم کے ابتدائی افسانوں میں بین الاقوامی حالات اور سیاسی شعور کا کوئی گہرا اثر نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ ممکن ہے۔ ندیم کے طرزِ بیان میں شعریت گھلی ملی ہے اور وہ دیہاتی فضا کو سیدھے سادے رنگ میں پیش کرتے ہیں لیکن جہاں وہ سپاہی کا ذکر کرتے ہیں وہاں عالمی جنگ کے اثرات ضرور واضح ہیں۔

ندیم ۔ سوال یہ ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی جو وسعت اور بین الاقوامیت کی فضا ہے اس کا وجود کیسے ہوا۔ ان کے فن کے ابتدائی زمانہ میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت کیسے پیدا ہوئی ہ؟

منٹو ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو افسانہ نگار سمجھا ہے۔ میں نے بہت سے تجربے کئے ہیں جن میں سے کچھ میں تو ناکام رہا ہوں اور کچھ میں کامیاب ———

ندیم ۔ میرے خیال میں اس کے کچھ مادی وجوہ بھی ہیں مثلاً مطالعہ ——— مغربی افسانوں کے تراجم ——— وغیرہ۔

عبادت ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے قریبی تعلق بھی رکھا ہے اور ان میں گھل مل کر انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی زندگی سے قربت ہے اور اسی کی ترجمانی کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

منٹو ۔ لیکن میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں ——— اور یہی آرٹسٹ کا نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ میں نے اپنے افسانے "خوشیا" میں ایک بھڑوے کی کہانی لکھی ہے۔ لوگ نے کہا بھڑوا ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد ہر بھڑوا ایسا ہی بن جائے ——— یا یہ بھی ممکن ہے کہ بھڑوا میں بھی ہوں ———

افسانہ نگار کی خوبی اس میں ہے کہ وہ ایک چیز لکھے اور وہ بھی

آپ کو زندگی میں بھی مل جاتے ——— وہ ہر کسی کو "۔۔۔۔۔۔" کرتا چلا جاتا ہے ———

وقار عظیم ۔ اب تک ہم نے اپنے افسانہ کے ارتقا کی ان ابتدائی منازل کا جائزہ لیا ہے جن سے اردو افسانہ گذرا ہے اس وقت تک بعض رجحانات واضح طور پر نمایاں ہو چکے تھے مثلاً واقعیت کی طرف توجہ، اور یہ چیز سب سے پہلے پریم چند نے شروع کی۔ پریم چند کے اثر سے لکھنے والوں نے اس اسلوب کو اپنایا ——— اس کی مثالیں ہمیں اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور پھر احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ انہی میں کچھ لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے دیہات کو چھوڑ کر شہروں کو اپنا موضوع بنایا۔ مثلاً حامد اللہ افسر اور راشد الخیری وغیرہ لیکن ان میں سب سے نمایاں نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے۔ ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں ہمیں زندگی سے گہرا رابطہ نظر آتا ہے۔

دوسرا گروہ سجاد حیدر یلدرم اور ان کے متبعین کا ہے، ان کے افسانے زندگی سے متعلق ضرور ہیں لیکن زیادہ تر رومانی کیفیات کے ترجمان ہیں ——— مثلاً حجاب امتیاز علی اور ل۔ احمد اکبر آبادی۔ یہ زندگی اور رومان دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

بعض لوگ ان دونوں گروہوں سے متاثر ہوئے۔ مثلاً سدرشن کے ہاں پریم چند اور یلدرم دونوں کا اثر ہے۔

تیسرا گروہ رجحان سے الگ ہٹ کر ترجمہ کرنے والوں کا ہے ان لوگوں نے رومانی رجحان کو دور کرنے کی کوشش کی یہ زندگی کو فن کے ساتھ لے چلنے کے قائل تھے مثلاً خواجہ منظور (ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا) اس اثر کے تحت بعض لوگوں نے مرسپاں کے اور بعض نے چینی افسانوں کے ترجمے کئے ——— ان میں مولانا ظفر علی خاں، منشی حامد علی خاں، منصور احمد جیسے لوگ شامل ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موجودہ روایت پر پریم چند کی روایت، یلدرم کی روایت اور ترجمے کرنے والوں کا انداز مجموعی طور پر اثر انداز ہوا۔

پریم چند اور یلدرم کے بعد والے دور میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے نام بہت نمایاں ہیں اس لئے ہمیں انہی سے بحث

کا بھی ذکر کرنا چاہئے۔

عبادت ۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے پریم چند کے انداز کو اپنایا ہے۔ لیکن حسینی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ پریم چند اور حسینی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پریم چند کا نقطۂ نظر سیاسی تھا۔ حسینی کی راہ اس سے مختلف ہے۔

عبادت ۔ اسی طرح اعظم کریوی کے ہاں زندگی کی ترجمانی میں نفسیات کی گہرائی شامل نہیں ۔ ان کے پاس ایک سیدھا سادا بیان ہے ۔

حمید اختر ۔ پریم چند کا انداز فکر ایک خاص قسم کا تھا۔ حسینی کے یہاں بعض اور چیزیں بھی ملتی ہیں مثلاً جنس کی FRUSTRATION اور ازدواجی زندگی کی ناکامی۔

عبادت ۔ حسینی نے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی وہ افسانے لکھ رہے ہیں اور آج کے مسائل کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خالص رومانی نقطۂ نظر کے علاوہ رومانیت اور حقیقت نگاری کے رجحان نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو شدت ہے اگرچہ بعد میں پیدا ہوئی ہے، سیاسی شعور نہیں لیکن اس میں سماجی درد اور کسک ضرور ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند نے اپنے فن کے ہر دور میں راہ نما کی حیثیت قائم رکھی۔ علی عباس حسینی ایسا نہیں کر سکے لیکن یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ وہ ہر وقت کا ساتھ دیتے رہے۔

عبادت ۔ ایک بات اور علی عباس حسینی کے ہاں یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کے بارے میں کوئی بہت واضح اور قطعی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک طرح کے انسانیت پرست (HUMANIST) اور اصلاح پسند ہیں۔

وقار عظیم ۔ حسینی صاحب کی نظر ان مسائل پر ہے جو بالکل ان سے قریب تھے۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان حالات کے پیچھے کیا حقائق کام کر رہے ہیں۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کو میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ وہ چونکہ سرکاری ملازم رہے ہیں اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکے جو قابل گرفت ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں وہ شدت نظر نہیں آتی اور وہ باغیانہ انداز نہیں تھا جس کی تخلیق انقلابی شعور کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

حمید اختر ۔ حسینی اور پریم چند میں فنی اعتبار سے بھی بڑا فرق موجود ہے۔ حسینی کے پاس قاری کو ساتھ [illegible] کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ پریم چند کے ہاں یہ بات بڑی صاف ہے۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کے بعض افسانے ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے بڑے مکمل ہیں مثلاً "انسپکٹر کی عید" بڑا منا ہوا افسانہ ہے اور اس طرح کے بہت سے افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔

ندیم ۔ یہی بات "میلہ گھومنی" میں ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک اور افسانہ [illegible] مجھے پسند ہے [illegible] جانوروں کے [illegible] بیان اور [illegible] ہے۔ [illegible] میں پریم چند فن کے ساتھ [illegible] تجربے [illegible] ہیں۔ پھر انہیں بیان پر بھی [illegible] قدرت نہیں تھی۔ اس معاملے میں علی عباس ان سے بہت آگے ہیں۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کو ہیئت پر پوری قدرت ہے۔ وہ تکنیک اور دوسرے فنی لوازمات کو سمجھتے ہیں اور میرے خیال میں تو وہ ایک باشعور لکھنے والے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا گہرا مطالعہ ہے۔ اسی مطالعہ نے انہیں فن کے قریب بنا دیا ہے۔ مغربی افسانے کی روایات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس کا اثر ان کے افسانوں کی تکنیک پر بھی جھلکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ حسینی صاحب کو ہر رومانی چیز سے محبت ہے اور انہوں نے زندگی کے آداب اور تہذیب کے نکات کو افسانوں میں بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

عبادت ۔ ایک اور بات یہ ہے کہ [illegible] تکنیک کو سمجھنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہر بات کی [illegible] اور راستے ہیں۔ تکنیک کے [illegible] وہ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم ۔ اس وقت فن کا واضح شعور رکھنے والوں میں پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت افسانہ کی ہیئت پر توجہ شروع ہو گئی تھی۔

عبادت ۔ حسینی صاحب کے زمانے [illegible] کا تجزیہ بھی ان کے فن کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔

وقار عظیم ۔ ان کے افسانوں میں رومانی کیفیت زیادہ غالب ہے۔ اس لئے وہ دیہات کے متعلق لکھتے ہیں تو انہیں زیادہ کشش ان چیزوں میں معلوم ہوتی ہے کہ [illegible] میں محسوس کیا جاسکے

پنتی ہے ۔ کون سے گھنے لگائی ہیں وغیرہ ۔

ندیم ۔ نہیں ہے ۔ کچھ کہانیاں بھی ہیں نا ۔

وقار عظیم ۔ ان کی وجہ پریم چند کا اثر ہے ۔

عبادت ۔ عظیم کریگی کے ہاں فن کے رنگ کا پتہ نہیں چلتا —— وہ زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں ۔ اس طرح وہ ایک فطرت نگار NATURALIST کہے جا سکتے ہیں ۔

حمید اختر ۔ زندگی کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے وہ حسن عسکری کے پاس ہے نہ عظیم کریگی کے پاس ۔ یہ پریم چند اور سدرشن وغیرہ اصلاحی مصنفین کی طرح لکھتے ہیں ۔

وقار عظیم ۔ اور یہ چیز نئے لکھنے والوں کو روایت کی طرح ورثہ میں ملی ہے ۔ پھر نئے لکھنے والوں کو مغربی ادب سے بڑا تعلق ہے ۔ مثلاً احمد علی اور کرشن چندر کے افسانوں میں مشرقی روایت اور مغربی ادب دونوں کا نمایاں اثر نظر آتا ہے ۔

عبادت ۔ اس دور کے لکھنے والوں میں ہم نے ابھی تک عظیم بیگ چغتائی کا مرتبہ متعین نہیں کیا ۔ حالانکہ اردو افسانے کو جذباتی رومانیت سے نکالنے اور حقیقت و واقعیت سے ہم کنار کرنے میں وہ بہت نمایاں رہے ہیں ۔

حمید اختر ۔ چغتائی نے افسانوں میں سے رومانیت پسندی کو کم کیا ہے ۔

وقار عظیم ۔ ایک خاص بات جو طرزِ بیان سے متعلق ہے ۔ ہمارے ہاں ہمیشہ سے بڑی ٹھوس روایت رہی ہے ۔ جسے ہم کہانی کہانی سمجھنا چاہیے اس روایت کو نئے دور میں عظیم بیگ نے زندہ کیا ہے ۔

عبادت ۔ مجموعی طور پر ان کے ہاں مختصر افسانہ کے فنی لوازم پوری طرح نہیں ہیں ۔ ان کے بیشتر افسانے بہت واضح ہیں ۔ ان میں وحدتِ تاثر کا احساس بھی کم ہوتا ہے لیکن سماجی حالات کی ترجمانی میں انہوں نے جس طنز کا انداز سے جو ایک جارحانہ رنگ لئے ہوئے ہے وہ بالکل نیا ہے اور اس نے اردو افسانے میں نئی راہیں کھولی ہیں ۔

وقار عظیم ۔ ٹھیک ہے ہم انہیں فن کار کی حیثیت سے بڑا افسانہ نگار نہیں سمجھتے لیکن عظیم بیگ کا یہ بڑا احسان ہے کہ ہمارے نئے لکھنے والوں کو محض اصلاح کے راستے سے ہٹا کر نئے طریقے سے سوچنے کا اسلوب دیا ۔ بعد کے افسانہ نگاروں کے ہاں طنز کا جو عنصر ہے وہ چغتائی کے اثر کا نتیجہ ہے ۔

عبادت ۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ عظیم بیگ کے اثرات دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمارے نئے لکھنے والوں پر نمایاں ہیں —— عظیم بیگ کے بعد جو نئے افسانہ نگار آئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی حد تک چغتائی کی فن کاری کے جارحانہ انداز سے متاثر نظر آتے ہیں ۔

وقار عظیم ۔ اب ہمیں بات کو آگے بڑھانا چاہیے ۔

عبادت ۔ جی ہاں ۔ اب تو ہمیں منٹو ، عصمت ، بیدی ، ملک ، کرشن چندر ، احمد علی اور حیات اللہ انصاری میں سے ہر ایک کی خصوصیات کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے نئے تجربوں سے ہماری روایت میں کیا اضافے کئے ۔ مثلاً سب سے پہلے منٹو کو لیجئے ۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے لیکن اس کے باوجود وہ صرف دو تین موضوعات پر پوری طرح حاوی ہیں ۔ دوسرے موضوعات میں وہ شدت نہیں ۔

مثلاً طوائف کی زندگی کی انہوں نے ایسی جزئیات پیش کی ہیں جن سے گھن آتی ہے اور یہ ایک سماجی خدمت ہے لیکن بعض جگہ جنسی موضوعات پر لکھتے لکھتے وہ بھٹک گئے ہیں ۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت ——

وقار عظیم ۔ یہ بعد کا ہے اس لئے ابھی اس کا ذکر بے محل ہے ۔

ندیم ۔ میرے خیال میں ان کی تخلیقات ایسی ہیں کہ انہیں بھی دو ادوار میں تقسیم کر لیا جائے تو بہتر ہے ۔

حمید اختر ۔ اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں ؟

وقار عظیم ۔ وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔

عبادت ۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں ۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک روحانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی ۔

ہاجرہ مسرور ۔ میرزا ادیب کس دور میں رکھے جائیں گے ؟

وقار عظیم ۔ ان کا اندازِ طلسم و اندر جاب ، امتیاز علی کا ہے ۔ ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھوکھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو بھی آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں ۔

ہاجرہ مسرور ۔ کرشن چندر کے کون سے افسانے ہیں جن میں ذہنی لذتیت ہے ؟

عبادت ۔ ابھی ہم ان کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

انتظار حسین ۔ میرے خیال میں منٹو صاحب اور قاسمی صاحب کے تقسیم کے بعد کے افسانوں پر ہمیں الگ بحث کرنی ہوگی۔

ندیم ۔ انتظار صاحب کی بات ٹھیک ہے۔ تقسیم کے بعد لکھنے والوں میں بعض بڑی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلے یہ متعین کر لینا چاہئے کہ ۱۹۴۷ء تک افسانے میں کیا تجربے ہوئے اور اس وقت روایت نے کیا شکل اختیار کی تھی۔

عبادت ۔ ۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان اردو افسانہ کن منزلوں سے گزرا اور اس میں کون کون سے تجربے ہوئے؟ (ہاجرہ مسرور سے مخاطب ہو کر) آپ کی منٹو کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ہاجرہ مسرور ۔ آپ حضرات فرمائیں۔ مجھے تو ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

وقار عظیم ۔ مجھے منٹو کی تکنیک میں جو چیز شروع سے کھٹکتی رہی ہے وہ یہ کہ وہ ہمارے سیاسی اور سماجی عقائد اور ہماری اخلاقی قدروں کے خلاف ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جو پڑھنے والے کو SHOCK دے۔ وہ نئی بات کے بجائے غیر متوقع بات کہتے ہیں اور چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے وہ بات پیدا بھی کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بات اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔

انتظار حسین ۔ ان کی تحسین کا تصور یہ ہے کہ جو چیز ہے اسے کہا جائے کہ نہیں ہے ــــــ یہ رویہ تخلیق کے لئے بہت مہلک ہے چیزوں سے انکار کرنے سے بات نہیں بنتی۔

ندیم ۔ وہ FANTASY اور حقیقت دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

حمید اختر ۔ یہاں تک کہ اب ان کا مقصد صرف چڑھانا رہ گیا ہے شروع کے افسانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ پہلے انہوں نے بڑے پیارے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں۔ یہ چیز انہوں نے آہستہ آہستہ DEVELOP کی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ــــــ ایک بار منٹو اور اشک اپنے اپنے فن پر بحث کر رہے تھے۔ ایک صاحب ثالث بنے اور انہوں نے بتایا کہ یوں تو دونوں میز پر رکھی ہوئی دیا سلائی کے متعلق لکھتے ہیں لیکن اشک کی نظر دیا سلائی پر سیدھی جاتی ہے اور منٹو میز کے نیچے سے نظر گھما کر دیا سلائی کو دیکھتا اور اس پر لکھتا ہے۔

مطلب یہ منٹو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کرنا چاہتا ہے۔

حمید اختر ۔ یہ بات کبھی بہت بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں رہتی۔

عبادت ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کشمکش کا کوئی صحیح اور واضح شعور نہیں۔

ندیم ۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شدید قسم کے انفرادیت پسند ہیں اور ایسے شخص میں غصہ، ضد اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ضد میں لکھا ہے اور مقدمے چلائے جانے کی وجہ سے لکھا ہے اور کہتے ہیں کہ تم اگر "کالی شلوار" سے چڑتے ہو تو میں تمہیں "دھواں" لکھ کر پریشان کروں گا۔

وقار عظیم ۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زندگی طرح طرح کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہے، انہیں گرد و پیش کی زندگی کا صحیح احساس نہیں ہے' وہ فرد سے آگے بڑھ کر سوچنا نہیں چاہتے۔

عبادت ۔ ان کے افسانوں میں دو چیزیں خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ایک تو افراد کی مصوری دوسرے سماج کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر۔ لیکن ایسے نقطۂ نظر سے جس کے اندر زندگی کا کوئی طبقاتی اور تجزیاتی شعور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک ایسی حقیقت نگاری ملتی ہے جس میں فوٹو گرافی زیادہ ہوتی ہے مصوری نہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ رجحان اس دور میں عام ہے کہ کردار کی ذہنی کیفیت اور جزئیات کے ذریعے فضا پیدا کی جائے مثلاً اشک خاصی تفصیل سے لکھتے ہیں اور افسانے کو خوبی کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ منٹو ماحول سے پوری طرح واقف ہیں اور ان جزئیات سے وہ خاص چیزیں نکال لیتے ہیں جو قاری کو متاثر کرتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ آخر وہ قاری کو تاثر کیا دیتے ہیں؟

عبادت ۔ انسانی زندگی کی بدحالی اور سماجی محرومات کا تاثر۔ ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اثر ہوتا ہے ــــــ مثلاً طوائف کی زندگی کا دوسرا رُخ ــــــ اس سے قبل تو طوائف کو صرف تعیش کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا۔ منٹو اس کے انسانی پہلو کو پیش کرتے ہیں اور اس سے پڑھنے والے کو نفرت نہیں پیدا ہوتی۔

انتظار حسین۔ اس کے لہجے کی آہستگی بہت متاثر کرتی ہے۔ منٹو کا افسانہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقارہ بج رہا ہے۔ بیدی کے افسانے میں عام اپیل کم ہے اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کی ضرورت زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ یہ عجیب بات ہے کہ بیدی سے زیادہ مقبولیت کرشن چندر نے حاصل کی۔

خدیجہ مستور۔ یوں تو ایم اسلم کرشن چندر سے زیادہ مقبول ہیں۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر اور منٹو کا انداز ایک سا ہے وہ عام قاری کو زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

عبادت۔ بیدی کے مقابلے میں کرشن چندر کی مقبولیت کا سبب اور بھی ہے۔ اگرچہ بیدی کا انداز اور لہجہ کی آہستگی ٹھیک ہے لیکن گہرے سماجی روابط کا شعور بیدی کو کم ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی عکاسی ضرور ہے لیکن زندگی کی تنقید کم۔ کرشن چندر کے یہاں باوجود رومانیت کے یہ شعور زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ سوال یہ ہے کہ کیا مختصر افسانہ زندگی پر تنقید ہے؟

حمید اختر۔ ایک چیز اور بھی ہے کہ کرشن چندر اور منٹو نے بیدی سے بہت زیادہ لکھا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ایم اسلم کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

انتظار حسین۔ "یہ سماجی روابط کے شعور" کا فقرہ ذرا گمراہ کن ہے۔ بیدی کے پاس سماجی روابط کا تانا بانا زیادہ مضبوط ہے۔

حمید اختر۔ کرشن چندر واضح بات کہتا ہے جس سے تھوڑا پڑھے ہوئے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس کے قارئین کا حلقہ بڑھ جاتا ہے۔ علمی ادبی ذوق والے کم ہی جو بیدی سے متاثر ہو سکیں۔

عبادت۔ بیدی کے ہاں انداز بیان میں الجھن ہے اور ان کے افسانوں میں زندہ حرکت نہیں ہے بلکہ ایک سست روی ہے۔ یہ حرکت کرشن چندر کے ہاں بہت زیادہ ہے اس لئے اس کے افسانوں کا تاثر بیدی کے مقابلے میں گہرا ہوتا ہے

انتظار حسین۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی —— او ہنری بڑا سادہ نگار ہے چیخوف نہیں ہے۔ لیکن چیخوف زیادہ بڑا فن کار ہے۔

عبادت۔ شگفتگی اور روانی تاثر کو گہرا کرتی ہے۔ بیدی کے افسانوں کی مقبولیت میں شگفتگی اور روانی کی یہ کمی حائل نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کے بجائے بیان کی قدرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر کے ہاں صحافتی انداز پیدا ہو گیا ہے اس لئے وہ قاری کے ذہن کو جلدی گرفت میں لے لیتا ہے۔

عبادت۔ یہ بات غلط ہے۔ کرشن چندر کے پاس بڑا خوب صورت انداز بیان ہے۔ اس اعتبار سے وہ علی عباس حسینی کو چھوڑ کر اردو کے باقی تمام افسانہ نگاروں سے آگے ہے۔ اس کے پاس صحافت کو بھی ادب بنا دینے کا جادو ہے۔

وقار عظیم۔ بیدی کے موضوع اتنے متنوع نہیں جتنے کہ کرشن چندر کے ہیں۔ لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس مشاہدہ کی گہرائی ضرور ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت میں ان کے طرز بیان اور طرز بیان کی شاعری کو بڑا دخل ہے۔ اس سے قطع نظر بیدی بڑا افسانہ نگار ہے۔

عبادت۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بیدی محدود ہو کر سوچتے ہیں۔ ان کے یہاں احساس کی شدت ہوتی ہے لیکن گہرائی نہیں ہوتی۔ وہ جن مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے افسانوں میں ان کا کوئی حل نہیں ملتا۔

وقار عظیم۔ کرشن چندر باتیں زیادہ کہتے ہیں۔ پھیل کر کہتے ہیں۔ گہرائی تو بیدی کے پاس ہے البتہ وسعت نہیں۔ انہوں نے اپنے گردوپیش کی زندگی کو دیکھا ہے اور اسی کو اتنا کافی سمجھا ہے کہ وہ اور چیزوں کے محتاج نہیں۔ کرشن چندر جس چیز کو سماجی شعور کہتے ہیں وہ کہیں کہیں پروپیگنڈا بن گئی ہے۔

انتظار حسین۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خاص تحریک کی طرف سے اپنے اوپر ایک فرض عائد کر لیا ہے۔

ندیم۔ یوں تو ہر افسانہ نگار نے اپنے اوپر کچھ نہ کچھ فرائض عائد کر لئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آواز اس کے دل کی آواز ہے یا خارجی تحریک کا اثر۔

عبادت۔ کرشن چندر کا خلوص اس سے ظاہر ہے کہ وہ رومانی ہے اگر پراپیگنڈسٹ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا

انتظار حسین۔ یہ بحث ختم کیسے ہوگی؟

شوکت تھانوی۔ مزید بحث سے پہلے مجھے اجازت دیجئے۔

عبادت۔ کچھ اشک کے بارے میں۔

وقار عظیم۔ وہ پریم چند کے مقلد ہیں۔ تفصیلات اور جزئیات میں زیادہ جاتے ہیں۔

خدیجہ مستور۔ ان کے افسانوں میں بڑی ناپختگی ہے۔

وقار عظیم۔ نہیں یہ اندازہ نہیں کہ نفسیات میں سے کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ وہ ONE ACT PLAYS اچھے لکھتے ہیں۔

محمد طفیل۔ اتنے اچھے کہ اردو کا کوئی بڑے سے بڑا افسانہ نگار بھی ان کے مقابل کھڑا ہوتے ہوئے ہچکچائے گا۔

عبادت۔ اس دور کے لکھنے والوں میں تیسرا نام عصمت چغتائی کا ہے ان کے افسانوں میں دو رجحان ملتے ہیں۔ ایک تو جنسی زندگی کے ایسے پہلو جن کی کوئی سماجی اہمیت نہیں مثلاً نوجوان لڑکیوں کے ایسے مسائل جو ذہنی الجھنوں کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں خاص رومانی اور جذباتی سی فضا بھی پیدا کر دی ہے ——— دوسرے وہ افسانے جن میں انہوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور جذباتی مسائل کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں رجحانات نے اردو افسانے میں کیا اضافے کئے ہیں۔

وقار عظیم۔ عصمت کا فن اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اسے پیش کر سکتی ہے۔ عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ دوسری بڑی بات سماجی شعور ہے۔ انہوں نے یوپی کے متوسط طبقے کے خاندانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور اس میں جو تبدیلی رونما ہو رہی ہے اسے بڑے حسن اور فنکاری کے انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت۔ لیکن انہوں نے بعض ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک سستی قسم کی رومانیت پیدا ہو گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے مزاج میں تمسخر کا رنگ ہے۔

عبادت۔ اس میں ان کا اپنا جذبہ اور خواہش بھی شریک دکھائی دیتی ہے اور یہ اس معاشرہ کا تمسخر معلوم ہوتا ہے جس نے انہیں گھٹن و مجبوری میں رکھا لیکن ان باتوں کو موضوع بنانے میں کیا ان پر رشید جہاں کے افسانوں کا اثر نہیں ہے؟

وقار عظیم۔ رشید جہاں اور عصمت میں بڑا فرق یہ ہے کہ رشید جہاں نے ماحول کی عکاسی زیادہ نہیں کی۔

انتظار حسین۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ افسانہ نگار خواتین کا گروپ پنجاب کو چھوڑ کر یوپی میں پیدا ہوا اور یہ بغاوت یوپی میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے معاشرتی ماحول کا پورا احساس ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اور قرۃ العین کی کہانیوں میں [illegible]۔

عبادت۔ قرۃ العین حیدر کا مزاج ان سب سے الگ ہے۔ ان کا نام ان کے ساتھ نہ لیجئے۔

انتظار حسین۔ ہاں ان کی کچھ دوسری شکل ہے۔

محمد طفیل۔ جیسا نرگس [illegible] یہاں بات سنگروں کی نہیں افسانوی تخلیقات کی ہو رہی ہے۔

(قہقہہ)

عبادت۔ عصمت چغتائی نے مختصر افسانے کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھا اور اسے توازن اور ہم آہنگی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا انداز بیان خاصے کی چیز ہے۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے۔ بے ساختگی اور روانی نے ان کی تکنیک پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے۔ وہ تصویریں جو انہوں نے پیش کی ہیں بڑی واضح ہیں۔ ان میں معنویت اور مقصدیت بھی ہے اور وہ بڑی دلآویز اور دلنشین بھی ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک اور بات یہ کہ وہ بڑی بے حجاب ہیں۔ انہیں کسی کے عتاب یا تعزیر کا خوف نہیں۔

عبادت۔ لیکن ان کی یہ شدت، تیزی، جارحانہ کیفیت اور بیباکی کہیں کہیں حد سے گزر جاتی ہے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں کرتی۔

وقار عظیم۔ یہ ترقی کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ سنجیدگی کی کمی توازن کی کمی کا سبب بن جاتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ عبادت صاحب نے جو حد سے گزر جانے کی بات کی ہے تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ حدود کیا ہیں؟

وقار عظیم۔ حدود تو کوئی نہیں لیکن لکھنے والے کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے۔ اب اگر وہ بیان میں اتنی شدت پیدا کر دے کہ [illegible] کے بجائے جھنجھلاہٹ پیدا کرے۔ تو یہ ٹھیک نہیں۔

انتظار حسین۔ غالباً عبادت صاحب کے ذہن میں [illegible] ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں عبادت صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ اور ملک میں چند سماجی قدریں ہوتی ہیں جن کا توڑنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

ہاجرہ مسرور۔ میں نے یہ بات اس لئے کی کہ ہم نے پہلے منٹو پر بحث کی تھی۔ ان کا انداز کہیں زیادہ خطرناک اور پھسلواں ہے۔

عبادت۔ منٹو کا انداز مختلف ہے۔ سماجی محرکات کے بیان میں ان کی اپنی ذہنی کیفیت شامل نہیں لیکن عصمت کے ہاں [illegible]۔

کیفیت شامل ہو جاتی ہے عصمت کے فن کا یہ جھوٹا تصور ہمارے سامنے ہے اس میں اگرچہ زندگی کی بڑی اچھی عکاسی ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ راستے سے ہٹ کر ایک دلہن نہ جوش اور جذبے میں انہوں نے جگہ جگہ ایسی باتیں کہہ دی ہیں جس سے فن کے کار پر بیشتر گری کو ٹھیس لگتی ہے بات یہ اس کی داستان کی نوجوانی اور نوجوانی کی ذہنی جذباتی کیفیات ہیں جن کو ایک مخصوص ماحول نے دبا کر ابھرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

انتظار حسین ۔ یہ بات تو کرشن چندر اور اس دور کے دوسرے لکھنے والوں پر بھی صادق ہو سکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ بچہ فطری طور پر شرارت پسند ہوتا ہے آپ اسے روکئے ہیں تو وہ اور راستے ڈھونڈھ لیتا ہے جھپنے سے منع کئے جانے پر وہ دیواریں سیاہ کرنے لگتا ہے۔

عبادت ۔ عصمت باشعور انقلابی نہیں ہیں ۔ ان کے یہاں ایک باغیانہ جھنجھلاہٹ ہے ۔ یہ خصوصیت ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ بہرحال آپ انہیں روکتے ہیں زرد چٹکیاں بیتنے لگتی ہیں۔

ندیم ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اردو افسانہ کی جوش ملیح آبادی ہیں۔

(قہقہہ)

ہاجرہ مسرور ۔ عصمت چغتائی نے جن مسائل پر لکھا ہے ان کے لئے یہ انداز لازمی ہے ۔ انہوں نے مردوں کے ذہنی کھیل کا ذکر کیا ہے ۔ اب اس کے لئے وہ اور کیا لکھ سکتی ہیں اور یہ بات تہذیب کے دائرے میں کس طرح لائی جا سکتی ہے۔

عبادت ۔ اسے بات دیکھئے وہاں کی فضا بازی اور چھینٹے نیپا لینے کو بھی نظر کیجئے۔

وقار عظیم ۔ اس کی فضا بازی میں تیزی تو محسوس ہوتی ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ اس سلسلے میں "بات" کا ذکر ضرور ہو ۔ اپنے پہلے عصمت نے یہ جو ہندی ہے ۔ اسے بچے کی زبان سے کہلوایا ہے اس سے وہ گفتگو سا ہو گیا ہے ۔ انداز بیان غلط تھا لیکن موضوع غلط نہیں تھا۔

عبادت ۔ اس کا مجموعی تاثر فنکار کی اپنی دلچسپی اس معاملے میں ظاہر کرتا ہے اور یہ اس افسانے کی سب سے بڑی خامی ہے اور اس کا بنیادی مقصد اس طرح فوت ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین ۔ میرے خیال میں تو عصمت نے صحیح انداز اختیار کیا۔ NARRATOR بالغ ہوتا تو یہ بات زیادہ گھناؤنی ہوتی ۔ یہ INDIRECT ہے ۔ بچے کے بیان سے یہ بات ہم تک پہنچ گئی اور اس میں عریانی نہیں رہی۔

عبادت ۔ عریانی بالکل نہ سہی لیکن مجموعی تاثر میں مذموم کیفیت کا اظہار نہیں ہو سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا اس میں خود لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ خصوصیت اس افسانے کو خاصا خطرناک بنا دیتی ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ اس میں لذت نہیں محسوس ہوتی۔

ندیم ۔ قاری لذت محسوس کرتا ہے ۔ اگر وہ بچے کے بجائے بالغ NARRATOR کے ذریعے پیش کرتیں تو افسانہ کامیاب ہوتا۔

خدیجہ مستور ۔ اور جس عورت کے ساتھ یہ واقعات ہو رہے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی نہیں ہوتی افسانے میں چٹخارا ہے ۔ یقین نہیں آتا کہ "چوتھی کا جوڑا" کا افسانہ نگار ایسا افسانہ بھی لکھ سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ میں نے تو موضوع سے بحث کی تھی۔

عبادت ۔ اس افسانے کے موضوع کی اہمیت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا ۔ یہ خرابی ہماری معاشرت میں موجود ہے کاش عصمت اس اہم موضوع کو اس طرح پیش کرتیں کہ ہمیں اس سے نفرت کی صورت ہی نمایاں ہوتا لیکن اس افسانے نے تو اس موضوع سے دلچسپی لینے کی ترغیب دی ہے عصمت کا وار اس طرح خالی جاتا ہے ۔ وہ خود اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔

انتظار حسین ۔ احمد ندیم قاسمی کے ذریعے اردو افسانے میں ایک نئی چیز آئی اب تک یوپی کے علاقے کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن اردو دان حلقہ پنجاب کے گرد و نواح سے واقف نہیں تھا ۔ اب یہ بات اور ہے کہ ندیم صاحب نے اسے DEAL کیسے کیا ۔ ان میں خامی یہ ہے کہ وہ پنجاب کی فضا پر شاعری کا پردہ ڈال دیتے ہیں ۔ وہ حقائق کو رنگین عینک سے دیکھتے ہیں۔

عبادت ۔ جس چیز کو انتظار صاحب خامی کہتے ہیں میں اسے ان کے فن کا ضروری جزو سمجھتا ہوں ۔ یوپی اور پنجاب کی فضا میں بڑا فرق ہے ۔ پنجاب کے دیہات کی فضا رومانی ہے ۔ وہاں کے پہاڑوں میں رومان ہے ۔ دریاؤں میں رومان ہے کھیتوں میں رومان ہے ۔ غرض یہ کہ ساری فضا رومانی کیفیت

چھائی ہوئی ہے ندیم صاحب جب اس فضا کو پیش کرتے ہیں تو رومان کا رنگین پردہ از خود ان کے فن پر پڑ جاتا ہے۔ یہ شعوری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکھڑپن، الھڑپن سی نہیں معلوم ہوتی۔ اس رومانی فضا میں تو وہ پنجاب کی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی یہ رومانیت فن کو حقیقت سے قریب کرتی ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن خود ندیم صاحب کے بعض افسانے ایسے ہیں جن میں یہ پردہ نہیں ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانے بھی ایسے ہیں اور اس پردہ کے بغیر ہم چیزوں کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

عبادت۔ ابتدائی دور میں ان کے افسانوں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا نقطۂ نظر تمام تر رومانی ہے۔ شاید ان کی نوجوانی نے اس خصوصیت کو پیدا کیا ہے، بعد میں حقیقت نگاری کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ ابتدائی دور سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ان کے مجموعے "بگولے" کے افسانے "خربوزے" میں تو کوئی رومان نہیں۔

محمد طفیل۔ یہ افسانہ "بگولے" میں نہیں "آنچل" میں ہے۔

عبادت۔ ان کا پہلا مجموعہ "چوپال" ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں میں رومانی فضا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ دور ہی حقیقت نگاری اور رومانی اقدار کے بین بین ہے اس وقت یہ دونوں چیزیں ہماری روایت کا جزو بن چکی ہیں بعد میں ندیم صاحب کے افسانوں میں واقعیت رومان پر غالب آگئی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اس فضا کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد نہیں۔

عبادت۔ ان کے شعور میں ارتقائی کیفیت ہے۔ اب ان کے ہاں حقیقت نگاری REALISM کا بڑا رچا ہوا انداز ملتا ہے، جس کو ان کے بڑھتے ہوئے سماجی شعور نے پیدا کیا ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن اس سماجی ذہنیت کے باوجود وہ اس رومانی فضا کو نظر انداز نہیں کرتے۔

عبادت۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ یہ فضا قائم کرتے تو ان کے یہ افسانے اُجڑے اُجڑے سے نظر آتے۔ اس فضا نے ان کے فن میں بڑی جان پیدا کی ہے۔ اس فضا نے ان کے افسانوں کو واقعیت سے قریب کیا ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن احمد علی نے جس زمانے میں اور قسم کے رنگ میں افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل۔ کیا ہم اسے خرابی کے بجائے ایک اسلوب کا درجہ نہیں دے سکتے؟

ندیم۔ اس سلسلے میں میں انتظار صاحب اور وقار صاحب سے متفق ہوں۔ ابتدا میں رومانیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ واقعیت دب گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس میں لطف ضرور آتا ہے لیکن مجموعی تاثر دب گیا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں نے زندگی سے کم رابطہ ضرور رکھا ہے لیکن فن سے شاید نہیں۔ ندیم صاحب ہی دوسرے واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے فن اور زندگی کو ساتھ ساتھ چلایا ہے۔

عبادت۔ ان کے ہاں بڑا توازن اور مسلسل ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ کہیں بہکے نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی اور فن کے امتزاج کی ایک صحت مند روایت قائم کی ہے۔

ندیم۔ اردو افسانے کی ساری روایت مجھ پر بیت چکی ہے۔ میں نے ابتدا داستانوں سے کی ہے۔ فنی حیثیت متعین کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

انتظار حسین۔ قاسمی صاحب کے فسادات کے بارے میں افسانوں میں خامی یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی ہو گئے ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ بات تو فسادات کے بارے میں جتنے لوگوں نے لکھا ہے سب ہی میں موجود ہے۔ وقت گذرنے پر ہی اس میں اعتدال پیدا ہو سکا۔ یہ خرابی کرشن چندر، بیدی، عصمت اور حیات اللہ انصاری میں بھی ہے۔

عبادت۔ ندیم صاحب نے تفصیل اور جزئیات کو مختصر افسانے میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ اس سے ایک فضا بھی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ماحول بھی وجود میں آیا ہے۔ ندیم صاحب اسی فضا اور ماحول کے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار کو قدرت ہے کہ وہ دس جملوں کی بات کو ایک جملے میں ادا کر سکتا ہے۔

محمد طفیل۔ اور یہ بھی کہ ایک جملے کی بات کو دس جملوں میں بھی ادا کر سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں کے ابتدائی دور میں عصمت چغتائی کا اثر ضرور ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ یہ شاید احساسِ کمتری کا نتیجہ ہو لیکن عصمت کا ماحول ان سے مختلف ہے۔

عصمت کا ماحول علی گڑھ کے آس پاس ہے اور ان کے پاس لکھنؤ کا ماحول ہے عصمت میں تشدد کا جو جذبہ ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

عبادت ۔ ابتدائی دور کے افسانوں میں ان کے یہاں ایک طرح کا احساس شکست بھی ہے اور اس میں عصمت والی بلندی نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عصمت نے اپنے آپ کو گھریلو الجھنوں سے نکال لیا تھا۔ یہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ میرے خیال میں گو ہم دونوں بہنوں پر صرف اس لئے ایک ساتھ بات کی جاتی ہے کہ ہم بہنیں ہیں تو بڑی زیادتی ہے۔

ندیم ۔ ان دونوں کے فن میں بھی بڑا فرق ہے، خدیجہ کے افسانوں میں آہستہ روی اور سہج سہج قدم رکھنے کا انداز ہے، ہاجرہ کے افسانوں میں عصمت کی تیزی اور شوخی بھی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ تو مزاجوں کا فرق ہے۔

انتظار حسین ۔ خدیجہ کے یہاں مرثیہ کی فضا ہے لیکن ہاجرہ کے یہاں طنز ہے۔

عبادت ۔ ان دونوں کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ ان کے بیان کی روانی اور طرز ادا کی بے باکی نے ان کے افسانوں میں زندگی پیدا کی ہے۔

وقار عظیم ۔ قرۃ العین میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ اس نے مسوری میں زبان سیکھی ہے اور انہوں نے لکھنؤ میں۔

انتظار حسین ۔ قرۃ العین کے یہاں امام باڑے کی زبان نہیں بلکہ نئے لکھنؤ اور وہ بھی کافی ہاؤس کی زبان ہے۔

عبادت ۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاجرہ اور خدیجہ کے پاس موضوعات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بھی اب وہ شگفتگی نہیں رہی۔

ندیم ۔ میرے خیال میں موجودہ دور میں ان کا فن زیادہ وسیع اور بلند ہو گیا ہے۔

عبادت ۔ میں بالکل ابتدائی دور سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ کچھ عرصہ پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

وقار عظیم ۔ بیان وغیرہ کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن زندگی کی باشعور ترجمانی تو اب ہی ہے۔ ایک کمی ضرور ہے کہ پہلے بیان کا انداز بے ساختہ تھا۔ اب اسے بنانے سنوارنے کی کوشش میں روانی میں کمی آگئی ہے اور تھوڑا سا تصنع پیدا ہو گیا ہے۔

عبادت ۔ میرے خیال میں اب ان کے یہاں لکھنے کی URGE اس شدت کے ساتھ نہیں ہے۔ زندگی کا شعور ضرور ہے لیکن جب URGE ہی نہیں ہو گی تو شعور تخلیق میں کس طرح معاونت کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے موضوعات ختم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انتظار حسین ۔ ہر دور میں ایک مزاج ہوتا ہے، پہلے وہ INNER URGE کے تحت لکھتی تھیں اب ایک خاص تحریک کے ماتحت لکھتی ہیں تو وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

ندیم ۔ ہاجرہ مسرور کے دو افسانے "صدمہ" اور "بجالیہ" تازہ ترین اور بڑے کامیاب افسانے ہیں۔

عبادت ۔ انتظار صاحب نے یہ بات ایک تعصب کے تحت کہی ہے۔ کسی تحریک کے ماتحت ہو کر لکھنا تو بڑی اچھی بات ہے بشرطیکہ اس تحریک کا ذہن و شعور پر خاطر خواہ اثر ہو۔

ندیم ۔ خدیجہ مستور کا افسانہ "میلوں لے چلے بابلا" مختصر اور بڑے DISPASSIONATE انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی تخلیق کی رفتار میں کمی آگئی اور شاید اسی کے باعث خامیاں پیدا ہو گئیں۔

عبادت ۔ میرا خیال یہ ہے کہ زندگی میں اگر فنکار کو سکون مل جاتے تو تخلیقی صلاحیتیں سونے لگتی ہیں —— ہاجرہ اور خدیجہ آج اسی سکون سے دوچار ہیں۔ ان کے موضوعات ختم ہو گئے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں جان نظر نہیں آتی۔ اب ان کے فن کو زندہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ کچھوں کے بارے میں لکھیں۔ کیونکہ آج وہ زندگی کی انہی منزلوں سے دوچار ہیں۔

ہاجرہ مسرور ۔ صاحب بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری گھریلو زندگی دیکھ لیتے ہیں اور پھر نسخہ تجویز کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ اس سے پہلے جو نام ہم نے لئے ہیں ان میں دیویندر ستیارتھی اور خواجہ احمد عباس کے نام رہ گئے ہیں۔ ہمیں ایک نظر ان پر بھی ڈال لینی چاہئے۔ دیویندر ستیارتھی میں ایک بات ہے جو کسی افسانہ نگار میں نہیں۔ دوسرے افسانہ نگار فضا سے متاثر ہیں یا انہوں نے برمرچند کی پیروی کی ہے لیکن ستیارتھی نے لوک گیتوں کے

سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور ان گنتیوں کے تانے بانے سے کہانیاں تیار کی ہیں اس طرح ان کی کہانیوں میں بڑی رنگا رنگی ملتی ہے۔ انہوں نے اس رنگینی کو بڑے تنوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا موضوع افسانے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انہوں نے فنی لوازمات کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

عبادت ۔ "لال دھرتی" افسانہ انہوں نے کافی چابکدستی سے لکھا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ میرے خیال میں تو اس میں بڑا تصنع ہے، انہوں نے خواہ مخواہ لال رنگ سے لڑکی کی جوعشت کو تعبیر کیا ہے۔ یہ چیز غیر قدرتی سی لگتی ہے، فنی حیثیت سے یہ کامیاب افسانہ نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ جی ہاں فنی نقطۂ نظر سے ان کا انداز عموماً بڑا لاابالی ہوتا ہے۔

عبادت ۔ وہ جس پس منظر کے متعلق لکھ رہے ہیں شاید اسے ہم یہاں بیٹھ کر اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جس ماحول کے بارے میں لکھا ہے اس پس منظر میں وہ خاصا متوثر نظر آتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ لیکن وہ اسے کسی اور انداز سے بیان کر سکتے تھے انہوں نے ایک جگہ لڑکی کے کھڑاؤں پر گھوم جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بڑی مصنوعی ہے۔

عبادت ۔ یہ اصل میں اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ماحول سے یہ ماحول قدرے مختلف ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن ہم ایسے افسانے بھی تو پڑھتے ہیں جن کا ماحول ہم نے نہیں دیکھا لیکن افسانہ نگار ہمیں پوری طرح CONVINCE ضرور کرتا ہے مثلاً ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے میکسیکو کے بارے میں افسانے۔

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں لیکن یہاں بات فن کی نہیں رہ جاتی یہ تو ماحول کی عکاسی کی بات ہے۔ ستیارتھی اس عکاسی میں کامیاب ہیں۔

وقار عظیم ۔ لکھنے والے کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے کہ پڑھنے والا اجنبیت محسوس نہ کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی کمزوری ہے۔ ہاں یہ ستیارتھی کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے مختلف دیہات کی فضا کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے میں رنگوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے بسنت میں یو۔پی کے دیہات کا ذکر کیا ہے تو زردی کا ذکر بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور رنگ ہی سے پس منظر بنایا ہے۔

ان کے اندازِ بیان اور سوچنے پر ٹیگور کا گہرا اثر ہے اور وہ اپنے کرداروں سے جنسی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں ہر بات کو اپنانے کی خواہش بدرجۂ اتم ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مجھے بڑا تصنع محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں انداز بدلتا رہتا ہے مثلاً کرشن چندر، پہلے رومانی تھے پھر بدل گئے لیکن عباس کا زندگی کے متعلق ایک خاص قسم کا نقطۂ نظر ہے جو سیاسی ہے وہ ایک خاص قسم کی قومیت کے حامی ہیں اور اس طرح وہ جو فضا بناتے ہیں اس میں تصنع کا احساس ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ قومی احساس بری بات نہیں، ہاں اسے پیش کرنے میں خامی رہ سکتی ہے۔

وقار عظیم ۔ فن کا اصل مقصد یہ نہیں کہ آپ اس کے محاسن سے لطف اندوز ہوں۔ فن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارا احساس دوسرے کا احساس بن جائے۔ اگر یہ تصنع معلوم ہونے لگے تو مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

عبادت ۔ خواجہ احمد عباس اپنے افسانوں میں زیادہ حقیقت نگار ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم شاید اسے محسوس کرتے ہیں کہ وہ کافی بیباک ہیں انہوں نے افسانے کے بنیادی اصولوں کا کم خیال رکھا ہے ——— شاید اس لئے بھی کہ وہ صحافی ہیں اور ان کی تحریروں پر صحافت کا خاصا اثر ہے۔ اسے ہم تصنع نہیں کہہ سکتے صاف گوئی کہہ سکتے ہیں، بیباکی کہہ سکتے ہیں، سیدھا سادا انداز کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ ہم کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ایک منطق قائم کرتے ہیں جب تک یہ بات نہ ہو ہماری بات سے کوئی متاثر نہ ہو گا۔ افسانہ کی منطق اس سے کچھ مختلف ہے جو چیز زندگی میں حقیقت ہے وہ افسانے میں تصنع بن جاتی ہے۔ افسانوی حقیقت کے لئے بہت بڑے جوڑ توڑ کرنے پڑتے ہیں۔ احمد عباس اس میں پورے نہیں اترتے شاید اس لئے کہ صحافی ہیں۔

محمد طفیل ۔ ان کا صحافی ہونا کوئی عیب نہیں ہونا چاہئے بعض افسانہ نگار صحافی نہیں ہیں لیکن ان کی تحریروں میں صحافتی رنگ جھلکتا ہے ——— اس سلسلے میں کسی حد تک کرشن چندر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ مجھے ان کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ ایک آدمی یادداشت کھو چکا ہے اور ریل میں سفر کر رہا ہے ہندو اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے مسلمان بھی یہی پوچھتے ہیں ——— یہ بڑا مصنوعی لگتا ہے

کیونکہ اس زمانے میں لوگوں نے قومیت اور مذہب معلوم کرنے کے بہت سے ڈھنگ ایجاد کر رکھے تھے۔

وقار عظیم۔ اصل میں اس وقت یہ رجحان تھا کہ فسادات کے بارے میں جو کہا جائے اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے۔ کرشن چندر نے بھی ایسا کیا ہے لیکن ان کے بیان کا لوچ اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

محمد طفیل۔ میرے خیال میں اس موقع پر اختر اورینوی کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔

عبادت۔ ان کے ساتھ اختر انصاری کا بھی۔

وقار عظیم۔ ان کا ذکر شروع میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ دونوں افسانہ نگار مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اختر اورینوی کے ہاں کسانوں اور شہروں کے متعلق افسانے ہیں۔ یہ افسانے انہوں نے ایسے دور میں لکھے ہیں جب لوگ فیشن کے طور پر ان کا ذکر کرتے تھے۔ ان کے پاس صحیح ہمدردی اور محبت ہے۔

عبادت۔ اختر انصاری کے افسانوں کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے افسانے اردو میں نفسیاتی تجزیے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک فضا کا قیام اور ایک سماں بندی ملتی ہے ان کے پاس عوام سے ہمدردی کا عنصر تو نہیں ہے البتہ متوسط طبقہ کی ذہنی الجھنوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس سے جو نتائج نکل سکتے ہیں ان کو انہوں نے بڑی مہارت سے لکھا ہے۔

وقار عظیم۔ اختر انصاری نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں فرد کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی ہے (مثلاً ان کے مجموعہ نازو میں)، انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حادثے سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ یہ بات اس دور کے لکھنے والوں میں نہیں تھی۔

عبادت۔ ان کے کردار پریشان، سراسیمہ اور کٹھ پتلیوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کے ہاتھوں وہ ایک فضا تیار کرتے ہیں لیکن یہ فضا پڑھنے والے پر کس انداز میں اثر انداز ہوتی ہے اس کا تو نہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا۔ ان کی تاثر کی ہم آہنگی فضا تیار اور ہلکی ہلکی بہتر ہوتی ہے اور اس بات کا احساس وہ تیز شدت سے دلاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں پھنس جاتا ہے۔

وقار عظیم۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے انہوں نے زندگی کی ہما ہمی میں قدم رکھا ہے FRUSTRATED رہے ہیں۔ چونکہ ان کی اپنی زندگی میں مایوسی ہے اس لئے وہی مایوسی ان کے کرداروں پر حاوی ہے۔ وہ کسی مصیبت سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے ہاں اس طرح کی زندگی میں انسان کو جن کیفیتوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کی عکاسی بڑی صداقت سے کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانے کی تکنیک میں اختر انصاری کی CONTRIBUTION اتنی ہے کہ ان کا نثر لکھنے کا انداز بڑا خوبصورت، حسین اور سادہ ہے نثر کے مقابلے میں ان کا انداز بیان بڑا دلکش ہے۔ ان کے چند افسانے (مجموعہ نازو) خاصے مشہور اور کامیاب ہیں لیکن ان کا کوئی اسلوب DEVELOP نہیں ہو سکا اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف متوسط طبقے کے ترجمان کی زندگی ہی پیش نہیں کرتے بلکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن کے بارے میں انہیں علم نہیں ہوتا۔ ایسا کرشن چندر نے بھی کیا ہے۔

عبادت۔ جس ترقی پسندی کی طرف انہوں نے پلٹا کھایا ہے وہ اصل میں ان کا مزاج نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ یہ بعد کا دور ہے ترقی پسندی کا CRAZE اس کی وجہ ہے۔

عبادت۔ ان کے افسانہ "دریا کی سیر" میں کئی کردار ہیں۔ اس میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔

وقار عظیم۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پریم چند کا اثر بہت گہرا ہے حتیٰ کہ حسینی بھی اس سے متاثر ہیں۔ اس زمانے میں اختر انصاری نے انفرادیت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنا رنگ الگ رکھا۔

عبادت۔ ہر چند کہ ان کا نقطۂ نظر صحت مندانہ نہیں ہے لیکن انہوں نے ایک نئے انداز کی بنیاد ضرور رکھی ہے۔ اختر اورینوی نے زندگی اور معاشی کشمکش پر بڑے عمدہ افسانے لکھے ہیں مثلاً "کلیاں اور کانٹے"۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ نتیجہ تک نہیں نکال پاتے۔ اس معاملے میں اگر اسی دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں لیکن اختر اورینوی جس فلسفۂ حیات کے قائل ہیں وہ انہیں آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ ان پر بلا مقصد مذہب کا اثر ہے۔

ندیم۔ اختر اورینوی کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور تصنع کا بڑا عجیب امتزاج ہے۔

عبادت۔ جب تک انسان کے پاس زندگی کی کشمکش کا صحیح شعور نہ ہو وہ اسی طرح بھٹکتا ہے۔ اختر اورینوی اس سے محروم نہیں۔

اگر طبقاتی آویزش کا شعور ان کے پاس ہوتا تو ان کے فن میں یہ خامی نہ باقی رہتی۔

وقار عظیم۔ لیکن اس کے باوجود طویل مختصر افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اختر اورینوی کا بڑا حصہ ہے۔

عبادت۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے کون کون سے نئے تجربے کئے اور کون کون سی نئی روایات قائم کیں۔

نئے افسانہ نگار پریم چند سے کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری انقلابی رجحان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا شعور بھی بڑھتا ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی شامل ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حقیقت نگاری اور واقعیت کے اس رجحان کے ساتھ ساتھ اپنے افسانوں میں حقیقت و رومان کا ایک سنگم بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کی بہترین مثال کرشن چندر کا فن ہے۔ کرشن چندر نے اپنے تقریباً تمام افسانوں میں حقیقت و رومان کا یہ سنگم بنایا ہے اور اس طرح اس نے جنت اور جہنم کو یکجا کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ منفرد ہے۔

ندیم۔ پریم چند کے زمانے میں افسانہ زیادہ تر عکسِ حیات تک محدود رہا ہے لیکن اب عکاسی میں تنقیدِ حیات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ محبت کے بارے میں بھی جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی سماجی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

عبادت۔ پریم چند کے ہاں محبت کا جو تصور ہے وہ خدمت کا تصور ہے۔ بلدرم اور نیاز اس محبت کو حسن و ناز کا مجسمہ بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں محبت کی نفسیاتی توجیہہ کو پیش کرنے کا رجحان عام ہے۔ سماجی کشمکش میں محبت کا کیا درجہ ہو سکتا ہے ان چیزوں کے متعلق بھی افسانے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح گویا محبت کو وسیع تناظر میں پیش کیا گیا ہے جو پہلے جنسی جذباتی یا اصلاحی تھی اب اس کا ایک پس منظر ہے جو اس کا محرک بنتا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ بات صرف محبت کے لئے مخصوص نہیں ہے حقیقت میں اب شاعر اور حیات جدا جدا نہیں رہا اور افسانہ نگار کسی مسئلے کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔

ندیم۔ محبت ہمارے شعری اور افسانوی ادب کا بہت بڑا موضوع رہا ہے اس لئے اس میں تبدیلی بھی واضح ہے۔ تیسری چیز جو اردو افسانوں میں موجود ہے بین الاقوامیت ہے۔

وقار عظیم۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے افسانہ نگاروں کی نظر ساری دنیا کے ادب پر ہے۔

عبادت۔ بین الاقوامیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر ہے جس کو ایک سائنٹیفک تجزیے کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجزیہ تہذیب بین الاقوامیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے قیام سے ایک خاص بات یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب ہم چیزوں کو تاریخی شعور کے تحت دیکھتے ہیں۔ یہ شعور جذباتی نہیں ہے۔ اس میں زندگی سے دلچسپی اور اس کا گہرا احساس ہے۔ اس سے پہلے انسانیت پرستی یا انسان دوستی (HUMANISM) کے جو تصورات تھے اس میں چیزوں کو ایک محدود دائرے میں رہ کر دیکھا اور سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب ایک عالمگیر انسانی برادری کا خیال پیدا ہوا ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے افسانے میں یہ کرشن چندر کا پیدا کردہ ہے۔ اس معاملہ میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ندیم۔ بین الاقوامیت اور آفاقیت دو الگ الگ چیزیں ہیں انہیں ملانا نہیں چاہئے۔

عبادت۔ بین الاقوامیت کی بنیاد آفاقیت پر ہے۔

وقار عظیم۔ سوچنے کا یہ انداز اس وجہ سے ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کر کے ان کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور جب ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سب بین الاقوامی مسائل ہیں۔

عبادت۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں ترقی کے افسانہ نگاروں کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ پریم چند کے ہاں یہ مسئلہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس دلچسپی کا احساس [illegible] حالی تھی۔ اب ان میں زندگی کی بخشش کا تجزیہ شامل ہو گیا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ چیز ایک حد تک پریم چند کے ہاں بھی موجود تھی۔

ندیم۔ اس زمانے میں رومانیت اب REALISTIC ہے۔

عبادت۔ زندگی کے تجزیے کے علاوہ ان کی جو ترقی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے تکنیک کے اعتبار سے بھی اضافے کئے ہیں

دو افسانے کی روایت کو بعض نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے تہہ دار بیان، کمان بندی، کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے نئے میدان تلاش کئے ہیں۔ اس لحاظ سے میں کرشن چندر کو بہت بڑا صناع سمجھتا ہوں۔ انہوں نے شعوری طور پر اُردو مختصر افسانے کی تکنیک کو فن کی نئی راہوں سے آشنا کیا ہے، مثلاً "اَن داتا" کو لے لیجئے۔ اس میں فن کا انداز ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اس سے پہلے ہم افسانے میں اس طرح کی ہیئت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وقار عظیم ۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں ایسے نمونے بھی ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ افسانے کو پیچھے لے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی ناکامیاں کم ہیں اور نیا لکھنے والا ان سے بچ سکتا ہے۔

عبادت ۔ ہر تجربہ اپنے اندر شدت اور کسی حد تک انتہا پسندی وغیرہ رکھتا ہے، یہ چیزیں فن کے لئے بڑی کھٹن ہوتی ہیں۔ اس لئے خامیاں اور فروگزاشتیں اس دور کے فن کاروں میں بھی موجود ہیں — کرشن چندر اور بیدی تک ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔

ایک اور بات۔ اس زمانے میں طویل مختصر افسانے کی تکنیک کا تجربہ بھی کیا جاتا ہے۔ ندیم، کرشن اور اختر انصاری نے اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ پھر دوسرے لوگ بھی میدان میں آ گئے جنہوں نے اسے آگے بڑھایا۔

ندیم ۔ اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔

وقار عظیم ۔ ناول کی طرح کینوس کی وسعت اور وہ بھی اس طرح کہ بوجھ نہ بن جائے اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ تفصیلات کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرتے ہیں کردار کا تصور گہرا کرتے ہیں۔ ان کے افسانہ میں کینوس کے پھیلاؤ کے باوجود وحدت تاثر قائم رہتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس دور میں اس کی نمایاں مثال ہے۔ اس کے پیچھے ایک وسیع دنیا ہے۔ اس کی ساری ہنگامہ آرائیاں ہیں جو پڑھنے والے پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

ندیم ۔ ان لکھنے والوں کا ایک CONTRIBUTION یہ بھی ہے کہ انہوں نے FANTASY کے انداز کو نکھارا ہے مثلاً غلام عباس کا افسانہ "آنندی"۔

انتظار حسین ۔ یہ بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔

عبادت ۔ میں سمجھتا ہوں کہ داستانوں کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔

وقار عظیم ۔ حقیقت نگاری کے رجحان کے پھیلنے کے بعد کبھی لازمی تھی ایک شاعرانہ ماحول، و رفضا سے مدد ضرور لی جاتی ہے۔ لیکن محض تخیل اور تصور ہی پر افسانہ کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

انتظار حسین ۔ عبادت صاحب نے داستانوں کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ داستانوں میں صرف FANTASY ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں ان میں حقیقت پسندی کا اظہار ہوا ہے وہ آج کل کے افسانوں سے بہت قریب ہے "قصہ چہار درویش" میں جہاں کھانے، لباس اور دوسری چیزوں کی تفصیل ہے وہ بالکل آج کے سے افسانوں کی ہے۔

عبادت ۔ اس سے مجھے اتفاق ہے، لیکن رومانی فضا جو داستانوں نے دی ہے اس کو ان لوگوں نے اس انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کا انداز اس کی نفی کرتا ہے —— پریم چند کے ہاں جو بات ہے وہ آج کے افسانوں میں نہیں ملتی۔ اب افسانہ نگار رومانی فضا بھی قائم کرتے ہیں تو اس میں نری جذباتیت نہیں ہوتی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ رنگ تو خود پریم چند کے آخری افسانوں میں بھی نہیں ملتا، لیکن داستانوں کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ یہ اصل میں مشرقی مزاج کی ایک کیفیت ہے۔

عبادت ۔ غالباً کرشن چندر پر مغربی رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔

وقار عظیم ۔ اگر غور کیجئے تو یہ انداز داستانوں میں مغرب کے رنگ سے بھی زیادہ ہے۔

عبادت ۔ لیکن داستانوں میں جو رومانیت ہے اس میں تصنع کی فضا قائم رہتی ہے لیکن نئے افسانہ نگاروں کے رومانی انداز میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے اسی لئے اس میں زیادہ جان ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب تک جو روایات قائم ہوئی ہیں ان کی روشنی میں نئے لکھنے والوں نے کیا کیا تجربے کئے۔ حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں وغیرہ اس دور میں آتے ہیں۔

حسن عسکری نے اردو افسانے کو بعض نئی چیزیں اس اعتبار سے دی ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی تجزیے کے رجحان پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی تکنیک میں ہیئت کا تجربہ بھی کیا ہے مثلاً "کالج سے گھر تک" وغیرہ وغیرہ۔

نفسیاتی تجزیے کے رجحان کو ان کا افسانہ "چائے کی پیالی" بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔

وقار عظیم۔ اس طرز کا سب سے پہلا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" کرشن چندر نے لکھا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ماخوذ ہے جس کا حوالہ نہیں دیا گیا اور اس طرح انہوں نے ادبی دیانت داری کا خیال پوری طرح نہیں رکھا۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اعتراف نہ کر کے ایک اخلاقی غلطی کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ اس نے اردو میں لکھا ہے اس سے افسانہ کی روایت میں ایک اضافہ ضرور ہوا۔

انتظار حسین۔ اس نقطہ نظر سے یہ اعتراض تو بیدی پر بھی کیا جا سکتا ہے ان کا افسانہ "گرم کوٹ" غیر زبان سے لیا گیا ہے۔

عبادت۔ حوالہ دیئے بغیر ایسا کرنا ایک معیوب بات ہے۔

وقار عظیم۔ میں اخلاقی پہلو سے آپ سے بھی زیادہ اس کی مذمت کرتا ہوں لیکن اس سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس ترجمہ سے ہماری افسانوی روایت میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔

عبادت۔ عسکری کے افسانے "کالج سے گھر تک" میں ایک اپج ہے۔ اس میں سماجی شعور بھی ملتا ہے۔ یہاں وہ اپنی یا فرد کی ذات میں گم ہونے کی کوشش نہیں کرتے دوسری چیز ان کے افسانوں میں یہ ہے کہ وہ سماں یا فضا پیدا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ "چائے کی پیالی" خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ رجحان ان کے یہاں دو راستوں سے آیا ہے، جوائس اور پروست کا ان پر اثر ہے۔ انہوں نے ان دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے انداز کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

تیسری چیز عسکری کے ہاں وہ ہے جو "پھسلن" میں ہے۔ یہ عصمت کے "لحاف" کی ایک دوسری شکل ہے۔ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ خواہ مخواہ لکھا گیا ہے۔

وقار عظیم۔ تجزیے کے سلسلے میں جو چیز عسکری کی خصوصیت ہے اس کا اندازہ ان کے مجموعے "جزیرے" کے عنوان سے ہوتا ہے اس میں ایک الگ دنیا آباد کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کو فکر کا محور و مرکز سمجھتا ہے۔ یہ رجحان اس روش کا ترجمان ہے کہ جب افسانہ نگار کو اجتماعی زندگی میں موضوع نہیں ملتے تو وہ فرد کو افسانہ کا موضوع بناتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیت کی مصوری کرتا ہے۔ اس رجحان کی بدولت شعور کی رو کی تکنیک افسانہ میں داخل ہوئی۔

ندیم۔ جب "چائے کی پیالی" اور "حرام جادی" چھپے تو بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

انتظار حسین۔ یہ بات تو عسکری صاحب نے "جزیرے" کے دیباچہ میں لکھی ہے کہ انہوں نے کون کون سا افسانہ کس کس افسانہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

عبادت۔ اس کے باوجود عسکری کے فن میں بڑی انفرادیت ہے انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس بارہ افسانے لکھے ہیں لیکن ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے مغربی اثرات کے باوجود اپنے فن میں ایک اپج پیدا کی ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے۔

وقار عظیم۔ حسن عسکری نے جس خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے وہ بھی ان کے لئے مخصوص ہے۔

عبادت۔ اور وہ اس تمام زندگی میں گھلے ملے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زندگی کا کتنا گہرا احساس ان کے فن میں نظر آتا ہے۔

انتظار حسین۔ وہ بلند شہر کے علاقے کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

وقار عظیم۔ فن کے نقطہ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول سے پوری طرح واقف ہو اسی کی عکاسی کرے۔

انتظار حسین۔ حقیقت میں حسن عسکری اور اس طرح کے دوسرے لوگ افسانہ نگار نہیں تھے، مختصر افسانے کی مجمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا تاثر لیا جائے جو فرد کی زندگی پر پوری طرح سے اثر انداز نہ ہو لیکن حسن عسکری کے افسانوں میں مسلسل واقعات ملتے ہیں وہ DETERMING FACTOR ہوتے ہیں۔ ان کا انداز طویل مختصر افسانوں کا سا ہے۔

عبادت۔ عسکری صاحب نے طویل مختصر افسانے لکھنے کا بہت تجربہ کیا ہے لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے مختصر افسانے نہیں لکھے ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے بعض بڑے اچھے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے جو طویل مختصر افسانے ہیں کھلتے ہیں۔ شاید یہ ارادہ ہیئت کی ہم آہنگی کے شعور کا نتیجہ ہے

انتظار حسین۔ میرا کہنا یہ ہے کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ آپ تفصیل میں جائیں

عبادت - آپ "چائے کی پیالی" کو لے لیجیے۔ اس میں وہ تمام واقعات کو بڑی خوبی سے یکجا کرتے ہیں۔ اس میں ایک شخص کی ذہنی کیفیت کی ساری تفصیل موجود ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس افسانے میں ایک مکمل وحدت نظر آتی ہے اور یہ مختصر افسانے کی تکنیک ہے۔

انتظار حسین - مختصر افسانے کے تصور میں صرف وحدت شامل نہیں۔ ان کے افسانوں میں بہت سے واقعات کو ملا کر ایک شکل مرتب ہوتی ہے جو فرد کی شکل کو بدل دیتی ہے۔

وقار عظیم - مختصر افسانہ کی جو تعریف آپ نے کی وہ بہت محدود ہے۔ افسانہ کے فن میں جب سامنے نئے تجربے ہوتے ہیں انہوں نے افسانہ کی حیثیت ہی بدل دی ہے اور اب جس چیز میں آپ کو جذبیت محسوس ہوتی ہے وہ حقیقت میں فن کی روایت بن چکی ہے افسانہ کے نئے فن میں بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ہمارا مرکزی تصور اب واقعات کے بجائے کرداروں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عبادت - ساری دنیا میں مختصر افسانہ میں تجربے کا تسلسل نظر آتا ہے تکنیک کا جو تنوع اس صنف ادب میں ملتا ہے شاید ہی کسی اور صنف میں ملے۔ اردو میں عسکری نے اس تسلسل کو باقی رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہمارے مختصر افسانے کی تکنیک میں بڑی تبدیلی پیدا کی ہے۔ البتہ ایک بات ہے وہ یہ کہ عسکری صاحب نفسیاتی تجزیوں کے ساتھ سماجی شعور کو بھی ہم آہنگ کرتے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا اس کمی نے ان کے یہاں ایک الجھن سی پیدا کر دی ہے۔

وقار عظیم - لیکن جس چیز کو ہم آج جانتے ہیں اس کا عمل مہر نیم تیار سے رکا نہیں ہوتی ہے۔

عبادت - لیکن ہماری زندگی کا حقائق یہ ہیں کہ عظمت نہیں ہے عظمت زندگی کے مسائل کی گہرائی تک پہنچنے میں ہے۔ یہ ذاتی یا انفرادی طور پر اس کا تقاضا نہیں ہے خود زندگی اس کی متقاضی ہے۔

وقار عظیم - مگر سب کوئی فن کار صرف عکاسی کو ہی پانا صحیح نظر بنا بات نہیں۔ ہم تو مسلک نہیں بدل سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عسکری نے فن کی حیثیت سے افسانہ کو آگے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

ندیم - عسکری صاحب کے افسانے ایک فرد کے تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایک فرد کے اتنے بہت سے تاثرات کو یکجا کر دیے ہیں کہ مختصر افسانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

عبادت - مجھے اس سے اختلاف ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر زاویے سے اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے اور بات زیادہ دلکشی سے ذہن نشین ہوتی ہے عسکری صاحب نے یہی تکنیک استعمال کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

وقار عظیم - ایک بات البتہ ہے کہ اس طرح کہانی پن باقی نہیں رہتا۔

عبادت - ان کا نقطۂ نظر صرف فضا کو پیش کرنا ہے مختصر افسانے کی تکنیک میں جو لچک ہے وہ اس کی اجازت دیتی ہے۔

وقار عظیم - یہ صحیح ہے لیکن اس کے باوجود فن کے ارتقا کا جب ذکر آئے گا تو عسکری کا نام نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

عبادت - عسکری صاحب کا نقطۂ نظر انفرادی ہے۔ ممتاز مفتی کا نقطۂ نظر بھی انفرادی ہے لیکن وہ لاشعور اور تحلیل نفسی کی گہرائیوں میں چلے جاتے ہیں۔ "آپا" اور "بڑھیا" ان کے بڑے اچھے افسانے ہیں جو مختصر افسانے کی تکنیک کو بڑی اچھی طرح سے پیش کرتے ہیں لیکن عسکری صاحب کی طرح وہ بھی ایک بیمار سی فضا پیدا کرتے ہیں۔

وقار عظیم - انہوں نے جنس کو محض لذت کی خاطر نہیں بلکہ علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔

عبادت - مجھے اس میں شبہ ہے۔ ان کے سارے کردار بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوتے ہیں اور خارجی اثرات کا احساس نہیں رکھتے۔ سماجی محرکات کا ان کے یہاں کوئی شعور نہیں اس لئے جو شخص ان کے قریب جاتا ہے وہ بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ لاشعوری دنیا میں رہنے والا انسان ہر کیفیت میں ذہنی و جذباتی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔

ندیم - لیکن یہ ان کا اپنا زاویۂ نظر ہو سکتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کے قائل ہی نہیں۔

عبادت - لیکن افسانے سے جاننے میں یہ اس کے اثرات کو ختم نہیں کر سکتے۔ مفتی نے اپنے آپ کو بہت محدود کر رکھا ہے ان کے افسانوں میں تنگی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ قاری کو ایک ایسی جگہ لے جاتے ہیں جہاں زندگی کی گہری دنیا کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور اعصاب مفلوج معلوم ہوتے ہیں۔

ندیم ۔ اس نقطۂ نظر میں بے لبی تو قدرتی ہے۔ وہ خارجی حسن کا احساس نہیں رکھتے اور میرے خیال میں وہ محض اس لئے اپنے لاشعور کی عکاسی کرتے ہیں کہ خود خارجی دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اب تو ان کے افسانوں میں تکرار یا تھکن کا احساس بھی ہونے لگا ہے۔

عبادت ۔ وہ فرائڈ کو اپنا امام مانتے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں یکسانیت اور تھکن پیدا ہو گئی ہے ـــــ فرائڈ کے سہارے انسان آخر کب تک چل سکتا ہے؟

ندیم ۔ لاشعور کی تمام گہرائیوں اور بھول بھلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے فن کار کو زبان پر پورا عبور ہونا چاہئے۔ یہ قدرت مفتی میں نہیں ہے۔

عبادت ۔ فرائڈ کے لکچر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ذہنی مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن ممتاز مفتی کے ہاں یہ بات بھی نہیں۔ انہوں نے فرائڈ کو ضرور پڑھا ہے لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے اسے نہیں دیکھا ـــــ شاید اسی وجہ سے وہ ان موضوعات پر بھی مفصل نہیں لکھ سکتے۔

ندیم ۔ اب تو وہ خارجی حقیقتوں کے بھی سرے سے قائل نہیں۔

عبادت ۔ ان کے علاوہ اس دور کے دو اور افسانہ نگار اہم ہیں۔ بلونت سنگھ اور غلام عباس۔

بلونت سنگھ نے ہمیں بہت سی نئی چیزیں دی ہیں۔ بظاہر وہ دیہات کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس ترجمانی سے آگے بڑھ کر دیہاتی زندگی میں جو حسن اور توانائی ہے اس کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین نے انہیں "پنجاب نگار" کہا ہے میں انہیں "حیات نگار" کہتا ہوں۔ وہ پنجاب پر اس لئے نہیں لکھتے کہ پنجابی ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں پنجاب میں زندگی نظر آتی ہے۔ اس زندگی میں جو حسن اور توانائی ہے اس نے بلونت سنگھ کو متاثر کیا ہے وہ اس زندگی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں اس زندگی سے ایک والہانہ دلچسپی ہے ـــــ جو افسانے انہوں نے فسادات پر لکھے ہیں ان میں بھی اسی زندگی کا احساس ہے۔ مثلاً "کالے کوس" میں یہ بات نظر آتی ہے۔ یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا کہانی ہے۔ تقسیم پر بڑی ہیجان انگیز چیزیں لکھی گئیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ ہیجان انگیز چیزیں ہی لکھی گئی ہیں۔ بلونت سنگھ نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کے وقت لوگ کس طرح محسوس کر رہے تھے، کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہجرت کے بارے میں ان کا کیا خیال تھا۔

کالے کوس میں ایک [illegible] اس کا بیٹا [illegible]

ہجرت کی غرض سے پاکستان کی طرف چل دیتے ہیں اور چلتے چلتے جب منزل پر پہنچتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہم پہنچ گئے۔ یہاں بھی زندگی ویسی ہے جیسی کہ وہاں تھی۔ وہی سبزہ ہے وہی کھیت ہیں، ہر چیز ویسی ہی ہے ـــــ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلونت سنگھ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے انسانی زندگی کی دلکشی اور دلآویزی کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اسی کے افسانہ نگار ہیں۔

انتظار حسین ۔ ان کے وہ افسانے جو پنجاب کے فسادات کے بارے میں لکھے گئے ہیں مختصر افسانے کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک ایسا ربط ہے جو یکسانی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، یہ تکنیک ناول کی ہے۔

عبادت ۔ جس چیز کی طرف انتظار صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ بلونت سنگھ کی خامی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ان کی خوبی ہے۔ ان کے ایسے افسانے فنی اعتبار سے مربوط ہیں ـــــ ان میں وحدت ہے، تسلسل ہے ـــــ اور یہ وحدت اور تسلسل درحقیقت زندگی کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ ناول کی تکنیک اس میں نہیں ہے ـــــ ان افسانوں میں تفصیل ضرور ہے لیکن اس کے باوجود وہ COMPACT ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ بات ہر اس افسانہ نگار میں ہوتی ہے جو زندگی کو جامد نہیں سمجھتا اور اس کے تسلسل کا قائل ہوتا ہے۔

انتظار حسین ۔ ایسے لوگوں کے افسانے ناول اور طویل مختصر افسانے کے تحت آتے ہیں۔ یہ ان کی کاہلی ہے کہ مختصر افسانے لکھتے ہیں۔

ندیم ۔ میرے خیال میں یہ بحث تکنیک کی ہے۔

عبادت ۔ مختصر افسانے کی تکنیک کو اتنا محدود نہیں کیا جا سکتا کہ جس افسانے میں تفصیل ہو اس کو افسانہ ہی نہ کہا جائے۔ یہ تفصیل اور پھیلاؤ اگر وحدت کے روپ میں سامنے آئے تو اس کو مختصر افسانہ کیوں نہ کہا جائے ـــــ پھر افسانے کی تکنیک اس وقت تجربے کے دور سے گزر رہی ہے۔ طویل مختصر افسانہ، مختصر افسانے کی تکنیک میں ایک اہم تجربہ ہے۔ بلونت سنگھ نے بھی ایسا ہی ایک تجربہ کیا ہے۔

وقار عظیم ۔ اس دور میں سوائے منٹو کے تمام اچھے لکھنے والوں کے یہاں افسانے کا آخری حصہ فکر کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس سے قبل یہ عیب ہو سکتا تھا۔ لیکن اب یہ عیب نہیں رہا۔

انتظار حسین ۔ بلونت سنگھ اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ [illegible]

زندگی میں سکھوں کے طبقے کی ترجمانی کی۔ ندیم صاحب نے پنجاب کے دیہات کی ترجمانی کی تھی لیکن سکھوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا۔

عبادت ۔ بلونت سنگھ ہی کی طرح اس دور میں ایک اور چابکدست فنکار غلام عباس نظر آتے ہیں۔ غلام عباس بڑے ہوشیار افسانہ نگار ہیں وہ افسانہ نگاری کے فن اور اس کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں ——— فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کا احساس ایک لمحے کو بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں لیکن ان موضوعات میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ موضوع کی تہ تک پہنچتے ہیں، اس کی باریکیاں تلاش کرتے ہیں اور ان تمام پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے ——— انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی جس لطیف انداز میں انہوں نے کی ہے، اردو افسانے میں اس کی صرف چند مثالیں مل سکتی ہیں ——— البتہ وہ ان تمام باتوں کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کرتے۔ ان کے انداز میں رمزیت ہے ——— اور یہ رمزیت ان کے افسانوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتی ہے ——— مختصر افسانے کی یہی خصوصیت ہے۔ غلام عباس نے اپنے فن میں اس کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔

وقار عظیم ۔ غلام عباس نے فن سے بڑی وفاداری برتی ہے۔ ان کے فن میں شائستگی نظر آتی ہے۔ اکثر افسانہ نگار سہل انگاری رکھتے ہیں اور یہ بات افسانہ نگاری کے فن کو بڑا نقصان پہنچاتی ہے غلام عباس سہل انگار نہیں ہیں۔ وہ دس سطروں کے افسانوں میں تین دن کی سی جگر کاوی کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ پر غور کرنا، جملے پر جملہ جمانا اور سوچنا فن کے لوازم ہیں اور یہ لوازم غلام عباس کے پاس موجود ہیں۔

انتظار حسین ۔ راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کو جہاں چھوڑا تھا غلام عباس افسانے کو اس سے آگے لے گئے ہیں۔ ان کا سٹائل بڑا منجھا ہوا ہے۔ لفظوں کی دروبست اور طرزِ بیان کی چستی جو مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے وہ غلام عباس کے یہاں موجود ہے۔ وہ افسانے کا TEMPO متوازن رکھتے ہیں۔ نقارہ نہیں بجاتے۔

عبادت ۔ ان کے فن کی یہ آہستہ روی اور متوازن کیفیت درحقیقت ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ وہ دھیمے دھیمے آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑا توازن ہے وہی چیز ان کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ندیم ۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خاصے معمر ہیں اور انہوں نے بہت بعد میں افسانے لکھنے شروع کیے ہیں۔

وقار عظیم ۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھی ہیں جن کے لئے بڑی احتیاط اور سنبھلی ہوئی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے اس چیز نے بھی ان کے فن کو متاثر کیا ہے۔

محمد طفیل ۔ یہاں قرۃ العین اور شفیق الرحمٰن کا ذکر ہونا چاہیئے۔

عبادت ۔ شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے یہاں کوئی سنجیدہ فضا نہیں ہے۔ وہ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا فن ایک خوش وقتی کے احساس کی پیداوار ہے۔ زندگی ان کے نزدیک ایک سنہرا خواب ہے۔ جس میں قہقہے ہیں، شوخیاں ہیں، اٹکھیلیاں ہیں، چہلیں ہیں ——— ظاہر ہے زندگی کے ان پہلوؤں میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے لیکن یہ زندگی کے کچھ پہلو ہیں ضرور۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمٰن کو لوگ دل خوش کرنے کے لئے پڑھتے ہیں ——— ان کا تاثر گہرا نہیں ہوتا ——— لیکن قرۃ العین اس زندگی کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھتی ہیں ——— ان کے یہاں زندگی صرف ایک سنہرا خواب ہی نہیں ہے ——— وہ مسرتوں کے ساتھ اونچے طبقے کی تلخیوں کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قہقہوں کے ساتھ آنسو بھی ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسرتوں کے ساتھ غموں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مسوری اور نینی تال کی فضاؤں میں زندگی کی تنہائیاں محسوس ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی بڑی فنکارانہ تصویر کشی کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں ایک بڑی فن کار ہیں۔

انتظار حسین ۔ شفیق الرحمٰن گدگدا دیتے ہیں، چٹکی سی بات کر دیتے ہیں ——— قرۃ العین تھوڑا سا گداز بھی دے دیتی ہیں۔

وقار عظیم ۔ دونوں نے زندگی کے ایک ہی طبقے کی عکاسی کی ہے لیکن شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں قرۃ العین کے یہاں اس طبقے کی زندگی کا شعور زیادہ ہے۔

عبادت ۔ قرۃ العین کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اونچے طبقے کی ساری تفصیل پیش کرتی ہیں اور اگرچہ ان کی تحریر کی ہوئی فضا تمام تر رومانی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ افسانے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ رومانی فضا میں اس زندگی کا کھوکھلا پن کچھ زیادہ ہی واضح

ہوتا ہے ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ایک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

وقار عظیم - اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی کے گھناؤنے پن پر پردہ نہیں ڈالتیں، بلکہ اس کو اجاگر کرتی ہیں۔

ندیم - انہوں نے زندگی کی خوبیاں اور خامیاں بغیر کسی تعصب کے پیش کر دی ہیں۔ البتہ ان کے پاس سماجی رشتوں کا شعور نہیں ہے لیکن جہاں ان کے افسانوں میں دوسرے طبقوں کا ذکر آیا ہے ہاں ان کے ساتھ ایک ہمدردی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

عبادت - قرۃ العین کے فن میں سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کی تخیل ہے ——— وہ اس تخیل کے سہارے بہت اونچا اڑتی ہیں ——— یہ پرواز تمام رومانی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ اڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن اس اڑان میں کبھی کبھی ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا پڑھنے والا ایک لمحے میں زمین پر آجاتا ہے ——— اسی جگہ جہاں سے اس نے اڑنا شروع کیا تھا۔

وقار عظیم - جس طرح عصمت نے بعض افسانہ نگار خواتین کو متاثر کیا ہے اسی طرح قرۃ العین حجاب امتیاز علی سے ایک حد تک متاثر ہوئی ہیں ——— البتہ حجاب کی طرح ان کے یہاں زندگی سے بے تعلقی باقی نہیں رہتی۔

عبادت - لیکن اس کے باوجود ان کی رومانی پرواز انہیں زندگی سے کسی حد تک دور ضرور لے جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کی یہ رومانی پرواز اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے اور وہ ہمیں مبہم معلوم ہونے لگتی ہیں ——— یہ ابہام ان کی تکنیک میں بہت واضح ہے ——— درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخئیل کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ تخئیل کی یہ گرفت جس جگہ بھی ان کے یہاں ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ ان کا فن ایسی اُن جان گھاٹیوں میں بہہ نکلتا ہے جہاں ہم اجنبی ہو جاتے ہیں۔

وقار عظیم - ان کی فطرت میں مشرقیت اور مغربیت کا اتنا میل ہے کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والدین سے مشرقی روایت کا احترام اور مغربیت کا اثر بھی لیا اور یہ تصادم ان کی تحریر میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی اردو میں سوچتی ہیں اور کبھی انگریزی میں، اور اس طرح ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم - قرۃ العین نے منظر نگاری کے سلسلے میں کرشن چندر کی طرح بڑے گہرے مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔

عبادت - قرۃ العین کے یہاں مناظر کا بڑا شدید احساس ہے اس کا بیان وہ دلنشیں انداز میں کرتی ہیں لیکن کرشن چندر کا احساس ان سے کہیں زیادہ شدید اور اس کا مشاہدہ کہیں زیادہ تیز ہے اس کا انداز بھی پختہ ہے۔ اس لئے وہ بڑا فن کار ہے۔

انتظار حسین - بہر حال قرۃ العین نے اُردو افسانے میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کیے ہیں۔

عبادت - ایک اور بات جو اس دور کے لکھنے والوں میں نئی ہے وہ یہ کہ اس زمانے میں گھریلو ماحول کی عکاسی کا شعور بھی خصوصاً بعض خواتین افسانہ نگاروں میں پیدا ہوا ہے۔ گھریلو ماحول میں جو دلکشی ہوتی ہے اس کو ہماری افسانہ نگار خواتین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس زمانے میں ممتاز شیریں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس سے قبل افسانہ نگار خواتین کے موضوعات ایک FRUSTRATION سے تعلق رکھتے تھے یہ افسانہ نگار خواتین نارمل نہیں تھیں۔ انہیں گھریلو ماحول کی دلکشی نصیب ہی نہیں ہوتی تھی۔ پھر وہ اس کو موضوع کس طرح بناتیں۔ ان کا موضوع تو چند نا آسودہ خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں تھا ——— ممتاز شیریں نے ان کے برخلاف گھریلو ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی سے کی۔ ان کے مجموعے "اپنی نگریا" میں اس موضوع پر اچھے افسانے ملتے ہیں۔

وقار عظیم - ممتاز شیریں نے جنوبی ہند کی زبانوں کے افسانوں سے اثر قبول کیا ہے۔ ان زبانوں کے افسانوں میں فن اور زندگی کا جو امتزاج ہے اس سے بعض اچھی باتیں لی ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں سے بعض افسانوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

عبادت - ممتاز شیریں کے افسانوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس مختصر افسانے کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور ہے افسانے میں تکنیک کا جو تنوع ہے اس کو انہوں نے بڑی خوبی سے برتا ہے لیکن تنوع کا یہ شعور ان کے یہاں تکنیک کے ایک SYNTHESIS کی صورت میں نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ شعور رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

انتظار حسین - خواتین افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم کی تھی،

اس کو کسی حد تک ممتاز شیریں نے پایا ہے اور کسی حد تک توڑا ہے۔

عبادت ۔ میرے خیال میں ممتاز شیریں نے ہماری دوسری خواتین افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زندگی کے صحت مندانہ پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ دوسری افسانہ نگار خواتین نے ان صحت مندانہ پہلوؤں کو نظر انداز کیا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ ان پہلوؤں سے انہیں تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک گھٹن کی پیداوار تھیں۔ ممتاز شیریں کے حالات مختلف تھے اس لئے وہ اس ڈگر پہ چل سکیں جو ان سے قبل کی افسانہ نگار خواتین نے بنائی تھی۔

بہرحال ممتاز شیریں کے ہاں دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے ایک انحراف ملتا ہے۔

انتظار حسین ۔ اس میں صحت مند اور غیر صحت مند ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عصمت وغیرہ زندگی کو ایک اور زاویے سے دیکھتی ہیں۔ ممتاز شیریں کا زاویۂ نظر مختلف ہے۔

عبادت ۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ عصمت کے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہ آسودگی کا احساس نہیں جو ممتاز شیریں کے یہاں ملتا ہے ——— عصمت وغیرہ کے یہاں ایک تشنج کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ میں ان کے فن کی حقیقت و واقعیت سے انکار نہیں کرتا۔ نہ ان کے فن کو کم مرتبہ سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں ایک نارمل کیفیت کم ہے۔

انتظار حسین ۔ تعجب ہے عبادت صاحب کو یہ احساس کیسے ہوا؟ ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں میں بھی تو زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ ہاجرہ، خدیجہ اور عصمت نے ہندوستان کی عورتوں کی اکثریت کی ترجمانی کی ہے اور شیریں نے آسودہ طبقے کی۔

عبادت ۔ یہ شاید صحیح نہیں، ممتاز شیریں نے ایک خاصے بڑے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ پھر انھوں نے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی پیش کی ہے جس کو خواتین افسانہ نگار نے اس سے قبل اہمیت نہیں دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین افسانہ نگار کو اس سے قبل گھریلو زندگی کا صحیح احساس ہی نہیں تھا۔ ممتاز شیریں نے اس کی ابتدا کی۔

وقار عظیم ۔ اصل میں دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔ ہاجرہ، عصمت وغیرہ نے یو۔پی کی مسلمان عورت کو دیکھا ہے جہاں [illegible] کا چرچا بھی ہوا ہے اور وہاں ماحول سے بغاوت زیادہ نمایاں ہے۔ شیریں کے افسانوں کی عورت ان حد بندیوں سے آزاد ہو چکی ہے۔ اس لئے اسے ماحول سے پوری طرح مطابقت پیدا کرنی ہے۔ اس نے آزاد ہو کر بھی گھر کو جنت بنانا سیکھا ہے۔

عبادت ۔ [illegible] گھریلو زندگی [illegible] مستحسن ہے

اس میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے۔ ہماری افسانہ نگار خواتین نے اس کو اہمیت نہیں دی۔

وقار عظیم ۔ یقیناً ——— حقیقت نگاری دونوں طرح کی لکھنے والیوں کے یہاں ہے۔ عصمت، شیریں کے ماحول میں ہوتیں تو غالباً اس سے زیادہ اچھے افسانے لکھتیں اور شیریں لکھنؤ میں ہوتیں تو شاید اس سے کہیں تلخ لکھتیں۔

انتظار حسین ۔ غالباً اب تقسیم کی باری آ گئی ہے۔

عبادت ۔ تقسیم کے بعد افسانے میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک لکھنے والوں میں سے بیشتر اپنا کام کر چکے تھے، تقسیم کے بعد ان کے موضوعات ختم ہو گئے ——— بات یہ ہے کہ جن راہوں پر یہ چل رہے تھے وہ سب تاریکی میں گم ہو گئیں۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا وہ نہ ہو سکا۔ جس چیز کی تمنا تھی وہ نہ ملی۔ اس لئے ایک احساسِ شکست FRUSTRATION عام ہوا۔ ان پر ایک مایوسی طاری ہو گئی۔ مایوسی کبھی کبھی انتہا پسند بھی بنا دیتی ہے مثال کے طور پر کرشن چندر، جو بہت بڑا فن کار ہے اسے تقسیم نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اسے اپنے مقام کا احساس تک نہیں رہا۔ مثلاً اس نے اپنے اوپر مقصدیت اور افادیت کو اتنا طاری کر لیا ہے اور ایک تحریک کے ساتھ ایسی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے کہ کہیں کہیں اس کا فن لڑکھڑا جاتا ہے۔

ندیم ۔ یہ کیفیت تو تقسیم کے بعد دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند۔ ترقی پسند اگر زوال پر آتے ہیں تو داخلیت پسند بھی اچھا ادب نہیں پیش کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند کچھ اور توقعات رکھتے تھے لیکن FRUSTRATION ہونے کی وجہ سے وہ فن کو سنبھال نہ سکے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے ان حالات سے فرار کا اثر لیا اور موجودہ حالات کا ذکر نہ کرنے میں ہی نجات سمجھنے لگے۔ اکثر اوقات انہوں نے انسانیت کا مذاق اڑایا۔ اس طرح دونوں افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

انتظار حسین ۔ یہ گروہ ایک خاص سیاسی ماحول میں پیدا ہوا تھا جب تقسیم ہوتی ہے تو ایک بریک سا آ جاتا ہے۔ نیا دور آتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اب کیا ہو اور چیزوں کو کس انداز سے لکھا جائے؟

عبادت ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے جو نقطۂ نظر قائم کیا تھا بڑا باشعور تھا۔ وہ انگریز کے خلاف صرف جذباتی ردِ عمل نہیں تھا بلکہ اس میں طبقاتی آویزش اور سماجی شعور کا صحیح احساس

بنی تھا اور یہ شعور تقسیم کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انگریز چلا گیا تو ہمارے افسانہ نگاروں نے سمجھا کہ ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ یہ احساس زیادہ بڑھا، یہاں تک کہ لوگ اسے پیش کرنے میں سہل پسند ہو گئے اور اس طرح فن کا خون ہوا۔

ندیم ۔ ڈاکٹر تاثیر نے بھی یہی بات کہی تھی جو انتظار صاحب نے ابھی بیان کی ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جو تقسیم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ تحریک BRITISH IMERIALISM کی تازت کے خلاف ایک جھلاتے کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریز چلا گیا اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ یہ تحریک بہتر ہی تھی کہ نئی صورت میں نئے نقطۂ نظر سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ روس کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا اور لیڈروں نے اسے جس طریقے سے نظر انداز کیا ہے اس سے لکھنے والے کچھ مبہوت سے ہو گئے ہیں۔

انتظار حسین ۔ تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے۔ سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے۔ ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے۔ اس طرح ہم اپنے طریق کار متعین نہیں کر پائے۔ پہلے ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے تھے۔ سماجی تانا بانا تھا، استحکام تھا، زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ بٹ گئے اور ایک طرح کا SOCIAL DISINTEGRATION کا دور آ گیا اور ان نئے حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

عبادت ۔ یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ طبقاتی کشمکش میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن سماجی انتشار کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہے اس لئے ہماری جو روایت تھی اور جس کا ہم نے تجزیہ کیا ہے اس پر اس رد و بدل کا اثر یقیناً ضرور ہوا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کا ماحول یکسر بدل گیا۔ ان کے لئے یہ دشواری پیدا ہو گئی ہے کہ برسوں سے وہ جس ماحول کا گہرا اثر رکھتے تھے اب اس کے متعلق وہ صرف تصور سے کام لیتے ہیں، اس طرح بہت سوں نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا مثلاً حسن عسکری۔ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہ کہا کہ اب میں آخر کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ میرا مانوس ماحول جس سے میں جذباتی ربط رکھتا تھا اب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے لکھنا ترک کر دیا ہے۔

وقار عظیم ۔ تخصیص خاص طرح کے سوچنے والے کی نہیں ہے۔

انتظار حسین ۔ خاص ماحول میں پرورش پانے والے کی ضرور ہے۔ آپ تصور کیجئے دلی کے کوچہ چیلان میں ایک لڑکی رسم و رواج کی کتنی پابند ہوتی تھی، لیکن وہ کراچی پہنچنے کے بعد ضابطہ اخلاق اور روایات کو توڑ دیتی ہے تو احمد علی، جو اسے کوچہ چیلان میں جانتے تھے، اب اس کے متعلق کیا لکھیں، کیسے لکھیں۔

عبادت ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو اتنی بڑی رونما ہوئی ہے اس کے متعلق ہمارے افسانہ نگاروں نے کیوں کم سوچا ہے۔ اس پر تو بڑی EPIC لکھی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا کتنا بڑا سانحہ ہے۔

ندیم ۔ اس کی وجہ وہی ہے جو انتظار صاحب نے بتائی کہ وہاں کے لکھنے والے نئے حالات سے ناواقف ہیں اور یہاں کے رہنے والے آنے والوں سے اجنبی ہیں۔

عبادت ۔ تو ہمارے لکھنے والے ان VALUES کو متعین کیوں نہیں کرتے۔ شاید یہ وجہ ہے کہ یہ ایک بحرانی دور ہے اور ابھی اتنا ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا کہ اس پر سوچا جا سکے۔ سوائے انتظار حسین کے کسی نوجوان افسانہ نگار نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ تمام کیفیات اکثر پر بیت چکی ہیں۔

انتظار حسین ۔ پہلے یہ متعین کر لیجئے کہ اس کے متعلق کون لکھے۔

وقار عظیم ۔ ہمیں تو اس وقت ان نئے حالات میں افسانہ نگاری شروع کرنے والوں کا جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس کی کیا نئی ترتیب کیا ہے۔

عبادت ۔ پرانے لکھنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس دور میں بہت اچھے افسانے لکھے ہیں مثلاً ندیم اور ان میں یہ وسعت نظر ہے۔ لیکن اب چونکہ CONCENTRATION نہیں اس لئے اچھی تخلیقات نہیں ہو سکیں۔ جس سے ہم کوئی حد نہیں لگا سکتے، ہاں یہ دیکھنا ہے کہ تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں انہوں نے کون سے نئے تجربے کئے ہیں جن سے افسانے کی روایت آگے بڑھی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے انتظار حسین کے افسانوں کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں۔ انہوں نے زندگی کی تنزل، تذبذب اور تقسیم کے بعد کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اس میں ایک انسانی نقطۂ نظر ہے انہوں نے زندگی کے منتشر پہلوؤں کو بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

محمد طفیل ۔ ان کے افسانوں کی یکسانیت عیب بن گئی ہے۔

عبادت ۔ اس یکسانیت کو میں ان کی خوبی سمجھتا ہوں، ان پر روسی حقیقت پسندی کا بڑا گہرا اثر ہے خصوصاً چیخوف اور تورگنیف کا۔ یہ یکسانیت اصل میں تکنیک کا دھیما پن ہے۔ یہ زندگی کو ایک خاص طرح سے محسوس کرنے کا انداز ہے۔

ندیم ۔ میرے خیال میں انہوں نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے جو ہر بڑے افسانہ نگار کو کر لینی چاہئے۔ انہوں نے جس خاص ماحول کا حصہ

کو دیکھا ہے اسی کی عکاسی کی ہے۔

عبادت ۔ طبقے کی وضاحت کیجئے۔

ندیم ۔ نچلا درمیانی طبقہ، چھوٹے دکاندار، ملازمت پیشہ لوگ وغیرہ۔ ان کے ہاں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ سماجی شعور تو ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بھرپور اظہار سے کترا کر نکل جانا چاہتے ہیں۔

عبادت ۔ طبقے کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف معمولی دکانداروں کی نہیں بلکہ یو۔پی کے خاص اضلاع کے متوسط طبقے کی ترجمانی کی ہے یعنی بلند شہر کے آس پاس کا علاقہ۔ انتظار کے ہاں درحقیقت دو قسم کے ماحول ہیں، ایک تو وہ جو وہاں موجود تھا۔ دوسرا اس تبدیلی کے بعد جسے وہ سوچ سکتے ہیں۔ رہا سماجی شعور تو وہ اس کے قائل نہیں۔ ان کا تعلق درحقیقت اسی سکول سے ہے جس کے تحت بہت سے بیدی، اور غلام عباس کو رکھا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کی تخصیص کر لی ہے، ان کے پاس ماحول کے المیے کا اظہار زیادہ ہے اور ان مسائل پر ان سے اچھے افسانے کسی نے نہیں لکھے۔

ندیم ۔ ان کا نام بیدی اور غلام عباس کے ساتھ لینا زیادتی ہے لیکن ایک چیز انتظار کے بارے میں اور ہے وہ یہ کہ یہ چیخوف کی طرح جزئیات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں لیکن تخلیقی طور پر ان کے افسانوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کو بالکل ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

وقار عظیم ۔ اس حد تک ہی دوسرے کسی افسانہ نگار نے اس اصول کی پابندی نہیں کی۔ ہر موضوع کی تخصیص جس سے تکرار کا احساس ہوتا ہے تو اس کا احساس انہیں خود ہوا ہے۔ اب وہ اپنے مانوس کردار کو نئے ماحول میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں اس کے احساس کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ اس طرح اب تکرار کا احساس کم ہو گیا ہے۔ یہ چیز آگے بڑھی تو ان کے افسانوں میں یقیناً وسعت پیدا ہوگی۔ اس طرح یہ ایک نئی راہ ہے جو انہوں نے نئے لکھنے والوں کو بتائی ہے۔

عبادت ۔ اس نے ان کی تکنیک اور انداز بیان میں شدت پیدا کی ہے جسے شدت کہنے کے بجائے صحیح طور پر خلوص کے ساتھ پیش کرنا کہا جا سکتا ہے مثلاً "سائے بھی چونسیں" میں ایک شخص پاکستان سے ہندوستان واپس جاتا ہے تو ریل میں جمنا کے پل پر سے گزرتے ہوئے جب وہ ہندوؤں کو پیسے پھینکتے نہیں دیکھتا تو خود بے اختیار ہو کر پیسے پھینکنے لگتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے جذباتی بیان سے ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اور مستقل تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ندیم ۔ فسادات کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ناکام ہیں۔ موجودہ تبدیلیوں کے بارے میں سب سے پہلے انتظار حسین نے لکھا ہے اور ان کے افسانے کافی اچھے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ پلاٹ اور کردار کی روایتی ہم آہنگی سے انہوں نے بڑا انحراف کیا ہے۔

عبادت ۔ انہیں معاشرت کی اہمیت کا احساس زیادہ ہے اور یہ چیز قارئین پر اسی طرح زیادہ واضح کی جا سکتی ہے۔ اگر کردار کے مدوجزر حرکات و سکنات سے واضح کئے جا سکیں تو یہ کامیابی کی دلیل ہے۔

وقار عظیم ۔ اس پورے ماحول میں صرف نچلے طبقے کی عکاسی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی بھی ہے۔ ان چیزوں سے انتظار کو بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ لیکن اس میں جب کوئی خامی نظر آتی ہے تو وہ اتنی تلخی سے اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ماحول سے تنگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں تو ایک بڑے cynic کا سا انداز ہو جاتا ہے۔ یہ نشتر کی کیفیت معلوم نہیں کس وجہ سے ہے۔

ندیم ۔ انتظار حسین نئے لکھنے والوں میں نمایاں ترین ہیں۔

عبادت ۔ ان کی تمام چیزوں میں وہی کیفیت ہے جو بلونت سنگھ کے یہاں ہے، یعنی حیات نگاری ہے، ان کو پڑھنے کے بعد اس زمانے کی زندگی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس معاشرت کے ساتھ ان کا انداز بیان پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ محاوروں اور لہجے کا استعمال کرداروں کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا بڑی خوبی ہے۔ ان کے یہاں محاورہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح ٹھونسا ہوا نہیں ہے۔ وہ خیال کی روانی کے ساتھ آتا ہے۔ ماحول کی وضاحت میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی محسوس کرنا چاہیئے کہ اس زندگی کو باقی رکھنے کے لئے جس سے انہیں اتنی دلچسپی ہے، اب کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ انہیں لہجے کے دھیمے پن میں ذرا سی شدت پیدا کرنی چاہیئے۔

وقار عظیم ۔ میں اس سے متفق نہیں۔ اس میں مزاج کو دخل ہے اور اگر اس سلسلے میں کوئی شعوری کوشش کی گئی تو تصنع پیدا ہو جائے گا۔

محمد طفیل ۔ اگر یہ بقدر ضرورت پلاٹ پر بھی توجہ دینے لگیں تو ان کے افسانے زیادہ جاندار ہو جائیں گے۔ پھر ان کے افسانوں میں محاوروں کی

جو بھرپور ہوتی ہے وہ بڑی طرح کھلتی ہے۔

وقار عظیم۔ ان کے افسانوں میں جو محاورے آتے ہیں وہ ضرورت کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں۔

محمد طفیل۔ اگر ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ کہ ان کے ہاں محاوروں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔

عبادت۔ اب نئے لکھنے والوں میں، اشفاق احمد رہ جاتے ہیں۔ یہ بہت ذہین افسانہ نگار ہیں، اور اسی سکول کے نمائندہ ہیں جس سے بلونت سنگھ اور انتظار حسین متعلق ہیں۔

وقار عظیم۔ مجھے اس سے اختلاف ہے، بلونت سنگھ اور انتظار حسین نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے لیکن، اشفاق احمد نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانے بچوں کے متعلق ہیں جن میں انہوں نے ان کے نرم و نازک احساسات کی بڑی فن کارانہ ترجمانی کی ہے۔ بعض افسانوں میں وہ رومان پیش کرتے ہیں۔ ان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو بڑی شگفتگی سے پیش کرتے ہیں۔

بچوں کے لئے ان کے دل میں بڑی محبت ہے اور انہیں انسانیت کے مستقبل کی امانت سمجھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ پوری انسانیت کی خدمت ہے۔ ہمارے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں یہ بات نہیں۔

ندیم۔ اشفاق کے تمام افسانوں کا ایک فنی معیار ہوتا ہے، وہ باشعور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی معاشی تبدیلی پر بھی کہانی لکھی ہے۔

وقار عظیم۔ ان کی نظر ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے لیکن جہاں ٹھہرتی ہے وہاں تمام جزئیات کا جائزہ لیتی ہے۔ انہوں نے پرانے ادب اور شعر کو بڑے حسن سے اپنے افسانوں میں رچایا ہے۔ غالب، حافظ اور میر درد ان سب کا کلام ان کے سامنے ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باتی طرز بیان میں بھی اس کی مطابقت کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس سے ان کے افسانوں میں بڑی ہمواری اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مخلص فن کار ہیں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

انتظار حسین۔ پنجاب کے افسانہ نگار نا دانستہ طور پر پنجابی الفاظ لاتے ہیں لیکن اشفاق احساس امر کی شعوری کوشش اور اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے تاثر کہیں بڑھ جاتا ہے۔

عبادت۔ اس سے انتظار حسین، بلونت سنگھ اور اشفاق سب کا نام لیتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک فرق البتہ ہے۔ انتظار حسین کو اس خاص طرح کے انداز سے فطری لگاؤ ہے۔ اشفاق اور بلونت سنگھ کے یہاں ہر جگہ اس کا انداز شعوری ہے۔ اس سے بعض اوقات خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اشفاق احمد کی اس شعوری کوشش میں ہر جگہ یہ احساس موجود ہے کہ بیان کو فنی تخلیقات کے حسن و تاثیر میں بڑا دخل ہے اور اس لئے وہ ہمیشہ اس کے بنانے سنوارنے پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔

محمد طفیل۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے بارے میں بھی کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔

وقار عظیم۔ وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے افسانے لکھنے کے لئے نہیں چنا۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں میں، اے حمید کا نام بھی رہ گیا۔

وقار عظیم۔ نام تو کئی اور ہیں، مثلاً دیویندر اسر کا ذکر ضرور ہونا چاہئے کیونکہ ہماری موجودہ زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا ہے، اس کا ذکر تو افسانہ نگاروں نے کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کس پر ہے اس کے اظہار میں عموماً جھجک محسوس کی ہے۔ اسر نے عام انداز کے خلاف اس معاملہ میں پوری جرأت کے ساتھ اس کی ذمہ داری ارباب سیاست پر رکھی ہے۔

عبادت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک وجہ یہ ہے اور دوسری یہ کہ جس ماحول میں اسر رہتے ہیں وہاں اظہار پر کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کو غالباً یہ اندیشہ بھی ہے کہ پڑھنے والے اتنے جذباتی ہیں کہ وہ لکھنے والے کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

——جی ہاں، میں دیوندر اسر کا ذکر کرنا چاہتا تھا اور بتانا مقصود یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں میں صرف وہی نام نہیں بلکہ کئی نام توجہ کے مستحق ہیں لیکن ابھی ان کے کارناموں پر انفرادی حیثیت سے گفتگو شاید قبل از وقت ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم ان لکھنے والوں کی ایسی خصوصیات کا ذکر کر لیں جو سب میں مشترک ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض چیزیں نمایاں ہیں مثلاً ایک عام رجحان یہ ملتا ہے کہ کسی افسانہ نگار نے اپنے آپ کو فسادات کے موضوع سے ملوث کرنے

کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ غالباً ان لکھنے والوں کے نزدیک یہ بھی کہ اگر اپنے لئے جگہ پیدا کرنی ہے تو نئے موضوع تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر یہ کہ یہ سب نئے لکھنے والے فن کی روایات کی پابندی کو بے عد ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتشار کے دور میں بھی روایت کو ٹھیس نہیں پہنچی اور نہ وہ پیچھے کی طرف گئی۔ موجودہ حالات میں یہ بھی فن کی بڑی خدمت تھی۔ دوسری چیز جو ان سب افسانہ نگاروں میں مشترک ہے، وہ زندگی کا احساس ہے۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی خاص زندگی سے وابستہ کیا ہے اور اسی کو موضوع بنایا ہے مثلاً شوکت صدیقی کے وہ افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں انہوں نے نکھٹو کے ڈرائیوروں اور بیگموں وغیرہ کی زندگی کی مصوری کی ہے ——— نئے لکھنے والوں میں صرف انہی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسے ایک نئے رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کا احساس نچلے طبقے کے لوگوں کو بھی ہے اور ڈرائیوروں اور بیگموں کو بھی۔

ندیم ۔ شوکت صدیقی بالکل نئے لکھنے والے نہیں ہیں۔ وہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں شروع میں معمولی درجے کے افسانے لکھے ہیں لیکن اس دور میں اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔

عبادت ۔ نئے افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم رکھی ہے اس میں ان افسانہ نگاروں کی کوششوں کے علاوہ اس روایت کی عظمت کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے افسانے نے بڑی عظیم روایت قائم کی ہے، اسے برقرار رکھنا ان لوگوں کے لئے ضروری تھا۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسے CALIBRE کا نہیں ہے جیسے ان کے پیش رو تھے۔ ان کی سطح اپنے پیش روؤں سے بہت نیچی ہے۔ ان کے احساس میں بھی وہ شدت نہیں جو پہلے افسانہ نگاروں میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو نسبتاً کم دیکھا ہے۔ ان کے احساس میں شدت بھی نہیں ہے شعور میں بیداری بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں وہ عظمت نہیں ہے جو ان کے پیش روؤں کے فن میں نمایاں نظر آتی ہے۔

وقار عظیم ۔ ابھی یہ افسانہ نگار اپنی تخلیقی زندگی کی اس منزل تک نہیں پہنچے کہ ہم ان کے کارناموں پر کوئی قطعی حکم لگا سکیں لیکن ان کی تحریروں میں اس عظیم روایت کی موجودگی اور اس کی پابندی کا احترام ایسی چیزیں ہیں جنہیں مستقبل کے لئے نیک فال کہا جا سکتا ہے۔

عبادت ۔ ان سب کے یہاں اس رجحان کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر رومانیت بلکہ کہیں کہیں سستی جذباتیت کی طرف مائل ہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے پورے ماحول میں وہ ہمواری پیدا نہیں ہوئی کہ کسی چھوٹے سے واقعے کو موضوع بنا کر اس پر کچھ لکھا جا سکے، اور اس لئے یہ لکھنے والے رومانیت کے سہارے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

عبادت ۔ ان میں سے بیشتر کے مزاجوں میں ایک فراری کیفیت ہے زندگی کا کوئی بہت واضح نقطۂ نظر بھی ان کے یہاں نہیں ہے اور جب تک کوئی واضح نقطۂ نظر سامنے نہ ہو فن یونہی بھٹکتا ہے۔ اس کو منزل سے ہمکنار ہونا نصیب ہوتا۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں سے بیشتر کے فن کا یہی حال ہے۔

وقار عظیم ۔ اس فرار کی ایک شکل بعض لکھنے والوں کے ہاں نمایاں ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے تقریباً سبھی افسانے ایسے ہیں جن میں قہوہ خانوں کا ماحول ہے۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آنکھ چراتے ہیں۔ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں اور اس لئے سختیوں سے بھاگ کر ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں وہ چھپ کر تلخیوں کا مذاق اڑا سکیں۔

عبادت ۔ اے حمید ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں یہ رجحان ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی جذباتی اور رومانی فضا اس کو ظاہر کرتی ہے۔ انہیں زندگی کی تلخیوں کا احساس ضرور ہے لیکن وہ ان تلخیوں کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اگر یہ سکت ان کے ہاں ہوتی تو ان کے فن میں بڑی توانائی پیدا ہو سکتی تھی۔

وقار عظیم ۔ ایک وجہ اور بھی ہے کہ ان لوگوں نے راشفاق اور انتظار کو الگ کر کے) جہاں زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا وہاں دوسری طرف ادب اور فلسفہ کا بھی مطالعہ نہیں کیا کہ خیال میں وسعت پیدا ہوتی۔

عبادت ۔ لیکن اے حمید کے ہاں ایک چیز ہے یعنی زندگی کے مظاہر سے دلچسپی ——— ہر چند کہ اس دلچسپی میں بچپن کی سادگی اور معصومیت کو دخل ہے لیکن یہی ان کے فن کی جان ہے ——— زندگی کی سنگین حقیقتوں سے دامن بچا کر چلنے کے باوجود ان کے ہاں زندگی سے دلچسپی کا رجحان ضرور ملتا ہے جس کا اظہار وہ کوہساروں، پہاڑوں اور دریاؤں کے بیان میں کرتے ہیں۔

نئی پود کے افسانہ نگاروں میں اے حمید کا فن اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ندیم ۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں توازن قائم نہیں رکھتے۔ بجائے اس کے کہ وہ حقیقت پسندی کی راہ پہ چلتے انہوں نے رومانیت کا سہارا لیا۔

انتظار حسین ۔ اصل میں ان کے ہاں COMMON MAN کا زاویۂ نظر ملتا ہے۔ مصنف عام آدمی سے الگ نہیں دکھائی دیتا۔

عبادت ۔ ان کے یہاں مطالعہ کا فقدان اور شعور کی سطحیت ہے۔ اس لئے وہ ہر چیز کو رومان کی عینک سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن ان کی رومانیت میں جو سادگی اور معصومیت ہے وہ اپنے اندر بلا کی دلکشی رکھتی ہے۔

محمد طفیل ۔ آپ حضرات مذاکرہ ختم کر چکے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر ہم تین چار افسانہ نگاروں کا ذکر اور کر لیتے تو اچھا تھا۔ میری مراد چودھری محمد علی رودولوی، قدرت اللہ شہاب، تسنیم سلیم اور ابوالفضل صدیقی سے ہے۔

عبادت ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی گفتگو میں بے شمار نام لئے ہیں لیکن یہ نام محض اس لئے نہیں لئے گئے کہ ہم انفرادی طور پر ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم ناموں کے ساتھ ساتھ یہ دیکھتے چلیں کہ ان کے انفرادی فن نے ہمارے افسانہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں کیا حصہ لیا ہے۔

وقار عظیم ۔ عبادت صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے لیکن طفیل صاحب کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے بھی ہمارے افسانہ کی روایت کو کوئی نہ کوئی چیز دی ہے اس لئے روایت اور جدت کے تسلسل کے تذکرہ میں ان کا ذکر آنا ضروری ہے۔

محمد طفیل ۔ جی ہاں! میرا یہی خیال ہے۔

وقار عظیم ۔ تو پھر آئیے ان افسانہ نگاروں کے فن کے ان پہلوؤں پر گفتگو کر لیں جن کی بدولت ہماری افسانوی روایت کسی نہ کسی جدت سے آشنا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کے افسانوں کو لیجئے۔

عبادت ۔ چودھری صاحب خاصے پرانے افسانہ نگار ہیں اور بڑی مدت سے خاموشی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اسی خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو خدمت ہمارے افسانے کی انہوں نے کی اس کی داد بعد میں آنے والوں کو ملی۔

وقار عظیم ۔ آپ کا اشارہ شاید ان خاص طرح کے افسانوں کی طرف ہے جن میں چودھری صاحب نے جنسی مسائل کو بڑے لطیف اور نازک فنی انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت ۔ جی ہاں! بالکل انہی افسانوں کی طرف۔ جنسی مسائل کو افسانہ کا موضوع بنانے کی جو روش متوسط دور کے لکھنے والوں میں نظر آتی ہے اور جس کی مختلف صورتیں ہمیں منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اس کی ایک نکھری ہوئی شکل چودھری محمد علی کے افسانوں میں ہے۔

وقار عظیم ۔ جو بات ممتاز مفتی کا ذکر کرتے وقت ندیم صاحب نے فرمائی تھی وہ اس وقت یاد آ رہی ہے۔

ندیم ۔ مجھے یاد نہیں رہی وہ بات۔

وقار عظیم ۔ آپ نے فرمایا تھا کہ جنسی مسائل اور خاص کر ان مسائل کے نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرنے کے لئے بیان پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ مفتی کو میسر نہیں ـــ چودھری محمد علی کا امتیاز بیان کی یہی قدرت ہے۔

ندیم ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کے ماحول اور اس کے کرداروں سے پوری طرح واقفیت اور بے تکلفی۔

وقار عظیم ۔ چودھری صاحب کے بعض افسانے پڑھ کر تو مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ موضوع سے پوری واقفیت اور بیان پر پوری قدرت ہو تو سیدھی سادی کہانی میں بھی ایک طلسم کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین ۔ یوں اس طرح کے طلسم تو قدرت اللہ شہاب نے بھی بہت باندھے ہیں۔

وقار عظیم ۔ آپ کی اجازت سے میں آپ کے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت اللہ شہاب نے طلسم باندھنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن طلسم باندھنے میں انہیں کامیابی ذرا کم ہی ہوئی ہے۔

انتظار حسین ۔ مجھے اس معاملہ میں آپ سے اتفاق نہیں "یاخدا" ایک مکمل طلسم ہے۔

وقار عظیم ۔ "یاخدا" کی حد تک تو سب آپ سے متفق ہوں گے لیکن یہاں ذکر مختصر افسانوں کا ہے اور شہاب کے مختصر افسانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جب جنسی پہلو کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ایک پست قسم کی لذتیت ان کے پورے افسانے پر چھا جاتی ہے۔

محمد طفیل ۔ لیکن انہوں نے سارے افسانے جنسی پہلوؤں ہی پر تو نہیں

لکھے۔ پھر ان کے ہاں اظہار کی جرأت بھی ہے۔ جرأت کے بجائے شاید جسارت کا لفظ مناسب ہے۔ بعض اوقات تو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک برگزیدہ آفیسر اس طرح بھی سوچ سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں! یہ صحیح ہے۔ شہاب کے موضوع متنوع ہیں اور ان متنوع موضوعات میں نفس مضمون اور طرزِ بیان کے اعتبار سے دو چیزیں مشترک ہیں۔ نفس مضمون کے اعتبار سے تو یہ کہ وہ ہماری معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں (اور اس میں ان کے جنسی افسانے بھی شامل ہیں) جس میں بھرپور طنز اور بے پروا تنقید کی گنجائش ہو اور اظہار کے نقطۂ نظر سے یہ کہ اس بات کو وہ پوری دلیری سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں پستی یا سوقیت کے پیدا ہو جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

عبادت۔ اور اس طرح وہ توازن ختم ہو جاتا ہے جسے ہم فنی تاثیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کے باوجود ہمارے افسانے میں جرأت اظہار کی روایت بہت عام نہیں ہے اور عصمت، منٹو اور ہاجرہ مسرور کے علاوہ بہت کم کہیں دکھائی دیتی ہے اسے شہاب نے ایک نئی شکل دے کر اس روایت کو وسعت دی ہے اور یہ ان کی خدمت ہے۔

محمد طفیل۔ تسنیم صاحبہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم۔ یہ بات ہمیں ندیم صاحب بتائیں گے۔

ندیم۔ صاحب! میں تسنیم کو کئی حیثیتوں سے مکمل افسانہ نگار سمجھتا ہوں ——— پہلی تو یہ کہ وہ موضوع کے انتخاب کے لئے ادھر اُدھر کبھی نہیں بھٹکی۔ اب تک پاکستان کی زندگی میں اس نے ایسے بے شمار موضوع تلاش کر لئے ہیں جن میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تسنیم کا کوئی افسانہ پڑھ کر پڑھنے والا اپنے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہیں محسوس کرتا۔ یہ ایک سیدھی سادی شگفتہ فضا ہے اور اسے ہلکے پھلکے سیدھے سادے شگفتہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے ——— نہ کہیں افسانہ کی رفتار میں بوجھل پن ہے نہ اس کے طرزِ بیان میں۔

عبادت۔ لیکن اس کی وجہ آخر کیا ہے؟

وقار عظیم۔ صاحب! مجھے تو ان ساری باتوں کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہماری دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح تسنیم کسی طرح کے COMPLEX میں مبتلا نہیں ہیں۔ عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر سب کے ذہن بظاہر کسی نہ کسی نفسیاتی اُلجھن میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان اُلجھنوں سے ان کے فن میں جا بجا صاف گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تسنیم کا ذہن ان اُلجھنوں سے خالی ہے اور اس لئے اس کا فن ہموار اور صاف ہے ——— اس کے ہاں زندگی کے مسائل آتے ضرور ہیں لیکن وہ پڑھنے والے کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر نہیں بیٹھ رہتے اور اس طرح ہمیں ان کہانیوں سے فن کا ایک بڑا اچھا سبق یہ ملتا ہے کہ افسانہ نگار کچھ بھی لکھے اگر وہ خلوص اور سادگی سے لکھتا ہے تو اس میں تاثیر ضرور ہو گی۔

ندیم۔ تسنیم کو اپنے ماحول اور کرداروں سے جو لگاؤ ہے اس نے بھی افسانوں میں بے تکلف روانی کی یہ فضا پیدا کی ہے۔

محمد طفیل۔ ان کے ہاں جتنا خلوص ہے وہ کسی افسانہ نگار میں نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں قاری پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وقار عظیم۔ ہاں صاحب یہ تو حقیقت میں ہماری افسانہ نگاری کا ایک اہم رجحان بن گیا ہے کہ ہمارے اکثر افسانہ نگار اسی ماحول اور انہی کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں جن سے وہ اچھی طرح مانوس ہیں۔

محمد طفیل۔ اور اس لحاظ سے مجھے ابوالفضل صدیقی میں جو بات نظر آتی ہے کسی اور میں نہیں دکھائی دیتی۔ جس خاص طرح کے ماحول کی عکاسی اس نے اپنے افسانوں میں کی ہے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کی۔ اس کی زبان اور بیان بھی اپنا ہے۔ اسے اس ماحول کی جزئیات کا اتنا علم ہے اور وہ اس علم کو جس نئے انداز میں اس بے تکلفی اور خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر خاصا طویل افسانہ لکھ سکتا ہے۔

عبادت۔ اور اس طرح پڑھنے والوں کو بور بھی کر سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ طوالت اور بوریت میں ایک قریبی تعلق ہے اور اس لئے اگر ابوالفضل صدیقی کسی طرح اپنے آپ کو اختصار اور اعتدال کی طرف مائل کر سکیں تو ان کی وہ خوبیاں جن کا طفیل صاحب نے ذکر کیا، انہیں بڑا کامیاب افسانہ نگار بنا دیں۔

محمد طفیل۔ ہم نے بزعم خود تمام افسانہ نگاروں کا ذکر کر دیا، پھر بھی کئی ایک افسانہ نگار چھوٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کم از کم اے حمید اور جلیس کا ذکر یہاں ضرور ہونا چاہیے۔

عبادت۔ ابراہیم جلیس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ انہوں نے

افسانے میں کوئی خاص تجربہ نہیں کیا۔ کم و بیش انہی موضوعات پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں جن پر اس دور کے بیشتر افسانہ نگار لکھتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے متوسط طبقے کے افراد کی زندگی، ان کی معاشی الجھنیں، ان کی اقتصادی پریشانیاں ——— جلیس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ طبقاتی سماج پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں ——— اسی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جلیس کی تکنیک میں ویسے کوئی ایسی بات نہیں جس کو اہم تجربہ کہا جا سکے۔ لیکن انہیں واقعات کو کہانی کا روپ دینے کا گُر آتا ہے اور وہ اس کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں ——— البتہ خاکے کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض بہت اچھے خاکے انہوں نے لکھے ہیں۔

وقار عظیم ۔ انہیں زندگی کا شدید احساس ہے اور اس شدید احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ انہوں نے بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل ۔ ان پر کرشن چندر کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

عبادت ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر جو کچھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں اور جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں ہمارے نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے اس لئے اس کے فن کا رنگ نوجوان افسانہ نگاروں پر بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ جلیس کرشن چندر کے انداز میں سوچتے ہیں اور اس لئے اسی طرح اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ندیم ۔ ان کے انداز بیان میں خاصی روانی پائی جاتی ہے اور اس خصوصیت نے ان کے افسانوں میں دلآویزی پیدا کی ہے۔

عبادت ۔ ابراہیم جلیس کی طرح انور نے بھی افسانے میں کوئی اہم تجربہ نہیں کیا۔ لیکن زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احساس ان کے یہاں بھی شدید ہے۔ اسی لئے وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ان متنوع موضوعات میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ ان سب پر ایک مخصوص زاویۂ نظر سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس زاویۂ نظر کی نوعیت سماجی ہے، البتہ اس میں بڑی گہرائی نہیں ہے۔

محمد طفیل ۔ انور کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔

عبادت ۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے فن میں موضوع کے ساتھ ایک خلوص نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے فن میں احساس تاثر کی شدت ہے جو جذبہ خلوص ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

محمد طفیل ۔ اب وہ اسٹیج آ گئی ہے کہ ہم اپنی ساری گفتگو کا ایک جائزہ لے سکیں کہ اب تک کے افسانہ نگاروں نے کہاں تک روایت کا ساتھ دیا اور کیا کیا نئے تجربے کئے۔ اب اگر وقار صاحب اس ساری گفتگو کا ماحصل بیان فرما دیں تو یہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

وقار عظیم ۔ ہم نے "روایت اور تجربے" کے موضوع پر خاصی طویل گفتگو کی اور اس طویل گفتگو میں ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے مختصر افسانہ کی تقریباً پچاس برس کی تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس جائزے کے سلسلے میں اُردو کے بے شمار افسانہ نگاروں کی فنی تخلیقات اور ان کی اہم خصوصیات کا تذکرہ آیا۔ بعض لکھنے والوں کا تذکرہ بار بار کیا گیا اور خاصی تفصیل سے کیا گیا، بعض کا ذکر محض سرسری انداز سے ہوا۔ بعض لکھنے والے شاید ایسے بھی ہوں جن کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ لیکن چونکہ فرداً فرداً سب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبہ اور حیثیت کا تعین اس گفتگو کا مقصد نہیں تھا اس لئے کسی نام کا ہونا یا نہ ہونا اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کی دلیل ہرگز نہیں۔ گفتگو کا مقصد تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ جب ہمارا افسانہ شروع ہوا تو اس کی اساس کون کون سی ایسی چیزیں تھیں جنہیں ہم اس کی روایت کہہ سکیں۔ اس اساس میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا اضافے ہوئے اور کس طرح افسانہ کی روایت ایک سیدھی سادی روایت سے بڑھ کر اس بلند مقام تک پہنچی جہاں ہم اسے آج دیکھ رہے ہیں (یا اب سے چند برس پہلے دیکھ چکے ہیں)

افسانوی روایت کے ارتقا کی اس تاریخ میں بعض ناموں کی اہمیت یقیناً دوسروں سے زیادہ ہے ——— کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے افسانہ کو اس کی اساسی حیثیت بخشی، کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے اس اساس پر بلند تعمیریں کیں، اور کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے کبھی کبھی ایسے مشکل حالات میں جب بڑی سے بڑی اور پختہ سے پختہ روایت کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں، اس عمارت کو گرنے اور مسمار ہونے سے بچایا

روایت کے بانی ہیں، دوسرے اس لئے کہ اپنی افسانہ نگاری کے تیس برس کی عمر میں انہوں نے اس روایت میں طرح طرح کی جدتوں اور تجربوں سے بے شمار اضافے کئے۔ افسانہ اپنی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں میں روایت اور تجربہ کی جن جن منزلوں سے گزرا ہے وہ ساری منزلیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اور اس طرح "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے "کفن" تک افسانہ کی روایت کی ابتدا، ارتقا اور عروج کی ساری داستان درج ہے۔ روایت نے ابتدا سے عروج تک پہنچتے پہنچتے جو راہیں طے کی ہیں ان سب راہوں میں پریم چند کی حیثیت محض رہرو کی نہیں رہنما کی ہے اور یہ چیز ان کی اہمیت کا تیسرا نمایاں پہلو ہے۔

پریم چند کا افسانہ روایت اور تجربہ کی جن مختلف منزلوں سے گزرا ہے انہیں چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ابتدا تو وہ ہے جب ان کے "سوزِ وطن" کے افسانوں میں ہمیں گہری مقصدیت، شدید قسم کی جذباتیت اور فضا اور طرزِ بیان پر داستانوں کی شعریت، رنگینی اور فوق الفطرت مبالغہ آرائی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے تاریخی، نیم تاریخی اور روایتی افسانوں میں مقصدیت اور جذباتیت تو موجود ہے لیکن داستانوں کا فوق الفطرت بہت کم ہو گیا ہے۔ ذرا اور آگے چل کر تاریخ کے بجائے زندگی افسانوں کا موضوع بن گئی ہے۔ مقصدیت میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اس نے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پسندی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بیان میں داستانی عناصر اب بالکل نہیں رہے لیکن شعریت اور خطابت اب بھی ہے۔ اس سے اگلے دور میں ماحول اور مسائل کی تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔ بیان کی شعریت میں اب بھی دھیما پن ہے۔ پانچویں دور میں ماحول کی تخصیص کے ساتھ نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اب نظر سماجی اور اخلاقی مسائل سے بڑھ کر سیاست پر بھی جاتی ہے اور باتوں کو دھیمے انداز میں کہنے کی طرف پوری توجہ ہے۔ آخری دور وہ ہے کہ افسانہ نگار واقعہ سے زیادہ اشخاص کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتا ہے، اس کے خارجی ماحول سے زیادہ اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے، اس نے اس دور میں حقیقت اور فن کا مکمل امتزاج بھی کیا ہے اور اپنے فن کو اپنی شخصیت کا مکمل مظہر بھی بنایا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے یہ مختلف دور حقیقت میں اردو افسانہ کی روایت کے ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں۔ ان مختلف منزلوں میں پریم چند نے ایک تنہا مسافر کی طرح کبھی سفر نہیں کیا۔ ہر دور میں ان کے ساتھ ایسے لکھنے والوں کا ایک کارواں رہا ہے جس کے ہر فرد نے ان کی بنائی ہوئی روایتوں کو اختیار کر کے ان کی پیروی کی ہے۔ پہلے اور دوسرے دور میں سدرشن ان کے ساتھ ہیں۔ تیسرے دور میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی ہیں، چوتھے اور پانچویں دور میں بے شمار لکھنے والے ان کے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حامد اللہ افسر، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، ان میں سے چند ہیں۔

پریم چند نے افسانہ کے بالکل ابتدائی دور میں اسے مقصدیت اور داستانی رنگ کی روایت دی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے ایک خاص ماحول کی زندگی کے پس منظر میں اصلاحی مقصد سے افسانے لکھے اور اس طرح داستانی رنگ سے بچ کر حقیقت نگاری اور مقصد نگاری کے امتزاج کی روایت شروع کی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم نے افسانہ کو رومانیت کی روایت سے آشنا کیا اور اس طرح اساس کی حیثیت سے روایت کے تین پہلو افسانہ کا جزوِ خاص بنے ــــ مقصدیت اور داستانی رنگ، مقصدیت اور حقیقت نگاری، رومانیت اور فنی لطافت کا احساس۔ آنے والے ہر دور میں افسانہ کی روایت انہیں تین راستوں پر چل کر موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ حقیقت نگاری کی روایت کو پریم چند کے علاوہ حسینی، حامد اللہ افسر، عظیم بیگ چغتائی، منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد علی، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ہاجرہ مسرور اور انتظار حسین نے زندہ رکھا، ترقی کی نئی راہیں دکھائیں اور فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ رومانیت کی روایت سجاد حیدر کے علاوہ نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی کے ہاتھوں پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ سدرشن، اعظم کریوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے حقیقت اور رومانیت کے امتزاج سے اس روایت کو چار چاند لگائے

فن کے جس رجحان کا احساس سجاد حیدر یلدرم کے ترجموں نے پیدا کیا تھا اسے خواجہ منظور، بشیر الدین، منصور احمد، جلیل قدوائی کے روسی افسانوں کے ترجموں اور محمد مجیب کے روسی انداز کے افسانوں نے جلا دی ــــ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء تک ہمارے افسانہ میں حقیقت، رومانیت اور فنی احساس نے ایک عظیم المرتبہ روایت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پریم چند کے فن، ترقی پسندی کی تحریک اور "انگارے" کے باغیانہ انداز نے تجربوں کی بے شمار راہیں کھول دیں اور تقسیم سے بہت پہلے علی عباس حسینی، کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت، اختر انصاری، احمد علی اور اختر اورینوی نے اور اس کے ذرا بعد حسن عسکری، بلونت سنگھ، غلام عباس، ممتاز مفتی، تسنیم سلیم، دیویندر ستیارتھی، ہاجرہ مسرور اور قدرت اللہ شہاب

نے جو کچھ لکھا اس سے حقیقت نگاری میں نئے نئے باب کھلے ——— افسانہ کے لئے کسی خاص ماحول کی تخصیص، ایک محدود ماحول کی زندگی میں بین الاقوامی حالات کا عکس، زندگی کے پھیلے ہوئے رشتوں کا احساس، وسیع انسانیت کا تصور، واقعات کے بجائے کرداروں پر اہمیت، زندگی کے خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی زندگی کا مطالعہ، فرد کے جذبات کے علاوہ اس کی لاشعوری کیفیتوں کا تجزیہ، ذہنی گتھیاں اور تحلیل نفسی، زندگی سے متعلق کسی مخصوص زاویۂ نظر کی موجودگی، اس کے مسائل کا اجتماعی شعور ——— یہ سب کچھ حقیقت نگاری کے زمرہ میں شامل ہو گیا اور یہ ساری چیزیں مختلف لکھنے والوں کی شخصیتوں کا جزو بن کر افسانہ میں اس طرح گھل مل گئیں کہ نہ اس میں موضوعات کی کمی رہی اور نہ اس کی وسعتوں کا ٹھکانہ۔ جو رومانیت کبھی محض ایک شاعرانہ یا جذباتی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ اپنے سارے خارجی حسن و مظاہر اور داخلی و نفسیاتی لوازم کے ساتھ حقیقت میں شیر و شکر ہو گئی اور اس نے فرد کی بیزاری کا لباس پہن کر فن کو نئی سے نئی شکلیں دیں۔ اظہار و بیان میں بھی نت نئے تجربے ہوئے، کچھ روسی حقیقت نگاروں کے اثر، کچھ فرانسیسی رومانیت کے اثر کے ماتحت اور کچھ فرانس اور انگلستان کے لکھنے والوں کے نئے نفسیاتی فن کی بدولت یہاں تک کہ تقسیم تک ہمارے افسانہ میں وہ سب کچھ آ گیا جو مغرب میں افسانہ کی روایت کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے والوں نے اسے کبھی کبھی جوں کا توں اختیار کر کے اور کبھی مشرقی مزاج کے رنگ میں سمو کر اپنے افسانہ کی روایت کو مالا مال کیا اور تقسیم کے بعد لکھنے والوں نے ایک ایسے دور میں جب ہر چیز انتشار کی سخت زد میں تھی اس عظیم روایت کو اپنا کر اسے زندہ و برقرار رکھا۔ وہ اب تک بظاہر اس میں کوئی اضافہ تو نہ کر سکے لیکن جس دشوار دور میں انہوں نے اس کی حفاظت کی ہے وہ اس لئے بہت اہم اور غنیمت ہے کہ اس طرح روایت کا تسلسل مدہم یا برہم نہیں ہوا۔ ایک سیدھی سادی روایت کو بے شمار فنکاروں نے نئے نئے تجربوں نے، ان کی ذہنی کاوشوں نے، ان کے خونِ جگر نے جو عظیم الشان شکل دی تھی، وہ بگڑنے نہیں پائی۔ حالات ساز گار رہیں گے تو یقین ہے کہ اس کے بننے سنورنے کی صورت بھی پیدا ہو گی ——— اور نئے تجربے ہماری عظیم روایت کو عظیم تر بنائیں گے۔

تصریحات

نامور افسانہ نگاروں اور نقادوں کے درمیان "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" کے بارے میں جو یہ گفتگو ہوئی اس کے متعلق مجھے بجز اس کے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ گفتگو بڑی کارآمد اور افسانوی ادب کے مخلصانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے لیکن ہماری اس گفتگو میں جن اچھے افسانہ نگاروں کا ذکر ایک آدھ ہی فقرے میں ہوا ہے میں چاہتا ہوں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ عرض کر دوں۔ مقصود فیصلوں کو جھٹلانا نہیں ہے، اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔

میں نے اس سمپوزیم کی پہلی اشاعت پر بھی عرض کیا تھا کہ "اس بحث میں جن دوستوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف ہو گئی ہے یا جن کی تعریف مقررتا بھی نہیں ہوئی ان سے مجھے بحث میں حصہ لینے والے احباب کے خلوصِ نیت کی خاطر معذرت کرنا ہے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو کم از کم اختر حسین رائے پوری، میرزا ادیب، اوپندر ناتھ اشک اور شفیق الرحمٰن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔

ہر دور میں (مسئلہ خواہ کسی صنفِ ادب کا ہو) دو ایک ہی بڑے لکھنے والے ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں ایسے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں جن کے دم قدم سے ادب میں بہار رہی۔ مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کا میرے نزدیک یہی درجہ ہے۔

اس ساری بحث میں اختر حسین رائے پوری کا ذکر صرف اسی ایک فقرے میں آیا ہے کہ "افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمہ ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ۔"

انہوں نے جس دور میں افسانے لکھے، اس دور کی تمام افسانوی تخلیقات پر رومان ہی رومان چھایا ہوا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتے تھے اور یہ بھی کہ اس وقت مغربی افسانوں کا ایک ایسا طلسم بندھا ہوا تھا جس نے ہمارے پورے افسانوی ادب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور ساتھ ہی سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کا نوجوان افسانہ نگاروں پر بڑا اثر تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے بعد میں ہی، کئی ایک مسائل کو بڑے ترقی پسندانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی سابقہ روش کو جس میں محض رومان ہی رومان تھا، ترک کر دیا اور کئی ایک ترقی پسند افسانہ نگار ان کی تحریروں سے متاثر بھی ہوئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اس ڈھب کی چیزیں کم لکھیں۔ اگر ان کا قلم رواں رہتا اور وہ ایک سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتے تو ہمیں امید تھی کہ ایک بہت بڑے

لکھنے والے گروپ کو برابر متاثر کرتے رہتے۔ بہرحال ان کا جتنا بھی افسانوی سرمایہ موجود ہے وہ قطعی طور پر نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ انہوں نے روایت سے اپنا ناطہ جوڑ کر کچھ نہ کچھ تجربے بھی کیے ہیں جو میرے نزدیک قابل احترام ہیں۔

آگے چل کر میرزا ادیب کی بیس سالہ ادبی زندگی کو ایک ہی فقرے میں چلتا کیا ہے۔ وہ یوں کہ "ان کا انداز یلدرم اور حجاب امتیاز علی کا سا ہے اور ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھوکھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔"

میرزا ادیب کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ضرور ہے اگر ہم ذرا سا اس دور کو بھی پیش نظر رکھیں تو ان کا زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا۔ ان کے ہاں رومانیت بھی بتدریج کم ہوتی گئی۔ اگر کم نہ بھی ہوتی تو کیا رومان نگار ہونا عیب میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمارا کلاسیکل لٹریچر سارے کا سارا نہیں تو آدھے سے زیادہ بیکار رہ جاتا ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہئے تھا کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں کوئی نئی بات کہی ہے یا نہیں۔ اگر ہم ان کی صرف ابتدائی چیزوں کو پیش نظر رکھیں تو ان کا ایک منفرد رنگ تھا جس کے یہ واحد مالک تھے اور موجودہ دور کے افسانوں میں بھی وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ہم ایک اچھے افسانہ نگار سے توقع رکھ سکتے ہیں۔ اب میرزا صاحب کے افسانوں میں زندگی کے عام مسائل کا فنکارانہ تجزیہ ملتا ہے۔ معاشرت کی اچھائیوں اور برائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے افسانے اب ایک تماشائی کی روداد نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے افسانہ نگار کا بھرپور اخلاص اور ایک اچھے فن کار کی چابکدستی موجود ہے۔

میرزا ادیب بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ خود کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "وہ ڈرامے اچھے لکھتے ہیں اور افسانے میں اس چیز کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ تفصیلات میں سے کون کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لانی چاہئیں۔"

اشک صاحب عموماً اوریجنیلیٹی (ORIGINALITY) میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے اور ان کے افسانوں کے تمام کردار اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا افسانہ بڑا افسانہ بنے یا نہ بنے مگر اس میں کہیں بھی غیر فطری اور خواہ مخواہ کی سنسنی پیدا کرنے والی بات راہ نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں منٹو کے افسانوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے بعض غیر ضروری باتوں کو لا کر بھی خواہ مخواہ حیرت ناک قسم کا تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم افسانے کے فن اور اس کی نازک سی جزئیات کا پورا پورا احترام کریں تو اشک کے افسانے (خواہ وہ بڑے افسانے نہ ہوں) ایک بڑے فنکار کی تخلیقات کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اشک کی بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی کہ ان کے فن پر بھی ڈرامہ کچھ اس طرح چھا کر رہ گیا ہے کہ اردو افسانے کے ضمن میں ان سے پورا پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی کچھ کم ہی سمجھ میں آتی ہے کہ جو ڈرامہ لکھتے وقت ڈرامے کی ذرا ذرا سی جزئیات کو پیش نظر رکھتا ہو اور اس کی کوئی بھی چول ڈھیلی نہ ہونے دیتا ہو۔ وہ افسانے میں غیر ضروری باتیں لکھ دے۔ میرے خیال میں تو وہ تمام ضروری ہی باتیں لکھتے ہیں اور غیر ضروری بات لکھتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کی کہانی افسانہ نہیں بنتی۔ پھر بھی چھ سات بڑے افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر ان کی افسانوی تخلیقات کو بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔

فنکار کی حیثیت سے شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے فن کا مقابلہ کرنا یا ان کے بارے میں ایک ہی انداز میں سوچنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ان دونوں نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کیا ہے تو کیا ان تمام افسانہ نگاروں کے فن کے بارے میں ایک ساتھ سوچنا ہوگا جنہوں نے نچلے طبقے سے متعلق افسانے لکھے ہیں۔ اگر یوں سوچنا صحیح نہیں ہے۔ شفیق الرحمٰن کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ مختلف انداز میں سوچنا ہوگا۔

شفیق الرحمٰن نے دو طرح کی چیزیں لکھی ہیں۔ ایک تو خالصتاً رومانی افسانے، دوسرے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین، اور یہ ان دونوں قسم کی تحریروں میں برابر کے کامیاب ہیں۔ جن میں ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے۔ یہ اسٹائل اپنے اندر کشش اور منفرد پن رکھتا ہے۔ نہ ان کے رومانی افسانے محض ذہنی تعیش کے آئینہ دار ہیں، اور نہ ان کی مزاحیہ تحریریں محض تفریح ہی تفریح ہیں بلکہ ان میں پڑھے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حسن ہے، نفاست ہے، ادب ہے اور اپنا ایک قطعی منفرد رنگ۔

اب رہا یہ سوال کہ ان کا ادب کس درجے کا ہے تو یہ بات سوچنے والی ضرور ہے مگر کوئی فیصلہ روا روی میں نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی رومانی افسانوں میں ایک منفرد اسٹائل اور شگفتہ نگاری کی نایابی میں شفیق الرحمٰن کی تحریروں پر غور کرے گا تو انہیں ایک بڑا فن کار ماننا پڑے گا۔

میں نے ان چند سطروں میں بات کو طول پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ نہ ہی مثالوں سے بھاری بھرکم بنانے پر راضی ہوا۔ یہ تو صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں آپ سے اتنا عرض کر سکوں کہ ان حضرات نے بھی افسانوی ادب میں اپنے اپنے رنگ میں کچھ خدمت ہی کی ہے۔

محمد طفیل